مرکزی اردو کتب خانہ
اردو ہال
حیدرآباد دکن

تاریخِ ادبِ اردو

یہ کتاب اور دیگر ہر قسم کی کتابیں ملنے کا پتہ
شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

مرکزی اردو کتب خانہ
اردو ہال - حیدر گوڑہ
حیدر آباد-۱

مُصنّف : رام بابو سکسینہ

مُترجم : مرزا محمد عسکری

نظرِ ثانی : مرتضیٰ حسین فاضل

تاریخِ ادبِ اُردو

۸۸۷۰
۸۹۱۵۸۳۰۹
ر ـ ت

سلسلہ ۱۷۰

ناشر ———— میاں ولی محمد

مطبع ———— علمی پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت ———— سفید کاغذ مصوّر -/18

〃 ———— نیوز پرنٹ غیر مصوّر -/۱۰

★

ملنے کا پتہ

ولی سنز، پبلشرز

کرشن نگر، لاہور

CURRENT PRICE Rs. 18/-

فہرست مضامین

مضمون	نمبر صفحہ
مقدمہ — فاضل لکھنوی	۵
فہرست تصاویر حصہ نظم	۱۶
تمہید — رام بابو سکسینہ	۱۷
تقریظ — تیج بہادر سپرو	۲۰
التماس مترجم — عسکری	۲۴
باب ۱	
زبان اُردو اور اس کی اصل	
اُردو سے کیا مراد ہے؟	۳۵
اُردو اور ہندی کا تعلق	۳۷
زبان اور ادبِ اُردو فارسی کا احسان مند ہے۔	״
اُردو میں فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی کثرت کے اسباب	۳۸
یورپ کی زبانوں کا اُردو پر اثر	۴۱
نثر اور نظم کی زبان	۴۴
ادبی اُردو	۴۵
زبان اُردو کے قدیم نام	۴۶
اُردو کا رسم الخط	״
نظم اُردو	۴۹
باب ۲	
ادب اُردو کی ترقی کے ابتدائی دور	
نظم کا تقدم نثر پر، اس کے وجوہ اور اس کا تعلق خاص ادب اُردو کے ساتھ	۵۴
سب سے پہلا اُردو شاعر، امیر خسرو دہلوی	۵۵
اُردو کی پختگی کا زمانہ	۵۶
زرّیں عہد اکبری	۵۷
قدیم شعرائے دکن اور دربار شاہانِ گولکنڈہ و بیجاپور	۵۸
ولی دکنی ۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء	۵۹
قدیم شعرائے دہلی۔ حاتم، آبرو، آرزو	״
میر و سودا کا زمانہ۔ اس زمانہ کی ترقیاں زبان اور شاعری میں اصلاحیں	۶۱
انشا اور مصحفی کا دور۔ ان کی خدمات زبان اور شاعری کے ساتھ	۶۲

مضمون	نمبر صفحہ
ریختی، اور ذوق کا زمانہ اور اُس	۶۳
غالب اور ذوق کا زمانہ اور اسکی خصوصیات	۶۴
شعرائے لکھنؤ کا نیا دور اور اس کی خصوصیات۔ ناسخ اور آتش کا زمانہ۔ اُن کی خدمات زبان کے ساتھ	۶۶
مراثی اور اُن کا تعلق زبان کے ساتھ	۶۷
مابعد کے شعرا۔ امیر و داغ کا زمانہ	۶۸
جدید رنگ۔ آزاد اور حالی کا زمانہ اُن کی خدمات زبان کے ساتھ	۶۹
نثر اُردو۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ	″
نثر مقفےٰ۔ رجب علی بیگ سرور	۷۰
"دریاے لطافت"	۷۱
"اُردوے معلّیٰ" اور "عود ہندی"	″
عیسائی پادریوں کی تحریروں کا اثر	۷۲
سرسید اور ان کے رفقاے کار کا زرّیں عہد	″
تعلیم انگریزی کا اثر اُردو پر	″
چھاپہ کی ابتدا۔ اُردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔	۷۳
ناول نویسی کی ابتدا	۷۴

مضمون	نمبر صفحہ
اُردو ڈراما	۷۴
باب ۳	
اُردو شاعری کے عام خصوصیات	
اُردو شاعری فارسی کی مقلد ہے۔	۷۵
تقلید کے بُرے نتائج	۷۶
اُردو شاعری محض نقالی ہے۔	
اُردو شاعری محض رسمی رہ گئی	۷۷
قافیہ پیمائی	۷۸
خلاف نیچر مضامین	″
اصناف سخن	۸۰
غزل اور اس کا رنگ	″
تصوّف	۸۱
عاشقانہ	۸۲
اہل دربار کا اثر اُردو شاعری پر	″
دیہاتی اور قدرتی مناظر کی اُردو شاعری میں کمی	۸۳
اُردو شاعری حزن و یاس کی شاعری ہے	۸۵
قصائد	۸۶
مثنوی	۸۷
مراثی	۸۸

مضمون	نمبر صفحہ
قطعہ اور رباعی	۸۸
اُستاد و شاگرد کا تعلق	"
مشاعرے	"
تخلص	"
اردو شاعری کی خصوصیات	۸۹
باب	
قدیم شعرائے دکن	
دکھنی کیا چیز ہے؟	۹۰
زبان دکھنی کی ابتداء	۹۱
دکن میں اردو شاعری کی ابتداء کے اسباب	۹۲
شاہان بہمنی کا زمانہ (۷۴۸ھ لغایت ۹۳۲ھ)	"
	۹۴
قطب شاہیوں کا عہد (۹۱۶ھ تا ۱۰۹۸ھ)	"
سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء)	۹۵
سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ء لغایت ۱۶۲۵ء)	۹۸
سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵ء لغایت ۱۶۷۴ء)	۹۹

مضمون	نمبر صفحہ
ابن نشاطی	۹۹
غواصی کا قصہ "سیف الملوک"	۱۰۰
سبرس مصنفہ مولانا وجہی	۱۰۱
تحسین الدین	"
ملا قطبی	۱۰۲
جنیدی	"
طبعی	"
ابوالحسن تانا شاہ ۱۶۷۲ء لغایت ۱۶۸۷ء	"
نوری	۱۰۳
فائز	"
شاہی	"
مرزا	"
عادل شاہیوں کا زمانہ (۸۹۵ھ لغایت ۱۰۹۷ھ)	"
ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء لغایت ۱۶۲۶ء)	۱۰۴
علی عادل شاہ ثانی (۱۶۵۶ء لغایت ۱۶۷۲ء)	۱۰۵
رستمی	"
نصرتی	"

مضمون	نمبر صفحہ
ہاشمی	۱۰۷
دولت	۱۰۸
شاہ ملک	"
شاہ امین	"
دکن میں مرثیہ کی ابتداء	۱۰۹
شعرائے دکن مغلوں کے عہدِ حکومت میں	"
عاجز	"
بحری	"
امین	۱۱۰
ولی دکنی	"
وجدی	"
آزاد	۱۱۱
شعرائے اورنگ آباد	"
ولی ۱۶۶۸ئہ تا ۱۷۴۴ء	"
نام کے متعلق اختلاف	۱۱۲
مقام پیدائش اور خاندان کے متعلق اختلاف	"
حالات زندگی	۱۱۳
دلی کے دو سفر	"

مضمون	نمبر صفحہ
"وہ مجلس"	۱۱۳
وفات	۱۱۴
کلام پر رائے	۱۱۵
داؤد	۱۱۶
سراج	"
دیگر شعرا اس دور کے	۱۱۹
احاطہ مدراس وارکٹ کے شعراء	"

باب ۵

اساتذہ دہلی

حصہ اول طبقہ متقدمین

حاتم و آبرو کا زمانہ

مضمون	نمبر صفحہ
دہلی میں اردو زبان کی ابتداء و ترقی	۱۲۱
اردو لغات کی ترتیب	۱۲۲
دلی کے پرانے شاعر اور زبان کے ساتھ ان کی خدمات	۱۲۳
صنعت ایہام	۱۲۴
تصوف	"
سپاہی پیشہ شعراء	۱۲۵
کلام میں یک رنگی کی کمی اور	

مضمون	نمبر صفحہ
سبک و مبتذل الفاظ	۱۲۵
اس عہد کے شعراء کا طرز بیان اور اور اُن کے کلام کی خامیاں	"
عربی و فارسی الفاظ و خیالات کا داخلہ اور سنسکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا اخراج	۱۲۶
شاہ مبارک آبرو متوفی سنہ ۱۷۵۰ء	"
خان آرزو سنہ ۱۶۸۹ء تا سنہ ۱۷۵۶ء	۱۲۷
شاہ حاتم سنہ ۱۶۹۹ء تا سنہ ۱۷۹۱ء	۱۲۹
میاں مضمون متوفی سنہ ۱۷۴۵ء	۱۳۱
مرزا مظہر جانجاناں سنہ ۱۶۹۸ء لغایت سنہ ۱۷۸۱ء	۱۳۲
ناجی	۱۳۵
تاباں	"
یکرنگ	۱۳۶
فغاں متوفی سنہ ۱۷۷۲ء	۱۳۷
باقی اور شعراء	۱۳۸

باب ۶

اساتذہ دہلی

مضمون	نمبر صفحہ
حصّہ دوم طبقہ متوسطین	
میرؔ و سوداؔ کا زمانہ	
اُردو شاعری کا زریں عہد	۱۳۹
زبان میں فارسیت کا غلبہ	۱۴۰
الفاظ میں تذکیر و تانیث	۱۴۱
شعراء دہلی چھوڑکر لکھنؤ آتے ہیں	"
کلام کی خصوصیت	"
تذکرے	۱۴۲
خواجہ میر درد سنہ ۱۱۳۳ھ تا سنہ ۱۱۹۹ھ	"
تصانیف	۱۴۵
شاگرد	۱۴۸
میر سوز سنہ ۱۱۳۳ھ تا سنہ ۱۲۱۳ھ	۱۴۹
طرز کلام	۱۵۰
سوزؔ کا مرتبہ شاعری میں	۱۵۱
سودا سنہ ۱۱۲۵ھ تا سنہ ۱۱۹۵ھ	"
تصانیف	۱۵۵
سوداؔ کا مرتبہ شاعری میں	"
اُن کی خدمات زبان کے ساتھ	۱۵۶
اُن کی خدمات شاعری کے ساتھ	۱۵۸

مضمون	نمبر صفحہ
قصیدہ اور مرثیہ	۱۵۸
ہجو	۱۵۹
کلام پر رائے	۱۶۲
سودا کا اثر بعد کے شعرا پر	〃
مرزا کے کلام پر شعرا کی رائیں	۱۶۴
کلام میں کمی	۱۶۶
میر حسن متوفی ۱۲۰۱ھ	〃
تعلیم و شاگردی	۱۶۸
طرز کلام	〃
میر حسن کے صاحبزادے	〃
تصانیف	۱۶۹
اختصار مثنوی میر حسن مسلسل بصورت افسانہ	۱۷۰
مراثی	۱۸۵
تذکرۃ الشعراء	〃
نمونہ مثنوی گلزار ارم	۱۸۶
رباعی اور ہجو اور قصائد کے نمونے	۱۸۷
میر تقی میر	۱۸۹
روانگی لکھنؤ	۱۹۳
میر صاحب کی عمر	۱۹۵
ذکر میر	۱۹۶
سیادت میں اختلاف	۱۹۷
نکات الشعراء	۱۹۹
میر صاحب کا کیریکٹر	۲۰۲
نازک دماغی	〃
کلام میں مایوسی و درد	۲۰۵
تصانیف	۲۰۸
میر صاحب کی ایجادیں	۲۱۰
میر صاحب کی خدمات زبان اور شاعری کے ساتھ	۲۱۱
میر بحیثیت شاعر کے	۲۱۲
میر اور سودا کا مقابلہ	۲۱۳
اس عہد کے دیگر شعراء	۲۲۰
باب ۷	
اساتذۂ دہلی	
طبقۂ متاخرین	
انشاء اور مصحفی کا زمانہ، طبقات کی ترتیب، اس دور کی ترقیاں	۲۲۱
شاعری دربار سے وابستہ ہوگئی	۲۲۲

مضمون	نمبر صفحہ
اس وابستگی کے خراب نتائج	۲۲۲
ریختی	۲۲۳
ہزل گویان اردو	۲۲۵
انشاء (متوفی ۱۲۳۳ھ ہجری مطابق ۱۸۱۷ء عیسوی)	"
انشاء کی تقریب نواب سعادت علی خاں کے دربار میں	۲۲۶
ان کے کلام کی خصوصیات	۲۲۹
تصانیف	۲۳۲
کہانی ٹھیٹھ ہندی میں	۲۳۴
دریائے لطافت	۲۳۶
جرأت (متوفی ۱۲۲۵ھ)	۲۳۸
تصانیف	۲۴۰
جرأت کی خصوصیات اور ان کا مقابلہ میر کے ساتھ	"
جرأت اور داغ	۲۴۲
مصحفی (۱۱۶۴ھ تا ۱۲۴۰ھ)	"
تصانیف	۲۴۳
تذکرہ شعرائے اردو مصنفہ ۱۷۹۴ء	۲۴۴
خصوصیات کلام	"
مصحفی اور سید انشاء کے معرکے	۲۴۶
رنگین ۱۱۶۹ھ تا ۱۲۵۱ھ	۲۴۹
تصانیف	۲۵۰
ریختی سے کیا مطلب ہے اور اس کی ایجاد کے اسباب	۲۵۱
شاعر شاہان دہلی شاہ عالم ثانی ۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۶ء	۲۵۴
مرزا سلیمان شکوہ متخلص بہ سلیماں	۲۵۴
اکبر شاہ ثانی ۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء	۲۵۵
بہادر شاہ ثانی متخلص بہ ظفر	۲۵۶
قائم چاند پوری	۲۵۷
منت	۲۵۸
ممنون	۲۵۹
حسرت (دہلوی)	"
قدرت	۲۶۱
بیدار	۲۶۲
ہدایت	۲۶۳
فراق	"
ضیاء	۲۶۴
بقا	۲۶۵

مضمون	نمبر صفحہ
حزیں	۲۶۶
بیان	〃
راسخ	۲۶۷
باب ۸	
اساتذہ لکھنؤ	
ناسخ و آتش کا زمانہ	
مرکز شاعری لکھنؤ میں منتقل ہوتا ہے	۲۶۸
لکھنؤ کا طرز شاعری	۲۷۰
طرز دہلی اور طرز لکھنؤ کا فرق اور	
ان کا تقابل	۲۷۱
تحقیق الفاظ اور رعایت لفظی کا زمانہ	۲۷۳
شیخ امام بخش ناسخ متوفی سنہ ۱۲۵۴ھ	
مطابق سنہ ۱۸۳۸ء	۲۷۴
تصانیف	۲۷۷
ناسخ کا اثر شاعری اور زبان پر	۲۷۸
ناسخ کی غزلیں	۲۷۹
تاریخیں	۲۸۰
قصیدہ نہیں کہا	۲۸۱
نقائص کلام	〃

مضمون	نمبر صفحہ
ناسخ کے کارنامے	۲۸۲
شاگرد	۲۸۳
برق	〃
بحر	۲۸۴
آباد	۲۸۵
خواجہ وزیر	〃
رشک	۲۸۷
مہر	۲۸۹
تصانیف	۲۹۰
منیر	〃
تصانیف	۲۹۲
آتش متوفی سنہ ۱۲۶۶ھ	〃
طرز کلام	۲۹۴
تصانیف	۲۹۵
نقائص کلام	〃
ناسخ اور آتش کا مقابلہ	〃
شاگرد	۲۹۷
رند	۲۹۸
خلیل	۲۹۹
نسیم	۳۰۰

مضمون	نمبر صفحہ
صبا	۳۰۱
آغا جو شرف	"
اس دور میں زبان میں کیا تغیرات ہوئے۔	۳۰۲
باب ۹	
دربار لکھنؤ اور اس کے شعراء	
واجد علی شاہ اختر کا عہد	۳۰۳
آصف الدولہ آصف	"
نواب وزیر علی خاں وزیر	۳۰۵
نواب سعادت علی خاں سعادت	"
غازی الدین حیدر	۳۰۶
نصیر الدین حیدر	"
اختر (واجد علی شاہ)	۳۰۷
تصانیف	۳۰۹
طرز کلام	۳۱۱
اسیر	۳۱۲
امانت	۳۱۳
آفتاب الدولہ قلق	۳۱۴
ذکی	۳۱۵
درخشاں	۳۱۵
اختر	۳۱۶
باب ۱۰	
مرثیہ اور مرثیہ گو	
مرثیہ کی تعریف	۳۱۸
مرثیہ کی قدامت	۳۱۹
اردو مرثیہ کی ابتدا۔	۳۲۰
بزرگان انیس اور ان کی خدمات	
مرثیہ کے ساتھ	"
خلیق	۳۲۱
میر انیس	۳۲۳
میر بحیثیت شاعر	۳۲۵
تصانیف	۳۲۶
انیس کی خدمت زبان کے ساتھ	"
مرقع نگاری	۳۲۷
اظہار جذبات	۳۲۸
میر انیس کا طرز	۳۲۹
دبیر	۳۳۰
دبیر بحیثیت مرثیہ گو	۳۳۲

نمبر صفحہ	مضمون
۳۳۳	انیس و دبیر کا مقابلہ
۳۳۴	مرثیہ کی مقبولیت کے اسباب
۳۳۵	مرثیہ سے کیا کیا فائدے پہنچے
۳۳۷	دیگر مرثیہ نویس
"	خاندان انیس
۳۳۸	میر مونس
"	میر نفیس
۳۳۹	عارف
"	جلیس
"	سیّد میرزا اُنس کا خاندان
"	سید میرزا اُنس
۳۴۰	عشق
"	تعشق
۳۴۱	احمد میرزا صابر
۳۴۲	پیارے صاحب رشید
۳۴۳	خاندان دبیر۔ مرزا اوج
"	نعت
	باب ۱۱
۳۴۴	نظیر اکبر آبادی اور شاہ نصیر دہلوی

نمبر صفحہ	مضمون
۳۴۴	نظیر اکبر آبادی
۳۴۷	نظیر بحیثیت واعظ و ناصح کے
۳۴۸	نظیر بحیثیت حقیقی ہندوستانی شاعر کے
۳۴۹	اُن کی خدمت زبان کے ساتھ
۳۵۱	نظیر جدید رنگ کے پیشرو تھے
۳۵۲	نظیر کا ظریفانہ رنگ، اُن کا مقابلہ انشاء کے ساتھ
۳۵۳	نظیر بحیثیت مصور کے
۳۵۴	اردو کا شیکسپیئر ہمارا کون شاعر ہو سکتا ہے؟
۳۵۶	شاہ نصیر دہلوی متوفی سنہ ۱۸۴۰ء
۳۵۸	تصانیف
۳۵۹	ان کا مرتبہ شاعری میں
	باب ۱۲
	طبقہ متوسطین شعرائے دہلی
	ذوق و غالب کا زمانہ
۳۶۱	دلّی کی شاعری کا دوبارہ عروج
۳۶۲	مومن سنہ ۱۲۱۵ھ لغایت سنہ ۱۲۶۸ھ
۳۶۵	تصانیف

مضمون	نمبر صفحہ
رنگِ کلام	۳۶۵
مومن کا مرتبہ بحیثیت شاعر	۳۶۶
شیفتہ ۱۲۲۱ھ تا ۱۲۸۶ھ	۳۶۷
تسکین ۱۲۱۷ھ تا ۱۲۶۵ھ	۳۶۸
نسیم دہلوی ۱۷۹۴ء تا ۱۸۶۴ء	۳۶۹
طرزِ کلام	۳۷۰
ذوق ۱۷۸۹ء تا ۱۸۵۴ء	〃
شاہ نصیر سے معرکہ	۳۷۳
تصانیف	۳۷۵
ذوق کی خدمت زبان کے ساتھ	۳۷۶
اندازِ کلام	〃
شاگرد	۳۷۸
ظہیر متوفی ۱۹۱۱ء	〃
انور	۳۸۰
غالب ۱۷۹۶ء تا ۱۸۶۹ء	〃
عام حالات اور طبعی عادات	۳۸۴
غالب بحیثیت شاعر کے	۳۸۶
تصانیف	۳۸۸
مرزا صاحب سے مباحثے	۳۹۰
غالب کی شاعری کے تین دور	۳۹۱
غالب کے خصوصیات، پہلی خصوصیت جدّت پسندی	۳۹۴
دوسری خصوصیت نظر فریبیِ طرزِ تحریر	〃
تیسری خصوصیت ذاتی جذبات کا ادا کرنا	۳۹۵
چوتھی خصوصیت فلسفیت اور حقیقت طرازی	۳۹۶
پانچویں خصوصیت جذبات نگاری	۳۹۷
کلام میں ظرافت و شوخی	۳۹۸
غالب کا مقابلہ اپنے معاصرین شعرا سے	۳۹۹
غالب کے شاگرد	۴۰۰
میر مہدی مجروح متوفی ۱۹۰۲ء	۴۰۱
سالک متوفی ۱۸۹۳ء	۴۰۲
ذکی متوفی ۱۹۰۳ء	〃
رخشاں متوفی ۱۸۸۳ء	۴۰۳
آزردہ ۱۲۰۴ھ لغایت ۱۲۸۵ھ	۴۰۴
باب ۱۳	
دربار رام پور و حیدر آباد	

مضمون	نمبر صفحہ
امیر و داغ کا زمانہ	
مٹیا برج کلکتہ میں شعراء کا مجمع	۴۰۶
شعرائے دہلی اپنا وطن چھوڑ کر نکلتے ہیں۔	۴۰۷
فرخ آباد	۴۰۸
عظیم آباد	״
مرشد آباد	۴۰۹
ٹانڈہ	״
حیدر آباد	״
فیض آباد و لکھنؤ	۴۱۰
شعرائے دہلی و لکھنؤ کا دوسرے مقامات پر منتشر ہو جانا	۴۱۱
ٹونک	۴۱۲
منگرول	۴۱۳
بھوپال	״
رام پور	۴۱۴
نواب یوسف علیخاں	۴۱۵
نواب کلب علی خاں سنہ ۱۲۵۰ھ تا ۱۳۰۴ھ	״

مضمون	نمبر صفحہ
موجودہ فرمانروائے رام پور	۴۲۰
امیر مینائی ۱۲۴۴ھ لغایت ۱۳۱۸ھ	״
تصانیف	۴۲۳
شاگرد	۴۲۶
امیر کی شاعری	״
اخلاق و عادات	۴۲۷
چند اشعار بطور نمونہ	۴۲۸
داغ دہلوی ۱۸۳۱ء لغایت ۱۹۰۵ء	۴۲۹
عام اخلاق و عادات	۴۳۳
داغ کی شاعری	״
تصانیف	״
طرزِ کلام	۴۳۵
کلام پر اعتراض	۴۳۶
شاگرد	۴۳۸
امیر و داغ کا مقابلہ	״
جلال لکھنوی سنہ ۱۲۵۰ھ تا ۱۳۲۵ھ	۴۴۲
تصانیف	۴۴۴
مزاج کی کیفیت	۴۴۵
خصوصیاتِ کلام	۴۴۶

مضمون	نمبر صفحہ
شاگرد	۴۴۷
آرزو	״
احسان	״
تسلیم ۱۸۲۲ء تا ۱۹۱۱ء	۴۴۸
تصانیف	۴۵۰
اندازِ کلام	״
عرش	۴۵۲
دربار حیدر آباد دکن	۴۵۳
نظام الملک آصف جاہ اوّل	۴۵۴
میر محبوب علی خاں متخلص بہ آصف	״
موجودہ فرمانروائے دکن	۴۵۶
مہاراجہ چندو لال	״
شادان ۱۷۶۶ء تا ۱۸۴۵ء	״
راجہ گردھاری پرشاد	
باقی ۱۸۲۴ء تا ۱۸۹۰ء	۴۵۷
مہاراجہ سرکشن پرشاد متخلص بہ شاد	۴۵۸
انجمن ترقی اُردو	۴۵۹
عثمانیہ یونیورسٹی	
دار الترجمہ	۴۶۲
باب ۱۴	

مضمون	نمبر صفحہ
اُردو شاعری کا جدید رنگ	
آزاد اور حالی کا زمانہ	۴۶۴
جدید طرز کے پیشرو	״
انقلاب کا اثر	۴۶۵
انگریزی تعلیم کا اثر	۴۶۶
جدید رنگ کے خصوصیات	۴۶۷
اصنافِ سخن میں جدتیں	۴۶۸
جدید رنگ کے اثرات	۴۶۹
جدید ادب اُردو کے تین طرز	۴۷۰
پہلا طبقہ	״
دوسرا طبقہ	۴۷۱
تیسرا طبقہ	۴۷۳
خواجہ حالی	۴۷۴
حالی کی شاعری اور اس پر غالب و شیفتہ کا اثر	۴۷۷
سرسیّد کا اثر	۴۷۸
تصانیف	۴۷۹
مثنویاں	۴۸۰
مسدّس حالی	۴۸۱

مضمون	نمبر صفحہ
شکوۂ ہند	۴۸۳
مراثی	″
مناجاتِ بیوہ	″
چپ کی داد	۴۸۴
دیوانِ حالی	″
مقدمہ شعر و شاعری	۴۸۵
اولیاتِ حالی	۴۸۷
نقائصِ حالی	۴۸۸
مولانا محمد حسین آزاد	″
آزاد کی شاعری	۴۸۹
تصانیف منظوم	۴۹۱
آزاد کا قدیم و جدید رنگ	″
آزاد و حالی کا فرق	۴۹۴
مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی	۴۹۵
سرور جہاں آبادی	۴۹۷
ان کی شاعری کی خصوصیات	۴۹۸
انگریزی نظموں کے ترجمے	۴۹۹
اکبر الہ آبادی	۵۰۱
اخلاق و عادات	۵۰۲

مضمون	نمبر صفحہ
اکبر کی شاعری	۵۰۲
پہلا دور ابتدا سے ۱۸۶۶ء تک	۵۰۳
دوسرا دور ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۴ء تک	″
تیسرا دور ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۹ء تک	۵۰۴
چوتھا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک	″
پانچواں دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۱ء تک	۵۰۵
اکبر کی غزلیات	۵۰۶
رنگِ قدیم	″
رنگِ متوسط	۵۰۷
رنگِ آخر	۵۰۸
اکبر کی خوش طبعی و ظرافت	۵۱۰
اقسام ظرافت	۵۱۳
اکبر کی سیاسی نظمیں	۵۱۸
اکبر بحیثیت نکتہ چین	
سوسائٹی	۵۲۱
اکبر کے مذہبی عقائد	۵۲۶
نادرہ کاکوردی	″

مسٹر رام بابو سکسینہ مصنف اصل کتاب (ہسٹری آف اردو لٹریچر)

مقدمہ

رائے بہادر، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اُردو ادب کے ان پرستاروں میں ہیں جن کے نام و کام پہ تاریخ ہمیشہ محبت کے پھول برسائے گی۔ موصوف فرخ آباد کے رہنے والے اور حکومت کے انتظامی افسروں میں سے تھے۔

۱۸۹۴ء مطابق ۱۳۱۲ھ کو پیدا ہوئے اور دسمبر ۱۹۵۷ء مطابق ۱۳۷۷ھ کو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تریسٹھ سال کی عمر میں انہوں نے یوں تو اردو شعراء زمانہ حال، اوراق پریشاں اور "مثنوی میر بخط میر" نیز ایک قدیم مجموعہ تصاویر شعراء شایع کرنے کے علاوہ متعدد مضامین بھی لکھے۔ لیکن ان کا یادگار کارنامہ "ہسٹری آف اُردو لٹریچر" ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد اشاعت پذیر ہوئی۔

ہسٹری آف اُردو لٹریچر کی اشاعت سے پہلے سر عبدالقادر، صلاح الدین خدا بخش کے مضامین بلکہ ان کی وقیع کتابوں نے انگریزی دان صاحبان ذوق کو مہمیز دی تھی، لیکن یہ تالیفات مکمل صورت میں ابھی منصہ شہود پہ نہیں آئی تھیں کہ سکسینہ صاحب کو اعلیٰ

امتحانات میں طلبار کی مشکلات کا خیال آیا[1] اور اسی ضرورت کے پیشِ نظر موصوف نے اپنی کتاب ایک نئے خاکے پر لکھنا شروع کر دی۔ بالفاظ مترجم وبقول مؤلف :

" اس کی تصنیف میں میرے پیشِ نظر یہ رہا ہے کہ یہ زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں کے مطابق بطور ٹیکسٹ بُک تیار کی جائے۔ تاکہ انگریزی داں جماعت بھی ادب اُردو سے کماحقہ واقف ہو جائے "

سکسینہ کی کامیابی اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ یہ کتاب اشاعت کے بعد سے اب تک ٹیکسٹ بُک شمار ہوتی چلی آتی ہے۔

چار برس میں کتاب مکمل ہوئی۔ پھر اس میں ردّ و بدل اور اضافہ و ترمیم کا سلسلہ جاری رہا حک و اصلاح کے دوران مؤلف کو ایک اور کمزوری نظر آئی :

(الف) " ابتدائی قصد تو یہ تھا کہ ادب اُردو کی ایک پرائمر (ابتدائی کتاب) کالج کے طلبا اور عام پبلک کے فائدے کے لیے تیار کی جائے، اسی وجہ سے فٹ نوٹ اور حوالوں سے کتاب کو وزنی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی " (تمہید)

(ب) " اس بات کی بھی شکایت کا موقع ہو سکتا ہے کہ تمثیلی اقتباسات دوسری کتابوں سے نہیں دیے گئے۔ میں نے یہ فروگذاشت جان بُوجھ کر کی ہے اور سند میں پروفیسر سنٹسبری کی کتاب " مختصر تاریخ انگریزی علم ادب " کی مثال پیش کر سکتا ہوں جس کے طرز پر میں نے یہ کتاب ترتیب دی ہے "

(ج) " ایک اور اہم فروگذاشت قابل ذکر یہ ہے کہ دورِ موجودہ کے اُردو شعرار کا اس کتاب میں ذکر نہیں ہے "

---

[1] تمہید از مصنف کے علاوہ خود مرزا محمد عسکری صاحب مرحوم نے بھی یہی لکھا ہے۔

ان خصوصیات کے ساتھ سکسینہ کی کتاب چھپی اور چھپتی رہے گی، لیکن یہ طے ہے کہ کتاب جتنی مقبول ہوئی وہ تو خیر ہوئی لیکن ترجمہ نے جو پر پرواز عطا کئے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

مرزا محمد عسکری مرحوم نے اسی کتاب کا ترجمہ کیا اور "تاریخ ادب اُردو" نام رکھا۔ جناب عرشی صاحب کے بقول یہ ترجمہ "۱۹۲۹ء میں کہیں کہیں مناسب ردّ و بدل کے ساتھ مرتّب کیا گیا ہے، یہ کتاب دو حصوں اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے اور مطبع نول کشور لکھنؤ نے مصوّر شایع کی ہے۔" (دیباچہ دستور الفصاحت ص ۱۱۴)

مرزا صاحب، لکھنؤ کے رہنے والے، خاندانی ادب دوست اور خود بڑے صاحب ذوق تھے، وکٹوریہ اسٹریٹ، اقتدار مقتدا خاں کی کوٹھی سے ہوتی ہوئی ایک سیدھی سڑک چلی جاتی ہے، اکبری دروازے سے ذرا آگے بڑھ کر محمود نگر میں سڑک پر مرزا صاحب کا مکان تھا۔ یہاں اُن کے صاحب زادے[1] (غالباً) کے نام کا بورڈ لگا تھا۔ میں غالب کے سلسلے میں موصوف سے دو مرتبہ ملنے گیا، لکھنؤ کے معیاری اخلاق و وضع کے بزرگ تھے، بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ غالب کے سفر لکھنؤ، مرزا عباس بیگ اور مرزا خانی کے بارے میں کچھ سوالات کیے تھے، لیکن موصوف علیل تھے، اس لیے کچھ نہ بتا سکے۔ صرف یہ فرمایا کہ قتیل اس مکان میں آیا کرتے اور اپنی ترکی غزلیں سنایا کرتے تھے۔ گویا مرزا خانی صاحب ترکی جانتے تھے۔

مرزا غالب کے سلسلے میں اپنے جد بزرگوار کے انتخاب دیوان کا شرف بیان کرتے ہوئے اپنے "ادبی خطوط غالب" کا ذکر بڑے فخریہ انداز میں فرمایا۔ پھر اپنا ایک مقالہ "مرزا غالب کی شاعری" عطا فرمایا۔

ان کی دونوں ملاقاتوں سے میرا تاثر یہ ہے کہ مرحوم کو انگریزی اُردو کے مزاج اور ترجمہ

---

[1] غالباً وکیل ہیں، نام یاد نہیں۔

واصطلاحات، لطائف و نوادر سے خاص دلچسپی تھی۔

ان کے والد مرزا محمد تقی بن محمد مرزا خان عرف مرزا خانی (کوتوال دہلی) تھے جو اپنے بڑھاپے تک اولادِ نرینہ سے محروم رہے۔ پچاس برس کے قریب عمر تھی۔ جب ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۶ھ میں مرزا محمد عسکری صاحب کی ولادت ہوئی۔ ہوش سنبھالنے کے بعد مستند اساتذہ سے ابتدائی عربی پھر فارسی پڑھنے کے بعد انگریزی تعلیم شروع کردی جو ۱۸۹۱ء میں بی۔اے ڈگری پر ختم ہوئی۔ تعلیم کے بعد تعلّم و تدریس کا مشغلہ اپنایا۔ اچھی خاصی مدت اور اچھے نام و کام نے حکومت ہند کی نگاہ انتخاب کو متوجہ کیا۔ چنانچہ لیجسلیٹو ڈیپارٹمنٹ کلکتے میں ہیڈ ٹرانسلیٹر ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں مرحوم مہاراجہ محمود آباد سر علی محمد خاں نے پانچسو روپیہ ماہوار اور رہائش کے اعلیٰ انتظام کے ساتھ اپنا پرائیویٹ سیکرٹری منتخب کیا۔

۱۹۲۲ء میں دوبارہ کلکتے گئے جہاں اپنے عہدے سے ۱۹۲۵ء میں سبکدوش ہو کر لکھنؤ آ گئے اور منشی نول کشور کے ادارے میں کام کرنے لگے۔ انہی دنوں تاریخ ادب اُردو کا ترجمہ کیا۔

۱۹۳۰ء میں اس ادارے سے بھی علیحدگی اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں نیاز فتح پوری مدیر نگار نے مرزا صاحب سے اپنی ملاقات اور تاثرات کا ذکر ان لفظوں میں کیا تھا:

> "مرزا صاحب یہاں (نول کشور پریس) کے شعبہ اُردو کے مہتمم ہیں اور باوصف ضعف و پیرانہ سالی کے جوانانہ سرگرمی کے ساتھ تحریر و مطالعے میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کا آخری کارنامہ "تاریخ ادب اُردو" ہے جو تقریباً آٹھ سو صفحات کو محیط ہے۔ لکھنؤ میں "مسلم اکاڈیمی" کا وجود آپ ہی کی ذات سے قائم ہے کیونکہ نہ آپ ہر ماہ اپنے مکان پر ممبروں کو پر تکلف دعوت دیں اور نہ کوئی شرکت کے لیے مجبور ہو۔ اکاڈیمی میں اس وقت تک

بعض اچھے اچھے مضامین پڑھے جا چکے ہیں اور یہ صرف نتیجہ ہے مرزا صاحب کے شغف علمی کا، مرزا صاحب سرخ و سپید رنگ، باریک کترے ہوئے نقشے کے انسان ہیں اور اس حد تک "صنادید عجم" کے آثار آپ میں نمایاں ہیں کہ بے اختیار جی چاہا کہ ایام خزاں میں ان کے "افسانہائے بہار" سنوں"۔

(مذکرات نیاز۔ طبع ۱۹۴۲ صفحہ ۱۵۵)

۱۹۳۰ء کے بعد بھی ان کی اجتماعی زندگی میں علمی رنگ باقی رہا، اجتماعات، تحریکات، منصوبے بنتے بگڑتے رہے لیکن آخر میں وہ بڑی حد تک مستقل طور پر تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ ضعیفی و بیماری کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس لیے پوری تندہی سے کتابوں کی اشاعت کی طرف دھیان نہ دے سکے۔ اور ۱۹۵۱ء میں انتقال فرما گئے۔

تالیفات

۱۔ وقایع محاصرۂ گولکنڈہ ترجمہ وقایع نعمت علی خاں عالی

۲۔ دیوان اوّل میر تقی میرؔ

۳۔ کلیات نظیر اکبر آبادی

۴۔ کلیات انشا

۵۔ غوث الاعظم

۶۔ مجموعۂ مضامین و تراجم

۷۔ نوادر۔ مجموعۂ لطائف (مطبوعہ)

۸۔ لغت خیالات ترجمہ ڈکشنری آف تھاٹ (مطبوعہ نامکمل)

۹۔ من کیستم (غیر مطبوعہ)

۱۰۔ شیخ جی (مطبوعہ)

۱۱۔ ادبی خطوط غالب (مطبوعہ)

۱۲۔ مرزا غالب کی شاعری (")

۱۳۔ آئینہ بلاغت (")

۱۴۔ تاریخ ادب اُردو (")

مرزا محمد عسکری مرحوم نے دو کتابوں کی بدولت خصوصی شہرت حاصل کی ہے۔ ان دو کتابوں کے نام ہیں۔

۱۔ ادبی خطوط غالب ـــ جس پر گفتگو کا یہ موقعہ نہیں

۲۔ تاریخ ادب اُردو (باتصویر) اس کتاب پر مختصر گفتگو میرے موضوع کا اہم جزو ہے۔

کتاب کا موضوع :

کتاب کا موضوع، اُردو ادب کا تاریخی، ثقافتی، فنی اور ارتقائی تعارف و جائزہ ہے "ادب" میں نظم و نثر دونوں پر گفتگو اور بڑی حد تک جامع گفتگو ہے، "بڑی حد تک" اس لئے کہتا ہوں کہ ناول، ڈرامہ، طنز و مزاح، داستان، صحافت، تنقید، تاریخ میں سے بعض پر انتہائی تشنہ اور بعض پر صرف تذکرے کی حد تک کچھ لکھ دیا گیا ہے لیکن آج سے پچاس برس پہلے یہاں تک سوچنا، پڑھنا اور لکھنا بلا شبہ قابل صد تحسین تھا۔

کتاب کی اہمیت :

تاریخ ادب اُردو، پہلی کتاب ہے جس میں اُردو زبان و ادب کو جدید نقطہ نظر سے دیکھا، پڑھا، پرکھا اور پیش کیا گیا ہے

انیسویں صدی کے پہلے ربع میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے "گلشن بیخار" لکھا تو شہزادہ قادر بخش صابر نے گلستان سخن " سے جواب دیا۔ آزاد نے آب حیات "شایع کی تو عبدالحی نے گل رعنا"۔ ان تمام کتابوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ متقدمین کے نزدیک ادب کی شرط اور ادیب کے لئے دواوین کا مطالعہ ضروری تھا۔ مختلف دبستان سخن اور متعدد اسالیب بیان سمجھنے کے

یے شعرا کا کلام پڑھتے اور پسندیدہ اشعار بیاضوں پر لکھ لیتے تھے۔ ان کا مقصد اسلوب شعر گوئی سمجھنا ہوتا تھا۔ وہ شعر فہمی پر زور دیتے تھے۔ زبان و بیان کے پرکھنے میں زیادہ زور ذوق پر تھا۔ فن کی تجدید، فنی شعور کا تجزیہ، فن کار اور فن کا رشتہ، نفسیات و تاریخ کے تاثرات کی نشان دہی، زندگی اور ادب کے رشتے اس وقت تک موضوع بحث نہ تھے۔ مصطفٰے خاں شیفتہ کے تذکرہ کو آج بھی بڑی اہمیت اور اُن کی رائے کو شعوری تنقید سمجھا جاتا ہے۔ لیکن خود ان کی زبان "گلشن بےخار" ــــ "بیاضے جمع آمد و روشن تراز سپیدۂ صبح صادق" ــــ ایک رات کو دوستوں کا مجمع تھا کہ "ہمانا باتمثال امر یکے از احبائے روحانی کہ آرزوئے جان و جان آرزو ست و محبتش با جان برشتہ اندر گفت چہ شود اگر بیاضی جمع شود مشتمل بر ذکر اسلاف کبار و اخلاف سعادت آثار" ــــ

خلاصہ یہ کہ ــــ دوست عزیز کی فرمائش پہ بیاض ــــ یا مجموعۂ انتخاب اشعار ــــ مرتب کرتے ہیں تاکہ گزشتہ شاعروں کا ذکر اور زندہ و معاصر شعرا کی تحریریں محفوظ ہو جائیں

ابیاض و انتخاب دیوان میں شاعر کی سوانح عمری اور تنقید کا خصوصی خیال کیسے آتا، مگر اپنے تاثرات لکھنے میں ہر انسان کی طرح کچھ اونچ نیچ ہوئی اور ہر تنقید پڑھنے والے کی طرح سے ایک گروہ کی اس سے دل آزاری ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح کتاب کے جواب میں کتاب لکھی گئی۔ نظیر و مومن کا تو بہانہ تھا، وقت آچکا تھا کہ اُردو ادب بحث کا شکار اور تنقیدی تحریروں کی زد میں آتے، تاریخ و سوانح کو پھیلایا جائے۔ چنانچہ انتخاب اشعار کے بعد شاعروں کی درجہ بندی اور اختلاف مراتب کے وجوہ بیان ہونے کے بعد شاعروں کی ولادت و وفات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جانے لگی۔

گلستان سخن کا مفید و جدید مقدمہ، نغمۂ عندلیب کی زبان ادبی تاریخ میں انتہائی اہم نشانات راہ ہیں۔ کریم الدین، و سرسیّد کی کتابیں یعنی طبقات شعرائے ہند و آثار الصنادید نے تاریخی روشنی ضرور مہیا کی مگر "تذکرہ" بیاض انتخاب یا سم شاعر ہی رہا۔ حد یہ ہے کہ مولوی

عبدالحی نے گل رعنا کے دیباچے میں بھی بیاض ہی کو سبب تالیف قرار دے کر "تذکرۂ شعرائے اُردو موسوم بہ گل رعنا" مرتب کیا۔ موصوف کے الفاظ ہیں :

"انھیں کتابوں میں وہ بیاض بھی نکل آئی جو کسی زمانے میں ہر وقت پیش نظر رہتی تھی، دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مشہور شعرا کا کلام اس میں اتنا جمع ہو چکا ہے کہ اس کو ترتیب دے کر شایع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، اسی کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو ان کے مختصر حالات بھی لکھ دیے جائیں، تذکرے جمع کیے اور کام شروع کیا، بات میں بات نکلتی آئی اور وہ ایک خاصی کتاب بن گئی، جس کا نام "گل رعنا" میں نے رکھ دیا۔"

نانا کی بیاض پر "مختصر مختصر حالات" کا اضافہ کر کے تذکرۂ گل رعنا وجود میں آیا۔ حالانکہ اس سے پہلے آزاد نے "دیباچۂ آب حیات" میں واضح طور پر کہا تھا "اس ملک کی زباں ترقی کے قدم برابر آگے بڑھا رہی ہے"۔ انھوں نے تذکرہ لکھنے کے بجائے فن کاران شعر و سخن کی "رفتار، گفتار، اوضاع اطوار بلکہ اس زمانے کے سارے چال چلن پیش نظر تھے جس میں انھوں نے زندگی بسر کی اور کیا کیا سبب ہوئے کہ اس طرح بسر کی ...... گویا وہی زمانہ اور وہی اہل زمانہ موجود نہیں۔

آب حیات سے پہلے یہ تصور تصویر نہیں بن سکا تھا۔ آزاد نے سب سے پہلے علمی اصولوں کے مطابق موضوع کا جائزہ لیا اور باقاعدہ مآخذ، مصادر، تاریخ اور زندہ راویوں کے سہارے معاصر روایتوں کو قلمبند کیا، ان کے ہاتھوں فن کار کے سوانح اور اس کے فن کا رشتہ نظر آیا، ان کی بدولت شعرا پر رائے دینے کے لیے معین اصطلاحات کو قدرے پھیلاؤ حاصل ہوا۔ شعرا کی تاریخ ولادت و وفات، سوانح اور عہد، تاریخ اور فنی پس منظر کو خصوصی اہمیت عطا

کی گئی۔ آبِ حیات پہلی اور اب تک شاید آخری کتاب ہے، جس میں ادبی تذکرے اور شاعر کے احوال میں شعری روایات اور ثقافتی و تاریخی پس منظر کو یوں سمو دیا گیا ہے کہ قاری خود اس دور کا ایک رکن اور احوال و ادوار، ترقی و تنزل فن و فنکار کے ساتھ ساتھ حرکت اور دوڑ میں شریک ہو جاتا ہے۔ نہ تاریخ کی خشکی سے ذہن پر بوجھ پڑتا ہے نہ حوالوں اور حاشیوں کے وزن سے نظر بھٹکتی ہے۔ مقدمے میں اُردو کی پیدائش کا حال پڑھتے ہی ذہن و دل کے تمام گوشے آزاد کے اشاروں پر آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ نظم و نثر، تاریخ و تنقید، ذوقِ سخن فہمی، نگاہِ انتخاب اور پسند و ناپسند کے معیار سامنے آتے جاتے ہیں اور قاری پوری توجّہ کے ساتھ آنکھوں دیکھا حال پڑھتا جاتا ہے۔ یہ بات کوشش کے بعد بھی اس جامعیت کے ساتھ پھر کسی کو کہتے نہ بن پڑی۔

اس کا سبب ایک تو یہ تھا کہ تمام مصنّف یا تو کتب خانہ نشین و کتب بین تھے۔ علم سفینہ کو سینے اور علم سینہ کو سفینے میں اَدلتے بدلتے رہتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کو افہام و تفہیم، سوجھ بوجھ، چھان بین، افادیت وغیرہ کے ایسے عملی تجربوں سے بھی دوچار ہونا پڑا، جس سے کسی کالج کے اُستاد کو مفر نہیں اور غیر اُستاد ان تجربوں کے مواقع مشکل ہی سے حاصل کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آبِ حیات کے چالیس برس بعد گلِ رعنا کی تالیف مکمل ہوئی۔ مگر اس میں افہام و ابلاغ، پھیلاؤ اور سلجھاؤ کی کمی موجود ہے۔

رام بابو سکسینہ کی کتاب بھی اسی زمانے میں منظرِ عام پر آئی۔ لیکن زبان و بیان کی طرح اس کا خاکہ بھی تمام ماسبق تالیفات سے جداگانہ ہے۔ سکسینہ، پروفیسر تو نہ تھے مگر تعلیمی اداروں کے معیار، ضروریات اور تاریخِ ادب کے مزاج سے آشنا تھے۔ انھوں نے یہ کتاب طالب علموں، استادوں اور فارغ التحصیل اُردو دوستوں کے لئے لکھی تھی۔ ان کے سامنے انگریزی ادب اور اس کی تاریخ تھی۔

مرزا محمد عسکری نے غیر زبان میں لکھی ہوئی کتاب کو جب خود اسی زبان میں لکھا تو ایسی

نکھری کہ اصل کے پڑھنے والے کم اور ترجمہ دیکھنے والے زیادہ ہو گئے۔ ترجمہ ہی نصاب میں داخل ہوا اور اسی کو حوالے میں استعمال کیا گیا۔

ترجمہ کے خصوصیات :

تاریخ ادب اُردو، زبان کے لحاظ سے لکھنوی دبستان کی سادہ نگاری کا کامیاب نمونہ ہے۔ مرزا صاحب چونکہ قادر الکلام مترجم ہیں۔ اُنھوں نے اب سے تقریباً سو برس پُرانے اصول تعلیم کے مطابق انگریزوں سے انگریزی اور مادری زبان سیکھی تھی۔ وہ خود اُستاد بھی رہ چکے تھے اور ترجمے کے مشکل ترین مراحل سے گزر چکے تھے۔ اس لیے سکسینہ کی کتاب ان کے لیے نہ مشکل تھی نہ غیر دلچسپ۔

اُنھوں نے اصل کے ساتھ ماٰخذ، اور مصادر کے ساتھ اپنے مشاہدات سے فائدہ اُٹھایا، دل چسپی و دل جمعی قدر دانی اور امید کامیابی نے اُنھیں سہارا دیا۔ نتیجہ میں یہ باتصویر کتاب ظہور پذیر ہوئی۔

ہم کتاب پڑھتے وقت یہ محسوس نہیں کرتے کہ کسی ترجمہ سے دو چار ہیں۔ بلکہ جملوں کی ساخت، عبارت کی روانی، مسائل و مطالب کا بیان، اس قدر موزوں ہے کہ جیسے براہِ راست تالیف سے مستفید ہو رہے ہیں۔

بہت سے سنین ولادت و وفات، بہت سے اشخاص و افراد، بہت سے آراء و خیالات بہت صحیح اور مضبوط ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ جس دَور میں لکھی گئی ہے۔ اس دور میں بلاشبہ اس سے زیادہ جامع کتاب کوئی نہ تھی اور اب بھی اتنی ضخیم کتاب دستیاب نہیں ہوئی۔ اس لیے ہر درجہ کا قاری اس سے مستفید ہونے پر مجبور رہے۔

ہو سکتا ہے کہ آپ زبان و بیان میں ادبی چاشنی نہ پائیں۔ ممکن ہے تحقیقی غلطیاں اور آراء فیصلے میں لغزشیں ہوں مگر ان باتوں سے کون سی کتاب خالی ہے! انسان غلطی کا پُتلا ہے مگر ایک وہ غلطی ہے جس کا سبب عمداً غفلت ہو، ایک وہ غلطی جو ظاہری اور شخصی امکان کی

حد سے باہر ہو۔ "تاریخ ادب اُردو" کی غلطیاں تعصب، جہالت اور زبردستی پر مبنی نہیں ہیں۔ تاریخ ادب اُردو کے فیصلے عموماً نقل در نقل یا دوسرے کی کہی بات کو دہرانے کے مترادف نہیں بلکہ اس میں مطالعہ و ذوق کی پوری نمایندگی پائی جاتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب:

"تاریخ ادب اُردو" کا یہ ایڈیشن قدیم نسخوں اور باقاعدہ تطبیق و تنقیح پر مبنی ہے۔ ہم نے حاشیوں میں غلطیوں پر بحث ضروری نہ سمجھی۔ اس لیے کہ جو وقت اور قوت غلطیوں کی نشاندہی پر صرف کی جائے اُسے کسی دوسرے تعمیری و تخلیقی کام کے لیے کیوں نہ مخصوص کیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو حلقہ اس کتاب کا مُطالعہ کرتا ہے، اس کا مقصود عموماً طالبعلمانہ استفادہ ہے۔ محقق کے لیے حاشیے کے مباحث ذیلی فائدہ تو رکھتے ہیں مگر یہ نہیں کہ اگر حاشیہ نہ ہو تو کتاب بےکار ہو جائے۔

ہاں یہ سنین ولادت و وفات یا اس جیسے چند ایسے نکتے جو کتاب میں کہیں کہیں اتفاقاً رہ گئے ہیں انھیں لکھ دیا ہے۔ یقین ہے کہ انشاء اللہ آیندہ ایڈیشن میں یہ کام اور زیادہ مکمل انداز میں پیش کیا جائے گا۔

بصورتِ موجودہ، کتاب کے تمام سابقہ محاسن، اس کی کتابت و طباعت کی تمام خوبیاں محفوظ رکھی گئی ہیں، تصویروں کی تیاری اور کتاب کی گٹ اپ بھی ایسی ہے کہ طالب علم اور اُستاد، محقق اور عام قاری یکساں مستفید ہو سکے۔

مرتضیٰ حسین، فاضل لکھنوی

۲۴ دسمبر ۱۹۶۵ء

فہرست تصاویر حصّۂ نظم

تصویر	صفحہ	تصویر	صفحہ	تصویر	صفحہ
مصنف	۵	مومن دہلوی	۳۶۰	تسلیم	۴۴۵
سر تیج بہادر سپرو	۲۰	غالب	۳۹۸	میر محبوب علی خاں	۴۵۴
مترجم	۲۴	میر مجروح	"	موجودہ نظام حیدرآباد	"
		مہر	۴۰۲	مہاراجہ سرکشن پرشاد	۴۵۸
خانخاناں	۵۹	ذکی	"	حالی	۴۹۵
آصف الدولہ	۳۰۵	طباطبائی	"	مولوی محمد اسمٰعیل	
واجد علی شاہ اختر	"	طالب	"	میرٹھی	[illegible]
میر انیس	۳۳۰	نواب یوسف علیخاں	۴۱۵	سرور جہاں آبادی	۴۹۸
میر مونس	"	نواب کلب علیخاں	"	نوبت رائے نظر	(ضمیمہ میں) ۲۰۹
عارف	۳۳۹	امیر مینائی	۴۲۵	اکبر الہ آبادی	۵۰۲
مجلس حیدرآباد	"	داغ دہلوی	"	شاد عظیم آبادی	"
تعشق	۳۴۲	بیان یزدانی	۴۳۴	مرزا جعفر علی خاں	
پیارے صاحب رشید	"	ڈاکٹر اقبال (ضمیمہ)	۲۴۱	اثر	۵۰۷
نظیر اکبرآبادی	۳۶۰	جلال	۴۴۵	حسرت موہانی	"

تمہید

(از مصنّف)

اس کتاب کی تصنیف کی اصلی غرض یہ ہے کہ ادب اُردو کی تدریجی ترقّی کا خاکہ زمانۂ قدیم سے لے کر زمانۂ حال تک کا مع مشہور شعراء اور نثاروں کے مختصر حالاتِ زندگی اور اُن کے کلام اور تصانیف پر ایک مختصر تنقید کے کھینچا جائے۔ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ ایک طبقہ کے تعلقات دوسرے طبقہ کے ساتھ اور ایک فرد کے تعلقات دوسرے فرد کے ساتھ اس میں وضاحت سے بیان کئے جائیں اور نیز مختلف تحریکوں اور طرزوں کی ابتدا اور ترقی اور زوال کے اسباب بتائے جائیں اور اُس دَور کے تاریخی حالات و واقعات بھی نظر انداز نہ کئے جائیں جس میں کہ وہ شعراء اور نثّار گزرے۔ یہ کتاب محض کسی زمانے کے واقعات کا ایک ذخیرہ نہیں بلکہ اُن خیالات اور خصوصیات کے دکھانے کی اس میں پوری کوشش کی گئی ہے جن کا اثر اُس زمانہ پر تھا۔ اس کی تصنیف میں میرے پیش نظر یہ رہا ہے کہ یہ زمانہ حال کے تنقیدی اصولوں کے مطابق بطور ٹکسٹ بُک تیار کی جائے تاکہ انگریزی داں جماعت بھی ادب اُردو سے کماحقہٗ واقف ہوجائے۔

مصنّف اپنی خامیوں سے بخوبی واقف ہے۔ تقریباً چار برس کا عرصہ گزرا کہ اُس نے باوجود اپنی سرکاری مشغولیتوں کے اس کتاب کو ختم کر دیا تھا مگر بعد کو کچھ ابواب میں ردّ و بدل کرنا پڑا تاکہ وہ زمانہ موجودہ کی تحقیق و تنقید کے مطابق ہوجائیں۔ یہی وجہ اُس ناہمواری کی ہے جو کتاب کے مختلف حصّوں میں پائی جاتی ہے۔

ابتدائی قصد تو یہ تھا کہ ادب اردو کی ایک پرائمر (ابتدائی کتاب) کالج کے طلبا اور عام پبلک کے فائدے کے لئے تیار کی جائے اسی وجہ سے فٹ نوٹ اور حوالوں سے کتاب کو وزنی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ہر چند کہ حسب ضرورت اصل کتابوں کا بخوبی مطالعہ کر لیا تھا مگر بالآخر یہ اپنے مقررہ حجم سے بڑھ گئی جس قدر میں آگے بڑھتا گیا اور اس کی غرض بدلتی گئی حوالے دینے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی گئی۔ مگر بعد میں عملاً یہ کام مشکل معلوم ہوا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ یہ نقص آئندہ ایڈیشن میں دُور کر دیا جائے گا۔

اس بات کی بھی شکایت کا موقع ہو سکتا ہے کہ تمثیلی اقتباسات دوسری کتابوں سے نہیں دیئے گئے۔ میں نے یہ فروگذاشت جان بوجھ کر کی ہے اور سند میں پروفیسر سینٹسبری کی کتاب "مختصر تاریخ انگریزی علم ادب" کی مثال پیش کر سکتا ہوں جس کی طرز پر میں نے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مختصر اقتباسات میرے مفید مطلب نہ ہوتے اور طویل اقتباسات سے کتاب کا حجم بڑھ جاتا۔ اس کمی کو رفع کرنے کی یہ تدبیر مناسب معلوم ہوتی ہے کہ آئندہ کسی موقع پر ایک علیحدہ کتاب بطور ضمیمے کے مرتب کی جائے جس میں ہر دَور کے خاص خاص مصنفین کی کتابوں کے اقتباس مع اُن کے انگریزی ترجمے کے اور اگر ممکن ہوا تو منظوم ترجمے کے بالتفصیل دیئے جائیں۔ یہ نقص بھی ضرور رہ گیا ہے کہ ماخذ کے نام نہیں دیئے جا سکے۔ اس کی تلافی انشاء اللہ یوں ہو جائے گی کہ ایک علیحدہ رسالہ تنقیدی نوٹوں کے ساتھ جس کا نام "ماخذ ادب اُردو" ہوگا شائع کیا جائے گا۔

ایک اور اہم فروگذاشت قابل ذکر یہ ہے کہ دَور موجودہ کے اُردو شعراء کا اس کتاب میں ذکر نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا حال ایک علیحدہ کتاب میں قلمبند کیا گیا ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

اس کتاب کے متعلق میں پروفیسر سینٹسبری کا یہ مذاقیہ مگر نہایت صحیح قول ضرور نقل کروں گا "اگر کوئی یہ دعوے کرے کہ میں نے ایسی کتاب لکھی ہے جس میں کوئی غلطی

نہیں ہے تو وہ مسخرہ جھوٹا ہے اور جو شخص کسی دوسرے سے ایسی کتاب لکھنے کی اُمید رکھے جس میں کوئی غلطی نہ ہو وہ اس سے بڑھ کر لغو ہے"۔ مجھ کو اس کتاب میں بہت سی فروگزاشتوں کا اعتراف ہے جن کی اصلاح افسوس ہے کہ نہیں کی جا سکی۔

اب میں اپنی اس مختصر تالیف کو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ مجھ کو اپنی محنت اور کاوش کی پوری داد مل جائے گی اگر میں اس کے ذریعہ سے لوگوں کے دلوں میں اس ادب شریف یعنی ادبِ اُردو کا صحیح ذوق پیدا کردوں جو میری رائے میں ہندو مسلم اتحاد کا بہترین ذریعہ ہے اور ان کو شوق دلاؤں کہ وہ اس قصرِ عالی کو جس کی میں نے صرف بنیاد ڈالی ہے تکمیل تک پہنچا دیں۔

میں تہ دل سے ممنون ہوں (۱) ان تمام مصنفین کا جن کی کتابوں کو میں نے نہایت شوق سے پڑھا اور اُن سے فائدہ اُٹھایا مگر اس کا اعتراف متن میں نہ کر سکا (۲) ان تمام اصحاب کا جنھوں نے مجھ کو کتابیں پڑھنے کے لئے مرحمت فرمائیں اور میرے استفسارات کا جواب نہایت فراخدلی سے دیا (۳) اُن حضرات کا جنھوں نے مسودۂ کتاب پڑھا اور تصحیح پروف میں میری مدد کی (۴) اُن کا جنھوں نے میرا دل بڑھایا اور نیک صلاح سے اپنی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ مگر چونکہ میرے محسنوں کی فہرست طویل ہے اور ان میں سے بعض کا انتخاب کرنا ایک کو دوسرے پر بیجا ترجیح دینا ہے۔ لہذا میں اُن سب کا مجموعی حیثیت سے تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

رام بابو سکسینہ

از بریلی (یو۔پی)

تقریظ

(از عالیجناب فضیلت انتساب کے بیج بہادر سپرو صاحب ایم اے ال ال ڈی کے سی ایس آئی)

لکھنؤ یونیورسٹی کے جلسہ کانووکیشن کی تقریر میں میں نے اس بات پر اظہارِ افسوس کیا تھا کہ ہم لوگ زبانِ اُردو سے بے توجہی اور غفلت کر رہے ہیں۔ ہمارے صوبے کے اکثر تعلیم یافتہ نوجوان اپنی اُس ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے جو کہ اُن پر اُن کی زبان اور ادب کی ترقی کی نسبت عائد ہوتی ہے۔ افسوس ہے مگر صفائی سے کہنا پڑتا ہے کہ شمالی ہند کی دیسی زبانوں کو جس قدر ہمارے نام نہاد نیشنلزم (قوم پرستی) کے غلط مفہوم نے جو دراصل کمیونلزم (فرقہ بندی) کا مرادف ہے نقصان پہنچایا اتنا کسی اور چیز نے نہیں پہنچایا۔ ہمیں صوبے کے اکثر مقامات پر ایسے ہندو گریجوئیٹوں اور انڈر گریجوئیٹوں کو دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ ہندی کی ترقی کے لازمی طور پر یہ معنی ہیں کہ دلوں سے اس زبان اور ادب کی محبت اور خیال بالکل نکال دیا جائے جسمیں خود اُن کے بزرگ ابھی دو ہی ایک نسل کا زمانہ گزرا کہ کمال رکھتے تھے۔ اسی طرح ایسے

سر تیج بہادر سپرو کے - سی - ایس - ائی ایل - ایل - ڈی

مسلمانوں سے مل کر بھی نہایت صدمہ پہنچتا ہے جو ہندوؤں کی زبان اُردو سے بے توجہی اور بے پروائی کے توشاکی ہیں لیکن اپنا کوئی قابل تعریف کارنامہ اُس میدانِ ادب میں نہیں پیش کرسکتے جس کا محافظ خاص وہ اپنے تئیں سمجھتے ہیں۔ تعلیم و تربیت اور علمی مذاقوں کے اختلاف نے جو گذشتہ بیس پچیس سال کے عرصہ میں بہت بڑھ گیا ہے، فرقہ بندی کے مضر اثرات کو اور قوی کر دیا ہے جس سے سرچشمۂ اتحاد مسموم اور ایک دوسرے کے خیالات کو صحیح طور پر سمجھنا معدوم ہوتا جا رہا ہے۔

میں اس سے بے خبر نہیں ہوں کہ زمانۂ حال میں لوگوں کو ایک ادبی قسم کا اشتغال ضرور ہے مگر ہمارے اس قسم کے کاموں سے ہماری زندگی کتنی مالا مال ہوگی یا کہ وہ کام کتنے دیرپا ہوں گے۔ یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کا جواب صرف مرورِ ایام سے ملے گا۔ جس قدر نظمیں فی زمانا لکھی جاتی ہیں اُن کا زیادہ تر حصہ ایک منظوم نثر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اُن میں کوئی الہامی اثر مطلق نہیں پایا جاتا اور نہ کوئی اعلیٰ آیڈیل ہوتا ہے بلکہ بعض نظمیں تو میں نے ایسی دیکھیں جن پر "بدنام کنندۂ نکو نامے چند" کی مثال پوری طرح صادق آتی تھی۔ اور اُن کو ایک اعلیٰ درجے کی بدمذاقی کا نمونہ پایا۔ ہماری نثر کی بھی یہی حالت سمجھنا چاہیئے۔ چلتی ہوئی کتابیں اس صنف میں ہرگز ایسی نہیں ہوتیں جن سے ہمارے خیالات میں بلندی یا ہماری دلچسپیوں میں کوئی اضافہ ہو بلکہ وہی کمبخت پُرانے عشق و عاشقی کے قصے ہیں جن میں یا تو کسی عورت کی بے وفائی اور مکاری یا ادنیٰ درجہ کی رکیک سازشوں اور چالاکیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ میرے اس خیال میں تمام ادبارِ اردو بالکلیہ داخل نہیں ہیں۔ لہٰذا میں اس بات کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں کہ الحمدللہ ہم میں چند افراد ایسے ضرور ہیں جن کے ادبی کارنامے گو مقدار میں کم سہی مگر بلاشک نہایت اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں۔ شعرائے اُردو کی پوری تعداد کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہے مگر وہ جو اپنا نام صفحۂ ہستی پر چھوڑ جانے والے ہیں اُن کی تعداد فی الحقیقت بہت کم ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر

ہندوستان میں کسی مقام پر ادبِ اُردو کی قرار واقعی دیر یا اور مفید خدمت انجام دی جاتی ہے تو وہ حیدر آباد دکن ہے۔

انہیں اسباب سے یہ میرے لئے خاص طور پر قابلِ مسرت ہے کہ ہمارے اسی صوبہ کے ایک گزیجویٹ کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ اُن کو اتنا وقت ملا کہ باوجود اپنی سرکاری مصروفیتوں کے اُنھوں نے ایک کتاب زبان انگریزی میں زبان اور ادبِ اُردو کی تاریخ پر تیار کردی۔ مولانا آزاد کی مشہور و معروف کتاب "آبِ حیات" سے کون واقف نہیں لیکن وہ ضروریات زمانۂ حال کے مطابق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور کتابیں زمانۂ موجودہ میں بھی اسی مبحث پر بہت عمدہ تصنیف ہوئیں۔ مگر اُن کے مصنفین مجھے معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ اُن میں قوتِ امتیاز اور روشن خیالی کے ساتھ تنقید کی بھی کمی ہے۔ اس کتاب کے مسودہ کو میں نے خوشی کے ساتھ پڑھا تھا اور ہر چند کہ بعض باتوں میں مصنّف کی تجاویز سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر قابل مصنّف کی اس بارے میں ضرور داد دینا پڑتی ہے کہ کیسے مسلسل اور مربوط طریقہ سے اُنھوں نے زبان اور ادبِ اُردو کی ترقی اور نشو و نما کا حال قدیم زمانہ سے لے کر زمانۂ حال تک کا لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کتاب کے آئندہ ایڈیشنوں میں وہ خود اس بات کی ضرورت محسوس کریں کہ اپنی تجاویز پر نظر ثانی کریں مگر جو بات مجھے اُن میں نہایت اُمید افزا معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی رائے قائم کرنے میں آزاد اور اپنے اظہارِ خیال میں بیباک ہیں۔ مثلاً میں اس کتاب کے باب ۳ کو پیش کرتا ہوں اور بھی بہت سی مثالیں دیگر مقامات سے پیش کی جا سکتی ہیں مگر میں اسی پر اکتفا کروں گا مختصر یہ کہ کتاب نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے جس کے واسطے تمام ہی خواہانِ اُردو کو لائق مصنّف یعنی رام بابو سکسینہ صاحب کا احسان مند ہونا چاہیئے۔ یہ کتاب یقیناً اُن اصحاب کو پسند آئے گی اور میری رائے میں ضرور آنا چاہیئے جو اس بات کی

تحقیق چاہتے ہیں کہ زبان اُردو کس طرح عالم وجود میں آئی، مختلف اُستادوں کے ہاتھ سے اُس میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں اور ترقی کے مختلف اَدوار نے اس پر کیا کیا اثرات کیے۔ آخر میں مَیں یہ ضرور کہوں گا کہ سول سروس صوبہ کے حکام اِتنے خوش نصیب نہیں ہیں کہ ان کو اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں اتنا وقت مِل جائے کہ وہ اُس کو کسی اَدبی خدمت میں صرف کر سکیں۔ مگر رام بابو صاحب نے اس کلیہ کو توڑ دیا اور دُنیا کو دکھلا دیا کہ ڈپٹی کلکٹر ایک مصنف بھی ہو سکتا ہے اور قانون و انتظام کے فرائض کے ساتھ ساتھ ادبی فرائض کو بھی بخوبی انجام دے سکتا ہے۔

(ڈاکٹر سر) تیج بہادر سپرو

اِلتماسِ مُترجم

ادبِ اُردو تشنہ تھا کہ اُس کی قدیم تاریخ یعنی اُس کی ابتدا اُس کی نشو و نما اُس کی تدریجی ترقیاں اور وہ تغیرات جو اُس میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں ان سب چیزوں کے حالات کسی ایسے شخص کی بھی زبان سے سُنے جائیں جو اُن لوگوں سے بالکل مختلف ہو جنہوں نے اب سے پہلے اس قسم کے حالات و واقعات پر بہت کافی روشنی ڈالی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مضمون پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت خوب لکھا جا چکا ہے صدہا نہیں تو بیسیوں تذکرے ایسے موجود ہیں جن سے مذکورہ اُمور بہت وضاحت سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم تذکرہ نویسی کو تین دوروں پر تقسیم کریں تو قدما میں میر تقی اور میر حسن کے تذکرے ہمارے واسطے شمع ہدایت کا کام دیتے ہیں۔ متاخرین میں آبِ حیات اور جلوۂ خضر کو ہم لے سکتے ہیں جن سے ہم کو بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور ہو سکتی ہیں۔ اور اول الذکر تو باوجود سخت تنقیدات کے جو اس کی نسبت وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں جن سے بعض واقعات فی الحقیقت معرضِ شک میں ضرور پڑ گئے ہیں۔ پھر بھی اپنی صنف میں ایک لاجواب اور انتخاب کتاب ہے جس کی نظیر علی الخصوص اس زمانہ میں جبکہ ہم اپنی زبان کی طرف سے اتنی بے پروائی برتتے

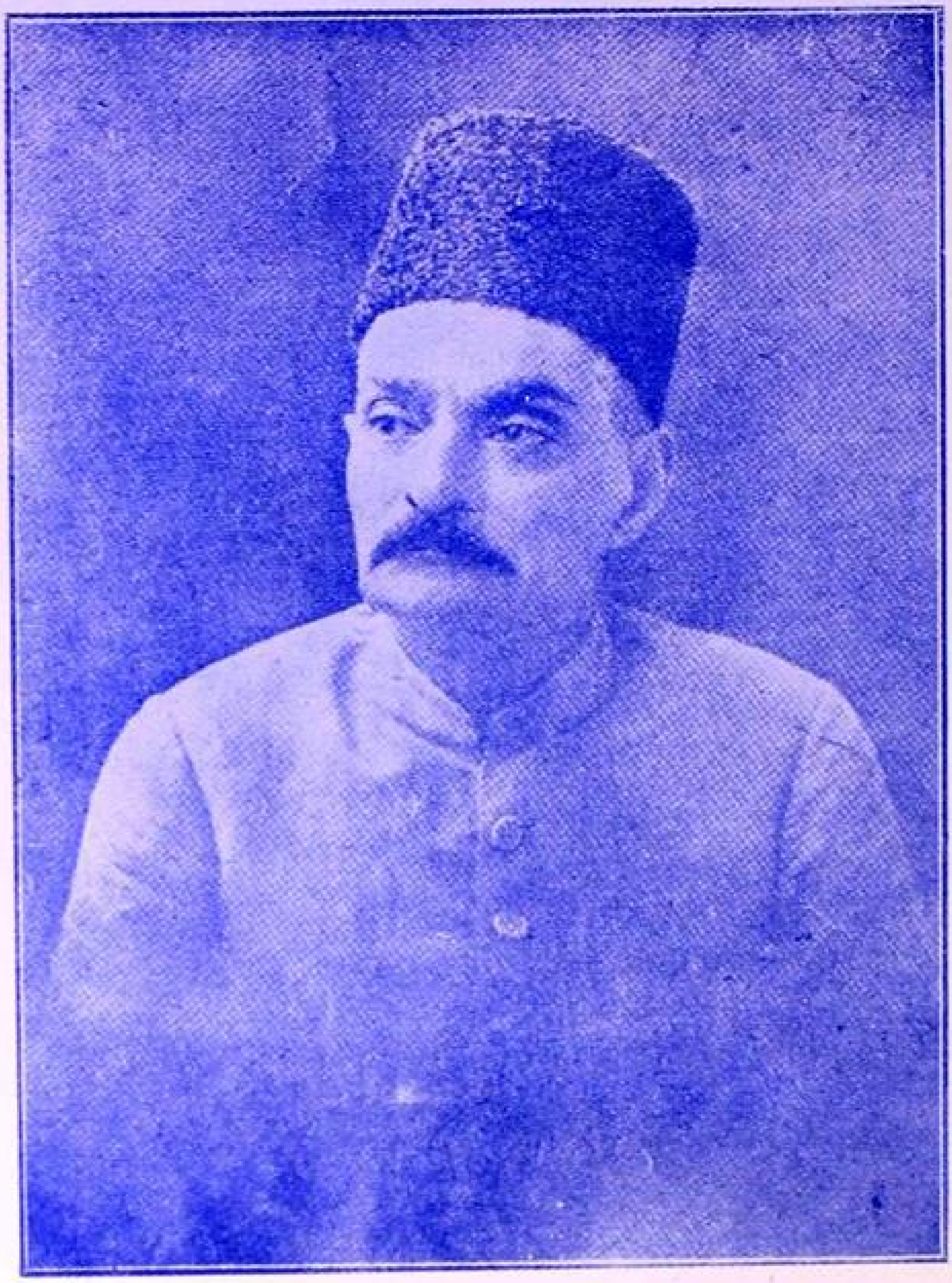

مرزا محمد عسکری بی — اے

ہیں محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ قدیم تذکرہ نویسوں نے بس اسی پر اکتفا کی ہے کہ اپنے معاصرین اور بعض قدیم شاعروں کے وہ حالات جو اُن کو بہ آسانی معلوم ہو سکے قلمبند کر دیئے اور کچھ نمونے اُن کے کلام کے پیش کر دیئے اور مختصر طور پر اپنی رائے اُن کے کلام کی نسبت ظاہر کر دی اور بس۔ زبان کی تدریجی ترقیوں کا حال اور وہ تغیرات جو اُن کے عہد تک زبان میں ہوئے تھے اس کے بیان کرنے کے وہ شایق تھے اور نہ ہی اس کو ضروری سمجھتے تھے۔ میری رائے میں اس کا سہرا مولانا آزاد کے سر ہے۔ کہ انھوں نے اُردو زبان کی ابتداء وارتقاء۔ اور اس کے مختلف ادوار کی تاریخ زمانہ حال کی روش کے مطابق سب سے پہلے قلمبند کی۔ مگر میری ناچیز رائے میں اتنی بات اُن سے ضرور رہ گئی کہ اس قسم کی کتاب میں اپنی عبارت کا طرزِ تحریر بجائے سادہ اور سائنٹیفک رکھنے کے انھوں نے نہایت رنگین اور پُر تصنّع رکھا۔ جیسا کہ اُن کی دیگر تصانیف کا ہے اور اس کا خیال نہیں رکھا کہ یہ تصنیف ایک خاص انداز کی اور ان کی دیگر تصانیف سے مختلف ہے۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ ان کی کتاب اس قدر دلچسپ ہو گئی کہ اگر ایک مرتبہ اُس کو شروع کیجئے تو پھر ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور ایک دفعہ کے پڑھ لینے کے بعد بھی طبیعت اس سے اُکتاتی نہیں۔ اور یہ بات گلستان سعدی کے سوا کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ مگر حق یہ ہے کہ جو اعتراضات فی زمانہ اس پر بیدردی سے کئے جا رہے ہیں یہ بھی اسی عبارت کی رنگینی کا نتیجہ ہے کہ کتاب کو پُر لطف بنانے کی غرض سے اور دل کو خوش کرنے کے لئے اظہار واقعات میں ایک مورخ کی نہیں بلکہ ایک افسانہ گو کی حیثیت اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر ایسے واقعات خلط ملط ہو گئے جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے یا ایسے پُر زور اور رنگین الفاظ استعمال کئے گئے جو اس موقع کے حسب حال نہ تھے۔ تنقید کی گہری نگاہیں جو اس کتاب پر بالفعل پڑ رہی ہیں اور اعتراضات

کی بوچھاڑ جو اس پر ہو رہی ہے میری رائے میں ایک نتیجۂ لازمی بلکہ خمیازہ اس غلطی کا سمجھنا چاہیے جو مصنف مبرور نے اپنی عبارت اور طرزِ ادا کے اختیار کرنے میں شروع میں کی تھی۔

تذکرہ نویسی کا تیسرا دور ہم کو اپنے ہی زمانے میں ملتا ہے جس میں لالہ سری رام صاحب کی مشہور و معروف تصنیف خمخانۂ جاوید ہے جس میں سلاستِ عبارت، روانیٔ بیان اور متانت کے ساتھ بے حد کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کے نامی گرامی شعرا کے ساتھ اُن لوگوں کا بھی تذکرہ کیا جائے جو گوشۂ گمنامی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس تذکرہ کی اب تک صرف چار جلدیں چھپی ہیں اور شین منقوطہ سے آگے نہیں بڑھا۔ اس کے ساتھ ہی تذکرہ گلِ رعنا مولوی حکیم عبدالحی صاحب مرحوم کا اور شعر الہند مولوی عبدالسلام ندوی اور سیر المصنفین جناب تنہا (نثاروں کا تذکرہ) بھی ہرگز نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ بلکہ ان تذکروں کے شائع ہونے سے بہت سی وہ باتیں جو اب تک پردۂ اخفا میں تھیں معرضِ ظہور میں آ گئیں۔

مگر غالباً غلط نہ ہو گا اگر ہم یہ کہیں کہ ان سب میں کوئی نہ کوئی مخصوص انداز رکھا گیا ہے اور انھیں وجوہات سے اُن تذکروں کو مکمل کہنا ایک حد تک غیر ذمہ دارانہ حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ تذکرۂ خمخانۂ جاوید میں صرف اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شاعر بھی چھوٹ نہ جائے۔ اسی طرح تذکرۂ گلِ رعنا کی بنیاد آزاد کی غلط بیانیوں پر ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ کسی طرح سے مکمل نہیں اور بہت سی اور باتوں اور بہت سے باکمالوں کو اس میں نظر انداز کر دیا گیا ہے یا نظر انداز ہو گئے ہیں۔ شعر الہند بحیثیت مجموعی شعرائے اردو کی ایک تاریخ ہے مگر ژولیدہ بیانی نے اس کو بھی حدودِ معین سے نکال دیا ہے۔ سیر المصنفین یا نثر نگاروں کا تذکرہ یہ مخصوص نثر کے لئے ہے۔ اگرچہ یہ بھی ادبِ اردو کے واسطے نہایت قابلِ قدر اور گراں بہا اضافے ہیں مگر سب میں ایک نہ ایک انفرادی خصوصیت موجود ہے۔

"ہسٹری آف اُردو لٹریچر" جناب رام بابو صاحب سکسینہ کے دل و دماغ کا نتیجہ ہے۔
جو اُنھوں نے انگریزی میں تصنیف فرمائی ہے اور اس سے زیادہ تر یہ غرض تھی کہ انگریزی
تعلیم یافتہ طبقہ اس سے مستفیض ہو۔ مگر اوّل سے آخر تک اس کتاب کے دیکھنے والے
جانتے ہیں کہ مصنف موصوف نے جس کاوش، جس کوشش، زورِ مطالعہ اور وسعتِ نظر
سے اس میں کام لیا ہے اور اسلوبِ بیان و تنقید وغیرہ میں جو صفائی مدنظر رکھی گئی ہے شعرا
اور نثاروں کے کلام کا توازن کر کے اُن پر جیسی صحیح بیباکانہ اور بے لاگ رائیں قائم کی ہیں
وہ اس کتاب کو ہر حیثیت سے منفرد صورت میں پیش کرتی ہیں۔ تلاش و تجسس کا یہ عالم ہے
کہ اُن واقعات کو اظہر من الشمس کر دیا ہے جن سے ابھی تک لوگ ناآشنا تھے۔ ایک ایک
لفظ سے ایک ضخیم دفتر کا فائدہ اُٹھایا ہے۔ اس کے ساتھ کہیں توازن و انصاف کو ہاتھ
سے جانے نہیں دیا۔ قدما اور متاخرین کو تو بالکل نظر انداز سمجھئے زمانہ حال میں جس قدر کتابیں
زبان اُردو کی تحقیق یا اُس کی نظم و نثر کے متعلق یا بطور تذکرہ وغیرہ کے نکلتی ہیں ان کے مصنفین
زبان انگریزی سے ملاحقہ واقفیت تقریباً پندرہ بیس فیصدی سے زیادہ نہیں رکھتے جس
کا نتیجہ یہ ہے کہ جو طریقہ تحقیق و تدقیق (ریسرچ) اور علی الخصوص ترتیب مضامین کا مطبوعات
یورپ میں اختیار کیا جاتا ہے اس سے ہماری اکثر ادبی تصانیف بالکل خالی ہوتی ہیں۔ اور
شاید اسی وجہ سے وہ پُرانے رنگ کی کتابیں جن میں فہرست مضامین و انڈکس تک کا پتہ نہیں
ہوتا موجودہ انگریزی داں طبقہ کو مطلق پسند نہیں آتیں اور اُن کی آنکھیں انھیں باتوں کو ڈھونڈتی
ہیں جو زبان انگریزی اور دیگر یورپین زبانوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اور جن سے اور کچھ
نہیں تو کتاب کی سہولت اور دلچسپی میں ضرور ترقی ہو جاتی ہے اور پڑھنے والے کا بہت
سا ضروری وقت فضول اور غیر ضروری باتوں سے بچ جاتا ہے۔ فاضل مصنف نے اصل
کتاب کی ترتیب میں اسی روش کا خیال رکھا ہے جو ادبِ انگریزی کے مشہور مصنفین پروفیسر
سینٹس بری اور گاس وغیرہ نے اپنی تصانیف میں اختیار کی ہے جس سے علاوہ جدتِ

ترتیب اور مخصوص اسلوب بیان کے یہ فائدہ بھی ہوا کہ کتاب اُن اصحاب کے لئے بہت مفید ہو گئی جنھوں نے بی، اے یا ایم، اے کی ڈگری یا آئی، سی، ایس کے واسطے ادب اُردو لیا ہو۔ جس قدر سوالات کہ امتحان مذکور میں پوچھے جا سکتے ہیں وہ سب اس کتاب کے مطالعہ سے بخوبی اور بآسانی حل ہو سکتے ہیں اور ترتیب مضامین خود سوالات بنانے میں بھی بہت معین ہوگی۔ مگر چونکہ اُردو داں طبقہ اس سے محروم تھا۔ نیز یہ کہ ایسی کتاب کو عام ہونا چاہیئے اور اس سے ہر شخص کو مستفیض ہونا چاہیئے اور موجودہ صورت میں وہ محض ایک فرقہ کے لئے مخصوص تھی۔ اس وجہ سے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کا ترجمہ کر دیا جائے۔ مگر ترجمہ جس کو حقیقی ترجمہ کہہ سکیں اس کے لئے میرے نزدیک اُسی مطالعہ، اُسی تعمق نظر، اُسی وسعت معلومات کی ضرورت ہے جو مصنف کی نظر اور عبارت میں ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں لانا اور پھر اُن کی وہی خوبیاں قائم رکھنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ مگر چونکہ اصل خیالات کا ماخذ اُردو ہے اور اُردو ہی کے جامہ میں اُس کو پھر منتقل کرنا تھا۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ باوجود ان مشکلات کے میں کچھ اس فرض سے عہدہ برآ ہوا ہوں۔ اس موقع پر میں اپنے قدیم عنایت فرما اور مخلص دوست رائے بہادر کنور بم بہادر شاہ صاحب بالقابہ کا ممنون ہوں کہ اُنھیں کے اصرار سے مجھ کو موقع ملا کہ اس کتاب کے ذریعہ سے کچھ ادب اُردو کی خدمت کر سکوں۔

ترجمہ کی مشکلات کے علاوہ بعض دوسری مشکلوں سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ بعض باتیں ایسی تھیں کہ وہ اگرچہ اوّل اُردو ہی میں تھیں مگر قدیم تذکرہ نویسوں نے اُس کو فارسی میں بیان کیا ہے۔ پھر اُنھیں کو اُردو میں بیان کیا اور پھر اُردو سے انگریزی میں بیان کی گئیں۔ اس لئے ان میں کچھ نہ کچھ تباین ہو گیا۔ اس میں مصنف ایک حد تک معذور تھے۔ مگر اُن کو اُردو میں دوبارہ پھر اسی حیثیت سے لانا مشکل تر تھا جس کی زیادہ سے کوشش کی گئی

ہے۔ اور جہاں انھیں مضامین ماخوذہ کا اعادہ کرنا پڑا ہے تو اُن کے الفاظ کو نیا جامہ پہنا دیا دیا گیا ہے۔ بعض واقعات ایسے تھے جنھیں شاید مصلحتاً اصل کتاب میں مجملاً بیان کیا گیا تھا۔ مگر اُردو میں اُن کی کسی قدر تفصیل ضروری تھی، اُن کو بھی اس میں بیان کیا گیا۔ اور اس میں تحقیق و تنقیح کما ینبغی کی گئی۔

چونکہ انگریزی میں نمونۂ کلام دینا کچھ زیادہ ضروری اور دقیع نہ تھا۔ اس لئے اصل کتاب میں اس طرف توجہ نہیں دی گئی لیکن اس میں سب کا نہیں مگر اکثر کا نمونۂ کلام دیا گیا ہے۔

کسی دوسری زبان میں اگر یہ بات ضروری نہ بھی ہو تب بھی اُردو کے لئے نقد و تبصرہ میں مسامحت اور ملائمت کی ضرورت ہے۔ اسی لئے اکثر اس بات کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ گلشن بیخار میں نظیر اکبر آبادی پر کوئی بڑا اعتراض نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ مصنف نے اپنی رائے کو بے لوث ظاہر کر دیا تھا۔ اسی پر قطب الدین باطن کا پورا تذکرہ لکھا گیا جس میں وہ سب اساتذۂ دہلی معرض تحقیر میں لائے گئے جنھیں مصنف گلشن بیخار (یعنی مصطفےٰ خاں شیفتہ) سے برائے نام بھی تعلق تھا۔ اسی طرح سے بُرہان قاطع دکھنی، اور قاطع برہان مرزا غالب، نے اپنے زمانہ میں جو بے پایاں طوفان برپا کیا تھا اس کی مہیب آوازیں آج تک کانوں میں آرہی ہیں۔

اکثر جگہ ترجمہ میں کوہ کندن و کاہ بر آوردن کا معاملہ پیش آیا ہے یعنی بعض معمولی اور ادنیٰ باتوں کے لئے پوری پوری کتابیں اور تاریخیں پڑھنی پڑی ہیں جس کے بعد کوئی صحیح نتیجہ نکالا جا سکا ہے یا کوئی رائے قائم کی ہے۔ اصل کتاب کے علاوہ مصنف صاحب بھی اکثر جگہ حذف و اضافہ کرتے رہے۔ اس لئے اس میں وہ بہت سی باتیں دوسری شکل میں نظر آئیں گی جو اصل کتاب میں تھیں۔ کہیں کہیں مترجم اور مصنف کی رائے میں اختلاف تھا جس کو فٹ نوٹ کے تحت میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ غرض کہ یہ ایک کوشش و کاوش ہے جو اربابِ نظر کی خدمت ہدیۂ ناز بنا کر پیش کی جاتی ہے۔

اور نگاہ منتظر طغرای قبول کی متمنی ہے۔

مجموعی حیثیت سے آج جب اس کتاب کو دیکھا جاتا ہے تو تنہا اس کے اندر وہ تمام چیزیں نظر آتی ہیں جو ایک ادیب کی معلومات کے لیئے سرمایۂ ناز ہیں یعنی زبان اُردو کی پیدائش ہندی بھاشا اور دوسری زبانوں سے اُس کا ارتباط و اتحاد۔ دوسری زبانوں کا اس سے سرنگوں ہونا اور مسلط جانا۔ نظم کے ادوار مختلفہ اُن کے مشہور و معروف افراد۔ اُن پر تنقیدیں۔ موجودہ اساتذہ کے حال۔ تمام اصناف نظم پر روشنی۔ اُن کی ابتدا و انتہا کے تاریخی نقطۂ نظر سے انکشافات۔ نثر اُردو کے مشہور مصنفین۔ اُس کی عہد بعہد کی ترقیاں۔ ان کی تصانیف پر نقد و تبصرہ مشہور نثاروں کا ذکر اور نثر کے اصناف وغیرہ پر بسیط رائیں غرضکہ سبھی کچھ ان اوراق پریشاں میں موجود ہے۔ اُردوئے جدید کی جو روش بعض ناعاقبت اندیشوں نے نکالی ہے اصولی طریقہ پر خواہ اس کا کوئی بھی موجد اور ذمہ دار ہو، مگر موجودہ صورت اس بات کی معین معلوم ہوتی ہے کہ وہ سلاست، شیرینی، روانی بیان کا خاتمہ کر کے چند ہی روز میں زبان کو ایک خارزار بنا دے گی۔ میں نے اس بات کی خصوصیت سے کوشش کی ہے کہ استعارات و تشبیہات اغراق و غلو سے مطلب کا خاتمہ ہو جائے اور نہ ہی وہ اس قدر دشوار ہو جائے کہ قدم قدم پر لغت دیکھنا پڑے۔ بلکہ عبارت سلیس اور سادہ رہے اور کہیں سے گنجلک نہ ہو۔

کتاب کا فائدہ اور دلچسپی بڑھانے کے لیئے اس کے آخر میں ایک مفصل انڈکس شامل کیا گیا ہے تاکہ ہر اس چیز کو جس میں اُس کا ذکر ہے بہ آسانی ڈھونڈھ سکیں۔

ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بعض مشہور شعرا اور نثاروں کی تصاویر بھی دے دی گئی ہیں جس سے کتاب کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ ہر چند کہ یہ ضروری نہیں کہ تصاویر کے شمول سے کسی کتاب کی اصلی قدر و قیمت میں کوئی معتدبہ اضافہ ہو۔ مگر جبکہ فی زمانہ دوسری کتابوں کے ادبی تذکرے اور انسائیکلوپیڈیا اپنے مشاہیر کی تصویروں سے خالی نہیں ہوتے تو ہم کو بھی مناسب معلوم ہوا کہ جس طرح ہم اپنے ادبی پیشواؤں کے روحانی اور باطنی فیوض

سے اپنے دل و دماغ کو مسرور و منور کرتے ہیں اسی طرح اُن کے خد و خال اور ظاہری جمال سے اپنی آنکھوں کو بھی روشن کریں۔ جی چاہتا تھا کہ تمام مشہور باکمالوں کی تصاویر دی جائیں مگر افسوس ہے کہ قدما کی تصویریں دستیاب نہیں ہوئیں اور جو ایک آدھ ملی بھی اُس کا بھی اعتبار نہیں۔ علی الخصوص سوداؔ کی تصویر جو ابھی تھوڑا عرصہ ہوا زمانہ میں شائع ہوئی تھی اور اس کتاب میں بھی اُسی سے لی گئی ہے، نہایت بھدّی اور بھونڈی تصویر ہے اور ہرگز دل نہیں مانتا کہ یہ مرزا رفیع سوداؔ کی شبیہ ہوگی۔ بہر طور جس قدر عمدہ اور معتبر تصاویر بہم پہنچ سکیں اس کتاب میں دی گئیں اور اُس کے واسطے ہم اپنے مکرم و محترم دوست منشی دیانرائن صاحب نگم کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے بعض تصاویر کے بلاک فراہم کیے اور خود مصنّف صاحب اور مولوی عبد الباری صاحب آسیؔ کے بھی شکر گزار ہیں جن کی کوشش سے بعض دیگر تصاویر دستیاب ہوئیں۔ اول الذکر نے ایک بہت بڑا ذخیرہ تصاویر کا بھیج دیا جس میں اکثر کام آئیں۔

آخر میں بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں بعض حضرات کا جن سے اس کتاب کی تیاری میں بہت کچھ مدد ملی دلی شکریہ ادا کروں۔ سب سے پہلے میں اپنے مددگار اور دوست مولوی عبد الباری آسیؔ کا نام اس فہرست میں لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنھوں نے مجھ کو اس کی تکمیل و تیاری میں بڑی مدد دی۔ مجھ میں ایک سخت عیب ہے کہ اپنے ہاتھ سے لکھنے سے قاصر ہوں بلکہ اپنے ڈکٹیشن سے کسی دوسرے شخص سے لکھواتا جاتا ہوں۔ یہ کتاب تمام و کمال مولوی صاحب موصوف کی اعانتِ قلمی کا نتیجہ ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اُن کا سا کاتب مجھے نہ ملتا تو اس کا اتمام و اختتام دشوار تھا۔

مولوی جعفر علی صاحب مصحح مطبع کا بھی متشکر ہوں کہ اُنھوں نے نہایت مستعدی اور ہوشیاری سے میرے ساتھ پروف پڑھے اور سپرنٹنڈنٹ مطبع یعنی بابو کیسری داس صاحب

سیٹھ کا بھی شکریہ میں نہیں بھول سکتا جنھوں نے اس کتاب کی طباعت واشاعت میں دلچسپی لے کر کافی مدد دی ۔

مرزا محمد عسکری

لکھنؤ ۔ ۱۵ ر فروری ۱۹۲۹ء

باب ۱

زبانِ اُردو اور اُس کی اصل

اُردو سے کیا مُراد ہے عام طور پر لوگ اُردو کو فارسی کی ایک شاخ خیال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ اس کی ابتدا مسلمان حملہ آوروں کی فوج میں اور مسلمان سلاطین ہند کی دارالسلطنتوں میں پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اُردو کے فارسی نژاد ہونے کی غلطی عام لوگوں کو تو اس وجہ سے بھی محسوس ہوتی ہے کہ اس میں فارسی لفظ بکثرت ہیں اور اس کی شاعری کی بحریں اور اس کا رسم الخط بھی خل فارسی کے ہے۔ اسی غلطی کی بنا پر عام لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے بمقابلہ ہندی کے جو ہندوؤں کی مخصوص زبان سمجھی جاتی ہے۔ اور اسی غلط فہمی سے ایک عرصہ دراز سے سخت مقابلہ اور مباحثہ درمیان معاونینِ اُردو اور طرفدارانِ ہندی کے ان دونوں زبانوں کی عمدگی اور خوبی اور نیز ان کی استعداد قبولیتِ عامہ کی نسبت چلا آتا ہے اور اس بحث میں لوگ ایک معمولی بات یعنی زبانِ اُردو کی اصل کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زبانِ اُردو اس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی

تھی اور جس کا تعلق شورسینی پراکرت سے بلاواسطہ تھا۔ یہ بھاشا جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہے زبان اُردو کی اصل اور ماں سمجھی جا سکتی ہے۔

گو کہ "اُردو" کا نام اس زبان کو ایک عرصۂ دراز کے بعد دیا گیا۔ زبان اُردو کی صرف نحو، محاورات میں کثرت سے ہندی الفاظ کا اس میں استعمال ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اُس کی ابتدا ہندی سے ہوئی اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی زبان عام بن گئی جس کی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی جو اس زبان کا ابتدائی مرکز تھا مسلمان حملہ آوروں اور بادشاہوں کی جائے ورود اور اُن کا دارالسلطنت بنا ہوا تھا۔ پس یہ خیال کرنا، جیسا کہ میرامّن اور بعض اور قدیم اُردو نثّاروں کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے جس میں وہ سب زبانیں داخل ہیں جو کسی زمانے میں دلّی کے بازاروں میں بولی جاتی تھیں صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ لشکر یا بازار سے اس زبان کی نشوونما اور ترقّی کو اس قدر تعلق ضرور تھا کہ اس کا نام ہی "اُردو" ہو گیا جس کو زبان تُرکی میں "لشکر" کہتے ہیں۔ زبان میں ہنوز پختگی نہیں آئی تھی اور وہ بحالتِ تشکیل تھی اور اجنبی الفاظ اور جملوں کو قبول کر لینے کا مادہ اُس میں بہت تھا جیسا کہ اب بھی ہے۔

اِس زمانے میں انگریزی تقلید میں اُردو کو "ہندوستانی" کہتے ہیں۔ مگر یہ لفظ ہماری رائے میں گو باعتبار لفظ صحیح ہو مگر حقیقت میں صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس لفظ میں مشرقی ہندی اور مغربی ہندی اور راجستانی سب شامل ہیں۔ اسی طرح ہمارے خیال میں برج بھاشا کو اُردو کا ماخذ قرار دینا جو کہ مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے، اور جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس وجہ سے کہ برج بھاشا جو متھرا اور اُس کے جوانب میں بولی جاتی تھی گو اس بھاشا سے جو اطراف دہلی میں بولی جاتی تھی بہت مشابہت رکھتی ہے مگر پراکرت کی ایک علیحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ یعنی دلّی بھاشا ہمارے خیال میں زبان اُردو کی اصل سمجھی جا سکتی ہے۔

اُردو اور ہندی کا تعلق جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اُردو کا اصلی ماخذ وہ زبان ہے جو دلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جس کو مغربی ہندی کی ایک شاخ سمجھنا چاہیئے اور مغربی ہندی اپنی جگہ پر شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی اور مندرجہ ذیل زبانیں اُس کی شاخیں ہیں۔ یعنی بنگارو، برج بھاشا، قنوجی، اور وہ زبان جو دہلی کے اطراف میں مروج تھی مگر زمانہ حال کی اعلیٰ ہندی اُردو سے پیدا ہوئی اس طرح کہ فارسی الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت لفظ رکھ دیئے گئے۔ اسی اعلیٰ ہندی میں نثر کی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں کہ مصنفین نے سنسکرت کے بڑے بڑے الفاظ استعمال کئے ہیں مگر سچ پوچھئے تو اُردو اور ہندی اپنے ماخذ اور نیز اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہیں اور ان دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اگر کچھ ہے بھی تو نشو و نما اور ترقی کے طریقے میں ہے۔ اُردو چونکہ مسلمانوں کے سایۂ عاطفت میں پلی اس لیئے اس میں فارسی الفاظ کی کثرت ہو گئی۔ برخلاف ہندی کے کہ جو اپنے اصلی ماخذ یعنی سنسکرت کی طرف عود کر گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانے کی ادبی اُردو اور ادبی ہندی میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا یعنی اوّل الذکر میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہے اور آخر الذکر غیر مانوس سنسکرت الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔

زبان اور ادب اُردو فارسی کا احسان مند ہے شروع میں زبان نہایت سادہ اور بے تکلف تھی اور عوام الناس کی معمولی ضروریات کے پورا کرنے کے واسطے بالکل کافی تھی۔ جوں جوں اُس میں ترقی ہوتی گئی اور وہ ایک ادبی زبان بنتی گئی اسی قدر اس میں فارسی اور عربی اور ترکی الفاظ شامل ہوتے گئے۔ فارسی الفاظ سننے میں بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اس وجہ سے مصنفین نے اپنی کتابوں میں جدت کی چاشنی دینے کے لیئے ان کو بے تکلف استعمال کرنا شروع کیا اور اس طرح فارسی ترکیبیں جو اصلی زبان سے بالکل اجنبی تھیں اور اس کے ساتھ میل نہیں کھاتی تھیں زبان میں داخل ہونے لگیں اسی

کے ساتھ فارسی رسم الخط بھی کچھ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ ہندی کی جگہ پر رائج ہو چلا اس وجہ سے کہ فارسی الفاظ فارسی خط میں بہ نسبت ہندی کے زیادہ آسانی سے اور صحت کے ساتھ لکھے جا سکتے تھے۔ اُردو شاعری پر بھی فارسی کا بڑا اثر پڑا اور وہ بھی فارسی شاعری کے قدم بقدم چلنے لگی۔ فارسی بحریں استعمال ہونے لگیں۔ ان کے علاوہ مضامین، طرزِ بیان، تخئیل، تلمیحات، خاص خاص محاورے اور مثلیں یہ سب کچھ فارسی زبان سے لیا گیا۔ اُردو کا علم عروض بھی فارسی عروض کے تابع اور زیر اثر ہو گیا۔ نثر کا بھی یہی حال تھا وہی عبارت کی رنگینی، الفاظ کا توازن، اور قافیہ بندی جو قدیم فارسی نثر کی جان تھی اُردو میں اُن کی پوری نقل کی جاتی تھی۔ الغرض زبانِ فارسی اُردو پر اس قدر حاوی اور غالب ہو گئی کہ دونوں ایک ہو گئیں، اظہارِ خیالات، مضامین اور طرزِ ادا میں فارسی اُردو پر اتنی غالب ہو گئی کہ اُردو کی ابتدائی شان اس سے بالکل غائب ہو گئی یہاں تک کہ اکثر لوگوں نے اُردو کی صرف و نحو کی کتابیں تک فارسی کے طرز پر لکھنا شروع کر دیں۔

اُردو میں فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی کثرت کے اسباب

(۱) مسلمان بحیثیت فاتح ہندوستان میں آئے اور قدرتاً زبانِ فارسی جو اُن کی مادری زبان تھی ہندوستان کی شاہی زبان بن گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی زبان مثل خادم کے دب کر اور مغلوب ہو کر اپنی مالکہ زبان فارسی کی خدمت کرنے لگی اور اسی کے طرزِ ادا اور محاورات وغیرہ کی تتبع اور ناقل ہو گئی۔

(۲) لوگوں کو نئی زبان سیکھنے کا شوق ہوا کرتا ہے اسی وجہ سے اُس وقت کے لوگ بھی پرانا طرز چھوڑنے اور نئے الفاظ اور جدید محاورات اختیار کرنے لگے۔ دیسی زبان میں جواب شرفا اور معزز شہری لوگوں سے چھوٹتی جاتی تھی اور اطراف شہر دیہات میں محدود ہو جاتی تھی۔ اب لوگوں کو کوئی مزا نہیں آتا تھا۔ لہذا جدت پسند طبیعتوں نے نئی زبان کی طرف رُخ کیا اور اُس کو نہایت شوق و ذوق اور انہماک

سے سیکھنے لگے۔ اسی وجہ سے قدیم ہندی شعرا کی تصانیف میں فارسی الفاظ کی کثرت تعجب خیز معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً چند کوی کی "پرتھی راج راسو" کو دیکھئے جو فارسی الفاظ سے بھری ہوئی ہے۔

(۳) دیسی زبان کی تنگی اور کم وسعتی بھی اس کا باعث ہوئی کہ نئے نئے الفاظ اور خیالات کے اظہار کے لئے اس کو اصلی لفظ اور طرز ادا جذب کر لینا پڑا۔ شروع میں دیسی زبان میں ایسے الفاظ بکثرت شامل تھے جو یا تو سنسکرت کے لفظ تھے یا انھیں سے بگڑ کر کسی دوسری صورت میں زبان پر چڑھ گئے تھے۔ جب مسلمان آئے تو زبان میں ایک بڑا انقلاب ہوا۔ مسلمان حملہ آور بادشاہ بن گئے اور دہلی اُن کا پایۂ تخت ہو گیا۔ اب وہ یہاں بسنے اور آباد ہونے کے لئے آئے نہ کہ جس طرح سابق میں وہ سال بسال آتے تھے اور مال غنیمت لے کر واپس چلے جاتے تھے۔

(۴) جب دہلی پایۂ تخت ہو گیا اور بادشاہ مع لاؤ لشکر کے وہاں رہنے لگا تو باشندوں اور غیر ملکی سپاہیوں میں میل جول اور ربط وضبط بڑھنے لگا۔ ایک دوسرے کی زبان اور خیالات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہوا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے الفاظ سیکھے اور اُن کو اپنے طرز پر استعمال کرے اور ظاہر ہے کہ فاتح کا اثر مفتوح پر زیادہ ہوا کرتا ہے۔ پس مفتوح قوم کی دیسی زبان یعنی ہندی پر فارسی کا بہت بڑا اثر پڑنے لگا۔ اسی وجہ سے اُردو میں فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت شامل ہو گئیں مگر ہندی نے اپنا اثر فارسی پر کم ڈالا۔ کیونکہ فارسی کے زبان داں اپنی زبان کو اس قسم کی آمیزش سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ یہ تغیر گو کہ ابتدا میں بہت غیر محسوس طریقے سے شروع ہوا تھا مگر جوں جوں مسلمانوں کی جڑ مضبوط ہوتی گئی اور وہ اس ملک میں آباد ہوتے گئے یہ زبانی تغیر برابر ترقی کرتا گیا اور یہ ترقی کی رفتار برابر قائم رہی یہاں تک کہ اکبر کے زمانہ میں ایک ہندو وزیر مال کی تاکید سے ایک حکم جاری کیا گیا کہ ہر سرکاری

ملازم کو فارسی سیکھنا ضروری ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان کی جڑ مضبوط ہوگئی اور اس کی عظمت و اہمیت بڑھ گئی۔

(۵) لوگ فارسی، عربی، ترکی الفاظ بڑے شوق سے بولنے لگے کیونکہ وہ سننے میں بڑے اچھے معلوم ہوتے تھے اور زوردار تھے اور ان کے بولنے والے خواہ مخواہ تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے، اس کے علاوہ فارسی دانی سے سرکاری ملازمتیں بھی آسانی سے ملتیں اور تقرب شاہی کا بھی یہ ایک اچھا ذریعہ تھا۔ ایسی حالتوں میں ابتداءً ہر زبان کا یہی حال ہوا کرتا ہے۔ جب قدیم اہل انگلستان کو نارمن لوگوں نے فتح کیا تو انگریزوں کی قدیم زبان "اینگلو سیکسن" کی بھی "نارمن فرینچ" کے ہاتھوں یہی حالت ہوئی تھی۔ بس جس طرح زبان انگریزی میں دو طرح کی زبانیں یا بولیاں پائی جاتی ہیں اسی صورت سے اردو کی بھی سمجھنی چاہیئے۔

اردو میں فارسی الفاظ کی کثرت کے کئی اسباب ہیں۔ مسلمان جب بحیثیت فاتح اس ملک میں آئے تو اپنے ساتھ بہت سی نئی چیزوں کے نام لائے جن کے مرادف سنسکرت یا دیسی بھاشا میں نہیں مل سکتے تھے، چونکہ ایسے نام کسی شرح یا گھوم پھیر سے بتائے نہیں جا سکتے تھے اس لیئے بجنسہٖ وہی فارسی الفاظ جن سے وہ چیز ظاہر ہوتی تھی زبان میں داخل کرنا پڑے۔ مثلاً ایسے نام جو لباس، طعام، مذہب اور بعض اسی قسم کی دوسری چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر چونکہ فارسی فاتح قوم کی زبان تھی اور ایک ایسی زبان تھی جو رزم و بزم، حسن و عشق کے افسانوں کے لیئے نہایت موزوں تھی۔ اس لیئے لوگ ایسے موقعوں پر فارسی الفاظ ہی بولنا پسند کرتے تھے۔ اس وجہ سے کہ وہ نہایت شیریں اور شاندار معلوم ہوتے تھے۔ ایسے پُرزور لفظوں کے سامنے پرانے دیسی الفاظ اور محاوروں کو خواہ مخواہ پیچھے ہٹنا پڑا اس لیئے کہ زمانہ ان کو پسند ہی نہیں کرتا تھا۔ زبان انگریزی کی بھی یہی داستان ہے۔ جب یونانی اور لاطینی علوم کا احیاء اور دوبارہ ترقی ہوئی تو اُس

زمانہ میں بھی موٹے موٹے عام الفاظ بولنے کا فیشن ہو گیا تھا۔ بہر حال جب فاتح اور مفتوح دونوں کا میل جول بڑھا تو ایک ایسی مخلوط زبان یا بولی کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ جو دونوں قوموں کے اچھی طرح سمجھ میں آ سکے اور چونکہ مفتوح اپنے مالکوں کو زیادہ خوش رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اُن کو خوش کرنے کے لئے اُن کی زبان سے زیادہ اخذ کیا بہ نسبت اس کے کہ ان کے حاکموں نے اُن کی زبان سے فائدہ اُٹھایا۔

اظہارِ قابلیت کے لیے بھی عربی فارسی الفاظ کثرت سے بولے جانے لگے۔ اردو ادب کی ابتدا شاعری سے ہوئی اور شاعری فارسی داں لوگوں کے ہاتھ میں ایک گویا کھلونا تھی جس کو وہ فارسی الفاظ و محاورات ہی کے لباس میں آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ زبان ہندی بہت کم جانتے تھے اور سنسکرت سے بالکل ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے یہ ہونہار بچہ اپنے حقیقی والدین سے جدا ہو کر اپنے مصنوعی والدین کی آغوش محبت میں تربیت پاتا رہا۔ جنھوں نے بلاشک اس کے ساتھ بہت کچھ کیا۔ اُن کی آغوش تربیت میں رہ کر اُردو کی نشو و نما بالکل فارسی کی روش پر ہوتی رہی۔ نہ صرف فارسی الفاظ کا ایک کافی ذخیرہ زبان میں جمع ہو گیا بلکہ فارسی ترکیبیں بھی کثرت سے شامل ہونے لگیں۔ مثلاً جار مجرور، صفت موصوف کی ترتیب بدل گئی۔ ایسے سیکڑوں فقرے جو حرف ربط "بہ" سے معمولاً شروع ہوتے ہیں اُردو میں بے تکلف استعمال ہونے لگے جو قواعد صرف و نحو کے بالکل خلاف تھا۔ آج بھی ہماری ادبی دیسی زبان میں اسی قسم کی فارسی ترکیبیں کثرت سے موجود ہیں۔ یہ ضرور ہوا کہ فارسی کے اثر سے اُردو ایک مستقل زبان کی شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے لیکن اس کا افسوس بھی ہوتا ہے کہ اصل زبان کی خوبیاں جن سے اُردو کی ابتدا ہوئی تھی بہت کچھ فنا ہو گئیں۔

یورپ کی زبانوں کا اُردو پر اثر فارسی زبان اور فارسی ادب کا تو اُردو پر بہت گہرا اثر پڑا ہی تھا لیکن پرتگالی اور انگریزی کا بھی کچھ کم اثر نہیں پڑا۔ البتہ زبان ڈچ اور فرنچ کے

جمائے ہوئے نقوش یا تو مٹ گئے یا ہیں بھی تو اس قدر دُھندلے کہ معلوم نہیں ہوتے۔
پرتگالی اور انگریزی دونوں نے اُردو لغات میں معتدبہ اضافہ کیا۔ سنہ ۱۵۴۰ء میں ہندوستان
کی مشہور بندرگاہوں پر اہل پرتگال قابض تھے اور ممالک مشرق میں گویا تجارت اُنھیں
کے ہاتھ میں تھی۔ اُن کی آبادیاں ہندوستان کے سواحل پر اور اندرون ملک میں بھی
تھیں۔ اُن کا تعلق ہندوستان سے عارضی نہ تھا۔ بلکہ وہ بحیثیت تاجر و حاکم اور مبلّغ کے
یہاں رہتے تھے، اُنھوں نے بہت ترقی کی تھی اور سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں
ان کی زبان ہندوستان کے ایک بڑے حصّے کی زبان عام ہوگئی تھی جو محض ہندوستانیوں
اور اہل یورپ کے درمیان تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہی نہ تھی بلکہ خود یورپ کے سوداگر
بھی آپس میں اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ اسی میں عیسائی پادری اپنے مذہب کی
اشاعت اور تبلیغ کرتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس کو بہت ایسے موقع ملے کہ وہ
اپنا اثر یہاں کی دیسی زبانوں پر ڈال سکی۔ سب سے زیادہ اثر بنگلہ زبان پر پڑا۔ اسی طرح
دراوڑی زبانیں مثلاً مرہٹی، اسامی، اور اڑیا بھی اس سے بہت کچھ متاثر ہوئیں۔ اردو بھی
اس کے لغات سے بہت متمتع ہوئی۔ یہ اثر اتفاق سے شمالی ہندوستان میں اُس
وقت پڑ رہا تھا جب دکھنی زبان جو پرتگالی کے اثر سے بسبب قربت کے بہت کچھ
متاثر ہوچکی تھی۔ اور نیز اسی طرح کی دوسری زبانیں اُردو پر اپنا اثر اچھی طرح ڈال رہی
تھیں۔ پرتگالی الفاظ دیسی زبانوں میں اصلی حالت پر باقی نہیں رہے بلکہ جس بگڑی
ہوئی شکل میں وہ ہندوستان میں بولے جاتے تھے اور ہندوستانی زبانیں ان کو قبول
کرسکتی تھیں اُسی ہیئت پر وہ اب بھی بکثرت موجود ہیں۔ اہل پرتگال نے محض اپنی زبان
کے الفاظ ہندوستانی زبانوں میں داخل نہیں کئے بلکہ بہت سے عربی، فارسی اور
ہندی الفاظ بھی اکثر یورپی زبانوں میں پہنچا دیئے۔ اس کے علاوہ اکثر عربی اور فارسی
لفظ پرتگالی سے مسخ ہوکر داخل ہوئے۔ مثلاً وہ الفاظ جو عربوں کے فتح اُندلس کے

زمانے میں اُن ممالک میں رائج ہو گئے تھے، پرتگالی الفاظ ہماری زبان میں بکثرت بولے جاتے ہیں مثلاً از قسم میوہ جات و اشیائے طعام، اچار، اناناس، انوس (قسم انبہ) بسکٹ، کاجو، پیمفرے (قسم مچھلی) پپیتا، تمباکو، ترنج، چاء، ساگو، گوبھی وغیرہ۔

از قسم سلمان آرایش و آلات و اسلحہ۔ الپین، الماری، ارغنوں، بجرا، بالٹی، بوتل، پیپا، پستول، پریگ، چابی، صابون، کوچ، کپتان، کاربین، کارتوس، میز، تولیہ، گارد وغیرہ۔

مذہبی الفاظ : پادری، گرجا، کراس وغیرہ۔

لباس میں : سایہ، قمیض، کاج، اسلیٹ وغیرہ۔

متفرق الفاظ : مثلاً انگریز، آیا، بمبا، پاگر (تنخواہ) پاؤ روٹی، چھاپہ، نیلام، ستری، کمرہ، روپیہ وغیرہ۔

اہل پرتگال ہی نے سب سے پہلے یورپ کی اکثر چیزوں کی اشاعت ہندوستان میں کی۔ لہٰذا اُن کے نام بھی اسی طرح رائج ہو گئے جس طرح کہ وہ لوگ اپنی زبان میں بولتے تھے مرزا غالب "شراب پرتگالی" کا اکثر ذکر کرتے ہیں۔ زبان انگریزی ایک زندہ اور حلقوں کی زبان ہے۔ اس نے اپنا اثر بہت کچھ ڈالا ہے اور ڈالتی رہے گی۔ انگریزی علم ادب نے اردو نظم و نثر کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا جس کا ذکر مفصل طور پر آئندہ کسی باب میں کیا جائے گا لیکن اثنا اس موقع پر ضرور بتا دینا چاہیئے کہ زبان انگریزی سے وہ الفاظ اردو میں داخل کیے جن کی جگہ پر کوئی دوسرا لفظ موجود نہ تھا اور وہ الفاظ اب زبان زد ہو گئے۔ ترجمہ کا بھی یہ نتیجہ ہوا کہ اکثر انگریزی الفاظ اس کی بدولت اُردو میں شامل ہو گئے۔ اُردو میں انگریزی الفاظ بکثرت داخل کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اسی طرح وہ انگریزی الفاظ جو بضرورت اُردو میں داخل اور مستحکم ہو گئے ہیں خارج کرنا بھی اندیشہ سے خالی نہیں ہے۔ اُردو کو مالدار ہونا چاہیئے اور ہر طرح کے الفاظ جو اس کی اصل سے

میل کھاتے ہوں اس میں ضرور داخل ہونے چاہئیں خواہ وہ انگریزی ہوں یا فارسی ہوں یا سنسکرت صرف یہی ایک طریقہ زبان اُردو کی تکمیل اور اس کی ترقی کا ہے اور اسی طرح وہ ایک اعلیٰ درجہ کی زبان اور ہندوستان کی عام زبان بن سکے گی۔

نثر اور نظم کی زبان ہر زبان میں نظم و نثر کی عبارت میں فرق ہوتا ہے۔ عبارت میں متانت اور سنجیدگی پیدا کرنے کے لئے اور نیز اس خیال سے کہ نثر اور نظم میں فرق معلوم ہو۔ نظم کی عبارت بہ نسبت نثر کے زیادہ شاندار ہوتی ہے، اسی وجہ سے وہ معمولی اور سادہ الفاظ اور معمولی بول چال کی ترکیبیں جو نثر میں عام طور پر پائی جاتی ہیں نظم میں ناجائز سمجھی جاتی ہیں، یہی وجہ تھی کہ فارسی محاورات اُردو نظم میں بکثرت شامل کر دیے گئے۔ اگر اُردو نثر کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالی جاتے تو معلوم ہوگا کہ شروع میں مقفیٰ عبارت بہت پسند کی جاتی تھی جس میں بیحد تکلف اور تصنّع ہوتا تھا۔ بہترین طرز وہ تھا جس میں ظہوری اور بیدل کی مرصّع نگاری کی تقلید کی جاتی تھی۔ ہماری پُرانی نثر نگاری کی مثال باعتبار عبارت کی رنگینی اور قافیہ بندی کے بعینہٖ وہی ہے جو انگلستان میں ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں انگریزی نثر کی تھی۔

مرزا غالب بلکہ سر سید احمد خاں کے زمانے سے ایک نیا دور شروع ہوا۔ جبکہ مغربی تعلیم کے اثر سے وہ پرانا رنگ بدل گیا اور مقفیٰ عبارت اور فارسی کی رنگینیت کی جگہ اب بے تکلف اور سادہ عبارت پسند کی جانے لگی۔ دور جدید میں نثر نگاری کی وہ شان باقی بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ کیونکہ عملی دنیا میں سیدھے سادے صاف اور زوردار الفاظ کی ضرورت ہے اب بھی فارسی الفاظ کی کثرت ضرور ہے لیکن اس سے عبارت کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ کسی قسم کا تصنّع پیدا ہوتا ہے۔ ہندی محاورات خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں اور پیچیدہ بندشوں سے گریز کیا جاتا ہے لیکن گلستانِ نظم کی آبپاشی اب بھی چشمہ فارسی ہی سے ہوتی ہے اور اس کا چمن اب بھی انھیں صنعتوں

مرکزی اردو کتب خانہ
اردو ہال - حیدر گوڑہ

حیدرآباد-۱

سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ ہندی الفاظ و محاورات استعمال ہوتے ہیں مگر کمی کے ساتھ اور صرف اسی وقت جب وہ فارسی الفاظ کے ساتھ میل کھاتے ہوں۔

نثر کی طرح نظم میں بھی کچھ تغیر ہو چلا ہے اور موجودہ رنگ میں بجائے پرانی لفاظی اور تصنّع کے سادگی اور بے تکلفی بہت پسند کی جاتی ہے لیکن باوجود اس کے اکثر اہل ادب اب بھی فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے دلدادہ ہیں۔ مگر ان کی کثرت اور جا و بیجا استعمال کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں نظم اور نثر کی عبارت اور انشا پردازی میں کوئی اصولی اور اہم اختلاف نہیں ہے۔

ادبی اُردو تقریری زبان تحریری زبان سے بالکل علیحدہ ہے۔ سادہ اور روزمرہ کے جملے جو ہر وقت زبان پر چڑھے ہوتے ہیں تحریر میں آنے کے وقت فارسی الفاظ سے بدل جاتے ہیں جس کی وجہ اُن کی جدت عظمت اور شانداری ہے۔ ابتدا میں بے شک زبان کا دائرہ بہت تنگ اور الفاظ کا ذخیرہ کم تھا اور وہ ایک مستقل زبان کہلانے کی مستحق نہ تھی کیونکہ اُس وقت تک اس میں بھونڈا پن تھا۔ اُس پر جِلا ہوئی تھی اور نہ ہی اتنی صلاحیت اس میں تھی کہ اس کے ذریعہ سے باریک اور نازک خیالات ادا ہو سکیں یا مختلف خیالات کا اظہار اچھی طرح کیا جا سکے۔ اُس میں ایک قسم کا لوچ اور الفاظ اور بندشوں کو جذب کرنے کا مادہ ضرور تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو جو الفاظ اور بندشیں اس کو ملتی گئیں وہ سب اس میں شامل ہوتی رہیں۔ رفتہ رفتہ زبان میں پختگی اور صفائی آتی گئی۔ دورِ اوّل کے شاعر ایسی زبان میں لکھتے تھے جس میں آدھی اُردو اور آدھی فارسی ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ اُردو کا عنصر غالب ہوتا گیا اور غالب نے مغلوب کو جذب کر لیا۔ فارسی الفاظ اور غیر مانوس فارسی ترکیبیں اس طرح اُردو میں گھل گئیں کہ اب وہ ہماری زبان کا جزو بن گئیں جن کو اب ہم نکال نہیں سکتے بعض حضرات جو اس زمانہ میں سنسکرت الفاظ کے دلدادہ ہیں وہ فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو زبان سے نکالنے کی کوشش میں ہیں۔ ہماری رائے میں یہ ایک فضول اور عبث کوشش

ہے کیونکہ یہی کثرت الفاظ جو اُردو کا مایۂ ناز ہیں اس کو اتنا لوچ دار اور مضبوط بنائے ہوئے ہیں کہ ہر ادبی کام اس کے ذریعہ سے نکل سکتا ہے۔

زبان اُردو کے قدیم نام قدیم انگریز مورخ جنھوں نے ہندوستان کے حالات لکھے ہیں اُردو کو لفظ "اندوستان" سے تعبیر کرتے تھے۔ شروع اٹھارھویں صدی کے مصنفوں نے زبان لاطینی میں اس کو "لنگوا اندوستانی کا" لکھا ہے۔ اس سے پہلے کے انگریز مورخین اس کو "مورز" کہتے تھے۔ جان گلکرسٹ نے ۱۷۸۷ء میں سب سے پہلے لفظ "ہندوستانی" زبان اُردو کے واسطے استعمال کیا اور جبھی سے یہ لفظ مروج ہو گیا۔ گو کہ اس کا پتہ بعض قدیم کتابوں میں ۱۶۱۶ء تک ملتا ہے جبکہ مسٹر ٹیری نے سب سے پہلے اس کو استعمال کیا تھا۔ "اُردوے معلّیٰ" کا معززہ خطاب شاہجہاں نے اس کو دیا جب کہ زبان ادبی خدمات انجام دینے کے قابل اچھی طرح ہو گئی تھی۔

لفظ "ریختہ" (یعنی وہ زبان جس میں دیسی الفاظ کے ساتھ فارسی الفاظ بھی بکثرت استعمال ہوں) بعد کے مصنفین نے اس غرض سے استعمال کیا کہ ادبی زبان و ریختہ اور بول چال کی زبان (اُردو) میں جو بازاروں اور جاہل فوجی سپاہیوں میں مروج تھی، فرق ہو جائے۔ لفظ ریختہ زبان کے متعلق اب بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ ابتدا میں نظم کے واسطے یہی لفظ استعمال کیا جاتا تھا اس وجہ سے کہ نثر کا رواج اُس زمانے میں بہت کم تھا۔ میر اور مصحفی تک کے زمانے میں اُردو کو بمقابلہ فارسی کے "ہندی" کہتے تھے جس سے ملک کی دیسی زبان مراد تھی۔

اُردو کا رسم الخط اُردو کے حروفِ تہجی بالکل وہی ہیں جو فارسی اور عربی کے ہیں البتہ بعض مخصوص حروف جن سے ہندوستانی زبان کی خاص خاص آوازیں ظاہر ہوتی ہیں جو فارسی اور عربی میں نہیں پائی جاتیں اضافہ کر دئے گئے ہیں مثلاً ٹ۔ ٹھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ ڑ۔ ڑھ۔ ان حروف کے لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ت۔ د۔ ر پر یا تو چھوٹی سی (ط) بنا دیتے ہیں یا چار نقطے دے دیتے ہیں۔

حصّۂ نظم

نظمِ اُردو

نظمِ اُردو کا عروض فارسی اور عربی کے عروض کا تابع ہے۔ لفظ کے کسی جزو پر زور دے کے پڑھنا جس کو انگریزی میں "ایکسینٹ" (Accent) کہتے ہیں اُردو میں نہیں ہے۔ البتہ قدیم یونانی اور رومی شاعری کی طرح اُردو میں بھی حروفِ علت کی آوازیں کھینچ کر پڑھی جاتی ہیں اور اس کو "اشباع" کہتے ہیں۔ نظمِ اُردو میں ردیف اور قافیہ بہت ضروری چیز ہے۔ مروّجہ بحریں اُنیس ۱۹ ہیں جن میں سے بعض عربی کے لئے مخصوص ہیں اور بعض میں اتنی ترمیم ہوگئی ہے اور ان کی صورت ایسی بدل گئی ہے کہ وہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔ وزن شعر کے لئے خاص ارکان جو قدما نے مقرر کر دیئے تھے، ان کی تکرار یا تغیر و تبدل سے مختلف بحریں قائم ہوگئی ہیں۔ یہ الفاظ عموماً عربی افعال کے مادے ہوتے ہیں اور اُنھیں سے اشعار کی تقطیع کی جاتی ہے اور بڑی یا چھوٹی بحریں اُنھیں سے قائم ہیں۔ تقطیع کا طریقہ یہ ہے کہ یا تو وہی رکن بار بار دہرایا جاتا ہے۔ مثلاً فعولن فعولن فعولن فعولن ۴ بار یا رکنوں میں ردّ و بدل ہوتا ہے جیسے مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن۔ تقطیع کے خاص قواعد مقرر ہیں۔ تحریر شدہ حروف کے ساتھ ان حرفوں کا

بھی شمار ہوتا ہے جو پڑھے جاتے ہیں گو تحریر میں نہیں آتے۔ وہ حروف جو پڑھے نہیں جاتے بلکہ محض تحریر میں آتے ہیں تقطیع میں شمار نہیں کئے جاتے۔ الف ممدودہ شروع لفظ میں جب آتا ہے دو حرف کے برابر اور اضافت جو کھینچ کے پڑھی جائے ایک حرف کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ اُن الفاظ کو جن سے تقطیع کی جاتی ہے "رکن" کہتے ہیں جس کے معنی ستون کے ہیں جس پر عمارت یا خیمہ قائم ہوتا ہے۔ پورے شعر کو "بیت" اور نصف شعر کو "مصرع" کہتے ہیں۔ مصرع کے لغوی معنی "دروازے کا ایک پٹ" ہیں۔ نظم کی مختلف قسمیں جو فارسی میں متداول ہیں اور جو اردو میں اختیار کی گئی ہیں حسب ذیل ہیں :-

غزل اور قصیدہ :- یہ سب سے زیادہ مشہور اصنافِ نظم ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف مضمون اور طول کا ہوتا ہے مگر بحر اور ردیف و قافیہ کی پابندی دونوں میں یکساں طور پر ہوتی ہے۔ غزل کا رنگ عموماً عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے اور تعداد اشعار عموماً ۵ سے ۱۲ تک گو کہ اس کی پابندی بہت کم کی جاتی ہے۔ قصیدہ میں عموماً کسی کی مدح یا ہجو ہوتی ہے اور نصیحت آمیز یا فلسفیانہ رنگ کا بھی ہو سکتا ہے۔ تعداد اشعار عموماً کم از کم ۲۵ اور زیادہ سے زیادہ ۱۷۰ تک، مگر اس کی بھی پابندی کون کر سکتا ہے۔

قطعہ :- جس کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں اور اُس کو قصیدے یا غزل کا ایک حصّہ سمجھنا چاہیئے۔ تعداد اشعار کم سے کم دو اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔ پہلے دو مصرعوں کے لئے ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں لیکن اشعار میں قافیہ کی پابندی لازمی ہے۔ قطعات میں اکثر پند و نصائح کے مضمون بیان کئے جاتے ہیں اور مطلب پورا ہو جاتا ہے۔

رُباعی :- اس میں دو شعر یا بیت ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو دو بیتی بھی کہتے ہیں۔ پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتے ہیں اور زیادہ تر ایک ہی سی بحروں میں لکھی جاتی ہے۔ رُباعی کے لئے خاص کسی مضمون کی تخصیص نہیں لیکن چوتھے مصرعہ کو عموماً مؤثر

CENTRAL URDU LIBRARY
URDU HALL HIMAYATNAGAR
HYDERABAD 500029

معنی خیز اور زوردار ہونا چاہیئے۔

مثنوی: یہ صنف رزم و بزم، حسن و عشق، قصے اور افسانہ نگاری کے لئے مخصوص ہے۔ اس میں ہر شعر کے دونوں مصرعوں کو ہم قافیہ ہونا چاہیئے۔ ردیف ہو یا نہ ہو تعداد محدود نہیں ہے۔ مثنوی کے لئے عموماً پانچ بحریں مروج ہیں مگر بعض کے نزدیک سات ہیں۔

مستزاد: اُس کو کہتے ہیں کہ جب ہر مصرع کے آخر میں کچھ زائد لفظ بڑھا لئے جائیں۔ یہ زائد لفظ اسی بحر میں ہوتے ہیں جو اصلی مصرع کے دو آخری رکنوں کی ہوتی ہے۔ مگر ان کا قافیہ کہیں علیحدہ بھی ہوتا ہے۔

ترجیع بند اور ترکیب بند: یہ بھی نظم کی قسمیں ہیں۔ ان میں بہت سے بند ہوتے ہیں اور ہر بند میں برابر یا بعض وقت مختلف تعداد ابیات کی ہوتی ہے جو ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ہر بند کے آخر میں ایک بیت ہوتا ہے جو اُوپر کے بند کو نیچے کے بند سے جُدا کرتا ہے اور قافیہ میں بھی اُن سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اگر ہر بند کے بعد ایک ہی بیت بار بار آئے تو ایسی نظم کو ترجیع بند کہتے ہیں، ورنہ اگر بیت بدلتا جائے تو ترکیب بند کہلاتی ہے۔ ترجیع بند یا ترکیب بند میں تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔

مربّع: چو مصرعی نظم کو کہتے ہیں جس میں سب مصرع ہم قافیہ ہوں۔

مخمّس: اس میں بجائے چار کے پانچ مصرع ہوتے ہیں، پانچویں مصرع کا قافیہ بدلا ہوتا ہے اور باقی صورت مربّع کی سی ہے۔

مسدّس: اس کی شکل بھی قریب قریب ایسی ہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے چار مصرع یا دو بیت ہم قافیہ اور باقی دو مصرع علیحدہ ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر اصناف سخن مسبّع وغیرہ بھی اسی طرز کے ہیں۔

واسوخت: نظم کی وہ قسم ہے جس میں عاشق اپنے معشوق کی بیوفائی، ظلم و ستم، رقیب کے ساتھ بیجا محبت اور جدائی کی مصیبت و تکلیف کی شکایتیں کرتا ہے۔ گویا معشوق کو دھمکاتا ہے کہ

اگر اس کا طرزِ تغافل اور ستم شعاریاں اسی طرح باقی رہیں تو پھر اس کے ہاتھ سے عنانِ صبر چھوٹ جائے گی اور وہ معشوق سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

تاریخ: نظم کی وہ قسم ہے جس میں کسی واقعہ کے اعداد سنہ حروف ابجد کے حساب سے نکالے جاتے ہیں۔

فرد: کسی تمام یا ناتمام غزل کے کسی ایک شعر کو کہہ سکتے ہیں جو کبھی مثالاً پیش کیا جاتا ہے۔

قصیدہ اور غزل کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر مقطع کہلاتا ہے۔ جس میں شاعر اپنا تخلص نظم کرتا ہے۔ نظم کی کتابوں میں اکثر پہلے حمد و نعت پھر بادشاہ یا ممدوح کی تعریف، اس کے بعد سببِ تالیف اور کچھ فخریہ اشعار، آخر میں مناجات و خاتمہ ہوتا ہے۔

مجموعۂ نظم کو کلیات کہتے ہیں جس کی ترتیب عموماً اس طور پر ہوتی ہے۔ قصائد۔ غزلیات، قطعات۔ رباعیات۔ مثنویات وغیرہ۔

نثر کی تین قسمیں ہیں :۔

(۱) عاری، جو بالکل سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے۔

(۲) مرجز، جس میں بحر ہوتی ہے مگر قافیہ نہیں ہوتا۔

(۳) مسجع جس میں بحر نہیں ہوتی مگر قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔

نثر مسجع کی بھی تین قسمیں ہوتی ہیں :۔

(۱) متوازی (۲) مطرف (۳) متوازن

نثر متوازی میں دو فقروں کے آخری الفاظ ہم وزن اور ہم قافیہ ہونے چاہئیں۔

مطرف میں آخری الفاظ کے ہم وزن اور ہم قافیہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

متوازن میں ہم وزن ہوتے ہیں مگر ہم قافیہ نہیں ہوتے۔

یہ تمام قسمیں اب متروک ہیں۔ کیونکہ انیسویں صدی کے آخر میں اس قسم کی مصنوعی

عبارت اور قافیہ پیمائی کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

"تذکرہ" میں شعراء کے سوانح و حالات مختصراً بیان کئے جاتے ہیں اور "گلدستہ" مجموعۂ نظم کا نام ہے۔

باب ۲

اُردو ادب کی ترقّی کے اِبتدائی دَور

نظم کا تقدّم نثر پر، اس کے وجوہ اور اس کا تعلق خاص اُردو ادب کے ساتھ

دنیا کے تمام ادبوں کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ شعر ایک زندہ قوت ہے جس کا وجود نثر سے بہت پیشتر معلوم ہوتا ہے۔ قافیہ پیمائی اور تُک بندی انسان میں ایک فطری چیز ہے۔ انسان کو پہلے جذبات کا حس ہوتا ہے۔ پھر وہ دماغ کو کام میں لاتا ہے اور سوچتا ہے۔ اسی وجہ سے ارتقائے تہذیبِ انسانی میں جو مظہر جذبات ہے نثر پر مقدم ہے جو فکر دماغی کا نتیجہ ہے۔ سب سے پہلے جبکہ فن تحریر کی ایجاد نہیں ہوئی تھی شعر ہی اپنے زبردست اثر سے دماغ میں محفوظ رہ سکتے تھے اور قوت حافظہ کی مدد سے مجمع میں سنانے (انشاد) کے قابل بھی شعر ہی ہو سکتے تھے۔ گو کہ ظاہراً نثر ہمارے اظہار خیالات اور گفتگو کا آسان ترین اور فطری ذریعہ معلوم ہوتی ہے مگر غور کرنے کے بعد اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف ضبط خیالات اور رسمی تحریروں کے واسطے موزوں ہے۔

زبانِ اُردو کی دیوی اپنے سازِ طرب سے آراستہ و پیراستہ اس طرح نمودار

ہوئی کہ اردو ادب جو دراصل فارسی کا مطیع اور ناقل ہے اس کو اپنے پیشرو کی تقلید نسبت نثر کے نظم میں زیادہ آسان اور دلچسپ معلوم ہوئی کیونکہ نقل و ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں نثر میں اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ فی الحقیقت نظم میں ہوتا ہے، اور چونکہ اردو اپنی ارتقائی منزلوں میں جبکہ اُس کا ادب ہنوز عالم طفلی میں تھا قوت تخئیل اور اظہار جذبات کے واسطے ایک زبردست سرمایہ الفاظ کا اپنے پاس محفوظ رکھتی تھی۔ لہذا جب اس کی پیدائش کا وقت آیا تو وہ اپنے اُستادوں کے دماغوں سے منروا[1] کی طرح دفعتہً نکل آئی اور اظہارِ خیالات و جذبات کے لئے چونکہ نثر عام طور پر نہیں پسند کی جاتی ہے۔ لہذا متقدمین اردو نگار بھی اس صنف کے استعمال سے شروع میں پرہیز کرتے رہے۔

سب سے پہلا اُردو شاعر
امیر خسرو دہلوی

زبانِ اُردو کی ترقی کا ابتدائی زمانہ اتنا دھندلا نظر آتا ہے کہ اس کے خط و خال صاف طور پر نمایاں نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے پہلا شاعر زبانِ اُردو کا اس دُھندلکے میں جو صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے وہ حضرت امیر خسرو دہلوی ہیں جن کی شہرت بحیثیت ایک فارسی شاعر کے کسی تعریف و توصیف کی محتاج نہیں۔ ان کا لقب اسی شاعری کی مناسبت سے "طوطی ہند" ہے۔ اُنھوں نے سب سے پہلے اُردو الفاظ ادبی اغراض سے استعمال کئے۔ اور سب سے پہلے اُردو میں شعر کہا۔ سب سے پہلی غزلِ اُردو بھی امیر خسرو ہی کی طرف منسوب ہے مگر اس کی ترکیب اس طرح ہے کہ اس کا ایک مصرع فارسی اور ایک اُردو ہے اور بحر فارسی ہے۔ اس کے علاوہ اکثر پہیلیاں، مکرنیاں، انملیاں، دو سخنے، دوہے وغیرہ جو آج تک مشہور ہیں ان کی طرف منسوب ہیں۔ بعض شعر ایسے بھی ہیں جس میں

---

[1] یہ یونانی دیوتاؤں کی طرف اشارہ ہے جس میں مرقوم ہے کہ منروا جو یونانیوں میں عقل و علم اور جنگ کی دیوی مانی جاتی تھی جیوپیٹر کے سر سے نہایت مکمل اور آراستہ دفعتہً پیدا ہوئی تھی۔

۷۰ ۲ ۲ ۲

ٹھیٹھ ہندی الفاظ جو بمشکل اُردو کہے جا سکتے ہیں سنسکرت بحروں میں بندھے ہیں، گو فارسی الفاظ بھی کہیں کہیں استعمال[1] ہوئے ہیں۔ حضرت امیر خسرو تیرھویں عیسوی میں ضلع ایٹہ (ممالک متحدہ آگرہ واودھ) میں پیدا ہوئے[2]۔ اور متعدد شاہان دہلی مثلاً غیاث الدین بلبن، معزالدین کیقباد وغیرہ کے درباروں میں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے۔ وہ مشہور صوفی ومرشد حضرت نظام الدین اولیا کے مرید ومحبوب خاص تھے جن سے ان کو اتنی محبت و عقیدت تھی کہ جب پیر کے انتقال کا حال سُنا تو اسی غم میں چند روز کے بعد ۱۳۲۵ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔ بلبن اُن کی بڑی قدر کرتا تھا اور اُن کے کلام کا دلدادہ تھا۔ امیر خسرو فن موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ اُنھوں نے سب سے پہلے فارسی بحور اُردو میں استعمال کیں اور اُن کی کتاب "خالق باری" جس کے مطلع کے ابتدائی الفاظ یہی دو لفظ "خالق" اور "باری" ہیں اب تک ہمارے یہاں ایک مشہور درسی کتاب سمجھی جاتی ہے جس کو بچے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ امیر خسرو کی شہرت زبان اُردو کے شاعر یا ادیب ہی کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ وہ اس کے موجد ومخترع کہے جا سکتے ہیں۔ اُن کے زمانے میں زبان میں روانی پیدا ہو چلی تھی مگر پختگی ہنوز نہیں آئی تھی اور متانت الفاظ بھی بہت محدود تھی۔ مختصر یہ کہ اُن کا دَور ابتدائی دَور ہے اور گو اس وقت زبان میں کوئی ترقی نہیں ہوئی مگر آیندہ ترقیوں کی داغ بیل اسی زمانہ میں پڑ گئی تھی۔

اُردو کی پختگی کا زمانہ

امیر خسرو کے زمانہ سے لے کر دکن کے شعرائے اُردو کے عہد تک بڑا فصل ہے مگر زبان نے گو اس طویل عرصہ میں جو تین صدیوں سے کم نہ تھا کوئی نمایاں ترقی نہیں کی۔ پھر بھی یہی مدت اس کے حقیقی نشو ونما اور مضبوطی کی کہی جا سکتی ہے۔

---

[1] فارسی میں ایک نئی صنعت ایجاد کی ہے جس کا نام ترجمۃ اللفظ رکھا ہے یعنی فارسی کا ترجمہ اردو میں کر دیا ہے۔ مثلاً "سودا اے رُخ تو کشت مارا"۔ کشت کے معنی اُردو میں مارا کہے ہیں۔

[2] مقام ولادت پٹیالی ضلع ایٹہ ہے اور سنہ ولادت ۶۰۵ھ ہے۔

زبان اب تک غیر منظم حالت میں تھی اور قوت، لوچ اور وسعت کی اس کو سخت ضرورت تھی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بلند انشا پردازی کی اغراض کے لئے اُس کے لغات میں معتدبہ اضافہ ہونا چاہیئے تھا۔ اسی وجہ سے مناسب فارسی الفاظ کو اس نے اپنے آغوشِ محبت میں بے تکلّف اور بڑے شوق سے جگہ دی۔ چنانچہ ملک محمد جائسی (سنہ ۱۵۴۰ء) کی پدماوت جو فارسی حروف میں تحریر ہوئی تھی کبیر (سنہ ۱۴۴۰ء لغایت ۱۵۱۸ء) کے بھجن اور بابا تلسی داس (سنہ ۱۵۵۰ء لغایت ۱۶۲۴ء) کی تصانیف میں ایسے الفاظ کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

زریں عہد اکبری زبان اُردو کی توسیع کے جو لوگ شائق تھے انھیں اس زبان کو مختلف طبقوں کے لوگوں تک پہنچانے اور اُس کو پھیلانے کے لئے دونوں قسموں کے الفاظ یعنی ملکی اور غیر ملکی کے استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کوشش کی رفتار عہد اکبری میں بہت تیز تھی، شہنشاہ اکبر کا دل چاہتا تھا کہ ملک کی مفتوح رعایا اور باہر کے فاتح زبان کے ذریعہ سے شیر و شکر ہو جائیں۔ چنانچہ وہ خود بھی کبھی کبھی دیسی زبان یعنی ہندی میں شعر کہتا تھا اور اس کے اہل دربار بھی اُس کی تتبع میں ہندی میں کہتے تھے اور ہندی شاعروں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس کے درباری شاعر سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرتے تھے۔ فیضی نے اکثر ہندی دوہرے کہے اور عبدالرحیم خاں خانخاناں دربار اکبری کا رُکن اعظم اور فارسی کا مشہور شاعر ہندی کا بھی اچھا خاصا شاعر تھا۔ چونکہ فاتح اور مفتوح دونوں قوموں میں دلی یک جہتی اور اتحاد تھا۔ اس وجہ سے زبانوں میں بھی اتحاد پیدا ہوا اور کئی زبانوں سے ملکر ایک نئی زبان پیدا ہو گئی۔ اسی زمانہ میں راجہ ٹوڈرمل نے ایک بڑا کام کیا جو اُردو کی اشاعت کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ ملک کے مالی حسابات پہلے دیسی زبان میں لکھے جاتے تھے جن کو مسلمان افسران صیغۂ مال اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے اور حساب کی جانچ پڑتال میں ان کو مجبوراً مترجم سے مدد لینا پڑتی تھی اور اس طرح دیسی حساب نویسوں اور غیر ملکی حساب فہموں میں ایک بُعد رہتا تھا جس کو راجہ ٹوڈرمل نے اس طرح رفع کیا کہ مسلمان افسرِان

کو ہندی زبان اور ہندی محاسبوں کو زبان فارسی سیکھنے کی سخت تاکید کی اور اس کا حکم دیدیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان فارسی کی تعلیم حصول ملازمت اور ترقی کی منزلیں طے کرنے کے لئے بہت ضروری قرار پاگئی۔ کسی قسم کی ترقی اور دربار میں بغیر بادشاہ کی زبان جانے ہوئے ممکن نہ تھی۔ ٹوڈرمل نے حکم دے دیا کہ صیغۂ مال میں جو لوگ ملازمت کرنا چاہیں اُن کے لئے زبان فارسی کی تحصیل لازمی ہے۔ پس جس چیز کی ابتدا اکبر کے زمانہ میں ہوئی تھی، وہ شاہجہاں کے عہد میں درجۂ تکمیل کو پہنچی اور اب زبان اس قابل ہوگئی کہ وہ ادبی اغراض میں کام آسکے۔ ترقی اور درستی اور اصلاح کا کام بیشک زبان میں برابر جاری رہا۔ بلکہ ہمارے نزدیک اب تک جاری ہے۔

قدیم شعراء دکن اور دربار شاہان گولکنڈہ و بیجاپور

امیر خسرو کے زمانہ کو زبان اُردو کی نمود کے واسطے صبح کاذب کہنا بجا ہے جس کی صبح صادق ہمارے نزدیک مُلکِ دکن کے مطلع پر مسلمان شاہان بیجاپور و گولکنڈہ کے عہد میں نمودار ہوئی جس کے اسباب کو ہم نے اس کتاب میں آگے چل کے وضاحت سے لکھا ہے۔ بادشاہان مذکور خود صاحبان علم وفضل اور اہل علم کے بڑے قدرداں تھے۔ محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۱-۱۶۱۱ء) سلطان محمد قطب شاہ (۱۶۱۱-۱۶۲۵ء) عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۵-۱۶۷۲ء) ابوالحسن قطب شاہ (۱۶۷۲-۱۶۸۲ء) جو ۱۷۰۴ء میں قید میں مرا) یہ سب خود بھی شاعر اور شاعروں کے بڑے مربّی اور قدردان تھے۔ محمد قطب شاہ۔ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن زبان دکھنی میں شعر کہتے تھے جو اُردو ہی کی ایک شاخ ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی ان سب نے غزل، رباعی، مثنوی، قصیدے اور مرثیے لکھے جو اس زمانہ میں موجود مگر بہت کمیاب ہیں۔ اسی طرح بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰-۱۶۲۶ء) اور علی عادل شاہ اول (۱۵۵۸-۱۵۸۰ء) خود بھی قابل بادشاہ تھے اور اہل فن کے بڑے قدردان تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے فن موسیقی پر زبان ہندی میں

نواب خان خاناں

ایک مشہور کتاب لکھی ہے۔ جس کا دیباچہ بزبان فارسی اُس کے دربار کے مشہور شاعر اور نثار ملا ظہوری ترشیزی متوفی ۱۶۱۶ء کا لکھا ہوا زبان فارسی کی ایک بے مثال تحریر سمجھا جاتا ہے اور آگے چل کر اکثر اُردو نثاروں نے اس کی نقل کی بڑی کوشش کی ہے۔ اسی طرح علی عادل شاہ اوّل بھی بڑا قابل بادشاہ تھا جس کے دربار کے مشہور شاعر نصرتی کی اکثر تصانیف موجود ہیں جن میں مثنوی گلشن عشق اور علی نامہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے بلکہ کثرت سے زبان دکھنی کے الفاظ اور قدیم متروک الفاظ کے خلط ملط سے اکثر جگہ مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کتابوں کی وقعت اس قدر ضرور ہے کہ وہ زبان و ادب اُردو کی تدریجی ترقی کی قابل قدر مثالیں ہیں۔

ولی دکھنی ۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء

جب ولی کا نیّرِ اقبال چمکا تو چھوٹے چھوٹے تارے جو افق شاعری پر اُس وقت ضیا فگن تھے سب ماند پڑ گئے۔ ولی کو ریختہ کا موجد۔ گویا اُردو کا چاسر[1] خیال کرنا چاہیئے۔ اسی زمانہ میں اُردو شاعری کا سنگ بنیاد باقاعدہ طور سے رکھا گیا۔ ولی کا کلام شمالی ہند کے تمام نظم نگاروں کے واسطے نمونہ بن گیا اور اسی کو دیکھ کر اور اپنے سامنے رکھ کر اُس وقت کے تمام شعرائے دہلی نے ترقی کرنا شروع کی ولی کا کلام نہایت صاف، سادہ، فصیح اور پیچیدہ استعارات اور دور از کار تشبیہوں سے پاک ہے تصوف کا بھی رنگ جھلکتا ہے۔ فارسی الفاظ اور خیالات کی کثرت ضرور ہے مگر غلبہ نہیں ہے۔ ہندی لفظ بھی فارسی الفاظ کے ساتھ جا بجا ملے جلے ہیں جو بعد کو متروک ہو گئے۔

قدیم شعرائے دہلی
حاتم، آبرو، آرزو

دیوان ولی کی اشاعت کے ساتھ ہی مرکز شاعری گویا دکھن سے منتقل ہو کر دہلی میں آ گیا اس وجہ سے کہ یہاں کے لوگوں کو

---

[1] چاسر زبان انگریزی کا بہت قدیم شاعر ۱۳۴۰ء تا ۱۴۰۰ء، اس کی مشہور تصنیف کنٹربری ٹیلس (کنٹربری کے قصے) کی زبان قدیم ہے اور مروجہ زبان سے بہت مختلف ہے۔

ایک خاص دلچسپی شعر و شاعری کے ساتھ پیدا ہو گئی۔ سیکڑوں تتبع ولی کے پیدا ہو گئے جو ان کے کلام کی بڑی قدر کرتے تھے اور اسی طرز پر کہتے تھے۔ اب اُردو شاعری فارسی کے دوش بدوش ترقی کرنے لگی گویا اس کی مدمقابل اور حریف بن گئی۔ گو ابھی تک اُس میں وہ کہنگی اور پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے اس کی حریف زبان فارسی کو کوئی اندیشہ ہوتا۔ نظم اُردو اب تک ایک کھلونا سمجھی جاتی تھی جس کو لوگ پسند ضرور کرتے تھے اور فارسی کلام کی محنت و دماغ سوزی کے بعد اُسی سے دل بہلاتے تھے۔ سلطنت مغلیہ گو بہت کمزور ہو گئی تھی مگر اب تک اس میں جان باقی تھی اور درباری زبان اب تک فارسی ہی تھی۔ اُردو کے کمزور اور نوخیز بچہ کو اتنی قوت کہاں تھی کہ فارسی کے شہ زور پختہ کار پہلوان سے مقابلہ کر سکے۔ اس لیے اُسے مقابلہ کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ قدیم شعرائے اُردو سب بڑے بڑے فارسی داں اور فارسی کے کہنہ مشق شاعر تھے۔

ولی کے تتبع ظہور الدین حاتم (۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء) خان آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء) ناجی، مضمون، آبرو اور بہت سے اور شعراء پیدا ہوئے جن کو اُردو شاعری کے آباء سمجھنا چاہیے۔ ان کا کلام تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا، بہت صاف اور سادہ اور تصنع و تکلف سے بہت کچھ پاک و صاف ہے۔ نشست الفاظ میں بہت زور طبع دکھایا گیا ہے اور فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت ملتی ہیں۔ ولی کے یہاں جو ہندی الفاظ تھے، وہ ان لوگوں کے یہاں نہیں یا بہت کم ہیں۔ ان کی جگہ فارسی لفظوں نے لے لی ہے۔ فارسی بحریں اُردو نظم میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بہت خوبی سے بندھی ہیں۔ اُن کے زورِ طبیعت اور قدرتِ کلام میں کسی کو کلام نہیں۔ اور اُن کی مشاقی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور نقش اوّل سے نقش ثانی یقیناً بہتر ہے گو فارسیت کا رنگ اور تصنع بہ نسبت دکھنی شعرا کے ان میں زیادہ ہے۔ مقامی رنگ گو بالکل غائب نہیں مگر رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے۔ ہندی دوہروں کا بھی کچھ اثر اشعار میں پایا جاتا ہے قدیم شعرائے دہلی کا کلام

اُردو کی تدریجی ترقیوں کی منزل میں ایک نمایاں نشان ہے۔

میر و سودا کا زمانہ، اُس زمانہ کی ترقیاں زبان اور شاعری میں اصلاحیں

یہ زمانہ اُردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس میں محبوبۂ شاعری معہ اپنی تمام کرشمہ سازیوں کے زینتِ الفاظ اور جدتِ خیال سے آراستہ و پیراستہ ہوکر دنیا کے سامنے نمودار ہوئی۔ یہ میر اور سودا کا زمانہ ہے جو اُردو شاعری کے رکن رکین اور اُستادِ اعظم مانے جاتے ہیں۔ یہ دونوں بزرگ اپنے حسنِ ادا، حلاوتِ زبان، قدرتِ الفاظ اور نزاکتِ زبان کی وجہ سے اپنے تمام ہمعصر اور نیز ماسبق حریفوں پر گوئے سبقت لے گئے۔ ان کے مبارک زمانہ میں غزل اور قصیدہ دونوں معراجِ ترقی پر پہنچ گئے۔

مرزا مظہر جانجاناں، میر درد، سوز، قائم، یقین، بیان، ہدایت، قدرت اور ضیاء ان کے ہمعصر ہیں جو سب علاوہ اُردو کے نظم فارسی کے بھی اُستاد تھے۔ چونکہ ان سب پر فارسی کا رنگ غالب تھا۔ لہٰذا وہ قدرتاً ہندی الفاظ پہ فارسی کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ وہی اُن کو اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اسی زمانہ میں زبان بہت کچھ ایسے الفاظ اور بندشوں سے پاک ہوگئی جو ولی اور اُن کے ہمعصر شعرائے دہلی کے یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ بہت سے خوبصورت اور مناسب فارسی لفظ اور محاورے خواہ بجنسہٖ یا بصورت ترجمہ زبان میں داخل کر لئے۔ ان کا کلام اُردو اور فارسی کی آمیزش سے گنگا جمنی ہے۔ حُسن و عشق کے معاملات جس خوب صورتی اور مؤثر طریقہ سے ان حضرات نے باندھے اس سے پیشتر کسی نے نہیں باندھے تھے۔ ان کے کلام کو دیکھ کے تعجب ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی لغات کا خزانہ انہوں نے کھنگال ڈالا جس میں سے صدہا جواہر ریزے منتخب کر کے زبان میں داخل کئے گئے ہیں۔ گُل و بُلبل اور قمری و شمشاد کے عشق کے افسانے جس کو فارسی شعراء مدت سے باندھتے چلے آتے تھے اب اُردو میں

بھی داخل ہوئے اور جدید خیالات اور نئی ترکیبوں کے ساتھ بڑے حُسن وخوبی سے برتے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فنِ شعر میں بھی ایک نمایاں ترقی ہوتی نقائص اور معائب سے کلام پاک ہونے لگا۔غزلیں ایسی بحروں میں کہی جانے لگیں جو اِس سے پیشتر مروج نہ تھیں اور کانوں کو بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے اور صنائع بدائع جن کو اب تک کلام میں جگہ نہیں ملی تھی بکثرت استعمال ہونے لگے مگر اُسی حد تک کہ اُن سے شعر کے حُسن اور ادائے مطلب میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ وہ کلام میں گھُل مل جاتے تھے اور بدنما نہیں معلوم ہوتے تھے ۔ نئے نئے اصناف شعر بھی اسی عہد میں رائج ہوئے ۔ مثلاً واسوخت ، مرثیہ ، مخمس ، ہجو ، مثلث ، مربع اور مستزاد وغیرہ اور یہ سب فارسی سے لئے گئے اور خوب خوب کہے گئے۔ جو اصناف سخن پیشتر سے مروّج تھے ان میں بھی ترقی ہوئی۔ صنعت ایہام جو قدما میں جاری تھی اس زمانہ میں کم ہوگئی گو بعد کو پھر رائج ہوگئی۔ میر کو یہ صنعت کم پسند تھی ۔ لیکن اگر بلا تکلف اور کسی دوسری صنعت کے ساتھ بندھتی اور کلام کا حُسن بڑھتا تو مضائقہ بھی نہ تھا۔ مظہر اور اُن کے اکثر معاصرین اور متبعین نے بھی اس معاملہ میں میر ہی کا مسلک اختیار کیا۔ اس زمانے کے شعرا بعض اصناف سخن کے محض مُوجد ہی نہ تھے بلکہ انھوں نے اُس میں بڑی بڑی ترقیاں کیں اور آئندہ ترقی کی راہ بتا گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی ایجادیں فارسی ترکیبوں سے ماخوذ تھیں اور انھیں پر مبنی تھیں اس عہد میں زبان اُردو نے علی العموم زبردست ترقی کی اس میں قوت وسعت اور لوچ باحسن وجوہ پیدا ہوا اور نئے نئے لفظ اور محاورے اور ترکیبیں زبان میں داخل ہوئیں جن سے آئندہ ترقی کا دروازہ کھُل گیا۔

انشاء اور مصحفی کا دور، اُن کی خدمات زبان اور شاعری کے ساتھ

ایک دوسرا دور ربط کے شعرائے دلی سے شروع ہوا جس میں اکثر میر حسن، جراءت،

انشاؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ، بقاؔ، حسرتؔ، رنگینؔ اور فراقؔ مشہور ہوئے۔ اس زمانہ میں بھی وہی پرانی ترکیب ہندی الفاظ خارج کرنے اور اُن کی جگہ فارسی اور عربی الفاظ داخل کرنے کی برابر جاری رہی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ہندی اور بھاشا لفظ جو خارج کئے گئے بدنما اور ثقیل ضرور تھے اور نظم کی صنف نازک ان کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی مگر اُن کے یک قلم نکال دیے جانے سے دیسی زبان کی ترقیوں کو سخت نقصان پہنچا۔ ایسے جواہر ریزے جو سنسکرت اور پراکرت کے خزانوں سے زبان اُردو کے قبضے میں ایک عرصۂ دراز سے چلے آتے تھے۔ فارسیت کے غلبہ سے اب خارج ہوگئے۔ قدیم اُردو شاعر سنسکرت اور ہندی سے ناواقف تھے اسی لئے اُنھوں نے ہندی الفاظ کی کوئی قدر نہیں کی اُن کو زبان سے خارج کردیا اور ان کی جگہ پر فارسی اور عربی الفاظ رکھ دیئے اس کارروائی کو وہ لوگ اور نیز اس زمانے کے مسلمان مصنفین جو فارسی کا ذوق رکھتے تھے "زبان کی اصلاح اور پختگی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی عہد میں ایک اور ترقی یہ بھی ہوئی کہ پرانے متروکات جو میرؔ و سوداؔ کے زمانہ میں باقی رہ گئے تھے نکال دیے گئے اور اُن کی جگہ جدید خوبصورت لفظ اور ترکیبیں داخل کی گئیں۔ ہندی اور فارسی محاورے اور ترکیبیں باہم ملادی گئیں۔ طرز عبادت میں کچھ فرق نہیں ہوا مضامین میں بھی کوئی خاص جدّت نہیں ہوئی البتہ ابتذال اور شہوت پرستی کا رنگ پیدا ہوگیا۔ اس دور کی شاعری اس زمانہ کی اخلاقی حالت اور دہلی کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا پورا نمونہ ہے۔ معشوق کے حُسن ظاہری کی تو عام طور پر تعریف کی جاتی تھی مگر بعض شعراء نے کھُلّم کھُلّا ایک اور رنگ اختیار کیا جس کو اصلاح میں "معاملات" یا "معاملہ بندی" کہتے ہیں جراؔت، انشاؔ اور رنگینؔ اس خاص رنگ کے بادشاہ تھے۔

ریختی یہ حُسن پرستی اور شہوت پرستی بعد کو ایک خاص طرز میں ظاہر ہوئی جس کا نام "ریختی" یعنی عورتوں کی زبان رکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ ریختہ سے نکلا ہے اور

اُس کا مؤنث ہے عورتوں کی زبان بالذات کوئی مذموم بات نہیں، مگر خرابی یہ ہوئی کہ اِس قسم کے اشعار جذبات نفسانی برانگیختہ کرنے کی غرض سے کہے جاتے تھے اور اسی وجہ سے وہ نہایت فحش اور مخرب اخلاق اور شرفار کے کانوں تک کو ناگوار ہوتے تھے۔ ایسی کل چیزیں جو عورتوں کے پڑھنے کے قابل نہیں ہوتیں غیر مہذّب اور فحش ہوتی ہیں۔ عورتوں کی تعلیمی ترقی ہر ملک اور ہر قوم میں زبان کی اصلاح اور ترقی کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ ریختی کی مثالیں پُرانے شعرار کے کلام میں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں۔ مثلاً" مولانا ہاشمی بیجاپوری اور سید محمد قادری ہمعصر ولی کے کلام میں بھی اس رنگ کا کچھ پتہ چلتا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو یہ بالکل متروک ہوگیا تھا۔ اس کو دوبارہ سعادت یار خاں رنگین اور اُن کے دوست انشآ نے زندہ کیا۔ سب سے بڑے ریختی گو میر یار علی خاں متخلص بہ جانؔ صاحب سمجھے جاتے ہیں۔ انشآ مختلف طرز کے شعر کہتے تھے کبھی ریختی بھی کہہ جاتے تھے مگر جان صاحب نے اس کو ایک فن قرار دیا اور سوائے اس رنگ کے کچھ نہیں کہا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ صنعت شاعری زمانہ کے ساتھ بہت کچھ بدل گئی ہے اور اب تقریباً متروک ہے۔

اس دَور کے شاعر غزل کے استاد تھے اور مثنوی اور قصیدہ بھی خوب کہتے تھے لوگوں میں شعر و شاعری کا چرچا تھا بزم مشاعرہ اکثر گرم ہوتی تھی۔ اس عہد کے اکثر شاعر اپنا وطن مالوف دہلی چھوڑ کر اِدھر اُدھر نکل گئے اکثر لکھنؤ پہنچے جہاں دربار شاہی میں شعرار کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ اس زمانہ کی مشہور یادگاریں میر حسنؔ اور خواجہ میر دردؔ کے بھائی میر اثرؔ کی مثنویاں ہیں۔ علی الخصوص میر حسنؔ کی مشہور آفاق مثنوی "سحر البیان" جس کی روانی، سادگی شیرینی اور رنگینی کا جواب نہیں۔

غالب اور ذوق کا زمانہ اور اس کی خصوصیات

اِس دَور کی ابتدار شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ اور ظفرؔ سے ہوتی ہے۔ اِس میں وہ رہے سہے ہندی الفاظ بھی جو قدما سے

باقی رہ گئے تھے نکل گئے اور فارسیت کو اور ترقی ہوئی۔ غالب اور مومن فارسی میں بھی کہتے تھے۔ چنانچہ اُن کی اکثر تصانیف اس زبان میں موجود ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہوگی کہ اس زمانہ میں زبان میں فارسی الفاظ کی بھر مار ہوگئی جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا۔ شاہ نصیر کو دور سابق (مصحفی و انشا) اور دور حال (ذوق و غالب) کے بیچ کی کڑی سمجھنا چاہیے۔ یہی زمانہ نظیر اکبر آبادی کا بھی ہے جن کا رنگ سب سے علیحدہ ہے اور ادب اُردو میں ایک نہایت نمایاں اور خاص رنگ ہے۔ غالب و مومن کے یہاں ہم کو ان مشکل اور دقیق فارسی ترکیبوں اور محاوروں کی ابتدا ملتی ہے جو اُستادوں کے قلم سے تو بُرے نہیں معلوم ہوتے مگر معمولی قابلیت والوں کے ہاتھ میں وہ بالکل غارت ہو جاتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ اس قسم کی زبان جس پر فارسی کا اتنا رنگ غالب تھا زیادہ رواج پذیر نہیں ہوئی۔ ورنہ پھر اُردو اور فارسی میں فرق ہی کیا رہ جاتا۔ اسی فارسیت کے غلبہ کی وجہ سے مومن اور غالب کا اکثر کلام سمجھ میں نہیں آتا۔ ذوق گو بلحاظ شاعری غالب سے ذہانت اور طباعی میں کم ہیں مگر زبان پر اُن کی قدرت مُسلّم ہے اور محاورات و امثال میں تو ضرب المثل ہیں۔ اُن کا کلام نہایت صاف اور بہت مزے کا ہوتا ہے۔ ظفر کے یہاں کچھ خاص خوبیاں ہیں۔ وہ غالب اور ذوق کے ہم پلّہ نہیں بلکہ اُن سے اصلاح لیتے تھے۔ ظفر اور ذوق کے کلام میں بہت مشابہت ہے جس سے بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ ظفر کا کلام ہی نہیں بلکہ اُن کے اُستاد ذوق کا کہا ہوا ہے۔ اس زمانے میں غزل اور قصیدے میں بڑی ترقی ہوئی۔ چنانچہ ذوق اور غالب کی غزلیں اور قصیدے اُردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سنگلاخ زمینوں میں اشعار کہے گئے اور جدید اور مشکل بحریں جو اب تک رائج نہیں ہوئی تھیں استعمال ہونے لگیں۔ شعرا اپنا کمال فن دکھانے کے لئے مشکل قافیے اور ردیفیں باندھتے اور غیر معمولی بحریں اختیار کرتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش

کرتے تھے۔ مگر اس قسم کا کلام حقیقی شاعری کی لطافت و معنویت سے خالی ہوتا تھا۔ الغرض اس زمانہ ہندی الفاظ زبان سے اکثر نکل گئے ہیں۔ فارسی ترکیبیں بکثرت داخل ہو گئیں خیالات میں جدّت اور مضامین میں نُدرت پیدا ہوئی۔ جس کا بہترین نمونہ غالبؔ کے کلام کو سمجھنا چاہیئے۔

شعرائے لکھنؤ کا نیا دور اور اس کی خصوصیات ناسخؔ اور آتشؔ کا زمانہ اُن کی خدمت زبان کے ساتھ

ناسخؔ اور آتشؔ کے زمانہ سے لکھنؤ میں ایک جدید دور شروع ہوتا ہے۔ دہلی پر جب زوال آیا تو وہاں کے اکثر اہلِ کمال نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور یہاں آکر پناہ لی۔ دہلی کی شمع سخن سے لکھنؤ کی شاعری کا چراغ جلا اور وہاں بھی بکثرت شاعر پیدا ہونے لگے۔ ناسخؔ اور آتشؔ کا تعلق لکھنؤ سے ہی تھا وہاں کے شاہی دربار میں شاعری کی اتنی عزّت اور ایسی قدر ہوئی کہ اس سے پیشتر کبھی نہ ہوئی تھی۔ لوگ شاعری کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے۔ مشاعرے گھر گھر ہوا کرتے تھے۔ قدردانوں کی تعریفیں دل بڑھاتی اور نئی اُمنگیں پیدا کرتی تھیں۔ مشاعرے ماہوار و ہفتہ وار کیا بلکہ اکثر روزمرّہ ہوتے تھے۔ اسی کثرت اور مشّاقی نے شاعری کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا اور اس میں طرح طرح کی جدّتیں اور رنگینیاں پیدا کیں۔ مختلف اصناف سخن پہ قدرت حاصل ہو گئی شاعری کے ساتھ ظاہر ہے کہ زبان بھی صاف ہوتی گئی اور ترقّی کرتی گئی۔ جو ہندی الفاظ پیشتر کی تراش خراش اور قطع و برید سے بچ گئے تھے وہ بھی اب نکل گئے اور ان کی جگہ فارسی و عربی الفاظ نے لی۔ اسی طرح پُرانی بندشیں اور ترکیبیں بھی جو زبانوں پہ جاری تھیں ترک کی گئیں۔

ناسخؔ کو یہ فخر حاصل ہے کہ تکمیل زبان کے آخری مدارج اُنہی کے مبارک ہاتھوں سے پُورے ہوئے واقعی اُن کو متروکات کا ناسخ کہنا بالکل بجا ہے۔ اُن کے زمانہ سے ایک نیا رنگِ شاعری شروع ہوا جس کی خصوصیات یہ ہیں۔ الفاظ شان دار، عبارت میں تعقید و

تکلف صنائع و بدائع اور دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کی کثرت۔ فضول مبالغے۔ فرسودہ تشبیہیں جذبات اور اثر کی بہت کمی۔ مگر باوجود اس کے اس رنگ کے بھی بعض شعر مزے کے ہوتے ہیں۔ یہ رنگ بھی اپنے زمانہ میں بہت مقبول ہوا۔ علاوہ ناسخ کے بحر، وزیر، صبا، سحر، رشک وغیرہ اپنے زمانے کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ قبولیت کا سہرا اسی رنگ کے سر پر رہا یہاں تک کہ یہ رنگ ایک مرتبہ پھر بدلا اور اشعار میں بے تکلفی۔ سادگی۔ نیچر کی جھلک، سوز و گداز اور اثر پسند کئے جانے لگے۔

ناسخ ہی کے ہمعصر آتش بھی تھے جن کا رنگ بالکل علیحٰدہ تھا۔ وہ غزل کے مسلم الثبوت اُستاد مانے جاتے ہیں۔ ہر چند اُن کی درسی تعلیم اور وسعت معلومات ناسخ سے کم کہی جاتی ہے مگر اُن کا کلام ناسخ کے کلام سے کہیں زیادہ شیریں اور موثر ہے۔ وہ اپنے خاص رنگ یعنی شستگی الفاظ چُستی بندش، بلندی مضامین، میں قدما کے متبع کہے جا سکتے ہیں۔ اُن کے اشعار سوز و گداز اور اثر سے مملو ہیں بلحاظ علمیت وہ ناسخ سے کم ہوں مگر شاید یہ کمی علم ہی زیادتی اثر و کیفیت کا باعث ہے صفائی زبان پر اُن کا بھی بہت بڑا احسان ہے مگر حق یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہم کو ناسخ کا زیادہ ممنون احسان ہونا چاہیے۔ ان دونوں پہلوانان سخن کے شاگردوں اور پیرووں میں بھی اکثر زور آزمائیاں اور مقابلے ہوا کرتے تھے جو ترقی زبان کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔

مراثی اور اُن کا تعلق زبان کے ساتھ

مرثیہ ایک قدیم صنفِ شاعری ہے۔ اُردو مرثیہ گوئی کو قدما نے نظر استحسان سے نہیں دیکھا اس وجہ سے وہ عرصہ تک ایک کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہی یہاں تک کہ میر خلیق اور ان کے لائق فرزند میر انیس اور انیس کے معاصر دبیر کے زمانہ میں وہ از سرِ نو زندہ ہوئی اور اُن کے بعد سے تو مرثیہ گو بکثرت پیدا ہونے لگے۔ مرثیہ بہت پُرانی چیز ہے۔ عربوں میں یہ پیشتر سے موجود تھی وہاں سے یہ اہلِ فارس میں آئی اور فارسی سے اُردو میں اُس نے رواج پایا۔

قدیم شعرائے دکن نے بھی اُردو میں مرثیے کہے مگر ان کی زبان کچی اور ابتدائی حالت میں تھی۔ مرثیہ گوئی کی اصل ترقی لکھنؤ میں ہوئی جہاں اس میں ایک نئی رُوح پھونکی گئی۔ لکھنؤ کے اکثر امرا اور رؤسا شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ جو اعتقاداً شہدائے کربلا کے مصائب پر گریہ و بکا اور اظہار غم و الم کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ زمانہ عزاداری اب بجائے دس دن (عشرہ) کے چالیس دن (اربعین) ہوگیا تھا اور اس زمانہ میں پورا لکھنؤ رنج و غم اور حسرت و ماتم کی ایک زندہ تصویر بن جاتا تھا۔ اور اس غم و الم اور حسرت و ماتم کے اظہار کا بہترین ذریعہ شعرا کے پُرزور اور درد انگیز مراثی کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ اسی وجہ سے اس فن مرثیہ گوئی نے جو ترقی اس دور میں کی وہ اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ خود بادشاہ بھی مرثیے کہتے تھے اور مجلسوں میں اپنا پُراثر اور رقت خیز کلام سناتے تھے۔ فلک مرثیہ گوئی کے سب سے درخشاں تارے میر انیس اور مرزا دبیر تھے جن کا کلام نہایت مؤثر اور قدرتی شاعری کا نمونہ ہے۔ ان دونوں بزرگواروں کا کلام اُردو شاعری کے سر کا تاج ہے۔ اس کی چند خصوصیتیں یہ ہیں۔ کلام میں اخلاقی تعلیم کُوٹ کُوٹ کے بھری ہے۔ تاریخ اور ان کے زمانہ کی بد اخلاقیوں سے بالکل پاک ہے۔ قصائد کی سی بے کار لفاظی اور دور از کار مبالغے اس میں مطلق نہیں۔ مناظر قدرت اچھی طرح کو سماں باندھنا کہتے ہیں، اور جذبات قلبی کے سچے فوٹو مؤثر الفاظ میں کھینچے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ نگاری کو اُردو شاعری کا ایک نیا دور سمجھنا چاہیے۔

مابعد کے شعراء امیر و داغ کا زمانہ

معزولی سلطان عالم واجد علی شاہ اور زمانہ غدر کے بعد اکثر نامور شاعر مثلاً امیر، داغ، جلال اور تسلیم وغیرہ اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر اسلامی ریاستوں میں چلے گئے۔ بعض نے رامپور اور حیدرآباد کا رُخ کیا۔ کیونکہ وہ زبان اُردو کے قدرداں سمجھے جاتے تھے۔ اس زمانے کے شعراء کا کوئی خاص رنگ نہیں بلکہ قدما کے تتبع تھے۔ دربار میں اور رؤسا کے گھروں پر مشاعرے بکثرت ہوتے تھے غزلیں

رباعیاں، قصیدے، قطعات اس زمانے میں اکثر کہے گئے۔ امیر مینائی اپنے پیشروؤں کے مقلد تھے اُن کا کلام ناسخ کے زمانہ کی اکثر بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔ داغ کے یہاں طباعی، بیساختگی اور روزمرّہ بہت ہے۔ مگر متانت اور بلندیٔ مضامین کم ہے۔ جلال کا کوئی خاص رنگ نہیں مگر وہ فن عروض کے استاد اور صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور قدما کے پیرو تھے۔ اس دور میں اُردو شاعری نے بحیثیت شاعری کوئی نمایاں ترقی نہیں کی۔

جدید رنگ
آزاد اور حالی کا زمانہ، اُن کی خدمات زبان کے ساتھ

زمانۂ حال میں نظم اُردو نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ اس کے رکن رکین آزاد، سرور اور حالی ہیں۔ نئے مضامین اور نیا طرز انشا زبان میں داخل ہوا۔ قومی نظمیں، خیالی نظمیں اور بیانیہ نظمیں لکھی گئیں جو پرانی قیود اور قواعد کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہیں۔ نظم کا دائرہ وسیع ہوا۔ میدان شاعری کو وسعت دی گئی۔ سادگی، بے تکلفی، اثر اور جذبات اس رنگ کی نظموں کے خاص جوہر ہیں۔ نئی چیزوں پر طبع آزمائی کی جانے لگی۔ ہمارے نزدیک اس تغیر کا بڑا سبب انگریزی تعلیم اور انگریزی علم ادب کا شوق نقل ہے۔ حالی قومی شاعر ہیں۔ آزاد نیچرل شاعری کے موجد ہیں۔ سرور کا تخیل اور طرز بیان بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اکبر کا رنگ خاص ہے جس کو انھوں نے شروع اور انھی پر ختم ہو گیا۔ اقبال کے کلام میں فلسفہ اور نیچرل مضامین کا لطف ہے۔ حسرت میں زمانۂ حال کی بہت سی خوبیاں ہیں۔ اس جدید دور میں غزل گوئی میں بھی بہت کچھ اصلاح ہوئی۔ مختصر یہ کہ اس رنگ نے نظم اُردو کو پرانی قیدوں اور پابندیوں سے بہت کچھ آزاد کر دیا اور آئندہ ترقی کے واسطے نئے راستے کھول دیئے۔

نثر اُردو
فورٹ ولیم کالج کلکتہ

جدید نثر کی ابتدا انیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے۔ اس نئی تعمیر کا سنگ بنیاد ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے اہتمام سے فورٹ ولیم

کالج کلکتہ میں رکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اُس وقت فورٹ ولیم کالج کے افسر اعلےٰ تھے۔
انھوں نے شمالی ہند سے قابل لوگوں کو اس غرض سے اپنے یہاں جمع کیا تھا کہ انگریزی افسروں
کے واسطے جو تازہ وارد ہوتے تھے۔ ایسی کتابیں تیار کی جائیں جن سے انتظام ملکی اور
ہندوستانیوں کے ساتھ میل جول اور ربط وضبط بڑھانے میں آسانی ہو۔ اس مشہور کالج کے
قیام کے پیشتر بھی نثر اُردو کی بعض کتابیں موجود تھیں مگر وہ مذہبی رنگ کی یا قصّے کہانیاں
تھیں اور کچی ابتدائی زبان میں فارسی سے ترجمہ کی گئی تھیں۔ عبارت کی درستی اور قواعد صرف و
نحو کا ان میں کچھ خیال نہ تھا "دہ مجلس" اور "نوطرز مرصّع" اسی عہد کی یادگاریں ہیں۔ وہ خاص
لوگ جو انگریزوں کے واسطے سنسکرت اور فارسی سے ترجمہ کرنے یا نئی کتابیں سادہ اور
بے تکلّف زبان میں لکھنے کی غرض سے جمع کئے گئے تھے۔ سیّد محمد حیدر بخش حیدریؔ
بہادر علی حسینیؔ، میر امّنؔ، حفیظ الدین احمد، مظہر علی ولاؔ، اکرام علی اور مرزا علی لُطفؔ وغیرہ ہیں۔
جن کی تصانیف نہایت صاف سادہ اور دلکش عبارت میں ہیں۔ ان کتابوں سے اکثر ثقیل
اور غیر مانوس فارسی اور سنسکرت الفاظ نکال دیئے گئے ہیں۔ یہی کتابیں نصف صدی تک
نثر اُردو کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی تھیں اور زمانۂ حال کی جو ترقّیاں زبان میں ہو رہی ہیں اُن کا بھی
زیادہ تر دار ومدار انہیں پر ہے۔ "ڈاکٹر گلکرسٹ ہی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ دیسی زبان
(اُردو) سرکاری زبان ہو گئی اور یہ استعداد اس کو حاصل ہو گئی کہ بجائے مروّجہ فارسی کے وہ
عدالتوں اور گورنمنٹ کی زبان قرار دی جائے۔" ڈاکٹر گلکرسٹ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اُردو
لغات اور صرف ونحو کی کتابیں بھی ان کے زمانہ میں تیّار ہوئیں۔

نثر مقفّیٰ — رجب علی بیگ سرورؔ

سادہ نثر کے مقابلہ میں جس کی ابتداء کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج سے
ہوئی تھی وہ نثر مقفّیٰ ہے جو ظہوریؔ اور بیدلؔ کی فارسی نثر کے طرز پر
لکھی جاتی تھی۔ اس کی عبارت مقفّیٰ اور جملے بالکل نپے تُلے ہوتے تھے۔ صنائع بدائع استعاروں
اور تشبیہوں سے بہت کچھ کام لیا جاتا تھا۔ جملے طولانی پیچیدہ اور قافیہ بندی کی رعایت کی

وجہ سے اکثر جگہ مطلب سمجھنے میں دِقّت واقع ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے پوری عبارت کے پڑھنے اور مطلب سمجھنے میں بھی دِقّت ہوتی تھی عرصہ تک اسی قسم کی رنگین اور مقفّٰے عبارت لکھنؤ اور دہلی میں مقبول عام رہی۔ خطوط تک اِسی قسم کے مرصع اور باتکلف عبارت میں لکھے جاتے تھے۔ کتابوں کے دیباچے، تمہیدیں، تقریظیں، خواہ بزبان فارسی یا اردو سب اسی قسم کی رنگین عبارت میں لکھنے کا دستور تھا۔ اس عبارت کے بہترین نمونے مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کے یہاں ملتے ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف "فسانۂ عجائب" جس طرح اپنی انشاپردازی میں مشہور ہے۔ اسی طرح لکھنؤ کی اُس زمانہ کی معاشرت کی بھی ہو بہو تصویر ہے۔

دریائے لطافت انشاؔ اور قتیلؔ کی "دریائے لطافت" کو گویا فارسی اور اُردو کا مجموعہ کہنا چاہیے وہ ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ نہ صرف اُردو صرف ونحو کی پہلی کتاب ہے، جو ایک ہندوستانی کے قلم سے نکلی ہے بلکہ اس میں یہ بھی خوبی ہے کہ مختلف قسم کی زبانیں اور بولیاں جو اُس وقت ملک میں رائج تھیں اور جن کا اثر زبانِ اُردو پر پڑ رہا تھا اور نیز وہ محاورے اور اصطلاحیں جو بعض مخصوص طبقوں اور جماعتوں میں مرّوج تھیں ان سب کے نمونے بھی اُس میں بکثرت موجود ہیں۔

اُردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی ایک بہت بڑی شخصیت نثر اُردو کی تاریخ میں مرزا غالبؔ کی ہے۔ ان کی مشہور تصانیف "اُردوئے معلّیٰ" اور "عودِ ہندی" ایک دلچسپ مجموعہ اُردو خطوط کا ہیں جس کی عبارت نہایت سادہ، سلیس، بے تکلّف اور نہایت دل آویز ہے ان میں ایک خاص قسم کی پُر لطف ظرافت اور عبارت میں شگفتگی ہے دونوں کتابیں نثر اُردو کی سادگی و سلاست کا بہترین نمونہ ہیں۔ مصنّف کے ذاتی حالات کی طرف جا بجا جو اشارے ہیں اُن کو پڑھ کر دل بہت محظوظ ہوتا ہے۔ غالبؔ کے طرز نے اُردو کی نثر نگاری میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا اور ایک نئی رُوح پھونکی جس کا اثر زمانۂ مابعد کے نثر نگاروں پر بھی بہت کچھ پڑا۔ غالبؔ بھی اپنے زمانے کے مرّوجہ رنگ سے نہ بچ سکے کیونکہ اُن کی اکثر تحریروں میں وہی پُرانے

رنگ کی مقفّٰی اور مسجّع عبارت پائی جاتی ہے جو اُن کے زمانہ میں عام تھی۔

عیسائی پادریوں کی تحریروں کا اثر

عیسائی پادریوں کی تصانیف نے بھی اُردو نثر پر ایک خاص اثر ڈالا۔ ان لوگوں نے عموماً اور خاص کر اُن پادریوں نے جو سیرام پور واقع بنگال میں قیام گزیں تھے۔ بائبل کا ترجمہ ملک کی دیسی زبانوں میں کر کے اُس کی اشاعت عوم الناس میں بکثرت کی۔ اس کے علاوہ صدہا مذہبی چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابیں اُردو میں شائع کیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دیسی زبان میں اخبار نویسی کی ابتدا بھی اسی زمانہ سے ہوئی۔ سب سے قدیم ترجمے بائبل کے جو ۱۸۰۵ء سے ۱۸۱۴ء تک شائع ہوئے وہ زیادہ تر اُردو ہی میں ہوئے تھے۔

سرسید اور ان کے رفقائے کار زریں عہد

نثر اُردو کی ترقّی کا زرّیں عہد اُنیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کو سمجھنا چاہیئے جس میں سرسیّد اور اُن کی جماعت کے لوگوں نے اُردو نثر نگاری میں ایک خاص رنگ پیدا کیا۔ اس زمانے میں جس قدر مذہبی مناظرے خواہ مسلمانوں کے آپس میں یا مسلمانوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں کے درمیان ہوتے تھے اُن سے بھی اُردو کو ترقی اور ایک خاص قسم کی تقویت حاصل ہوئی۔ ایسی جملہ کتابیں اور رسائل علی العموم نہایت سادہ اور پُر زور عبارت میں لکھے جاتے تھے اور گو یہ کہ وہ ایک عارضی اور وقتی اثر اور دلچسپی رکھتے تھے مگر پھر بھی اُس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اُردو نثر نویسی میں سادگی اور پختگی پیدا ہوگئی۔ مولوی سید احمد شہید بریلوی کی مذہبی اصلاحیں ۱۷۸۲ء لغایت ۱۸۳۱ء اور وہ مختلف فیہ مسائل جن کو وہ ملک میں پھیلانا چاہتے تھے اُن کے اُوپر متعدد رسالے اور کتابیں لکھی گئیں۔ قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ زبانِ اُردو میں ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔ جو اصلاحیں کہ مولوی سید احمد شہید بریلوی کے زمانہ سے شروع ہوئی تھیں۔ ان کی ترقی نمایاں طور پر سرسیّد احمد خاں کے ہاتھوں ہوئی جن کی متعدد تصانیف سے جو تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی، فلسفیانہ، مذہبی، سیاسی جریدہ نگاری غرضیکہ ہر

صنف در قسم کی تحریر سے تعلق رکھتی تھیں زبان اُردو کو اتنا فائدہ پہنچا اور وہ اس قدر مالامال ہوئی کہ اور کسی چیز سے نہیں ہوئی تھی۔ سرسید مرحوم ایک ایسے طرز تحریر کے مُوجد ہُوئے جو جامع تھا اور جمیع اقسام مذکورۂ بالا کے بخوبی کام آسکتا تھا۔ ان کی تمام تصانیف اور علی الخصوص وہ بیش بہا مضامین جو تہذیب الاخلاق اور اس وقت کے دیگر مشہور جرائد میں چھپے ہیں ہزارہا تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔

سرسید مرحوم کے رفقائے کار نے جن کو زبان اُردو کے نو رتن سمجھنا چاہیئے۔ زبان اور ادب اُردو کے ساتھ احسانِ عظیم کئے اور بیش بہا خدمتیں انجام دیں۔ مولانا حالی کی قومی نظمیں اور تنقیدی مضامین، علامہ شبلی اور مولوی ذکاء اللہ کی تاریخی تصانیف، مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے اخلاقی اور پولٹیکل مضامین و لیکچر، مولانا نذیر احمد کے اخلاقی ناول اور دیگر تصانیف جن میں ادب آموزی کے ساتھ ایک لطیف ظرافت کا بھی رنگ ہے، ان سب سے نہ صرف لائق مصنفین کے اہل قوم و مذہب ہی کو فائدہ پہنچا بلکہ وہ تمام ملک کے واسطے یکساں طور پر مفید ثابت ہُوئے۔ اسی طرح مولانا محمد حسین آزاد کی جادو نگاری (جس کا ان سب سے جُدا اور ایک خاص رنگ ہے) درحقیقت نہایت ہی لطیف اور دل آویز ہے۔ ان کی تصانیف کو خزانۂ اُردو کے بیش بہا جواہر سمجھنا چاہیئے۔

تعلیم انگریزی کا اثر اُردو پر چھاپہ کی ابتداء۔ اُردو سرکاری زبان قرار دی گئی

اُنیسویں صدی کے نصف آخر سے انگریزی تعلیم کا نمایاں اثر زبان اُردو پر پڑنے لگا۔ اس سے ادب اُردو کی وسعت اور معلومات اور بڑھ گئی اور مختلف اصناف سخن اس میں داخل ہونے لگے۔ چھاپہ کی وجہ سے اشاعت کتب کو بہت مدد ملی، قدیم و جدید ہر قسم کی کتابیں چھپنے لگیں اور اُن کی نشر و اشاعت آسان ہو گئی۔ ۱۸۳۲ء میں بجائے فارسی کے اُردو سرکاری دفاتر کی زبان قرار دی گئی جس سے اُس کا پایۂ اعتبار اور بلند ہوا اور عدالتی دفاتر کی نئی نئی اصطلاحات کے شمول سے اُس کے لغات اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔

ناول نویسی کی ابتدا افسانہ نویسی، تاریخی ناول اور اخبار و جرائد کو تعلیم انگریزی کا لازمی نتیجہ سمجھنا چاہیئے ۔ یہ مضمون ضروری اور اہم ہے ۔ چنانچہ اس کی تفصیل آئندہ ابواب میں مناسب مقامات پر کی گئی ہے ۔ زمانۂ حال میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد جس نے زبان اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا ہے اور مولانا شبلی مرحوم کے دار العلوم ندوہ کا قیام اس امر کی بیّن مثالیں ہیں کہ زبان کس قدر ترقی کر رہی ہے ۔ نیز یہ کہ اُردو کو ہندوستان کی ادبی زبان بننے کا فخر باحسن وجوہ حاصل ہو گیا ۔

اُردو ڈراما یہ بالکل نئی اور مقامی چیز ہے اس وجہ سے کہ فارسی میں اس کا وجود ہی نہ تھا ۔ اس صنف جدید کا ابھی بچپن ہے ۔ ہنوز اس کو پختگی اور کمال حاصل نہیں ہوا ۔ ہمارے ملکی ڈراما نگاروں میں ابھی پختہ کاری نہیں آئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے کریکٹر نامکمل اُن کے پلاٹ اکثر ناقص اور ناتمام ہوتے ہیں، اُن کی تحریروں میں صرف لفاظی اور سطحی باتیں ہوتی ہیں ۔ شیکسپیئر اور دیگر یورپی جادو نگاروں کے ڈرامے البتہ ترجمہ ہو گئے ہیں ۔ اور ہندوستانی اسٹیج کے حسب حال ان میں کچھ تغیر و تبدل بھی ہو گیا ہے ۔ اُردو ڈراما نویسی کے سامنے ایک درخشاں مستقبل ضرور ہے ۔

باب ۳

اُردو شاعری کی عام خصوصیات

اُردو شاعری فارسی شاعری کی مقلد ہے

اُردو شاعری دیسی پیداوار نہیں ہے وہ فارسی سے پیدا ہوئی اور فارسی کے نمونے اس کے پیش نظر تھے۔ فارسی علم عروض نے جو عربوں کی ایجاد تھا اُردو شاعری پر بہت بڑا اثر کیا۔ اسی طرح فارسی بحور اور قواعد عروض میں بھی فارسی کا اتباع کیا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ غیر ملکی پودا جڑ پکڑ گیا اور اُس کو اس ملک کی آب و ہوا راس آئی۔ بحروں کے علاوہ شعرائے اُردو نے فارسی ہی کی تشبیہیں اور وہی مضامین اخذ کیے اور یہ سب چیزیں بلا لحاظ ملکی ضروریات کے اور بلا امتیاز اس کے کہ اُردو زبان کی اصل کیا تھی اور اس میں استعداد کس قدر تھی داخل زبان ہو گئیں اور ہمارے شعرائے اُردو کا مایہ بساط بن گئیں۔ اس تتبع میں فائدہ اور نقصان دونوں مضمر تھے۔ نقصان یہ کہ اُردو شاعری کو وہ مدارج ارتقا طے کرنا نہیں پڑے جن کی رفتار تو ضرور سست تھی لیکن ایک نئی زبان کی ترقی کے واسطے وہ ازبس ضروری تھے۔ مثال کے لئے انگریزی شاعری کو دیکھو کہ جس نے یہ منازل ارتقا بتدریج طے کر کے معراج ترقی حاصل کی۔ اُردو میں اس کمی کی وجہ

سے وہی پرانی فرسودہ باتیں اور وہی مضامین جو فارسی شاعری میں بکثرت پائے جاتے تھے اور جن کا کوئی تعلق اس ملک سے نہ تھا دفعتاً سنگِ بنیاد بن گئے۔ شروع میں تو اکثر اُردو اشعار فارسی اشعار کا لفظی ترجمہ ہوتے تھے اور اب بھی ہمارے شعراء صائب، حافظ، نظیری اور بیدل وغیرہ کی تقلید کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔

تقلید کے بُرے نتائج

اس حریصانہ جذب اور کورانہ تقلید سے یہ بُرا نتیجہ پیدا ہوا کہ اُردو شاعری میں اصلیت مفقود ہو گئی اور بسا اوقات ابتذال پیدا ہو گیا۔ سرزمینِ ہندوستان ان مضامین سے ناآشنا ہے۔ لیلیٰ مجنوں کا عشق، شیریں فرہاد کی محبت، رستم و اسفندیار کی بہادری، مانی اور بہزاد کی نقاشی، جیحون و سیحون کی طغیانی، بیستون اور الوند کی بلندی وغیرہ وغیرہ یا جانوروں میں بُلبُل، درختوں میں سنبل وغیرہ یہ سب غیر ملکی چیزیں ہیں جن کو یہاں کے لوگوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ اسی تتبع کی وجہ سے شاعری واقعیت سے

اُردو شاعری محض نقالی ہے

ہٹ کر صرف نقالی رہ گئی۔ ہندوستانی بادشاہوں کے عدل کی جب تعریف کی جاتی ہے تو اُن کا مقابلہ نوشیرواں سے کیا جاتا ہے۔ سخاوت میں وہ حاتم بنائے جاتے ہیں حوالاں نصیب عاشقوں کی مثال کے واسطے سوائے مجنوں کے کوئی نہیں ملتا اور ان کی معشوقہ ہمیشہ لیلیٰ ہوتی ہے۔ ایک حسین آدمی کی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ یوسف کی طرح ماہِ کنعاں ہے اور معشوق کے سخت احکام کی تعمیل کرنے والا کوہکن، خطاب پاتا ہے۔ قد کی تشبیہ کے لئے سرو و شمشاد۔ آنکھوں کے واسطے نرگس، زُلف کے لئے سنبل، بےرحمی اور سفاکی کے لئے تُرک، گُل کی عاشق بُلبل، سرو کی دلدادہ فاختہ، بادِ صبا کی اٹکھیلیاں، چاند کو دیکھ کر کتاں کا پارہ پارہ ہونا، یہ سب فارسی سرمایہ اُردو کے واسطے مخصوص بلکہ اُس کی مِلک ہو گیا اور ان کی وہ بھرمار ہوئی کہ شاعری اپنی اصلیت کو بھول گئی اُس کو اپنے مُلک کی تشبیہات سے نفرت پیدا ہو گئی اور اپنے وطن کی حسین سے حسین چیزوں کی قدر کرنے کا احساس تک اُس سے فنا ہو گیا۔ مثلاً ہندوستان کی بہار اس کا موسم برسات ہے مگر

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری اُردو شاعری میں اس کے صحیح اور دلکش مناظر کا کہیں پتہ نہیں، ایسے ہی ہندوستان کا موسم گرما، موسم بہار، ہمالیہ کی سربفلک برف زار چوٹیاں، گنگا اور جمنا کے خوب صورت گھاٹ، اُن کا ہمارے قدیم شاعروں نے کوئی خیال نہیں کیا۔ زبان بھاشا کی خوبصورتی اور شیرینی کو دوسری زبان کی دل فریبیوں پہ قربان کر دیا۔ مختصر یہ کہ اُردو شاعری نے فارسی شاعری کی تقلید آنکھ بند کر کے جزئیات تک میں کی مرجارلس لائل اسی تقلید کی نسبت لکھتے ہیں کہ اُردو شاعری فارسی شاعری کا کامل اتباع کرتی ہے اور وہی مضمون بار بار دُہراتی ہے جن کو خود اساتذۂ فارس نے بارہا پامال کیا ہے مضامین اور الفاظ دونوں ابتدا سے آج تک جیسے تھے ویسے ہیں ان میں کوئی جدّت یا اصلیت نہیں پائی جاتی اور اسی کمی کی وجہ سے ان کو ایک نہایت مہتم بالشّان اور مستقل علم معنی و بیان کی بنیاد رکھنا پڑی۔ جبکہ کوئی چیز جو کسی شاعر کو کہنا ہو اور اُس کو اُس سے بیشتر سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہہ گئے ہوں تو ظاہر ہے کہ اُس کے واسطے یہ بہت ضروری ہے کہ اُس چیز کے کہنے کا اپنے واسطے ایک خاص اسلوب مقرر کرے۔ بس یہی اسلوب یا بہ الفاظ دیگر علم معنی و بیان نہ کہ جذبات شعراء اُردو شاعری کا مایۂ ناز ہو گئے۔ اسی وجہ سے نہایت دلچسپ و دلچسپ مبالغے نئی نئی بندشیں اور ترکیبیں، صنعت تضاد اور اسی قبیل سے دیگر صنائع و بدائع اُردو شاعری کی روح رواں بن گئیں۔

اُردو شاعری صرف رسمی رہ گئی

اُردو شاعری میں نہ صرف تکلفات ظاہری ہی کی کثرت ہے بلکہ وہ محض رسمی اور لکیر کی فقیر ہے۔ وہی استعارے وہی تشبیہیں جو بار بار لکھی جا چکی ہیں پھر دُہرائی جاتی ہیں۔ آئینۂ فطرت کے مشاہدہ کا اس میں کہیں پتہ نہیں اسی وجہ سے مضامین میں کسی قسم کی تازگی نہیں اور نہ کوئی نیا پیغام ہوتا ہے۔ پرانے شعراء کی گمشدہ کو لین مضامین کی تلاش میں بار بار ڈھونڈھی جاتی ہیں۔ اور مقررہ قواعد کے بموجب پھر انہیں باتوں کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ شاعری محض تلی تُلی چیز ہو گئی، نہ کبھی کم ہوتی ہے نہ زیادہ۔ ہر شاعر

اپنے کلام میں اسی آموختہ کو رٹتا ہے اور اسی وجہ سے اُردو شاعری کا بازار تصنّعات اور بے مزگی سے بھرا ہوا ہے۔

قافیہ پیمائی فارسی کی تتبع میں اُردو میں بھی ایک قافیہ اور بعض اوقات دو قافیوں کی پابندی لازمی ہے۔ قافیہ گو کہ کانوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اظہار خیال میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مدّت ہوئی ہے کہ یورپ کی شاعری اس بارگراں سے سُبکدوشی حاصل کرکے آزاد ہو گئی ہے۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ قافیہ پہلے ذہن میں آتا ہے جو مضمون کی طرف رہبری کرتا ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیئے کہ مضمون خود قافیہ پیدا کرے غرضکہ انہیں قیود سے اُردو شعراء کے تمام دوادین بھرے پڑے ہیں۔ اب اس بدمزگی کا احساس خود ہمارے شعراء کو پیدا ہو چلا ہے۔

خلاف نیچر مضامین علاوہ نقائص مذکورۂ بالا کے سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اُردو شاعری میں اکثر مضامین فطرت کے خلاف باندھے جاتے ہیں۔ مثلاً مرد کا عشق مرد کے ساتھ جس کے لئے کوئی معقول وجہ یا عذر بھی نہیں پیش کیا جاتا۔ ایک لڑکے کو معشوق تصوّر کرکے اس کے گھونگروالے بال اس کی زلفیں اس کا سبزۂ خط اس کی بھیگی مسیں اُس کے خدوخال اس لطف سے بیان کئے جاتے ہیں کہ جس کی تہذیب حال کبھی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس رنگ کو ہمارے قدیم شعرائے اُردو نے شروع کیا۔ جس کا تتبع آج تک کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں تہذیب اور متانت کے اعتبار سے بھاشا کو اُردو پر اس معاملہ میں فوقیت حاصل ہے۔ بھاشا میں شاعر اپنے کلام میں عشق اس طرح ظاہر کرتا ہے جیسے ایک عورت اپنے شوہر یا عاشق کے فراق میں گریہ کرتی ہے یا جیسے اس کا خیالی معشوق اس کے جذبات کا احترام نہیں کرتا برخلاف اس کے ہمارے اُردو شعراء بسا اوقات عشق کا اظہار اپنے ہم جنس کے لئے کرتے ہیں اسی اختلاف کی وجہ سے بھاشا کی شاعری حقیقی اور موافق فطرت ہے اور دل میں گھر کرتی ہے۔ اور خیالات میں بلندی اور رفعت

پیدا کرتی ہے۔ بخلاف اس کے اُردو کے اکثر عاشقانہ اشعار میں زنانِ بازاری کے حُسن و دل فریبی کا ذکر ہوتا ہے جس سے خیالات میں پستی اور عبارت میں ابتذال پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی ایک چیز اس امر کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ اُردو شاعری فارسی کی سراسر پیرو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری اور زبان کو پنپنے اور ترقی کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہ وجہ بھی ہوئی کہ لوگوں نے اُردو شاعری کو محض تفنّنِ طبع سمجھا اور جب کبھی فارسی شعر گوئی سے اُن کو فرصت ہوئی تو تھوڑا سا وقت دل بہلانے کے لئے اس میں بھی صرف کر دیا۔ بڑی قباحت یہ ہوئی کہ وہ لوگ عموماً ہندی اور سنسکرت سے ناواقف تھے جس کی وجہ سے وہ ان دونوں زبانوں کی برکتوں سے منتفع نہ ہو سکے۔ فارسی چونکہ سرکاری اور درباری زبان تھی اور اُس وقت کے بڑے بڑے رئیس و امیر عالم و فاضل اور شاعر سب اسی کو پسند کرتے تھے اور یہی زبان رائج تھی لہٰذا قدرتی طور پر ہندی الفاظ اس کے مقابلہ میں اُن کو بھدّے اور اجنبی معلوم ہُوئے اور اسی وجہ سے وہ ترک کر دیئے گئے۔ ہمارے ذہن میں فارسی تتبع کی بڑی وجہیں صرف دو ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ زبان فارسی کا بازار اُس وقت تک گرم تھا دوسرے یہ کہ وہ لوگ سنسکرت اور بھاشا سے ناواقف تھے انہیں وجوہ سے زمانہ قدیم میں اُردو کی بے قدری تھی۔ چنانچہ متقدمین اساتذہ اُردو سب فارسی گو شاعر تھے یہاں تک کہ مرزا غالب بھی فارسی کے مقابلہ میں اپنے اُردو کلام کو ہیچ سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من است

گزشتہ زمانہ کے عربوں میں یہ دستور تھا کہ عاشق اپنی معشوقہ کو بنت العم کے خطاب سے یاد کرتا تھا اور اپنے عشقیہ اشعار اس کی شان میں نظم کرتا تھا اور بالآخر اسی کے ساتھ اس کا عقد ہو جاتا تھا۔ اس رسم کا ایک بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات معشوقہ کا نام ظاہر ہو جانے سے جھگڑا اور فساد برپا ہوا اور کبھی کشت و خون تک نوبت پہنچی، لہٰذا اس خرابی کے دُور

کرنے کے لئے محض فرضی اور خیالی عورتوں کے نام تجویز کئے گئے۔ پردہ کے رواج نے عورتوں کے کھلم کھلا نام لینے کو ممنوع قرار دیا۔ جس کی وجہ سے یا تو ان کے واسطے کسی مشہور معشوقۂ سلف کا نام لیا جانے لگا اور یا وہ صیغۂ تذکیر کے ساتھ یاد کی جانے لگیں۔ فارسی میں صیغۂ تذکیر و تانیث میں فرق نہ تھا۔ اسی وجہ سے شاید یہ صورت ابتری ظاہر ہوئی یہ عذر بارہ فارسی میں جہاں تذکیر و تانیث کا کوئی امتیاز نہیں ہے مقبول ہو سکتا ہے مگر اردو میں جس میں کہ افعال و اسماء سب میں تذکیر و تانیث کی تفریق موجود ہے اور پورا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ یہ عذر لنگ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے ہر ملک کا ادب وہاں کی سوسائٹی کے اخلاق کا آئینہ ہوتا ہے یعنی سوسائٹی کی اخلاقی خرابیاں کسی ملک کے ادب سے بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں کے جواب میں عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ بظاہر تذکیر کے صیغے استعمال کئے جاتے ہیں مگر حقیقتاً ان سے مراد وہی فرقۂ اناث ہوتا ہے جس میں حقیقی معشوق بننے کی قابلیت موجود ہے مگر سچ پوچھئے تو تہذیبی و اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ جواب بھی ٹھیک نہیں ہے اس لئے کہ پردہ کی وجہ سے شریف عورتیں سامنے نہیں آسکتیں۔ پس لامحالہ جس حسن کا ذکر ہوگا وہ بازاری عورتوں کا شمار کیا جائے گا۔

اصنافِ سخن اردو شاعری میں اصنافِ ذیل پر طبع آزمائی کی جاتی ہے:۔

غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ۔

غزل اور اس کا رنگ ان میں سب سے مشہور صنفِ شاعری غزل ہے جس کا رنگ زیادہ تر عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے۔ اساتذۂ متقدمین کے کلام میں تصوف کا رنگ سب رنگوں پر غالب تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں مذہبی بیداری کی ایک لہر تمام ہندوستان میں دوڑ گئی تھی بھگتی کا عقیدہ اور رام و کرشن کے روایات جنہوں نے ادبِ ہندی پر بہت اثر ڈالا اسی مذہبی بیداری کے علامات ہیں۔

تصوّف | تمام قدیمی شعرائے اُردو صوفی تھے اور ان بزرگوں کی اولاد میں تھے جو مجاہدینِ اسلام کی فوجوں کے ہمراہ خود آئے تھے یا اس زمانہ کے چند روز بعد ہندوستان میں داخل ہوئے تھے ان میں مذاقِ تصوّف اُن کے اسلاف سے وراثتاً چلا آتا تھا۔ اور لوگ ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ چنانچہ اُردو کا سب سے پہلا شاعر ولی دکنی ایک بہت بڑا صوفی تھا اور دِلّی کے ایک مشہور بزرگ شاہ سعد اللہ گلشن کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا۔ اسی طرح شاہ مبارک آبرو، شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے جو ہندوستان میں ایک بہت مقدس بزرگ گزرے ہیں۔ شیخ شرف الدین مضمون گو ایک سپاہی پیشہ شخص تھے مگر آخر میں دُنیا چھوڑ کر فقیر ہو گئے تھے۔ شاہ حاتم اور مرزا مظہر جانِ جاناں بھی مشہور صوفیائے کرام سے گزرے ہیں۔ خواجہ میر درد جو کہ خواجہ بہاء الدین نقشبند کی اولاد میں تھے علاوہ شاعری کے دولتِ فقر سے بھی مالامال تھے۔ ان کے علاوہ مشہور پہلوانانِ سخن میر۔ سودا اور اسی طرح ان کے ہمعصروں کے کلام میں بھی تصوّف کا رنگ نمایاں ہے فارسی شاعری چونکہ مضامین تصوّف سے مملو تھی لہٰذا یہ بہت قدرتی بات تھی کہ اُردو نے منجملہ اور چیزوں کے اس میں بھی اُس کی پیروی کی۔ تقدس، ریاضتِ نفس ترک ماسوی اللہ، دنیاوی نمایش اور ریاکاری سے اجتناب، تعیّش، اور حصولِ دولت و اقتدار سے بیزاری کہ ان چیزوں کے لئے اہلِ دنیا ساعی رہتے ہیں۔ عزلت گزینی اور اپنی ہستی کو عبادتِ الٰہی کے لئے وقف کر دینا۔ ان کو تصوّف کا بنیادی اصول سمجھنا چاہیئے۔ شعرائے صوفیہ حسنِ مجازی کی تعریف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس کو حسنِ حقیقی کا زینہ سمجھتے ہیں اور عشقِ حقیقی کا ذوق لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کے واسطے انہیں ظاہری نقوش و علامات سے کام لیتے ہیں۔ اُن کا مقولہ ہے :-

متاب از عشق رو گرچہ مجازی است
که آن بہر حقیقت کارسازی است

ایران اور ہندوستان کی عاشقانہ شاعری میں روحانی اور شہوانی جذبات کی عجیب آمیزش انہیں نکات تصوّف کی بدولت ہے۔

عاشقانہ غزل میں عاشقانہ رنگ کی بنیاد تصوّف اور اہل دربار کی عیش پرستی اور فارسی شاعری کے تتبع پر پڑی۔ غزل اُردو شاعری کی جان ہے۔ انگریزی میں اگر اُس کے مقابل کوئی چیز ہے تو سانٹ ہے۔ غزل کے لغوی معنے عورتوں سے باتیں کرنا ہیں۔ غزل میں چند اشعار ہوتے ہیں اور ہر شعر بہ اعتبار مطلب کے مکمل ہوتا ہے یہی چیز غزل اور سانٹ میں مابہ الامتیاز ہے یعنی غزل میں ہر شعر بجائے خود مکمل اور ایک دوسرے سے بے نیاز ہوتا ہے اور سانٹ میں سب اشعار مربوط و مسلسل کسی ایک مضمون پر ہوتے ہیں اصناف شاعری میں سب سے سہل اور اسی وجہ سے سب سے زیادہ برتی جانے والی چیز غزل ہے۔ غزل میں تسلسل کا لحاظ کم رکھا جاتا ہے۔ مضامین غزل محدود ہیں اور اسی وجہ سے شاعر کو ایک شعر پر اپنی پوری قوّت صَرف کر کے طبع آزمائی کا موقع ملتا ہے۔ اگرچہ بلحاظ مضامین تنوع بھی ہوتا ہے۔ جن مضامین میں غزلیں عام طور پر کہی جاتی ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔ عاشق کی حرماں نصیبی، وصل کی جستجو، معشوق کے جور و جفا، گل و بلبل کے راز و نیاز وحشت و جنون، عشق کی بلا انگیزی، معشوق کے سراپا کی تعریف، باغ و بہار کے مناظر، بادۂ گلفام کی تعریف و طلب، رقیبوں کے شکوے، عاشقانہ شاعری دُنیا کی تمام ادبی تصانیف میں موجود ہے۔ کیونکہ عشق ایک فطری جذبہ ہے جس کا اظہار ہر زبان سے ہوتا ہے۔ تصوّف حُسنِ مجازی کو عشق حقیقی کی اوّل منزل سمجھتا ہے جیسا کہ چند سطریں پیشتر بیان کیا گیا۔

اہل دربار کا اثر اُردو شاعری پر اُردو شاعری اہل دربار میں ہمیشہ مرغوب اور ہر دلعزیز رہی اور اُمرا اور رؤسا کے درباروں میں اس کی ترقی اور نشو و نما ہوئی۔ دِلّی، حیدرآباد، لکھنؤ اور رام پور شاعری کے مرکز رہے ہیں اور یہیں کے فرمانرواؤں نے اُردو شاعری کو پروان چڑھایا۔ مگر درباری اثر شاعری پر دو حیثیت یعنی نفع اور نقصان کی صورت میں مترتب ہوا۔ نفع اس معنی میں کہ شعراء کو اُن کی جانکاہی کے صلہ میں انعام و اکرام خوب دیا گیا اور اُن

کی محنت ٹھکانے لگی۔ نقصان اس صورت میں کہ مضامین شاعری محدود ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ شعراء کو رئیس واہل دربار کے مذاق کی پیروی کرنا پڑی۔ دلّی اور لکھنؤ کی سلطنت کا مٹ جانا اُردو شاعری کے زوال یا کم از کم اس کے ضعف کا خاص باعث ہوا۔ عاشقانہ رنگ فرمانروایان اودھ کے دربار میں خصوصیت کے ساتھ مقبول تھا۔ اس وجہ سے کہ اُن لوگوں کے دلوں میں خود تعیش کے جذبات موجود تھے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر اُس زمانہ کے شاعروں کے کلام کا بیشتر حصّہ اس رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ قصائد اور غزل دونوں بکثرت کہے جاتے تھے۔ ایک میں کسی نواب یا وزیر کی تعریف تو دوسرے میں کسی اصلی یا فرضی معشوق کا ذکر ہوتا تھا۔ چونکہ ان لوگوں کو خوش کرکے شعراء کو اپنی کار برآری کرنا ہوتی تھی۔ اسی لئے وہ ان دونوں رنگوں میں مشغول رہتے تھے۔ انگریزی شاعر اسکاٹ[1] کے یہ دونوں شعر اسی حالت کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں ؎

شاعران نکتہ رس سے لیتے ہیں محنت مدام
اپنے رنگ عیش وعشرت کیلئے سب بادشاہ

لیکن اپنی روح کو کر لیتے ہیں پابندِ دام
تھوڑی سی تنخواہ کے لالچ میں یہ کہتے ہیں مدح

اسی درباری وابستگی اور ہم آہنگی کا یہ بُرا نتیجہ ہوا کہ ہماری اُردو شاعری سے وہ تنوع پرکاری وسعت اور جدّت مفقود ہو گئی جو دنیائے شاعری کی جان ہے۔

دیہاتی اور قدرتی مناظر کی اُردو شاعری میں کمی

اُردو شاعری کا دائرہ محدود ہے۔ قدرتی مناظر پر جو شعرائے مغرب کے دلوں میں عجب عجب اُمنگیں پیدا کرتے ہیں ہمارے اُردو

[1] سر والٹر اسکاٹ گزشتہ صدی کا نہایت نامور انگریزی شاعر اور ناولسٹ گزرا ہے۔ اس کے اکثر ناول اور نظمیں داخل درس ہیں اور ان کا ترجمہ بھی مختلف زبانوں میں ہو گیا ہے۔ اس کی نیچرل بیانیہ شاعری زبان انگریزی میں بہت پسند کی جاتی ہے۔ اُس کے وطن اصلی یعنی اسکاٹ لینڈ میں اس کی اس قدر شہرت اور قدر ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں اس کے کسی ناول یا کیرکٹر کے نام سے کوئی چیز بطور یادگار منسوب ہے ۱۲

شاعروں پر وہ اثر نہیں کرتے۔ اُردو میں برائنٹ[1]، ہوٹیر[2] اور ٹامسن[3] کی طرح کے شعرا کا پتہ اور نہ ورڈسورتھ[4] (Wordsworth) کا ایسا کوئی نیچر کا عاشق ہے۔ اُردو شاعری میں اصلی

---

[1] برائنٹ امریکہ کا شاعر اور اخبار نویس تھا۔ اکثر مشہور اخباروں اور رسالوں کا ایڈیٹر رہا۔ ہومر کی الیڈ اور اوڈیسی کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ [2] ہوٹیر یہ بھی امریکن شاعر اور جریدہ نگار ہے۔ اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی پرزور نظموں کے ذریعہ سے انسدادِ غلامی میں بڑی مدد کی۔ چنانچہ اس کو وہاں انسدادِ غلامی کا ملک الشعراء کہتے ہیں۔ [3] ٹامس (۱۷۰۰ء لغایت ۱۷۴۸ء) انگلستان کا خوشگو نیچرل شاعر ہے اس کا مجموعۂ نظم موسوم بہ سیزنس (موسم) مشہور ہے جس میں زمستان تابستان بہار خزاں چاروں فصلوں کا حال نہایت شاعرانہ پیرایہ میں لکھا ہے۔ چند ڈرامے بھی لکھے مگر وہ مقبول نہیں ہوئے۔ اس کی دیگر تصانیف میں رول برطانیہ اور کیسل آف انڈولینس بہت مشہور ہیں۔ [4] ولیم ورڈسورتھ (۱۷۷۰ء لغایت ۱۸۵۰ء) نہایت مقبول انگریزی شاعر ہے۔ اس کا اُن لوگوں میں شمار ہے جن کو زبان انگریزی میں "لیک پوئٹ" یعنی جھیل کے شعرا کہتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ ورڈسورتھ اور اس کی بہن ڈارتھی اور کولرج وغیرہ ایک ایسے مقام پر رہتے تھے جس کا نام گراسمیر ہے اور جو اپنے نام کی ایک جھیل کے پاس واقع ہے۔ ورڈسورتھ کو انقلاب فرانس کے زمانہ میں آزادی پسند جماعت سے جو "جاکوبنسٹ" کہلاتے تھے بہت ہمدردی تھی مگر جب نپولین نے اصول جمہوریت کو توڑ کر جبر و استبداد شروع کیا تو اس کی ہمدردی اس جماعت سے بالکل منقطع ہو گئی۔ ورڈسورتھ کی تصانیف کثرت سے ہیں منجملہ جن کے اس کی فلسفیانہ نظم رکلوس (راہب) بڑی اعلیٰ پیمانہ کی ہے۔ اُس کے علاوہ ایکسکرشن (گلگشت) اوڈ ٹو ڈیوٹی (غزل بر فرائض انسانی) اوڈ انٹی مٹیشنس آف امارٹیلٹی (ازل کی یاد) وغیرہ حال کی انگریزی شاعری میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ کولرج کا قول ہے کہ ورڈسورتھ نے خاص کام یہ کیا کہ دنیا کی معمولی چیزوں کو ایک فلسفی شاعر کی نظر سے دیکھا اور ان میں وہ وہ باتیں پیدا کیں جو ہر شخص کو نہیں سوجھتیں، دوسری بڑی خصوصیت اس کی یہ ہے کہ وہ عالم نباتات میں ایک روح کا قائل تھا اور اُن کو ذی حیات تصور کرتا تھا۔ ورڈسورتھ علاوہ شاعری کے فن تنقید کا بھی اُستاد تھا۔ سودے (Southey) کے بعد خطاب ملک الشعرا اسی کو ملا تھا۔

قدرتی مناظر مثلاً بہتا ہوا دریا، لہلہاتے کھیت، گاتی ہوئی چڑیاں ۔ اس قسم کی چیزوں کا ذکر بہت کم ہوتا ہے گو کہ مصنوعی اور فرضی مناظر باغوں، چشموں، بلبل و گل، قمری و سرو وغیرہ کا ذکر کثرت سے ہے۔ شعرائے اُردو کے سرودہ میں صرف ایک ہی تار ہے اور وہی بار بار بجایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بے سُرا ہو جاتا ہے۔ سمندر کی تعلیمیں، آزادی کے راگ، حسن کی صحیح تصویریں، اُردو شاعری میں نہیں ہیں۔ وہی پامال مضامین جن کو بادشاہ اور اہلِ دربار پسند کرتے تھے۔ مثلاً شراب و کباب، رقیبوں کے شکوہ و شکایات، عاشقوں کی حرماں نصیبی، فلک کے جور و ستم، تقدیر کی گردشیں بکثرت ہیں۔ البتہ تھوڑے دنوں سے جب سے کہ انگریزی تہذیب و تعلیم کا چرچا پھیلا۔ نیچرل مضامین پر بھی طبع آزمائی کی جانے لگی اور اُن کی مقبولیت سے اُمید ہے کہ اس صنف جدید میں بہت جلد ترقی ہوگی۔

اُردو شاعری حزن و یاس کی شاعری ہے کُل مشرقی شاعری جس میں اُردو شاعری بھی داخل ہے، حزن و یاس کے مضامین سے مملو ہے۔ ایک یورپین نقاد کی رائے ہے کہ زوالِ مشرق اپنی طبیعت کی اُفتاد سے افسردہ خاطر، پُر اسرار سوچ بچار میں وقت گزارنے والے اور تقدیر کے قائل واقع ہوئے ہیں۔ دنیائے عمل میں وہ بہت کم حصہ لیتے ہیں۔ اُن کی زندگی میں زیادہ تر حزن و یاس، درماندگی و بیچارگی، زندگی سے تنفر، دُنیا کی بے ثباتی کا ہر دم تصوّر، دُنیاوی ترقی اور مرفہ الحالی سے اجتناب شامل ہے۔ اسی دنیا کی بیزاری کی وجہ سے وہ اکثر اوقات باوجود اپنے ارادوں کے بھی مذہب اور تصوف کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا گڑگڑا کر دُعائیں مانگنا، تقدیر سے مقابلہ کرنے کو بیکار سمجھنا، انسانی قوتِ ارادی کو بالکل معطل و بیکار سمجھنا، زمانہ اور آسمان کی شکوہ و شکایات یہ سب باتیں اہلِ مشرق کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ علاوہ مذکورہ بالا باتوں کے جو تمام مشرقی مصنفین کے یہاں بالعموم پائی جاتی ہیں، ہندوستان میں اس پابندیِ قسمت اور مجبوری کا ایک اور بھی سبب ہے جو اُن کی فطری حزن و یاس کے رنگ کو اور گہرا کر دیتا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کا اختر سعادت و اقبال غروب ہو گیا اور ان کی گزشتہ عظمت و جبروت کے واقعات خواب و خیال ہو گئے) اردو میں خوشی اور مسرت کے نغمہ سرائی کرنے والے مثل براوننگ[1] بہت کم ہیں مگر کہا جا سکتا ہے کہ اسی مایوسی اور مجبوری کی وجہ سے مشرقی شعراء کے کلام میں ایک خاص قسم کا درد و اثر پیدا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ان کا کلام مقبول خاص و عام ہے۔

قصائد قصائد نویسی میں بڑے بڑے اساتذۂ فارس مثلاً انوری و خاقانی، عرفی و قاآنی اور ظہیر فاریابی وغیرہ کی پیروی کی گئی۔ اُردو کے مشہور قصیدہ گو سودا، ذوق اور امیر وغیرہ ہیں۔ قصیدہ کے انداز میں بھی فارسی کا تتبع کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اُس میں شکوہ الفاظ اور علوِ مضامین کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ وہی فارسی ترکیبیں اور استعارے تشبیہیں مبالغے وغیرہ عام طریقے سے برتے جاتے ہیں۔ چونکہ قصیدہ کسی خاص شخص کی تعریف میں کہا جاتا ہے۔ لہٰذا ممدوح کی صفات کو نہایت مبالغہ کے ساتھ ہر ممکن طریقہ سے بیان کرتے

---

[1] رابرٹ براوننگ (سنہ ۱۸۱۲ء لغایت ۱۸۸۹ء) دورِ وکٹوریہ کا نہایت نامور شاعر تھا۔ انیسویں صدی یعنی کوئن وکٹوریہ کے عہد میں جس کو انگریزی شاعری کا دورِ متاخرین بلکہ آخری دور کہنا چاہیئے۔ تین نامور شاعر گزرے ہیں ورڈسورتھ، ٹینیسن اور براوننگ، اور ان تینوں کا انداز بیان ایک دوسرے سے الگ ہے۔ براؤننگ کے یہاں روحانیت کا عنصر غالب ہے۔ مضامین نہایت بلند خیالات نہایت پاکیزہ گو عبارت میں کسی قدر پیچیدگی ہوتی ہے جیسے فارسی میں مرزا بیدل کے کلام میں۔ ایک قابل ذکر بات اس میں یہ تھی کہ اس کی بیوی بھی نہایت مشہور اور صاحب تصنیف شاعرہ تھی۔ تمام قوموں میں دستور ہے کہ ہمعصر شعرا ایک دوسرے کے کلام کے متعلق مذاق و طنز آمیز باتیں کرتے ہیں چنانچہ براؤننگ کی مشہور کتاب سارڈلو جب نکلی تو اس کے دوست ٹینیسن نے دیکھ کر کہا کہ میں اس کے صرف دو شعر سمجھ سکا ہوں یعنی پہلا اور آخری اور وہ بھی صحیح نہیں ہیں اور کارلائل نے جب یہ کتاب اپنی بیوی کی زبان سے سُنی تو کہا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سارڈلو کسی آدمی کا نام ہے یا کسی شہر کا یا کتاب کا!! ۱۲

ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض قصائد بہ لحاظ مضمون و زبان اپنا جواب نہیں رکھتے مشکل بحریں، سخت قوافی قصیدہ گو کی قابلیت پر دال ہوتے ہیں۔ اکثر قصائد صنائع بدائع سے بھرے ہوئے ہیں۔

مثنوی شعراء اُردو میں یہ صنف بہت مقبول رہی ہے۔ اس میں بھی بحروں اور فارسی قواعد نظم وغیرہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی شاعری میں جو دو مشہور صنفیں معروف بہ ایپک اور ڈراما ہیں۔ اُردو میں صنف مثنوی ان کا جواب ہے مگر ہماری رائے میں مثنوی اور اصناف مذکورہ میں فرق ہے۔ اُردو کے مشہور مثنوی نویس میر۔ میر حسن۔ مومن خاں نسیم۔ تلق نواب مرزا شوق اور شوق قدوائی ہیں اور سب سے زیادہ مشہور مثنویاں سحر البیان اور گلزار نسیم سمجھی جاتی ہیں۔ وہی یورپین نقاد مثنوی کے بارہ میں یوں رقمطراز ہے (مثنوی یا بیانیہ نظموں میں بھی نفس قصہ دوسرے درجہ پر اور الفاظ کے ماتحت ہوتا ہے۔ اکثر صورتوں میں قصہ کی روش ایک ہی ہوتی ہے اور پڑھنے والا اُس کے جزئیات تک سے واقف ہوتا ہے۔ ہر چند کہ اشخاص قصہ کے نام بدل دیئے جاتے ہیں مگر اصل قصہ پُرانا ہوتا ہے۔ جدت صرف وہیں ہوتی ہے جہاں ختم قصہ کے قریب افشائے راز ہوتا ہے۔ واقعات جو ایک محدود دائرہ میں بیان کیئے جاتے ہیں بدمزگی کے ساتھ بار بار دُہرائے جاتے ہیں) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اُردو میں ڈرامہ کی کمی کو مثنوی پُورا کرتی ہے مگر حق یہ ہے کہ جو لوگ ڈراما کے فن سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مثنوی اور ڈراما میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وجہ سے مثنوی میں نہ تو کیرکٹر نویسی ہے نہ پلاٹ قائم کیا جاتا ہے۔ عمدہ مواقع جو ڈراما میں پیدا کیئے جاتے ہیں ان کا مثنوی میں کہیں پتہ نہیں اور نہ وہ دلچسپ مکالمے ہیں جو ڈراما کی جان ہیں۔ واقعات کی حرکت نہایت آہستہ اور عمل معدوم ہوتا ہے۔ اُردو مثنویاں محض رسمی اور قواعد قدیمہ کی پابند ہیں۔ شاہنامہ فردوسی اور سکندر نامہ نظامی کی دُھن کو ہوا

بھی نہیں لگی۔ البتہ جیسا کہ بیان کیا گیا مثنوی میر حسن اور گلزار نسیم بہ اعتبار فصاحت و بلاغت روانی اور سلاست چستیِ بندش وغیرہ کے لیے بے نظیر ہیں۔

مراثی مراثی ادب اردو کی ایک نمایاں صنف ہے۔ ان میں مناظر خوب خوب دکھائے جاتے ہیں۔ ہر چند کہ پیروی فطرت پوری طرح نہیں کی جاتی، پھر بھی معرکہ کارزار مبارزین کی جانبازی، صبح و شام کا سماں، جنگلوں اور میدانوں کے منظر، دھوپ اور گرمی کی شدت وغیرہ کے مکمل نقشے، الفاظ میں بے مثل طریقہ سے کھینچ دیے گئے ہیں۔ پُرزور اور فصیح بیانیہ نظموں کی یہ بہترین صنف ہے۔ اس کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ ایک آیندہ باب میں بیان کیا جائے گا۔

قطعہ اور رباعی ان اصناف سخن کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہے ان میں نصیحت آمیز خیالات اور عمدہ عمدہ مضامین نظم کیے جاتے ہیں۔ تمام بڑے بڑے شاعروں نے رباعیاں لکھی ہیں جن میں انیس اور دبیر اور حالی کی رباعیاں بہت مشہور ہیں۔

اُستاد و شاگرد کا تعلق اُستاد اور شاگرد کا تعلق ادب اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔ ابتدائی کلام اُستاد کو دکھا لیا جاتا ہے اور شعرا سے اس فن میں ایک باقاعدہ قواعدلی جاتی ہے۔ چنانچہ شعرائے اُردو ایک بڑے سلسلہ میں وابستہ ہیں۔ شاگرد عموماً اپنے اُستاد کا تتبع کرتے ہیں۔ اُستاد سے انحراف کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس اتباع کی وجہ سے قدرتی ذہانت اور طباعی کا خون ناحق ہوتا ہے اور شاعری رسمی رہ جاتی ہے کبھی کبھی البتہ کوئی خاص آدمی اس دائرۂ اتباع سے علیحدہ ہو کر شہرت حاصل کر لیتا ہے۔

مشاعرے مشاعرے میں سخن گو اور سخن سنج سب جمع ہوتے ہیں۔ اس میں اور کسی طرح پر بھی طبع آزمائی کی جا سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے اُردو شاعری کو بہت ترقی ہوتی ہے۔ اس قسم کی کوئی چیز یورپ میں نہیں ہے۔

تخلص شاعر اپنے کلام میں اپنے واسطے اپنے نام کے علاوہ ایک خاص نام اختیار کر لیتا

ہے جس کو تخلص کہتے ہیں۔ بعض اوقات اُستاد شاگرد کے واسطے تخلص کا انتخاب کرتا ہے کبھی کبھی اپنے مختصر نام سے تخلص کا کام لیا جاتا ہے۔

اُردو شاعری کی خصوصیات باوجود اُن نقائص کے جو اُوپر بیان ہوئے اُردو شاعری جذباتی شاعری ہے اور ہمارے فطری جذبات میں کشش پیدا کرتی ہے۔ ماسوا اس کے شیریں اور لطیف اور اپنے طرز خاص میں بے مثل ہے۔ وہ عشق میں شرابور ہے۔ تنہائے غم، عشق کی ناکامیاں، حسرت و ارمان، ہجر کا قلق، یہ اور اس قسم کے بیسیوں مضامین جو اُردو شاعری کی جان ہیں ہمارے قلب پر ایک خاص اثر کرتے ہیں۔ اس میں ایسے جواہر بے بہا شامل ہیں جو اپنی آب و تاب سے انگریزی کیا بلکہ دنیا کے علم ادب سے علو خیال، نزاکت الفاظ، رفعت، حسن تخیل، محویت وغیرہ میں بے تکلف مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ بہت سا کلام ناقص اور بے مزہ ہے۔ مگر یہی حال دُنیا بھر کی شاعری کا ہے۔ اُردو کی نظم و نثر کو وجود میں آتے ہوئے ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا مگر زمانہ حال کی تہذیب و تعلیم کا اثر اس پر اچھا پڑ رہا ہے اس وجہ سے کہ اب اس میں قومی ترانے اور جوشیلی اور نیچرل نظمیں اور انگریزی نظموں کے ترجمے بہ کثرت ہونے لگے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب طبائع پُرانی لکیر کے فقیر رہنے کو پسند نہیں کرتیں اور جدید راہیں نکالتی ہیں۔ بہرحال اُردو کا مستقبل بہت درخشاں نظر آتا ہے۔ کیونکہ مشرق و مغرب دونوں کے قابل اور بااثر لوگ اس کی فلاح و ترقی میں دل سے کوشاں ہیں۔

باب ۳

قدیم شعرائے دکن

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا مسلمان فرمانروایان دکن کے دربار میں دکھنی زبان میں ہوئی۔ اس معاملہ کو زیادہ تفصیل سے لکھنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ یہ دریافت کیا جائے کہ دکھنی سے کیا مراد ہے اور اس میں اور زبان اردو میں کیا فرق ہے۔

دکھنی کیا چیز ہے

دکھنی زبان ہندوستانی کی ایک شاخ ہے جس کو مسلمانان دکن بولتے ہیں۔ اردو کے مانند وہ بھی فارسی نستعلیق خط میں لکھی جاتی ہے مگر اس میں فارسی الفاظ کی کثرت نہیں ہے۔ اُس میں بعض خصوصیتیں ہیں۔ جب مسلمان فوجیں اپنے ساتھ اپنی زبان کو ملک دکن میں لے گئیں اُس وقت اُس میں بہت سے ایسے محاورے داخل ہو گئے جو اب ادب اردو سے متروک ہو گئے۔ جب اس نئی زبان کا میل اطراف و جوانب کی زبانوں میں یعنی مرہٹی، تامل اور تلنگی سے ہوا تو اُس کے محاورے اور ساخت میں کسی قدر فرق آگیا مثلاً حالت فاعلیت میں اسم یا ضمیر کے بعد اور فعل ماضی کے قبل حرف (نے) استعمال

نہیں کیا جاتا جیسے کہ مغربی ہندی کی شاخوں میں قاعدہ ہے۔ اسی طرح بجائے "مجھ کو" کے "میرے کو" بولتے ہیں یہ اور اسی قسم کے چند خصوصیتیں شمالی ہندوستان میں بھی پہنچیں جہاں صفائی زبان کی تدریجی رفتار میں ان میں سے اکثر متروک ہوگئیں۔ نظر بریں دکھنی کو ایک خاص قسم کی ادبی اُردو خیال کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس کو اُردو کی ایک شاخ سمجھنا چاہیئے جس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے درباروں میں نشوونما پائی اور ولی اور اس زمانہ کے مشہور شعراء کی کوشش سے اُس کو ایک ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی۔

زبان دکھنی کی ابتدا ملک دکن کی فتح خلجیوں کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلا مسلمان بادشاہ جس نے ملک دکن پر حملہ کیا اور اس کو فتح کرکے سلطنت دہلی کا ماتحت بنایا سلطان علاء الدین خلجی ہے۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق کا دومرتبہ دکن جانا بھی اہمیت سے خالی نہیں۔ کیونکہ سلطانی حکم کے بموجب اکثر باشندگان دہلی کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ بڑے بڑے علمائے کبار اور صوفیائے عظام معمولی لوگوں کے ساتھ بادشاہ کے ہمرکاب تھے اس کے بعد بھی سلسلۂ آمدورفت جاری رہا۔ مگر اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی تباہ ہوگئی۔ چنانچہ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے "چوں مردم اطراف کہ در دولت آباد بہ تکلیف ساکن شدہ بودند پراگندہ گشتند۔ پادشاہ مدت دوسال درانجا ماندہ ہمت بر تعمیر دولت آباد بگماشت و مادر خود مخدومۂ جہاں را باسائر حرم ہائے امراد سپاہی روانہ دولت آباد گردانید۔ واحدے از مردم دہلی راکہ بر آب و ہوائے آنجا خو گرفتہ بودند بحال خود نگزاشتہ طرا بدولت آباد فرستاد و دہلی بنوعی ویران گشت کہ آواز ہیچ متنفسے بجز شغال و روباہ و جانوران صحرائی بگوش نمی رسید"۔

مختصر یہ کہ دہلی کے باشندے اب دکن کے باشندے ہوگئے اور دلی کا نقصان دولت آباد کا فائدہ ہوا۔ امتداد زمانہ کے باعث آب و ہوا کے اثرات، زبانوں کے اختلاط اور مقامی باشندوں کے ساتھ ربط و ضبط نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ جو زبان دلی والے اپنے ساتھ لے گئے تھے اس میں نمایاں تغیر ہوگیا۔ اور آخر ان دونوں زبانوں میں معتدبہ فرق

معلوم ہونے لگا۔

دکن میں اُردو شاعری کی ابتدا کے اسباب

اس امر کی تحقیقات کہ دکن میں اُردو شاعری کی ابتدا کے کیا اسباب ہوئے بہت دلچسپ ہے۔ قرین قیاس یہ تھا کہ اس کی نشو و نما دلّی میں ہوتی جو اس کا اصلی گھر تھا۔ مگر بجائے اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم شعرا اُردو کا گہوارہ دلّی سے اتنا دُور دراز مقام یعنی دکن ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ اس ضروری سوال کا جواب دینے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔ اس کے صحیح جواب کے لیے ایک اہم واقعۂ تاریخی کی طرف حوالہ دینا ضروری ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ مشہور خاندان بہمنی کا بانی ایک برہمن گنگو نامی کا ایک چیلا تھا جب کہ انقلاب زمانہ سے وہ تخت نشین ہوا تو اُس نے نہ صرف شگون نیک کے واسطے اپنے گرو کا نام تعظیماً اپنے خاندان کے نام میں شامل کیا بلکہ اُس کو اپنا وزیر مال بھی مقرر کیا۔ تاریخ فرشتہ[۱] میں لکھا ہے کہ یہ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ گنگو پہلا برہمن ہے جس نے ایک مسلمان بادشاہ کی ملازمت اختیار کی۔ اُس سے قبل برہمن لوگ معاملات ملکی میں کوئی حصّہ نہیں لیتے تھے بلکہ اُن کی زندگی امور مذہبی کی خدمت کے واسطے وقف تھی۔ گنگو کے زمانہ سے یہ رسم نکل آیا کہ وزارت مال تمام فرمانروایان دکن کی مملکت میں برہمنوں کو تفویض ہوتی ہے ہندوؤں کے صیغہ مال میں تقرر سے یہ نتیجہ ہوا کہ زبان ہندی نے جلد ترقی کرنا شروع کی اور نیز ان دو بڑی جماعتوں یعنی ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ارتباط بڑھ گیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے بجائے دوسرے ممالک کے لوگوں کے دکھنیوں کو اپنی ملازمت میں رکھنا شروع کیا اور اس کے حکم سے ملکی حسابات جو اَب تک فارسی میں لکھے جاتے تھے، وہ برہمنوں کے زیر نگرانی ہندوی یعنی ہندی میں لکھے جانے لگے[۲] اس سے دیسی زبان کو

۱؎ دیکھو تاریخ فرشتہ ترجمہ مسٹر برگ جلد ۲ صفحہ ۲۹۲۔

۲؎ تاریخ فرشتہ جلد ۳ صفحہ ۸۰۔

بڑی تقویت پہنچی۔ کیونکہ اب وہ سرکاری اور درباری زبان ہوگئی اور اس نے بڑی ترقی کرنا شروع کی۔ ہندوؤں کی تعداد ملک دکن میں کم نہ تھی۔ یہ جماعت اپنی کثرت تعداد ہی کی بدولت مسلمان بادشاہوں کی خانہ جنگیوں میں فاتح اور برسر اقتدار شخص کو بہت مدد دیتی تھی کبھی ایک مسلمان حاکم اُن سے میل کرنا چاہتا تھا اور کبھی اُس کا حریف۔ بعض اوقات ہند مسلمان حکمران کسی ہندو راجہ کے خلاف بھی آپس میں میل کر لیتے تھے مگر اس ارتباط اور میل جول کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ باہمی معاملات سے زبان فائدہ اٹھاتی رہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تین سو برس کے عرصہ میں یعنی جب تک بیجاپور اور گولکنڈہ خود مختار سلطنتیں رہیں ان دونوں قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں میں اتنا میل جول تھا کہ ہندوستان میں کسی دوسری جگہ نہیں پایا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان محض معمولی برتاؤ اور رواداری نہ تھی بلکہ ہندو رعایا اپنے مسلمان بادشاہوں کے ساتھ دلی محبت اور خلوص سے پیش آتی تھی اور یہ حالت برابر قائم رہی۔ یہاں تک کے زوال سلطنت بیجاپور کے بعد مرہٹوں کے ساتھ ظلم و تعدّی نے اُس کا خاتمہ کر دیا[1]۔ باہمی ارتباط اور محبت و یگانگت کی حد یہ تھی کہ مسلمان بادشاہ اور امرا ہندو عورتوں سے شادی کرتے تھے اور اسی طرح ہندوؤں کو بھی مسلمان عورتوں سے شادی کرنے میں کوئی باک نہ تھا۔ انتظام ملکی میں بہ کثرت ہندوؤں کا دخیل ہونا رواداری کی پالیسی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ گو کہ باہمی خانہ جنگیاں کبھی ہوتی تھیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ سلاطین گجرات اور بہمنی بادشاہوں کو امن و امان سے سلطنت کرنے اور انتظام ملکی کو قائم رکھنے کے لئے سلاطین دہلی کی نسبت زیادہ موقعے حاصل تھے جہاں کہ شمال سے برابر حملے ہوا کرتے تھے اور رعایا کی فلاح اور بہبود مفقود تھی۔ بس (۱) مختصراً ہندو مسلمانوں کا باہمی ارتباط (۲) مسلمان فرمانروایان دکن کی سلطنت میں ہندوؤں کا عروج (۳) حساب کتاب کا زبان ملکی میں تبدیل کر دیا جانا، یہ سب اسباب

---

[1] دیکھو تاریخ دکن مصنفہ مسٹر گریبل جلد ۱ صفحہ ۲۹۴۔

مل کر اس کا باعث ہوتے کہ دیسی زبان جو دکھنی کے نام سے مشہور تھی وہ ترقی کرکے ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہو گئی (۲) اس کے ملک دکن میں اکثر بزرگان دین اور اولیاء اللہ بھی رہتے تھے جو ہندو اور مسلمانوں کی زبان اور مذہب میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ یہ لوگ عوام الناس کے ساتھ میل جول کے خیال سے دیسی زبان ہی کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر قدمائے اُردو صوفی منش اشخاص تھے اور اُن سب کے اشعار بہت صاف اور عام فہم زبان میں ہوتے تھے۔ اس مختصر بیان سے اُردو شاعری کی نشو و نما کا کچھ حال تو معلوم ہو گیا مگر اُس زمانہ کے شعراء کے حالات مکمل اور یکجا کسی معاصر تذکرہ میں نہیں دیکھے گئے۔ تذکروں میں صرف بعض شعراء کے نام ملتے ہیں اور اُن کے کلام کا بھی کچھ نہ کچھ نمونہ موجود ہے مگر یہ تذکرے بہت بعد کی تصنیف ہیں۔ غنیمت ہے کہ اس زمانے میں اس مسئلہ خاص میں کافی دلچسپی لی جا رہی ہے۔ اور ہم کو اُمید ہے کہ قابل لوگوں کی توجہ سے اس پر کافی روشنی پڑے گی۔

شاہان بہمنی کا زمانہ
۷۴۸ھ لغایت ۹۳۲ھ

آٹھویں صدی ہجری سے دکن میں علم و ادب کی ابتدا ہوتی ہے اُس زمانہ کی تصانیف کے جو نمونے اس وقت موجود ہیں وہ زیادہ تر مذہبی کتابوں کی صورت میں ہیں۔ اور اُن کے مؤلف اُس وقت کے صوفی مشرب لوگ تھے جن میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ گنج الاسلام شیخ عین الدین (متوفی ۷۹۵ھ) خواجہ سید گیسو دراز۔ شاہ میر انجی۔ مولانا وجہی اور سید شاہ میر وغیرہ۔ یہ لوگ زیادہ تر نثار تھے۔ ان کا کچھ مختصر حال ہم اس کتاب کے حصۂ نثر میں بیان کریں گے۔

قطب شاہیوں کا عہد
۹۱۶ھ تا ۱۰۹۸ھ

سلطنت بہمنی کے زوال کے بعد بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ اُس زمانہ میں دکھنی زبان کو بہت ترقی ہوئی۔ ہندو رانیوں کی وجہ سے جو شاہی محلوں میں تھیں دیسی زبان کو اور

بھی تقویت پہنچی۔ یوسف عادل شاہ کی بیوی جو بوبوجی کے نام سے مشہور تھیں، مکند راؤ مرہٹہ کی بہن تھیں۔ بھاگ متی سلطان محمد قلی شاہ کی محبوب بیوی تھیں۔ احمد نظام شاہ والی احمد نگر کی ماں بھی ہندو تھیں۔

شاہان گولکنڈہ و بیجاپور نہایت قدردان فن، مہذب اور قابل بادشاہ تھے۔ شعرا کی قدردانی کے ساتھ خود بھی فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو کو دکن میں دکھنی کہتے ہیں۔ اُن کے دربار میں ایسے لوگوں کا ایسے لوگوں کا مجمع تھا جو فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ اس نئی زبان کے اطراف و جوانب میں تلنگی مرہٹی اور کنڑی زبانیں بولی جاتی تھیں مگر بے میل ہونے کی وجہ سے اُن سے اُردو کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ نئی زبان کے ترویج و اشاعت کا انحصار ایسے لوگوں پر تھا جو فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں سے ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے اس نئی زبان یعنی دکھنی کی ترکیب زبان فارسی کے مطابق ہوئی۔ دربار گولکنڈہ اس وقت کے شعرا اور اُدبا کا مجمع تھا، جن میں مندرجہ ذیل شعرا کے نام تذکروں میں ملتے ہیں مگر حالات دستیاب نہیں ہوتے:
غواصی، ملا قطبی ابن نشاطی، جنیدی، طبعی، نوری، فائز، شاہی، مرزا، شعور، بیچارہ، طالب مومن۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ
۱۵۸۰ء لغایت ۱۶۱۱ء

یہ سلطنت ۱۵۱۸ء میں قائم ہوئی اور ترقی کی معراج پر پہنچ گئی۔ سلطان قلی قطب شاہ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کی وفات پر جو ۱۵۸۰ء میں واقع ہوئی بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ ۱۵۸۶ء میں سلطان مذکور نے ابراہیم عادل شاہ فرمانروائے بیجاپور کے ساتھ صلح کی اور اپنی بہن کا نکاح اُن کے ساتھ کر دیا۔ وہ شہنشاہ اکبر اور شاہ عباس صفوی کا ہمعصر تھا۔ گولکنڈہ سے کچھ فاصلہ پر اپنی معشوقہ بھاگ متی کے نام سے ایک شہر بھاگ نگر آباد کیا۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد اس نسبت کو بدل کر اسی شہر کو حیدرآباد کے نام سے موسوم کیا، جو

موجودہ فرمانروائے دکن کا مشہور دارالسلطنت ہے۔ قطب شاہ کو علاوہ شعر و شاعری کے دیگر فنونِ لطیفہ کا بھی بہت شوق تھا۔ چنانچہ فنِ تعمیر سے بھی اُن کو دلچسپی تھی۔ دو مشہور عمارتیں مشہور بہ خداداد محل اور بارگاہ خسروی تعمیر کرائیں۔ اُن کے دربار میں بڑے بڑے صاحبِ کمال اور اُستادانِ فن عرب و ایران سے اُن کی داد و دہش اور قدردانی کا حال سُن کر آتے تھے۔ اور اُن کی فیاضی سے مستفیض ہوتے تھے۔ بادشاہ نے ایک خاص وقت مقرّر کیا تھا۔ جبکہ علما و شعرا میں مناظرے اور مشاعرے ہوتے تھے۔ خوشنویسی کا بھی اُن کو بہت ذوق تھا۔ چنانچہ مشہور خطاط ایران و عراق کے اُن کے دربار میں جمع ہو گئے تھے علاوہ دیگر باکمالوں کے دو مشہور عالم اُن کے دربار میں میر محمد مومن استرآبادی اور میر جملہ تھے۔ قطب شاہ کا مذہب شیعہ تھا اور وہ اکثر مناظرے اپنے مذہب کی حمایت میں اہلِ دربار میں منعقد کرواتے تھے۔ اسی مذہبی شوق کی وجہ سے بہت سے مرثیے اس عہد میں کہے گئے۔ علاوہ قدردانِ فن ہونے کے خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ چنانچہ ان کا کلام بزبان دکھنی و تلنگی و فارسی ایک ضخیم کلیات کی صورت میں جس کے اٹھارہ سو صفحے ہیں موجود اور محفوظ ہے۔ اشعار فارسی میں قطب شاہ اور دکھنی میں معانی تخلص کرتے تھے۔ اُن کی کلیات میں حسبِ ذیل اصنافِ سخن موجود ہیں۔ مثنویاں۔ قصیدے۔ ترجیع بند۔ مراثی بزبان فارسی و دکھنی اور رباعیات۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے تھے۔ سادگی اور شیرینی اُن کے کلام کا جوہر ہے۔ تصوّف اور عاشقانہ رنگ بھی اُن کے اشعار میں پایا جاتا ہے۔ مرقع نگاری اور مناظر قدرت کی بنیاد اُنھیں کی رکھی ہوئی ہے جو سودا اور نظیر اکبر آبادی کے زمانہ میں تکمیل کو پہنچی۔ اکثر مثنویاں خاص ہندوستانی پھلوں اور ایک ہندوستانی ترکاریں اور شکاری چڑیوں کے متعلق ہے بعض نظموں میں شادی بیاہ اور ولادت کے رسم و رواج، ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی تہوار مثلاً ہولی، دیوالی، عید، بقرعید، بسنت وغیرہ۔ اور بعض میں ہندوستان کے موسم

برسات کا ذکر نہایت دلچسپی سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک دلچسپ مکالمہ صراحی و ساغر کا منظوم کیا ہے۔ ایک قصیدہ باغ محمد شاہی کی تعریف میں اور اکثر قصائد حمد و نعت اور منقبت میں ہیں۔ معرکۂ کربلا کے مؤثر مراثی بھی لکھے ہیں۔

قلی قطب شاہ پہلے شخص ہیں جن کا کلام اُردو مجموعی صورت میں موجود ہے۔ اُن کی زبان میں کافی پختگی اور ترقی پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے ان سے بھی پیشتر کچھ لوگ گزرے ہوں جنھوں نے شعر کہا ہو مگر اُن کے کلام کا اس وقت تک کہیں پتہ نہیں ملا۔ کچھ مذہبی تنثریاں قطب شاہ سے پیشتر کی موجود ہیں۔ مگر وہ کسی معنی میں ادبی تصنیفات نہیں کہی جا سکتیں۔ قطب شاہ ہی کا کلام اب تک ایسا کلام کہا جا سکتا ہے کہ جس میں ایک ادبی شان موجود ہے۔ اُنھوں نے سب سے پیشتر فارسی کے تتبّع میں شعر کہے اور ایک دیوان بہ ترتیب حروف تہجّی جمع کیا اور یہ سہرا اب تک عدم تحقیق کی وجہ سے ولی کے سر تھا۔ علاوہ متعارف مضامین کے اُن کے کلام میں قابل تعریف بات یہ ہے کہ اصلیت اور جدت ہے۔ اور بعض مقامی دلچسپیوں کو بھی اُنھوں نے قلمبند کیا ہے۔ فارسی کے وہ پورے تبع نہیں ہیں کیونکہ ان کے کلام میں ہندی کا بھی بہت بڑا اثر پایا جاتا ہے۔ ہندی الفاظ اور ترکیبیں ہندی استعارے اور تشبیہیں، مہند فارسی الفاظ خدا کی تعریف ٹھیٹھ بھاشا میں ہندو سورماؤں اور بہادروں اور ہندوستان کی روایات کا ذکر، اظہار عشق عورت کی جانب سے مرد کے واسطے جو ہندی شاعری کے لئے مخصوص ہے۔ یہ سب باتیں اُن کے کلام کی خصوصیات ہیں، معشوق سے طریقۂ خطاب جو بعد میں اُلٹ گیا اُن کے یہاں صحیح طریق پر پایا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ فارسی کا اتباع بھی نظر انداز نہیں کیا گیا، کیونکہ قواعد نظم الفاظ، محاورات، ترکیبیں، مضامین تشبیہات اکثر اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ وہ اپنی قابلیت کا اظہار نہیں کرتے اور فارسی عربی الفاظ کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں جیسے روزمرہ میں مشہور ہیں، عام اس سے کہ وہ لغوی طریق پر صحیح ہوں یا غلط۔ فی الحال چونکہ وہ قدیم زبان متروک ہو گئی ہے اور لوگوں کو اس میں کوئی

لطف نہیں آتا۔ اس لیے ان کا کلام دلچسپی سے نہیں پڑھا جاتا مگر جب نظر تحقیق وسیع ہو گی تو اُن کے کلام کی قدر کی جاتی ہے۔ مختصراً یہ کہ قلی قطب شاہ ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اپنے کلام کی تدوین کی اور اُردو کو ایسا وسیع کیا کہ آئندہ وہ ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہو گئی۔ اُنھوں نے ایک ایسے ادب شعر کی بنیاد رکھی جس کے پیرو اور مختتم میر و سودا، انیس و دبیر، ذوق و غالب وغیرہ ہوئے۔ نمونۂ کلام یہ ہے

دل تانگ خدا کن کہ خدا کام دوے گا | تمنن کی مرادن کے بھرے جام دوے گا
کرتے ہیں دعوے شعر کا سب اپنی طبع سوں | بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

سلطان محمد قطب شاہ
سنہ ۱۰۲۰ھ لغایت ۱۰۳۵ھ

سلطان محمد قطب شاہ سلطان قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور جانشین تھے۔ اُن کی ولادت گولکنڈہ میں ۹۹۱ھ میں ہوئی اور اُن کی شادی اپنی چچازاد بہن یعنی سلطان قلی قطب شاہ کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ نہایت متشرع اور پابند مذہب سخی اور فن تعمیر کے دلدادہ تھے۔ منجملہ دیگر تعمیرات کے الٰہی محل، جامع مسجد معروف بہ مکہ مسجد، محمدی محل، دال محل مشہور ہیں۔ نظم و نثر فارسی و اُردو دونوں خوب لکھتے تھے۔ اُن کے دو دیوان ہیں۔ ایک فارسی اور ایک دکنی جن میں اکثر اصناف سخن موجود ہیں۔ فارسی میں ظل اللہ اور اُردو میں قطب شاہ تخلص کرتے ہیں۔ اسی توافق تخلص کی وجہ سے ان دونوں بادشاہوں کا کلام خلط ملط ہو گیا ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کا تخلص اُردو کلام کے واسطے اور سلطان قلی قطب شاہ کا فارسی کے واسطے مخصوص تھا۔ ان کے دونوں دیوان حیدرآباد میں نواب سرسالار جنگ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان کے کلام میں بھی شیرینی، صفائی، لطافت پائی جاتی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

سکھی تو ہر گھڑی مجھ پہ نہ کر غیظ | محبت پر نظر رکھ کر بسر غیظ
دو لب تیرے رنگیلے یاقوت کو دیے رنگ | لے بھیک رنگ عقیقاں رنگیں ہوئے یمن ہیں

سلطان عبداللہ قطب شاہ ۱۰۲۵ھ لغایت ۱۰۸۳ھ

عبداللہ قطب شاہ سلطان محمد قطب شاہ کے بیٹے اور سلاطین قطب شاہی میں چھٹے بادشاہ تھے۔ ۱۰۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے باپ کی وفات کے بعد ۱۰۲۵ھ میں تخت نشین ہوئے۔ اُنھوں نے شاہ جہاں کے سامنے گردن اطاعت خم کی اور ایک سالانہ رقم بطور خراج کے دینا منظور کیا۔ ۱۰۶۵ھ میں جب شاہ جہاں اُن سے ناراض ہوئے تو شاہزادہ اورنگ زیب نے جو اُس وقت ممالک محروسۂ دکن کے صوبہ دار تھے حیدرآباد پر چڑھائی کر کے اس شہر کو تہ و بالا کر دیا۔ عبداللہ نے اپنی شکست قبول کر کے تمام شرائط صلح منظور کر لئے اور اس وقت سے وہ سلطنت مغلیہ کے ایک باجگزار کی حیثیت سے ہو گئے۔ یہ بھی مثل اپنے باپ کے شعر و شاعری کے دلدادہ تھے اور انھیں کی طرح اُن کو بھی فن تعمیر کا بڑا شوق تھا۔ ان کا دربار بھی فارس اور عرب کے عالموں فاضلوں سے بھرا رہتا تھا اور وہ سب اُن کی فیاضی سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ اکثر کتابیں اس عہد میں ان کے نام سے لکھی گئیں۔ مثلاً برہان قاطع اور ایک لغت موسوم بہ لغات فارسی۔ یہ فارسی اور دکھنی دونوں میں شعر کہتے تھے اور تخلص عبداللہ تھا۔ ان کے دیوان فارسی اُردو دونوں میں موجود ہیں۔ اُن کے اشعار بہت صاف اور شیریں ہوتے ہیں۔ آصفی ملکاپوری نے اپنے تذکرہ شعرائے دکن میں ان کے اکثر اُردو اشعار بطور نمونہ پیش کئے ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:

تری پیشانی پر ٹیکا جھمکتا   تماشا ہے اُجالے میں اُجالا

کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث   آب حیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا

سو مخفی نہیں اُس پہ ہیں آشکار   جو کچھ راز پردہ میں ہیں غیب کے

ابن نشاطی

اس زمانہ کے شعرائے دکن میں ابن نشاطی بہت مشہور ہوئے ہیں۔ یہ گولکنڈہ کے رہنے والے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے اُن کے حالات زندگی کچھ معلوم نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ ایک مثنوی موسوم بہ "پھول بن" کے مصنف ہیں

جو زبان دکنی میں ہے اور عشق و عاشقی کا قصہ ہے۔ اس کا نام اس کی ہیروئن کے نام پر رکھا گیا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک فارسی کتاب بساتین کا ترجمہ ہے۔ اس میں سکندر اور لقمان وغیرہ کی حکایات بھی ہیں اور ایک فرضی شہر مشہور بہ کنچن پاٹن کا حال ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ تقریباً ۱۳۰ صفحہ کا ایسٹ انڈیا ہاؤس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ معمولاً حمد و نعت و منقبت سے ابتدا ہوئی ہے۔ اس کے بعد سلطان عبداللہ قطب شاہ کی تعریف ہے۔ پھر اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ قصہ میں انسانوں کے قالب بدلنے اور جانوروں کے قالب میں آجانے کا ذکر ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ سرور نے اسی کے مطالعہ کے بعد فسانہ عجائب لکھی ہو۔ اس کی تصنیف سنہ ۱۰۷۶ھ میں ہوئی۔[1]

غواصی کا قصہ "سیف الملوک" غواصی نے بزبان دکھنی ایک مثنوی ہے جس میں سیف الملوک شاہزادہ مصر اور بدیع الجمال شاہزادی چین کے عشق کا حال ہے۔ اس کا سن تصنیف سنہ ۱۰۳۵ھ ہے۔ غواصی مذہب کا شیعہ تھا۔ اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا شاعر تھا قصہ سیف الملوک غالباً الف لیلہ سے ماخوذ ہے۔ شروع میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد بادشاہ کی تعریف ہے۔ جس کا ذکر کتاب کے اٹھارہویں شعر میں ہے۔ انہوں نے ایک اور مثنوی بھی لکھی ہے جس کا نام طوطی نامہ ہے اور یہ ۱۰۴۹ھ میں تمام ہوئی اور جس کو سر چارلس لائل غلطی سے ابن نشاطی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ دراصل یہ قصہ ضیاء بخشی کے فارسی طوطی نامہ سے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اردو میں ترجمہ ہوا تھا۔ اس وجہ سے کہ دیباچہ میں انہیں کی بہت زیادہ تعریف ہے۔ اس کا ماخذ اصلی سنسکرت کی کتاب "سوگا شپتتی" بتایا جاتا ہے۔ غواصی کے اس قصہ سے مولوی حیدر بخش نے جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مدرس تھے اپنا مشہور طوطی نامہ ۱۸۰۱ء میں تیار کیا۔ غواصی نے اپنا تخلص ایک ترجیع بند میں ظاہر کیا ہے اور سن تصنیف دیباچہ سے ۱۶۲۹ء مطابق

---

[1] "دکن میں اردو" ۱۲

یکم رجب سنہ ۱۰۴۹ھ) پایا جاتا ہے۔ ملا غواصی گولکنڈے کے باشندے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر ہیں۔ نصرتی نے گلشن عشق میں ان کا تذکرہ کیا ہے ؎

پڑی کچھ غواصی تنی کر خیال کیا تازہ باغ بدیع الجمال

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں: "غواصی تخلص در وقت جہانگیر سنہ ۱۰۱۴ھ تا سنہ ۱۰۳۷ھ بود طوطی نامہ نخشبی را نظم نمودہ است، بزبان قدیم نصفے فارسی نصفے ہندی بطور بکٹ کہانی سرسری دیدہ بودم شعر آں نظم یاد نیست"۔

سب رس مصنفہ مولانا وجہی ایک ضروری کتاب موسوم بہ سب رس کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے جس کو نثر دکنی میں مولانا وجہی نے تصنیف کیا تھا۔ مولانا موصوف سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر اور غواصی کے معاصر تھے۔ یہ کتاب سلطان عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے سنہ ۱۰۴۰ھ یا ۱۰۴۵ھ میں تصنیف ہوئی۔ قدیم نثر دکنی کے نمونے سب رس سے پیشتر کے بھی موجود ہیں مگر وہ سب مذہبی رنگ یا تصوف میں ہیں۔ سب سے بڑی خوبی اس کتاب کی جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے بتلایا ہے کہ جن کی کوششوں سے یہ کتاب پبلک کی نظروں میں آئی یہ ہے کہ یہ ایک مسلسل قصہ ہے نیز یہ کہ اس کی عبارت ادبی شان رکھتی ہے اور نثر مقفّٰے ہے جیسا کہ فارسی میں ظہوری کا رنگ ہے۔ زبان بہت صاف اور سادہ ہے اور قصہ میں روانی پائی جاتی ہے۔ نفس قصہ مختصر ہے جس میں جابجا اشعار حسب موقع عشق، عقل، شجاعت، حرص وغیرہ کے موضوع پر لائے گئے ہیں۔ اس کی زبان بھی ویسی ہے جیسی کہ قطب شاہیوں کے کلیات کی ہے۔

تحسین الدین ممکن ہے کہ یہ نام ہو یا کوئی خطاب۔ غرضکہ ان بزرگ نے ایک مثنوی لکھی جس کا نام "کامروپ کلا" ہے۔ کلا شاہ لنکا کی بیٹی قصہ کی ہیروئن ہے اور کامروپ، شاہ اندھ کا بیٹا ہیرو ہے۔ قصہ یہ ہے کہ یہ دونوں خواب میں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے جیسا کہ الف لیلہ میں چین والی شہزادی کی نسبت لکھا ہے۔ کامروپ اپنی دیدہ بلکہ خواب دیدہ

معشوقہ کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا ہے جہاں اس کو عجب عجب واقعات پیش آتے اور بالآخر اس کی شادی کلا کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ مصنّف مسلمان ہے اور اشخاص سب ہندو ہیں۔ اسی مثنوی کو گارساں دتاسی نے ۱۸۳۶ء میں قصۂ کامروپ کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مشہور جرمن شاعر گوئٹے نے اس نظم کو ترجمہ کرا کے سُنا اور اُس سے بہت محظوظ ہوا۔

ملا قطبی انہوں نے سنہ ۱۰۴۶ھ میں تحفۃ النصائح کا ترجمہ زبان فارسی سے دکھنی میں کیا۔ یہ کتاب شیخ یوسف دہلوی نے ۷۹۵ھ میں اپنے بیٹے کی تعلیم کے واسطے تصنیف کی تھی۔ یہ ۷۸۶ بند کا ایک قصیدہ ہے جسے ملا قطبی نے اُسی بحر اور اسی ردیف و قافیہ میں ترجمہ کیا ہے۔

جنیدی ان کی نسبت کچھ اور معلوم نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک مثنوی ماہ پیکر کے مؤلف ہیں جس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۶۴ھ ہے۔

طبعی گولکنڈہ کے رہنے والے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے۔ ان کی ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" ہے جس کا مضمون ہفت پیکر نظامی سے ماخوذ ہے۔ سنہ تصنیف سنہ ۱۰۸۱ھ ہے۔ دیباچہ شاہ راجہ حسینی کے نام سے ہے جو گولکنڈہ کے ایک بہت بڑے بزرگ اور اولیاء اللہ سے تھے اور خاتمہ پر ابوالحسن تاناشاہ کی تعریف ہے۔ یہ تقریباً تیرہ چودہ سو شعر کی مثنوی ہے۔

ابوالحسن قطب شاہ ۱۶۷۲ء لغایت ۱۶۸۷ء متوفی ۱۷۰۴ء ابوالحسن قطب شاہ مشہور بہ تاناشاہ گولکنڈہ کا سب سے آخری تاجدار نہایت عیش پسند اور نازک دماغ تھا۔ یہ خود بھی نہایت قابل اور قابلوں کا قدرداں تھا۔ ایک شعر تذکرۂ گلشن ہند میں اس کی طرف منسوب ہے۔ یہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا اور اس کی وفات پر تخت نشین ہوا۔ جب گولکنڈہ سات ماہ کے محاصرہ کے بعد ۱۶۸۷ء میں فتح ہو گیا اور سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ

قرار پایا تو ابوالحسن قید کر لیا گیا اور اس کی باقی عمر قید میں گزری۔ مشہور ہے کہ اُس کو حُقّہ کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس نے حُقّہ پینے کی اجازت قید خانہ میں بھی طلب کی تھی۔ شعرائے ذیل ابوالحسن تانا شاہ کے زمانہ میں یا اُن کے دربار کے شاعر تھے۔

نوری سید شجاع الدین نوری گجرات کے معزز خاندان سادات سے تھے۔ وہ سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے وزیر کے بیٹے کو پڑھاتے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اُن کا ذکر کیا ہے ان کو اِن ملّا نوری سے نہ ملانا چاہئے جو فیضی کے دوست تھے۔ اور جن کا ایک شعر قائم نے اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے گارساں دتاسی اور سر چارلس لائل نے نام کے التباس کی وجہ سے دھوکہ کھایا اور دونوں کو ایک سمجھا ہے۔

فائز یہ گولکنڈہ کے رہنے والے تانا شاہ کے عہد کے شاعر تھے۔ ۱۰۹۴ھ میں انہوں نے قصہ رضوان شاہ و روح افزا کا ترجمہ نثر فارسی سے نظم دکنی میں کیا۔ یہ مثنوی قصہ رضوان شاہ کے نام سے مشہور ہے مگر کتب خانہ آصفیہ میں مثنوی روح افزا کے نام سے ہے۔

شاہی شاہ قلی خان نام اور بھاگ نگر (موجودہ حیدرآباد دکن) کے رہنے والے تھے۔ شاہی ملازمت کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ تانا شاہ کے ندیم خاص ہو گئے۔ شمالی ہند کی بھی سیر کی تذکرہ میر حسن میں ان کا ذکر ہے۔

مرزا ابوالقاسم متخلص بہ مرزا حیدرآباد کے رہنے والے تانا شاہ کے مصاحب تھے۔ تانا شاہ کے انتزاعِ سلطنت کے بعد یہ فقیر ہو گئے اور حیدرآباد میں بقیہ عمر بسر کی۔ اور وہیں انتقال کیا۔ تذکرہ میر حسن میں ان کا ذکر ہے۔

عادل شاہیوں کا زمانہ ۸۹۵ھ لغایت ۱۰۹۷ھ

سلطنت عادل شاہی کی بنیاد پڑنے سے مدتوں پیشتر بیجاپور میں اردو زبان عام ہو گئی تھی۔ امیر غریب، ادنےٰ اعلےٰ سب اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ سلاطین بہمنیہ نے یہاں کے شاہی دفتر کو بھی اسی زبان میں کر دیا تھا۔ لیکن یوسف عادل شاہ اور اُس کے فرزند اسمٰعیل عادل شاہ نے اپنے

زمانہ میں شاہی دفتر کو فارسی میں منتقل کر دیا۔ کم و بیش پچاس سال فارسی عروج پر رہی ابراہیم عادل شاہ اوّل نے جب تاج و تخت حاصل کیا تو اس نے حسب سابق فارسی کے عوض شاہی دفاتر میں زبان اردو کو رواج دیا اور یہ زبان سلطنت کی زبان قرار پائی۔ مورخ خافی خان نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ علی عادل شاہ اوّل نے اپنے زمانے میں فارسی زبان کو مروج کیا لیکن جب ابراہیم عادل شاہ ثانی حکمراں ہوا تو شاہی دفاتر میں پھر اردو زبان جاری ہو گئی اور سلطنت عادل شاہیہ کی تباہی تک برابر جاری رہی۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۵۸۰ء لغایت ۱۶۲۶ء

مثل بادشاہان گولکنڈہ کے سلاطین بیجاپور بھی نہایت تعلیم یافتہ روشن خیال علم دوست بادشاہ تھے۔ چنانچہ ابراہیم عادل شاہ کو بھی شعر و شاعری اور فن تعمیر سے بڑا شوق تھا۔ فارسی کا مستند شاعر ظہوری جو ۱۵۸۰ء میں ہندوستان آیا اور ۱۶۱۶ء میں وفات پائی اسی دربار کا بڑا مشہور شاعر تھا ظہوری کی دو کتابیں "خوان خلیل" اور "گلزار ابراہیم" اسی ابراہیم عادل شاہ کے نام پر ہیں اور اس کی تین مشہور فارسی نثریں جو سہ نثری ظہوری کے نام سے مشہور ہیں، ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف نورس کا دیباچہ ہیں جو ہندی نظم میں فن موسیقی کی ایک مشہور کتاب ہے۔ میر سنجر اور قمی بھی اسی دربار کے بڑے شاعر تھے۔ سید شمس اللہ صاحب قادری لکھتے ہیں۔ "ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی میں بے حد مہارت حاصل تھی۔ خاص کر سرود ہندی میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ اس عہد کے تمام گویئے اسے جگت گرو کہا کرتے تھے۔ اس نے علم موسیقی میں (دھرپد) ایک کتاب لکھی تھی جس میں سرود ہندی کے قواعد و ضوابط قلم بند کئے تھے اور اس کا نام نورس نامہ رکھا تھا۔ یہ کتاب نظم دکھنی میں ہے ملا ظہوری نے اس پر دیباچہ لکھا تھا جو اس وقت سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے۔ مصنف گل رعنا رقمطراز ہیں "کہ موسیقی کا شوق ایسا بڑھا کہ اطراف ہندوستان سے بلا کر تین چار ہزار

گویے بیجاپور میں جمع کیے اور ۱۰۰۰ھ میں بیجاپور کے قریب نورسپور کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا جس میں گردا اور چیلوں کے لئے بڑی بڑی محلسرائیں بن کر تیار ہو گئیں۔ شاہی محلسرا کا نام نورس محل، شاہی مہر پر نورسی، سکّہ پر نورس۔ علم و نشان کے نام نورسی بعض شاعروں نے اپنا تخلص بدل کر نورس قرار دیا۔"[1]

علی عادل شاہ ثانی ۱۶۵۶ء لغایت ۱۶۷۲ء

اس بادشاہ کے دربار میں بھی مشہور شاعر اور ادیب جمع تھے۔ ملک کا امن و سکون شیواجی مشہور سردار مرہٹہ کے متواتر حملوں سے درہم برہم ہو گیا تھا۔ شیواجی نے اکثر قلعے فتح کر لیے اور افضل خاں کو جو بیجاپور کا سردار تھا قتل کر دیا۔

اسی علی عادل شاہ کے زمانے کا مشہور شاعر نصرتی جس کا نام محمد نصرت اور فرماں روائے کرناٹک کا رشتہ دار تھا۔ کرناٹک سے بیجاپور آیا جہاں علی عادل شاہ نے اس کو عہدہ منصب داری عطا کیا اور اپنا رفیق اور مصاحب بنایا۔ علی عادل شاہ ثانی[2] کو دکھنی سے نہایت دلچسپی تھی اور وہ دکھنی شعراء کی نہایت قدر کرتا تھا بقول خافی خاں "بادشاہے بود باہوش سپاہ دوست و در سخاوت و شجاعت، و وسعت خلق مشہور، در حق شاعران ہندی زیادہ مراعات می فرمود در عہد او ترجمہ یوسف زلیخا تالیف ملا جامی و ترجمہ روضۃ الشہداء و قصۂ منوہر مدمالت کہ عاقل خاں خوافی بہ نظم در آوردہ مُلا نصرتی و دیگر شاعران بیجاپور بہ زبان دکنی تالیف نمودہ از نقد و جنس صلۂ وافر در خور سلاطین یافتند" اس عہد کے مشہور شعراء یہ ہیں۔ رستمی۔ نصرتی شاہ ملک۔ امین۔ سیوا۔ مومن۔ ہاشم۔ مرزا۔

رستمی

رستمی کا نام کمال خاں ولد اسماعیل خاں۔ دربار بیجاپور سے اس کا تعلق تھا۔ رستمی نے خدیجہ سلطانہ شہر بانو بیگم کی فرمائش سے ۱۰۵۹ھ میں خاور نامہ کا فارسی سے نظم دکنی

[1] نصیر الدین ہاشمی وغیرہ نے یہ سب نام "نورس" بغیر ی لکھے ہیں۔ مرتضیٰ

[2] خود بھی شاعر تھا۔ ۱۶ ربیع الثانی ۱۰۴۸ھ کو ولادت۔ ۲۶ محرم ۱۰۶۷ھ کو تخت نشینی اور ۱۲ شعبان ۱۰۸۳ھ میں وفات پائی۔ اس کا کلیات چھپ چکا ہے۔ (مرتضیٰ)

-

میں ترجمہ کیا۔ خاور نامہ میں جناب امیر علیہ السلام کے محاربات مذکور ہیں اور فردوسی کے شاہنامہ کے طرز پر لکھا ہے۔ شہر بانو بیگم کا عقد سلطان محمد بن ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ ہوا تھا۔

نصرتی اس کے حالات تحقیق سے[1] معلوم نہیں ہیں۔ بقول سید شمس اللہ قادری "نصرتی کا نام شیخ نصرت اور وطن بیجاپور ہے۔ ان کے آباو اجداد بیجاپور میں فوجی ملازم اور والد سرکار شاہی کے سلح دار تھے چنانچہ خود نصرتی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ نصرتی کے بھائی شیخ منصور ایک اہل دل اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ بیجاپور کے مشاہیر فقرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ گلشن عشق کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نصرتی نے محمد عادل شاہ کے زمانہ میں دربار میں رسائی حاصل کی اور علی عادل شاہ کے دور میں عروج پایا اور ملک الشعرا کا خطاب حاصل کیا۔" عبدالجبار خاں ملکاپوری نے اپنے تذکرہ شعرائے دکن میں نصرتی کا اس طرح ذکر کیا ہے۔ "نصرتی تخلص، محمد نصرت نام دکنی المولد ہے۔ حاکم کرناٹک کے قرابت داروں سے تھا۔ آپ کی گذر اوقات توکل و قناعت پر تھی۔ مدت تک کرناٹک میں رہا۔ پھر سیر کرتا ہوا بیجاپور میں آیا۔ ۱۰۷۶ھ علیسوی میں دکنی زبان میں علی نامہ لکھا۔ اس پر ملک الشعرا کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۰۹۵ھ میں فوت ہوا۔ نصرتی سُنی المذہب تھا۔ بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان کا مرید و معتقد تھا جیسا کہ شعر سے عیاں ہے۔" یہ نہیں معلوم کہ مؤلف تذکرہ شعرائے دکن نے یہ مواد کہاں سے فراہم کیا۔ نصرتی کی تصنیفات[2] حسب ذیل ہیں:-

مثنویاں

(۱) علی نامہ ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۵ء میں نصرتی نے ایک طویل مثنوی لکھی جس کا نام علی نامہ ہے جس میں اپنے محسن علی عادل شاہ کے اکثر واقعات نظم کیے ہیں۔ اس میں

---

[1] ماخوذ از اردوئے قدیم ۱۲   [2] اب نصرتی پہ مستقل کتاب چھپ چکی ہے۔

علی عادل شاہ کے سوانحات و فتوحات اور مجالس عیش و طرب کے واقعات کا بھی ذکر ہے ان کے ضمن میں مختلف مواقع پر قصائد مدحیہ بھی درج ہیں۔ اس کتاب کو زبان دکنی میں سب سے پہلی کتاب سمجھنا چاہیئے جو ایک بادشاہ کی تعریف میں بصورت قصیدہ لکھی گئی۔

(۲) گلشن عشق:۔ دوسری مثنوی کا نام گلشن عشق ہے اور یہ ۱۰۶۸ھ ہجری مطابق ۱۶۵۷ء میں تحریر ہوئی تھی۔ اس میں ایک شخص مسمی بہ کنور منوہر پسر سورج بھان اور مدھ مالتی کے عشق کا ذکر ہے۔ اس قصہ کو مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے لکھا ہے۔ عاقل خاں رازی نے اسی قصہ کو فارسی میں نظم کیا ہے اور شمع و پروانہ اس کا نام رکھا ہے۔ یہ مثنوی اپنی رنگین تشبیہوں اور استعارات کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے گلشن عشق کے اشعار بعض تو نہایت صاف ہیں اور بعض ادق۔ کہیں عربی و فارسی کی آمیزش نظر آتی ہے تو کہیں بھاشا کی بہتات ہے۔ اس کے دیباچہ میں حسب معمول اپنے محسن علی عادل شاہ کی تعریف کی ہے۔

(۳) گلدستۂ عشق مصنفہ ۱۶۵۰ء لغایت ۱۶۷۰ء — بقول سید شمس اللہ صاحب قادری یہ تیسری مثنوی ہے۔ مگر بقول دتاسی یہ عاشقانہ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ نصرتی کے ایک قصائد کا ایک مجموعہ اور ایک غزلیات کا دیوان ہے۔ مؤلف گل رعنا نے نصرتی کا معراج نامہ بھی دیکھا ہے۔ یہ بزمانہ محمد عادل شاہ لکھا گیا تھا۔ ایک سو اکتیس شعر اس میں ہیں۔ بحر ایسی ہے جو فارسی اور ہندی میں مشترک ہے۔ ابراہیم زبیری نے نصرتی کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے اور ان کی مضمون آفرینی زور طبع اور اوج تخیل کو خاقانی کے ہم پایہ قرار دیا ہے۔ سرجارس لائل کا خیال ہے کہ یہ برہمن تھے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

ہاشمی سید میراں نام اور بیجاپور ان کا وطن تھا۔ ہاشمی تخلص تھا۔ سید شاہ ہاشم علوی کے مرید تھے اور اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص کرتے تھے۔ ہاشمی مادر زاد اندھے تھے مگر نہایت طباع اور ذہین آدمی تھے۔ ہندی اشعار مزے کے کہتے تھے۔ اپنے مرشد کی فرمائش سے یوسف زلیخا نام کی ایک مثنوی دکنی زبان میں لکھی اور یہ ۱۰۹۹ھ میں تمام ہوئی

اس میں چھ ہزار سے زیادہ ابیات ہیں اور دکنی لٹریچر میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔
شمس اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ "ہاشمی نے اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ جس میں قصائد و غزلیات کے علاوہ مرثیے اور قطعات اور رُباعیات بھی تھے۔ یہ مجموعہ اس وقت نایاب ہے لیکن جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں جس قدر غزلیات ہیں ان کا بیشتر حصہ ریختہ کے بجائے ریختی میں ہے۔" قدیم بھاشا کا رنگ ان کے کلام میں بہت ہے۔ اکثر جگہ صنعت ایہام سے کام لیتے ہیں اور ہندی شاعری کی متابعت میں عورت کا عشق مرد کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ ہاشمی نے بقول قادری ۱۱۰۹ھ میں انتقال کیا۔

دولت یہ بھی ایک دکنی شاعر ہیں۔ انہوں نے ۱۱۴۲ھ میں ایک قصہ موسوم بہ شاہ بہرام و بانوے حُسن تصنیف کیا۔ جس میں بہرام گور اور ایک پری موسوم بہ بانوے حُسن کے عشق کا ذکر ہے اور شہر دیو سپید میں بہرام گور کو جو عجیب واقعات پیش آئے تھے اُن کا بھی ذکر ہے۔

شاہ ملک ان کا ذکر اُردوے قدیم میں ہے۔ شاہ ملک بیجاپور کے باشندے اور علی عادل شاہ کے معاصر تھے۔ انہوں نے ایک رسالہ احکام الصلوٰۃ کے نام سے نظم دکنی میں لکھا ہے اور اس میں نماز کے فرائض و احکام بیان کئے ہیں۔ یہ رسالہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اور ۱۰۷۷ھ میں تمام ہوا۔

شاہ امین شیخ امین الدین اعلےٰ کا تخلّص ہے۔ آپ بیجاپور کے اولیائے کبار سے ہیں اور علی عادل شاہ کے زمانہ میں تھے۔ ۱۰۸۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ پر شب و روز محویت و استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اور اسی حالت میں آپ نظم ارشاد فرماتے تھے۔ مریدوں نے ان کے عرفان حقایق کو جمع کیا۔ اور اس مجموعہ کا نام جواہر الاسرار رکھا۔ دو رسالے ان سے اور یادگار ہیں۔ رسالہ قربیہ۔ رسالہ وجودیہ۔

دکن میں مرثیہ کی ابتداء مرثیہ نویسوں میں سب سے پہلے شیخ شجاع الدین نوری[1] بیجاپوری تھے۔ یہ اکبری دور کے شاعر تھے۔ آگرہ گئے اور ایک زمانہ تک ابوالفضل و فیضی کا ساتھ رہا۔ ان کے بعد اور بھی مشہور مرثیہ گو گذرے جن کا ذکر ایک دوسرے باب میں ہوگا۔ یہاں پر صرف ان کے نام لکھے جاتے ہیں۔ ہاشم علی برہان پوری۔ قطب شاہی دور کے کاظم علی۔ رام راو سیوا۔ سیوا نے روضۃ الشہداء و قانون اسلام نامی کتابیں لکھیں۔

شعرائے دکن مغلوں کے عہد حکومت میں بیجاپور و گولکنڈہ کو مغل بادشاہوں نے فتح کر لیا اور ان سلطنتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن شعرائے اردو کی قدر و مراعات میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ زبان اردو کے عام ہونے کی وجہ سے تمام ملک میں اردو شعر و شاعری پھیل گئی۔ اس زمانہ کے مشہور اردو شعراء ذیل میں درج ہیں۔

عاجز محمد علی تخلص عاجز۔ اورنگ زیب کی فتوحات دکن کے زمانہ میں موجود تھے۔ ان کی تصنیفات سے قصہ فیروز شاہ ہے جو اردو میں محبوب القلوب کا ترجمہ ہے۔ دوسری تصنیف قصۂ لال و گوہر ہے۔ اس میں لال زمرد بادشاہ بنگال کے فرزند اور گوہر جواہر شاہ بنگال کی دختر کے عشق و محبت کا افسانہ مذکور ہے۔ قصہ ملکہ مصر بھی عاجز نے فارسی سے دکھنی میں نظم کیا۔ عاجز کا ذکر مشرح طور پر اردوئے قدیم و تاریخ شعرائے دکن میں درج ہے۔

بحری قاضی محمود متخلص بہ بحری ولد بحر الدین دکن کے ایک صوفی مشرب بزرگ تھے۔ ۱۰۹۵ھ کے قریب اپنے وطن سے بیجاپور چلے گئے۔ وہاں سکندر عادل شاہ کے دربار میں دو سال رہے اور جب ۱۰۹۷ھ میں سلطنت تباہ ہو گئی تو حیدر آباد چلے آئے۔ فارسی اور دکنی زبانوں میں مثنویات۔ غزلیات۔ رباعیات اور قصائد لکھے جن کے اشعار کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی۔ مگر یہ سب ذخیرہ راستہ میں تلف ہوگیا۔ آپ کی تصنیف "من لگن" تصوف میں ایک مثنوی ہے اور یہ بزبان دکنی ۱۱۱۲ھ میں تمام

---

[1] تاناشاہ کے وزیر سید مظفر کے لڑکوں کا اتالیق متوفی ۹۹۳ھ یا ۱۵۵۶ء (مرتضٰے)

ہوئی۔ زبان اس کی مشکل اور الفاظ سخت ہیں۔

امین شیخ محمد امین متخلص بہ امین عہد اورنگ زیب میں گذرے۔ انہوں نے یوسف زلیخا کے فسانہ کو دکنی میں ۱۱۰۹ھ میں منظوم کیا۔

ولی دکھنی سید محمد فیاض نام۔ ملا محمد باقر آگاہ نے مراۃ الجنان کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ کہ ویلور ان کا وطن تھا۔ عالمگیر کے زمانہ میں گذرے ہیں۔ دکن میں سات گڑھ ایک تاریخی مقام ہے۔ وہاں حراست خاں نام کا ایک امیر آدمی رہتا تھا۔ ولی عرصہ تک اس کی رفاقت میں رہے پھر وہاں سے نکل کر کڑپہ میں چلے آئے۔ یہ واقعات ولی نے "رتن پدم" کے دیباچے میں بیان کیے ہیں۔ اس کو ولی نے سدھوٹ میں لکھا تھا۔ یہ مثنوی ضخیم ہے۔ دوسری تصنیف "روضۃ الشہدا" ہے اس میں کربلا کے واقعات منظوم کیے اور یہ ۱۱۱۹ھ میں لکھی گئی تھی۔ ان کے علاوہ ایک مناجات بھی لکھی ہے۔

وجدی بقول نصیر الدین ہاشمی مؤلف اُردوئے دکن[1] اس تخلص کے دکن میں دو[2] شاعر ہوئے ہیں۔ ایک وجدی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تھا۔ جس نے تحفۂ عاشقاں ۱۰۱۵ھ میں لکھی اور دوسرے وجدی جنہوں نے بارھویں صدی میں کئی ایک مثنویاں لکھیں اس میں سے ایک پنچھی نامہ ہے جو شیخ فریدالدین عطار کے منطق الطیر کا ترجمہ ہے۔ جس کو وجدی نے ۱۱۵۵ھ میں ترتیب دیا۔ بقول مؤلف اُردوئے قدیم مثنوی تحفۂ عاشقاں شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی گل و ہرمز کا ترجمہ ہے جو خسرو نامہ یا خسرو و گل بھی کہلاتی ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۵۳ھ میں ختم ہوئی اور خاتمہ میں اس کی تعریف اس طرح مذکور ہے۔

دسے اس کی تاریخ مجھکوں عیاں   پچھانو اسے تحفۂ عاشقاں!
۱۱۵۳ھ

غالباً مؤلف اُردوئے قدیم کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے ان سے ایک اور ضخیم مثنوی یادگار

---

[1] ماخوذ از اُردوئے قدیم ۱۲۔ [2] دکن میں اُردو۔ صحیح ہے۔ مرتضےٰ

ہے۔ اُس کا نام مثنوی باغ جانفزا ہے۔ ۱۱۲۵ھ میں تصنیف ہوئی اور "باغ جانفزا" سے اس کی تاریخ نکالی ہے۔

آزاد | فقیراللہ متخلص بہ آزاد۔ حیدرآباد کے باشندے اور ولی اورنگ آبادی کے معاصر تھے۔ ان کا ذکر تذکرۂ شعرا میر حسن و نکات الشعرا میں درج ہے۔

شعرائے اورنگ آباد | اورنگ زیب جب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اس نے کھرکی کو اپنا صدر مقام قرار دیا اور اس کا نام اورنگ آباد رکھا۔ اس کے بعد اورنگ زیب کی عمر کا بیشتر حصہ اسی شہر میں بسر ہوا اور ایک عرصہ تک یہ شہر سلطنت مغلیہ کا مرکز رہا۔ اس تقریب سے ہندوستان اور دہلی کے بڑے بڑے امراء و علماء و مشائخین جن کو شاہی دربار سے کسی قسم کا بھی واسطہ تھا اورنگ آباد چلے آئے اور حیدرآباد و بیجاپور کی تباہی کے بعد یہاں کے باشندے بھی اورنگ آباد کی جانب متوجہ ہوئے۔ اس دور میں بہت سے شاعر گزرے جن کے حالات سید عبدالولی عزلت کی بیاض۔ لچھمی نرائن شفیق کے چمنستان شعراء۔ میر بہاء الدین عروج کے بہار و خزاں۔ اور محمد افضل کے تحفۃ الشعراء و تذکرۂ موسوی خاں میں تحریر ہیں۔ میر حسن نے بھی اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔

ولی ۱۶۶۸ عیسوی تا نہایت ۱۷۴۴ء | ولی کو اردو شاعری کے ساتھ وہی نسبت ہے جو چاسر کو انگریزی کے ساتھ اور رودکی کو فارسی شاعری کے ساتھ ہے۔ یہی وہ بزرگ ہستی ہیں جن سے موجودہ اُردو شاعری کی بنیاد پڑی۔ آزاد مرحوم کے دعوے کے مطابق اب تک سب کا یہی خیال تھا کہ سب سے پہلے اُردو میں دیوان جمع کرنے والے ولی ہیں۔ مگر جب سے کہ قطب شاہیوں کے دواوین دستیاب ہو گئے۔ اس وقت سے اس خیال کی تردید ہو گئی۔ مگر اس واقعہ سے ولی کے کمال میں فرق نہیں آتا۔ اُردو شاعری کو ان کی وجہ سے جو تقویت پہنچی وہ کبھی زائل نہیں ہو سکتی۔ ان کو ان کے معاصرین اور مابعد کے قریب العہد شعراء مثلاً شاہ حاتم وغیرہ سب نے اُستاد مانا ہے اور

ان کے کلام کی بڑی قدر کی ہے۔

نام کے متعلق اختلاف ولی کے نام میں اختلاف ہے۔ بعضوں کے نزدیک ان کا نام شمس الدین اور تخلص ولی ہے اور بعض محمد ولی نام۔ شمس الدین لقب اور ولی تخلص بتاتے ہیں۔ میر حسن دہلوی۔ مرزا علی لطف و نساخ و بلوم ہارٹ کے نزدیک شاہ ولی اللہ نام ہے۔ اور نواب علی ابراہیم اور یوسف علی و آزاد شمس ولی اللہ کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسی عہد میں شمس ولی اللہ نام کے ایک صوفی احمد آباد میں رہتے تھے۔ جن کے توافق نام کی وجہ سے یہ خلط ملط واقع ہو گیا۔

مقام پیدائش اور خاندان کے متعلق اختلاف گارسن ڈناسی۔ بلوم ہارٹ اور میر حسن کا خیال یہ ہے کہ ولی احمد آباد میں پیدا ہوئے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ ان کی ولادت اورنگ آباد میں ۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۸ء میں ہوئی جس کی تصدیق میر تقی میر کے تذکرہ نکات الشعراء سے بھی ہوتی ہے۔ ولی کا تعلق خاندانی شاہ وجیہ الدین علوی کے ساتھ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ وہ اورنگ آباد کے شیوخ قادریہ میں سے تھے۔ البتہ وہ شاہ وجیہ الدین کے خاندان میں بیعت رکھتے تھے۔ کیونکہ جو قصائد اور ترجیع بند وغیرہ انھوں نے ان بزرگ کی شان میں لکھے ہیں اُن سے اُن کے حُسن عقیدت کا اظہار ہوتا ہے مگر شجرۂ اولاد شاہ وجیہ الدین علوی میں اُن کا نام کہیں نہیں پایا جاتا۔ اُن کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ وہ گجراتی نہ تھے اور دکنی الفاظ بھی بہ کثرت استعمال کیے ہیں۔ جو لوگ اُن کے گجراتی ہونے کے مدعی ہیں وہ اپنے دعوے کی تائید میں ان کا ایک قصیدہ پیش کرتے ہیں جس میں انھوں نے گجرات سے مفارقت پر اظہار ملال کیا ہے۔ مگر ہماری رائے میں یہ کافی ثبوت اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ گجرات ان کا مولد و مسکن تھا۔ اسی طرح اس مثنوی سے بھی جو شہر سورت کی تعریف میں لکھی ہے ان کا گجراتی الاصل ہونا پایا نہیں جاتا۔

حالاتِ زندگی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے جہاں بیس برس تک تحصیل علوم کرتے رہے بعد ازاں احمد آباد گئے۔ جو اس زمانہ میں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ اور شاہ وجیہ الدین علوی کے مدرسہ میں لوگ مختلف مقامات دور و دراز سے تحصیل علوم کے لیئے آتے تھے داخل ہوئے اور تھوڑے عرصہ کے بعد اس خاندان کے مرید ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد اپنے وطن آکر شعر و شاعری شروع کی اور اس میں انہیں پورا انہماک ہو گیا۔ ان کا کلام تقریباً سب اصناف سخن میں موجود ہے۔ یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، مستزاد، رباعیات، ترجیع بند وغیرہ۔ پھر احمد آباد گئے۔ جہاں انہوں نے اپنے احباب کو اپنا کلام سنایا۔ اور انہوں نے اس کو بہت پسند کیا۔

ولی کے دو سفر تذکروں میں ہے کہ ولی دو مرتبہ دلی آئے۔ ایک مرتبہ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد یعنی سنہ ۱۷۰۰ء میں۔ اس مرتبہ شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی جنہوں نے فرمایا کہ "یہ سب مضامین جو بے کار فارسی میں بھرے پڑے ہیں ان کو زبان ریختہ میں کام میں لاؤ، تم سے کون محاسبہ کرے گا۔" اس واقعہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ولی میاں گلشن کے شاگرد ہوئے تھے۔ البتہ ان سے عقیدت رکھتے تھے اور مذاق تصوف بھی انہیں کی صحبت میں حاصل کیا تھا۔ دوسری مرتبہ سید ابو المعالی کے ساتھ سفر کیا جس میں دلی اور سرہند کے مزارات کی زیارت کی۔ سید ابو المعالی سے ان کو کمال محبت تھی جو درجہ عشق کو پہنچ گئی تھی۔ ولی کا یہ دوسرا سفر محمد شاہ کے عہد سلطنت میں سنہ ۱۱۳۴ ہجری مطابق سنہ ۱۷۲۲ء میں ہوا۔ اس سفر میں ولی اپنے ساتھ دیوان ریختہ لائے تھے جس کی نہایت قدر دانی کی گئی اور جو بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہوا۔ اور یہاں تک اس کی شہرت ہوئی کہ امراء کی محفلوں اور جلسوں اور کوچہ و بازار میں اس کے اشعار لوگوں کی زبان پر تھے۔ ان کے اشعار کو سُن کر لوگوں کو شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا۔

دہ مجلس سنہ ۱۱۴۱ھ میں دلی سے اورنگ آباد واپس آئے جہاں شہدائے کربلا کی شان

میں ایک مثنوی موسوم بہ دہ مجلس تصنیف کی جس کے ان دو آخری شعروں سے اس کا سنہ تصنیف اور اس کی زبان کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال
تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال

کہا ہاتف نے یوں تاریخ معقول
ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

اس مثنوی کو فضلی نے نثر کے قالب میں ڈھالا۔ جو اصل کتاب سے بھی زیادہ مقبول ہے صاحب گلشن ہند لکھتے ہیں کہ ولی کا ایک ہندی دیوان بھی ہے۔ مولانا آزاد اور مصنف گل رعنا کا بیان ہے کہ ولی نے دیوان کے علاوہ تصوف میں بھی ایک رسالہ نور المعرفت لکھا ہے۔ لیکن وہ ناپید ہو گیا ہے۔

وفات ولی کو گجرات سے ایسی دلچسپی ہو گئی تھی کہ اورنگ آباد میں کچھ دنوں رہ کر پھر احمد آباد چلے گئے۔ جہاں بقول تذکرۂ شعرائے دکن ۱۱۵۵ھ[1] مطابق ۱۷۴۲ء میں انتقال کیا۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔

ولی کے بہت سے دوست تھے جن سے اس کو خاص محبت اور خلوص تھا۔ مثلاً لالہ کھیم داس اورنگ آبادی۔ امرت لال گوہر لال اور محمد یار خاں دہلوی وغیرہ ان سب کا ذکر مناسب مقام پر ان کے اشعار میں موجود ہے۔ وہ گویا کہ حنفی المذہب تھے۔ جیسا کہ صحابہ کبار کی تعریف سے ظاہر ہے جو ان کے اشعار میں موجود ہے مگر ساتھ ہی کسی مذہب و ملت سے اُن کو کوئی تعصب نہ تھا کیونکہ وہ ایک صوفی منش، فقیر مشرب شخص تھے۔ انہوں نے بہت سیر و سیاحت کی تھی اور اکثر مقامات دور و دراز کو دیکھا تھا۔ بنگال میں ان کا جانا پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ گارساں دتاسی ان کے کسی شعر سے جس میں حسن بنگالہ کی تعریف ہے۔ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ بنگال بھی گئے تھے۔ البتہ ستارا، دلی اور سورت کا سفر یقینی ہے اس وجہ سے ان تمام

---

[1] ڈاکٹر اعجاز ۱۱۱۹ھ بتاتے ہیں۔ مرتضےٰ

مقامات کی تعریف ان کے اشعار میں موجود ہے۔ مثلاً سورت کی تعریف میں ایک مثنوی میں کہتے ہیں:

عجب شہروں میں ہے پر نور اک شہر ۔۔۔ بلا شک ہے وہ جگ میں مقصد دہر
کہ ہے مشہور اس کا نام سورت ۔۔۔ کہ جاوے جس کو دیکھے سب کدورت
بھری ہے بیبرست صورت سوں صورت ۔۔۔ ہر اک صورت ہے واں انمول صورت

ولی نے کسی امیر یا بادشاہ کی تعریف میں اشعار نہیں کہے مگر فارسی کے تتبع میں اپنی شان میں اکثر فخریہ اشعار کہے ہیں جن میں جابجا معاصرین پر چوٹیں ہیں۔

کلام پر رائے ان کی تصانیف بہ اعتبار قدامت اور نیز بہ اعتبار زبان بہت دلچسپ ہیں۔ عبارت آسان اور سہل ہے۔ شعرائے مابعد نے ان کا تتبع کیا ہے اور انہیں کی شاعری سے شمالی ہند میں شعر کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ سادگی، سلاست اور ترنم ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ اشعار میں روانی، بے تکلفی اور آمد ہے اور صنائع بدائع بکثرت نہیں ہیں۔ بعض شعر تو ایسے صاف ہیں کہ بالکل زمانہ حال کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً۔

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے ۔۔۔ زخمی ہے شکار کیونکہ جاوے
دشمن دیں کا دیں دشمن ہے ۔۔۔ راہزن کا چراغ رہزن ہے
آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اُس کو ۔۔۔ کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی
عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں دلبر سے ۔۔۔ سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ
گناہوں کی سیہ نامی سے کیا غم اس پریشاں کو ۔۔۔ جسے وہ زلف دستاویز ہو روز قیامت میں
خوب رو خوب کام کرتے ہیں ۔۔۔ اک نگہ میں غلام کرتے ہیں!
دل ہوا ہے مرا خراب سخن ۔۔۔ دیکھ کر حسن بے حجاب سخن
بزم معنی میں سرخوشی ہے اُسے ۔۔۔ جس کو ہے نشۂ شراب سخن

راہ مضمونِ تازہ بند نہیں — تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن
گوہر اُس کی نظر میں جا نہ کرے — جس نے دیکھا ہے آب و تابِ سخن
ہے سخن جگ منے عدیم المثل — جز سخن نئیں دوجا جوابِ سخن
شعر فہموں کی دیکھ کر گرمی — دِل ہوا مرا کبابِ سخن
عُرفی و انوری و خاقانی — مجھ کو دیتے ہیں حسابِ سخن

اے ولی دردِ سر کبھو نہ رہے
جب ملے صندل و گلابِ سخن

داؤد مرزا داؤد نام۔ داؤد تخلص وطن اورنگ آباد۔ ولی کے معاصر تھے اور ۱۱۶۸ھ میں انتقال کیا۔ ایک چھوٹا سا دیوان ان سے یادگار ہے۔

سراج سید سراج الدین نام۔ آپ سادات حسینی خاندان مشائخ سے تھے۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور وہیں تربیت و تعلیم پائی۔ غالباً آپ ۱۱۲۷ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنا حال منتخب دوادین کے دیباچے میں لکھا ہے[1]۔ اس منتخب کا تاریخی نام "منتخب دیوان ہا" ۱۱۶۹ھ ہے۔ سراج نے اس میں متقدمین و معاصرین شعراء کے فارسی کلام کا انتخاب کیا ہے۔ مجموعہ ضخیم ہے اور اس میں کئی ہزار اشعار ہیں۔ دوادین فارسی کا اس طور پر انتخاب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نقادِ سخن تھے۔ سراج خود لکھتے ہیں: "یہ فقیر بارہ برس کی عمر میں بجوشِ جذبہ و غلبۂ شوق سے سات برس تک برہنہ تن و برہنہ سر رہا۔ اکثر اوقات عالمِ بیخودی حضرت شاہ برہان الدین غریب دولت آبادی کے روضہ کے اطراف میں گھومتا تھا۔ اسی حالت مستی میں اکثر اشعار فارسی زبان میں بر آمد ہوتے مگر تحریر کے دائرہ میں

---

[1] ماخوذ از اردوئے قدیم ۱۲۔ کلیات سراج، عبد القادر سروری نے ۱۳۵۸ھ میں شائع کر دیا ہے جس میں سنہ ولادت ۱۱۲۸ھ، وفات سہ شوال ۱۱۷۷ھ درج ہے۔ - مرتضیٰ

نہیں آئے اور وہ تمام اشعار موجود ہوتے تو ایک ضخیم و بزرگ دیوان مرتب ہوجاتا۔ پھر مدت مذکور کے بعد حضرت خواجہ سید شاہ عبدالرحمٰن چشتی المتوفی ۱۱۶۱ھ کی خدمت میں پہنچا۔ حسن ارادت سے مرید ہوا۔ ان دنوں میں بپاس خاطر عزیزی عبدالرسول خاں جو فقیر کے برادر طریقت تھے۔ اکثر اشعار ریختہ زبان میں لکھے گئے۔ خاں صاحب نے جواہر متفرق کو جو تخمیناً پانچ ہزار اشعار تھے۔ حرف تہجی میں ترتیب دیا اور کامل دیوان شائقین کی خدمت میں بھیجا۔ پھر فقیری اختیار کی اور مرشد کے حکم سے شعر گوئی ترک کی"۔ سراج ایک درویش منش اور پاکباز بزرگ تھے۔ مسافر دوست و غریب نواز۔ گوشہ نشین و پاکیزہ دل۔ ہفتہ میں ایک روز محفل سماع منعقد فرماتے تھے۔ اس میں شہر کے اکثر عمائد و مشائخ جمع ہوتے تھے۔ قوال و گویّے آپ کی غزلیں سناتے تھے۔ مجلس میں آپ کا وہ رعب و داب تھا کہ اہل مجلس باادب عالم سکوت میں ہوتے تھے۔ اس وقت دکن میں آپ کے معاصرین میں سے میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ عبدالوہاب افتخار دولت آبادی، ظفر بیگ ظفر اورنگ آبادی۔ محمد فقیہ دردمند۔ مرزا محمد باقر شہید۔ وجان مرزا رسا۔ موسوی خاں جرأت اورنگ آبادی وعبدالقادر سامی اورنگ آبادی ۔ عارف الدین خاں عاجز۔ موسوی خاں فطرت۔ حاتی خاں۔ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی اور میر امداد محمد ذکا بلگرامی وغیرہ شعراء وعلماء و مشائخ تھے۔ خوب مشاعرے ہوتے تھے اور سراج باوجود گوشہ نشینی مشاعروں میں شریک ہوتے اور کبھی کبھی اصرار سے شعر کہتے۔

میر نے نکات الشعراء میں اور حسن نے اپنے تذکرہ میں تحریر کیا ہے کہ سراج کو سید حمزہ دکنی سے تلمذ حاصل تھا۔ مگر دکن میں کسی شاعر کا نام سید حمزہ یا سید حمزہ علی نہیں تھا۔ گمان غالب یہ ہے کہ سراج نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ سراج نے

ایک دیوان فارسی کا اور ایک ریختہ کا جس میں پانچ ہزار اشعار ہیں اپنی یادگار چھوڑے منتخب دیوانہا کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ایک مثنوی بوستان خیال بھی لکھی جس میں ایک ہزار سات ابیات ہیں اور گل و بلبل کے افسانے میں جذبات معرفت کی ترجمانی کی ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۷۳ھ میں تمام ہوئی۔

آپ کا کلام بھی ولی کی طرح ایہام و ذو معانی الفاظ سے پاک و صاف ہے۔ سیدھا سادہ بیان ہے۔ تکلف و بناوٹ کا نشان نہیں۔ اکثر غزلوں میں حسن و عشق کے کرشمے بعض اشعار میں توحید و معرفت کا نقشہ۔ مضامین میں شگفتگی خیالات میں بلندی اور پھر کلام میں صفائی و سادگی موجود ہے۔ ریختہ گوئی میں ولی کے قائم مقام تھے۔ دکن میں استادی کے رتبہ کو پہنچے۔ ولی نے اس زمین میں جو کچھ پودے جمائے تھے اور جو کچھ سبزے لگائے تھے سراج نے ان کو اپنی توجہ کے پانی سے سیراب و شاداب کیا۔ آپ نے چوتھی شوال یوم جمعہ ۱۱۷۷ھ میں انتقال فرمایا۔ یہ غزل سراج کی بہت مشہور ہے۔

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب[1] لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

---

[1] مجھے وہ لباس

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی

ترے جوش حیرت حسن کا اثر اس قدر سیں عیاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری کی جلوہ گری رہی

کیا خاک آتش عشق نے دل بینوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

دیگر شعراء اس دور کے

اس دور میں بہت سے شاعر گذرے ہیں۔ جن کا ذکر بوجہ طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان کے نام و حالات تذکرہ لچھمی نرائن و تذکرہ موسوی خاں و نکات الشعراء میر۔ تذکرہ شعرائے اردو میر حسن۔ تذکرہ شعرائے دکن مؤلفہ عبدالجبار خاں ملکاپوری۔ و دکن میں اردو مؤلفہ نصیر الدین ہاشمی سے معلوم ہو سکتے ہیں بعض مشہور شعراء اس زمانہ کے حسب ذیل ہیں:۔

عارف الدین عاجز۔ سید عبدالولی عزلت۔ بار۔ محرم۔ ایما۔ داغ۔ رنگیں۔ مہدی۔ عزیز۔ صارم۔ مہر۔ پناہ۔ رضا۔ عراقی۔ مہتاب۔ شرافت۔ شہید۔ ضیا۔ کاظم۔ مبتلا۔ نجم۔ ہمدم۔ درد۔ حشمت۔ حاجی۔ قادر۔ فخر۔ فتوت۔ فدر۔ ان میں سے عزلت اور عاجز زیادہ مشہور و نامآور ہیں۔ اور جو حالات کہ مصنف گل رعنا نے ان شعراء کے درج کیے ہیں وہ زیادہ تر تذکرۂ شعرائے دکن سے ماخوذ ہیں۔

احاطۂ مدراس و ارکاٹ کے شعراء

مولوی محمد باقر متخلص بہ آگاہ ویلور میں پیدا ہوئے اور انہوں نے اردو زبان میں سیر، عقاید، فقہ کی متعدد کتابیں لکھیں ۱۱۸۵ھ سے انہوں نے تصنیف کا کام شروع کیا۔ بسنہ ۱۲۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کے بزرگان سلف وطناً بیجاپوری تھے۔ مؤلف شمع انجمن لکھتے ہیں کہ "در خیابان کرناٹک ہیچو او نہالے سربالا نکردہ و از گل زمین مدراس مثل او گل خوش رنگ نہ دمیدہ۔" اردو

تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے۔

ہشت بہشت۔ تحفۃ الاحباب۔ تحفۃ النساء۔ فرائد در عقائد۔ ریاض الجنان۔ محبوب القلوب۔ روضۃ السلام۔ گلزار عشق۔ قصۂ رضوان شاہ۔ روح افزا خمسہ متحیرہ۔ مثنوی روپ سنگار۔ ارکاٹ کے دربار کے مدار المہام شرف الملک مولانا محمد غوث۔ اور ان کے خلف مولانا قاضی بدر الدولہ نے بھی کئی کتابیں اردو میں لکھیں۔

اس وقت کے شعراء کے نام ذیل میں رقم ہیں:۔

محمود۔ صبائی۔ احمد۔ اعظم[1]

---

[1] ماخوذ از اردوئے قدیم ۱۲۔

باب ۵

اساتذہ دہلی

حصّہ اوّل ۔ طبقۂ متقدمین

حاتم و آبرو کا زمانہ

دلی میں اردو زبان کی ابتدا و ترقی

اردو زبان دکن میں نویں صدی سے پہلے ادبی صورت حاصل کر چکی تھی اور اس میں اس زمانہ سے تصنیف و تالیف کا آغاز ہو گیا تھا۔ برخلاف اس کے جہاں تک معلوم ہوا ہندوستان میں بارہویں صدی کے آغاز تک یہ زبان محض بات چیت اور لین دین تک محدود رہی۔ مولانا جمالی جو شہنشاہ بابر کے معاصر تھے اور ۹۴۲ھ ہجری میں فوت ہوئے۔ ملا نوری جو اعظم پور کے باشندے تھے اور اکبر کے زمانہ میں گذرے ملا فیضی سے نہایت اتحاد رکھتے تھے۔ ان کا ذکر میر حسن نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے اور شیخ سعدی نے اگرچہ ایسے اشعار کہے ہیں جو آدھے فارسی اور آدھے اردو ہیں۔ لیکن یہ باقاعدہ اور علمی شاعری نہ تھی۔ بابر، اکبر و جہانگیر۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کی اور ان کے عہد کی تحریرات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کی زبان پر عربی و فارسی کے الفاظ چڑھ رہے تھے اور اسی طرح مسلمانوں کی زبانیں بھی ملکی زبانوں کے زیر اثر تھیں۔ اس کے نمونے اردوئے قدیم

اور تذکرہ گل رعنا میں موجود ہیں۔ شاہ جہاں کا اُردو میں شقہ لکھنا اور اورنگ زیب کا اپنے رقعات میں اُردو الفاظ استعمال کرنا اس بات کی بیّن دلیل ہے۔ کہ اُردو زبان اس زمانہ میں ملک کی عام زبان ہو گئی تھی۔ بازار سے شاہی محلات تک خاص و عام اس کو بولتے اور سمجھتے تھے[1]۔

عالمگیر کے زمانہ سے دلی میں اُردو شعر گوئی نے رواج پایا اور اس جانب سب سے پہلے فارسی شعراء نے توجہ کی۔ موسوی خاں فطرتؔ۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ مرزا عبدالغنی قبولؔ وغیرہ فارسی کے نامور شاعر تھے لیکن تفریح خاطر کے لیے اُردو میں بھی دو چار شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ محمّد شاہ کے عہد سے پہلے لوگ خانہ جنگیوں میں مبتلا اور مرہٹوں کے حملوں سے پریشان تھے۔ محمد شاہ کے زمانہ میں سادات کی قوّت ٹوٹ جانے پر کچھ عافیت نصیب ہوئی۔ اُس وقت اِدھر اُدھر سے سمٹ کر دِلّی میں سب لوگ مجتمع ہو گئے۔ محمّد شاہ کی رنگیلی طبیعت نے رنگ دکھایا۔ قزلباش خاں اُمیدؔ۔ سلیمان قلی خاں وداؔد۔ علی قلی خاں ندیمؔ۔ شیخ سعداللہ گلشنؔ۔ مرتضیٰ قلی خاں فراقؔ۔ میر شمس الدین فقیرؔ۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ ایسے بڑے بڑے صاحب فضل و کمال دِلّی میں جمع تھے۔ شمس ولی اللہ دکن سے آ گئے۔ فراقیؔ۔ فخریؔ۔ آرزوؔ وغیرہ بھی دکن سے آئے۔ ولی کچھ دنوں کو رہ گئے اور اُن کا رنگ دِلّی میں خوب چمکا۔ ہر طرف سے قدردانی کی گئی۔ جو شعراء صرف فارسی میں اظہار کمال کرتے تھے۔ اُن کو اُردو میں بھی شعر کہنے کا شوق ہوا۔ اُمیدؔ۔ بیدلؔ۔ فراقؔ۔ آرزوؔ نے اُردو میں طبع آزمائی کی اور یہ زبان دِلّی سے اُردوئے معلّٰی کا خطاب پا کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں[2] پھیل گئی۔

اردو لغات کی ترتیب	قریب قریب عالمگیر کے زمانہ میں اہل ہندوستان کو اُردو لغات

---

[1] اردوے قدیم ۱۲۔ [2] گل رعنا ۱۲

کی ترتیب و تدوین کا خیال پیدا ہوا۔ ملا عبدالواسع ہانسوی نے (جن کی قواعد فارسی اور گلستان بوستان کی شرحیں نہایت مشہور ہیں) عالمگیر کے زمانہ میں اُردو ہندی الفاظ کا ایک لغت مدون کیا اور اس کا نام "غرائب اللغات" رکھا اُردو الفاظ کے معنے فارسی میں لکھے۔ ایک عرصہ کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو نے اس کی نظرثانی کی۔ بہت سے الفاظ اور معنی اضافہ کئے۔ غلطیاں درست کیں اور اُسے "نوادر الالفاظ" کے نام سے موسوم کیا۔

دلّی کے پرانے شاعر زبان کے ساتھ ان کی خدمات جو شاہراہ ولی نے دکھلائی تھی اُس کے پیرو دِلّی میں بہت پیدا ہو گئے۔ آبرو۔ حاتم۔ ناجی۔ مضمون۔ مرزا مظہر جان جاناں کو جو ولی کے ہمعصر تھے اور فارسی میں خوب کہتے تھے، ریختہ کا آبائے قدیم سمجھنا چاہیئے۔ یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کی آغوش تربیت میں نونہال اُردو نے پرورش پائی اور اس مبارک عہد میں زبان نے بہت کچھ پختگی حاصل کی۔ شاعری کے واسطے کوئی خاص طرز اب تک مقرر نہیں ہوا تھا اور نہ اغراض شاعری کے واسطے کوئی خاص مناسبت زبان میں پیدا ہوئی تھی۔ بہت سے سخت اور بھدے دکنی لفظ و محاورات جو دیوان ولی کی بدولت زبان میں داخل ہو گئے۔ تھے چھانٹنا اور نکالنا پڑے۔ اسی وجہ سے اِن حضرات کی خدمات تصفیۂ زبان کے متعلق بہت لائق تحسین ہیں۔ انھوں نے یہ مشکل کام بہت حُسن و خوبی اور بڑی محنت و جانفشانی سے انجام دیا۔ اسی لیے ان کی قابلیت اور خوش مذاقی کی داد دینا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ بھاشا الفاظ کی خوبصورتی ان کی نظر میں نہ جچی ورنہ اپنے ملک کے دیسی الفاظ کے بدلے غیر ملکی الفاظ کم لیے جاتے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں نے اس کاٹ چھانٹ اور متروکات کے خارج کرنے میں بڑی قابلیت اور دقت نظر

ا؎ اُردوئے قدیم ۱۲

سے کام لیا ہے۔ اور بعد سے تراشیدہ محاورات اور تراکیب کی جگہ خوشنما محاورے اور دل کش ترکیبیں داخل کیں جو کہ عموماً فارسی سے لی گئیں کیونکہ اُسی کے وہ مشتاق تھے۔ زبان میں چونکہ لوچ اور قوت جذب پہلے ہی سے موجود تھی۔ اس لئے یہ سب جدید تصرفات اس نے آسانی سے قبول کر لیے۔

صنعت ایہام دلی کے معاصرین صنعت ایہام کے بہت شائق تھے جس کا ذکر پیشتر کیا گیا۔ یہ صنعت بھاشا کی شاعری میں بہت مقبول ہوئی اور دوہروں کی جان ہے قدما کے کلام میں ایسے ذو معنی اشعار بکثرت ہوتے ہیں۔ یہ محمد شاہی دور کی خصوصیت ہے۔ شاہ مبارک آبرو۔ یک رنگ۔ شاکر ناجی و شاہ حاتم وغیرہ نے اس رنگ کو خوب برتا اور اس کو اپنا مستقل فن بنا لیا تھا۔ مگر شاہ عالم کے زمانہ میں اس میں ترمیم و اصلاح ہوئی اور مظہر۔ سودا۔ میر۔ قائم نے اس کا رواج بہت کم کر دیا۔ اور میر درد فقیر دہلوی اور میر حسن کے عہد میں یہ رنگ قریب قریب خارج ہو گیا۔ میر فرماتے ہیں ؎

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

سودا فرماتے ہیں ؎

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

قائم چاند پوری ؎

ہو رہو م مرا کیوں نہ خوش کہ وہ بت چلیں
یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج میں سر شام
بطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ
تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

تصوف ایک دوسری خصوصیت اس زمانے کی یہ تھی کہ شاعری پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ یہ رنگ اس زمانے میں عالمگیر تھا۔ وجہ یہ تھی کہ شعراء اکثر صوفی مشرب ہوتے۔ یا کم از کم آخر عمر میں ہو جایا کرتے تھے۔ پیری مریدی کا بازار گرم تھا۔ فارسی شاعری متاخرین کے کلام میں تصوف میں ڈوبی ہوئی تھی اور اردو شاعری اسی

کی ناقل تھی۔ دکن میں شاعری کی ابتداء مذہب سے ہوئی اور تصوف شاعری کا جزو اعظم تھا۔ انہیں اسباب سے اردو شاعری پر بھی تصوف کا رنگ اچھا خاصا چڑھ گیا۔

سپاہی پیشہ شعراء

اس زمانہ کے شعراء اکثر سپاہی پیشہ ہوتے۔ اس وجہ سے کہ زمانہ بہت پُر آشوب تھا۔ بیرونی حملوں کی کثرت۔ ملک میں بد امنی۔ سلطنت کی کمزوری ان سب وجوہ سے کسی کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔ اور پھر سپہ گری کا پیشہ نہایت عزت اور منفعت کا پیشہ خیال کیا جاتا تھا۔

کلام میں یک رنگی کی کمی اور سبک و مبتذل الفاظ

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد کے اکثر شعراء کا کلام یک رنگ نہیں مثلاً کسی غزل کو لیجئے تو اس کے بعض شعر تو بہت اچھے ہوں گے۔ مگر بعض شعر نہایت معمولی اور اعلےٰ مذاق سے گرے ہوئے اس زمانہ میں معمولی شوقیانہ الفاظ لکھنے میں مطلق عار نہ تھا۔ جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ریختہ اُس وقت تک تفنن طبع اور تبدیل ذائقہ کے طور پر لکھی جاتی تھی۔ نہ کہ اس میں مزاولت اور مشق مدِ نظر تھی۔ اسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو آبرو۔ حاتم۔ ناجی مظہر کے یہاں عمدہ کلام کے ساتھ ساتھ بہت سے اشعار ایسے بھی ملیں گے جو ذوق صحیح اور طبع سلیم پر ناگوار ہیں۔ میر اور سودا نے بھی کبھی کبھی ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں خاص کر جہاں شیخ اور زاہد وغیرہ کا خاکہ اڑایا گیا ہے جو اب کسی مہذب صحبت میں شاید ہی استعمال کیے جائیں۔

اس عہد کے شعراء کا طرز بیان اور ان کے کلام کی خامیاں

نظم ابھی پختگی اور کمال کے درجہ پر نہیں پہنچی تھی۔ قواعد عروض کی پابندی بھی مشکل سے ہوتی تھی۔ قافیہ ایسی ضروری چیز اور ردیف تک کے قواعد پوری طرح برتے نہیں جاتے تھے۔ اشعار کی بندش ڈھیلی۔ زوائد کی کثرت جن سے آج کل ہمارے کانوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ البتہ زبان میں سادگی اور شیرینی غضب کی ہے۔

عربی و فارسی الفاظ و خیالات کا داخلہ اور سنسکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا اخراج

اس دور میں سنسکرت و بھاشا و قدیم دکنی الفاظ کا اخراج ہوا۔ جو کہ میر و سودا کے زمانہ میں جاری رہا۔ اور شیخ ناسخ کے عہد تک جس کی تکمیل ہوئی۔ مورخین ان کو مصلحین زبان کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے بھونڈے الفاظ خارج کر دیے گئے مگر اس کے ساتھ ہی بھاشا کے بہت سے شیریں خوبصورت اور خوش آہنگ الفاظ بھی نکال دیے گئے۔ عربی و فارسی کے مترادف قبول کیے گئے اس کے ساتھ ہی ساتھ عربی و فارسی الفاظ میں صحت کا خیال ہونے لگا۔ قدیم محاورات و الفاظ جو ولی کے زمانے میں مستعمل تھے۔ ان میں تغیرات پیدا ہونا شروع ہوئے اور جدید محاورے بنانے کی کوشش کی گئی۔ تاریخ شعرائے اُردو میں درج ہے کہ "گو استعمال الفاظ مکروہ کا اور نہ پروا کرنا یا ریگ یاتوں کا یعنی جائز رکھنا قافیہ سین اور صاد کا اُس کے کلام سے دریافت ہوتا ہے۔ اور نہ صرف اسی کے کلام میں بلکہ اس کے ہم عہدوں کے کلام میں اس سے زیادہ ہے۔ شاہ حاتم نے اس طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کی جیسا کہ اُن کے "دیوان زادہ" کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔"

شاہ مبارک آبرو متوفی ۱۷۵۰ء

شاہ نجم الدین دہلوی عرف شاہ مبارک متخلص بہ آبرو محمد شاہ کے زمانہ میں تھے۔ پیدائش کی تاریخ معلوم نہیں۔ مشہور صوفی شیخ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے۔ گوالیار میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں دہلی آئے جہاں شعر کہنا سیکھا۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے اور انہیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں۔ مگر افسوس کہ دیوان زمانہ غدر میں تلف ہو گیا۔ اور

---

[1] مبارک اللہ نام عالمگیری عہد کے آخر میں پیدا ہوئے۔ ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ (دسمبر ۱۷۳۳ء) کو انتقال ہوا۔ فائق رامپوری بحوالہ محمدی ص ۱۰۹۔ قاموس الاعلام ۱۱۶۱ھ۔

اب نایاب ہے۔ ایک مثنوی موسوم بہ "آرائشِ معشوق" بھی لکھی ہے۔ تھوڑے عرصہ تک نارنول میں بھی رہے۔ نہایت خلیق اور متواضع آدمی تھے۔ ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی۔ جس کی وجہ سے مرزا جان جاناں مظہر سے اکثر چشمک چلتی تھی۔ شاہ آبرو ایک شخص ببیر نکھن عرف شاہ کمال الدین بخاری سے جو خود بھی شاعر تھے بہت محبت رکھتے تھے جس کا حوالہ اکثر اُن کے شعروں میں ہے۔ اکثر تذکرہ نویس مثلاً میر حسن مصحفی فتح علی اور لطف وغیرہ ان کے مداح ہیں اور ان کے کلام کی تعریفوں سے اُن کی آبرو بڑھاتے ہیں۔ شاہ آبرو متقدمین شعراء میں ہیں اور استعارات و ایہام کے بادشاہ ہیں اسی وجہ سے کبھی کبھی کلام رُبک اور مبتذل ہو جاتا ہے۔ گو وسعتِ معلومات محدود ہے مگر درسیات سے فارغ معلوم ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۱۶۱ھ مطابق سنہ ۱۷۴۸ء میں پچاس برس کی عمر سے متجاوز ہو کر وفات پائی۔

خان آرزو ۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء

سراج الدین علی خاں متخلص بہ آرزو معروف بہ خان آرزو۔ شیخ حسام الدین حسام کے صاحبزادے ہندوستان کے مشہور شعراء اور ناقدانِ فن میں سے تھے۔ میر تقی میر کا قول ہے کہ "ان کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر کوئی محقق اور شاعر شیریں زبان نہ تھا" میر حسن ان کو امیر خسرو دہلوی کے بعد سب سے بڑا شاعر ہندوستان خیال کرتے ہیں۔ لطف بھی ان پر اپنی مداح سرائی سے لطف کرتے ہیں اور فتح علی ان کو ان کے نام کی مناسبت سے "چراغِ محفلِ فصاحت" کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔ مولانا آزاد ان کی نسبت لکھتے ہیں کہ ان کی زبان اُردو کے ساتھ وہی مناسبت ہے جو ارسطو کو فلسفہ کے ساتھ ہے" میر تقی میر ان کا ذکر نہایت ادب سے کرتے ہیں اور اپنا اور اس زمانہ کے شعراء کا جگت اُستاد مانتے ہیں۔ خان آرزو اُردو اور فارسی دونوں کے اُستاد تھے۔ گو اُردو کم کہتے تھے مگر اُن کے استاذ الاساتذہ ہونے میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے۔ اس وجہ

سے کہ میر۔ سوداؔ۔ مظہر۔ دردؔ۔ ایسے قادر الکلام ان کو اُستاد مانتے تھے۔ آگرہ کے رہنے والے شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں سے تھے۔ شعر کہنا ابتدائے عمر میں شروع کیا۔ اور مختلف علوم و فنون میں بصیرت کاملہ حاصل کی۔ جوانی میں بمقام گوالیار منصب دار مقرر ہوئے۔ مگر فرخ سیر کے عہد میں ۱۱۳۰ھ میں دہلی واپس آئے ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۷۳۴ء میں شیخ علی حزیں ایران سے ہندوستان آئے جہاں ان کے کمال کی بے انتہا شہرت ہوئی۔ ہر شخص ایسے صاحب کمال سے ملنے کا مشتاق تھا۔ مگر آرزوؔ کو کمال فن اور استغنا اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اتفاقاً کسی موقع پہ ان دونوں باکمالوں کا سامنا ہو گیا۔ شیخ کی متکبرانہ باتیں اُن کو بُری معلوم ہوئیں جس سے متاثر ہو کہ انھوں نے شیخ کے کلام پر اعتراض وارد کرنا شروع کیے اور ان کو ایک رسالہ مسمّی بہ تنبیہ الغافلین کی صورت میں شایع کیا۔ نادر شاہ کے حملہ دہلی اور تباہی شہر کے بعد نواب سالار جنگ کے مشورہ سے وطن چھوڑ کر لکھنؤ آئے جہاں ۱۱۶۹ھ میں مطابق ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا۔ مگر لاش کو حسب وصیت نواب موصوف دہلی لے گئے اور وہیں پیوند زمین کیا۔ خان آرزو بڑے صاحب کمال اور شاعر شیریں مقال تھے۔ ان کی قابلیت طباعی، ذہانت، قوت اختراع، فصاحت و بلاغت سب کو مسلّم ہے۔ تصانیف بکثرت ہیں۔ منجملہ اُن کے کتب ذیل موجود ہیں، ایک فارسی دیوان تقریباً تیس ہزار شعر کا شرح سکندر نامہ و قصائد عرفی و گلستان سعدی لغت فارسی موسوم بہ "سراج اللغات" لغت اُردو موسوم بہ "غرائب اللغات"[۲] جو اصطلاحات صوفیہ کی ایک لغت مسمّی بہ نوادر الالفاظ کی شرح ہے۔

---

[۱] اسی نام کا ایک رسالہ سوداؔ کا بھی ہے جس میں فاخر مکین کا خاکہ اڑایا گیا ہے (شاید مرزا صاحب کو تسامح ہوا) سوداؔ کی تالیف کا نام عبرۃ الغافلین ہے جو منظوم و مندرج کلیات ہے۔ فاضل م [۲] غالباً فیض آباد۔ مرتضیٰ

[۲] معاملہ برعکس ہے۔ غرائب اللغات عبدالواسع ہانسوی کا اردو لغت ہے جس کی شرح و تنقیح و تنقید نوادر الالفاظ تالیف آرزو ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔ مرتضیٰ۔

رسائل "موہبت عظمیٰ" اور "عطیۂ کبریٰ" فن بلاغت و معانی و بیان میں۔ تذکرہ "مجمع النفائس" جس کو تذکرہ آرزو بھی کہتے ہیں جس میں ان ہندوستانی و دکنی شعراء کا ذکر ہے جنہوں نے بزبان فارسی شعر کہے ہیں۔ اس میں سے میر تقی میر نے اپنے تذکرہ "نکات الشعراء" میں کچھ نقل کیا ہے۔ تقریباً پندرہ تصانیف خان آرزو کی کہی جاتی ہیں مشہور استاد تھے۔ اور بعض شاگرد اپنے سے بھی زیادہ نامور چھوڑ گئے۔ زبان اُردو ایسے محقق کامل اور ناقد فاضل کے احسانات سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

شاہ حاتم سنہ ۱۶۹۹ء تا سنہ ۱۷۹۱ عیسوی

شاہ حاتم مشاہیر قدما میں ہیں۔ ان کو دہلی کے رنگ کا موجد خیال کرنا چاہیے۔ ریختہ بطرز ولی و مضمون و تاجی و آبرو لکھتے تھے۔ ظہور الدین نام۔ حاتم تخلص۔ شیخ فتح الدین کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ "تاریخ ولادت سنہ ۱۱۱۹ھ لفظ ظہور سے نکلتی ہے جو سنہ ۱۶۹۹ء کے مطابق ہے۔ سپاہی پیشہ تھے۔ تھوڑے عرصے تک نواب امیر خاں صوبہ الہ آباد کی رفاقت میں رہے۔ سنہ ۱۷۲۰ء میں جب دیوان ولی دہلی میں آیا اور اس کے اشعار کو لوگوں نے بہت پسند کیا تو حاتم نے بھی طبع آزمائی کی اور ریختہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ کمال کو پہنچ گئے۔ خواجہ میر درد، میر تقی میر اور بعد کو مصحفی کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اپنے زمانہ میں ریختہ کے اُستاد مانے گئے ہیں۔ دو دیوان ان کی طرف منسوب ہیں۔ ایک قدیم رنگ میں جس میں صنعت ایہام بہت ہے اور اکثر کلام فحش ہے۔ دوسرا جدید رنگ میں۔ پہلے رمز تخلص کرتے تھے۔ عالمگیر ثانی کے زمانے میں ایک دیوان کلیات سے منتخب کر کے مرتب کیا۔ اس کا نام دیوان زادہ رکھا۔ کلیات کی نسبت جو آبرو و تاجی کے طرز میں لکھا تھا تذکرہ قدرت میں لکھا ہے کہ فائدہ بجم شاعری بسیار دارد، دیوان قدیم او از نظر ایں مؤلف گذشتہ بطرز آبرو و تاجی حرف می زند اکثر اشعارش از لطف خالی یافتم" محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے

ایک مثنوی حقّہ پر لکھی جو زیادہ دلچسپ نہیں۔ ان کے علاوہ ایک دیوان فارسی بھی ہے نہایت متین و مہذّب بزرگ تھے۔ اپنے دیوان کے دیباچہ میں ۴۵ شاگردوں کے نام دیے ہیں۔ جن سب سے پہلے مرزا رفیع سوداؔ کا نام نامی ہے۔ یہ ایسے شاگرد تھے جن پر استاد کو بھی فخر تھا۔ اور مشہور شاگردوں میں رنگینؔ، نثارؔ، تاباںؔ، فارغؔ بھی ہیں۔ شاہ صاحب کے مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی بہت تھی۔ تصفیۂ زبان کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور بہت سے غیر مانوس اور غیر فصیح الفاظ ترک کر دیے۔ درستی زبان کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کام ذوقؔ اور آتشؔ و ناسخؔ کے زمانہ میں ایک سو برس بعد پورا ہوا۔ اس کی داغ بیل شاہ حاتم نے ڈال دی تھی۔ افسوس ہے ان کے معاصرین نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ورنہ اُسی زمانہ میں بہت کچھ تکمیل ہو جاتی۔ شاہ صاحب اس کے متعلق خود فرماتے ہیں: "خوشہ چین خرمن سخنوران عالم۔ بصورت محتاج و بمعنی حاتم کہ از ۱۱۲۹ھ تا ۱۱۶۹ھ کہ چہل سال باشد عمر دریں فن صرف کردہ در شعر فارسی پیرو مرزا صائب و در ریختہ ولی را استادی داند۔ اول کسے کہ دریں فن دیوان ترتیب نمودہ او بود و معاصرین فقیر شاہ مبارک آبرو و شرف الدین مضمون و مرزا جان جاناں مظہر و شیخ احسن اللہ احسنؔ۔ و مرزا شاکر ناجی و غلام مصطفےٰ یک رنگ مست۔ و لفظ در بر دار و الفاظ وافعال دیگر کہ در دیوان قدیم خود تقید دارد۔ دریں ولا از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روزمرۂ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیحان رند در محاورہ آرند منظور دارد زبان ہندی بھاکا را موقوف کردہ محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار نمودہ ... ... مختصر کہ لفظے غیر فصیح انشاء اللہ نخواہد بود۔" اس کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ درستی اور اصلاح زبان کا خیال سب سے پہلے شاہ حاتم کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ کلام صاف اور عاشقانہ اور

کہیں کہیں عارفانہ ہے۔ شعر آپس کی باتیں۔ زبان سلیس۔ البتہ زبان کی ابتدائی حالت ہونے کی وجہ سے اکثر زائد الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دہلی میں ۱۱۹۲ھ یا ۱۱۹۳ھ میں انتقال کیا[1]۔ مگر مصحفی کا قول ہے کہ ۸۳ برس کی عمر میں ۱۱۹۶ھ میں فوت ہوئے[2]۔ میر تقی کو شاہ حاتم کے ساتھ حسن عقیدت نہیں ہے۔ اپنے تذکرہ میں مرد جاہل و متمکن ان کی نسبت لکھا ہے۔ مگر میر حسن اُن صاحب کمال و پسندیدہ افعال۔ عالی فطرت و بلند ہمت کے معزز القاب سے یاد کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ان کی غزلوں کو نغمہ سرایان ہند محفلوں میں گاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ حاتم کا مرتبہ ادب اُردو میں منفرد اور ممتاز ہے۔ وہ سودا اور دوسرے بڑے بڑے شاعروں کے اُستاد تھے۔ اور اصلاح شعر اور درستی زبان میں انہوں نے بہت نمایاں حصہ لیا۔

میاں مضمون متوفی ۱۱۴۷ھ

شیخ شرف الدین متخلص بہ مضمون، حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج کی اولاد میں تھے۔ جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید — کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید

جاجمؤ صوبۂ اکبرآباد کے رہنے والے سپاہی پیشہ تھے پھر تلوار کو قلم سے بدل لیا بچپن میں دلّی گئے اور زینت المساجد میں قیام کیا۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے مگر بڑے ظریف بامذاق اور بذلہ سنج تھے۔ میر اُن کو "ہنگامہ گرم کن مجلسہا" لکھتے ہیں۔ اپنے زمانہ کے اُستاد فن اور اُسی زمانہ کی روش کے مطابق خوب کہتے تھے۔ ایک دیوان دو سو ابیات کا چھوڑا۔ کلام پاکیزہ اور پُر لطف ہے مگر اکثر جگہ فحش اور استعارات و ایہام وغیرہ سے جو زمانہ کا رنگ تھا مملو ہے۔ گو کہ سن میں آرزو سے

---

[1] مصنف خمخانۂ جاوید کی تحقیق کے مطابق ۹۶ برس کی عمر میں سنہ ۱۲۰۷ ہجری میں انتقال کیا ۱۲

[2] مخدومی جناب عرشی نے اس اشتباہ کی تردید کی اور ۱۱۹۷ھ کو صحیح مانا۔ دیکھیے حاشیہ دستور الفصاحت ص ۷۰۔ فاضل

بڑے تھے۔ مگر شعر میں ان سے مشورہ کر لیتے تھے۔ میر اُن کو خوش فکر اور تلاش الفاظ تازہ کا بہت مشاق لکھتے ہیں۔ سوداؔ اور میر حسنؔ بھی ان کے بہت معترف ہیں۔ خان آرزوؔ اُن کو "شاعر بیدانہ" کہتے تھے۔ اس وجہ سے کہ نزلہ کے سبب سے سب دانت اُن کے گر گئے تھے۔ ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۷۴۵ء میں انتقال کیا۔

مرزا مظہر جان جاناں
۱۶۹۸ء تا ۱۷۸۱ء

شمس الدین نام جان جاناں عرف مظہر تخلص۔ والد کا نام مرزا جان تھا۔ جو عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ نسب ان کا باپ کی طرف سے محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے۔ ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی دربار شاہی میں صاحب منصب تھے۔ پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی۔ ان رشتوں سے تیموری خاندان کے نواسے تھے۔ صوفی باصفا اور شاعر یکتا تھے۔ کلام میں جس قدر متانت اور تاثیر ہے اُسی قدر توحید اور رُوحانیت بھی جلوہ گر ہے۔ مسٹر بیل اور فرانسیسی محقق گارسن دتاسی کی تحریر کے موافق بمقام آگرہ ۱۱۱۰ھ مطابق ۱۶۹۸ء میں۔ مگر مولانا آزاد کی تحقیق کے بموجب ۱۱۱۲ھ میں بمقام کالا باغ صوبۂ مالوہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد عہد عالمگیری میں منصب دار اور نسباً علوی تھے اور خاندان شاہی سے بھی دور کا پیوند تھا۔ جب آپ کی عمر سولہ برس کی ہوئی تو سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا۔ مرزا صاحب کو صوفیائے کرام اور اہل دل کی صحبت کا بچپن سے شوق تھا۔ شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے باقاعدہ حدیث پڑھی اور تین برس تک مشائخ نقشبندیہ سے کمال حاصل کیا۔ خود بھی وہ درویش کامل اور صوفی صاحب دل تھے۔ سیکڑوں ہندو اور مسلمان آپ سے بیعت اور حسن عقیدت رکھتے تھے۔ میر تقی میرؔ اپنے تذکرہ میں آپ کا ذکر ادب و احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "مردیست مقدس، مطہر، عالم، صاحب کمال شہرۂ عالم بے نظیر، معزز، مکرم، اکثر اوقات در یاد الٰہی صرف می کنند

خوش تقریرے بمنزلہ ایست کہ در تحریر نمی گنجد۔ حسن صوری و معنوی دونوں سے عشق کامل رکھتے تھے۔ میر عبدالحی تاباں سے جو اس زمانہ کے شہرۂ آفاق و خوبرو شاعر تھے بہت محبت اور اختلاط تھا۔ عالم متبحر۔ نقیہ کامل حنفی المذہب اور نقشبندی طریقت تھے۔ عالم باعمل احکام قرآن کے پیرو۔ اکثر وقت اوراد و وظائف یا دلچسپ علمی گفتگو اور شعر و شاعری میں صرف کرتے تھے۔ آپ کی تہذیب و متانت و قناعت اور پابندی وضع ضرب المثل تھی۔ استغنا اور بے تعلقی کی حکایات گل رعنا میں درج ہیں۔ محمد شاہ نے ایک دفعہ کہلا بھیجا کہ ملک کا جو حصہ چاہیے قبول فرمائیے۔ انکار کر دیا۔ نواب فیروز جنگ نے گاؤں پیش کش کیے۔ قبول نہ ہوئے۔ آصف جاہ نے تین ہزار روپیہ نذر کیا منظور نہ ہوا۔ استغنا کی یہ شان تھی کہ کھانا تک بازار سے منگواتے تھے۔ نذر و نیاز شاید ہی لیتے تھے۔ علم و فضل اور شعر و شاعری کے۔ ساتھ آپ کا اخلاق شگفتہ روئی اور لطافت مزاج بھی مشہور تھی۔ حسن معنی کے ساتھ حسن صورت بھی اللہ تعالے نے بدرجہ اتم عنایت فرمایا تھا۔ اکثر کرامات بھی آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔

آپ کا کلام زبان اُردو کی تاریخ ارتقاء میں ایک خاص درجہ اور اہمیت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے کہ آپ نے نہ صرف زبان کو صاف کیا بلکہ اس میں فارسی کی نئی نئی ترکیبیں اور خیالات پیدا کیے اور قدیم طرز ایہام گوئی کو ترک کیا زبان میں یہ جدید رنگ آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ مصحفی اور شوق اپنے اپنے تذکروں میں اس خدمت کا ضرور اعتراف کرتے ہیں۔[1] آپ کا کلام نظم و نثر دونوں میں نہایت سادہ سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور

[1] مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں: "در ابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصہ نیامدہ بود و دور دورِ ایہام گویاں بود اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست ... در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان استاد جلوہ ظہوری و ہدر فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ باعتقاد فقیر مرزا مست (باقی اگلے صفحہ پر)

جیسا ہم اوپر لکھ آئے ہیں جذبات اور تاثیر کے ساتھ تصوف کے خیالات سے بھی مالا مال ہے۔ اکثر اشعار کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضمون خیالی نہیں بلکہ واردات قلبیہ کا صحیح اور من وعن اظہار ہے۔ ایک دیوان فارسی ایک ہزار ابیات کا جو ۱۱۷۰ھ میں مرتب کیا اور ایک قدیم دیوان کا انتخاب ہے جس میں بیس ہزار شعر تھے۔ ایک ناتمام دیوان اُردو اور ایک بیاض "خریطۂ جواہر" فارسی شعراء کے منتخب کلام کی آپ تصانیف سے یادگار ہیں۔ وفات نہایت افسوس ناک طریقے سے ہوئی۔ اس طرح کہ عشرۂ محرم تھا۔ تعزیے نکل رہے۔ مرزا صاحب اپنے کوٹھے پر بیٹھے ان کی سیر کر رہے تھے۔ مشہور ہے کہ اُن کی زبان سے نکلا۔ کہ" بارہ سو برس بعد اس قدر شور و غل اور ماتم کرنا اور کاغذ اور بانس کے ڈھانچوں کا اس قدر ادب و احترام کرنا خلاف عقل ہے۔ یہ جملہ تعزیے جانے والوں نے سُن لیا اور برسر پرخاش ہو گئے۔ نویں تاریخ کی رات کو دو آدمی مرزا صاحب کے مکان پر وارد ہوئے اور آواز دی۔ مرزا صاحب کو کچھ خیال نہ ہوا۔ باہر نکل آئے۔ ایک آدمی نے دیکھتے ہی فوراً قرابین مار دی۔ مرزا صاحب زخمی ہوئے اور یہی ہلاکت کا سبب ہوا۔ یہ واقعہ ۱۱۹۴ھ مطابق ۱۷۸۰ء

بعد تتبعش بدیگراں رسیدہ" ۱۲۔ قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں: "میگویند اول کسے کہ طرز ایہام گوئی ترک نمودہ و ریختہ را در زبان اُردوے معلی شاہجہان آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص وقت گردیدہ و مروج ساختہ زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین واقف رموز جناب اکبر کاشف کنوز طریقۂ پیغمبر مرزا جان جاناں متخلص بمظہر مرد یست فرشتہ صفت" ۱۲۔ انشاء اللہ خاں دریائے لطافت میں لکھتے ہیں: "ازبسکہ آواز فصاحت و بلاغت جناب فیضمآب مرزا جان جاناں مظہر علیہ الرحمہ گوش راقم را متزخود میداشت دل با دیدۂ مستعد ستیزہ شد کہ چرا از دیدار مرزا صاحب خود را ایں ہمہ محروم می پسندی و مرا از لذت جاودانی و عیش روحانی کہ در کلام معجز نظام آں حضرت ست باز میداری ۱۲۔ میر صاحب لکھتے ہیں: "دیوان مختصر شعر فارسی او بنظر فقیر مؤلف آمدہ است از سلیم و کلیم پایہ کمی ندارد" ۱۲۔ میر حسن لکھتے ہیں: "از فصحائے زماں و بلغائے دوراں" ۱۲۔

کا ہے۔ آپ کے شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقین۔ میر محمد باقر حزیں۔ خواجہ احسان اللہ خاں بیاں۔ مصطفےٰ خاں یک رنگ۔ بساون لال بیدار اور محمد فقیہ دردمند مشہور شاعر صاحب دیوان ہوئے ہیں۔

ناجی | سید محمد شاکر، نام ناجی تخلص۔ مرد سپاہی پیشہ نواب امیر خاں کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے۔ شاہ آبرو حاتم اور ولی کے معاصر عہد محمد شاہی کے شعراء میں ہیں جب نادرشاہ نے دلی پر حملہ کیا ہے تو یہ موجود تھے۔ شہر کی تباہی و بربادی اپنی آنکھ سے دیکھی جس کے پُردرد حالات ایک مخمس میں بیان کیے ہیں۔ عنفوان شباب میں انتقال کیا۔ آرزو اُن کے کمال کے قائل اور اپنے برابر بلکہ اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں نہایت تیز شوخ بطبع ظریف اور ہر شخص کے کلام میں عیب نکالا کرتے تھے۔ میر صاحب کا قول ہے کہ "مزاج میں ہزل بہت تھا۔ اپنے مذاق آمیز کلام سے لوگوں کو ہنسلاتے اور خود منہ بنائے رہتے"۔

ان کا کلام بصورت دیوان موجود ہے اور سلاست زبان اور نزاکت خیالات کی وجہ سے اہل دہلی میں مقبول ہے۔ اشعار میں استعارات و ایہام کی کثرت ہے بعض اشعار فحش ہیں جو اس زمانہ کا رنگ ہے۔

تاباں | میر عبدالحی تاباں تخلص۔ نہایت خوب صورت خوشرو جوان تھے۔ ان کے غیر معمولی حُسن کا شہرہ لوگوں کے زبان زد تھا یوسف ثانی کہلاتے تھے۔ ان کے حُسن کی تعریف میں شعر کہے جاتے تھے۔ اسی حسن کو دوبالا کرنے کے لئے وہ عموماً سیاہ کپڑے پہنتے تھے۔ ان کے حُسن کا شہرہ یہاں تک پھیلا کہ ایک مرتبہ شاہ عالم اُن کے روے صبیح کی زیارت کے لیے خود گئے۔ عورتوں کی طرف ان کو زیادہ توجہ نہ تھی مگر

لہ کلب علی خان فائق۔ صحیفہ، لاہور نمبر ۲۱ میں تاریخ ولادت ۱۱۲۸ھ تقریباً لکھتے ہیں۔ اور وفات ۱۱۶۳ھ۔ فاضل

ایک شخص پر جن کا نام شاہ سلیمان تھا عاشق تھے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں کو ان کے ساتھ ایک خاص محبت اور ارتباط تھا۔ جیسا کہ ان کے حال میں لکھا گیا ہے۔ اکثر تذکرہ نویسوں کا قول ہے کہ جوانی میں مرے اور موت کی وجہ بتائی جاتی ہے کہ مے نوشی کثرت سے کرتے تھے جس کی وجہ سے استقسار ہو گیا تھا۔ مگر صاحب تذکرہ گلشن ہند کا بیان ہے کہ انہوں نے ان کو ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ میں دیکھا تھا اور جب بھی وہ نہایت حسین وجمیل تھے۔ فیلن صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۷۹۷ء یعنی ۱۲۱۱ھ تک وہ زندہ تھے۔

میر صاحب اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر غیر معمولی تعریفوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں "نوجوان بامزہ بود۔ سید نجیب الطرفین مولداو شاہ جہاں آباد است بسیار خوش فکر و خوب صورت خوش خلق و پاکیزہ سیرت، معشوق عاشق مزاج۔ تا حال در فرقہ شعرا ہیچوں او شاعر خوش ظاہر از مکمن بطون عدم بعرصہ ظہور جلوہ گر نشدہ بود" آگے ان کی مے نوشی کی نسبت لکھتے ہیں کہ "آخر آخر کہ اوائل جوانی او بود۔ ایں قدر مداومت شراب کردہ کہ ملاقات ہمہ یاراں موقوف شد اکثرے از دوستانش کہ بہ خانۂ او می رفتند او را مست طافح می یافتند"۔ اسی شراب کی کثرت سے دوستوں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے بھی مجبور ہو کر آخرکار شراب سے کنارہ کشی کی مگر چند ہی دن کے بعد سفرِ آخرت اختیار کیا۔ ان کا کلام عاشقانہ شیریں و نمکین ہے۔ خیالات نہایت نازک، زبان بہت سلیس۔ شاگردی میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حاتم اور بعض کے نزدیک محمد علی حشمت سے اصلاح لیتے تھے۔ لطف کا قول ہے کہ سودا کو اپنا کلام دکھلاتے تھے۔ مگر میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں حشمت ہی کو ان کا استاد مانا ہے اور یہی صحیح ہے۔

یک رنگ مصطفےٰ خاں یک رنگ خان جہاں لودھی کے احفاد سے تھے۔ اُمرائے محمد شاہی میں تھے اور عزت و آبرو سے زندگی بسر کرتے تھے۔ باکمال سخنورانِ دہلی میں شمار کیے گئے ہیں۔ کلام بلند اور استعارات سے مملو شاہ مبارک آبرو اور میاں مضمون

کے طرز کا ہے۔ بعض لوگ اُن کو شاہ آبرو کا اور بعض خان آرزو کا شاگرد بتاتے ہیں مگر خود ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا مظہر کے شاگرد تھے۔ ایک دیوان یادگار ہے جو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور عاشقانہ اور عارفانہ دونوں رنگ میں ہے۔ اکثر اشعار کو دنیا دار عشق مجازی کا مگر عرفا" اُن کو عشق حقیقی کا پرتو سمجھتے ہیں۔ تاریخ پیدائش و وفات کا پتہ نہ چلا۔ ایک مرثیہ بھی امام حسین علیہ السلام کی شان میں لکھا ہے۔ جس کے کچھ اشعار میر صاحب نے اپنے تذکرہ میں کیئے ہیں۔

فغان متوفی ۱۷۷۲ء — اشرف[1] علی خاں متخلص بہ فغاں خلف مرزا علی خان نکتہ۔ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے کوکہ یعنی رضاعی بھائی تھے۔ نہایت ظریف الطبع اور بذلہ سنج تھے۔ اسی وجہ سے ظریف الملک کوکہ خاں بہادر کا خطاب دربار دہلی سے عنایت ہوا تھا۔ باتوں میں مزاح اور ظرافت بہت تھی۔ پھبتی کہنے کے مشاق[2] تھے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو تباہ کیا تو فغاں مرشد آباد چلے گئے جہاں ان کے چچا ایرج خاں برسر اقتدار تھے۔ مرشد آباد سے نواب شجاع الدولہ بہادر کے پاس فیض آباد آئے۔ اور نواب نے ان کی بڑی خاطر مدارت کی۔ چونکہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے کوبات ناگوار گزری یہاں سے پٹنہ چلے گئے (بقول مصحفی) (نواب نے جوش اختلاط میں گرم بیسے سے ان کا ہاتھ داغ دیا تھا) جہاں مہاراج شتاب رائے نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی۔ یہاں کی صحبت سے بھی دل بھر گیا اور بالآخر گوشہ نشینی اختیار کی۔ ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء

[1] خلیق انجم، مجبفہ، لاہور نمبر ۲۶ - تاریخ ولادت تقریباً ۱۱۳۹ھ (بعبعد) اور قبر دھول پورہ پٹنہ ہند۔ دیوان چھپ چکا ہے۔ جس کے آغاز میں ایک دیبع مقدمہ بھی ہے۔ نیز دیکھیئے حاشیہ دستور الفصاحت ص ۶۴ ببعد۔ فاضل۔

[2] میر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ایک درباری امیر ناگر مل کو "گھی کی منڈی کا سانڈ" اور ایک شخص مسمٰی بہ حکیم معصوم کو "گادہ گجراتی" کہا کرتے تھے ۱۲۔

میں پٹنہ میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ایک عمدہ دیوان ریختہ یادگار چھوڑا جس میں تقریباً دو ہزار اشعار ہوں گے۔ میر تقی اور میر حسن کی تحقیق کے بموجب ایک دیوان فارسی کا بھی ہے۔ سودا اور میر دونوں باکمال ان کے معرف ہیں۔ سودا نے ان کے بعض اشعار کی تضمین بھی کی ہے۔ میر صاحب ان کو قزلباش خاں اُمید کا شاگرد بتاتے ہیں۔ مگر مصحفی علی قلی ندیم سے نسبت دیتے ہیں۔ فغاں فارسی اور ہندی کے محاورات خوبی کے ساتھ ایک ساتھ نظم کرتے ہیں۔ کلام نہایت پاکیزہ۔ خیالات نازک اور بلند۔ ایہام گوئی ترک کر دی تھی۔ تبذل اور فحش الفاظ و خیالات سے احتراز تھا۔ کلام میں صفائی اور روانی بہت ہے۔ قطعات مسلسل خوب لکھتے ہیں۔ میر صاحب ان کو "جوان قابل و ہنگامہ آرا" کہتے ہیں۔ دیوان میں غزلیات۔ قصائد۔ قطعات۔ رباعیاں مخمس سبھی کچھ ہیں۔

باقی اور شعرا اس عہد میں شاعری کا رواج بہت پھیل گیا تھا۔ اس وجہ سے شعرا بھی کثرت سے پیدا ہوئے۔ قدیم تذکروں میں مثلاً میر تقی اور میر حسن کے تذکروں میں چھوٹے بڑے مشہور و غیر مشہور ہر قسم کے شاعروں کے نام اور ان کے کلام کے نمونے بہ کثرت دیے ہوئے ہیں۔ ہم اس مختصر کتاب میں ان سب کا ذکر بالاستیعاب کرنے سے قاصر ہیں۔ میر محمد حسین کلیم جو دلی کے رہنے والے تھے وہ قابل ذکر ہیں۔ میر حسن کا بیان ہے کہ فصوص کا انھوں نے عربی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا اور ایک رسالہ عروض و قافیہ میں بھی لکھا تھا۔ میر صاحب کے رشتہ دار تھے اور صاحب کمال تھے۔

باب ٦

اساتذہ دہلی

حصّۂ دوم۔ طبقۂ متوسطین

میرؔ اور سوداؔ کا زمانہ

اُردو شاعری کا زریں عہد

یہ دور اُردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا دور ہے۔ اسی میں شاعری کو معراج ترقی حاصل ہوئی۔ اسی میں میر حسنؔ، دردؔ، سوداؔ اور میرؔ ایسے صاحبِ کمال پیدا ہوئے۔ جن کے نام اِس وقت تک روشن ہیں۔ بلکہ جب تک زبان اُردو دنیا میں رہے گی وہ کبھی نہیں مٹ سکتے۔ تمام اصناف سخن اس عہد میں انتہائے کمال پر پہنچے۔ مثنوی میں میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" قصیدہ میں سوداؔ کے قصائد۔ غزل میں میرؔ اور دردؔ کی غزلیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ یہ کامل اُستاد اپنے اپنے فن میں بے نظیر اور بے مثال گزرے ہیں اور اپنا کلام آئندہ نسلوں کے واسطے ایک بے مثال کسوٹی چھوڑ گئے ہیں۔ یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جن کا ادب و احترام مرورِ ایام سے کم نہیں ہو سکتا۔ تمام اساتذہ مابعد مثلاً ذوقؔ۔ غالبؔ۔ ناسخؔ۔ آتشؔ سب ان کا لوہا مانتے تھے اور ان کی استادی اور قادر الکلامی کے دل سے قائل تھے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب   ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

ریختہ کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اُس معتقد کا

زبان میں فارسیت کا غلبہ اس عہد میں فارسیت کا بہت غلبہ تھا۔ میر، سودا اور دیگر اُستادانِ فن اپنے پیش روؤں کی نقل کرتے رہے۔ شاہ حاتم کے ساتھ خواجہ میر درد و میر چناں بیکین نے اپنے کلام سے ہندی کے لفظ نکال ڈالے۔ ان تغیرات کی فہرست صفیر بلگرامی نے تذکرۂ جلوۂ خضر کی جلد اول میں درج کی ہے جس کو شعر الہند میں نقل کیا ہے۔ مولوی عبد السلام لکھتے ہیں کہ "ان اصلاحات کے بعد اُردو شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی اور ہمارے شعراء نے بالکل ایرانی شعراء کے طرز میں کہنا شروع کیا چنانچہ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

تبعیت سے جو فارسی کے میں نے ہندی شعر کہے
سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

سودا و میر نے سعدی و حافظ سے استفادہ کیا اور ان اشعار کا ترجمہ بھی کیا۔ اس زمانہ میں کچھ لوگوں نے متاخرین شعرائے فارسی ناصر علی، جلال، اسیر، کلیم اور بیدل کے رنگ میں کہنا شروع کیا۔ لیکن خوش مذاق شعراء نے طالب آملی اور نشاطی وغیرہ کی روش اختیار کی۔ ان تصریحات کے علاوہ خود ان شعراء کے کلام کی اندرونی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے متاخرین شعراء فارسی کے کلام کو پیش نظر رکھ کر شاعری شروع

کی ہے۔ چنانچہ سودا، میر و درد وغیرہ نے اس دور کے متعدد شعرائے فارسی مثل صائب بیدل۔ نظیری۔ عرفی کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور ان کے عمدہ اشعار کا ترجمہ کیا اور اس دور کے شعراء کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور فارسی محاوروں کی ترجمہ کی جو بہتات ہے وہ اسی تقلید و تتبع کا اثر ہے۔ سودا نے علی الخصوص ایسی نئی نئی ترکیبیں اور محاورے زبان میں داخل کئے جو مستقل طور پر اسی کے ہو گئے۔ میر نے بھی خزانۂ فارسی سے زبان کو بہت کچھ مالامال کیا۔ البتہ میر حسن نے متاع موجودہ پر قناعت کی۔

الفاظ میں تذکیر و تانیث — الفاظ میں تذکیر و تانیث کی پابندی نہ تھی۔ مصنف کی خواہش اور خوشی کے موافق الفاظ مذکر اور مونث لکھے جاتے تھے۔ نئی بحریں جو اس سے پیشتر نہیں کہی گئی تھیں اب داخل شعر ہوئیں اتنے اصناف سخن بھی اسی زمانہ میں داخل ہوئے۔ مثلاً میر صاحب نے واسوخت مثلث، مربع کی ایجاد کی۔ فارسی میں البتہ واسوخت کی ابتدا، فغانی اور وحشی نے کی تھی۔ قصائد اور ہاجی کی تکمیل سودا کے ہاتھوں ہوئی اور قصائد تو یقیناً اسی وقت درجہ کمال کو پہنچ گئے تھے۔ مشکل مشکل بحریں اور قافیے۔ اور دوہرے قافیوں کا رواج ہوا تاکہ زبان پر قدرت ثابت ہو۔ زوائد اور بھرتی کے الفاظ جن کا رواج عہد سابق میں بہت تھا اب کم ہو گئے۔

شعراء دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آتے ہیں — افغانوں کے پیہم حملوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار کے خوف سے اکثر نامور شعرائے دہلی نے ترک وطن اختیار کیا۔ چنانچہ میر حسن، سودا، میر، سوز وغیرہ اس پر آشوب زمانہ میں اپنے وطن کو خیرباد کہہ کے لکھنؤ چلے آئے جو اس وقت شعرا و کملا کا ملجا و ماوا تھا۔ اور ہر فن کے اُستاد وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ صرف میر درد ہی ایک ایسے قانع اور وطن پرست بزرگ تھے جنہوں نے خاک وطن کی محبت نہ چھوڑی اور وہیں جمے رہے۔

کلام کی خصوصیت — اس عہد کے شعراء کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کلام میں پست

خیالات کے ساتھ بلند خیال اور سخیف الفاظ کے ساتھ شاندار اور فصیح الفاظ ملے جلے ہیں۔ غزلوں میں شتر گربگی و ناہمواری۔ میر تقی میر کی نسبت ایک قدیم تذکرہ نویس کا قول ہے کہ ان کے معمولی اشعار نہایت معمولی اور اعلیٰ اشعار نہایت اعلےٰ ہوتے ہیں۔ انگریزی یہی حالت ورڈسورتھ شاعر کی ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں یہی اعتراض مرزا سودا پر بھی وارد کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ ناہمواری کلام ایک معقول سزا ہے جو ان لوگوں کو ملتی ہے۔ جن کا کلام من قع بے موقع اور بکثرت ہوتا ہے۔ سودا اور میر سے زیادہ پرگو کون ہوگا پس ان کے تمام اشعار یکساں کیسے ہو سکتے ہیں۔ خواجہ میر درد چونکہ کم کہتے تھے یعنی اسی وقت کہتے تھے جب طبیعت ملہم ہوتی تھی اسی وجہ سے ان کا بیشتر کلام اس عیب سے پاک ہے۔

تذکرے متعدد تذکرے یعنی شعراء کے مختصر حالات اور ان کے کلام کا انتخاب بھی اسی عہد میں قلمبند کیا گیا۔ یہ کام بہت مفید ہوا۔ کیونکہ اس سے اس زمانہ کے حالات پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعراء" اور میر حسن کا تذکرہ "شعرائے اردو" اب چھپ گئے ہیں اور ہر جگہ ملتے ہیں۔ ان میں گو کہ حالات بہت مختصر لکھے ہیں مگر پھر بھی شعر اردو کے مورخ کے لیے بہت مفید چیز ہیں اور نہایت دلچسپ باتیں ان میں ملتی ہیں۔

خواجہ میر درد ۱۱۳۳ھ تا ۱۱۹۹ھ ہجری سید خواجہ میر[1] نام۔ درد تخلص۔ خواجہ ناصر عندلیب کے خلف الصدق تھے۔ ان کے پدر بزرگوار کا بھی ایک ضخیم دیوان

---

[1] دیکھیے فٹ نوٹ صفحہ [2] مقدمہ دیوان از محمد خلیل الرحمن داؤدی۔ طبع مجلس ترقی ادب لاہور

ولادت ۱۹ ذی قعدہ ۱۱۳۳ھ وفات ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ۔ مرتضیٰ

[2] خواجہ عندلیب کے حالات خلیل الرحمن صاحب نے مقدمہ دیوان میں مفید طور پر قلمبند کیے ہیں۔ فاضل۔

"قالۂ عندلیب" کے نام سے مشہور ہے۔ سلسلۂ نسب خواجہ بہاؤ الدین نقشبند سے ملتا ہے۔ اور ماں کی طرف سے حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ ان کے نانا میر سید محمد حسنی نواب میر احمد علی خاں کے صاحبزادہ تھے جن کی تعریف میں سودا نے قصیدہ لکھا ہے۔ اور جو جنگ پانی پت میں شہید ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب کے جدّ امجد بخارا سے ہندوستان آئے مگر ان کے والد خواجہ ناصر کی ولادت ہندوستان ہی میں ہوئی۔ خواجہ ناصر جب جوان ہوئے تو شاہی منصب دار مقرر ہوئے مگر تھوڑے دنوں میں تعلقات دنیاوی ترک کر کے گوشہ نشین اور حضرت شاہ خواجہ محمد زبیر کے مرید ہو گئے۔ اسی عرصہ میں مشہور صوفی شاہ گلشن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ خواجہ صاحب نے اپنے پدر بزرگوار کے علم و فضل اور کمالات ظاہری و باطنی کے حالات نہایت پُر اثر طریقہ سے بیان کیے ہیں۔ خواجہ صاحب کا سنہ ولادت ۱۱۳۳ھ ہے۔ انھوں نے اپنے والد ہی کی آغوش تربیت میں تحصیل علوم سے فراغت حاصل کی۔ قرآن۔ حدیث۔ تفسیر۔ فقہ اور تصوف میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ جوانی میں دنیاوی معاملات میں حصہ لیتے اور اپنی جاگیر کے کاموں کو بھی دیکھتے تھے۔ مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "سپاہی پیشہ تھے۔ مگر والد کے حکم سے نوکری چھوڑ کر فقر اختیار کیا۔ اٹھائیس ۲۸ برس کی عمر میں دنیا چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ اور جب باپ نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ تو اُنتالیس ۳۹ برس کے سن میں ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ خواجہ صاحب کا خاندانی اثر اور نواب ظفر خاں رئیس عہد جہانگیری سے ان کے انتساب اور سلسلۂ نقشبندیہ میں ان کا شیخ وقت ہونا۔ یہ سب باتیں ان کو مرجع خاص و عام بنائے ہوئے تھیں۔ پھر ان کے ذاتی تقدس اور مراتب عرفان و تصوف سے کماحقہٗ واقف ہونے کی وجہ سے لوگ ان کے دل سے گرویدہ تھے۔ غریب سے لے کر امیر اور بادشاہ سے لے کر فقیر تک ان کی بے انتہا عظمت کرتے اور

اُن کے ساتھ دلی عقیدت رکھتے تھے۔ معاصر تذکرہ نویس اُن کے اس خاص امتیاز اور ان کی بزرگی اور خدارسی کی شہادت نہایت زوردار الفاظ میں دیتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ وہ مجسم تہذیب و متانت اور پیکر آداب و اخلاق تھے جو اولیاء اللہ کا نشان امتیاز ہے۔ قناعت و توکل اور رضا و تسلیم ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ جب دہلی پر احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا اور اس کے بعد مرہٹوں کی لوٹ مار شروع ہوئی تو ہر شخص جو اپنی ناموس و آبرو کا تحفظ چاہتا تھا شہر چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ بڑے بڑے نامی شاعر دلی سے نکل کر لکھنؤ پہنچے مگر اس مرد خدا کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ وہ اللہ پر توکل کیے اپنے بزرگوں کے سجادہ پر بیٹھا رہا۔ اور اس کی قناعت و استقلال اور توکل علی اللہ میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ طبیعت میں آزادی، خودداری اور استغنا اس درجہ تھا کہ کسی کی مدح و ثنا سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ ایسی خوددار طبیعت بھلا خوشامد اور بھٹئی کیونکہ گوارا کر سکتی تھی۔ دنیاداروں کے سامنے زانوے ادب تہ نہ کرنا ان کو بے حد شاق تھا۔ استغنا کا یہ حال تھا کہ بادشاہ وقت تک سے ملنے میں عار تھا۔ ایک مرتبہ شاہ عالم ان کی بزم سماع میں چلے آئے جس کی شرکت کو وہ اپنا فخر جانتے تھے اتفاق سے پاؤں پھیلا دیے۔ خواجہ صاحب کو نہایت ناگوار ہوا۔ بادشاہ ان کے چشم و ابرو سے سمجھ گئے۔ فوراً عذر کیا کہ مجبور ہوں، پاؤں میں درد ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر تکلیف تھی تو تکلیف کیوں کی۔ حضرت کو موسیقی سے بڑا ذوق تھا۔ خود اس فن میں صاحب کمال تھے۔ بڑے بڑے کلاونت اور گویے حاضر خدمت ہوتے اور متاع کمال پیش کرتے۔ آپ کے دولت خانہ پر ہر مہینہ کی دوسری اور بیسویں کو محفل سماع منعقد ہوتی جس میں بڑے بڑے قوال اور ماہران فن جمع ہوتے اور اپنا کمال دکھلاتے۔ میاں فیروز جو اُس زمانہ کا مشہور قوال تھا اکثر حاضر خدمت ہوتا اور اپنے کمال سے حضرت کو محظوظ کرتا۔ مرحوم میں

مجالس منعقد ہوتیں جس میں سوز خوانی اور مرثیہ خوانی کے جوہر دکھائے جاتے۔ اسی طرح ارباب تصوف اور اصحاب سلوک کے بھی جلسے دولت کدہ پہ اکثر منعقد ہوتے جن کی شرکت کو بڑے بڑے رئیس و امیر اپنی سعادت و فخر سمجھتے۔

تصانیف خواجہ صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ کتب ذیل جو چھپ چکی ہیں اُن کی تصنیفات سے ہیں۔

(۱) رسالۂ اسرار الصلوٰۃ جو پندرہ برس کے سن میں بہ حالت اعتکاف لکھا۔

(۲) واردات درد اُنتیس برس کی عمر میں لکھی اور اس کی شرح میں (۳) علم الکتاب ایک بڑا نسخہ تحریر کیا۔ جس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں۔ (۴) نالۂ درد۔

(۵) آہِ سرد (۶) دردِ دل (۷) شمع محفل (۸) واقعات درد وغیرہ (۹) حرمت غنا۔

(۱۰) دیوان فارسی (۱۱) دیوان اُردو۔

رسالہ اسرار الصلوٰۃ اسم بامسمّیٰ ہے۔ اس میں نماز کی فضیلتوں اور پوشیدہ اسرار کا بیان ہے۔ رسالۂ واردات اُنتیس برس کی عمر میں ۱۱۷۲ھ[1] میں تصنیف فرمایا۔ اس میں مسائل تصوف نظم و نثر میں بیان کیے گئے ہیں۔ علم الکتاب اسی رسالۂ واردات کی شرح ہے جس کو اپنے عزیز بھائی اور شاگرد خواجہ میر اثرؔ کی فرمایش سے تصنیف کیا۔ اس میں مسائل تصوف کو زبردست دلائل کے ساتھ آیات قرآنی۔ احادیث نبوی اور اقوال سلف سے ثابت کیا ہے۔ اپنی زندگی کے بھی اکثر واقعات کا اس میں بیان ہے۔ نالۂ درد ۱۱۹۰ھ میں اور آہ سرد ۱۱۹۳ھ میں تصنیف ہوئیں۔ یہ رسالے بھی روحانیات اور مسائل تصوف پر ہیں۔ شمع محفل، اور صحیفۂ واردات یہ دونوں کبرسنی کی تصنیفات ہیں جبکہ آپ کی عمر باسٹھ برس کی تھی۔ حرمت غنا اور واقعات دردؔ میں بھی دقیق مسائل تصوف کا ذکر ہے۔ اول الذکر میں غنا کی حلت و حرمت سے

---

[1] تاریخ تالیف صحیح بیان عمر غلط ہے۔ فاضل

بحث کی ہے۔ دیوانِ فارسی، فارسی کلام کا ایک مختصر دیوان ہے جس میں غزلوں کے
علاوہ رباعیات اور مخمسات وغیرہ بھی ہیں۔ آخری چیز دیوان اُردو ہے جس کو اُردو
شاعری کے تاج کا سب سے بڑا ہیرا سمجھنا چاہیے۔ دیوان اُردو کے علاوہ جملہ تصانیف
مذکورۂ بالا فارسی میں ہیں۔ دیوان کا ایک نہایت صحیح اور عمدہ نسخہ مطبع نظامی نے
چھاپا ہے جس پر محترم نواب حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے نہایت قابلیت
سے ایک دیباچہ لکھا ہے۔ خواجہ صاحب کی زبان اور طرزِ ادا وہی ہے جو میرؔ کی ہے
عبارت صاف سلیس فصیح ہر شخص سمجھ میں آسانی سے آتی ہے۔ درد و اثر کوٹ
کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ تصوف کو ان سے بہتر کسی نے نہیں کہا۔ عرفان اور تصوف کے
پیچیدہ اور مشکل مضامین اس خوب صورتی اور صفائی سے بیان کیے ہیں کہ دل
وجد کرتا ہے۔ غزلیں زبان کی سادگی اور صفائی میں میر کے کلام کا مزا دیتی ہیں
اور تصوف کی چاشنی اور درد واثر کے اعتبار سے ان سے بڑھی ہوئی ہیں۔ مثل میر
صاحب کے خواجہ صاحب کی بھی وہ غزلیں جو چھوٹی بحروں میں ہیں اپنا جواب نہیں
رکھتیں۔ بقول مصنّف "آبِ حیات" "تلواروں کی آب داری نشتروں میں بھر دی ہے"
یا بقول امیر مینائی مرحوم "بسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں"۔ بیہودہ مذاق اور ہجو
سے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ کہیں کہیں پرانے الفاظ اور محاورے بھی استعمال
کر جاتے ہیں مگر اس خوب صورتی سے کہ ان سے شعر کی خوبی بڑھ جاتی ہے۔
عاشقانہ رنگ نہایت اعلیٰ اور بلند ہے۔ اس زمانہ کا عشق مجازی جس کو بوالہوسی
سے تعبیر کرتے تھے ان کے کلام میں نہیں پایا جاتا مثل خواجہ حافظ اور اساتذۂ
سلف کے ان کا معشوق بھی کوئی بازاری اور ہرجائی نہیں بلکہ اس سے معشوق حقیقی یا
مرشد مراد ہے۔ ایسے بزرگوں کی نظر میں شاعری کا پایہ نہایت بلند اور اس کا مقصد
نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔ وہ لوگ کسب مال وجاہ کی غرض سے شعر کہنا گناہ سمجھتے تھے۔

اسی وجہ سے ان کا کلام سوز و گداز اور تاثیر سے مملو ہوتا ہے۔ زبان اور ادب اُردو کے لحاظ سے خواجہ صاحب ایک نہایت نمایاں اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں بقول مصنف "آب حیات" چار رکنوں سے ایک رکن یہ ہیں باقی رکن میر۔ سودا اور مظہر ہیں حقیقت میں انہیں عناصر اربعہ کی ترکیب سے زبان کا قوام درست ہوا۔ قدیم ایہام گوئی اور ہندی دوہروں کی تقلید گئی۔ زبان صاف ہوئی اور منجی۔ اور بالآخر ترقی کی معراج تک پہنچ گئی۔ خواجہ صاحب کے کلام نے یہ اور اضافہ کیا کہ تصوف اور روحانیت کی چاشنی سے اس میں چار چاند لگا دیے۔ خواجہ صاحب کا یہ اثر ان کے معاصرین اور بعد کے آنے والوں پر بھی بہت تھا۔ ان کے معاصر شعراء ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ خدائے سخن میر تقی میر اپنے تذکرہ میں کس رنگینی اور جوش کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "جوش بہار گلستانِ سخن۔ عندلیب خوش خوان چمن این فن زبان گفتگویش گرہ کشائے زلف شام مدعا مصرعہ نوشتہ اش بر صفحہ، کاغذ از کاکل صبح خوش نما . . . . . خلیق۔ متواضع آشنائے درست شعر فارسی هم میگوید اما بیشتر رباعی گرمی بازار وسعت مشرب اوست غرض از آشنائی مطلب اوست متوطن شاہجہان آباد بزرگ و بزرگ زادہ جوان صالح از درویشی بہرہ وانی دارد فقیر را بخت او بندگی خاص است۔ اگرچہ حُسن سلوک عام سر حُسن سلوک بپائے خود گرفتہ اعتراز را از گوشہ دل نہادہ خلف الصدق حضرت خواجہ ناصر صاحب سلمہ اللہ تعالٰے است کہ مقتدائے عالم است۔ ایامی کہ فقیر بخدمت آں بزرگوار شرف اندوزمی شد۔ از زبان مبارکش میفرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد۔ مجلس ریختہ کہ بخانہ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر ست واللہ بذات ہمیں بزرگ است۔ زیرا کہ پیش ازیں مجلس بخانہ اش مقرر بود۔ از گردش روز ہمیدار بر ہم خورد از بسکہ باایں احقر اخلاص دلی داشت گفت کہ ایں مجمع راشما اگر بخانہ خود معین

بکنید بہتر ست۔ نظر بر اخلاص آن مشفق عمل کردہ آمد۔ خدایش ابدالآباد سلامت دارد"۔ میر صاحب خواجہ صاحب کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتے ہیں کہ لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ ان کے شاگرد تھے۔ چنانچہ فرنچ مستشرق اور زبان اُردو کے دلدادہ گارسن ڈیتاسی کو بھی یہی دھوکا ہوا۔ کہ وہ میر کو درد کا شاگرد بتاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب ان کے تقدس اور کمال عرفان اور نیز اُن کی ذاتی قابلیت کے دل سے قائل تھے اور یہی حال میر حسن کا بھی ہے۔ وہ بھی اُن کی بزرگی کے قائل اور ان کے کلام کے معترف اور دلدادہ تھے۔ کلام کی نسبت لکھتے ہیں کہ "اگرچہ مختصر مگر مثل کلام حافظ شیرازی انتخاب ہے"۔ ہماری رائے میں میر انیس کے کلام میں جو سادگی اور اثر پایا جاتا ہے وہ بالواسطہ میر حسن خواجہ صاحب کے کلام کا ایک نمایاں اثر ہے۔

شاگرد خواجہ صاحب کے بہت سے شاگرد تھے۔ جن میں قائم۔ ہدایت۔ فراق اور اثر مشہور ہیں علی الخصوص قائم اور اثر اعلیٰ درجہ کے شاعر اور صاحب دیوان ہیں خواجہ صاحب کے صاحبزادہ کا نام صاحب[1] میر اور الم تخلص تھا۔ سنہ وفات اور عمر کے متعلق اختلاف ہے۔ بیل صاحب لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۱۹۹ھ مطابق سنہ ۱۷۶۸ء میں وفات پائی۔ مرزا علی لطف سنہ ۱۲۰۲ھ اور مصحفی سنہ ۱۲۰۹ھ لکھتے ہیں جو سنہ ۱۷۶۳-۹۴ء کے مطابق ہے۔ یہی وہ سن ہے جس میں مصحفی نے اپنا تذکرہ لکھا تھا۔ گارسن ڈیتاسی اور لائل صاحب مصحفی کی پیروی کرتے ہیں۔ مصنف آب حیات لکھتے ہیں سنہ ۱۱۹۹ھ میں بمقام دہلی چھیاسٹھ ۶۶ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ علامہ شروانی نے اپنے مقدمہ میں ایک معاصر شاعر بیدار کی تاریخ لکھی ہے ع حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب

---

[1] خلیل الرحمن کہتے ہیں کہ "صرف ایک صاحبزادے تھے جن کا اسم گرامی خواجہ ضیاء الناصر تھا اور الم تخلص۔ نیز دو لڑکیاں بھی تھیں۔ فاضل

جس سے سن وفات ۱۱۹۹ھ اور عمر اڑسٹھ کی نکلتی ہے۔ خود خواجہ صاحب شمع محفل میں فرماتے ہیں کہ کشف کے طور پر مجھ کو معلوم ہوا کہ میری عمر چھاسٹھ کی ہوگی۔ سب کا خلاصہ یہ ہے اور صحیح بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عمر چھاسٹھ سال اور سنہ وفات ۱۱۹۹ھ ہے۔

درد کی شخصیت اور شاعری میں ایک خاص شخصیت ہے۔ اپنے معاصرین پر اور نیز بعد کی نسلوں پر ان کی شاعری کا ایک گہرا اثر پڑا۔ تصوف کے رنگ میں وہ بے نظیر اور بے مثال ہیں۔

میر سوز
۱۱۳۳ھ تا ۱۲۱۳ھ

سید محمد میر نام۔ میر ضیاء الدین کے صاحبزادہ، شاہ قطب عالم گجراتی کی اولاد میں تھے۔ آباو اجداد بخارا کے رہنے والے تھے مگر خود میر سوز کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ تیر اندازی اور شہسواری میں مشاق تھے۔ شہ زور اور ورزش کے بڑے شائق تھے۔ فنون سپہ گری کے علاوہ خوش نویسی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ نسخ نستعلیق۔ شفیعا وغیرہ تمام خطوط مروجہ خوب لکھتے تھے۔ جوانی میں رنگین طبع اور عاشق مزاج تھے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں جب دلی پر تباہی آئی اور لوگ بے حال تھے تو یہ دولت فقر سے مالا مال صوفی باکمال تھے۔ وطن کی تباہی و بربادی سے افسردہ خاطر ہو کر نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے فرخ آباد گئے جہاں نواب مہربان خاں رند دیوان، نواب احمد خاں غالب جنگ کی چند دن ملازمت و رفاقت کی۔ اس کے بعد لکھنؤ آئے۔ یہ نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ نواب بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ مگر ان کا جی نہ لگا۔ چند دن ٹھہر کر مرشد آباد کا رُخ کیا۔ جہاں نوابان بنگالہ کا دور دورہ تھا۔ وہاں سے بھی جی گھبرایا تو آخر کار اُسی سال پھر لکھنؤ واپس آئے اور اب کی مرتبہ آصف الدولہ اُن کے شاگرد ہوئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُستاد نے انتقال کیا۔ بیلؔ صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۲۱۲ھ میں بعمر ۸۰ سال

۱؎ دیکھیے حواشی دستور الفصاحت طبع رام پور۔ فاضل

رحلت کی۔ مگر لطف سنہ وفات ۱۲۱۳ھ بتاتے ہیں۔ اور مصحفی بوقت وفات ستر برس کا سن لکھتے ہیں۔ نساخ اپنے تذکرہ سخن شعرا میں عمر اسّی سال اور مقام وفات لکھنؤ بتلاتے ہیں۔ فیروز تذکرۃ الشعرا میں ۱۲۱۳ھ وفات اور عمر ۷۰ سال لکھتے ہیں ہمارے خیال میں عمر ۸۰ سال اور ۱۲۱۳ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ میر سوز نہایت خوش طبع ظریف۔ شیریں زبان خلیق۔ ملنسار اور بڑے پابند وضع تھے۔

طرزِ کلام کلام میں ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے جس میں غزلوں کے علاوہ مثنوی، رباعیاں اور مخمس بھی ہیں۔ انداز کلام نہایت صاف سادہ اور بے تکلّف۔ زبان میٹھی غزل کے واسطے نہایت موزوں ہے۔ لطف زبان۔ صفائی محاورہ اور بے ساختہ پن میں ان کا کلام اپنا آپ نظیر ہے۔ تکلف و آورد فضول مبالغے تشبیہات اور استعاروں سے پاک و صاف۔ لفظی صنائع بدائع بھی بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ان کا شاہد کلام حسن طبعی سے آراستہ کسی مصنوعی زیب و زینت کا محتاج نہیں۔ سادگی اور صفائی میں میر تقی میر البتہ ان کے مقابل ہیں مگر سودا بہت پیچھے ہیں۔ مگر میر صاحب کے یہاں لطف زبان کے ساتھ جو لطف مضامین اور جذبات کا ہے وہ سوز کے یہاں بہت کم ہے۔ ان کے کلام میں میر اور سودا کی طرح فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی بھی کثرت نہیں۔ سیدھے سادے ہندی لفظ بے ساختگی سے باندھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کر رہے ہیں۔ شعر کو اتنا ہلکا پھلکا کر دیتے ہیں کہ اکثر اس پر ردیف کا بھی بوجھ نہیں ڈالتے۔ اس سادگی کی وجہ سے ایک دور پہلے کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ زبان کی اصلاح یا توسیع کی کوئی خدمت ان سے انجام نہ ہو سکی بلکہ سچ پوچھو تو غزل کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ ان کے اشعار کی سادگی اور بے تکلفی معلوم ہوتا ہے کہ جو طرز ریختی کے نام سے بعد کو سعادت یار خاں رنگین نے ایجاد کیا۔ اس کی ابتدا، سوز ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی۔ شعر پڑھنے کا طریقہ بھی ان کا سب

سے علیحدہ تھا۔ ترنّم اور خاص درد واثر کے ساتھ شعر پڑھتے۔ اور اظہار مطلب میں آنکھ، ناک، ہاتھ، گردن غرض ہر عضو سے کام لیتے اور خود مضمون کی صورت بن جاتے آب حیات میں لکھا ہے کہ جب یہ قطعہ پڑھا ؎

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے　　سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل پری رو　　ارے رے رے ارے رے رے ارے رے

تو جو تھا مصرعہ پڑھتے پڑھتے زمین پر گر پڑے۔ گویا پری زادوں کو دیکھ کر دل بے قابو ہو گیا۔ میر حسن، اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "درعہد خود ازجملہ ادا داران ممتاز طرز ادائیہ ملک اوست و خواندن اشعارش از زبان او نیکو از خواندنش چناں خوب می نماید کہ درگفتن نمی آید" مرزا علی لطف لکھتے ہیں کہ عاشقانہ رنگ کے بادشاہ میر سوز کا کلام سوز وگداز میں ڈوبا ہوا ہے۔

نام کی مناسبت سے پہلے میر تخلص کرتے تھے پھر سوز اختیار کیا۔ چنانچہ اس شعر میں دونوں تخلصوں کی طرف اشارہ ہے ؎

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ ہوئے ہزار حیف　　اب جو کہیں ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

میر تقی میر اسی اشتراک تخلص کی وجہ سے ان سے کچھ ناراض سے ہیں فرماتے ہیں "ہرچند طرز علیحدہ وارد لیکن از خوش کردن تخلص من نصف دلم از و خوش است۔"

سوز کا مرتبہ شاعری میں　سوز کا مرتبہ اردو شاعری میں بہت بلند ہے گو وہ میر و سودا کے مقابل نہیں سمجھے جا سکتے مگر پھر بھی غزل گوئی کے استاد اور صفائی کلام، محاورہ بندی اور سوز و گداز کے بادشاہ تھے، کلام نہایت صاف، سلیس، پُر اثر تکلف اور بناوٹ سے بالکل خالی ہوتا ہے۔

سودا ۱۱۲۵ھ تا ۱۱۹۵ھ
۱۷۱۳ء تا ۱۷۸۱ء
مرزا محمد رفیع متخلص بہ سودا، اقلیم سخنوری کے شہنشاہ۔ اردو کے خاقانی و انوری۔ سپہر شاعری کے درخشندہ تارے بلکہ

آفتاب۔ اور بقول اپنے حریف اور معاصر خدائے سخن میر کے ریختہ گویوں کے انتخاب تھے۔

ان کے آباد اجداد معزز خاندان کے لوگ کابل کے باشندے تھے۔ مرزا صاحب کے والد مرزا محمد شفیع ایک تجارت پیشہ بزرگ تھے جو کابل سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام کیا۔ خاکِ دہلی ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ سرآمد شعرائے ہندوستان مرزا رفیع السودا وہاں پیدا ہوئے۔ آزاد تذکرۂ آبِ حیات میں تاریخ ولادت ۱۱۲۵ھ لکھتے ہیں۔ مگر یقین کے ساتھ اس کی صحت کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اس وجہ سے کہ نہ تو معاصرین نے لکھا ہے اور نہ مابعد کے تذکروں میں مرزا صاحب کی عمر یا سنہ ولادت کی تصریح ہے تخلّص کے انتخاب کی وجہ بھی آبِ حیات میں دلچسپ لکھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ تخلّص سوؔدا اس واسطے رکھا گیا کہ سوؔدا یا جنون تمغائے عشق ہے جس پر پریشانئ شاعری کا دارمدار ہے یا پھر باپ کی سوداگری کی رعایت سے رکھا گیا۔ کہ اس کے جزوِ اوّل میں لفظ سودا داخل ہے۔" اور آخر میں یہ خوب فرمایا کہ سوداگری کی بدولت ایہام کی صنعت گھاتے میں آئی۔

مرزا صاحب کی پرورش اور تعلیم دہلی میں ہوئی۔ پہلے سلیمان قلی خاں وداد کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ شاہ صاحب نے جو فہرست اپنے شاگردوں کی اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھی ہے اس سے مرؔزا کی استادی پر فخر و مباہات ثابت ہوتا ہے۔ لائق شاگرد کا نام نہایت محبت اور عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔

مرؔزا کو خان آرزو کے ساتھ شرف تلمذ نہ تھا۔ مگر ان کی صحبت بہت فیضیاب ہوتے اور شعر گوئی میں بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ انہیں کی ہدایت کے موافق فارسی کو ترک کیا اور ریختہ کہنا شروع کیا۔ مگر فارسی کا شوق ان میں اس قدر سرایت کیے ہوئے تھا کہ اُس سے بالکل علیحدگی محال تھی۔ کچھ نہ کچھ ضرور کہتے تھے چنانچہ ان

کا مکمل دیوان، فارسی دیوان ریختہ کے شروع میں موجود ہے۔ مرزا کا کلام اس قدر مقبول اور ہر دلعزیز ہوا کہ گھر گھر اور کوچہ و بازار تک میں پھیل گیا۔ مرزا کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں مشہور ہو گیا تھا، اور وہ مسلّم الثبوت شاعر اسی وقت مانے جاتے تھے۔ ان کی استادی کا چرچا اس قدر پھیلا کہ بادشاہِ وقت شاہ عالم کو بھی ان کی شاگردی کا شوق ہوا اور وہ اردو اور فارسی خوب کہتے تھے اور آفتاب تخلّص کرتے تھے۔ آخر کار مرزا کے شاگرد ہوئے اور اپنا کلام اصلاح کے لیے دکھانے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد مرزا کو اُن سے کسی خاص بات پر رنجش ہو گئی اور دربار آنا جانا چھوڑ دیا۔ مگر دلی میں بہت سے ایسے قدر دان رئیس و امیر موجود تھے۔ جنہوں نے استادِ زمانہ کی دلجوئی اور خدمت کو اپنا فخر سمجھا اور اُن کے ساتھ بڑی مہربانی اور عالی حوصلگی سے پیش آتے تھے۔ ایسے قدر شناسوں کی دریا دلی اور قدر دانی نے مرزا کو ایسا مستغنی اور فارغ البال کر دیا تھا کہ نواب شجاع الدولہ نے مرزا کے کمال کا شہرہ سُن کر اُن کو نہایت شفقت و محبت سے بلاوے کا خط لکھا اور زادِ راہ بھی بھیجا تو مرزا نے ٹال دیا اور کمالِ استغنا سے یہ رباعی جواب میں لکھ بھیجی ؎

سودائے پئے دنیا تو بہر سو کب تک ... آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے ... بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

تھوڑے دنوں کے بعد زمانہ نے پلٹا کھایا۔ دلّی کی حالت بدل گئی۔ وہ پُرانا وقت نہ رہا۔ پُرانے قدر دان یکے بعد دیگرے مرتے گئے۔ پُرانے شرفا کے گھرانے آئے دن کے بیرونی حملوں اور مرہٹوں کے قتل و غارت سے برخاستہ خاطر اور پریشان ہو گئے۔ اسی کے ساتھ لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو بھی خطرہ میں تھی اور وہ قدر دان اور فن کے جوہری بھی باقی نہیں رہے تھے اس وجہ سے شعرائے باکمال

نے دلّی کو خیر باد کہا۔ مرزا بھی اسی نازک وقت میں اس تباہ قافلے کے ساتھ دہلی سے نکلے۔ اس وقت اُن کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی تھی، فرخ آباد پہنچے۔ نواب احمد خاں بنگش غالب جنگ بر سر حکومت تھے۔ مہربان خاں رندؔ ان کے دیوان تھے جو اہلِ علم و کمال کے قدر دان خود بھی شاعر تھے۔ اور بقول میر حسنؔ میر سوزؔ و مرزا سوداؔ سے تلمذ تھا۔ چند سال تک مرزا فرخ آباد رہے۔ انہوں نے مہربان خاں کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں۔ ۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں مر گئے تو سوداؔ بھی فیض آباد چلے گئے۔ اور نواب شجاع الدولہ کے زمرۂ ملازمین میں داخل ہو گئے۔ جب سلطنت کا مرکز لکھنؤ قرار پایا تو سوداؔ بھی لکھنؤ آ گئے۔

تھوڑے دنوں کے بعد نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا اور نواب آصف الدولہ سریر آرائے سلطنت ہوئے تو اس زمانہ میں مرزا سے اور ایک فارسی شاعر فاخر مکیںؔ سے شعر و شاعری کے معاملہ میں کچھ نزاع ہو گئی جس نے طول پکڑ کر ایک سخت جھگڑے اور باہمی جنگ کی صورت اختیار کی۔ اس کا تصفیہ نواب سعادت علی خاں نے جو اس وقت ولی عہدِ سلطنت تھے، نواب کے رُوبرو مرزا کی موافقت میں کرا دیا۔ سابق کی شکر رنجی جاتی رہی۔ بخطاب ملک الشعرائی اور چھ ہزار سالانہ کا وظیفہ عطا ہوا۔ پھر تو نواب آصف الدولہ مرزا پر نہایت شفقت اور عنایت کی نظر فرمانے لگے اور اتنا ارتباط بڑھ گیا کہ اکثر اوقات مرزا کی پُر لطف صحبت اور ان کی بذلہ سنجیوں کو جبلہ کاموں پر یہاں تک کہ بسا اوقات محل کے عیش و آرام پر ترجیح دیتے تھے۔ مرزا کا انتقال لکھنؤ میں ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں ہوا۔ بہت سے معاصرین اور نیز مابعد کے شاعروں نے وفات کی تاریخیں کہی ہیں مصحفیؔ۔ منتؔ، ناسخؔ، نساخؔ کی تاریخیں مشہور ہیں۔

---

(۱) ایک تاریخ یہ ہے۔ "سن نے خلد کو جب حضرت سوداؔ گئے ۔ فکر میں تاریخ کی ماہر تو بولے منصف ۔ دور کر پائے عناد: شاعران ہند کا سردار گیا۔"

تصانیف مرزا کی تصانیف جمیع اقسام سخن میں بکثرت حسب ذیل ہیں :۔

(۱) ایک مختصر دیوان فارسی جس میں ردیف وار غزلیں ہیں۔

(۲) چند فارسی قصائد۔

(۳) دیوان اُردو مکمل جس میں علاوہ غزلوں کے رباعیات، قطعے، تاریخیں، مخمس، ترجیع بند، واسوخت، مستزاد، تضمین، غرض ہر قسم کا کلام ہے۔

(۴) چوبیس مثنویاں یعنی مختلف منظوم حکایتیں اور لطائف جن میں ان کی دلچسپ اور مشہور ہجویں اور پہیلیاں ہیں۔

(۵) تضمین بر کلام میر۔ اور دو خط بنام میر ایک نظم اور ایک نثر میں (اُن کے کلیات میں نہیں ہیں)۔

(۶) قصائد امرائے دہلی و لکھنؤ وغیرہ اور نواب آصف الدولہ کی تعریف میں۔

(۷) سلام اور مرثیے حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان میں۔

(۸) قصائد ائمہ معصومین علیہم السلام کی منقبت میں۔

(۹) ایک رسالہ نثر میں موسوم بعبرۃ الغافلین۔ مرزا فاخر مکین کے اعتراضوں کا جواب ہے جو انہوں نے فارسی کے شعرائے سلف پر کیے تھے۔

(۱۰) میر تقی میر کی مشہور مثنوی شعلۂ عشق کا ترجمہ نثر میں (اُن کے کلیات میں نہیں ہے)

(۱۱) ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا۔ جو اب نہیں ملتا۔

سودا کا مرتبہ شاعری میں سودا اپنے زمانے کے بہت بڑے استاد مانے گئے ہیں اس میں شک نہیں کہ میر اور سودا دونوں زبان اُردو کے سب سے بڑے شاعر گزرے ہیں۔ اپنے زمانہ میں بھی بے نظیر اور بے عدیل تھے اور اُن کے بعد بھی ان کا ایسا کوئی نہیں ہوا۔ ان کی خدمات زبان اور شاعری اور فن نظم کے

ساتھ بہت قابل قدر ہیں۔ ان کی اصلاح زبان کا اثر بہت گہرا اور دیرپا ہے۔

ان کی خدمات زبان کے ساتھ مرزا نے اکثر ہندی الفاظ کی درشتی کو دُور کر کے فارسی کی آمیزش سے زبان میں شیرینی اور حلاوت پیدا کی۔ میر اور سودا ہی نے زبان کو ادبی زبان بنایا۔ اس کو ریختہ کا مرتبہ بخشا چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

کہے تھا ریختہ کہنے کو عیب ناداں بھی | سو یوں کہا میں کہ دانا ہنر لگا کہنے
بسانِ مہر یہ روشن ہے سارے عالم پہ | جہاں میں جیسے کہ میں شعرِ تر لگا کہنے

ولہ

سخن کو ریختے کے پوچھے تھا کوئی سودا | پسند خاطر دلہا ہوا یہ فن مجھ سے
کب اس کو گوش کرے تھا جہاں میں اہلِ کمال | یہ سنگریزہ ہوا ہے درِ عدن مجھ سے

شاعری کی صناعیوں سے اس میں طرح طرح کی لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں۔ فارسی سے بکثرت الفاظ و محاورات، استعارے اور تشبیہیں، طرزِ تخیل اور تلمیحات زبان اردو میں داخل کیے اور اس اُستادی سے داخل کیے کہ اس کے جزو ہو گئے۔ اور اس کی وسعت اور لوچداری اتنی بڑھ گئی کہ وہ اس قابل ہو گئی کہ ہر ادبی کام اس سے لیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نئی نئی ترکیبیں اور محاورے فارسی کی روش پر ایجاد کیے۔ جس میں سے بعض تو مقبول ہوئے اور بعض کو آئندہ نسلوں نے ناپسند اور متروک کیا۔ کیا اچھا ہوتا اور ہماری زبان کی کتنی خوش نصیبی ہوتی اگر ان خدایانِ سخن کو وہی توجہ فارسی کے ساتھ تھی بھاشا کے ساتھ بھی رہی ہوتی جس کا نتیجہ لازمی یہ ہوتا کہ دیسی زبان کے لفظ بجائے اجنبی کے کثرت سے داخل ہوئے ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا کی قوت ایجاد و انتخاب اور قابلیت اس اعلیٰ درجہ کی تھی کہ جو چیزیں داخل کیں ان پر طغرائے قبول فوراً ثبت ہو گیا۔ اور اب وہ ہماری زبان کا جزو لاینفک بن گئیں۔

یہ بات بھی قابلِ داد ہے کہ فارسی روایات اور تلمیحات کے ساتھ ہندوستان کی قدیم روایات و الفاظ بھی بھلائے نہیں گئے۔ مثلاً الفاظ بھبل۔ پربت۔ رائی وغیرہ اور ہندی علم الاصنام میں ارجن کی بہادری۔ کنھیّا کا عشق وغیرہ جوان کے کلام میں بڑا لطف دیتے ہیں۔ یہ سب اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ کم سے کم اس زمانہ میں مادرِ وطن کے ساتھ تعلقات کو پختہ کرنے کا خیال ہمارے شعرائے اُردو کے دل میں بہت کچھ تھا جو افسوس ہے کہ متاخرین نے حقارت کے ساتھ دل سے فراموش کر دیا۔ مرزا کو اکثر مناسب ہندی الفاظ بھی ہندی خیالات کے اظہار کے لئے اختراع کرنا پڑے اور اس کوشش میں ان کو اپنے معاصرین سے سخت مخالفتیں اور دقتیں اٹھانا پڑیں۔ مرزا کے عہد میں قدیم ایہام گوئی اور دوہروں کا رواج جو متقدمین کی یادگاریں سے کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بالکل متروک ہو گیا تھا۔ چنانچہ سودؔا خود فرماتے ہیں ؎

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
مُنکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

اور ان کے ہمعصر میرؔ کہتے ہیں

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

مگر فارسی اور ہندی الفاظ کو ملانے کی دِقّت رفع نہیں ہوئی تھی۔ اور آخری منازل ترقی اُردو شاعری کے واسطے ہنوز باقی تھے۔ مرزا کے کلام کو اس نقطۂ نظر سے

محبت کے کرنے میں بھبل کی ہیں تعریف کیا یارو
نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اس کو نہ دیکھا ہو
ترکش الینڈ سینہ عالم کا چھان مارا
مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا

ستم پربت ہو تو اس کو اُٹھا لیتا ہے جوں رائی
کنھیّا سے نہیں کچھ کم صنم میرا ہے ہرجائی

جانچنا بہت ضروری بات ہے۔ جو خدمات زبان کے ساتھ انہوں نے انجام دیں اور جو قوت زبان پر انہیں حاصل تھی اس کا اعتراف ان کے معاصرین مثلاً میر و میر حسن، مصحفی وغیرہ نے بخوبی کیا ہے اور ان کی قابلیت و کمال کی دل سے داد دی ہے۔

ان کی خدمات شاعری کے ساتھ

جو بنیادیں ولی اور شاہ حاتم نے قائم کی تھیں اُنہیں پر سودا نے اپنا رفیع اور شاندار ایوان شاعری تیار کیا۔ علاوہ کمال فن کے وہ دو چیزوں کے مُوجد بھی تھے۔ یعنی قصیدہ اور ہجو۔ ہر چند کہ یہ دونوں صنعتیں فارسی میں نہایت مکمل اور باقاعدہ صورت میں اور اُردو میں بھی ایک ابتدائی اور ناکمل حالت میں موجود تھیں۔ مگر انہوں نے یہ کمال کیا کہ اُن کو اُردو میں درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ اور ایسا کر دیا کہ اُن کی برابری اور ہمسری کا خیال تک بعد کے شاعروں کے لئے محال ہو گیا ہر چند کہ اکثر شعرا نے اُن کی پیروی کی اور ان کے قدم بقدم چلنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکے اور مرزا دونوں اصناف سخن میں منفرد ہی رہے۔

قصیدہ و مرثیہ

اُن کے اُردو قصائد بڑے بڑے فارسی استادوں کے قصائد کے ٹکر کے ہیں اور بعض تو عُرفی و خاقانی کے معرکۃ الآرا قصیدوں کو بھلا دیتے ہیں۔ نزاکتِ خیال اور طرفگی مضامین میں وہ اکثر اہلِ عجم سے گوے سبقت لے گئے ہیں۔ یہی حالت ان کے مراثی کی بھی سمجھنی چاہیے۔ مرزا سے پہلے گو مرثیہ گو اُردو میں بہت گزرے ہیں مگر اُن کے کلام میں سوائے مذہبیت کے کوئی شاعرانہ رنگ، کوئی جدت اسلوب، کوئی نئی بات نہ تھی جو زمانۂ موجودہ کے ترقی یافتہ مذاق کو بھلی معلوم ہو۔ مرزا ہی وہ صاحبِ ایجاد ہیں جنہوں نے اس فن خاص میں بھی اپنے زمانہ کے اعتبار سے کمال حاصل کر لیا۔ بلکہ سچ پوچھو تو آپ نے آنے والوں کے واسطے ترقی کی راہیں کھول گئے۔

ہجو مرزا صاحب نے ہجوؤں کے دفتر لکھ کر رکھ دیے ہیں۔ ان لوگوں پر تو ضرور افسوس ہوتا ہے جن کے دلوں پر یہ آرے چلے ہوں گے مگر ہمارے واسطے وہ ایک زعفران زار چھوڑ گئے ہیں جو ابد الآباد تک سرسبز و شاداب رہے گا۔ اُن کے اہاجی میں گرمیٔ کلام اور تیزی ہے جس سے وہ ظرافت و مذاق کا ایک دائمی ذخیرہ بن گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس صنف سے ان کو خلقی مناسبت بلکہ قدرتی خصوصیت تھی جیسا کہ اُن کے خود ایک شاگرد نے اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

کی ہجو ہر اک شخص کی ہر چند کہ اُس نے — پر اس سے طرف اس کے نہ عائد ہوئی تقصیر
ہے ایک سبب یہ کہ وہ خود آپ مغل تھا — اور جتنے بزرگ اُس کے تھے مغلوں کے تھے وہ پیر

بڑھاپے میں بھی ان کی زندہ دلی اور مزاج کی شگفتگی ایسی تھی کہ جو بات دل میں آجاتی تھی اس کے اظہار سے کبھی نہ چوکتے تھے۔ کسی انعام کا لالچ یا انتقام کا خوف اُن کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے سے روک نہ سکتا تھا۔ جہاں کسی سے اَن بن ہوئی فوراً ان کا غلام، غنچہ، قلمدان و کاغذ کا سامان گل تراشی لیے ہر وقت موجود تھا۔ اور پھر وہ وہ گل بوٹے تراشتے جاتے تھے کہ جن کو دیکھ کر لوگ اپنی آنکھیں اور سُن کر اپنے کان بند کر لیتے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں سے اس مبتذل صنف کو بھی ایک باقاعدہ اور مکمل فن بنا دیا۔ وہ زمانہ کی خرابی اور گمراہیوں کی پردہ دری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے ایک انگریز نقاد کا قول ہے کہ "جس طرح رومۃ الکبریٰ کے زوال کی تصویروں کے واسطے ہم جووینال ایسے مرقع نگاروں کی صفحہ گردانی کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم کو اگر زوال دولت مغلیہ کی سچی تصویریں دیکھنا ہیں تو ہم کو چاہیے کہ سودا کی اُن پُر آشوب نظموں کا مطالعہ کریں جس میں انہوں نے مرہٹہ سواروں کی عین قلعہ دہلی کی دیواروں کے نیچے قتل و غارت گری کا سچا فوٹو اُتارا ہے یا جس میں زمانہ کی پُر آشوب حالت اور اُمرائے

۱؎ دیکھیے فٹ نوٹ صفحہ (۱۶۰)

دہلی کی تباہی و بربادی اور کس مپرسی کا بیان نہایت پُر زور اور دردناک طریقے سے کیا ہے۔ یا مثلاً وہ نظم جو ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہان آباد کے نام سے مشہور ہے جس میں چوری کی کثرت شہر کی بدامنی اور کوتوال شہر کی کمزوری کس پُر مذاق اور مؤثر طریقے سے بیان کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ مرزا سے پہلے بھی بعضوں نے ہجویں کہی ہیں مگر بہت کم اور بے قاعدہ۔ مرزا کے یہاں وہ ایک صنف کلام اور مقابلہ کا ایک زبردست ہتھیار بن گئی۔ میر حسن کے پدر بزرگوار میر ضاحک، فدوی پنجابی، مرزا فاخر مکین، بقا اور ان کے علاوہ اور لوگ بھی باری باری سب مرزا کی زد میں آ گئے اور ان بے چاروں نے حرکت مذبوحی میں کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے اور اپنی بساط کے موافق کہا مگر اُن کا کہا کسی نے نہ سنا۔ مرزا کا کہا بچّے بچّے کی زبان پر ہے۔ کثرت ہجو گوئی سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا کو اس چیز سے خاص اُنس تھا۔ اور اس میں اُن کو بڑا مزا آتا تھا۔ ان کی ہجویں کچھ معمولی نظمیں نہیں ہیں بلکہ اُن سے ان کی قوت بیان، قدرت زبان اور معاملات دنیاوی میں ان کی وسیع معلومات کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ وہ جب کسی کی ہجو لکھتے ہیں تو اس چیز کی جزئیات کو کبھی نظرانداز نہیں کرتے اور حیرت ہوتی ہے کہ وہ دو متضاد چیزیں درد واثر اور تمسخر و مذاق کو یکجا کر دیتے ہیں۔ اور سننے والے پر غضب کا اثر پڑتا ہے۔ جس چیز کا خاکہ اُڑاتے ہیں اس میں فارسی وغیرہ کی تقلید نہیں ہوتی۔ مضمون اچھوتے اور

لہ "جوینس جوو نیالیس" روما کا مشہور ہجو نگار شاعر تھا۔ سنہ پیدائش تقریباً ۶۰ عیسوی اور وفات ۱۲۸ عیسوی۔ ایک امیر آدمی کا لڑکا فن شعر اور انشاد میں کمال رکھتا تھا۔ اس کی سولہ کتابیں مختلف مضامین پر موجود ہیں۔ جن میں ہجو کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ زمانہ کی سوسائٹی کی بداخلاقی اور خرابی پر شہر آشوب کی صورت پر جو مضمون لکھے ہیں وہ نہایت سخت اور زوردار زبان میں ہیں جس کے بعض جملے ضرب المثل ہو گئے ہیں۔

پھڑکا دینے والے ہوتے ہیں۔ مرزا میں جو دنیال، والٹیئر اور سویفٹ تینوں کا مزا ہے ایڈیسن کی متانت اُن میں مطلق نہیں۔ ان کی ہجو میں پھکڑ پن کے ساتھ طعن و تشنیع بھی بہت ہے۔ ان کے الفاظ میں دل لگی اور مذاق کی تہ میں ایسی کاٹ اور بُرش ہے جو دل کے اندر اُتر جاتی ہے۔ آزاد نے سچ کہا ہے کہ جس کے پیچھے

۱؎ پورا نام " فرانسوے ماری والٹیر" فرانس کا مشہور شاعر ڈراما نویس اور ناقد گزرا ہے۔ ۱۶۹۴ء سن ولادت اور ۱۷۷۸ء سن وفات۔ فن شعر اور تنقید میں یکتائے زمانہ تھا مرزا غالب کی طرح اس کے بھی خطوط نہایت دلچسپ اور انشاء پردازی کے بہترین نمونے ہیں اس کے کلام میں ذہانت وطباعی اور انتہا درجہ کی طعن آمیز شوخی اور ظرافت پائی جاتی ہے۔ نہایت آزاد خیال واقع ہوا تھا۔ مذہب کے ساتھ اُس کی بے پروائی شوخی اور طعن آمیز جملے مشہور ہیں۔ اس کا ڈراما موسوم بہ "محمد" ایک مشہور کتاب ہے۔

۲؎ "جانتھن سویفٹ" والٹیر کا معاصر ہے۔ مشہور انشاء نویس اور ہجو نگار تھا۔ برخلاف والٹیر کے یہ مذہب کا پابند بلکہ پادری تھا۔ "بیٹل آف دی بکس (کتابوں کی جنگ) اور گلیور کے سفر" اس کی مشہور تصانیف ہیں۔ ملکی سیاسیات میں بھی بہت حصہ لیتا تھا۔ اس کی تصانیف میں بے انتہائی شوخی، مذاق اور طنز ہے مثلاً جب آئرلینڈ کے قصابوں کا جھگڑا پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو اس نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام "معقول تجویز" رکھا۔ جس میں تجویز تھا کہ آئرلینڈ کی مصیبت دور کرنے کی سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ اس ملک کے بچے حلال کر کے ان کا گوشت بازار میں بیچا جائے۔ یہ مضمون نہایت پُر مذاق اور طنز آمیز ہے۔ عبارت نہایت صاف سادہ بلا کسی تصنع کے لکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی تمام تصانیف مقبول عام ہیں۔ ۱۲

۳؎ جوزف ایڈیسن انگلستان کا سب سے بڑا مشہور مضمون نگار اور نثار گزرا ہے۔ اس کی مشہور کتاب "اسپکٹیٹر" بہترین ذخیرہ اخلاقی سیاسی اور معاشرتی مضامین کا ہے جن کی سلاست اور شیرینی زبان انگریزی میں مشہور ہے۔ وہ بھی اپنے کلام میں ایک خاص قسم کی ظرافت اور مذاق سے کام لیتا ہے مگر اس سے کبھی کا دل نہیں دُکھتا۔ اس کے کلام میں نہایت متانت اور سنجیدگی ہے برخلاف سویفٹ کے جس کے یہاں طعن و تشنیع بہت ہے۔ ۱۲

پڑتے تھے اُس کو نبھا جانا مشکل ہوتا تھا:

کلام پر رائے مرزا کو زبان پر پوری قدرت اور شعر پر پوری حکمت حاصل تھی مشکل سے مشکل زمینیں ان کے سامنے پانی اور ادق مضامین ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ اشعار سب کیل کانٹے سے درست، بندش چست، زوائد و بھرتی کا نام نہیں۔ کلام سانچے میں ڈھلا معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ کو اپنے مقام پر ایسا رکھتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینے جڑے جاتے ہیں اگر کوئی لفظ بدل جاوے تو دوسرا لفظ اس کی جگہ پر نہیں رکھ سکتے۔ اگر لفظ اِدھر سے اُدھر رکھ دو تو شعر کا لطف اور مزا جاتا رہے گا۔ کلام ٹھوس اور زور فصاحت سے بھرا ہوا ہے۔ نئی نئی بحریں اور شگفتہ زمینیں نئے نئے ردیف اور قافیے ایسے کہہ گئے ہیں کہ اب تک دِل مزے لیتا ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں بھی ایسے ایسے شعر نکلے ہیں جس طرح پتھر سے چشمہ نکلتا ہے۔

سودا کا اثر بعد کے شعرا پر مرزا کا اثر اپنے زمانے کے اور نیز بعد کے شعرا پر بہت کچھ پڑا۔ ان کے اشعار پڑھ کر بہت سی منچلی طبیعتوں میں شعر گوئی کا شوق اور مادہ پیدا ہو گیا۔ اس خاص صفت کے اعتبار سے ان کو اردو شاعری میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو اسپنسرؔ[1] کو انگریزی میں ہے جو شاعروں کا شاعر کہلاتا ہے۔ معاصرین سے قطع نظر غالبؔ اور ذوقؔ وغیرہ بھی سب اُن کو مانتے تھے اور ان کے کلام سے مستفیض ہوتے تھے۔ ناسخؔ کا قول اوپر نقل ہو چکا ہے۔ غالبؔ ایسا جادو نگار سوداؔ کا قائل ہے۔ اور اُستاد ذوقؔ کا تو پورا کلام مرزا کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ علی الخصوص اُن

[1] اڈمنڈ اسپنسر سولھویں صدی عیسوی کا نامور انگریزی صاحب تصنیف شاعر ہے۔ اس کی کتاب فیری کوئن (پری ملکہ) ایک مشہور نظم ہے اس نے لاطینی اور یونانی بحریں نظم انگریزی میں رواج دے کر انگریزی شاعری کا پایہ بلند کیا۔

کے قصائد میں معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے قصائد سامنے رکھ کر کہے گئے تھے۔ مرزا کے کلام میں بسبب تنوع کے اس قدر مقبولیت اور دلچسپی ہے کہ ہر شخص خواہ وہ شاعر ہو یا غیر شاعر اُس کو پڑھتا ہے اور اس پر وجد کرتا ہے بعض اشعار میں تو حقیقی شاعری کے ایسے سچے جذبات دکھائے ہیں جو دیگر شعرائے اُردو کے کلام میں کمیاب ہیں۔ البتہ انگریزی میں شیلی[1] اور کیٹس[2] کے یہاں بہت کچھ ہیں غرض کہ میر و مرزا دونوں ایسے صاحبِ کمال تھے جن کا کلام بعض اس زمانہ کے الفاظ و محاورات کو چھوڑ کر زبان کی صفائی اور شیرینی اور خیالات کی بلندی اور پاکیزگی دونوں اعتبار سے اُردو شاعری کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے اور اس زمانہ میں بھی کسی شعر کی سب سے بڑی تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ ان قادر الکلاموں کے کسی شعر کے قریب پہنچ جائے۔ سودا کی استادی اور ملک سخنوری کی بادشاہت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ وہ قدرتی شاعر تھے اور جذبات شاعری ان کے خمیر میں پڑے تھے۔ میر ایسا نازک دماغ اور دنیا کو بے حقیقت سمجھنے والا شخص اُن کو پورا شاعر مانتا ہے ان کو ملک الشعرائی کا مستحق قرار دیتا ہے۔ مرزا کے کلام سے ظاہر و باہر ہے کہ ان کا دل جذبات سے کس قدر متاثر ہوتا ہے۔ ان کے اشعار میں ترشے ہوئے نگینوں کی سی آب داری اور انعکاس اور ان کا دماغ اعلیٰ تخیل سے

---

[1] تنو برس اُدھر کا ایک مشہور رنگین طبیعت اور عاشق مزاج انگریزی شاعر تھا۔ تیتس برس کے سن میں جوانا مرگ مرا، نہایت آشفتہ مزاج اور آزاد خیال آدمی تھا جو اس کی بدنامی کا بھی باعث ہوا۔ اس کی تصانیف کوئین میب (ملکہ میب) الاسٹر (کنج تنہائی) اور ریوولٹ آف اسلام مشہور ہیں اس کے خیالات نہایت شاعرانہ اور بلند ہوتے تھے ۱۲۔

[2] شیلی کا معاصر تھا اور مثل اسی کے نوجوان مرا۔ اس کی کتاب 'انڈ ئمین' نہایت دلچسپ ہے۔ نازک خیال اور رنگین طبیعت شاعر تھا۔ وہ خود نہایت حسین اور حُسن کا عاشق تھا۔ ۱۲۔

روشن ہے۔ مرزا میں چند خاص باتیں ہیں جو ان کے کلام کو شعرائے ماضی وحال سے ممتاز کر دیتی ہیں۔

(۱) زبان پر کامل قدرت۔ جس سے کلام کا زور، مضمون کی لطافت اور نزاکت سے رل کر عجب لطف واثر پیدا کر دیتا ہے۔

(۲) بندش کی چستی اور الفاظ کی نشست وترکیب جس سے شعر میں ڈھیلا پن اور سستی مطلق باقی نہیں رہتی بلکہ اس میں تلوار صفاہانی کی سی آب داری پیدا ہو جاتی ہے۔ نشست الفاظ کی یہ صفت ہے کہ اگر کوئی لفظ ادھر اُدھر ہو جائے تو تو شعر بے مزہ بلکہ مہمل ہو جائے گا۔ صنعت کی خوبی سے صناع کی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔

(۳) خیالات کی بلندی اور نزاکت ہے۔ البتہ کچھ استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیتے ہیں مگر صرف اسی قدر کہ شعر کا حسن بڑھ جائے اور سامع کو مطلب ٹٹولنا نہ پڑے۔ ان کا سامان زینت شعر کے حقیقی حسن کو کبھی نہیں چھپاتا۔ ان کی طبیعت ایک رنگ کی پابند نہ تھی۔ جو بات اور لوگوں کو سخت کاوش اور محنت سے میسّر ہوتی تھی وہ اُن کو ایک جنبشِ قلم سے حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ تخیّل اور قدرت زبان کا اثر تھا۔

(۴) چوتھی چیز اُن میں تصفیۂ زبان ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جن لوگوں نے زبان کو پاک صاف اور نیز وسیع کیا۔ ان سب میں مرزا کا نمبر اوّل ہے۔ بقول مصنف آبِ حیات جس طرح کیمیا داں دو مادّوں سے تیسرا مادّہ تیار کرتے ہیں انہوں نے فارسی اور ہندی کے امتزاج سے ایک تیسری زبان پیدا کی جسے مقبولیت عام حاصل ہوئی۔

مرزا کے کلام پر شعراء کی رائیں

اب بے موقع نہ ہوگا کہ مرزا صاحب کے متعلق ان کی اور نیز ان کے بعد کے شعراء اور تذکرہ نویسوں کی بھی قیمتی اور قابلِ قدر رائیں

بلکہ اُن کا اقتباس یہاں تحریر کیا جائے۔ میر تقی میر اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں ان کی نسبت فرماتے ہیں۔ خود انہیں کی زبان سے سنیئے: "مرزا رفیع متخلص بہ سودا جوانے است خوش خلق و خوشخو، گرم جوش یار باش، شگفتہ رو۔۔۔ غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست بسیار خوش گوست۔ ہر شعرش طرف لطف رستہ رستہ وہر چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرعۂ برجستہ اش لا مرد آزاد بندہ۔ پیش طبع عالیش فکر عالی شرمندہ۔ شاعر ریختہ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید قصیدۂ در ہجو اسپ گفتہ موسوم بہ تضحیک روزگار دور از حد متعارف و در صنعتہا بکار بردہ۔ اکثر اتفاق طرح غزل باہم می افتد۔ غرض از مغتنمات روزگارست حق تعالی سلامتش دارد۔" نکات ص ۱۸۴۔ ناقل

اسی طرح مرزا قتیل چار شربت میں مرزا کے قصائد کی نسبت لکھتے ہیں کہ "سودا کا مرتبہ قصائد میں ظہوری کے برابر ہے۔ سوائے اس کے کہ دونوں کا طرز الگ الگ ہے اور کوئی فرق نہیں ہے۔" اس تنقید پر مصنف آبِ حیات کی رائے ہے کہ "مرزا قتیل جو چاہیں کہیں مجھ بے کمال نے ظہوری کی غزلیں اور قصائد تھوڑے بہت پڑھے ہیں دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے الجھا ہوا ریشم معلوم ہوتے ہیں۔ مرزا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے جو قصائد اور ہجو اور نیز محاورے اور زبان دونوں کا بادشاہ ہے۔" اسی طرح صاحب طبقات الشعراء مرزا کے قصائد کو عرفی اور خاقانی کے قصائد سے اور ان کی غزلوں کو سلیم و کلیم کی غزلوں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ پُرگو بھی تھے اور خوشگو بھی تھے۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ مرزا سودا کے مقابلہ میں اب تک کوئی شخص ہندوستان سے نہیں اٹھا اور وہ موسیقی کے بھی ماہر تھے اور رفیقر اُن کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا ہے اور وہ میرے اوپر کرم فرماتے ہیں۔" حکیم

قدرت اللہ خان بقاؔ، اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "مرزا محمد رفیع سرآمد شعرائے فصاحت ہیں بعض کے نزدیک وہ غزل گوئی میں میر تقی میر کو نہیں پہنچتے۔ سچ یہ ہے کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ مرزا ایک بے کنار سمندر اور میر ایک عظیم الشان دریا ہیں قواعد کی معلومات میں میر صاحب کو مرزا صاحب پر برتری ہے اور قوت شاعری میں مرزا صاحب کو میر صاحب پر فوقیت ہے" تذکرۂ گلشن بیخار میں ہے کہ "فقیر کی دانست میں اُن کی غزلیں اُن کے قصیدوں سے اور اُن کے قصیدے اُن کی غزلوں سے بہتر ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ غزلوں میں بھرتی کے اشعار ہیں اور قصائد ان سے خالی ہیں تو میں کہوں گا کہ اُن کے دیوان کو سمجھ کر پڑھنے والوں پر اس رائے کی قباحت ظاہر ہو جائے گی۔ پروفیسر شہباز شمس العلماء نواب امداد امام صاحب اثر کا قول نقل کرتے ہیں کہ سوداؔ اُردو کے شیکسپیر تھے اسی طرح سر الفرڈ لائل سوداؔ کو زبان اُردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

کلام میں کمی مرزا میں دو تین کمیاں بھی ہیں (۱) ان کا کلام کم و بیش تصوف کی چاشنی سے خالی ہے جس کا ان کے اکثر ہمعصروں میں بہت زور تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ اور ذوق معاملات دنیاوی تک محدود ہے (۲) دوسرے لطفِ غزل ان میں کم ہے یعنی ان کی غزلوں میں وہ سوز و گداز اور گھلاوٹ اور سادگی نہیں جو غزل کی جان ہے۔ اس مفصل ذکر انشاء اللہ میر تقی میر کے حالات میں آئے گا جہاں ان دونوں کی شاعری کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

میر حسن متوفی ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء میر غلام حسن متخلص بہ حسن معروف بہ میر حسن۔ میر غلام حسین ضاحک کے وہ بلند اقبال صاحبزادے تھے جن کے بیٹے خلیق اور پوتے

۱؎ وحید قریشی، ماہ دسمبر ۶۲ ۶۱ —— ولادت تقریباً ۱۱۵۰ھ میں بتاتے ہیں۔ وفات عشرہ محرم ۱۲۰۱ھ یا ۱۷۸۶ء۔ ناشر۔

میر انیس ہوئے جو ملک شاعری پر آفتاب بن کے چمکے۔ ان کے اجداد شہر ہرات کے مشہور خانوادۂ سادات سے تھے۔ جدّ اعلےٰ میر امامی نام ہندوستان آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔

میر حسن اپنے زمانہ کے نامی گرامی شاعر جیّد فاضل اور مشہور خوش نویس تھے اور ان کمالات کی وجہ سے اپنے ہمچشموں اور ہمعصروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اُن کے والد میر ضاحک نہایت زندہ دل ظریف اور باغ و بہار آدمی تھے۔ جیساکہ ان کے تخلّص سے ظاہر ہے۔ میر حسن کی ولادت پرانی دِلّی کے محلہ سید واڑہ میں سنہ ۱۱۵۰ھ میں ہوئی اور بچپن میں درسی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ اور کلام بھی اُنہیں کو دکھایا۔ اس کے بعد خواجہ میر دردؔ کے شاگرد ہوئے۔ دہلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ہمراہ فیض آباد گئے۔ راستہ میں تھوڑے عرصہ تک ڈیگ میں قیام کیا۔ ایک مرتبہ شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ سفر کیا جس کا مفصّل حال اپنی مثنوی گلزار ارم میں قلمبند[1] کیا ہے۔

فیض آباد میں پہنچ کر نواب سالار جنگ بہادر برادر بہو بیگم صاحبہ کی ملازمت اختیار کی اور ان کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں کی مصاحبت میں بھی چند دن رہے جب نواب آصف الدولہ سنہ ۱۱۸۸ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھے۔ اور فیض آباد بدل کر لکھنؤ دار السلطنت ہو گیا تو میر حسن بھی لکھنؤ چلے آئے اور تھوڑے دن قیام کر کے یہیں سنہ ۱۲۰۱ھ میں انتقال[2] کیا۔ بر وقت وفات عمر پچاس سال سے متجاوز تھی۔ مصحفی نے تاریخ کہی "شاعر شیریں بیاں" جس سے تاریخ سنہ ۱۲۰۱ھ نکلتی ہے۔ مرزا علی لطف سنہ ۱۲۰۵ھ

---

[1] گلزار ارم میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی بہت تعریف ہے۔ اس مثنوی کا ایک نہایت صحیح اور خوش خط نسخہ کتب خانہ ندوہ میں موجود ہے (تذکرہ گل رعنا)

[2] عقب باغ نواب قاسم علی خاں، محلہ مفتی گنج (لکھنؤ) میں مدفون ہیں۔ (تذکرہ خمخانۂ جاوید جلد ۲)

لکھتے ہیں جو زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے۔

تعلیم اور شاگردی میر حسن عربی کم جانتے تھے۔ مگر فارسی میں کمال حاصل تھا۔ اور اس زبان میں کمال بے تکلفی اور سادگی سے لکھتے تھے۔ چنانچہ ان کا "تذکرہ شعرائے اردو" جو نہایت اعلیٰ درجہ کی فارسی میں ہے اس کا شاہد ہے۔ شاگردی کی نسبت تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے مصنف آب حیات لکھتے ہیں کہ سودا کے شاگرد تھے۔ میر تقی لکھتے ہیں "جوان اہلے است نوکر پیشہ اکثر در بندہ خانہ در تقریب مجلس تشریف می آرد در عنیج مرد آدمیانہ می دارد۔ مشق شعر از مرزا رفیع می کند" میر حسن خود اپنی نسبت لکھتے ہیں اصلاح سخن از میر ضیاء سلمہ اللہ گرفتہ ام۔ لیکن طرز ادشان از من کماحقہ سرانجام نیافت۔ بر قدم دیگر بزرگان مثل خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا و میر تقی پیروی نمودہ ام" اس سے ظاہر ہے کہ وہ رسمی طور پر میر ضیاء الدین ضیاء کے شاگرد تھے۔ اور بقول اصحاب مذکورہ بالا کی پیروی کرتے تھے۔ اور ممکن ہے مشورہ سخن بھی کرتے ہوں۔ فطرتاً نہایت خوش مزاج ہشاش بشاش ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ ہزل اور فحش سے کبھی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ نہایت شیریں زبان، خلیق اور قابل تھے۔ کسی شخص کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا اور نہ کسی تذکرہ نویس نے ایک حرف ان کے خلاف لکھا ہے۔

طرز کلام کلام نہایت سلیس اور صاف ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ غزل۔ رباعی۔ مثنوی۔ مرثیہ سب خوب کہتے تھے۔ البتہ قصیدہ نہ کہتے تھے۔ مثنوی میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی مثنوی "سحر البیان" معروف بہ "مثنوی میر حسن" اردو میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ان کی غزلیں میر سوز اور میر تقی میر کی غزلوں کا لطف دیتی ہیں وہی عاشقانہ رنگ، وہی سادگی، وہی دل فریبی۔

میر حسن کے صاحبزادے میر حسن کے چار بیٹے تھے جن میں سے تین شاعر تھے۔ میر مستحسن خلیق جو مصحفی کے شاگرد تھے۔ میر محسن محسن۔ یہ دونوں نواب آصف الدولہ کی والدہ

نواب بہو بیگم صاحبہ کے داماد مرزا محمد تقی کی سرکار سے تعلق رکھتے تھے۔ تیسرے بیٹے میر احسن خلق نواب ناظر داراب علی خاں کی خدمت میں رہتے تھے۔ یہ سب اچھے شاعر تھے۔ اور اپنے پدر بزرگوار کے رنگ میں کہتے تھے خلیق اور خلق کے دیوان بھی ہیں۔

تصانیف حسب ذیل ہیں

(۱) ایک دیوان غزلوں کا مشتمل بر جملہ اقسام سخن۔ ترکیب بند۔ مخمس و اسوخت مثلث وغیرہ جس میں فارسی شعر پر تیسرا مصرع خواہ فارسی ہی یا اردو میں لگایا ہے۔

(۲) گیارہ مثنویاں جن میں سے حسب ذیل نہایت مشہور ہیں:۔

(۳) مثنوی سحر البیان یا قصۂ بے نظیر و بدر منیر۔ لاجواب اور بے عدیل و بے نظیر مثنوی ہے۔ ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں تحریر ہوئی۔ جیسا کہ قتیل اور مصحفی کی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے اور نواب آصف الدولہ بہادر کے نام نامی پر معنون ہوئی۔ اس میں شاہزادہ بے نظیر اور شاہزادی بدر منیر کے عشق کا افسانہ ہے جس میں ضمناً نہایت دلچسپ جزئیات مثلاً قدیم زمانہ کا لباس، زیور شادی بیاہ کے رسوم، برات کا سامان وغیرہ وغیرہ نہایت خوبی سے بیان کیے ہیں۔ عبارت اس قدر صاف اور بامحاورہ ہے کہ صدہا شعر محاورہ کی صورت میں زبانوں پر چڑھ گئے۔ اس کا ہر مصرع لاجواب اور شعر انتخاب ہے۔ صفائی بیان، لطف محاورہ، شوخی مضمون قابل دید ہے سوال جواب کی نوک جھونک پر لطف مذاق کی باتیں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور ان سب پر طرّہ یہ کہ کتاب کو لکھے ڈیڑھ سو برس ہو گئے۔ زبان وہی ہے جو ہم آپ بولتے ہیں۔ مولانا آزاد حیرت سے پوچھتے ہیں۔ "کیا اُسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو اب ہم تم بول رہے ہیں"۔ قصہ پرانے رنگ کا ہے۔ اس کا ترجمہ نثر میں ایک شخص مسمّی میر بہادر علی نے ۱۲۱۷ھ میں کیا تھا جس کا نام "نثر بے نظیر" رکھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے

کہ اس موقع پر ہم اصل مثنوی سے ایسے اشعار منتخب کر کے لکھیں جس سے قصّہ کی تمام کڑیاں مل جائیں اور پورا قصّہ بآسانی سمجھ میں آجائے۔

اختصار مثنوی میر حسن مسلسل بصورت افسانہ

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ
کہ تھا وہ شہنشاہِ گیتی پناہ

کسی طرح کا وہ نہ رکھتا تھا غم
مگر ایک اولاد کا تھا الم

وزیروں کو اک روز اُس نے بُلا
جو کچھ دل کا احوال تھا سو کہا

کہ میں کیا کروں گا یہ مال و منال
فقیری کا ہے میرے دل کو خیال

وزیروں نے کی عرض کائے آفتاب
نہ ہو ذرّہ تجھ کو کبھی اضطراب

یہ دُنیا جو ہے مزرعِ آخرت
فقیری میں ضایع کرو اس کو مت

مگر ہاں جو اولاد کا ہے یہ غم
سو اِس کا تردّد بھی کرتے ہیں ہم

بُلاتے ہیں ہم اہلِ تنجیم کو
نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو

بُلا کر اُنھیں شہ کنے لے گئے
جونہی روبرو سب وہ شہ کے گئے

کہا رام جی کی ہے۔ تجھ کو دِیا
چندرماں سا بالک ترے ہوئے گا

یہ لڑکا تو ہوگا ولے کیا کہیں
خطر ہے اسے بارھویں سال میں

نہ آئے یہ خورشید بالائے بام
بلندی سے خطرہ ہے اس کو تمام

نہ نکلے یہ بارہ برس رشکِ مہ
رہے برج میں یہ مہِ چاردہ

گئے نَو مہینے جب اُس پہ گذر
ہوا گھر میں شہ کے تولّد پسر

ہوا وہ جو اس شکل سے دل پذیر
رکھی نام اس کا شہِ بے نظیر

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی
کھلی گلجھڑی غم کے جنجال کی

کہا شہ نے بلوا نقیبوں کو شام
کہ ہوں صبح حاضر سبھی خاص و عام

رعیّت کے خوش ہوں صغیر و کبیر
کہ نکلے گا کل شہر میں بے نظیر

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو
کہ بابا نہا دھو کے تیار ہو

نہا دھو کے نکلا وہ گل اس طرح
کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

غرض ہو کے اس طرح آراستہ
خراماں ہوا سروِ نوخاستہ

گھڑی چار تک خوب سی سیر کر
رعیّت کو دکھلا کے اپنا پسر

اُسی کثرتِ فوج سے ہو سوار
پھرا شہر کی طرف وہ شہریار

قضارا وہ شب تھی شبِ چاردہ
پڑا جلوہ لیتا تھا ہر طرف مہ

کچھ آئی جو اُس مہ کے جی میں ترنگ
کہا آج کوٹھے پہ بچھے پلنگ

خواصوں نے جا شاہ سے عرض کی
کہ شہزادے کی آج یوں ہے خوشی

ارادہ ہے کوٹھے پہ آرام کا
کہ بھایا ہے عالم لبِ بام کا

کہا شہ نے اب تو گئے دن نکل
اگر یوں ہے مرضی تو کیا ہے خلل

قضارا وہ دن تھا اُسی سال کا!
غلط وہم ماضی میں تھا حال کا!

زبس نیند میں تھا جو وہ ہو رہا
بچھونے پہ آتے ہی وہ سو رہا

قضارا ہوا اک پری کا گذر
پڑی شاہزادے پہ اُس کی نظر

ہوئی لاکھ جی سے وہ اُس پر نثار
وہ تخت اپنا لائی ہوا سے اُتار

محبت کی آئی جو دل میں ہوا!
وہاں سے اُسے لے اُڑی دلربا

قضارا کھلی آنکھ اُس گل کی جو
نہ پائی وہاں شہر کی اپنے بُو

نہ وہ لوگ دیکھے نہ وہ اپنی جا
تعجب سے اِک اِک کو تکتا رہا

اچنبھے کا یہ خواب دیکھا جو واں
لگا کہنے یا رب! میں آیا کہاں

سرہانے جو دیکھی مہِ چاردہ
کہ ہے اجنبی سی وہ اک رشکِ مہ

کہا کون ہے تو یہ کس کا ہے گھر
یہ آیا مجھے کون گھر سے اِدھر

پھرا منہ کو لے اور اُدھر سے نقاب
دیا اس پری نے یہ ہنس کے جواب

خدا جانے تو کون میں ہوں کہاں
مجھے بھی تعجب ہے میں ہوں جہاں

یہ گھر کو کہ میرا ہے تیرا نہیں
پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

چھٹا کر ترا تجھ سے شہر و دیار
یہ بندی ہی لائی ہے تقصیر دار

پری ہوں میں اور یہ پرستان ہے
یہاں سب یہ قوم بنی جان ہے

غرض دل کو جوں توں لگایا وہاں
کہا اس نے جو کچھ کہا اس کو ہاں

ولیکن نہ عقل و نہ ہوش و حواس
رہے وحشیوں کی طرح وہ اداس

وہ تھی نازنین بھی بہت عقل مند
نہ کھلنے سے کچھ اس کے ہوتی تھی بند

غرض ماہ رخ اس پری کا تھا نام
پدر سے کیا تھا یہ پوشیدہ کام

کیا ایک دن اس نے اسے دلپذیر
مرے دام میں تو ہوا ہے اسیر

تو مت رک کے کر اپنے جی کو نہ بند
نہ پہنچے کہیں تیرے جی کو گزند

یہ گھوڑا تو کل دوں گی کل کا تجھے
ولیکن یہ دے تو پکا سب مجھے

کہ گر شہر کی طرف جائے کہیں
دیا دل کسی سے لگائے کہیں

تو پھر حال ہو جو گنہگار کا
وہی حال ہو تجھ سے دل دار کا

کہا میں نہ کیوں تم کو جاؤں گا بھول
مجھے جو کہا تم نے سب ہے قبول

یہ گھوڑا جو اس کل کے تھا بخشش کا
فلک سیر تھا نام اس رخش کا

سرِ شام وہ بے نظیر جہاں
اسی رخش پہ ہو کے جلوہ کناں

ہر اک طرف سے ہو گزرتا تھا وہ
وہیں ایک پہر سیر کرتا تھا وہ

پہر جبکہ بجتا تو پھرتا شتاب
کہ پھر مہر تھا ماہ رخ کا عتاب

سنو ایک دن کی یہ تم واردات
اٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات

ہوا ناگہاں اُس کا اِک جا گذر — سہانا سا اِک باغ آیا نظر

سفیدہ ایک دیکھی عمارت بلند — کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند

یہ عالم جو بھایا کوٹھے پہ آ ! — اُترا اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا

لگا جھانکنے اس مکاں کے تئیں — کہ دیکھوں یہاں کوئی ہے یا نہیں

جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر — کہ سب کچھ گیا اس کے جی سے اُتر

کہا جی سے اب تو جو کچھ ہو سو ہو — ذرا چل کے اس سیر کو دیکھ تو

یہ کہہ نیچے اترا دبے پاؤں وہ ! — نظر سے بچائے ہوئے چھاؤں وہ

الگ کھول ہاتھوں سے واں کے کواڑ — چلا سائے سائے درختوں کی آڑ

تھے اک طرف گنجان باہم درخت — کہ لپٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت

لگا واں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر — درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر

جو دیکھی تو صحبت عجب ہے وہاں — عجب چاندنی ہے عجب ہے سماں

ملی جنس کی اپنے جو اُس کو بُو — لگا تکنے حیرت سے ہر ایک سو

عجب صورتیں اور طرفہ محل — چلا دیکھتے ہی دل اُس کا نکل

گئی اس کے عالم پہ جس دم نگاہ — اور آئی نظر اُس میں اک رشک ماہ

برس پندرہ ایک کا سنّ و سال — نہایت حسیں اور صاحب جمال

دیئے کہنی تکیے پہ اک ناز سے — سرِ نہر بیٹھی تھی انداز سے

خواصیں کھڑی ایدھر اودھر تمام — ستاروں کا جوں ماہ پر اژدہام !

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام — قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

یہ قدرت کا دیکھا جو اس نے کمال — کہا شاہزادے نے یا ذوالجلال

درختوں سے وہ دیکھتا تھا نہاں — کسی کی نظر جا پڑی ناگہاں

جو دیکھیں تو ہے اِک جوانِ حسین — درختوں کی ہے اوٹ میں مہ جبیں

کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن — کسی نے کہا ہے قیامت کا دن

یہ آپس میں باتیں جو ہونے لگیں — اشاروں سے گھاتیں جو ہونے لگیں

گئے بات پر شاہزادی کے گوش — یہ سنتے ہی جاتا رہا اُس کا ہوش

کہا ہیں تو دیکھوں یہ کہہ کر اُٹھی — گیا سنسنا جی تو رہ کر اُٹھی

نواصوں کے کاندھے پہ رکھ اپنا ہاتھ — عجب اِک ادا سے چلی ساتھ ساتھ

جو دیکھیں تو ہے اِک جوانِ حسین — کھڑا ہے وہ آئینہ ساں مہ جبیں

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن ! — جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

دلے عشق کی تیغ کھاتے ہوئے — کڑا دل کسی پر لگائے ہوئے

گئی اُس جگہ جب کہ بدرِ منیر — اور اس نے جو دیکھا شہِ بے نظیر

گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل — نظر سے نظر، جی سے جی، دل سے دل

غرض بے نظیر اور بدرِ منیر — گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر

تھی ہمراہ اِک اس کی دختِ وزیر — نہایت حسین اور قیامت شریر

شتابی سے لا اُس نے چھڑکا گلاب — تب آئی تنوں میں ذرا اُن کے تاب

وہ اُٹھنے تو اٹھی یہ حیران سی — گلِ شبنم آلودہ گریان سی

چلی اُس کے آگے سے مُنہ موڑ کر — وہیں نیم بسمل اُسے چھوڑ کر !

غضب مُنہ پہ ظاہر نہاں دل میں چاہ — نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ

یہ ہے کون کم بخت آیا یہاں — میں اب چھوڑ گھر اپنا جاؤں کہاں

یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں — چھپی اپنے جا کر وہ دالان میں

کہ اتنے میں آئی وہ دختِ وزیر — لگی ہنس کے کہنے کہ بدرِ منیر

مری طرف ٹک دیکھ تو ہائے ہائے — مثل ہے کہ من بھائے مُنڈیا ہلائے

ترے گھر میں آیا ہے مہماں غریب — ہے یہ واردات غریب و عجیب

شتابی سے مجلس کو تیار کر — تو اس گل سے گھر رشکِ گلزار کر
بلا لائی جا اس جواں کے تئیں — کیا میزباں میہماں کے تئیں

بلا اک مکاں میں بٹھایا اسے — محل کا سماں سب دکھایا اسے
کھلا بند جس دم درِ گفتگو — جواں نے حقیقت کہی مو بمو
پری کا بھی احوال ظاہر کیا — چھپے راز سے اس کو ماہر کیا
کہا اک پہر کی ہے رخصت مجھے — زیادہ نہیں اس سے فرصت مجھے
رہی دل ہی دل میں غرض دل کی بات — پہر بھر گئی اتنے عرصے میں رات
خبر رات کی سن اٹھا بے نظیر — کہا اب میں جاتا ہوں بدرِ منیر
اگر قید سے چھوٹنے پاؤں گا — پھر آج کے وقت کل آؤں گا
بندھا پھر تو معمول اس کا مدام — کہ ہر روز آتا ادھر وقتِ شام
پہر رات تک ہنسنا اور بولنا — درِ عشق اور حسن کو کھولنا
کبھی ہجر سے ان کو ہونا ملول! — کبھی وصل میں بیٹھنا پھول پھول
کسی دیو نے دی پری کو خبر — کہ معشوق عاشق ہوا اور پر!
یہ سن کر وہ شعلہ بھبوکا ہوئی — لگی کہنے ایں یہ بلا کیا ہوئی
قسم مجھ کو حضرت سلیمانؑ کی — ہوئی دشمن اب اس کی میں جان کی
کہا دیو سے تو مجھے دے پتا — کہا وہ کسی باغ میں تھا کھڑا!
کوئی نازنیں سی تھی اک اس کے ساتھ — کھڑی تھی دیے ہاتھ میں اس کے ہاتھ
قضارا اڑی میں جو ہو کر ادھر — یہ دونوں مجھے واں پڑے تھے نظر
یہ اڑتی سی سن کر خبر وہ پری — کہا دیکھنے پاؤں اس کو ذری
غضب ناک بیٹھی تھی یہ تو ادھر — کہ اتنے میں آیا وہ رشکِ قمر

بلا سی وہ دیکھ اُس کے پیچھے پڑی
کہا سُن تُو اے مُوذی و مُدّعی

تجھے سیر کو میں نے گھوڑا دیا
کہ اُس مال زادی کو جوڑا دیا

مزا چاہ کا دیکھ اپنی ذرا
جھنکاتی ہوں جیسے کنوئیں رہ بھلا

یہ کہہ اور مُلا اِک پری زاد کو
کہا سننا اُس کی نہ فریاد کو

اِسے کھینچتا یاں سے لے جا شتاب
وہ صحرا جو ہے درد و محنت کا باب

کنواں اس میں جو ہے مصیبت بھرا
کئی من کا پتھر ہے واں پہ دھرا

اِسے جا کے اس چاہ میں بند کر
وہی سنگ پھر اس کے مُنہ پر تُو دھر

سرِ شام کھانا کھِلانا اِسے
اور اِک جام پانی پلانا اِسے

نہ دیجو سوا اس کے گر کچھ کہے
یہی اُس کا معمول دائم رہے

کیا بند پھر جا کے اُس چاہ میں
کنواں وہ جو تھا قاف کی راہ میں

پھنسا اس طرح سے جو وہ بے نظیر
پڑی بے قراری میں بدرِ مُنیر

کئی دن نہ آیا جو وہ رشکِ ماہ
نظر میں ہُوا اُس کے عالم سیاہ

لگی کہنے نجم النّسا سے بُوا!
خدا جانے اس شخص کو کیا ہُوا

کہا اس نے بی تم کو سودا ہے کچھ
وہ معشوق ہے اُس کو پروا ہے کچھ

خدا جانے کس شغل میں لگ گیا
مری چیز ہے اتنا بھی ہو نا فدا

لگی کہنے تب اس کو بدرِ مُنیر
کہ سنتی ہے اے میری دختِ وزیر

مجھے رات دن اس کا رہتا ہے ڈر
پری نے سُنی ہو نہ یاں کی خبر

نہ باندھا ہو اس کو کسی قید میں
کیا ہو نہ اُس کے تئیں قید میں

گئی نیند گھبرا کے آخر کو لیٹ
پھر کھٹ کے کونے میں مُنہ کو لپیٹ

ذرا آنکھ لگ گئی جو اِس حال میں
تو دیکھا بہت اُس کو جنجال میں

قضا کے دکھایا عجب اس کو خواب
کہ دشمن نہ دیکھے یہ حالِ خراب

جو دیکھے تو صحرا ہے اک لق و دق
کہ رستم بھی جسے دیکھ ہو جائے فق

نہ انساں ہے واں نہ حیوان ہے
فقط اک کفِ دست میدان ہے

مگر بیچ میں اس کے ہے اک کنواں
کہ اُٹھتا ہے آہوں کا واں سے دھواں

کنوئیں کا ہے منہ بند اس سے اڑی
کئی لاکھ من کی سِل اُس پہ پڑی !

صدا واں سے آتی ہے بدرِ مُنیر
ترے چاہِ غم میں ہوا ہوں اسیر

مَیں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جاں
کروں کیا کہ ہے مجھ کو آ قید گراں

یکایک گئی آنکھ اتنے میں کھُل
پڑے اشک رُخسار پر اس کے ڈھل

سُنا جب کہ نجم النسا نے یہ حال
ہوئی بے قراری تب اُس کو کمال

لگی کہنے وہ یوں دم آنسو بہا
ترے واسطے مَیں نے یہ دُکھ سہا

بس اب سر بصحرا نکلتی ہوں مَیں
اسے ڈھونڈھ لانے کو چلتی ہوں مَیں

کہا شاہزادی نے سُن اے رفیق
ہوئی میں تو اس چاہِ غم میں غریق

بھلی چنگی اپنی نہ کھو جان تو
کہ وہ ہے پری اور انسان تُو

کہا اس نے کیا کیجیے اب بھلا
پڑی اب تو ہے اپنے سَر پہ بَلا

تجھے دیکھنا یوں گوارا نہیں
اس اندوہ کا مجھ کو یارا نہیں

یہ کہہ اُس نے رو رو اُتارا سنگار
کیا اپنی پشواز کو تار تار !

پھر آئے جو کچھ اُس کے ہوش و حواس
سجا تن پہ جوگن کا اُس نے لباس

چلی بن کے جوگن وہ باہر کے تئیں
دکھاتی ہوئی چال ہر ہر کے تئیں

جُدا ہو کے القصہ روتوں کو چھوڑ
چلی اپنے گھر بار سے مُنہ کو موڑ

نہ سُدھ بُدھ کی لی نہ سنگل کی لی
نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

لیے بین پھرتی تھی صحرا نورد
تن چاک چاک اور رُخ زرد زرد

قضارا تھا تا سا اک دشت تھا
کہ اک شب ہوا اس کا واں بسترا

وہ تھی اتفاقاً شبِ چار دہ
ادا سے وہ بیٹھی تھی واں رشکِ مہ

بچھا مرگ چھالے کو اور لے کے بین
وہ زانو سنبھل کر وہ زہرہ جبین

لگا وہ بجانے لگی شوق میں !
لگی دست و پا مارنے ذوق میں

بندھا اس جگہ اس طرح کا سماں !
صبا بھی لگی رقص کرنے وہاں

یہاں تو یہ عالم تھا اور طور یہ !
رقص اوپر مزا تم سنو اور یہ

کہ تھا اک پری زاد فرخ سیر
جنوں کے وہ تھا بادشاہ کا پسر

ہوا پہ اڑائے ہوئے اپنا تخت
کسی طرف جاتا تھا فیروز بخت

وہ جاتا تھا کرتا ہوا سیر ماہ
اسے لوگ کہتے تھے فیروز شاہ

یکایک سنی بین کی جو صدا
وہاں تخت لا اپنا اس نے رکھا

جو دیکھے تو جوگن ہے اک رشکِ حور
کہ چشمِ فلک نہ دیکھا یہ نور !

نظر کرکے حسن اس کا غش کر گیا
تعشق کے عالم میں بس مر گیا

یہ سمجھا بناوے کا کچھ بھیس ہے
لگا کہنے جوگی جی آدیس ہے

پڑا تم یہ ایسا کہو کیا بجوگ
لیا واسطے جس کے تم نے یہ جوگ

وہ سمجھی کہ دل اس کا آیا ادھر
کہ دل بھی تو رکھتا تھا دل کی خبر

کہا سن کے جوگن نے ہر بول ہر
جہاں سے تو آیا چلا جا ادھر

گیا بیٹھ آ سامنے ریت میں
ہوا کھیت یہ تو اسی کھیت میں

بجاتی رہی بین وہ صبح تک
یہ دھریا کیا سامنے بے دھڑک

دھری اپنے کاندھے پہ جب اس نے بین
اٹھی لے کے انگڑائی زہرہ جبین

پری زاد نے تب پکڑ اس کا ہاتھ
شتابی بٹھا تخت پہ اپنے ساتھ

زمیں سے اڑا آسماں کے تئیں
وہ کہتی کہا کی نہیں رے نہیں

نہ مانا اور اس نے اٹھایا اسے
پرستاں میں لاکر بٹھایا اسے

یہ مژدہ گیا باپ پاس اپنے لے | کہا عرض رکھتا ہوں میں آپ سے
یہ جوگن جو ہے ایک صاحب کمال | ذرا بین سنیئے اور اِس کے خیال
بہت آپ اُس سے اُٹھاویں گے حظ | بہت بین میں اس کی پاویں گے حظ
کہا اُس نے بابا بہت خوب ہے | ہمیشہ سے راگ اپنے مرغوب ہے
کہا آؤ جوگی جی بیٹھو اِدھر | کرو روشن اپنے قدم سے یہ گھر
بہت اس نے تعظیم و تکریم کی | جگہ ایک پاکیزہ رہنے کو دی
غرض اس طرح اُس کا معمول تھا | کہ اُس پریوں کی خدمت میں جا
بجا بین سب کو رِجھاتی تھی وہ | پہر رہے بجے گھر کو آتی تھی وہ
و لے کیا کہوں حال فیروز شاہ | کہ تھی دن بدن اس کی حالت تباہ
نہ دُنیا کی اُس کو نہ دین کی خبر | اُسی کے تصور میں آٹھوں پہر
غرض ایک دن بات یہ جان کر | لگا گھات پر اپنی وہ آن کر
نہ تھا اس گھڑی کوئی اِدھر اُدھر | اکیلی پڑی جوگن اُس کو نظر
اکیلے اُسے دیکھ ہو بے قرار | گرا پاؤں پر اس کے بے اختیار
گرا اس طرح سے قدم پہ جو وہ ! | تو کہنے لگی مسکرا اُس کو وہ
کہ ہے آج کیا یہ خلافِ قیاس | گرا اتنا کیوں ہو کے تو بے حواس
لگا کہنے رو رو کے فیروز شاہ | کہو بس بس یہی تو کہو گی نہ واہ !
تمہاری سمجھ نے تو مارا ہمیں | یہ باتیں تمہیں ہیں گوارا ہمیں
کہا اُس نے کہہ تو شتاب اپنا حال | کہ تو کیوں گرا سر کو پاؤں پہ ڈال
کہا تب پری زاد نے میری جاں | کہاں تک کروں راز اپنا نہاں
بھلا ہجر میں کب تلک ہوں ملول | غلامی میں اپنی مجھے کر قبول
لگی ہنس کے کہنے کہ اِک طور سے | جو میری کہانی سُنے غور سے

مطالب اگر میرے بر لائیے تُو — تو شاید مُراد اپنی بھی پائیے تُو
کہا اُس نے پھر جلد فرمائیے — جو کچھ آپ سے ہو بجا لائیے
کہا اس نے یہ ہے مری داستاں — کہ شہرِ سراندیپ ہے اِک مکاں
مَلک اِک وہاں کا ہے مسعود شاہ — کہ بیٹی ہے اِک اُس کی مانندِ ماہ
جہاں میں ہے بدرِ مُنیر اُس کا نام — مَیں رہتی تھی خدمت میں اُسکی مدام
بنایا ہے اُس نے الگ ایک باغ — کہ فردوس کا ہے وہ چشم و چراغ
جُدا باپ سے تھی وہ اُس جا مقیم — سدا سیر کرتی تھی بے خوف و بیم
مَیں نجم النسا اُس کی دختِ وزیر — ہمیشہ سے ہم راز تھی اور مشیر
ہوئی ایک دن یہ عجب واردات — کہ اِک شخص وارد ہُوا ایک رات
کہاں تک کہوں اس کا قصّہ ہے دُور — نہ تھا آدمی نور کا تھا ظہور
گیا اُس پہ اس شاہزادی کا دل — گئے کچھ دنوں میں وہ آپس میں مل
وے اُس پہ عاشق ہُوئی تھی پری — محبت میں تھی اُس کے وہ بھی بھری
کہیں اس کے آنے کی سُن کر خبر — خدا جانے پھینکا ہے اُس کو کدھر
دیا قید میں اُس کو ڈالا کہیں — کہ مدّت سے اس کی خبر کچھ نہیں
سو میں کھوج میں اس کے جوگن ہوئی — یہاں تک تو پہنچی بروگن ہُوئی
پری زاد آپس میں تم ایک ہو! — اگر تم ذرا کھوج اُس کا کرو
تو شاید مدد سے تمہاری ملے — تو پھر آرزو بھی ہماری ملے
دِل آباد ہو جی کو آرام ہو! — تمہارا اسی کام میں کام ہو
کہا تب پری زاد نے ہاتھ لا — انگوٹھا دِکھایا کہ اِترا نہ جا
یہ سُن قوم کو اُس نے اپنی بُلا — تَقیّد سے سب کو سُنا کر کہا
کہ جاؤ تو ڈھونڈو کرو مت کمی — کہ ہے اِک پرستان میں آدمی

جو تم میں سے لا دے کا اُس کی خبر
جواہر کے دُوں گا لگا اُس کو پَر

ہُوا ناگہاں ایک کا واں گذر
جہاں قید میں تھا وہ خستہ جگر

وہ روتا جو تھا نالہ و آہ سے
تو کچھ اُس کو آئی صدا چاہ سے

وہ چونکی پہ جو دیو تھے جابجا
لگا پوچھنے کس کی ہے یہ صدا

کہا ماہ رُخ کا ہے قیدی یہاں
کنوئیں میں تڑپتا ہے اک نوجواں

وہ تحقیق کر اور لے اُس کا بھید
اُڑا شہر کو اپنے دیو سفید

گیا جا کے فیروز شہ کو سلام
سُن آیا جو کچھ تھا سُنایا تمام

یہ بھیجا پھر اس ماہ رُخ کو پیام
کہ کیوں زیست کرتی ہے اپنی حرام

بنی آدموں کو تو چوری سے لا
بٹھاتی ہے گھر میں تعشق جتا

بھلا چاہتی ہے تو اُس کو نکال
کنوئیں میں جسے تُو نے رکھا ہے ڈال

گیا ماہ رُخ کو یہ پیغام جب
ہوئی خوف سے وہ پریشاں تب

کہا مجھ سے تقصیر اب تو ہوئی
کہو اس کو لے جائے یاں سے کوئی

پہ اتنا یہ احسان مجھ پر کرو
کہ اُس کا پرستاں میں چرچا نہ ہو

یہ سُن کر جواب اُس کا فیروز شاہ
چلا اپنے گھر سے جہاں تھا وہ چاہ

الگ یوں سے آیا کنوئیں سے نکال
کہ فوّارہ جوں آب کو دے اُچھال

وہ جیتا تو نکلا ولے اس طرح
کہ بیمار ہو نزع میں جس طرح

یہ دیکھا جو احوال اُس کا تباہ
تو روتا ہوا جلد فیروز شاہ

بٹھا تخت پر اپنے اُس کو وہاں
لے آیا وہ بیٹھی تھی جوگن جہاں

رکھا تخت اک جا پہ اُس کا چھپا
کہا پھر یہ جا کر کہ نجم النسا

چل اب تُو کہ میں اس کو لایا یہاں
یہ سُنتے ہی گھبرا کے بولی کہاں

کہا چل کہاں ہے بتا تُو مجھے
ذرا اُس کی صورت دکھا تُو مجھے

کہا رہ کے چلیو ذرا تھم رہو — کہ شادی بڑی ہے کہیں غم نہ ہو
یہ کہہ اور لے ہاتھ میں اُس کا ہاتھ — لے آیا وہ جوگن کو واں ساتھ ساتھ
گیا آپ اُس تخت پر بیٹھ اور — دکھایا اُسے اور کہا کر تو غور
جسے ڈھونڈتی تھی سو یہ ہے وہی — کہا ہاں ہے ہاں یہ وہی ہے وہی
یہ اُس تخت کے گرد پھرنے لگی — بلا اس کو لے لے کے گرنے لگی
وہ دیکھے جو ٹک آنکھ اٹھا بے نظیر — تو نجم النسا ہے یہ دختِ وزیر
کہا تو کہاں اور کس کا یہ جوگ — کہاں یہ لباس اور کہاں تم یہ لوگ
کہا تیرے غم نے دِوانہ کیا — کہ عالم سے اپنے بیگانہ کیا
کہی سرگذشت اس نے اس دم تلک — کہ اس طرح پہنچے ہو تم ہم تلک
کیا ایک دن تو انہوں نے مقام — چلے دوسرے دن وہ نزدیک شام
وہ جوگن وہ فیروز شاہ اور وہ ماہ — چلے تخت پر بیٹھ اوپر کی راہ!
مربع نشیں تھی جو بدرِ منیر — وہاں اس کو لائی وہ دختِ وزیر
بلائیں لگی لینے نجم النسا! — لگی گرد پھرنے برنگِ صبا
گئی جب کہ خلوت میں بدرِ منیر — کہا میں لے آئی ترا بے نظیر
کہا کیوں کر لائی کہا اس طرح — وہ سب کہہ دیا حال تھا جس طرح
ترا قیدی جا کر چھڑا لائی ہوں — اِک اور بندھوا اُڑا لائی ہوں
کہا پھر وہ دونوں کہاں ہیں کہا — درختوں میں اُن رکھا ہے چھپا
سو اب ایک کو جا کے لائی ہوں میں — ہوا دوسرے کو بتاتی ہوں میں!
یہ سن شاہزادی ہنسی کھل کھلا — کہا کیوں اڑاتی ہے نجم النسا
یہ سن کر شتابی گئی وہ نگار — لیا جا کے آہستہ ان کو پکار
چھپائے ہوئے لا بٹھایا وہاں — وہ خلوت میں جو تھا قدیمی مکاں

غرض دیر تک مل کے روتے رہے — جُدائی کے داغوں کو دھوتے رہے
کہا شاہزادے نے احوال سب — کنویں میں جو گذرا تھا اُس پر تعب
اگرچہ ہر اک وصل سے شاد تھا — ولے ہجر کا غم انہیں یاد تھا
یہ ٹھہرا کے نکلے وہ دو ماہ رو — کہ اس بات کو کیجیے ایک سو
وہ نجم النسا اور وہ بدرِ منیر — کچھ اک کر بہانا وہ دونوں شریر
رہیں گھر میں پھر جا کے ماں باپ کے — کہ دیکھیں گے ہم اب قدم آپ کے
نکل بے نظیر اور وہ فیروز شاہ — کسی شہر میں رکھ کے فوج و سپاہ
کر اسباب سب سلطنت کا درست — پھر آ گئے اسی جا پہ چالاک و چست
وہاں کا جو تھا شاہ انجم سپاہ — جسے لوگ کہتے تھے مسعود شاہ
کیا نامہ یوں ایک اُس کو رقم — کہ اے شاہ شاہاں و اے فخر جم
فریدوں مثال و سکندر نژاد — مرادِ جہان و جہان مراد
میں وارد ہوں یاں ایک مہمان غریب — لے آئے ہیں مجھ کو مرے یاں نصیب
نوازش سے اپنی کرم کیجیے — غلامی میں اپنی مجھے لیجیے!
گیا یہ جو مسعود شہ کو پیام — سُنا اور پڑھا خط کا مضمون تمام
لکھا نامہ اُس کے یہ اک در جواب — کہ عاقل کو نکتہ لگے ہے کتاب
کہ نامہ تمہارا جو سربستہ تھا — وہ رازِ نہاں اپنے ہاتھوں کھلا
اگر ہم کہیں اپنے دعوے پہ آئیں — تمہارے فلک کو نہ خاطر میں لائیں
ولے ہم کو ہے پاس شرعِ رسولؐ — سو اس واسطے کرتے ہیں ہم قبول
سُنی یہ جو نامہ کی گفت و شنید — ہوئی شاہزادہ کو گویا کہ عید
بُلا سنگولوں کو تا سال و سن — مقرر کیا نیک ساعت کا دن
بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز — چڑھا بیاہنے وہ مہ دلفروز

ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان ۔۔۔ پلا شب کو شربت دیے خاصدان
اٹھا پھر تو تو شاہ بعد از نکاح ۔۔۔ محل میں بُلانے کی ٹھہری صلاح
ہوا لیکن اُس وقت دُونا مزا ۔۔۔ کہ دُولھا دُلھن جب ہوئے ایک جا
غرض اس طرح جب وہ دُلہن کو بیاہ ۔۔۔ لے آیا جہاں اس کی تھی عیش گاہ
وہ نجم النسا تھی جو دخترِ وزیر ۔۔۔ گیا اُس کے والد کنے بے نظیر
کہا باپ کو اُس کے اے خیر خواہ ۔۔۔ مرا بھائی ہے اک فیروز شاہ
سو میں تجھ سے رکھتا ہوں اک التجا ۔۔۔ کہ تو اس کو فرزندی میں اپنی لا
غرض ہر طرح کر رضامند اُسے ۔۔۔ کیا حال پہ اپنے پابند اُسے
پری زاد تھا وہ فیروز شاہ ۔۔۔ دیا اُس کو نجم النسا سے بیاہ
پھرے دن تو اپنے وطن کو پھرے ۔۔۔ وہ آشفتہ بلبل چمن کو پھرے
خوشی سے لیے حرمت و جان و مال ۔۔۔ چلے شہر کو اپنے وہ حال حال
وہیں باپ ماں کو تھی سہرے کی چاہ ۔۔۔ دوبارہ انہوں نے کیا اُن کا بیاہ
لکھوں گر میں اس بیاہ کی دھوم دھام ۔۔۔ تو پھر یہ کہانی نہ ہووے تمام
ہوا شہر پہ فضلِ پروردگار ۔۔۔ وہی شاہزادہ وہی شہریار
مرے ایک مشفق ہیں مرزا قتیلؔ ۔۔۔ کہ ہیں شاہراہِ سخن کے دلیل
انہوں نے شتابی اُٹھا کر قلم ۔۔۔ یہ تاریخ کی فارسی میں رقم
بگوشم ز ہاتف رسید ایں ندا ۔۔۔ بریں ۱۱۹۹ مثنوی باد ہر دل فدا
میاں مصحفیؔ کو بھایا یہ طور ۔۔۔ انہوں نے بھی کی فکر از راہِ غور
کہی اس کی تاریخ یوں برمحل ۔۔۔ یہ بت خانۂ چین ہے بے بدل

(۲) دوسری مثنوی گلزار رام ہے جس کو گارساں ڈیٹاسی اور بلومہارڈ نے غلطی سے

ہ گلزار رام تاریخی نام ہے ۱۲

مثنوی سحر البیان کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔ یہ بالکل دوسری چیز ہے اور ۱۱۹۲ھ مطابق ۱۷۷۸ء میں تصنیف ہوئی اس میں جیسا کہ اوپر لکھا گیا شاہ مدار کے میلہ کی چھڑیوں کا مفصل حال لکھا ہے اور مثل مثنوی سحر البیان کے اس میں بھی اُس زمانہ کے مختلف رسم و رواج زنانہ لباس شادی بیاہ ناچ رنگ وغیرہ کے دلچسپ حالات موجود ہیں۔ اس میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی بہت تعریف کی ہے نمونہ آخر میں موجود ہے۔

(۳) رموز العارفین۔ اس کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا۔ مگر خود میر حسن نے اپنے تذکرۃ الشعراء میں کیا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بعض مثنویاں بتائی جاتی ہیں جو اب ناپید ہیں[1]۔ انہوں نے کئی ہجویں بھی لکھیں مثلاً ہجو عظیم کشمیری۔ ہجو قصاب۔ نقل کلاونت ہجو مکان وغیرہ یہ سب ہجویں نہایت پُر لطف اور مہذب زبان میں لکھی گئی ہیں۔

میر حسن نے مختلف اشخاص کی تعریف میں قصائد بھی لکھے جن میں سے سات قصیدے موجود ہیں۔ میر صاحب موصوف قصیدہ کے مردِ میدان نہ تھے مگر پھر بھی کچھ قصائد ملتے ہیں۔

مراثی چند مرثیے اور سلام بھی انہوں نے تحریر فرمائے جیسا کہ ان کے تذکرہ سے پایا جاتا ہے۔ اس صنف کی تکمیل و ترقی اُن کے پوتے کے زمانے میں بخوبی ہوئی۔

تذکرۃ الشعراء یہ تذکرہ فارسی میں ہے اور اس میں تقریباً تین سو شاعروں کا ذکر ہے اس کا سال تصنیف کہیں مذکور نہیں مگر ان تاریخوں سے جو خود تذکرہ میں موجود ہیں ۱۱۹۲ھ بہت قرین قیاس معلوم[2] ہوتا ہے اور یہ وہ سن تھا جبکہ مرزا رفیع سودا کی عمر ۷۰ برس کی

---

[1] تمام مثنویاں اور متعدد مجموعے چھپ رہے ہیں۔ ناضل

[2] مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی تذکرۂ شعرائے اُردو کے فاضلانہ مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ کہ واضح رہے کہ یہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا۔

تھی۔ مصنف نے اس کو تین دوروں پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور اُن شعرار کا جو فرخ سیر سے پیشتر گزرے۔ دوسرا اُن کا جو فرخ سیر کے بعد محمد شاہ کے زمانہ تک ہوئے اور تیسرا خود اپنے معاصروں کا۔ بڑی خوبی اس تذکرہ کی یہی ہے کہ اکثر ہمعصر شعرار کا اس میں حال ملتا ہے جو گو کہ بہت مفصّل نہیں مگر پھر بھی نہایت دلچسپ اور کارآمد ہے۔

مختصر یہ کہ میرحسن ایک شاعر شیریں بیان تھے ان کا کلام نہایت سادہ فصیح اور عاشقانہ ہوتا تھا اور ان کی مثنوی سحرالبیان تو ایک معرکۃ الآرا اور بے نظیر تصنیف ہے جس سے اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آخر میں مثنوی گلزارِ ارم سے اور کچھ متفرق اشعار قصائد و ہجو وغیرہ کے بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

مثنوی گلزارِ ارم سے لکھنؤ کی مذمّت

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں
نہ دیکھا کچھ بہارِ لکھنؤ میں

کیا تھا غم نے ازبس دل پہ ڈیرا
لگا اِس جا پہ ہرگز دل نہ میرا

بہت ہیں گرچہ اہل اللہ اس جا
وے جا گہ جو یہ ہو تو کریں کیا

زبس یہ ملک ہے بیہڑ پہ بستا
کہیں اُونچا کہیں نیچا ہے رستا

کسی کا آسماں پر گھر ہوا ہیں
کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں

تہیں ہے لکھنؤ یہ ہے زمانا
زمانے نے یہ عبث رکھنا بہانا

عجب ہے یاں کی رسم و راہ گندی
گہے پستی ہے اور گاہے بلندی

زبس گنجان ہے یہ شہر باہم
سما سکتا نہیں یاں غیر کا دم!

ہر اک کوچہ یہاں کا تنگ تر ہے
ہوا کا بھی بہ مشکل یاں گزر ہے

فیض آباد کی تعریف

یہ دیکھی میں نے جب کیفیّت شہر مرے اک روز جی میں آئی یوں لہر
کہ کیجے سَیرِ فیض آباد جا کر چلا مَیں یاں سے اپنا دل اُٹھا کر
جونہی داخل ہوا میں اُس نگر میں کھُلا جنّت کا دروازہ نظر میں
عجب معمُورۂ آباد پایا مثالِ گل ہر اک دل شاد پایا

فیض آباد سے مراجعت پر نہایت افسوس ظاہر کرتے ہیں۔

نہ تھی معلوم مجھ کو یہ جُدائی قضا پھر لکھنؤ میں مجھ کو لائی
بُرا دن سَر سے قسمت نے نہ ٹالا مجھے جنّت سے جُوں آدم نکالا
دُعا میری یہی ہے اب شب و روز کہ پھر دیکھوں وہی روئے دل افروز
وہی ہو شہر اور وہ باغ و گلزار وہی صحبت ہو اور وہ ساتھ کے یار
پھر دل میں چہچہے کرتا جہاں میں غزل خوانی کروں جا اس مکاں میں
رہیں میری غزل خوانی میں شامل رجب بیگ و حبیب اللہ فاضل

رباعی کا نمونہ

ظاہر بھی تو ہے اور نہاں بھی تو ہے معنی بھی تو ہے اور بیاں بھی تو ہے
دونوں عالم میں تجھ سوا کوئی نہیں یاں بھی تو ہے اور واں بھی تو ہے

ولہ

کیا وحش و طیور و انس و جاں عالم میں جو ہیں سو حسن روتے ہیں وہ اس غم میں
روشن نہ سمجھ ضریح پر قندیلیں جلتے ہیں یہ دل حسینؑ کے ماتم میں

ہجو کا نمونہ اپنے گھر کی حالت

ہم نے جب سے لیا ہے یاں ونگ گھر ڈُو رد پیہ کے تئیں کرائے پر

بان سے ہیں بتنگ اس میں لوگ — گھر نہیں ہے وہ ایک جان کا روگ
پہلے اس گھر کی خوبی یہ پائی — آتے ہی گھر میں مجھ کو تپ آئی
کلّہ آماس کر گیا سارا — پہلے ہی مجھ پہ گھر نے منہ مارا
وہ مثل ٹھیک ہے یہاں فی الحال — پہلے منہ چومتے ہی کاٹا گال
صحن اُس کا بتاؤں کس مقدار — ایک دو تین چار پائی دار !
پانچ بتّی کا کہنہ سا چھپّر ! — ساتھ سایہ کے دھوپ آٹھ پہر
نو کا یا دس کڑی کا اک دالان ! — تس پہ اِک ٹوٹے جھونپڑے کی نشان
سیڑھی اک بانس کی پرانی سی — آنے جانے کے واسطے ہے دھری
نہ تو مطبخ نہ واں مکان ضرور — دونوں باتوں کا واں نہیں دستور
ایک چوکی دھری ہے صحن کے بیچ — صحن میں ساری جا ضرور کی کیچ !
تس پہ دو ٹٹیاں پرائے اوٹ — وہ کہ جاویں ہوا سے خاک میں لوٹ
ڈیوڑھی کا بند کیجیے جب در — بیٹھیے جا ضرور تب جا کر
آنے والا جو کوئی آجاوے — دیکھ دروازہ بند پا جاوے
یعنی در جو کھلا نہیں پایا — کوئی ہے جا ضرور کو آیا
گھر میں ہیں دھوپ سے کباب سبھی — گھر سے نکلے نہ آفتاب کبھی
ٹوٹا پھوٹا جلا بھنا سارا — دھوپ سے گرم جیسے انگارا
چیز آبی و بادی اس میں کم — زور خاکی و ناری کا ہے بہم
یاں کنوئیں بھی نہیں مزا ہے یہ — کس کا یہ گھر ہے کیا بلا ہے یہ
خوب یاں کا کھلا جو ہم پہ بھید — چاہ کی جا ہے چشمۂ خورشید
دن کو آنکھوں میں بھرتے ہیں پانی — رات پلکوں سے قطرہ افشانی
گرد میں صورتیں اٹی ہیں سب — مٹی کی مورتیں بنی ہیں سب

کپڑے جھاڑتے ہیں ہم لیل و نہار — دھوبی دھوتے ہیں جیسے دے دے مار
تکیئے رہتے ہیں اس طرح میلے — جوں تیمم کی خاک کے تھیلے
طاق پر تھے جہاں جہاں جزدان — ہو گئے کل وہ کوہ ریگستان
خاک بھر بھر کے یوں ہوئی ہے دوات — جیسے آندھی میں ہو اندھیری رات
تھے دھرے وہ جو خاص و عام قلم — ریگ ماہی ہوئے تمام قلم
جھاڑتے جھاڑتے بیاض و کتاب — حرف مٹ مٹا کے ہو گئے خراب
صاف آثار نہ کوئی سانے گا! — خوب جب تک نہ خاک چھانے گا
کیا کہیں کس طرح سے جیتے ہیں — خاک کھاتے ہیں تیج پیتے ہیں!

قصیدہ کا رنگ یہ ہے:-

کون بدمست گل اندام چمن میں ہے مقیم — جس کی بُو دوش پہ اپنے لیئے پھرتی ہے نسیم
نوش ادا کون یہ مستانہ پھرے ہے جس کے — نقش پا سے گل نرگس کو کرے دام شمیم
عرق شبنم گل کس پہ چھڑکتا ہے گلاب — عندلیبوں کا ہوا رشک سے دل کس کے دو نیم
کون انگڑائیاں لیتا ہے چمن میں مخمور — غنچہ بھر بھر کے گلابی جو کرے ہے کیوں تقسیم
شاید اس باغ میں ہے آصفِ دوراں کا گزر — کہ ہے وہ ابنِ کریم ابنِ کریم ابنِ کریم
آصف الدولہ بہادر ہے وزیرِ اعظم — نائبِ ظلِ الٰہ صاحب تاج و دیہیم!

میر تقی میر میر محمد تقی نام، میر تخلص۔ ریختہ گویانِ ہند کے اُستادِ اعظم شاعرانِ اُردو کے رہبرِ مسلّم۔ ادب و زبان دانی کے ماہرِ فن، خوش گو، خوش بیان، شیریں سخن۔ تذکروں میں والد کا نام میر عبد اللہ لکھا ہے مگر ذکرِ میر میں میر صاحب نے کوئی نام نہیں لکھا البتہ یہ تحریر کیا ہے کہ "میرے والد نے جو میرے دادا کے چھوٹے بیٹے تھے۔

؎ کلب علی فائق ۱۱۳۶ھ میں ولادت کا تخمینہ بتاتے ہیں۔ دیکھیے دستور الفصاحت نام اور دوسرے اختلافات وغیرہ۔ فاضل

درویشی اختیار کی اور ترک دنیا کر کے بیٹھ رہے۔ شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی سے علم ظاہری و معنوی کا استفادہ کیا جوان صالح و عاشق پیشہ تھے اس لیے علی متقی کے عرف سے مشہور ہوئے۔" چونکہ ان کا نام تحریر نہیں ہے لہذا ممکن ہے کہ نام میر عبداللہ ہی ہو۔ اپنے بزرگوں کی نسبت میر صاحب تحریر فرماتے ہیں: "میرے بزرگ زمانے کی نامساعدت سے اپنی قوم و قبیلہ کے ساتھ حجاز سے روانہ ہو کر سرحد دکن میں پہنچے۔ وہاں سے وہ احمد آباد، گجرات میں وارد ہوئے بعض تو اُن میں سے وہیں رہ گئے اور بعض تلاش معاش کے لیئے نکل کھڑے ہوئے۔ چنانچہ میرے جدِّ کلاں نے اکبر آباد میں توطن اختیار کیا مگر ناسازگاری آب و ہوا سے راہی عدم ہوئے۔ ایک فرزند چھوڑا جو میرے دادا تھے۔ وہ اکبر آباد کی فوجداری پر سرفراز ہوئے۔ پچاس سال کی عمر میں علیل ہوئے اور ابھی پوری صحت نہ ہوئی تھی کہ گوالیار گئے اور چند ہی روز کے بعد اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کو کچھ خلل دماغ تھا اور وہ جوان مر گیا۔ چھوٹے بیٹے میرے والد تھے جو علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔" میر صاحب نے ان کے چند قصّے بیان فرمائے ہیں۔ درویش صفت تھے۔ ایک دفعہ لاہور چلے گئے اور وہاں ایک فقیر جس نے مکر و فریب کا جال پھیلا رکھا تھا۔ اس سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ پھر وہ دلّی آئے وہاں اُن کی بڑی قدر ہوئی۔ وہاں سے بیانہ پہنچے۔ ایک نوجوان سید پر اُن کی نظر پڑی جو خلوص کے ساتھ اُن کا معتقد ہو گیا۔ وہاں سے آگرے آئے اور خانہ نشین ہو گئے۔ وہ نوجوان سید بھی اُن کی تلاش میں آگرہ پہنچا اور وہیں رہ پڑا۔ اُن کا نام سید امان اللہ تھا اور میر تقی اُن کی عزّت کرتے تھے۔ میر صاحب کی تربیت میں اُن کو بڑا دخل تھا۔ میر صاحب ان کو اچھے کہتے تھے اور ذکر میر میں ہمیشہ عم بزرگوار کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ دن رات اُنہی کے پاس اور ان کی تمام تربیت سید صاحب

کے زیرِ نظر ہوئی۔ سیّد امان اللہ کا جب انتقال ہوا تو میر صاحب دس برس کے تھے۔ میر صاحب اور اُن کے والد کو اُن کے مرنے کا سخت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اُن کے والد بھی بخار میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے میر صاحب سے بڑی بے مروّتی کی اور باپ کے کُل ترکہ پہ قبضہ کر لیا۔ اس صغر سنی میں میر صاحب اپنے چھوٹے بھائی محمد رضی کو اپنی جگہ چھوڑ کر خود تلاشِ معاش میں مصروف ہوئے لیکن کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ ناچار وطن کو خیرباد کہہ کر شاہجہاں آباد دہلی پہنچے۔ خواجہ محمد باسط جو صمصام الدولہ امیر الامراء کے بھتیجے تھے اُن کو نواب کے پاس لے گئے اور میر صاحب وہاں ملازم ہو گئے۔ نواب صاحب نادر شاہ کی جنگ میں مارے گئے اور میر صاحب کی ملازمت جاتی رہی۔ میر صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد آگرہ واپس آ گئے۔ مگر جب گذر اوقات کی کوئی معقول صورت نظر نہ آئی تو پھر دلّی کا رُخ کیا اور اپنے بڑے بھائی کے خالو، سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں جا کر ٹھہرے اور کچھ دنوں اُن کے پاس رہے۔ مگر بڑے بھائی کی تحریک پر خان آرزو نے میر صاحب کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کی۔ اس سے میر صاحب کو اس قدر صدمہ ہوا کہ مکان کے اندر دروازے بند کیے پڑے رہتے اسی وجہ سے ان کی حالت جنوں کی سی ہو گئی۔ حکیم فخر الدین خاں نے علاج کیا اور رفتہ رفتہ وہ حالت جاتی رہی۔ بعدہٗ ایک بزرگ میر جعفر نامی سے کچھ تعلیم حاصل کی اور سیّد سعادت علی خاں نے ان کو ریختہ میں شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی۔ اُدھر خان آرزو درپے آزار تھے۔ ایک روز مجبوراً میر صاحب اُن کے مکان سے نکل گئے۔ مگر خوبیٔ قسمت سے ایک رئیس رعایت خاں نامی نے اُن اپنا مصاحب بنا لیا۔ اور اس طرح تنگ دستی سے گونہ نجات ملی۔ جب احمد شاہ دُرّانی کو سرہند میں شکست ہوئی تو میر صاحب بھی رعایت خاں کے ساتھ شریک تھے اور جو خدمت

اُن کے لائق ہوئی اُس کو انجام دیا۔ رعایت خاں کے ساتھ میر صاحب نے قصبۂ سانبھر کی سیر کی جو اجمیر کے قریب واقع ہے اور جب رعایت خاں اور راجہ رنجیت سنگھ میں شکر رنجی ہو گئی تو میر صاحب نے صفائی کی کوشش کی۔ ذرا سی بات پر رعایت خاں کی ملازمت ترک کر دی مگر اُس نے ان کی دوستی کا حق خوب نبھایا اور محمدؐ رضی میر صاحب کے چھوٹے بھائی کو اپنے یہاں نوکر رکھ لیا۔ چند دِنوں کے بعد میر صاحب نواب بہادر کے یہاں ملازم ہو گئے اور روہیلوں کی جنگ میں اُس اطراف کی سیر کی۔ جب صفدر جنگ نے نواب بہادر کو دغا سے قتل کر ڈالا تو میر صاحب بے کار ہو گئے لیکن چند ہی روز بعد مہا نرائن دیوان کی سرکار سے متوسل ہو گئے۔ اُسی زمانے میں میر صاحب نے خان آرزو اپنے خالو کی ہمسائیگی چھوڑ دی اور امیر خاں کی حویلی میں رہنے لگے۔ سکندر آباد کی لڑائی میں میر صاحب احمد شاہ کے ساتھ تھے۔ راجہ جگل کشور کے توسل سے مہاراجہ ناگر مل سے ملے۔ اور پھر کچھ دنوں بعد اُن کے بیٹے نے اُن کی کچھ تنخواہ مقرر کر دی۔ میر صاحب اُن کے خانہ باغ میں دو پہر رات تک موجود رہتے۔ مشاہرہ معقول ہونے سے کسی قدر فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔ خانہ جنگیوں سے دِلّی کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ اسی میں میر صاحب کا مکان بھی خاک میں مل گیا۔ اور سب مال و اسباب لُٹ گیا۔ اس لُوٹ مار کے بعد میر صاحب مع متوسلین کے دہلی سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور کچھ دنوں برسانہ ضلع متھرا میں قیام کر کے کمہیر پہنچے جو سورج مل جاٹ کا قلعہ تھا اور بہادر سنگھ یہاں سے بڑی مدارات سے پیش آئے اور سورج مل کے طویلے میں جو خانہ خرابانِ دِلّی کا مامن بن گیا تھا اعظم خاں سے ملاقات ہوئی۔ میر صاحب کے بیٹے میر فیض علی بھی یہاں اُن کے ہمراہ تھے۔ راجہ سورج مل چھوٹے بیٹے نے میر صاحب کے واسطے کچھ ساز و سامان مہیا کر دیا اور خود سورج مل نے روزینہ مقرر کر دیا۔ چند دنوں

بعد میر صاحب پھر دلّی واپس آئے مگر گھروں کو خراب اور شہر کو ویران پایا۔ سورج مل کے ساتھ تیس سال کے بعد میر صاحب اکبر آباد پہنچے اور اپنے والد اور عم بزرگوار کی قبروں کی زیارت۔ اُن کے شعر و سخن کا شہرہ اب عالم گیر ہو چکا تھا۔ چار مہینے وطن میں رہ کر سورج مل کے قلعہ میں آ گئے۔ کچھ دنوں بعد پھر اکبر آباد آئے اور پندرہ روز رہ کر پھر واپس چلے آ گئے۔ جاٹوں کی لوٹ مار سے راجہ ناگر مل مع اپنے ہمراہیوں کے کاماں چلے گئے جو راجہ پرتھی سنگھ پسر مادھو سنگھ کا سرحدی مقام تھا میر صاحب بھی اُن کی معیّت میں تھے اور بوجہ ملازمت اسی شہر میں چند دن اقامت گزیں ہوئے مگر تھوڑے عرصہ کے بعد ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ راجہ نے میر صاحب کو حسام الدین کے پاس بھیجا اور میر صاحب نے اُن کی طرف سے سب عہد و پیمان کیے مگر راجہ بادشاہ کے لشکر میں جو فرخ آباد میں تھا نہیں گیا۔ اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ناچار میر صاحب بھی اس کے ہمراہ ہو گئے اور دہلی پہنچے۔ اہل و عیال کو عرب سرائے میں چھوڑا اور راجہ سے جُدا ہو گئے۔ سرداروں کے اغوا سے بادشاہ نے مجبور ہو کر ضابطہ خاں پر حملہ کیا۔ میر صاحب بھی اس حملہ میں بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ ضابطہ خاں بے لڑے بھاگ گیا۔ میر صاحب چونکہ بے روزگار تھے تلاش معاش میں نکلے۔ وجیہ الدین خاں برادر خورد حسام الدولہ سے ملے اور اُس نے کچھ مقرر کر دیا۔ میر صاحب اِن دنوں خانہ نشین تھے۔ بادشاہ عالم گیر ثانی اِن کو اکثر طلب فرماتے مگر وہ کبھی نہ گئے۔ ابو القاسم خاں اور عبد الاحد خاں کا چچا زاد بھائی میر صاحب کے ساتھ اس زمانہ میں سلوک کرتے رہے۔ کبھی کبھی وہ اُن سے ملاقات کو جاتے اور بادشاہ بھی کبھی کبھی کچھ بھیج دیتے تھے اور حسن رضا خاں بھی میر صاحب کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آتے تھے۔

روانگی لکھنؤ

لکھنؤ کی روانگی کے حالات میر صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں "فقیر خانہ نشین

تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے۔ لیکن بے سروسامانی سے مجبور تھا۔ میری عزّت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے نواب الممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک نے چاہا کہ میرؔ میرے پاس آجائے تو اچھا ہو۔ چنانچہ میری طلبی کے لیے نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں موتمن الدولہ نے جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے، ان قدیم تعلقات کی وجہ سے جو میرے خالو سے تھے کہ اگر نواب صاحب از راہ عنایت کچھ زادِ راہ عنایت فرمائیں تو البتہ میر صاحب یہاں آسکتے۔ نواب صاحب نے حکم دیا اور انہوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے خط لکھا کہ نواب والا جناب آپ کو یاد کرتے ہیں۔ جس طرح ہو سکے آپ یہاں آجایئے۔ میں پہلے ہی دل برداشتہ بیٹھا تھا خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا چونکہ خدا کی یہی مرضی تھی میں بے یار و مددگار بغیر قافلہ اور رہبر کے فرخ آباد کے رستے سے گذرا۔ وہاں کے رئیس مظفر جنگ تھے۔ انہوں نے ہر چند چاہا کہ کچھ روز وہاں ٹھہر جاؤں مگر میرے دل نے قبول نہیں کیا۔ دو ایک روز بعد روانہ ہو کر منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ اوّل سالار جنگ کے یہاں گیا۔ انہوں نے میری بڑی عزّت کی اور جو کچھ مناسب تھا بندگانِ عالی کی جناب میں کہلا بھیجا۔ چار پانچ روز بعد اتفاقاً نواب مرغوں کی لڑائی دیکھنے کے لیے تشریف لائے میں بھی وہاں حاضر تھا، ملازمت حاصل کی۔ محض فراست سے دریافت فرمایا کہ کیا تم میر تقی ہو؟ اور نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ نشست کے مقام پر لے گئے اپنے شعر مجھے مخاطب کر کے سنائے۔ سبحان اللہ کلام الملوک ملوک الکلام۔ اس کے بعد فرطِ مہربانی سے مجھ سے کچھ پڑھنے کی فرمایش کی۔ اُس روز میں نے اپنی غزل کے صرف چند شعر عرض کیے رخصت کے وقت نواب سالار جنگ نے کہا کہ اب میر صاحب حسب الطلب حاضر ہو گئے ہیں۔ بندگانِ عالی مختار ہیں انہیں کوئی جگہ عنایت فرمادی جائے جب مرضی مبارک ہو یاد فرمائیں۔ فرمایا کہ میں کچھ مقرر کر کے آپ کو اطلاع دوں گا۔ دو تین روز بعد یاد فرمایا۔ حاضر

ہوا اور جو قصیدہ مدح میں کہا تھا پڑھا۔ سماعت فرمایا اور کمال لطف کے ساتھ اپنے ملازموں کے سلسلے میں داخل فرمایا اور ہمیشہ میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے رہے۔"

میر صاحب نے لکھنؤ میں زندگی آرام کے ساتھ بسر کی۔ نواب آصف الدولہ جب شکار کے لیے بہرائچ تک گئے تو میر صاحب بھی ہم رکاب تھے۔ اس کی یادگار میں شکار نامہ موزوں کیا دوسری دفعہ نواب کوہ شمالی کے دامن تک گئے۔ انہوں نے دوسرا شکار نامہ کہہ کر حضور میں پیش کیا۔ اس شکار نامہ کی دو غزلوں کی نواب نے بطور مخمس تضمین فرمائی۔

آخر میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں میرا مزاج ناساز رہتا ہے یاروں کی ملاقات ترک کر دی ہے۔ بڑھاپا آپہنچا اور عمر عزیز ساٹھ سال کی ہو گئی۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں۔ کچھ دنوں آنکھ کے درد کی تکلیف اُٹھائی۔ ضعف بصر کی وجہ سے عینک لگائی۔ دانتوں کے درد کا کیا ذکر کروں۔ آخر دل کڑا کر کے ایک ایک کو جڑ سے اکھڑوا دیا۔ غرض کہ ضعف قویٰ۔ بے دماغی۔ ناتوانی۔ دل شکستگی۔ اور آزردہ خاطری سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ زندہ نہ رہوں گا۔ اور زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ بس آرزو اتنی ہے کہ خاتمہ بخیر ہو۔[1]

میر صاحب کی عمر میر صاحب کی عمر میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ سو برس کی عمر پائی۔ اُن کی وفات کا سال تحقیق سے معلوم ہے تاریخ کے مشہور مصرعہ تاریخ ع "واویلا مُردشہ شاعراں" سے سنہ وفات بارہ سو پچیس ہجری نکلتا ہے۔ تذکرہ جہاں میں میر صاحب کی عمر ۸۰ سال تحریر ہے مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ۱۲۰۹ھ میں جبکہ وہ اپنا تذکرہ قلمبند کر رہے تھے۔ میر صاحب کا سن اسی ۸۰ سے متجاوز ہو چکا تھا۔ مگر یہ قیاس پر زیادہ تر مبنی ہے۔ کتاب ذکر میر کی تاریخ جو ایک قطعہ سے نکالی ہے۔

[1] ملخص از ذکر میر مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب (رسالہ اُردو اورنگ آباد دکن اپریل ۱۹۲۶ء)۔

۱۱۹۷ھ ہوتی ہے۔ کتاب کے اختتام پر میر صاحب نے اپنی عمر ۶۰ سال بتائی ہے ان کی تاریخ پیدائش تقریباً ۱۱۳۷ھ ہوئی۔ نادر شاہ کا حملہ ۱۱۵۱ھ میں ہوا تھا اس وقت ان کی عمر صرف ۱۴ یا ۱۵ سال کی ہو گی۔ اگر پیدائش کا سن ۱۱۳۷ھ ہو تو میر صاحب کی عمر ۸۸ یا ۸۹ سال کی ہوتی ہے۔

ذکرِ میر
۱۱۹۷ ہجری

میر صاحب کی زندگی کے متعلق ابھی تک صحیح حالات بہت کم معلوم ہوئے۔ ڈاکٹر اسپرنگر لکھتے ہیں کہ "جب میں ۱۸۴۸ء لغایت ۱۸۵۰ء میں شاہان اودھ کے کتب خانوں کی فہرست مرتب کر رہا تھا تو میں نے موتی محل میں ایک قلمی نسخہ میر صاحب کی خود نوشتہ سوانح عمری موسوم بہ ذکرِ میر کا دیکھا جو زبان فارسی میں ہے اور ضخامت ۱۵۲ صفحات کی ہے"۔ یہ کتاب ابھی تک نایاب تھی مگر اب دستیاب ہو گئی ہے اور انجمن ترقی اردو حیدر آباد کی طرف سے چھپ گئی ہے۔ لکھنؤ میں بھی ایک کتاب قلمی نسخہ سید مسعود حسن رضوی کے پاس موجود ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سی نئی نئی باتیں میر صاحب کے حالاتِ زندگی کے متعلق دریافت ہو گئیں۔ اور اکثر بے بنیاد اور فرضی افسانوں کا جو میر صاحب کے متعلق بعد کے تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں خاتمہ ہو گیا۔ اکثر ظنی اور بے بنیاد باتیں جو عوام الناس میں مشہور تھیں، معاصر تذکرہ نویسوں نے بغیر تحقیق کیے قلمبند کر دیں۔ اور اُن کو بعد کے لوگوں نے مستند تسلیم کر کے اور زیادہ چمکایا۔ افسوس ہے کہ ذکرِ میر میر کی ادبی زندگی پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتی اور نکات الشعرا میں میر نے اپنے متعلق سوائے اس کے اور کچھ نہیں لکھا، "مؤلف این نسخہ متوطن اکبر آباد ست بسبب گردش لیل و نہار انچندے در شاہجہان آباد ست"۔ یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۵ھ میں مرتب ہوا۔ ذکرِ میر میں میر صاحب نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند فرمائے ہیں۔ اپنے زمانے کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے بھی کتاب خاص وقعت رکھتی ہے۔ نادر شاہ کی جنگ سے

لے کر ضابطہ خاں کے قتل تک کے واقعات موجود ہیں۔ یعنی ۱۱۵۱ہجری سے لے کر ۱۱۹۷ھ تک کی تاریخ ہے اور اُس زمانے کے واقعات پر روشنی ڈالتی ہے۔ ابھی تک مؤرخین کو اس کتاب کا پتہ نہ تھا اور یہ کتاب تاریخی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ دہلی کی خانہ جنگیاں۔ مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں و افغانوں کی لڑائیاں۔ نوابانِ اودھ کے معرکے۔ انگریزوں کے مورچے۔ عمائدین شہر کی سازشیں اہل ہنود و مسلمانوں کے ناخوش گوار تعلقات سب کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ چونکہ اس زمانے کی بہت سی تاریخیں ہیں لہذا واقعات کی تصدیق یا تردید ہوسکتی ہے۔ میر صاحب خود بہت سی مہموں میں شریک تھے۔ افسوس ہے کہ میر صاحب نے اُس زمانے کے لٹریری پہلو پر بہت کم روشنی ڈالی ہے۔ شعرا کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ ادبی زندگی کے حالات مفقود ہیں۔

سیادت میں اختلاف تذکرہ شورش میں ہے (جس کا سنہ تالیف گیارہ سو ترانوے ہے جب کہ میر صاحب حیات تھے اور دلّی میں مقیم تھے) کہ میر صاحب فی الحقیقت سیّد نہ تھے بلکہ میر تخلّص ہونے کی وجہ سے سیّد خیال کیے جانے لگے۔ تذکرۂ آبحیات میں ہے کہ کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سُنا ہے کہ جب انہوں نے میر تخلص کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو ایک دن خواہ مخواہ سیّد ہو جاؤ گے۔ اُس وقت انہوں نے خیال نہ کیا۔ رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔ پھر سوداؔ کے ایک قطعہ کا حوالہ دیتے ہیں جس کا آخری شعر یہ ہے۔

میری کے اب تو سارے مسالے ہیں مستعد
بیٹا تو گند نا ہے اور آپ کو تھمیر

مگر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ قطعہ سوداؔ کے کلیات میں نہیں ہے اور پھر آگے خود کہتے ہیں کہ میر صاحب کی سیادت[۱] میں شبہ نہ کرنا چاہیئے اگر وہ سیّد نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے

---

[۱] دیکھیے فٹ نوٹ صفحہ ۱۹۸۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں   اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب کی سیادت کے متعلق کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا اس وجہ سے کہ اپنی سیادت کا اشارہ انھوں نے اپنے اکثر اشعار میں کیا ہے۔ ذکرِ میر نے اس امر کا قطعی طور پر فیصلہ کر دیا ہے۔ میر صاحب اپنے والد کا ذکر ہر جگہ میر علی متقی کے نام سے کرتے ہیں۔ اپنا نام اپنے والد و بزرگوں کی زبانی میر محمد تقی لکھا ہے۔ اپنے بیٹے کا نام میر فیض علی لکھا ہے یہ روایت غلط ہے کہ جب انھوں نے میر تخلص اختیار کیا تو اُن کے والد نے منع کیا کیونکہ والد کی وفات کے وقت میر صاحب کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ کی نہ تھی اور اُس وقت شعر نہیں کہتے تھے: میر صاحب کا مذہب شیعہ تھا مگر ایسا تنگ نہیں جو دوسروں کے لیے ناگواری کا باعث ہو۔" آزاد نے اپنی نہایت

لہ مصنف آبِ حیات نے میر صاحب کی سیادت کے متعلق ایسے الفاظ میں لکھا ہے جن سے ان کے سید ہونے میں شبہ بھی پایا جاتا ہے اور آگے چل کر اپنے اس شبہ کی خود ہی تردید بھی کر دی ہے۔ افسوس ہے انھوں نے ایک غیر معتبر روایت "کہن سال بزرگوں کی" زبانی نقل کر دی کہ جب میر صاحب نے میر تخلص کیا، تو اُن کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو ایک دن خواہ مخواہ سید ہو جاؤ گے۔ اس زبانی اور غیر موثق روایت کے علاوہ سودا کا وہ قطعہ بھی پیش کرتے ہیں جس کے ایک شعر میں میر صاحب کی سیادت کے متعلق مذاق اُڑایا گیا ہے مگر خود ہی اس پیش کردہ شہادت میں شبہ پیدا کرتے ہیں کہ یہ قطعہ سودا کے کلیات میں نہیں ہے اور آگے چل کر اپنی رنگین عبارت میں میر صاحب کی مسکینی و غربت اور صبر و قناعت وغیرہ کا اظہار کر کے ادائے شہادت کرتے ہیں کہ ان کی سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیے۔ یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی۔ اس وجہ سے کہ پہلے خود ہی شبہ کیا پھر اُس شبہ کی آپ ہی تردید کی۔ اس کے علاوہ شروع مضمون میں جہاں میر صاحب کے خاندان کا ذکر ہے اُن کو "خلف میر عبد اللہ" لکھتے ہیں یعنی ان کے والد کی بھی سیادت کے قائل ہیں۔ اسی طرح مضمون کے آخر میں میر صاحب کے بیٹے کا نام میر عسکری عرف "میر کلو" بتاتے ہیں ۱۲۔

قابلِ قدر، مگر واقعات کے اعتبار سے کسی قدر غیر معتبر تصنیف (آبِ حیات) میں بعض غلط بیانیاں بھی کی ہیں۔ مثلاً بعض ایسے قصّے اور اقوال میر صاحب کی طرف منسوب کیے ہیں جن سے ان کی بددماغی اور نازک مزاجی کا اظہار ہوتا ہے مثلاً وہ واقعہ جس میں میر صاحب کے سفرِ دِلّی کا ذکر کیا ہے۔ اور میر قمرالدّین منّت اور سعادت یار خاں رنگین کی شاگردی کے متعلق۔ افسوس ہے کہ ان واقعات کی تصدیق نہیں کرلی گئی اپنی کتاب کو دِل چسپ بنانے کی غرض سے بہت سے بے بنیاد قصّے اور سُنے سُنائے واقعات بلا تحقیق (ممکن ہے بعض غلط تذکرہ نویسوں کی تقلید کے خیال سے) داخل کر دیے۔ الحمد للّٰہ کہ نکات الشعراء کے شایع ہو جانے اور دیگر معاصرین میر کے تذکروں کے دستیاب ہونے سے اکثر مشکوک واقعات اب صاف ہو گئے۔

نکات الشعراء کے متعلق آبِ حیات ...

میں ہے کہ "نکات الشعراء شائق شعر کے لیے بہت مفید ہے۔ اس میں شعرائے اُردو کی بہت سی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے دیکھنے کے لائق ہیں مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ اُردو کا پہلا تذکرہ ہے اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا۔ ان ہزار میں ایک بے چارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ ولی کہ نبی شعراء کا آدم ہے اُس کے حق میں فرماتے ہیں۔ "ولے شاعریست از شیطان مشہور تر" مگر واقعات ان سب باتوں کی تردید کرتے ہیں۔ نکات الشعراء اب شایع ہو گئی ہے۔ اس کے دیباچہ میں یہ سب باتیں کہیں نہیں ہیں اور نہ اُس میں ایک ہزار شاعروں کا ذکر ہے بلکہ فی الحقیقت تقریباً سو شعراء کا حال ہے نہ اُن کے کلام کی تنقید میں سختی اور بددماغی سے کام لیا گیا ہے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی عبارت نہایت سلیس اور مبالغے اور استعارے وغیرہ سے پاک و صاف ہے۔ تنقید بھی نہایت مختصر اور زوردار الفاظ میں اور نہایت

نکات الشعراء

منصفانہ ہے۔ جہاں کہیں کسی شاعر کا حال زیادہ معلوم نہیں ہے تو صاف لکھ دیتے ہیں کہ فقیر کو اس کے حال سے آگاہی نہیں۔ یا اس قسم کا کوئی اور جملہ۔ درشت اور طنزیہ جملے کہیں کہیں ہیں مگر بہت کم۔ اور صرف اُسی صورت میں جب کہ کوئی شخص اُس کا مستحق فی الواقع ہے۔ ولی کی نسبت شیطان سے زیادہ مشہور والا فقرہ ہم کو کہیں نہیں ملتا بلکہ برعکس اس کے ان کی نسبت تو یہ لکھتے ہیں "کہ از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد" پھر میر صاحب کے مذہب کے متعلق آب حیات میں ہے کہ "میر صاحب کے ماموں حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ اس پر نازک مزاجی غضب غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے" یہ صحیح ہے کہ خان آرزو کے متعلق میر صاحب کی نازک مزاجی اور بد دماغی کا تذکرۂ نکات الشعراء میں کہیں پتہ نہیں چلتا بلکہ وہ تو اُن کو اپنا اُستاد و پیر و مرشد اور رہنمائے فن وغیرہ ایسے معزز الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ میر صاحب کو دیگر مذاہب کے ساتھ تعصب اور ناروا داری کا ہرگز خیال نہ تھا بلکہ وہ دیگر مذاہب کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے وہ علیحدگی جس کا ذکر مولانا آزاد نے کیا ہے۔ میر صاحب نے اس کے متعلق ذکرِ میر میں تحریر کیا ہے لیکن اُن کے کلام سے کہیں نہیں پایا جاتا کہ انہوں نے خان آرزو کے خلاف کوئی بدو شتی کی۔ ذکرِ میر میں سراج الدین علی خان آرزو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نادر شاہ کے حملے کے بعد پھر دہلی گیا اور اپنے بڑے بھائی کے خالو سراج الدین علیخان آرزو

لہ مولانا کی دشمنی میں یہ جوش کچھ علمی تحریر کے لئے زیب نہیں دیتا۔ بہت سے واقعات ماٰخذ میں موجود ہیں۔ کچھ مولانا کی روائتیں ہیں جو بزرگوں سے نقل کر دی ہیں۔ یہ فقرہ بھی قدرت اللہ قاسم کے تذکرے میں ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے تذکرہ قاسم چھپا اللہ اس نے پردے اٹھائے۔ میر پہ بہت کام ہوا ہے۔ اور بہت سے مسائل حل ہو گئے۔ حبیب الرحمان خاں، عبد الحق صاحب اور عسکری صاحب کے بے شمار اغلاط منظر عام پر آ گئے ہیں۔ مرتضےٰ

کا منت پذیر ہوا اور وہیں کچھ دن رہا اور شہر کے بعض صاحبوں سے چند کتابیں پڑھیں۔ جب میں کسی قابل ہوا تو بھائی صاحب (حافظ محمد حسن) کا خط پہنچا کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے۔ ہرگز اس کی تربیت میں سعی نہ کی جائے وہ عزیز (آرزو) واقعی دنیادار شخص تھا اپنے بھانجے کے لکھنے پر میرے درپے ہو گیا۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تو بلا وجہ برا بھلا کہنا شروع کر دیتے اور طرح طرح سے مجھے تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے میرے ساتھ ان کا سلوک ایسا تھا جیسا کسی دشمن سے ہوتا ہے۔" اس رنج و غم میں میر صاحب کی حالت جنون کی سی ہو گئی ایک روز خان آرزو نے میر صاحب کو کھانا کھانے کے لیے بلایا اور ناگوار وہ تلخ باتیں کرنا شروع کیں۔ میر صاحب بغیر کھانا کھائے اٹھ آئے شام کو اُن کے گھر سے چلے گئے اور پھر کچھ عرصے بعد اُن کی ہمسائگی بھی ترک کر دی۔ آرزو کے شجاع الدولہ کے پاس جانے کے بابت لکھتے ہیں کہ میرے خالو مادیہ بیمارے طمع ہوئے۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب دوسری بیوی سے تھے اور پہلی بیوی سے حافظ محمد حسن جن کے آرزو خالو تھے اور میر صاحب کے سوتیلے خالو ہوئے۔ انہوں نے میر صاحب کی کچھ پرورش ضرور کی اور تعلیم میں بھی کچھ حصہ لیا۔ نکات الشعرا میں خان آرزو کے کمالات کا اعتراف ہے اور ذکر میر میں خانگی تعلقات کا بیان۔ پھر آزاد کے بیان سے ایک جگہ مترشح ہوتا ہے کہ میر صاحب نے تخلص میر سوز سے لیا جو پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ یہ بھی ایک بے بنیاد دعویٰ ہے۔ کیونکہ میر صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں عرصہ سے یہ تخلص کرتا ہوں بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ جب سوز نے یہ دیکھا ہوگا کہ ان کے اچھے اشعار اُن کے ہم تخلص کی طرف منسوب کیے جائیں گے تو انہوں نے پہلا تخلص ترک کر کے سوز اختیار کیا ہوگا۔ خواجہ میر درد کی نسبت بھی میر صاحب نہایت عمدہ الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بہت ادب و عزت سے ان کا نام لیتے ہیں۔ مولانا آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ میر صاحب اُن

لوگوں کا ذکر جو دِلّی کے رہنے والے نہ تھے اور زبان اُردو سے اسی وجہ سے ناواقف تھے بہت حقارت کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی واقعہ کے خلاف ہے اس وقت سے کہ میر صاحب نے اکثر ایسے شعرا کی بہت کچھ تعریف کی ہے جو دلّی کے رہنے والے نہ تھے مثلاً میاں شرف الدین مضمون کی نسبت یہ دلچسپ الفاظ لکھتے ہیں: "متوطّن جاجمؤ کہ قصبہ ایست متصل اکبر آباد حریف ظریف، ہشاش بشاش، ہنگامہ گرم کن مجلسہا، ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ"۔

میر صاحب کا کیرکٹر — اس میں کوئی شک نہیں کہ قسّامِ ازل نے میر صاحب کو انتہا درجہ کی تمکنت، خود داری، اور ایک حسّاس طبیعت دی تھی۔ وہ اکثر رؤسا اور اُمرا کے ارتباط اور میل جول تک کو نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے کہ مبادا اس سے اِن کی خودداری پر حرف نہ آئے۔ وہ بے حد ضابطہ، کم گو، اور آزاد طبیعت واقع ہوتے تھے افلاس اور کم مائگی نے اُن کی عالی ظرفی کو اعلیٰ تر کر دیا۔

نازک دماغی — میر صاحب کی بددماغی اور نازک مزاجی کو آزاد نے بڑے مبالغے سے بیان کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ نازک مزاج ضرور تھے[1]۔ راجہ ناگر مل جو اُن کا بڑا قدر داں تھا۔ اس کی رفاقت محض اس وجہ سے چھوڑ دی کہ جو معاہدہ وہ اس کے ایما سے بادشاہی اُمرا سے کرکے آئے تھے اُس پر اُس نے عمل نہیں کیا۔ ایک امیر راجہ جگل کشور جو محمد شاہ کے دیوان بنگالہ تھے اور بڑی ثروت سے بسر کرتے تھے۔ میر صاحب کو گھر سے اُٹھا لے گئے۔ اپنے کلام کی اصلاح کی خواہش کی میر صاحب نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھی اور اُن کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔ مگر راجہ جگل کشور نے کچھ خیال نہ کیا اور راجہ ناگر مل سے ملاقات کرا دی اور میر صاحب کی انہوں نے

---

[1] اور ذرا آگے بڑھ کر یہ جملہ بھی پڑھ لیں: "سریع الغیظ اور جلد برہم ہونے والے تھے اور اپنی اس کمزوری سے خود بھی واقف تھے"۔ اجگر نامہ کے ذکر میں فطری غرور اور بددماغی کا اقرار ہے۔

بہت کچھ قدر کی۔ رعایت خاں رفاقت میں چند روز رہے۔ ایک روز انہوں نے میر صاحب سے فرمایش کی کہ گویے کو ریختے کے اپنے دو تین شعر یاد کرا دیجیے گا تو وہ گانے کے قاعدے سے درست کر کے گائے گا۔ میر صاحب نے عذر کیا خاں صاحب نے اصرار کیا مگر میر صاحب خانہ نشین ہو گئے اور ان کی ملازمت چھوڑ دی۔ عالم گیر بادشاہ نے بار بار بلایا مگر میر صاحب نہیں گئے۔ اس کا ایک سبب تو طبعی تھا اور دوسرے یہ کہ انہیں اپنی وضع کا بڑا پاس تھا اور جب فقر و فاقہ درپے ہو تو وضع داری نبھانے میں نازک مزاجی آہی جاتی ہے۔ ان کی نازک دماغی دوسروں کی ہمدردی کی بھی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ سریع الغیظ اور جلد برہم ہو جانے والے تھے اور اپنی اس کمزوری سے خود بھی واقف تھے۔ چنانچہ اپنے بعض اشعار میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور میر حسن و لطف وغیرہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں مرا میرؔ بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

ولہ

ہر چند میرؔ بستی کے لوگوں سے ہے نفور
پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

ولہ

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ولہ

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تُو نے کہ یاں جی نکل گیا

ولہ

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی!
جوں شیشہ میرے مُنہ نہ لگو میں نشہ میں ہوں

ہر چند کہ اپنی نسبت بعض اشعار میں اور تذکرہ میں حقیر اور منکسرانہ الفاظ استعمال کیے ہیں اور اپنے شاگردوں کو اپنا دوست بتایا ہے۔ مگر یہ سب بھی اُسی خلقی تمکنت کی ایک شان ایک ادا ہے۔ ان کی مشہور مثنوی "اژدر نامہ" جس میں کہ اپنے آپ کو ایک اژدہا قرار دیا ہے اور باقی شاعروں کو چھوٹے چھوٹے جانوروں سے تشبیہ دی ہے کوئی فرضی اور خیالی چیز نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ وہ ان کے فطری غرور اور بد دماغی کی ایک بیّن مثال سمجھی جا سکتی ہے۔ اپنے معاصر شاہ حاتم کو ان الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ "مردیست جاہل و متمکن و مقطع وضع ...... دریافت نمی شود کہ ایں رگ کہن بسبب شاعری ست یا وضع او ہمین ست خوب ست مارا با این ہا چہ کار...... با من آشنائے بے گانہ است۔" مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ہر شخص کو اسی ناروا داری اور کم بینی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنے دوسرے معاصر اور حریف مرزا رفیع سودا کی نسبت اس طرح رطب اللسان ہیں: "غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ راخوب می گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست بسیار خوش گوست ...... چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید۔" اسی طرح بعض خود اپنے شاگردوں کی بھی بہت کچھ تعریف کرتے ہیں۔ مگر مولانا آزاد نے اس قدر تی کمزوری پہ اور گل بوٹے لگائے ہیں فرماتے ہیں: "اگر یہ غرور و بد دماغی فقط اُمرار کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی۔

افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی انہیں دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ ہر ایسے شخص کے دامن پر بدنما دھبہ ہے جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نکوکاری کا خلعت پہنے ہو۔ بزرگوں کی تحریری روایتیں اور تقریری حکایتیں ثابت کرتی ہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے کسی اور کی کیا حقیقت ہے۔" اس سخت اور غیر منصفانہ تنقید سے صاف ظاہر ہے کہ "نکات الشعرا" مولانا آزاد کی نظر سے نہیں گزری بلکہ انہوں نے میر صاحب کے غرور اور بد مزاجی کی اکثر بے بنیاد روایتیں ضعیف اور غیر قابل اعتماد تذکروں سے علی الخصوص تذکرۂ قاسم سے بغیر جانچے ہوئے لے لیں۔

میر کے کلام میں بالیدگی و درد

میر ازل ہی سے دردمند دل لے کر آئے تھے اور اُن کو دنیا میں سوائے رنج والم کے کچھ اور نہیں دکھلائی دیتا تھا چنانچہ میر صاحب خود لکھتے ہیں ؎

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ — قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

پھر والد کی درویشانہ زندگی اور تلقین کہ "اے پسر عشق بورز۔ عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف است۔ اگر عشق نمی بود نظم کل صورت نمی بست۔ بے عشق زندگی وبال ست دل باختۂ عشق بودن کمال ست عشق بسازد عشق بسوزد۔ در عالم ہر چہ ہست ظہور عشق است ... ... بے عشق نباید بود۔ بے عشق نباید زیست۔" چنانچہ جابجا میر صاحب فرماتے ہیں ؎

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو! — سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

؎

یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے — اک عشق بھر رہا ہے زمین آسماں میں

میر صاحب کی تربیت بھی سید امان اللہ کے زیر نظر ہوئی جو ایک صوفی منش

بزرگ تھے۔ زمانۂ طفولیت ہی سے شانِ درویشی اور صبر و قناعت پیدا ہو گئی تھی۔ سیّد صاحب کی بدولت میر صاحب کو بہت سے درویشوں اور اہلِ دل سے ملنے کا اتفاق ہُوا اور ان کی سوز و گداز بھری باتیں سُننے کا موقع مِلا جو اُن کے دِل میں اُتر گئیں اور جن کا اثر اُن کی طبیعت اور کلام پر ہمیشہ باقی رہا۔ میر صاحب کی زندگی بھی درد سے معمور ہے بچپن ہی سے مصیبت کا سامنا تھا۔ دسؔ سال کی عمر میں باپ کا انتقال ہُوا۔ تلاشِ معاش کے لئے باہر نکلے۔ بڑے بھائی نے بے رُخی اختیار کی۔ دِلّی گئے وہاں بہت تکلیف سے کٹی۔ خان آرزوؔ بھی درپے ہو گئے۔ میر صاحب بہت ہی دِل شکستہ دِل گرفتہ رہتے تھے۔ اس پر بے نوائی و بے بسی۔ اس غم و غصّہ میں ایک جنون کی سی حالت ہو گئی اور انہیں چاند میں ایک عجیب صورت نظر آنے لگی جس سے ان کی وحشت و دیوانگی اور بڑھ گئی۔ اس حالت کا ذکر ذکرِ میر میں موجود ہے اور اُن کی مثنوی خواب و خیال میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ قلبی واردات کی تصویر نظر آتی ہے اُس کے جستہ جستہ اشعار ذیل میں درج ہیں :-

زمانے نے رکھا مجھے متصل — پراگندہ روزی پراگندہ دِل
چلا اکبر آباد سے جس گھڑی — در و بام پر چشم حسرت پڑی
پس از قطع رہ لائے دِلّی میں بخت — بہت کھینچے مَیں نے آزار سخت
جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا — مجھے رُکتے رُکتے جنوں ہو گیا
ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام — لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام
کبھو کف بلب مست رہنے لگا — کبھو سنگ در دست رہنے لگا
نظر آئی اِک شکل مہتاب میں — کمی آئی جس سے خور و خواب میں

دِلّی میں جب تک رہے روزی کا مستقل ٹھکانا نہ تھا۔ آج گھر میں اناج تو

کل نانِ شبینہ کے محتاج کبھی کبھی فاقہ کی نوبت پہنچی۔ اس فقر و مسکینی میں زندگی بسر کی چنانچہ کلام میں بھی اس حالت کی جھلک موجود ہے ؎

میرؔ کی وضع یاد ہے ہم کو! نامرادانہ زیست کرتا تھا

ولہ

بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے بہت سعی کیجیے تو مر رہیے میرؔ

ولہ

ہوئے ہیں فقیر اُن کی دولت سے ہم زرل میرؔ اب کے امیروں سے تو

پھر دلی کی بربادی۔ عزیزوں اور خاندانوں کی تباہی۔ آئے دن کے انقلاب۔ مرہٹوں۔ جاٹوں۔ درانیوں کی دستبرد و غارت گریاں اپنی آنکھ سے دیکھیں اور قلم سے لکھیں ؎

تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں

ولہ

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا

مولوی عبد السلام ندوی نے بہارِ بے خزاں کی روایت پر لکھا ہے کہ "میر صاحب تیغ عشق کے زخم خوردہ تھے اور ان کے دل پر ابتدا ہی سے یہ چرکہ لگ چکا تھا۔ عمر بھر اُن کے دل میں یہ نشتر کھٹکتا رہا۔ اگرچہ یہ ایک راز ہے کہ عام طور پر تذکرہ نویسوں کو اس کی خبر نہیں ہے لیکن بعض تذکروں نے اس کو فاش کر دیا ہے۔ چنانچہ بہارِ بیخزاں میں ہے کہ " بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشت آخر عشق او خاصہ مشک پیدا کردہ می خواست کہ بخیہ بکار سوئے رسوائی می کند و حسن بے پردہ بجلوہ گری در آید ناگاہ ننگ افشائے راز وطن و اقربا باد لے بغل پروردۂ حسرت و حرماں و با خاطر ناشاد دست دگریباں قطع رشتہ حب وطن ساختہ از اکبر آباد بعد از خانہ بر انداز یہا بشہر لکھنو رسید و ہمیں جا بصد حسرت جانکاہ جلا وطنی د

حرماں نصیبی از دیدار یار و دیار جاں بجہاں آفریں داد۔ تا بقید رشتۂ حیات بود۔ طوق محبت بہ گردن و سلسلۂ دیوانگی بپا داشت از کلام عاشقانہ و درد انگیزش پیدا است کہ صد آرزو بخاک بُردہ۔" میر صاحب کے بعض اشعار سے بھی در پردہ اس کی تصدیق ہوتی ہے ؎

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

لیکن ہمارے نزدیک یہ بات پایۂ تحقیق، نہیں پہنچی۔ اشعار سے اس بات کو ثابت کرنا ایک قیاسی دلیل ہے۔

تصانیف میر صاحب کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ چونکہ بہت بڑی عمر پائی تھی لہٰذا تصنیف و تالیف کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) چھ ضخیم دیوان غزلوں کے۔

(۲) ایک دیوان فارسی (جو ہنوز شایع نہیں ہوا ہے)[1]

(۳) متعدد مثنویاں

(۴) ایک رسالہ بزبان فارسی موسوم بہ فیض میر۔ جس کے آخر میں چند لطیفے و حکایات ہیں۔ ان میں بعض بہت فحش ہیں۔ اُس سے اُس زمانے کا مذاق معلوم ہوتا ہے۔

(۵) ایک تذکرہ بزبان فارسی شعرائے اُردو کا موسوم بہ نکات الشعرا۔ دیوانوں میں نہ صرف غزلیں ہیں بلکہ رباعیاں۔ مستزاد۔ واسوخت۔ مخمس۔ مسدس۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ مطلع۔ تضمینیں۔ فردیات۔ غرض کہ جملہ اقسام موجود ہیں۔ دیوانوں کے صدہا صفحے ہیں۔ اور غزلیں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

---

[1] مرزا محمد ہادی عزیزؔ نے ماہنامۂ الواعظ لکھنؤ میں شایع کیا تھا۔ ناضل

میر صاحب نے چند قصیدے بھی لکھے۔ مگر اوّل تو اُن کی تعداد کم ہے۔ دوسرے بمقابلہ سودا کے قصاید کے وہ زیادہ رو دار نہیں اُن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی طبیعت غزل گوئی کے واسطے مخصوص تھی، قصیدہ کی طرف مائل نہ تھی۔ اس وجہ سے کہ وہ امیروں اور رئیسوں کی خوشامد اور بھٹئی سے کوسوں بھاگتے تھے اور نیز یہ کہ استغراق خود داری اور قدرتی کم سخنی اُن کو بیجا لفاظی کی طرف کسی طرح مائل نہ ہونے دیتی تھی۔ مخمسات بعض مناقب میں ہیں اور بعض شہر آشوب کی صورت میں ہیں جن میں شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانہ کے شکایات ہیں۔

غزلوں کے بعد اُن کی مثنویوں کا نمبر ہے جن کی تعداد بھی کثرت سے ہے۔ مثنویاں اکثر عاشقانہ اور بہت مقبول ہیں بعض متفرق مضامین پر ہیں۔ تعداد حسب ذیل ہے۔

(۱) مثنوی اجگر نامہ یا اژدر نامہ جس میں میر صاحب کے طبعی غرور اور دیگر معاصرین شعراء کی حقارت کا ایک منظر ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے آپ کو ایک اژدہا تصور کیا ہے جو چھوٹے چھوٹے کیڑوں۔ سانپ بچھو وغیرہ کو کھا جاتا ہے اور ان حشرات الارض سے اس زمانہ کے کم مایہ شعراء مراد ہیں۔

(۲) شعلۂ شوق (۳) جوشِ عشق (۴) دریائے عشق

(۵) اعجازِ عشق (۶) خواب و خیال (۷) معاملات عشق

(۸) تنبیہ الجہال جس میں کہ نظم اور اُس کے مرتبہ کا بیان ہے۔ ان کے علاوہ تین مثنویاں شکار نامہ کی ہیں جن میں نواب آصف الدولہ کے سیر و شکار کا حال ہے اور کچھ چھوٹی چھوٹی نظمیں ایسی چیزوں کے متعلق بھی ہیں جن سے میر صاحب کو بہت اُنس تھا۔ مثلاً کُتا بلی۔ بکری وغیرہ۔ ایک مثنوی مرغ بازاں۔ ایک میں موسم برسات اور اُس کی تکلیفوں کا خاص کر اپنے گھر کا حال بیان کیا ہے جو بارش کی

شدت سے گر گیا تھا۔ اسی طرح ایک میں سفر برسات کا ذکر ہے۔ ایک چھوٹی سی مثنوی جھوٹ کی طرف سے خطاب کر کے لکھی ہے کچھ مرثیے بھی لکھے ہیں مگر وہ چنداں قابل ذکر نہیں۔ تاریخ گوئی کا اُن کو مطلق شوق نہ تھا۔ ایک ساقی نامہ بھی لکھا ہے۔

میر صاحب کی ایجادیں میر صاحب اُردو واسوخت کے موجد تسلیم کیے گئے ہیں۔ اسی طرح اُردو میں مثلث و مربع (یعنی تین اور چار مصرعوں کی نظمیں بھی انہیں کی ایجاد ہیں بعض فارسی کے شعروں کو تضمین کر کے کبھی مثلث کیا ہے اور کبھی مربع مثلاً اہلی شیرازی کا شعر ہے۔

امروز یقیں شد کہ نہ داری سر اہلی   بیچارہ ز لطفِ تو غلط داشت گماں ہا

اس پر میر صاحب نے ایک مصرعہ لگا کے اس طرح مطلب پورا کیا ہے۔

کل تک تو فریبندہ ملاقات تھی پہلی   امروز یقیں شد کہ نہ داری سر اہلی

بیچارہ ز لطفِ تو غلط داشت گماں ہا

میر صاحب کی شہرت خاص کر ان کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے۔ غزلوں میں فی الحقیقت ان کا جواب نہیں مگر مثنویاں میر حسن کی مثنوی سحر البیان کو نہیں پہنچتیں پھر بھی ان کی بے ساختگی اور فصیح البیانی و سادگی قابل داد ہے دیوان فارسی بقول مصحفی ایک سال میں تیار ہوا تھا جب کہ ریختہ کہنا موقوف ہوا تھا۔

تذکرۂ نکات الشعراء یہ تذکرہ تقریباً ۱۱۶۵ھ[1] مطابق ۱۷۵۲ء عیسوی میں لکھا گیا۔ یہ حسب دعوے مصنف شعرائے اُردو کا سب سے پہلا تذکرہ ہے اور واقعی نہایت دلچسپ اور مفید ہے افسوس ہے اس میں حالات زیادہ تفصیل سے نہیں دیے گئے مگر پھر بھی جو باتیں معاصر شعراء کے متعلق اس میں ملتی ہیں وہ بہت کچھ قابل قدر ہیں جن شعراء کا ذکر ہے ان کا کلام بھی بطور نمونہ کے دیا گیا ہے۔

---

[1] محترمی عرشی صاحب فرماتے ہیں: تقریباً ۱۱۶۱ھ سے تالیف شروع کی۔ دستور الفصاحت ص ۴۶

میر صاحب کی خدمات زبان اور شاعری کے ساتھ

میر صاحب نے اکثر فارسی ترکیبیں یا ان کے ترجمہ کو اردو میں داخل کر کے اُس کو ریختہ بنایا۔ آزاد نے آب حیات میں اس کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ مثلاً

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا | پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا
دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش | ایک عالم کے سر بلا لایا!
اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائے گا | یہ قافلہ رہے گا نہ زنہار جائے گا

ترجمہ کی مثال

گل کو محبوب ہم قیاس کیا | فرق نکلا بہت جو باس کیا

باس کرنا یا بو کرنا فارسی 'بو کردن' کا ترجمہ ہے بمعنی سونگھنا۔

ان میں سے اکثر چیزیں پسند عام ہو کر منظور ہوئیں بہت سی ناپسند ٹھہریں جو رفتہ رفتہ متروک ہو گئیں۔ میر صاحب کے خیالات ریختہ کے متعلق جو نکات الشعرا کے آخر میں دیے ہوئے ہیں۔ خود انہی کی زبان سے سننے کے لائق ہیں فرماتے ہیں :۔

بدانکہ ریختہ بر چندیں قسم ست۔ ازانجملہ انچہ معلوم فقیر ست نوشتہ می آید اوّل آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی۔ چنانچہ قطعہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کہ نوشتہ شد[1]۔ دوم آنکہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی۔ چنانچہ شعر مرزا معز کہ نوشتہ آمد[2]۔ سوم آنکہ حرف و فعل فارسی بکار می برند، و ایں قبیح است چہارم آں کہ ترکیبات فارسی مے آرند اکثر ترکیب نامناسب زبان ریختہ می افتد آن جائز است۔

---

[1] زر گر پسرے چو ماہ پارہ | کچھ گھڑیے سنواریے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست | پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

[2] از زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے | در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے ۱۲

ہ ایں را غیر شاعر نمی داند و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد آں معیوب ست و دانستن ایں نیز موقوف سلیقۂ شاعری است و مختار فقیر ہم ہمیں است۔ اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوے ریختہ بود مضائقہ ندارد۔ پنجم ایہام است کہ در شاعرانِ سلف دریں فن رواج داشت اکنوں طبعہا مصروف ایں صنعت کم است مگر بسیار برجستگی بستہ بشود۔ معنی ایہام ایں است کہ لفظے کہ برا و بنائے بیت بودن آں دو معنی داشتہ باشد یکی قریب و یکی بعید و بعید منظور شاعر باشد و قریب متروک او۔ ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آں محیط ہمہ صنعت ہا است تجنیس ترصیع تشبیہ، صفائی گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ۔ ایں ہمہ در ضمن ہمین ست و فقیر ہم از ہمیں وتیرہ محفوظم۔ ہر کہ را دریں فن طرز خاصی است ایں معنی را می فہمد۔ با عوام کار ندارم"!

میر بحیثیت شاعر کے

عام طور پر اُردو شاعری اور تغزل کی مرادف ہے اور میر صاحب غزل گوئی میں مسلم الثبوت اُستاد مانے گئے ہیں۔ لہذا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میر صاحب زبانِ اُردو کے سب سے بڑے شاعر اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ میر صاحب کا پایہ مثنوی نویسی میں بھی بہت بلند ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ غزل گوئی میں اُن کا جواب نہیں اور اُس مملکت میں وہ متفرد اور تن تنہا حکمراں ہیں۔ ان کے اشعار صاف۔ سادہ۔ فصیح اور تیر و نشتر کا کام دینے والے درد و اثر سے مملو ہوتے ہیں۔ ان میں دلکشی اور زور کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اظہارِ جذبات چستی بندش اور ترنم میں وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔ ان کے اکثر اشعار میں وہ ایک خاص کیفیت ہے جو سحر یا طلسم سے تعبیر کی جاسکتی ہے جو تمام زبانوں کی حقیقی اور سچی شاعری کا طغرائے امتیاز ہے۔ میر صاحب کے بہتّر نشتر مشہور ہیں۔ مگر سچ پوچھیے تو ان کے صدہا ایسے شعر نکلیں گے جن حقیقی شاعری کے اوصاف بدرجۂ احسن موجود ہیں۔ جب کوئی پھڑکتا ہوا شعر سنا جاتا

ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ انہیں بہتر نشتروں میں سے ہے۔ زبان شستہ کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ اور دل آویز جیسے باتیں کرتے ہیں۔ وہ اردو کے شیخ سعدی ہیں۔ ان کا کلام اکسیر شاعری ہے۔ بالخصوص چھوٹی بحروں کے تو وہ بادشاہ ہیں اور ہمارے نزدیک تو بڑی بحروں میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کے کلام میں جو حزن و ملال حسرت و مایوسی سے مملو ہے وہی ان کی شاعری کی جان ہے۔ یہی ناامیدی اور یاس اُن کی غزلوں کو زوردار اور مؤثر بناتی ہے۔ میر صاحب شاعری اور زبان دانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ عام طور پر لوگ اُن کو خدائے سخن کہتے ہیں۔ غالب و ناسخ اور نیز تمام مشاہیر جو ان کے بعد ہوئے اُن کی عظمت اور استادی کے معترف تھے اور یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ وہ اپنے ہی زمانے میں بہت بڑے شاعر مانے جاتے تھے۔ اُن کے معاصر اور نیز بعد کے تمام تذکرہ نویسوں نے ان کی بے حد تعریف کی ہے اور نہایت رنگین عبارت اور مبالغہ آمیز کلمات اُن کی نسبت استعمال کیے ہیں۔ شاعر اور نثار دونوں ان کی تعریف کے معاملہ میں باہم مسابقت کرتے معلوم ہوتے ہیں اور آرٹ اور نیچر دونوں میں ان کے کمال کی مدح سرائی کے الفاظ و اصطلاحات ڈھونڈتے ہیں۔ مثلاً میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ سر آمد شعرائے ہند اور اپنے وقت کے افصح الفصحا اور بے نظیر و بے عدیل شاعر تھے۔ اسی طرح مرزا علی لطف تذکرۂ گلشن ہند میں یوں رقمطراز ہیں کہ "جو شخص کہ نظارہ گاہِ سخن میں چشم خوردہ بیں رکھتا ہے اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیریں رکھتا ہے تو وہ اس بات کو جانتا ہے اور اس رمز کو پہچانتا ہے کہ میر شیریں مقال میں ریختہ گویان سابق و حال میں نسبت خورشید و ماہ ہے اور فرق سپید و سیاہ ہے۔" صاحب طبقات الشعراء لکھتے ہیں مجموعۂ قابلیت و ہنر صاحب طبع خوش فکر سر آمد مشہوران عصر محاورہ دان و متین مثلاشی

مضامین نو و رنگین متجسس الفاظ چرب و شیریں۔ در میدان غزل پردازی گوئے فصاحت از معاصران مے برد و ہرچند سادہ گو است اما در سادہ گوئی پرکار بہا دارد" حقیقت یہ ہے کہ میر و مرزا دونوں اپنے مابعد کے شعراء کے واسطے ایک صحیح نمونہ اور سرچشمۂ فیض تھے۔ ان کے کلام کی حلاوت و دل آویزی ان کے اشعار کا درد و اثر اور رنگینی آج تک مشہور ہے بلکہ جب تک زبان اردو قائم ہے مشہور رہیں گی۔

میر اور سودا کا مقابلہ میر صاحب کی شہرت اُن کی غزلوں اور مثنویوں پر مبنی ہے اور سودا قصیدہ اور ہجو کے استاد مانے جاتے ہیں۔ خود سودا کے زمانے میں یہی خیال اکثر ارباب فن کا تھا۔ چنانچہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرائے فصاحت مرزا محمد رفیع سودا در غزل گوئی بوے (میر تقی) نرسیدہ اما حق آنست کہ ہر گلے را رنگ و بوے دیگر ست، مرزا دریائیست بیکران و میر نہریست عظیم الشان۔ در معلومات تو الحق میر را بر میرزا برتریست و در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری" اسی طرح ایک مشہور صاحب دل خواجہ باسط نے جو علاوہ کمالات عرفان و تصوف کے فن نقد میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اس مشکل اور نازک مسئلہ یعنی میر و مرزا کی شاعری کے فرق کو نہایت مختصر الفاظ میں فیصلہ کر دیا اور فرمایا کہ "دونوں صاحب کمال ہیں۔ مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا کا کلام واہ ہے" اسی فرق کو ایک نہایت لطیف پیرایہ میں امیر مینائی نے بھی اپنے ایک شعر میں ظاہر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں بڑے شاعر اور اپنے اپنے طرز کے استاد تھے۔ ہماری ناچیز رائے میں ان دونوں بزرگوں کے طرز کلام کا فرق اُن مزاج اور طبیعت کے فرق پر بہت کچھ مبنی ہے۔ میر صاحب قدرتاً حزیں اور غمگین واقع ہوئے تھے۔ ان کی زندگی حزن و یاس اور مصائب و ادبار کا نمونہ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ خود داری اور عزت کا ان کو بے حد احساس تھا جس سے وہ مجبور ہو گئے تھے۔

کہ عزلت اور تلخ کلامی کی زندگی بسر کریں۔ اسی وجہ سے عمر بھر تلخابۂ حیات پیتے رہے بزمِ طرب اور محفلِ سرور کے وہ فطرتاً اہل نہ تھے۔ خوشی اور بشاشی کا حصہ قسامِ ازل نے اُن کو دیا ہی نہ تھا۔ برعکس اس کے سودا نہایت شگفتہ مزاج اور رنگین طبع واقع ہوئے تھے۔ وارستگی اور آزادی ان کی طبیعت کا اصلی جوہر تھا۔ خوشی و خرمی زندہ دلی اور ظرافت سے اُبلے پڑتے تھے خوشی کے مجمعوں اور ہنسی مذاق کے جلسوں کے رُوحِ رواں تھے، جہاں ان کی قابلیتِ خداداد کے جوہر کھلتے تھے۔ زندگی نہایت فارغ البالی اور شادکامی سے بسر کرتے تھے۔ نظر بریں ان دونوں کی شاعری اُن کے خیالات اور ان کے مزاج اور دنیا کے ساتھ ان کے برتاؤ کا بہترین آئینہ کہی جا سکتی ہے اسی طرح ان دونوں کے اپنی اپنی شاعری کے واسطے منتخب کیے ہوئے الفاظ بھی ان کے حسبِ مزاج اور موافقِ حال ہیں۔ ظاہر ہے کہ درد و اثر کے لیے الفاظ نہایت نرم اور صاف و سادہ اور بندش نہایت سلیس اور بے تکلّف ہونی چاہیے اور یہی طرز غزل کے واسطے زیادہ موزوں ہے۔ علی الخصوص چھوٹی چھوٹی بحروں کے لیے جس میں کہ میر صاحب کی شاعری اپنے عروج کمال پر دکھائی دیتی ہے۔ برعکس اس کے قصیدہ کے لیے شاندار الفاظ، علو مضامین، نادر تشبیہوں اور استعاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قصیدہ کہنا ایک پژمردہ اور دل گرفتہ آدمی کا کام نہیں۔ عاشقانہ خیالات مثلاً مصائب، ہجر و فراق وغیرہ کے دردناک حالات جن بے تکلّف اور سیدھے سادے الفاظ سے ظاہر ہو سکتے ہیں وہ قصیدہ کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ہیں۔ میر درد اثر اور سادگی کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ ان کے وہ اشعار جو بہتّر نشتر کے فرضی نام سے مشہور ہیں سب خود انہیں کے سچے اور دلی جذبات کا پرتو ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تخیل سے اُس میں رنگ آمیزی مطلق نہیں کی ہے۔

میر کی زندگی، ایک درد و الم کی زندگی ہے اور انگریزی شاعر شیلی کی یہ سطور اُن

کے حسب حال ہیں وہ حرماں نصیب، لوگ غلطی سے گہوارۂ شعر میں ڈال دیے جاتے ہیں جو مصیبت تو خود جھیلتے ہیں مگر وہی مصیبت نظم میں دوسروں کو سناتے ہیں۔"

اسی وجہ سے میر کے بہترین اور سب سے زیادہ مؤثر شعر وہی ہیں جن میں درد و الم کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ سودا کے کلام میں میر کا سا درد نہیں۔ میر کے اشعار غمگین اور چوٹیلے دلوں پر خاص اثر کرتے ہیں۔ ان کا قصہ غم کا قصہ ہے۔ وہ زندگی کا وہ رخ جو یاس اور غم سے بھرا ہوا ہے نہایت آب و تاب اور سچائی سے پیش کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے سودا اس کا دوسرا رخ دکھلاتے ہیں جو امید اور خوشی سے مملو ہے۔ سودا کے اشعار پڑھنے والے کے لیے سامان طرب و نشاط مہیا کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت کسی محدود دائرے میں مقید رہنا پسند نہیں کرتی وہ جذبات کے تنگ عالم سے نکل جانا چاہتے ہیں اور ایک وسیع جولانگاہ اپنے اظہار خیال کے لیے تلاش کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے نئی نئی راہیں نکالیں اور ان کے اشعار ایک ایسے گلدستہ کا مزا دیتے ہیں جو انواع و اقسام کے مختلف رنگ و بو کے پھولوں سے بسا ہوتا ہے۔ انہوں نے انقباضی جذبات کو چھوڑ کر انبساطی جذبات کو بہت کچھ وسعت دی ہے۔ میر کی دنیا تاریکی اور غم سے بھری ہوئی ہے جس میں کہ امید کی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ ان کے تمام اشعار اس مقولہ کے تحت ہیں: "جو کوئی اس غمکدہ میں قدم رکھے امید کو پیچھے چھوڑ آئے۔" میر کی ہنسی اور مذاق بناوٹی اور ان کی طعن و تشنیع مصنوعی ہے یہ کہنا صحیح نہیں کہ میر نے ہجو اور قصیدہ نہیں لکھا فی الحقیقت ان دونوں صنفوں میں انہوں نے طبع آزمائی مگر چونکہ طبیعت ان اصناف کے واسطے موزوں نہیں پائی تھی لہذا ناکام رہے۔ یہ بھی کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے مزاج کی خودداری اور دولت و اقتدار کی بے پروائی کی وجہ سے ان اصناف سخن میں سربسز نہ ہوئے۔ انہوں نے اجگر نامہ ضرور لکھا مگر وہ سودا کے ہجووں کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اسی

طرح ان کے قصائد جو نواب آصف الدولہ کی تعریف میں ہیں۔ سودا کے قصائد کے سامنے ہیچ ہیں۔

دونوں بزرگوار میر اور سودا حقیقت اور اصلیت بیان کرنے کے بادشاہ ہیں۔ دونوں وہ کامل مصور ہیں جو خیالی تصاویر نظم میں ایسی خوب صورتی اور جزئیات کی تفصیل کے ساتھ کھینچتے ہیں کہ ان کے لفظی مرقعے ہمارے دل کی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مرقع نگاری داخلی یا خارجی، یعنی جذبات انسانی یا مناظر قدرت دونوں کی ہو سکتی ہے۔ پس جہاں تک کہ جذبات انسانی اور علی الخصوص درد و غم کے جذبات کا تعلق ہے ان کے اعلام و اظہار میں میر صاحب منفرد ہیں۔ مگر ان کے سوا دیگر جذبات پر سودا کو کمال حاصل ہے۔ سودا کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جن مضامین کی وہ اپنے اشعار میں تصویر کھینچنا چاہتے ہیں ان کے مالہ اور ماعلیہ کا ان کو بدرجۂ کمال علم ہوتا ہے۔ میر صاحب اپنی افتاد طبیعت، اپنی نازک علوات اور اپنے استغراق خودی کی وجہ سے مجبوراً فطرت انسانی کا مطالعہ اپنی وسیع النظری سے نہیں کر سکتے۔ ان کی محدود نظر امی استغراق اور خود بینی کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کو اپنے کام میں اس قدر انہماک اور شغل تھا کہ سات برس تک اپنے کمرہ کے پائیں باغ کو نظر اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ ملی۔ اس انہماک سے اتنا ضرور ہوا کہ وہ اپنے خاص کام میں یکتائے زمانہ ہو گئے۔ وہ تنوع جو سودا کے کلام کی جان ہے میر صاحب کے یہاں مفقود ہے۔ سودا کی تصاویر نہایت رنگین اور خوش نما ہوتی ہیں۔ بخلاف میر صاحب کے جن کی دنیا مایوسیوں سے تیرہ و تار جس کے پھول پژمردہ و افسردہ جن کی زمین تکلیفوں اور مصیبتوں کی قیام گاہ اور جس کا آسمان آلام و مصائب کی جائے پناہ۔ ایسے عالم میں مفر کا بس یہی طریقہ ہوتا ہے کہ سکوت و محویت اختیار کی جائے یا نالہ و زاری سے دل کی بھڑاس نکالی جائے یا عالم خواب کی

سیر کی جائے۔ مگر وہ خواب بھی قوت متخیلہ ہی کے پیدا کیے ہوئے خواب پریشاں ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے سوداؔ کی دنیا جیتی جاگتی دنیا ہے جس میں بجائے تاریکی کے اُمید کی روشنی جلوہ گر، جس کے باغ سرسبز و شاداب جس میں بادِ صبا خوبصورت پھولوں اور نازک پتیوں کے ساتھ ہر وقت اٹکھیلیاں کرتی پھرتی ہے۔

تشبیہیں اور استعارے ہر شاعری کے جزوِ اعظم مگر خصوصیت سے مشرقی شاعری کی تو جان ہیں۔ اگر اُستادی کے ساتھ برتے جائیں تو شعر کے حُسن میں وہ چار چاند لگا دیتے ہیں۔ سوداؔ وہ اُستاد ہے جو ان کے صحیح استعمال پر قادر ہے۔ اس کے یہاں دل چسپ تشبیہیں اور نادر استعارے میرؔ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ وہ ان مختلف علوم و فنون سے بھی جن کو وہ شعر میں استعمال کرتا ہے بہ نسبت میرؔ کے زیادہ واقف ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ سوداؔ کی اکثر غزلوں میں قصیدہ کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی کم و بیش یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ شاعر کا زبردست تخیل بعض وقت اُس کو ایسے مضامین اور الفاظ سُجھاتا ہے جو غزلیت سے میل نہیں کھاتے وہ اپنی بلند پروازی اور تخیل کی تیزی کو روک نہیں سکتا۔ میر صاحب کے یہاں ایسے عیوب نہیں ہیں۔ سوداؔ کے اس قسم کے اشعار ان قواعد کے ضرور خلاف ہیں جو ترتیب غزل کے واسطے مقرر ہو گئے ہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسی قسم کے شعر علیحدہ علیحدہ دیکھے اور جانچے جائیں تو اُن کی عمدگی اور کمال میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ ترتیب غزل کے قواعد سے استغنا اور بے پروائی متاخرین شعرائے فارسی کی تتبع میں ہے جن کے قدم بہ قدم اُردو شعرا چلنا چاہتے ہیں۔ نظم فارسی کی آخری منزل ارتقا میں غزل کا محدود دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ اور اس میں بہت سی چیزیں مثلاً فلسفہ مذہب، اخلاق تصوف اور دیگر

علوم و فنون وغیرہ سب شامل کر لیے گئے تھے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ عاشقانہ رنگ یا عشق مرتب اور منظم ہو کر سائنس کے درجہ پر پہنچ گیا تھا۔ اُردو شاعری جو فارسی کی تتبع تھی اس انقلاب سے اس نے بھی بہت کچھ فائدہ اُٹھایا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ آخرالذکر مضامین سے بہرہ اندازی بہ نسبت دل کے دماغ زیادہ کرتا ہے۔ یعنی جس قدر ان مضامین کی کثرت ہوتی ہے اتنی ہی درد و اثر کی کمی ہو جاتی ہے۔ قصیدہ کی شان اور غزل کے رنگ میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور یہ فرق ہمارے زمانہ کے نوآموز شعراء کے کلام میں جو سودا اور غالب وغیرہ ایسے استادوں کی تقلید کرنا چاہتے ہیں بخوبی نمایاں ہے۔

سودا اور میر دونوں موسیقیت الفاظ کے استاد ہیں ان کے شعر سلجھے ہیں ڈھلے ہوئے۔ بندش نہایت چست اور زوائد سے پاک ہوتے ہیں نشست الفاظ پر سودا کو زیادہ توجہ تھی۔ وہ ہر شعر کو اپنی جگہ پر مکمل بنانا چاہتے ہیں جو خود ایک بہت بڑا فن ہے۔ شاذ و نادر معنی میں گنجلک بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ دونوں استاد دور از کار تلمیحات اور تشبیہات سے بچتے ہیں۔ اگرچہ سودا کے یہاں کبھی کبھی اس قسم کی غلطی ہو جاتی ہے۔ دونوں استادان فن کے کلام کا مقابلہ ایک کارآمد اور قیمتی چیز ہے۔ اس وجہ سے کہ دونوں ہم عصر تھے اور متحدہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہم طرح غزلیں کہی جاتی تھیں جن کا مقابلہ اس لیے بہت دلچسپ ہے کہ اس سے دونوں کے مختلف مزاج اور طبیعت اور نیز اندازِ بیان کے فرق کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ دونوں کے کلام میں اس عہد کے بعض نقائص بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے یہاں کبھی کبھی بتبذل اور فحش الفاظ استعمال ہوئے ہیں بعض اوقات مضمون شعر میں فحش ہوتا ہے کہیں اختلاف تذکیر تانیث اور شتر گربہ ہے اکثر اشعار معمولی بلکہ پھیکے اور بے مزہ بھی ہیں۔ میر صاحب کہیں کہیں ایہام بھی برتتے

ہیں۔ امرد پرستی جو اس زمانہ کی شاعری کا ایک قبیح موضوع ہے۔ دونوں کے کلام
میں جابجا پائی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ وسعت نظر، تنوع خیالات، جزئیات کے بیان کی قدرت، دنیاوی
معاملات کی واقفیت اور سب سے بڑھ کے یہ کہ مذاق اور ظرافت میں سودا کو میر
پر برتری ہے۔ سادگی الفاظ، سلاست زبان، عاشقانہ رنگ، درد و اثر، فصاحت
بلاغت اور تصوف میں میر صاحب کو سودا پر فضیلت ہے۔ کسی کا قول ہے اور سچ
کہا کہ دونوں کا کلام بیش بہا جواہر ہیں۔ میر صاحب کے یہاں صرف ہیرے ہیں
سودا کے یہاں ہیروں کے علاوہ موتی، زمرد اور یاقوت بھی بکثرت پائے جاتے ہیں
یہ کسوٹی پر کھنے والے کا مزاج اور مذاق ہے۔[1]

اس عہد کے دیگر شعراء اس عہد میں ان دو بزرگواروں کے علاوہ اور بھی بہت سے
شاعر گزرے ہیں مگر چونکہ وہ کثرت سے ہیں اور اُن کے کلام میں کوئی خصوصیت
نہیں لہذا یہاں اُن کا ذکر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ناظرین کو اگر اُن کے کلام یا حال کے
دریافت کرنے کا اشتیاق ہو تو اس عہد کے بعد کے تذکرے ملاحظہ کریں۔[2]

---

[1] میر و مرزا کے کلام کے مقابلہ کے لیے دیکھیے بقا کے اشعار صفحہ ۲۶۵۔

[2] اس عہد کے بعض شعراء کا حال مختصراً باب ۷ کے آخر میں کیا گیا ہے۔

باب

اساتذۂ دہلی

طبقۂ متاخرین

انشاؔ اور مصحفیؔ کا زمانہ

طبقات کی ترتیب
اس دور کی ترقیاں

شعراء کے طبقات کی ترتیب کوئی فرضی چیز نہیں جیسا کہ بادی النظر میں وہ معلوم ہوتی ہے۔ گو یہ سچ ہے کہ اکثر شعراء ایک دور کے (شعراء) ماقبل کے دور کے بعض شعراء کے معاصر رہے ہیں۔ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ مابعد کے دور کے شاعر دورِ ماقبل میں نوجوان اور نوآموز تھے اور اس وقت انہوں نے کوئی شہرت نہیں حاصل کی تھی اور دورِ ماقبل کے شاعر کہن سال، مشّاق اور مشہور ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ زبان کا فرق بھی بہت کچھ قابلِ لحاظ ہے۔ اس دور میں بمقابلہ دورِ ماقبل کے زبان اور نیز بندش کے اعتبار سے شعر میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ بہت سے پرانے الفاظ اور ترکیبیں متروک ہو گئیں اور ان کی جگہ نئے الفاظ اور جدید ترکیبوں نے لی۔ اس معاملہ میں زبان اردو انشاء کی بہت احسان مند ہے جنہوں نے اس کی ترقی اور توسیع کے لئے بہت سے نئے نئے تجارب اختیار کئے۔ مصحفی البتہ قدماء کے پیرو تھے جنہوں نے نظم کی قدیم

روایات کو جاری رکھا۔ جرأت بھی غزل میں میرؔ کے پیرو تھے۔

شاعری دربار سے وابستہ ہو گئی

اِس دَور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نظم اُردو کو دربار کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ دَورِ ماقبل کے شعراء گو اپنے سرپرستوں سے اِنعام و اکرام اور وظیفے اور تنخواہیں پاتے تھے مگر اپنی آزادی اور خودداری کو ہمیشہ قائم رکھتے رہے وہ اپنی حیثیت ایک ملازم کی کبھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس دَور میں یہ خرابی ہوئی کہ گو شعراء کی قدردانی اور سرپرستی بڑھ گئی مگر ان کی خودداری اور عزت و آبرو کم ہو گئی۔ شاعری کا اب صرف یہ کام رہ گیا کہ اس سے امیر و رئیس خوش کیے جائیں۔ شاعر لوگ اپنے سرپرستوں کے چشم و ابرو ہر وقت دیکھتے تھے اور چونکہ ان کا دل خوش کرنا مقصود تھا لہٰذا اشعار بھی اُنہیں کے مزاج اور مذاق کے موافق کہے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ اس دَور کے شعراء نقال اور مسخرے پہلے تھے اور شاعر بعد کو۔ اب شاعری حصول زر کا ایک کامیاب ذریعہ ہو گئی تھی اور شاعر اُمرا اور رؤساء کے درباروں میں پہنچنا بلکہ اپنے مالکوں کے مزاج میں درخور حاصل کرنا۔ بس یہی اپنا فخر سمجھتے تھے۔ اس کا ایک بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ خود آپس ہی میں سخت رقابت اور بدمزگی شعراء میں پیدا ہو گئی۔ اس کے قبل بھی اس قسم کی بدمزگیاں ظہور میں آئی تھیں مگر وہ فن سے متعلق اور حدود شائستگی کے اندر ہوتی تھیں۔ اب چونکہ شاعری امیر رسی کا ایک ذریعہ ہو گئی تھی لہٰذا شاعر ایک دوسرے سے سخت رقابت اور عداوت برتتے تھے اور ان کے آپس کے شاعرانہ مقابلے اب تہذیب و شائستگی کی حد سے گزر کے گالی گلوچ اور پھاڈگی کے درجہ تک پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ انشاءؔ اور مصحفیؔ کے ہنگامے اس زمانہ کی تاریخ شاعری پر ایک نہایت بدنُما دھبہ ہیں۔

اس وابستگی کے خراب نتائج

شاعری کی اِس درباری وابستگی کا ایک خراب نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی متانت اور پاکیزگی اور علوِ خیال میں بہت فرق آ گیا۔ درباری اثر سے اُس کی آئندہ

ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ خیالات میں نفاست اور پاکیزگی کم ہو گئی۔ شعر کی رُوحانیت اور بلند پروازی مفقود ہو گئی۔ معشوق سے اب تک عموماً معشوقِ حقیقی مراد ہوتا تھا۔ اب بجائے اس کے کوئی لونڈا یا رنڈی، جن کی ایسے عیش پرست دربارں میں کمی نہ تھی سمجھا جانے لگا۔ شہواتی جذبات بے تکلفی کے ساتھ بکثرت نظم ہونے لگے۔ کیونکہ عیاش اُمرا اور ان کے مصاحبین اسی قسم کے اشعار سے خوش ہوتے تھے اور اسی قسم کے فواحش پر انعام و اکرام دیتے تھے۔ دِلّی کی یہ حالت نہ تھی یہاں کے شعراء میں، گو کہ وظائف اور تنخواہیں نہ بھی پاتے تھے۔ متانت اور سنجیدگی اور آزادی مزاج اب تک باقی تھی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو یہاں عموماً شاعری تصوّف و عرفان کی گود میں پلی۔ شعر گوئی ایک مقدّس اور معزّز مشغلہ سمجھی جاتی تھی۔ اہلِ اللہ کے دائروں اور خانقاہوں میں اس کی نشو و نما ہوئی۔ شاہ گلشن، خواجہ میر درد، مرزا مظہر جانجاناں، یہ سب مشہور اہلِ دِل بزرگ گزرے ہیں جنہوں نے شاعری کو بہت کچھ تحریک و ترقی دی۔ لکھنؤ میں برعکس اس کے شاعری کے سر پر سے رُوحانیت اور تصوّف کا سایہ اُٹھ گیا اور اب وہ دربار سے متعلق ہو گئی۔ اب شاعر دلی ہونے کی نہیں بلکہ دربار رس ہونے کی تمنّا کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ کچھ ایسے لوگ جو دِلّی چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے تھے کچھ دنوں یہاں کی ہوا اور خراب صحبت سے بچتے رہے مگر رفتہ رفتہ طمع اور شہرت پسندی اور سب سے زیادہ اِس زمانہ کے بگڑے ہوئے مذاق نے اپنی راہ پر آخر لگا ہی لیا۔

ریختی ایک جدید صنفِ شاعری یعنی ریختی جس کو اس انحطاطِ مذاق کا بدترین نمونہ سمجھنا چاہیے اسی دور میں وجود میں آئی۔ اس کے موجد سعادت یار خاں رنگین تھے۔ جنہوں نے اپنے زمانہ کے مدرسہ تعیش میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے تمام مدارج عیاشی و آوارگی کو یکے بعد دیگرے بہ تمام و کمال طے کیا تھا۔ ان کا کلام عورتوں کی زبان میں

ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ عیاش مزاج لوگوں کو بہت دلچسپ معلوم ہوتا تھا مگر حقیقت میں سوائے فحش اور ابتذال کے اس میں اور کچھ نہ تھا۔ انشاء نے بھی بہت کچھ اُس میں حصہ لیا۔

اِس عہد میں فن شعر گوئی کو بہت قوت حاصل ہوئی اور کثرت مزاولت سے شعراء نے من حیث الفن بڑی ترقی کی۔ اگرچہ شیریں کلامی اور بلند خیالی شعر میں کم ہوگئی مگر تکمیلِ فن نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ اظہار قابلیت کی غرض سے لوگ مشکل مشکل بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے تھے اور پھر دو ایک نہیں بلکہ صدہا اسی قسم کی غزلیں کہہ ڈالتے تھے جو اُن کے کمال کا نمونہ تو ضرور ہیں مگر وہ قدما کا درد و اثر اور صحیح جذبات کا ان میں نام نہیں۔ اس عہد کے شعراء نے شعر کی ظاہری درستی کی طرف جو خاص توجہ کی تھی وہی آیندہ چل کر ناسخ وغیرہ کے زمانہ میں ایک طرز خاص بن گئی۔

فنی مباحث کو چھوڑ کر شعراء نے شاعری کو حصولِ زر اور کسب معاش کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا۔ اور وہ مباحث اب درباری نزاعوں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے میاں مصحفی جو صاحب عالم مرزا سلیماں شکوہ کے استاد تھے۔ انشاء نے اُن کو اس جلیل القدر درجہ سے ہٹانا چاہا اور یہ امر ایک عظیم الشان جنگ کا باعث ہوا جس کا تذکروں میں بالتفصیل ذکر ہے۔ اُس کی ابتدا تو معمولی طریقہ سے ہوئی تھی مگر آخر کو وہ جھگڑہ مچا کہ خدا کی پناہ! ان کے مربی اس قدر کا فضیحتی کا دور سے تماشا دیکھتے تھے اور ان کے مہملیات کی داد دے کر جانبیں کی آتش حسد و نفاق کو اور بھڑکاتے تھے بالآخر شاعروں نے قلم ہاتھ سے رکھ کر لاٹھی پونگے اُٹھا لیے اور بے تکلف ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوگئے بلکہ ایک دوسرے کی جان اور عزت و آبرو کے درپے ہو گئے۔ سچ پوچھیے تو اس قسم کی لغو اور بے ہودہ نظموں سے شاعری کی تہذیب و متانت

میں فرق آگیا اور مصحفی اور انشار کی اس قسم کی نظمیں اب اس زمانہ کے پرشور مذاق اور پھکڑ کا ایک نمونہ رہ گئی ہیں۔ جن کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے مگر رنج بھی ضرور ہوتا ہے۔

ہزل گویان اُردو — اس موقع پر چند ہزل گویان اُردو کا بھی کچھ ذکر کر دینا ضروری ہے۔ حسب ذیل نام قابل ذکر ہیں:۔ میر اٹل نارنولی۔ میر جعفر زٹل۔ زاٹلی۔ چرکین افسق میر غلام حسین برہان پوری شاگرد زاٹلی۔ یہ منشی لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے ہم عصر تھے اور شفیق نے افسق کا ذکر اپنے تذکرہ چمنستان شعراء میں کیا ہے۔

انشار متوفی ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ عیسوی — سید انشاء اللہ خاں متخلص بہ انشا خلف حکیم میر ماشاء اللہ خاں ان کے بزرگ نجف سے آئے تھے اور دلی میں بس گئے تھے۔ رفتہ رفتہ اُمرائے شاہی میں داخل ہوئے۔ انشار کے والد شاہی طبیب تھے۔ اور کچھ شعر بھی کہتے تھے اور مصدر تخلص کرتے تھے۔ زوال سلطنت کے زمانہ میں وہ مرشد آباد گئے جو نوابانِ بنگالہ کا دارالحکومت تھا اور یہیں سید انشار کی ولادت ہوئی۔ ابتدائے عمر میں علوم رسمیہ اپنے والد ہی سے حاصل کیے۔ شعر کہنے کا شوق ان کو بچپن سے تھا۔ کبھی کبھی والد سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر زیادہ تر اپنی طبیعت خداداد اور فطری ذہانت سے کام لیتے تھے۔ انشار مرشد آباد چھوڑ کر شاہ عالم کے زمانہ میں دلّی آئے۔ شاہ عالم اب محض برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے اور شاعروں کے بڑے قدرداں تھے۔ انہوں نے انشار کی بڑی قدر کی۔ دربار اس وقت بالکل لٹا پٹا تھا۔ مگر پھر بھی اس قدرداں بادشاہ نے اس جواں ہمت اور جواں طبیعت شاعر کو نظر شفقت و عنایت سے دیکھا اور اس کو انعام و اکرام سے مالامال کیا۔ سید انشار اہلِ دربار میں داخل ہوئے اور انہوں

---

[1] انشار پر مفصل حوالے عرشی صاحب کے حواشی دستور الفصاحت ص ۱۰۳ بعد میں دیکھیے نیز دلی سے ایک مفصل کتاب چھپ چکی ہے۔

نے بھی وہ لطیفے اور چٹکلے بادشاہ اور اہلِ دربار کو سنانا شروع کیے کہ پھر تو یہ عالم ہوا کہ اُن کی تھوڑی دیر کی بھی جدائی بادشاہ کو ناگوار ہوتی تھی۔ آخر کار دلی کی تباہی سے بددل ہو کر اور نیز اس خیال سے کہ ان کی قابلیت کے موافق یہاں ان کی قدر نہیں ہوتی تھی اور خاص کر مرزا عظیم بیگ کے مناقشہ کی وجہ سے انشاؔ نے لکھنؤ کا رُخ کیا جو اس زمانہ میں دہلی سے نکلے ہوئے شعراء اور دیگر باکمالوں کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا۔

یہاں پہنچ کر انہوں نے شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ متخلص بہ سلیماںؔ کی ملازمت اختیار کر لی جو خود بھی صاحب دیوان اور شاعروں کے قدرداں تھے۔ انشاؔ نے اپنی ظرافت اور بذلہ سنجیوں سے ان کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل کیا اور تھوڑے عرصے بعد ان کے قدیمی استاد مصحفیؔ کی جگہ لے لی۔ مگر اُن کی منچلی طبیعت جو ایک حال پر قائم رہنے والی نہ تھی۔ ہمیشہ ترقی کے لیے نئے راستے ڈھونڈھتی تھی۔

انشاء کی تقریب، نواب سعادت علی خاں کے دربار میں

تفضل حسین خاں علامہ[1] جو اپنی قابلیت اور حسنِ تدبیر سے سرکار انگریزی کے معتمد اور نواب سعادت علی خاں کے مشیر کار تھے۔ سید انشاؔ ان کی صحبت میں آجایا کرتے تھے۔ خاں علامہ ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور اس خیال میں تھے۔ کہ کوئی مناسب حال صورت ان کے لیے نکالیں۔ اتفاق سے ایک دن سیّد انشاؔ جوشِ تقریر میں ایک ایسا لفظ بول گئے جو ذو معنیین تھا اور اردو میں اس کے معنی قابلِ اظہار

---

۱ وزیر علی خاں کی مسند نشینی اور بعد کو ان کے اخراج اور سعادت علی خاں کی مسند نشینی انہیں کے حسن تدبیر کا نتیجہ تھی۔ خان علامہ علاوہ ایک مستند عالم فاضل اور باکمال ہونے کے اپنے زمانہ کے مشہور سیاستدان تھے۔ ان کو کئی زبانوں سے واقفیت تھی جن میں انگریزی اور لاطینی بھی شامل ہیں۔ سر آئزک نیوٹن نے ڈفرنشل کلکولس کا ترجمہ انہوں نے فارسی میں کیا ہے۔ (۱۲۱۵ھ میں انتقال فرمایا۔ فاضل)

نہیں۔ کہنے کو تو کہہ گئے۔ مگر خان علامہ کی نظر تاڑ کر بولے کہ زبان ماڑواڑی میں "بیوقوف" کو کہتے ہیں۔ انہوں نے کچھ سوچ کر کہا "خیر خاں صاحب انداز معلوم ہوگیا جلد کچھ صورت ہو جائے گی"۔ دوسرے دن نواب سعادت علی سے ان کے خاندان کی بزرگی اور ان کے ذاتی کمالات کا ذکر کرکے کہا کہ آپ کی صحبت میں ان کا ہونا شغل صغریٰ و کبریٰ سے بہتر ہوگا۔ وہ سُن کر مشتاق ہوئے۔ دوسرے دن خلعت صاحب سید انشا کو دے گئے۔ انشاؔ نے اپنے لطیفوں اور چٹکلوں اور مذاق و ظرافت سے نواب کو ایسا پرچایا کہ اُن کو ان کی ایک دم کی جدائی بھی ناگوار تھی۔ ان کی حاضر جوابیاں، ان کے پُر مذاق لطیفے، ان کی ظرافتیں نواب کو ایسی اچھی معلوم ہوتی تھیں کہ وہ ان کو ایک دم بھی اپنے سے جُدا رکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ آخر میں رنگ میں بھنگ اور ہنسی ہنسی میں مخالفت پیدا ہوگئی۔ انشار اپنے مذاق اور دل لگی کی باتوں میں بعض وقت حد سے گذر جاتے تھے اور جو مُنہ میں آتا کہہ جاتے تھے۔ ایسی باتیں اکثر موقعوں پر نواب کو موجب تفریح ہوتی تھیں مگر بعض دفعہ مکدّر ہو جاتے تھے اور ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ نواب کے مزاج کا پارہ حرارت ناپنے کے واسطے سید انشار بسا اوقات اچھے بیرامیٹر نہیں ثابت ہوتے تھے۔ مزاج میں بھی اختلاف تھا۔ انشار کی آزاد طبیعت یہ ہرگز گوارا نہیں کرسکتی تھی کہ موقع و بے موقع اور جا و بے جا نواب ہی کا کہنا مانا جائے اور اُن کی ہاں میں ہاں ملائی جائے چنانچہ ایک روز یہ واقعہ ہوا کہ دربار میں شرفائے خاندانی کی شرافت و نجابت کا ذکر ہو رہا تھا۔ نواب نے کہا "کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں؟" انشار محض مذاق سے اور بغیر سمجھے بوجھے بول اُٹھے "بلکہ انجب" (انجب عربی میں لونڈی بچہ کو کہتے ہیں) سعادت علی خاں فی الحقیقت حرم سے تھے۔ اس بے ہنگام لفظ پر سارے دربار میں

لہ ماخوذ از آب حیات ۱۲

سناٹا چھا گیا مگر کمان سے نکلا ہوا تیر کیونکر واپس کیا جا سکتا ہے نواب کے دل کی کھٹک کبھی نہیں نکلی اور اب اس فکر میں رہنے لگے کہ کوئی موقع پائیں تو انشار کو زک دیں۔ انشار کی بات بات کی گرفت ہونے لگی اور سخت سزائیں اور تکلیفیں ان کے واسطے تجویز کی جانے لگیں۔ حکم ہو گیا کہ سوائے ہمارے کسی امیر کے یہاں ہرگز نہ جاؤ۔ یہ نظر بندی ان کے لئے قید بے زنجیر تھی اس پر طرہ یہ ہوا کہ جوان لڑکا نعالی اللہ خاں مر گیا جس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ آخر میں ایک جنونی کیفیت بھی پیدا ہو گئی تھی جس کی ایک عبرت ناک کیفیت میاں رنگین کی زبانی آب حیات میں بیان کی گئی ہے[1]۔ اسی اثنا میں تنخواہ بھی بند ہو گئی تھی جس سے فاقہ کی نوبت پہنچ گئی تھی۔ وہ شخص جو کبھی چہکتا ہوا بلبل بادشاہ کی ناک کا بال اور اپنے دوستوں کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا۔ بالآخر اسی خراب صحت اور فقر و فاقہ کی حالت میں اس دار فانی سے چل بسا۔ یہ واقعہ ۱۲۳۳ھ کا ہے۔ جیسا کہ بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] آزاد نے انشار کے متعلق خصوصاً ان کے مجنوں ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی بہت سی روایتیں بیان کی ہیں جو پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچتیں اور بہت سی روایتیں مستند طور پر غلط قرار پائی ہیں۔ حیات دبیر کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو میر انشاء اللہ خاں کے نواسے تھے کہ سید انشار نہ مجنوں ہوئے نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی۔ صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علی خاں نے حکم دے دیا تھا کہ وہ سوا دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں اور دربار میں بھی بغیر بلائے حاضر نہ ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں انشار و مصحفی میں جھگڑا ہوا اور یہاں تک نوبت پہنچی تو نواب وزیر نے انشار کو لکھنؤ سے چلے جانے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ حیدرآباد گئے چند دنوں کے بعد نواب وزیر نے پھر بلا لیا۔ (تذکرۂ خازن الشعراء)۔ ناقل عرض کرتا ہے کہ حکیم احمد علی یکتا نے دستور الفصاحت میں واضح طور پر لکھا ہے۔ "آخر آخر مجنوں شدہ، چند سال گذشتہ بود کہ بہماں مرض در گذشت" یہ معاصر گواہی ہے جو ارد و مذکورہ ص ۱۰۷۔

خبر انتقال میر انشاء — دل غمدیدہ تا انشاط شگفت
سال تاریخ او ز جان اجل — "عرفی وقت[۱] بود انشا" گفت ۱۲۳۳

ان کے کلام کی خصوصیات انشاء کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے توسیع زبان کا کام جو مرزا رفیع سودا نے شروع کیا تھا جاری رکھا۔ انشاء پہلے ہندوستانی شخص ہیں جنہوں نے زبان اُردو کی صرف و نحو مدون کی اور حسب تحقیق و تلاش اور محنت سے اپنی مشہور کتاب دریائے لطافت مرتب کی اس سے اُن کا پایہ اُستادی بلند ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے کلام میں ہمواری اور استقامت نہیں ہے مگر ان کا اچھا کلام یقیناً بہت قابل قدر بلکہ قابل استناد ہے ان کے مختلف اصناف سخن سے پایا جاتا ہے کہ وہ زبان کو وسعت دینے کی غرض سے بہت سے تجربے کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ اپنی طبیعت اور زبان پر قابو رکھتے تو یقیناً وہ زبان اُردو کے بڑے پایہ کے استاد سمجھے جاتے۔ انشاء کی خاص خصوصیات یہ ہیں (۱) ظرافت۔ مذاق اور ظرافت میں ان کا ہم پلّہ شعرائے اُردو میں سوائے سودا کے اور کوئی نہیں ہوا۔ ان کی روزمرّہ کی گفتگو اور کلام نظم و نثر دونوں مذاق اور ظرافت سے بھرے ہوئے ہیں۔ (۲) جامعیت۔ ان کی طبیعت ایسی تھی جیسے ایک ترشا ہوا نگینہ جس کے مختلف پہل ہوتے ہیں۔ ان میں خاص صفت یہ تھی کہ ہر قسم کے مضامین کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتے تھے۔

(۳) علم و فضل۔ معلوم ہوتا ہے کہ مشکل مضامین علمیہ اپنے دماغ کے چھپے ہوئے گوشوں سے ایک لمحہ میں حاضر کر سکتے تھے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسا پُر لطف قصہ یا دلیل یا شعر یا کوئی دوسری سند اس خوبی سے پیش کرتے کہ حریف اس کو فوراً تسلیم کر لیتا۔

---

[۱] مادہ میں تعمیہ ہے یعنی اجل کی جیم کے عدد "عرفی وقت بود انشا" میں شریک کریں۔ فاضل

(۴) نہایت ذہین اور طبّاع تھے۔ اور ان کی قوت تخیّل بجلی سے تیز تھی۔

(۵) فارسی اور عربی کے فاضل زبردست تھے اور ان دونوں زبانوں میں اُن کے اشعار کا بہترین نمونہ موجود ہے۔ ان کے علاوہ ترکی۔ پشتو۔ پوربی۔ پنجابی۔ مارواڑی۔ مرہٹی۔ کشمیری اور ہندی بھی خوب جانتے تھے اور ان سب میں شعر کہہ سکتے تھے غرضکہ ایک بہت زبردست اور قابل زبان داں تھے۔ تضمین بھی خوب کہتے تھے۔ نہایت تیز و طرار طبیعت پائی تھی۔ اور مشکل اور نئی چیزوں میں اُن کو بڑا لطف آتا تھا۔ ایک مختصر دیوان صنعت غیر منقوطہ میں لکھا ہے۔ بعض نظموں میں دوسری صنعتیں بھی دکھائی ہیں۔ مثلاً واسع المشفتین یا ذو لسانین وغیرہ۔ ان کو اُردو کا امیر خسرو کہنا بجا ہے ان کو مشکل بحریں اور مشکل زمینیں بہت پسند تھیں اور اس میں اپنی زبان دانی کی قوت دکھائی ہے۔ ان کے بعض قوافی بھی بہت غیر معمولی اور دشوار ہوتے ہیں اور گو کہ بہت ہوشیاری سے نظم کیے ہیں مگر پھر بھی کانوں کو بُرے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ غزل کے واسطے وہ موزوں نہیں ہیں۔ ظرافت اور مذاق جو اُن کا خاصہ ہے بعض اوقات اس کی اتنی کثرت ہو جاتی ہے کہ مہذب طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے اور شعر میں ندرت اور خوبصورتی پیدا کرنے کے بجائے اس کو مہمل اور بھونڈا کر دیتا ہے۔ ظرافت کی کثرت شاید اس وجہ سے کی گئی ہو کہ اس زمانہ کے لوگوں کو جن کا مذاق بہت گر گیا تھا۔ یہ رنگ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ان کا مذاق لطافت اور تہذیب سے خالی ہے اور اسی تعلق سے اس عہد میں ریختی کی بنا پڑی جس کا موجد اور مخترع انشاء اور رنگین کو سمجھنا چاہیے انشاء کی بے ہنگام ظرافت نے تصوف ایسی مقدس اور پاک چیز کو نہ چھوڑا۔ چنانچہ اگر کسی کو تصوف اور مذاق کا بے جوڑ میل دیکھنا منظور ہو تو وہ اُن کی مثنوی شیر برنج دیکھ لے۔

انشاؔ کی خاص صفتیں یہ ہیں۔ زبان پر قدرت۔ ہمہ گیر طبیعت۔ ہر صنف شاعری میں

مہارت۔ اعلیٰ قابلیت۔ قوت ایجاد و اختراع۔ وطن کی روایات قدیمہ سے محبت اور مذاق و ظرافت۔ انشاؔ نے سوداؔ کی طرح مگر ان سے کسی قدر محدود درجہ پر ہندوستان کی تخیّل اور تلمیح سے اپنی غزلوں میں کام لے لیا۔ ان کا بڑا عیب یہ ہے کہ انہیں تناسب کا صحیح اندازہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے وہ صائب رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں ہمواری نہیں ہے۔ غزلوں میں خیالات کی قلّت اور الفاظ کی کثرت پائی جاتی ہے جس کی وجہ شاید ان کی مشکل زمینیں اور قوافی ہوں۔ قصیدہ اور غزل گوئی میں وہ معمولی قواعد شعر سے بے پروائی برتتے ہیں۔ اظہار ظرافت پر بھی قابو نہیں رکھتے۔ نواب اور اُن کے عیش پرست درباریوں کے خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی فحش سے بھی اپنی زبان خراب کرتے ہیں۔ یہ عیب ان کا خاص نہیں اس زمانہ کا عیب ہے یہی حال ریسٹوریشن کے انگریزی شعرار کا تھا۔ جن کا کلام اُس زمانہ کی خراب سوسائٹی کا آئینہ ہے۔ انشاؔ نے شعر کو اپنے نواب کی خوشی کے ماتحت کر دیا تھا۔ وہ شعر کے بلند درجہ پر کبھی فائز نہیں ہوئے۔ شاعری ان کے واسطے حصول غرض کا ایک ذریعہ تھی۔ ان کا کوئی اعلیٰ مطمح نظر نہ تھا اور نہ کوئی پیغام اُن کو پہنچانا تھا۔ درباری شاعر بن کر اُن کو معقول سزا ملی۔ جب کہ ان کے مسخرے پن کی باتوں اور ہزل و ہجو پر انعام و اکرام ملتے تھے اور ان کی قدر ہوتی تھی تو پھر اعلیٰ شاعری کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ وہ ایسے زبردست طبیعت کے پاک باطن بھی نہ تھے کہ اپنے زمانہ کے رنگ اور گرد و پیش کے حالات سے متاثر نہ ہوتے۔ بہر صورت جو کچھ لکھا ہے وہ سب بے کار اور خراب بھی نہیں ہے۔ اُن کے کلام میں جا بجا نہایت بیش بہا جواہر بھی ملیں گے۔ جو مرتبہ میں کسی سے کم نہیں۔ ان کا قصیدہ جو جارج سوم کی تعریف میں ہے۔ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ سید انشاؔ اور ان کی شاعری کے متعلق میاں بیتابؔ کا چبھتا ہوا جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ ہے کہ " انشاؔ کے علم و فضل کو اُن کی شاعری

نے کھویا اور اُن کی شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی درباداری نے ڈبویا۔" اگر کسی کو انشار کے مفصل حالات دلچسپ لطیفوں اور چٹکلوں کے ساتھ دیکھنا منظور ہوں تو وہ آب حیات میں اُن کا حال پڑھے۔

تصانیف اُن کی تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

کلیات جس میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:۔

(۱) ایک دیوان اُردو غزلوں کا جس سے زبان پر اُن کی پوری قدرت معلوم ہوتی ہے مگر ہمواری نہیں ہے۔ فصیح الفاظ، عمدہ محاوروں، چُست ترکیبوں کے ساتھ یہ عیب بھی ہے کہ کہیں کہیں قواعد شعر کی خلاف ورزی ہو گئی ہے۔ بعض اشعار فی الواقع بہت اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ اور نظم اُردو کے بہترین نمونے کہے جا سکتے ہیں۔

(۲) دیوان ریختی جس کے آخر میں کچھ مستزاد اور پہیلیاں اور طلسمات بھی ہیں۔

(۳) قصائد اردو و فارسی۔ یہ حمد و نعت اور منقبت ائمۂ معصومین اور مختلف اشخاص کی تعریفوں میں ہیں۔ ان میں زبان پر قدرت اور الفاظ کی شان وشکوہ بہت پائی جاتی ہے۔ مگر قواعد کا خیال کم کیا گیا ہے۔ بعض جگہ مذاق اور ظرافت کے ساتھ نازک خیالی بھی خوب ہے اور عربی۔ فارسی۔ تُرکی اور دیگر زبانوں کے شعر بھی شامل کیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں ان کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے جو قصیدہ کی شان کے خلاف ہے۔

(۴) دیوان فارسی کا بھی یہی حال ہے۔ گو زبان کا زور اور لُطف بہت کچھ ہے مگر اکثر جگہ صرف مسخراپن ہے اور کچھ نہیں۔ اگر اپنے رفیق طبعی یعنی تمسخر کو چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے ضبط سے کام لیتے تو اُن کا پایہ شاعری بہت بلند ہوتا۔

(۵) ایک فارسی مثنوی موسوم بہ شیر و برنج جو مولانا رُوم کی مشہور مثنوی کی بحر میں اور اسی طرز پہ لکھی گئی ہے اور جس میں مسائل روحانیت و تصوف کو مذاق کے پیرایہ میں

بیان کیا ہے۔ مولانا آزاد نے خوب لکھا ہے۔ کہ کھیر (شیر برنج) میں نمک ڈال کر تصوّر کو تمسخر کر دیا ہے۔

(۶) ایک مثنوی بے نقط جس کی سُرخیاں بھی بے نقط ہیں۔ مثلاً "حمد" کے موقع پر لکھتے ہیں کہ "لوحہ در حمد مالک الملک" "نعت" کے واسطے "لوحہ در مدح سرورِ کل" "منقبت" کے واسطے "لوحہ مدح سوار دلدل" بادشاہ کی تعریف کے لئے "لوحہ در مدح حاکم عصر" وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب سرخیاں بھی موزوں ہیں۔ اس سے ہم دو بے نقط شعر نقل کرتے ہیں جس سے نمونۂ کلام کے علاوہ تاریخ تصنیف بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

لوحِ سالِ کلامِ مسطور

دُر در سلکِ کلام کردم   گردِ کرمِ اِلٰہ گردم

کردم سالِ در را محرّر   طورِ الاسرار و سطرِ گوہر

(۷) مثنوی شکار نامہ جو نواب سعادت علی خاں کے حکم سے ان کے شکار دھر ہر کے بیان میں بقید تاریخ بطور روز نامچہ کے لکھی گئی تھی۔ اس کی نظم بہت دلچسپ اور ترکیبیں بہت چست ہیں۔ تاریخ کے یہ دو اشعار بطور نمونہ دیے جاتے ہیں

قطعہ در تاریخ

فوجِ ظفر موج بایں عزّ و جاہ   گر در سانید چو بر اوجِ ماہ!

شوکتش انشا بخطِ زر نوشت   فقرۂ تاریخ منظفر نوشت

(۸) ہجویں۔ گرمی۔ بھڑوں۔ کھٹملوں۔ مکھیوں۔ مچھروں وغیرہ کی شکایت میں اور متفرق اشخاص کی ہجویں منجملہ جن کے میاں مصحفی کی ہجو جو بحرِ طویل میں ہے۔

بہت دِل چسپ ہے۔

(۹) مثنوی موسوم بہ شکایت زمانہ۔

(۱۰) چند مثنویاں جو عاشقانہ رنگ میں ہیں۔ اور ایک میں ایک ہاتھی اور چنچل پیاری ہتھنی کی شادی کا دِل چسپ افسانہ ہے۔

(۱۱) ایک مثنوی بہ زبان مارواڑی جس میں گیان چند ساہوکار کی ہجو ہے ایک دوسری مثنوی موسوم بہ مرغ نامہ جس میں مرغبازی کے قواعد مذاق اور تمسخر کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

(۱۲) مائتہ عامل عربی بزبان فارسی۔

(۱۳) متفرق اشعار، معمے، رباعیاں، قطعے، تاریخیں، پہیلیاں، چیستانیں وغیرہ۔

(۱۴) دیوان بے نقط[۱]۔

کہانی ٹھیٹ ہندی میں اس مضمون[۲] کے نام سے ایک کتاب نثر اُردو میں لکھی ہے۔ جس میں ایک لفظ بھی عربی و فارسی کا نہیں آنے دیا اور نہ کوئی لفظ سنسکرت یا ٹھیٹھ ہندی بھاشا کا ہے۔ اور باوجود اس کے زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ اُردو ہے مقدار میں تقریباً ۵۰ صفحے ہوں گے۔ اس کے اکثر حصے اُن کتابوں میں نکل چکے ہیں جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی طرف سے شایع ہوئی تھیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے عرصہ ہوا اس کو کئی جلدوں میں شایع کیا تھا۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے:۔

---

[۱] ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ دو کتابیں قلمی ابھی دستیاب ہوئی ہیں۔ جن کو سید انشاؔ نے نواب سعادت علی خاں کے حکم سے ان کی دل چسپی کے واسطے لکھا تھا۔ ایک کا نام لطائف السعادت اور دوسری کا نام بحر السعادت ہے۔ آخر الذکر کا دریائے لطافت سے بھی کچھ تعلق معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کہ اس کا نقش اوّل ہو۔

[۲] اس کا نام رانی کیتکی ہے۔

ایک راجہ تھا۔ جس کا نام سورج بھان تھا۔ اور اس کی رانی کا نام لچھمی باس تھا۔ ان کے ایک لڑکا تھا جو اودے بھان کے نام سے مشہور تھا اور وہی اس قصہ کا ہیرو ہے۔ ایک دن وہ بغرض سیر و شکار جنگل کی طرف نکل گیا۔ ایک ہرنی کے پیچھے گھوڑا ڈالا، رات ہو گئی اور راستہ بھول گیا۔ ایک باغ میں اس نے چند خوب صورت لڑکیوں کو جھولا جھولتے دیکھا۔ جن میں راجہ جگت پرکاش و رانی کام لتا کی خوب صورت رانی کیتکی بھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ مدن بان رانی کیتکی کی سہیلی اور ہمراز تھی۔ اس کے کہنے سے ان دونوں نے اپنی اپنی انگوٹھی ایک دوسرے سے بدل لی۔ کنور اودے بھان واپس آیا تو اس کی حالت کیتکی کے عشق میں خراب ہو گئی۔ آخر تش یہ راز اودے بھان کے باپ پر ظاہر ہوا۔ تو اُس نے شادی کا پیام راجہ جگت پرکاش کو بھیجا جسے اُس نے بڑی حقارت سے رد کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ دونوں راجاؤں میں جنگ چھڑ گئی۔ لڑائی کے دوران میں کنور اودے بھان نے ایک مالن پھول کلی کے ہاتھ ایک رقعہ رانی کیتکی کے پاس بھیجا اور خفیہ بھاگ چلنے کے لیے اصرار کیا۔ رانی کیتکی کی غیرت نے اسے قبول نہ کیا۔ جگت پرکاش نے دیکھا کہ فتح نصیب نہیں ہوتی تو اس نے اپنے گرو مہندر گر کو جو کیلاس پربت (کوہ ہمالیہ) پر رہتا تھا، اپنی کمک پر بلایا۔ اُس نے اپنے علم کے زور سے سورج بھان کو شکست دی اور کنور اودے بھان اور سورج بھان اور مہارانی لچھمی بان ہرن ہرنی بن گئے اور کئی برس تک یوں ہی بسے چلتے وقت گرو نے راجہ جگت پرکاش اور اس کی رانی کو ایک شیر کی کھال اور بھبوت دی اور یہ ہدایت کی کہ اگر میری ضرورت ہو تو کھال میں سے ایک بال نکال کر جلا دینا، میں فوراً پہنچ جاؤں گا۔ اور بھبوت اس لیے ہے کہ جو کوئی چاہے۔ اُس کا انجن لگائے تو وہ سب کو دیکھے اور اُسے کوئی نہ دیکھے۔ رانی کیتکی کو اپنے عاشق کی جدائی شاق تھی اور وہ نہایت پریشان و مضطرب تھی ایک روز چالاکی سے آنکھ مچولی

کھیلنے کے بہانے اس نے بھبوت مانگا اور اس کو لگا کر رات کو نکل گئی۔ اس کی سہیلی مدن بان کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ بھی کیتکی کی تلاش میں بھبوت لگا کر نکلی۔ ایک عرصہ بعد دونوں کی ملاقات ہوئی مدن بان واپس آگئی اور رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی محبت کا راز راجہ جگ پرکاش و رانی کام لتا پر ظاہر ہو گیا۔ جب یہ معلوم ہوا تو اس نے گھال کے بال سے مہندر گرو کو بلایا اور کل حالات بیان کیے رانی کیتکی اور اس کے ماں باپ اپنے ملک کو چلے گئے اور مہندر گرو نے تلاش کر کے کنور اودے بھان اور اس کے ماں اور باپ کو اصلی صورت میں کر دیا۔ راجہ اندر نے بھی اس کام میں اس کی مدد کی تھی اور آخر ش رانی کیتکی کی شادی بڑی شان و شوکت و تزک و احتشام کنور اودے بھان کے ساتھ ہو گئی۔

نمونۂ کلام یہ ہے: "اب اس کہانی کا کہنے والا آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ اسے لوگ پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے۔ اپنا ہاتھ منہ پہ پھیر کر مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوں۔ اور آپ کو جتاتا ہوں جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ، راؤ چاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں کہ آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچپلاہٹ میں ہے دیکھتے ہی ہرن کے روپ اپنی چوکڑی بھول جائے۔" چوتکا

گھوڑے پہ اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں — کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں

اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی — کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

دریائے لطافت

پہلی کتاب قواعد اردو کی ہے جو ہمارے اہلِ زبان نے اردو سے متعلق لکھی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء ہے۔ اس کی تصنیف میں مرزا قتیلؔ بھی شریک تھے۔ انشاءؔ نے اس کا پہلا حصہ لکھا جس میں اردو زبان کی صرف و نحو کا حال ہے۔ اس میں اوّل اردو بولنے والوں کی مختلف زبانوں کے نمونے دکھائے ہیں اور پھر قواعد بیان کیے ہیں۔ طرزِ تحریر میں وہی ظرافت اور

تمسخر ہے جو ان کے دُم کے ساتھ ہے۔ دوسرا حصہ مرزا قتیلؔ کی تصنیف ہے۔ اِس میں عروض و قافیہ، منطق، معانی، بیان وغیرہ کا ذکر ہے۔ مرزا قتیل نے بھی اپنے دوست کی پیروی میں مذاق اور ظرافت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ مگر پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہے لُطف سے خالی نہیں۔ مثلاً تقطیع میں بجائے مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن کے پری خانم۔ پری خانم۔ پری خانم۔ پری خانم لکھا ہے اور مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن کی جگہ بے جان پری خانم بے جان پری خانم۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرا حصہ اتنا دلچسپ نہیں جتنا پہلا ہے۔ سیّد انشاؔ پہلے شخص ہیں جنھوں نے زبان اُردو کی اہمیت اور اس کے قواعد مرتب کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ انھوں نے صحیح محاورات لفظوں کی اصل، اور تلفظ کی تحقیق و تلاش میں اپنا بہت سا وقت عزیز صرف کیا اور بیگماتی اور محلات کی جو زبان لکھی ہے وہ بھی ہمارے واسطے دلچسپی سے خالی نہیں۔ انہوں نے بڑی محنت اور قابلیت سے اس اثر کا بھی ذکر کیا ہے جو مختلف قومیں اور جماعتیں مشترکہ زبان اُردو کی ترقی پہ ڈالتی ہیں۔ قواعد کو نہایت صفائی کے ساتھ اور مکمل طریقہ پہ بیان کیا ہے۔ اُردو کے حروف تہجّی اور اُن کی آوازوں کو نظرِ تعمق سے دیکھا ہے ان کی رائے میں مجموعی آوازوں کی تعداد ۸۵ ہے۔ زبان کے مختلف شعبوں مثلاً پوربی، مارواڑی وغیرہ کے نمونے دیے ہیں اور دکھایا ہے کہ ان کا اثر اُردو پہ کس طرح پڑتا ہے۔ یہ کتاب اس وجہ سے بھی دلچسپ ہے کہ اُس میں بہت سے متروکات دے کر ان کی مروجہ الفاظ کو بیان کیا ہے۔ پوری کتاب کا طرزِ تحریر مذاق و ظرافت سے بھرا ہوا ہے مگر باوصف اس کے وہ قدیم اُردو گرامر کی حیثیت سے نہایت قیمتی چیز ہے۔

غرض کل تصنیفات کی حالت مجموعی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انشاؔ من حیث الادیب اور نیز من حیث الشاعر بہت بلند پایہ رکھتے تھے۔ اُن کی تصانیف میں اتنا تنوع ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں۔ تصرف اور ایجادوں کے حاکم علی الاطلاق

اور ظرافت و لطافت میں طاق و مشّاق تھے۔ چنانچہ اُن کا ایک قطعہ خمخانۂ جاوید جلد اوّل سے نقل کرکے بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ فائق تخلص ایک شاعر تھا۔ جس نے اُن کی ہجو کہی اور خود لاکر سُنائی تھی۔ انہوں نے بہت تعریف کی اور پانچ روپے دیے اور یہ قطعہ بھی کہہ کر روپیوں کے ساتھ ساتھ اُس کے حوالہ کیا۔

فائق بے حیا چو ہجوم گفت
دلِ من سوخت سوخت سوختہ بہ

صلہ اش پنج روپیہ دادم
دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

اِس شاعر نے لفظ بِدَ کو مشدّد باندھا تھا انشاؔ نے اُس کے جواب میں بطور تعریض کے جو قطعہ لکھا ہے درج ذیل ہے۔

چہ خوش گفت فائق شاعرِ غرّا
کہ چوں ذہن او ذہن رسا نباشد

یکے شعر نادر کہ درچند وزن
شود خواندہ و شک بمعنا نباشد

دراں لفظ بِدرا بدالِ مُشدّد
نوشت ست و ایں غلط اصلا نباشد

شنید ایں سخن راچو گردد سخن
ز انشاؔ کہ ہمسرش اصلا نباشد

بگفتا کہ من شاعرِ خوش فکرم
چو من ہیچ مغفّل گویا نباشد

تو گلستان راندانی درست
ترا ہیچ شعور ذکا نباشد

سند یاد از اُستاد ست مارا
بکلام ما ہیچ خطا نباشد

چو تشدید در شعر ضرورت افتد
تشدید صحیح چرا نباشد

جرأت (متوفی ۱۲۲۵ھ) جرأت تخلص[1]۔ مشہور نام شیخ قلندر بخش۔ اصلی نام یحییٰ امان تھا۔ ان کے والد کا نام حافظ امان ہے۔ اور سلسلہ خاندان رائے امان سے ملتا ہے جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں دربار شاہی میں خدمت دربانی پر مامور تھے۔

---

[1] فائق صاحب کے خیال میں سنہ ولادتِ جرأت ۱۶۳۰ء ۱۲۴۰ھ کے درمیان اور وفات ۱۲۲۴ھ ہے۔

دِلّی میں کوچہ رائے مان انہیں کی طرف منسوب ہے اور یہ نادر شاہی حملہ دہلی ۱۷۳۹ء میں مارے گئے۔ جرأت کا زمانۂ بچپن فیض آباد میں گذرا جیسا کہ میر حسن کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ وطن سے بہت کمسنی میں نکلے تھے۔ شروع میں نواب محبت خاں پسر حافظ رحمت خاں کی رفاقت کی، چنانچہ خود کہتے ہیں:۔

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بستاں کے

ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

اس کے بعد ۱۲۱۵ھ میں صاحب عالم و عالمیان مرزا سلیمان شکوہ کے حاشیہ نشینوں میں داخل ہوئے اور آخر تک لکھنؤ ہی میں رہے اور وہیں وفات پائی ناسخ اور نساخ دونوں نے وفات کی تاریخیں کہی ہیں۔ ناسخ کی تاریخ ہے ؎

جب میاں جرأت کا باغِ دہر سے | گلشنِ فردوس کو جانا ہوا
مصرعِ تاریخ ناسخ نے کہا | ہائے ہندستان[2] کا شاعر موا ۱۲۲۵ھ

جرأت مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ علاوہ فن شاعری کے نجوم میں ماہر اور فنِ موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے اور ستار خوب بجاتے تھے[3]۔ افسوس ہے جوانی ہی میں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ بعض کہتے ہیں یہ حادثہ چیچک سے ہوا، بعض کچھ دوسری وجہ بتاتے ہیں۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں اس کو بہت طول دے کر لکھا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ہمارا نوجوان عاشق مزاج شاعر جنس نازک کی پُر لطف صحبتوں کا

---

[1] گلی کے سرے پر جو بورڈ لگا ہے اُس پر کوچہ رحمٰن لکھا ہے ۱۲

[2] ہندستان بغیر واو کے پڑھنا چاہیے ۔ ۱۲

[3] مرزا علی لطف اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں: "علم موسیقی میں مشغلہ بھلا چنگا رکھتا ہے اور ستار کے بجانے میں نہایت دستِ رسا رکھتا ہے۔ نجوم میں بھی اس شخص کو دخل تمام ہے۔ ایسا کہ ایک عالم لکھنؤ کا اس کا منتظرِ احکام ہے ۔ ۱۲

بہت دلدادہ تھا۔ مگر پردے کے سبب سے شرفاء اور اُمراء کے گھروں میں گھسنے نہیں پاتا تھا۔ ایک مرتبہ آشوب چشم کے بعد مشہور کر دیا کہ میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور مجھ کو اب کچھ نہیں سوجھتا۔ اس بہانے سے رئیسوں اور امیروں کے گھروں میں اندھا بن کے جانے لگا اور خوب صورت عورتوں کو چپکے چپکے تاکنے لگا۔ آخرکار اپنی اس بدکاری کی پاداش میں سچ مچ اندھا ہو گیا۔

جرأت زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ زبان عربی اور معمولی علوم و فنون سے ناواقف تھے مگر طبیعت بلا کی پائی تھی۔ شعر کا شوق اُن کو خلقی تھا۔ کبھی فکر شعر سے غافل نہیں رہتے تھے۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں " دیوانۂ فن شعر است کہ گاہے بے فکر نمی ماند۔ بسیار دردمند و گداز است "

تصانیف ایک دیوان اور دو مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ دیوان میں غزلیں، فردیات، رُباعیاں، مخمس، مسدس، ہفت بند، ترجیع بند، واسوخت، تاریخیں، ہجو، سلام، مرثیے، سب کچھ ہیں۔ ایک فالنامہ بھی ہے۔ دو مرثیوں کے آخر میں جو تاریخیں دی ہوئی ہیں ان سے ۱۱۹۱ھ اور ۱۱۹۲ھ نکلتے ہیں۔ مثنویوں میں ایک ۱۲ صفحات اور دوسری ۳۲ صفحات کی ہے۔ ایک میں برسات کی ہجو اور سن تصنیف ۱۱۹۵ھ ہے۔ دوسری مثنوی کا سن تالیف ایک تاریخ سے ۱۲۲۵ھ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا "حسن و عشق" اور اُس میں ایک بزرگ خواجہ حسن نام اور لکھنؤ کی ایک حسین رنڈی بخشی کے عشق کا ذکر ہے۔ اس کی زبان نہایت فصیح و پُر لطف اور کلام نہایت نمکین و بامزہ ہے۔

جرأت کی خصوصیات اور اُن کا مقابلہ میر کے ساتھ جرأت نے قصیدہ یا کسی دوسری مشکل اور متین صنف نظم کو اختیار نہیں کیا فارسی میں بھی کچھ نہیں کہا جیسا کہ اُس زمانہ کے ذی استعداد شعراء کا دستور تھا۔ وہ علی الخصوص ایسی محفل کے شاعر تھے جہاں شراب ناب

کے دور چلتے ہوں اور حسن و عشق کے چرچے ہوتے ۔ عاشقانہ رنگ بلکہ اس میں بھی معاملہ بندی، اُن کا خاص رنگ ہے اور اُس میں ان کو درجۂ کمال حاصل ہے۔ یہی معاملہ بندی بعض وقت زیادہ تفصیل کے بعد فحش کی حد سے مل جاتی ہے اور ان کے اشعار کو مہذب صحبتوں کے لائق نہیں رکھتی۔ باعتبار رنگ کے ان کا اور میر کا کلام ملتا جلتا ہے۔ کیونکہ دونوں غزال تھے۔ ان دونوں کا رنگ عاشقانہ ہے مگر میر کے جذبات اور درد و اثر جرأت کے یہاں مفقود ہیں۔ میر عمیق اور جرأت سطحی شاعر ہیں۔ ان کے یہاں معاشیق علی الخصوص معاشیق بازاری کے ناز و کرشمے، عشاق کی حرماں نصیبی، ہجر کی مصیبتیں، درباریوں کی ایک دوسرے کے ساتھ رقابت اور بے پروائی وغیرہ وغیرہ، غرضکہ جو کچھ ایک عیش پرست دربار اور عشرت طلب سوسائٹی کا تقاضا تھا۔ بہت خوبی اور بڑی کامیابی سے بیان ہوا ہے۔ غزل کے لئے ان کی طبیعت بہت مناسب واقع ہوئی تھی۔ میر کے رنگ کو انھوں نے اختیار کیا اور اس کی شیرینی اور فصاحت و بلاغت میں ایک ایسی چاشنی اور شوخی اضافہ کی جس سے ان کا طرز علیحدہ ہو کر مقبول عام ہو گیا۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ میر میں اور اُن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میر کا تخیل بلند اور ان کا عاشقانہ رنگ بہت اعلےٰ اور ارفع قسم کا ہے۔ جرأت کا عشق مادی اور ادنےٰ درجہ کا ہے میر کے قدردان اہلِ دل، سخن شناس اور جرأت کے دلدادہ عوام الناس ہیں۔ سچ پوچھیے تو اصلی فرق دونوں کی طبیعتوں کا ہے۔ میر میں متانت، خودداری، استغراق اور گوشہ نشینی تھی اور وہ شاعری کو ایک نہایت معزز اور مقدس کام خیال کرتے تھے۔ برخلاف اس کے جرأت ایک حریف، ظریف، ہشاش بشاش خوش طبع آدمی تھے۔ ہمیشہ صحبت کے متلاشی اور شاعری کو ذریعۂ معاش اور جلب زر کا ایک زبردست آلہ سمجھتے تھے اور شعر کے ذریعے سے اپنے تئیں اپنے مربّیوں اور سرپرستوں کا

ایک دل چسپ کھلونا بنائے ہوئے تھے اور ان کے دل کو خوش کر کے ان سے کچھ اینٹھنا جانتے تھے۔ ان میں میرؔ اور انشاؔ کا ایسا علم و فضل اور قواعد شعر سے ویسی واقفیت نہ تھی مگر پھر بھی اُن کا ایک طرزِ خاص ہے اور ان کے کلام میں ایسی سادگی اور مزہ ہے جو عام دلوں کو بہت مرغوب ہے۔ میرؔ نے جو رائے اُن کی غزلوں کی نسبت ظاہر کی تھی وہ سُننے کے قابل ہے اور بہت صحیح ہے۔ مرزا محمد تقی خاں ترقیؔ کے مکان پر ایک مشاعرہ تھا جس میں شہر کے سب نامی رئیس اور شاعر جمع تھے۔ میر اور جرأت بھی تھے۔ جرأت نے جو غزل پڑھی اس پر بہت واہ واہ ہوئی اور بہت تعریفیں ہوئیں۔ وہ ازراہ تمسخر یا شوخی سے، جو کچھ سمجھیے میر صاحب کے پاس آ بیٹھے اور اپنے کلام کی داد چاہی، میر صاحب نے دو ایک مرتبہ تو ٹالا مگر جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو تیوری چڑھا کر فرمایا: "تم شعر کہنا کیا جانو اپنی چُوما چاٹی کر لیا کرو۔" مختصر یہ کہ جرأت کا پایۂ شاعری بہت بلند نہیں، دربار کے توسل نے ان کو بھی مٹایا جیسا کہ انشاؔ کو مٹایا تھا۔ پھر بھی انشاؔ کو ان کے علم و فضل نے بچا لیا۔ ان کا تو یہ بھی سہارا نہ تھا۔ جرأت نے زبان یا نظم اردو کی ترقی میں بھی کوئی حصّہ نہیں لیا۔ جو شاہراہ متقدمین قائم کر گئے تھے اسی پر آنکھیں بند کیے چلے گئے۔ کہا جاتا ہے وہ عاشقانہ رنگ کے موجد ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دعوے صرف اس حد تک صحیح ہو سکتا ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے بگڑے ہوئے عام مذاق کی پیروی کی اور ایک ایسا رنگ اختیار کیا جس کی تکمیل متاخرین میں

جرأت اور داغ نواب مرزا خاں داغؔ کے ہاتھوں ہوئی۔ ان دونوں شاعروں میں باعتبار لفظ اور معنی دونوں کے فی الواقع بہت مماثلت اور مشابہت ہے۔

مصحفی (۱۱۶۴ھ تا ۱۲۴۰ھ) شیخ غلام ہمدانی نام۔ مصحفیؔ تخلص۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے

ا؎ دیکھیے نٹ نوٹ صفحہ ۲۴۳۔

امروہہ کے رہنے والے تھے۔ آغاز جوانی میں وطن چھوڑ کر ۱۱۹۰ھ میں دلّی آئے جہاں تکمیل علوم کی اور شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔ ان کو پڑھنے کا اس قدر شوق اور کتب بینی سے اس قدر ذوق تھا کہ کتابیں عاریت لے لے کر پڑھتے تھے۔ اور بطور خلاصہ اپنی یاد داشت کے طریقہ پر لکھتے جاتے تھے۔ انہوں نے ۱۱۹۵ھ ہی میں شعر گوئی میں شہرت حاصل کر لی تھی کیونکہ تذکرۂ میر حسن میں ان کا ذکر عزّت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ خود مشاعرہ بھی کرتے تھے۔ جن میں معزّز شعراء مثل انشاؔ اور میر حسنؔ اور جرأتؔ وغیرہ کے جمع ہوتے تھے۔ بارہ برس دلّی میں رہ کر مثل اور شعراء کے لکھنؤ آئے جب کہ نواب آصف الدولہ سریر آرائے حکومت تھے۔ لکھنؤ میں اُنھوں نے مستقل قیام کیا اور شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے ملازم ہوئے۔ لکھنؤ آنے سے پہلے کچھ دنوں ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں کے پاس رہے تھے۔ لکھنؤ تھوڑے دنوں رہ کر پھر دلّی چلے گئے مگر کچھ دنوں کے بعد آب و دانہ کی کشش اُن کو پھر لکھنؤ کھینچ لائی آزاد کی تحقیق کے موافق ۱۲۴۰ھ میں تقریباً اسّی برس کی عُمر میں انتقال کیا جب کہ آٹھواں دیوان ترتیب دے رہے تھے۔ شیفتہ بھی اپنے گلشنِ بے خار میں، جو ۱۲۵۰ھ کی تصنیف ہے لکھتے ہیں کہ ان کو مرے دسؔ برس ہوئے۔ حسرت موہانی اپنے تذکرہ میں ان کا سن ولادت ۱۱۶۴ھ[1] لکھتے ہیں۔ لہذا مرنے کے وقت ان کی عمر ۷۶ برس کی ہوگی۔

| تصانیف | مصحفی اردو اور فارسی دونوں کے پُر گو شاعر تھے۔ ۱۲۰۹ھ کے پہلے

انہوں نے دو[2] دیوان فارسی مرتب کیے تھے ایک نظیری نیشاپوری کے جواب

---

[1] ۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۰ء، ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء تاریخ ولادت میں بہت اختلاف ہے ۴۱، ۵۶ وغیرہ، قریشی صاحب نے احوال مصحفی کے تقریباً ۳۰ حوالے لکھے ہیں۔ دیکھیے دستور الفصاحت ص ۹۳۔ ابو اللیث صدیقی نے مستقل کتاب لکھی ہے۔ مصحفی اور ان کا کلام۔ طبع شیخ مبارک علی لاہور۔ فاضل۔

ہیں۔ اور دوسرا اپنی طبع زاد غزلوں کا مجموعہ۔ ان کے علاوہ دو اور فارسی دیوان بھی لکھے ایک ناصر علی کے رنگ میں اور دوسرا جلال اسیر کے انداز میں۔ یہ دونوں دیوان چوری گئے۔ اب ان کا صرف ایک دیوان فارسی مروج ہے جس کا ذکر سب تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ ایک تذکرہ فارسی شعرار کا اور ایک اُردو شعراء کا فارسی زبان میں لکھا۔ شاہنامہ کا ایک حصہ بھی لکھا ہے جس میں شاہ عالم کے خاندان تک کے حالات درج ہیں۔

تذکرہ شعرائے اُردو

مصنفہ ۱۷۹۴ء

مصحفی کی شہرت زیادہ تر ان کے ضخیم اُردو دیوانوں اور تذکرہ پر مبنی ہے۔ آٹھ اُردو دیوان ان کی یادگار ہیں جن میں ہزارہا غزلیں، قطعے، قصائد وغیرہ سب کچھ موجود ہیں۔ تذکرہ شعرائے اُردو جو زبان فارسی میں ہے ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں ترتیب پایا۔ اور اب ملتا ہے۔ یہ نہایت مفید کتاب ہے اور اس میں تقریباً ساڑھے تین سو شعراء کا ذکر ہے جو محمد شاہ کے زمانہ سے لے کر مصنف کے زمانہ تک تھے انہوں نے اپنے معاصرین کا خصوصیت کے ساتھ مفصل ذکر کیا ہے۔ اور کلام کے نمونے بھی دیے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تذکرہ ان کے شاگرد میر مستحسن خلیق خلف میر حسن کی خاص فرمایش سے لکھا گیا تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مصحفی کے آٹھوں دیوان اور دونوں تذکرے بھوپال میں کسی صاحب کے پاس موجود ہیں۔

خصوصیاتِ کلام

سب سے بڑی صفت مصحفی میں یہ تھی کہ وہ نہایت زود گو تھے۔ جب وہ شعر کہتے تھے اور قلمبند کرتے جاتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کتاب سے نقل کر رہے ہیں مشاعروں کے لیے بکثرت غزلیں کہہ رکھتے تھے معمولی غزلیں خریداروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے اور منتخب اشعار اپنے لئے رکھ لیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زود گوئی یا پُر گوئی سے ان کے کلام میں ناہمواری پیدا

ہو گئی۔ کیونکہ پُرگوئی نے زیادہ جانکاہی اور غور و فکر کا موقع نہیں دیا۔ دوسری خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ مسلم الثبوت جگت استاد تھے۔ اور بڑے بڑے استاد اُن کے دامن تلمذ سے وابستہ تھے۔ مثلاً میر مستحسن خلیق۔ قمیر آتش۔ شہیدی۔ عیشی وغیرہ۔ بلکہ اگر سچ پوچھیے تو ان کے زمانہ کے بعد کے اکثر شعراء بالواسطہ یا بلاواسطہ انہیں کے شاگرد تھے۔ ناسخ کی نسبت مشہور ہے کہ ان کو کسی سے فخر تلمذ حاصل نہ تھا۔ مگر وہ بھی محمد عیسیٰ تنہا کے ذریعہ سے جو مصحفی کے شاگرد رشید تھے۔ اسی مائدۂ سخن کے ریزہ چین ثابت ہوتے ہیں جیسا کہ خود مصحفی نے اپنے چھٹے دیوان کے دیباچہ میں ان کی نسبت لکھا ہے۔ اس سے بڑھ کر ثبوت مصحفی کے کمال فن کا کیا ہو سکتا ہے۔ کہ جتنے اُستاد اُن کے شاگردوں میں نکلے اتنے اور کسی کو نہیں ہوئے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قواعد نظم کے یہ نہایت سخت پابند رہے اور شتر گربہ کے عیب سے جو میر و سودا ایسے استادوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ان کا کلام پاک ہے۔ ناسخ نے اور بھی اس اصلاح کے آئین کو درجۂ تکمیل پر پہنچایا۔ مگر ان کے کلام میں رطب و یابس شامل ہونے کی وجہ سے ہمواری نہیں ہے کہیں میر تقی میر کا درد و گداز ہے۔ کہیں سودا کی بلند پردازی، کہیں فغاں کی رنگینی کہیں میر سوز کی سادگی۔ کسی میں جرأت کی شوخی اور کہیں کہیں انشاء کا بھی رنگ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا کلام اعلیٰ درجہ کا قدما کے رنگ کا بھی بہت ہے مگر زیادہ تر غزلیں معمولی ہیں اور کسی خاص رنگ کی نہیں ہیں۔ بعض غزلوں کی زمینیں سودا کے تتبع میں نہایت سخت اور ردیف و قافیہ مشکل رکھے گئے ہیں اور گو کہ ان میں شاعری کا کمال دکھایا ہے مگر پھر بھی سودا کا سا زور اور اُستادی نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ میر تقی اور میر سوز کے تتبع میں بہت سے اشعار سادہ اور فصیح اور دردناک لہجہ میں کہے ہیں مگر پھر بھی مذکورہ بالا استادوں کی وہ بات کہاں

مختصر یہ کہ غزل میں اُن کا کوئی خاص رنگ نہیں اور بعد اشعار کی عمدگی کو من اولہٖ الیٰ آخرہ نباہ نہیں سکتا۔ یہی حال ان کے قصیدہ کا بھی ہے۔ جن میں قواعد کی پابندی اور الفاظ ومعانی کی بلندی تو ضرور ہے مگر متقدمین کا زور اور شان و شکوہ پیدا نہیں ہو سکا۔ چند مثنویاں بھی رکھی ہیں جن میں ایک "بحر المحبت" میر کی مثنوی "دریائے عشق" کے رنگ میں بلکہ اُس کی نقل ہے۔ قصہ کا بیان اور طرز عبارت وغیرہ سب اُسی سے ملتے جُلتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مصحفی کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں، وہ متقدمین کے پیرو تھے اور نہایت زود گو اور پُر گو تھے۔ مختلف اصناف سخن پر انہیں کمال حاصل تھا ملکی خصوصیات ان کے یہاں جرأت سے زیادہ اور انشا سے کم ہیں۔ نہ تخیل میں بلندی ہے نہ جذبات میں دل کشی ہے۔ الفاظ بھی بعض جگہ ایسے لکھ گئے ہیں۔ جواب متروک ہو گئے۔ زبان میں اکثر جگہ میر و سودا کی پیروی ہے۔ گو کہ زمانہ انشا اور جرأت کا پایا تھا۔

مصحفی اور سید انشار کے معرکے

مصحفی اور سید انشار کے معرکے نہایت مشہور ہیں جن میں مختلف ہجووں اور مذاق و تمسخر سے جو لبا اوقات فحش کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ بہت کام لیا گیا ہے۔ یہ واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ آب حیات میں درج ہیں۔ اگر کسی کو دیکھنا ہوں تو اس کتاب میں دیکھنا چاہیے۔ یہاں بھی مختصراً بمصداق مشتے نمونہ از خروارے لکھے جاتے ہیں۔ ابتداء اس واقعہ کی یوں ہوئی کہ میاں مصحفی پہلے شہزادہ سلیمان شکوہ کے کلام پہ اصلاح دیتے تھے۔ جب سید انشار پہنچے تو اُن کے سامنے اِن کا رنگ کب جم سکتا تھا۔ چنانچہ اب غزلیں ان کے پاس آنے لگیں جس سے مصحفی کو بڑا قلق ہوا۔ اسی اثنار میں ان کی تنخواہ بھی کم کر دی گئی جس کے متعلق انہوں نے ایک قطعہ لکھ کر شہزادہ موصوف کو گذرانا جس کے چند اشعار یہ ہیں :-

چالیس برس کا ہی ہے چالیس سے کے لائق | تھا مرد معمر کہیں دس بیس کے لائق
اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے | ہم بھی تھے کبھی روز دِں میں پچیس کے لائق
اُستاد کا کرتے ہیں امیراب کے مقرر | ہوتا ہے جو در ماہہ کہ سائیس کے لائق

مشاعروں میں بھی ہم طرح غزلوں میں نوک جھوک ہوتی اور ایک دوسرے کا مذاق اُڑایا جاتا مثلاً ایک جلسہ میں میاں مصحفی نے غزل پڑھی جس کا مقطع تھا:۔

تھا مصحفی بہ مائل گریہ کہ پس از مرگ | تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں اُنگلی

اس شعر کو انشا نے یا اُن کے یار دوستوں نے اُلٹ دیا اور کہا۔

تھا مصحفی کا نا جو چھپانے کو پس از مرگ | رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں اُنگلی

اسی زمانہ میں مصحفی نے ایک غزل کہی تھی جس کا یہ مطلع ہے:۔

سر مُشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن | نے موسے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اس غزل پر سید انشا نے بہت سے اعتراض وارد کیے اور ایک قطعہ بھی نظم کیا۔ غزل کا مطلع ہے۔

توڑوں گا خمِ بادۂ انگور کی گردن ! | رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حُور کی گردن

اور قطعہ اس طرح شروع کیا۔

سُن لیجیے گوش دل سے مری مشفقانہ عرض | مانند بید غصّہ سے مت تھرتھرائیے
بلّور گو درست ہو لیکن ضرور کیا | خواہی نخواہی اُس کو غزل میں کھپائیے
دستور و طور و نور یہ ہیں قافیے بہت | اس میں جو چاہیے تو قصیدہ سُنائیے
کیا لطف ہے کہ گردن کافور باندھ کر | مُردے کی باس زندوں کو لاکر سُنگھائیے

اسی قسم کے اور بہت سے اشعار ہیں جن میں مصحفی کے زبان داں ہونے پر اعتراض کیا ہے۔ مصحفی نے جواب الجواب اپنی غزل کی طرح میں دیا۔ اور انشا کی غزل میں جو ان کے نزدیک قابلِ اعتراض باتیں تھیں۔ ان پہ اعتراض جمائے۔ مثلاً

اے آنکہ معارض ہو مری تیغ زباں سے — تو نے سپر عذر میں مستور کی گردن
ہے آدم خاکی کا بنا خاک کا پتلا — گر نور کا سر ہووے تو ہو نور کی گردن
لنگور کو شاعر تو نہ باندھے گا غزل میں — کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن
گردن تو صراحی کے لیے وضع ہے ناداں — لیے چاہیے خُم بادۂ انگور کی گردن

اس مباحثہ اور مناظرہ کے بعد پھر تو وہ پھکڑ شروع ہوا جو دونوں آدمیوں کی تہذیب و متانت سے بہت دُور تھا۔ فریقین کے شاگردوں نے اپنے اپنے استادوں کی تو بیچ میں وہ طوفان اٹھائے کہ خدا کی پناہ۔ ایک دن میاں مصحفی کے سب شاگرد اکٹھے ہوئے۔ شہدوں کا سوانگ بھرا اور ہجو کہہ کر اس کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشاء کے مکان کی طرف روانہ ہوئے اور آمادہ تھے کہ مارپیٹ بلکہ کشت و خون سے بھی دریغ نہ کریں۔ سید انشا کو اس کی پہلے سے خبر ہو گئی تھی وہ نہایت تحمل اور سمجھ دار آدمی تھے۔ بجائے ان لوگوں پر غصہ کرتے یا ان کا مقابلہ کرنے کے انھوں نے ان کی بہت خاطر و مدارت کی، ان کو مٹھائیاں کھلائیں۔ گلوریاں اور ہار پھول ان کے سامنے پیش کیے۔ اور اپنی ہجویں اپنے سامنے پڑھوا کر خود بھی بہت خوش ہوئے اور ان کو نہایت عزت و احترام سے رخصت کیا۔ مگر دوسرے دن جو جواب سید انشا نے تیار کیا وہ غضب کا تھا۔ ایک پر تکلف بارات کی نقل بنائی جس میں ایک مجمع کثیر شامل تھا اور لوگ ڈنڈوں پر کچھ اشعار پڑھتے ہوئے اور ایک گڈا اور ایک گڑیا ہاتھ میں ہلاتے ہوئے جاتے تھے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن — لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

ان معرکوں میں نہ صرف معمولی لوگ بلکہ اُس زمانہ کے معزز شعرائے لکھنؤ سب شامل تھے اور اس پُر فتنہ مذاق سے لُطف اُٹھاتے تھے اکثر امراء نے خاص کر

مرزا سلیماں شکوہ نے سید انشا کا ساتھ دیا تھا۔ جس سے مصحفی کو بہت رنج ہوا چنانچہ انہوں نے اسی افسردہ دلی میں ایک غزل کہی جس کا مطلع و مقطع یہ ہے۔

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں
کچھ اس کے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں

اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا
سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

ادھر مرزا سلیماں شکوہ کو یہ شبہ پیدا ہوا تھا کہ اس شکوہ و شکایت میں ہم پر بھی چوٹیں کی ہیں اور وہ ناراض ہو گئے تھے۔ مصحفی نے اس کی معذرت میں ان کے حضور میں ایک قصیدہ پیش کیا جس کا مطلع ہے۔

قسم بذاتِ خدا کہ ہے سمیع و بصیر!
کہ مجھ سے حضرتِ شہ میں نہیں ہوئی تقصیر

اس میں ممدوح کی عزت و شان اور اپنی بے حقیقتی کا مقابلہ کر کے کہتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ یہ نمک خوارِ قدیم حضور کی نسبت کوئی بُرا لفظ کہے۔ یہ افترا سب انشا کا بنا ہوا ہے۔ جس نے حضور کے مزاج کو مجھ سے منحرف کر دیا ہے۔ اس قصیدہ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بریت اور سید انشا کی خطا ثابت کی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ معرکہ بھی بحیثیت شعر و شاعری ایک یادگار معرکہ ہے۔ ہر چند اس میں خلافِ تہذیب نظمیں کہی گئیں مگر پھر بھی یہ بہت دلچسپ اور اس زمانہ کی ایک خاص یادگار ہے۔

رنگینی ۱۱۶۹ھ تا ۱۲۵۱ھ سعادت یار خاں رنگینؔ طہماسپ بیگ خاں تورانی کے فرزندِ ارجمند تھے۔ سرہند میں پیدا ہوئے ان کے والد توران سے آ کر چند دنوں لاہور میں حسین الملک میر منو خاں کی سرکار میں ملازم رہے۔ اس کے بعد دِلّی آئے جہاں پیش گاہ سلطانی سے منصب ہفت ہزاری اور خطاب محکم الدولہ اعتضاد جنگ بہادر عنایت ہوا۔ رنگینؔ نے شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی وہ

---

[1] ولادت ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۶ء وفات ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء عمر اسّی سال۔ دستور الفصاحت ص ۹۶ بعد۔ فاضل۔

بہت اچھے شہسوار اور فنونِ سپہ گری سے خوب واقف تھے۔ دکن میں نظام حیدر آباد کی فوج میں افسر توپ خانہ رہے۔ لیکن بعد کو نوکری چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ انشا کے وہ بڑے دوست تھے اور ان سے لکھنؤ میں ملا کرتے تھے اوائل عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ اور سب سے پہلے شاہ حاتم خاں کے شاگرد ہوئے مشہور ہے کہ میر صاحب سے اصلاح لینا چاہتے تھے مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا امیر آدمی کے لڑکے ہو، تم کو شاعری نہیں آسکتی تمہارے لیے شہسواری ورزش وغیرہ مناسب ہے تم کو اس سے کیا واسطہ۔ حاتم کے بعد وہ محمد امان نثار کو اپنا کلام دکھلاتے تھے اور جرمن مستشرق بلوم ہارٹ کی تحقیق ہے کہ مصحفی سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ رنگین کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا اور نہایت عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ چونکہ امیر آدمی تھے۔ حسین بھی تھے لہذا زندگی نہایت عیش و عشرت سے پری وشوں کے جمگھٹے میں گزارتے تھے۔ بے انتہا خلیق۔ متواضع اور مہذب آدمی تھے۔ ڈاکٹر اسپرنگر اور کریم الدین کی تحقیقات کے بموجب یہ اسّی برس کی عمر میں ۱۲۵۱ھ میں فوت ہوئے۔ مگر شیفتہ اور گارسن ڈیٹاسی ان کی عمر اکاسی اور سن وفات بارہ سو پچاس بتاتے ہیں۔

تصانیف (۱) "مثنوی دل پذیر" جس میں تقریباً دو ہزار شعر ہوں گے۔ اس میں شاہزادے ماہ جبین اور رانی سری نگر کا قصہ ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۳ھ ہے۔ جیسا کہ جرأت اور انشا وغیرہ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے۔

(۲) "ایجادِ رنگین" یہ بھی ایک مثنوی ہے۔ اس میں مختلف قصے اور دلچسپ حکایات ہیں۔

(۳) چار دیوان جن کے نام علیحدہ علیحدہ نام "(۱) دیوان ریختہ (۲) دیوان بیختہ

---

[1] ڈاکٹر صابر علی خاں نے رنگین پر مفصل کتاب لکھی ہے جو کراچی سے انجمن ترقی اردو نے شائع کر دی ہے۔ فاضل۔

(۳) دیوان آمیختہ (۴) دیوان انگیختہ" ہیں۔ اور مجموعاً ان چار دیوانوں کا نام "چار عنصر رنگین" ہے۔

(۴) مثنوی "مظہر العجائب یا غرائب المشہور" اس میں بھی حکایتیں ہیں۔

(۵) "مجالس رنگین" یہ ان کی بہت تصنیف ہے اور اس میں اپنے زمانے کے شعراء کا حال لکھا ہے اور ان کے کلام کی تنقید بھی کی ہے۔

(۶) فرسنامہ مصنفہ ۱۲۰۹ھ۔ اس میں گھوڑوں کی شناخت نیک و بد اور اُن کے علاج وغیرہ کا ذکر ہے۔ پہلا دیوان ۱۲۲۸ھ میں تیار ہوا جیسا کہ ایک تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ۷۰ صفحات غزلیات ۲۲ صفحہ رباعیات اور دو منظوم خط اور ایک قصیدہ ۶۰۰ شعروں کا ہے۔ دوسرا دیوان ۹۴ صفحہ کا غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ تیسرے دیوان میں ان کے ہزلیات شامل ہیں۔ اور اسی میں ایک قصیدہ شیطان کی تعریف میں ہے۔ چوتھا دیوان ریختی کا ہے۔ اس کے دیباچہ میں مصنف نے مستورات کے خاص خاص محاورات اور عورتوں کی اصطلاحیں بیان کی ہیں اور نیز بدچلن عورتوں کی جن کو وہ عروس شیطان لکھتا ہے، بول چال درج ہے۔

ریختی سے کیا مطلب ہے اور اس کی ایجاد کے اسباب

ریختی کے طرز میں ایک قسم کی دلچسپی ضرور ہے۔ مگر خرابی یہ ہے کہ اُس میں اکثر غیر مہذب اور فحش آمیز اشارے ہوتے ہیں۔ شارح کی رائے ہے کہ اس طرز خاص کے موجد میاں رنگین تھے اور رنگین نے خود بھی یہ دعویٰ اپنی نسبت اپنے دیوان کے دیباچہ میں کیا ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ طرز قدیم شعراء علی الخصوص شعرائے دکن میں بھی موجود تھا۔ مثلاً مولانا ہاشمی بیجاپوری جو دکن کے ایک مشہور شاعر تھے اور مولانا قادری جو ولی کے ہم عصر تھے اور جن کا تخلص خاکی تھا اور جن کا دیوان

۱۸۲۱ھ میں مرتب ہوا ہے۔ ان لوگوں کے یہاں بھی ریختی کا پتہ چلتا ہے۔ مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ ان قدیم شاعروں کی ریختی ایک خاص قسم کی تھی جس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ان کے کلام میں بھاشا کا زیادہ اثر ہے لہذا اسی کے تتبع میں اظہارِ عشق عورت کی جانب سے اور اسی کے الفاظ میں کرتے ہیں۔ بخلاف معمولی اردو کے جس میں اظہارِ عشق عموماً مرد کی جانب سے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس قسم کی ریختی میں فحش اور ابتذال مطلق نہیں ہوتا۔ برخلاف انشاء اور رنگین کے طرز کے جن کا دارومدار عیاشی اور شہوت پرستی پر ہے۔ ان کی غرض عموماً یہ ہوتی ہے کہ ایسا کلام پڑھ کر لوگوں کو ہنسی آئے یا ان کے نفسانی جذبات میں ہیجان پیدا ہو۔ اسی وجہ سے اس قسم کی نظموں میں خلوص اور بلند خیالی یہاں تک کہ بے ضرر سادہ مذاق بھی نہیں ہوتا۔

یہ بات ضرور قابلِ غور ہے کہ ہمارے ملک میں عورتوں اور مردوں کی علیحدہ علیحدہ زبان ہونے کے اسباب کیا ہیں۔ ان دونوں کی زبانوں میں صرف الفاظ و محاورات کا فرق ہوتا ہے۔ بعض الفاظ و محاورے مستورات کے لیے مخصوص ہیں جن کو عام طور پر مرد نہیں استعمال کرتے۔ ہمارے نزدیک اس خصوصیت کی بڑی وجہ پردہ ہے جس سے اس ملک کی شریف گھرانے کی عورتیں غیر مردوں کے سامنے نہیں آ سکتیں اور ان کے ساتھ بے تکلفی سے نہیں مل سکتیں۔ اکثر پرانے خیال کے لوگوں میں تو پردہ کے بارہ میں یہاں تک سختی ہے کہ عورتیں اپنے غیر محرم رشتہ داروں تک سے پردہ کرتی ہیں۔ پس ایسی قید کی صورت میں لازم ہوا کہ عورتیں اپنے واسطے کچھ خاص اصطلاحیں اور محاورے مخصوص کر لیں۔ مثلاً مرد چونکہ آزاد تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ لہذا وہ دوسری زبان کے الفاظ بے تکلف بولنے لگتے ہیں۔ عورتیں برعکس اس کے اپنے پردہ اور عدم تعلیم کی وجہ سے اپنی خالص

زبان کی پابند رہتی ہیں۔ اور اس کی صحت اور بے میل رہنے کی حفاظت کرتی رہتی ہیں۔ پھر چونکہ عورتوں کے مزاج میں فطرتاً قدامت پسندی اور تغیر ناآشنائی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے دوسری زبان کے ثقیل اور کڈھب الفاظ اُن کو پسند نہیں آسکتے مزید براں ان میں چونکہ قدرتاً شرم وحیا۔ اور ضعیف الاعتقادی ہوتی ہے ایسے الفاظ ان کو ایک رمز وکنایہ سے اور خاص طریقہ سے وضع کرنا پڑتے ہیں۔ جن کے نام لینے میں ان کو شرم وحیا مانع ہو یا وہم وخوف دامن گیر ہو۔ یہ تخصیص اصطلاحات و محاورات ظاہر ہے کہ اُن گھرانوں میں بہت زیادہ ہے جہاں پردہ کی زیادہ سختی سے پابندی ہوتی ہے۔ اس فرق مذکورہ بالا سے انشا اور رنگین نے اپنے خاص اغراض کے لئے فائدہ اُٹھایا۔ اور اپنی نوایجاد طرز کا دارومدار اسی مخصوص عورتوں کی زبان اور نیز عیاشی اور بداخلاقی پر رکھا۔

ریختی اس زمانہ کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا بہترین آئینہ ہے جب کہ لکھنؤ کے عیش پسند فرمانرواؤں اور امراء کی محفلوں میں عیش وعشرت اور حسن پرستی کا بازار گرم تھا اور بازاری عورتوں کا عشق داخلِ فیشن ہوگیا تھا۔ شہر کے نوجوان امراء اس قسم کی بے اعتدالیوں سے متنبہ ہونے کے بجائے ان کو کھلم کھلا اور بلاخوف لومۃ لائم عمل میں لاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کی نظم بھی ان کے جذبات اور ان کے مذاق کا آئینہ ہونا چاہیے۔ مگر حقیقت میں اس قسم کی ناشائستہ اور غیرمہذب نظمیں نہایت ہی مخرب اخلاق اور نوجوانوں کے حق میں سم قاتل ہیں۔ چنانچہ خود انشا نے بھی اس قسم کے فواحش کے بُرے اثر کا ذکر ایک جگہ اپنے دریائے لطافت میں کیا ہے۔ بہر طور یہ طرز اس زمانہ میں بہت مقبول تھا اور اس کی ترقی کی معراج میر یار علی المتخلص بہ جان صاحب کے زمانہ میں ہوئی۔ جان صاحب میر امن کے بیٹے اور نواب عاشور علیخاں کے شاگرد تھے۔ اصلی وطن لکھنؤ تھا مگر آخر عمر میں بسبب ملازمت زیادہ تر رامپور میں رہے۔

جان صاحب نے اپنی تمام عمر اسی خاص صنف میں بسر کر دی اور اپنی خاص روش میں خوب کہتے تھے۔ مشاعروں میں زنانہ لباس سے شریک ہوتے اور بالکل عورتوں کے طریقہ سے پڑھتے جس سے سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں وہ دلی گئے تھے اور وہاں سے بتلاش روزگار بھوپال آئے مگر ناکام رہے آخر کار رامپور میں نواب کلب علی خاں کے دامن دولت سے وابستہ ہو گئے اور اور یہیں رامپور میں کچھ اوپر ستّر برس کے سن میں ۱۸۹۷ء میں انتقال کیا۔

غرضکہ یہ صنف شاعری اب مقبول نہیں ہے اور مہذب جلسوں میں اس کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ البتہ مذاق ظرافت کے وہ اشعار جو دائرۂ تہذیب سے خارج نہ ہوں عام طریقہ سے پسند کیے جاتے ہیں۔

شاعر شاہان دہلی شاہ عالم ثانی ۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۶ء

آخر کار زمانہ کے شاہان دہلی شعراء کے مربی بھی تھے۔ اور خود بھی اچھے خاصے شاعر تھے۔ مثلاً شاہ عالم ثانی جو آفتاب تخلص کرتے تھے ایک مثنوی موسومہ "مضمون اقدس" کے مصنف ہیں جس میں ایک فرضی افسانہ مظفر شاہ بادشاہ چین کا ہے۔ یہ مثنوی کا تاریخی نام[2] ہے جس سے ۱۲۰۰ نکلتے ہیں۔ اس مثنوی کے علاوہ ایک دیوان غزلوں کا ۲۴۴ صفحات کا ہے وہ فارسی بھی کہتے تھے۔ چنانچہ ان کا دیوان بھی موجود ہے اور وہ قصیدہ جس میں نمک حرام غلام قادر کے ظلم و ستم کا اور اپنی آنکھیں نکالے جانے کا ذکر کیا ہے بہت ہی دردناک ہے۔ بڑے بڑے شاعر مثلاً سودا۔ میر۔ نصیر۔ اعظم۔ انشاء۔ زار۔ ممنون۔ احسان اور فراق وغیرہ یہ سب ان کی سرکار کے دعاگو تھے۔

مرزا سلیمان شکوہ متخلص بہ سلیمان

شاہ عالم ثانی کے تیسرے بیٹے تھے۔ غلام قادر کی

---

[1] وفات شاہ عالم ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۸۰۶ء۔ ذوق از ڈاکٹر تنویر۔ فاضل

[2] تاریخ صحیح نہیں نکلتی اس سے صرف ۱۱۰۱ نکلتے ہیں ۱۲۔

بغاوت کے بعد دہلی سکونت چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور مثل اپنے برادر بزرگ مرزا جوان بخت بہادر ولی عہد کے وہیں رہنے لگے۔ نواب آصف الدولہ بہادر نے اخراجات کے لیے چھ ہزار ماہوار مقرر کر دیے تھے۔ نواب سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر ۱۸۱۷ء تک ان سے جھک کر ملتے تھے اور نذریں دیتے تھے۔ جب غازی الدین حیدر نے تاج شاہی پہنا تو ملاقات بدرجۂ مساوات چاہی۔ شاہزادہ نے باقتضائے مصلحت وقت مرزا نصیر الدین حیدر ولی عہد سلطنت کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دی جنہوں نے سلطان بہو کا خطاب پایا۔ مگر شوہر و بیوی میں ناموافقت رہی۔ ۲۳ سال لکھنؤ میں رہ کر کاسگنج اپنے پرانے دوست کرنل گارڈنر کے پاس چلے گئے۔ بعد کو اکبرآباد میں سکونت اختیار کر لی۔ اکبر ثانی کے زمانے میں کئی بار دہلی آئے۔ ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا اور سکندرہ میں مدفون ہوئے۔ شعراء کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ خود بھی اچھے خاصے شاعر صاحب دیوان تھے۔ ابتدا میں شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ اس کے بعد مصحفی اور انشا کو کلام دکھایا۔ دہلی سے جو باکمال لکھنؤ جاتا پہلے ان کے یہاں حاضر ہوتا اور صاحب عالم بھی الطاف امیرانہ سے پیش آتے۔ لکھنؤ میں مشاعرے کرتے۔ مصحفی۔ قتیل۔ انشا۔ میر حسن سب اسی سرکار کے دعا گو تھے۔ ان کا قلمی دیوان لالہ سری رام صاحب مصنف خمخانۂ جاوید کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اکبر شاہ ثانی ۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء

ابو النصر معین الدین اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی حضرت شاہ عالم ثانی کے دوسرے بیٹے تھے۔ ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۰۶ء میں تخت سلطنت پر بیٹھے اور ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا۔ ظفر نے تاریخ کہی ہے

پے سال وفات گفت ظفر — عرش آرام گاہ عالی قدر

موزوں طبع تھے۔ اپنے باپ کے تخلص "آفتاب" کی رعایت سے شعاع تخلص کرتے

تھے۔ نکمر کی طرف توجہ کم تھی لیکن شعرار کی بڑی قدر کرتے تھے۔ میر نظام الدین ممنون۔ غالب علی خاں سید۔ شاہ نصیر وغیرہ ان کے دربار کے شاعر تھے۔

بہادر شاہ ثانی متخلص بہ ظفر

خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار مرزا ابو المظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ اکبر ثانی کے بیٹے تھے۔ ولادت ۱۷۷۵ء میں ہوئی اور باپ کے مرنے کے بعد ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھے اور غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں معزول ہو کر ملک برہما میں جلاوطن کیے گئے جہاں ۱۸۶۲ء میں انتقال کیا۔ بہادر شاہ شاعری کے بڑے دلدادہ تھے اور اکثر اپنا وقت اُس میں صرف کرتے تھے۔ چونکہ سلطنت کا کام کاج کچھ نہیں تھا۔ زیادہ تر وقت شعر گوئی میں گزرتا تھا۔ اُستاد ذوق اور مرزا غالب کو کلام دکھلاتے تھے۔ مگر قبل اس کے شاہ نصیر سے استفادۂ سخن کیا تھا۔ شاعری کے علاوہ فن موسیقی میں بھی ان کو اچھا دخل تھا۔ ان کی اکثر ٹھمریاں شمالی ہند میں بہت مقبول ہوئیں۔ خوش نویس بھی بہت اچھے تھے اور اکثر اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن شریف دِلّی کی بڑی مسجدوں میں بطور ہدیہ کے بھیجے تھے۔ انہوں نے ایک شرح گلستان بھی لکھی جو ایک اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ مگر ان کی شہرت کی اصل بنا ان کے ضخیم کلیات پر ہے جو بہت مشہور ہے چار دیوان اُن کے شایع ہو چکے ہیں۔ ان کو لوگ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کی غزلیں اس قدر مقبول ہیں کہ اکثر ناچ رنگ کے جلسوں میں گائی جاتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُن کے استاد ذوق اور غالب ان کو غزلیں کہہ کر دے دیتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ ظفر کی بعض غزلوں میں ان دونوں استادوں کا رنگ پایا جاتا ہے مگر پھر بھی ظفر کے خود شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں کیونکہ اُن کی بہت سی غزلیں ان کے خاص رنگ کی ہیں جو ذوق و غالب سے بالکل علیحدہ ہے۔ معلوم نہیں کہ ظفر نے بحالت قید بھی مشغلہ شعر و شاعری جاری رکھا تھا یا نہیں۔ اغلب ہے کہ یہ دلچسپ

مشغلہ ان سے نہ چھوٹتا ہو اور ان کا اس زمانہ میں بھی کلام موجود ہو۔ کیا تعجب ہے کہ سعی و تلاش اس معاملہ میں آیندہ کامیاب ہو۔

ان کا طرز کلام بہت صاف اور سادہ ہے۔ کلام بہت مزے دار سلیس اور فصیح ہوتا ہے اور ایک خاص درد و اثر رکھتا ہے جو ان کے مصائب کی اصلی تصویر ہے۔ ظفر اکثر جگہ مشکل مشکل بحریں اور سخت ردیف و قافیہ میں بھی غزلیں کہتے تھے جو بہت کچھ قابل تعریف ہیں۔ ان کے خیالات بلند اور تشبیہیں رنگین اور جذبات دل نشیں ہوتے ہیں۔

اس دور میں مذکورۂ بالا شعرا کے علاوہ اور بھی شعرا گذرے ہیں جو اگرچہ اس پایہ کے نہ تھے مگر پھر بھی مشاہیر میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً قائم۔ قاسم۔ حسرت۔ منت۔ ممنون وغیرہ۔ ان کے علاوہ بعض شعرائے دور سابق کا بھی کچھ حال جو گذشتہ باب میں رہ گیا تھا۔ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

قائم چاند پوری شیخ قیام الدین[1] نام تھا۔ بڑے اعلیٰ درجہ کے شاعر خاص کر قطعات اور رباعیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے مگر ملازمت کے تعلق سے عمر کا زیادہ حصہ دہلی میں بسر ہوا۔ جہاں وہ داروغہ توپ خانہ تھے شروع میں اپنا کلام میر درد کو دکھاتے تھے۔ بعد کو سودا کے شاگرد ہو گئے۔ انہوں نے ایک تذکرہ بھی لکھا ہے جو کمیاب ہے۔ دلی کی تباہی کے بعد وہ ٹانڈہ (قریب آنولہ) میں نواب محمد یار خاں کی رفاقت میں رہتے تھے۔ اس کے بعد رامپور گئے جہاں سنہ ۱۲۱۰ھ[2] میں انتقال کیا۔ ان کی نسبت مصحفی لکھتے ہیں: "در پختگی کلام و چستی مصراع غزل در دویہ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدوش اُستاد راہ

---

[1] اقتدار حسن نے سنہ ولادت تقریباً $\frac{\text{۱۱۳۸ھ}}{\text{۱۷۲۶،۲۵}}$ لکھا ہے۔ نیز دیکھیے نقوش نمبر ۹۴۔ ادبی دنیا نمبر ۹

[2] عرشی حاشیہ دستور الفصاحت: وفات $\frac{\text{۱۲۰۸ھ}}{\text{۱۷۹۳ء}}$ فاضل

می رفت در بعضی مقام رجحان می جست"۔ اور مرزا علی لطف اپنے تذکرۂ گلشن ہند میں یوں رقم طراز ہیں، "مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف ریخ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے۔ راقم آثم کو تو طور گویائی اس سخن آفرین کا نہایت مرغوب ہے۔

منت میر قمر الدین منت دلی کے رہنے والے ننھیالی رشتے سے سید جلال بخاری کی اولاد سے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سایہ عاطفت میں دلی میں پرورش پائی۔ روحانی تعلیم مولانا فخرالدین رحمتہ اللہ علیہ سے حاصل کی اور مشورۂ شعر و سخن میر نور الدین نوید اور میر شمس الدین فقیر سے کرتے تھے۔ بہت پرگو شاعر تھے ایک کلیات تخمیناً ڈیڑھ لاکھ اشعار کا اپنی یادگار چھوڑا متعدد مثنویاں تصنیف کیں جس میں سے ایک شکرستان ہے جو شیخ سعدی کی گلستان کے جواب میں لکھی ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

درین عمر دہ مثنوی گفتہ ام | بہ آئین طرز نوی گفتہ ام
چہ اشعار من در عدد میرسد | شمار قصائد بصد میرسد
بود شعر من در غزل سی ہزار | کہ پانصد رباعی گرفتم شمار

دلی چھوڑ کر ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ آئے۔ یہاں مسٹر جانسٹن سے ملاقات ہوئی۔ جو ان کو کلکتہ لے گئے اور مارکوئس آف ہسٹنگز کے روبرو ان کو پیش کیا۔ لارڈ موصوف نے خطاب ملک الشعرائی ان کو عنایت کیا۔ ان کی مدح میں ان کے اکثر قصائد ہیں بسنہ ۱۲۰۰ھ میں گورنر جنرل نے ایک خاص سفارت پر ان کو حیدر آباد بھیجا۔ وہاں پہنچ کر حضور نظام کی مدح میں انہوں نے قصیدہ پیش کیا جس کے صلے میں بہت انعام و اکرام پایا۔ بعد واپسی حیدر آباد عظیم آباد میں مہاراجہ شتاب رائے کی مصاحبت میں چند دنوں رہ کر پھر کلکتہ کا رخ کیا۔ جہاں پہنچتے ہی

۱۲۰۸ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

اس آنے کا کچھ لطف ہے پیارے ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم

ولہ

آہ اب کثرت داغ غم خوباں سے مدام صفحۂ سینہ پر از جلوۂ طاؤسی ہے

ولہ

گر اُس لب جاں بخش کی کچھ بات سناؤں عیسیٰ بھی جو کچھ پوچھے تو صلوات سناؤں

ممنون میر نظام الدین ممنونؔ[1] خلف قمر الدین منتؔ۔ ان کے آبا و اجداد سونی پت کے رہنے والے تھے۔ مگر ان کی ولادت دلّی میں ہوئی اور وہیں نشو و نما پائی۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کو فخر الشعرا کا خطاب عطا کیا۔ اور اکثر لوگ ان کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔

کچھ دنوں یہ اجمیر میں بحیثیت صدر الصدور رہے تھے۔ مگر پھر دلّی آ گئے جہاں ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا۔ خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور شاگرد بھی نامی و گرامی چھوڑے۔ مثلاً مفتی صدر الدین خاں آزردہ وغیرہ ان کا دیوان کمیاب ہے۔ اس کے دیکھنے سے ان کی قادر الکلامی کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

حسرت دہلوی[2] مرزا جعفر علی نام۔ حسرتؔ تخلص، ابو الخیر عطّار کے بیٹے تھے۔ دلّی میں پیدا ہوئے اور ابتداءً عطّاری کا پیشہ کرتے تھے۔ شعر سے اُن کو ذوق تھا اور اس فن میں انہوں نے کمال حاصل کیا۔ جب شاہ عالم ثانی سریر آرائے سلطنت ہوئے تو حسرت بھی اور شعراء کے ساتھ دامن دولت سے وابستہ ہو گئے جب

---

[1] ولادت تقریباً ۱۱۸۰ھ وفات ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء۔ فاضل

[2] ولادت معلوم نہیں وفات ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء، ۱۲۱۰ھ۔ ۱۲۰۹ھ۔ ۱۲۰۶ھ ہے۔ عرشی صاحب ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء مانتے ہیں۔ حاشیہ دستور ص ۷۲۔ فاضل

نمک حرام غلام قادر نے بدنصیب بادشاہ کی آنکھیں نکالیں اور اس قسم کی دوسری زیادتیاں کر کے لوٹ مار و بیگمات شاہی کی بے حرمتی وغیرہ کا ہنگامہ برپا کیا تو اس عبرت ناک منظر کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ چنانچہ اسی قیامت خیز واقعہ کی نسبت ان کی ایک درد انگیز نظم ہے۔ حسرت دِلّی چھوڑ کر فیض آباد آ گئے جو اس وقت اودھ کا دار السلطنت تھا۔ اپنے سفر کے مصائب اور حالات کے بیان میں انہوں نے ایک دلچسپ نظم لکھی ہے۔ جس میں سفر کی تکلیفیں، دھوپ کی شدت، پانی کی قلت، سست رو گاڑی کی مصیبت وغیرہ وغیرہ نہایت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ فیض آباد پہنچ کر انہوں نے نواب کے سامنے اپنا قصیدہ پڑھا اور اس کے صلے میں کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا۔

جب شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نواب ہوئے تو حسرت نے ان کی تہنیت میں ایک دوسرا قصیدہ کہہ کر ان کے سامنے پڑھا۔ ۱۱۹۵ھ میں جب لکھنؤ دار السلطنت ہوا تو حسرت بھی اپنے دوستوں کے اصرار سے لکھنؤ آ گئے اور یہاں گھنٹا بیگ کی گڑھیا پر قیام تھا۔ شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے قیام لکھنؤ کے زمانہ میں حسرت کے شاگرد رشید میاں جرأت بھی اپنے استاد کے پاس رہنے لگے اور دونوں شاگرد و اُستاد لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہو کر اپنی پُرکیف غزلوں پر سامعین سے خراج تحسین وصول کرتے تھے۔ حسرت سب سے پہلے مرزا احسن علی خاں بہادر کی رفاقت میں تھے۔ اس کے بعد پرنس جہاندار شاہ کے ملازم ہو گئے۔ مشہور ہے کہ یہ پالکی میں سوار ہوتے تھے جو امراء کے لیے مخصوص تھی۔ اس سے ان کے ہم پیشہ ساتھیوں کو بہت رشک ہوا اور انہوں نے ان کے چڑھانے کے لیے بہت سی ہجویں کہیں اور تمسخر کے اشعار کہے۔ سودا نے بھی اس میں حصّہ لیا خود حسرت نے ایک لکھنؤ کے حکیم کی ہجو لکھی ہے۔

جس میں اس کے پیشہ اور قابلیت پر حملہ کیا ہے۔ ان کو شاہزادہ سلیمان شکوہ بھی کچھ درماہہ دیتے تھے۔ وہ رائے سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے اور خود ان کے بھی شاگرد بکثرت تھے۔ چنانچہ میر حسنؔ تذکرہ میں لکھتے ہیں۔ کہ "کثرت شاگردانش چناں ست کہ در صورت شناسی خود ہم حیران ست" ان سب میں جرأت اور نواب محبت خاں محبتؔ بہت نامور شاعر ہوئے ہیں مشہور ہے کہ وفات ۱۲۱۷ھ میں[1] ہوئی اور لکھنو میں مدفون ہوئے۔ تصنیفات میں ایک کلیات ہے جس میں ساقی نامہ، مثنوی، واسوخت، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس، مخمس، قصیدے، رُباعیاں اور دو دیوان غزلوں کے ہیں۔ غرضکہ اصناف سخن میں سے ہر قسم کے نمونے اس میں پائے جاتے ہیں۔ خاص انداز یہ بھی ہے کہ وہ غزل کو اکثر قطعہ پر ختم کرتے ہیں۔ اور اکثر مسلسل غزل ایک ہی مضمون پر لکھتے ہیں۔

قدرت شاہ قدرت اللہ قدرتؔ میر شمس الدین فقیرؔ کے برادر عمزاد تھے اور کوئی عجب نہیں کہ ان کے شاگرد بھی ہوں۔ نساخ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ مظہر جانجاناں اور جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ع) میں مرشد آباد میں انتقال کیا۔ میر اُن کی نسبت اچھی رائے نہیں رکھتے اور اُن کو "عاجز سخن" لکھا ہے۔ مگر میر حسنؔ نے ان کے کلام کی بہت تعریف کی ہے لکھتے ہیں: "سمند نظمش در میدان فارسی و ہندی چالاک چُست و تصویر بلیغ نظیر معانیش در استخوان بندی الفاظ درست بندہ دیر ایک بار در مشاعرہ بہ لکھنؤ دیدہ ام"۔ اسی طرح مرزا علی لطفؔ بھی ان کے بہت مداح ہیں چند اشعار بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

---

[1] آب بقا ص ۲۰۱ میں ہے ۱۲۴۴ھ میں انتقال کیا قبر ان کی مفتی گنج میں ہے۔ فاضل

ہنگامۂ پرہیز و ورع اب بسر آیا — اے بادہ کشو مژدہ کہ پھر ابرِ تر آیا!
کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے — شاید تہِ مژگاں کوئی لختِ جگر آیا!

ولہ

مجھ کو غفلت نے خبر ایام فرصت کی نہ دی — آہ جب جلتے رہے دن تب میں پچھتانے لگا

ولہ

سینہ اُس کا ہے دل اُس کا ہے جگر اُس کا ہے — تیرِ بیداد جدھر رُخ کرے گھر اُس کا ہے

ولہ

ایک ہی پردے کے گر سمجھو تو یہ سب ہیں الاپ — گر صدائے چنگ ہے یا نغمۂ ناقوس ہے
صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یاں سے کر گئے — اب دلِ وداع ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے — کیا ہی ملکِ روم ہے کیا سرزمینِ روس ہے
گر میسر ہو تو کس عشرت سے کیجیے زندگی — اس طرف آوازِ طبل اودھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہو مئے گلگوں کا دور — شب ہوئی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہے
سُنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشہ میں تجھے — چل دکھاؤں کیا تو اپنی آز کا محبوس ہے
لے گئی اکبارگی گورِ غریباں کی طرف — جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے — یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و تمکنتِ دنیا سے آج — کچھ بھی ان کے ہاتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسبیح ریا
آج رہنِ جامِ مے یہ خرقۂ سالوس ہے

بیدار میر محمد علی عرف میر محمدی متخلّص بہ بیدار خواجہ میر درد کے دوست اور شاگرد بھی تھے۔ فارسی میں مرتضیٰ قلی خاں فراق سے مشورہ سخن کرتے تھے کہا جاتا ہے کہ شاہ حاتم کو بھی کلام دکھایا تھا۔ مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ کے مریدوں میں

تھے۔ آخر عمر میں دِلّی سے آگرہ چلے گئے جہاں ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں انتقال کیا۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔ میر درؔد مرزاؔ کے ہم عصر تھے۔ دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے[2] ان کے کلام میں صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بھی اچھا خاصہ ہے۔ دو چار شعر نمونہ کے دیے جاتے ہیں ؎

ہم خاک بھی ہو گئے ولیکن جی سے نہ ترے غبار نکلا

ولہ

تیرے رُخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار گُل جُدا، سرو جُدا نرگس بیمار جُدا

ولہ

بیدارؔ راہِ عشق کسی سے نہ طے ہوئی صحرا میں قیس کوہ میں فرہاد رہ گیا

ولہ

چھوڑ کر کوے بتاں جاتا ہے تو کعبہ کو جلد پھر یو تجھے بیدارؔ خدا کو سونپا

ولہ

ربط جو چاہیے بیدارؔ سو اُس سے معلوم مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

ہدایت ہدایت[1] اللہ خاں دہلوی خواجہ میر درؔد کے مریدوں اور شاگردوں میں تھے۔ ۱۲۱۵ھ میں انتقال کیا۔ صاحب دیوان ہیں اور بقول مرزا علی لطفؔ ایک مثنوی بنارس کی تعریف میں بھی خوب لکھی ہے۔ میر تقی میرؔ اور میر حسنؔ دونوں ان کے کمالات شاعری کے معترف ہیں۔

فراقؔ حکیم ثناء اللہ خاں متخلص بہ فراقؔ ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ مذکورہ بالا کے بھتیجے تھے۔ کسب سخن اور کسب باطن خواجہ میر درؔد سے کرتے تھے۔ مشاہیر عصر میں سے تھے اور دِلّی کے بہت نامور حکیم سمجھے جاتے تھے۔ مصحفیؔ اور میر حسنؔ نے

---

[1] ڈاکٹر گراہم بیلی نے ولادت ۱۱۴۲ھ/۱۷۳۰ء اور وفات ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء بتائی ہے۔ ص ۵۷۔ فاضلی

ان کا ذکرِ خیر بہت اچھے لفظوں میں کیا ہے۔ میر حسنؔ اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ میرے سامنے انہوں نے تحصیل طلب کی اور جب میں شاہجہان آباد میں تھا تو مجھ سے اور اُن سے مراسم دوستی و محبت بہت تھے۔

ضیاءؔ میر ضیاء الدین ضیاؔ دہلوی سوداؔ کے معاصر تھے۔ دِلّی سے فیض آباد اور لکھنؤ آئے اور یہاں سے عظیم آباد گئے جہاں مہاراجہ شتاب رائے کے بیٹے راجہ بہادر متخلص بہ راؔجہ ان کے شاگرد ہوگئے پٹنے ہی میں انتقال کیا۔ میر حسن اور مرزا علی لطفؔ ان کے کلام کے معترف ہیں اور آخر الذکر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "اکثر شعر در زمین سنگلاخ گفتن و الفاظ نامقبول رامقبول دلہا ساختن کار اوست"۔ میر حسن ابتدا میں انہیں کے شاگرد تھے۔ ان کو قصیدے اور مثنوی وغیرہ سے شوق نہ تھا۔ صرف غزل کو پسند کرتے تھے جیسا کہ میر حسن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں کہنے کا شوق تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

رسوائیوں کی اپنے مجھے کچھ ہوس نہیں ناصح یہ کیا کروں کہ مرا دل یہ بس نہیں

ولہ

کسی دشمن کی بھی یارب نہ گذرے شب جدائی کی کہ جیسے اُس سے میرے وصل کا اِک دن گذرتا ہے

ولہ

رازِ دل ہیں پوچھتے اور بولنے دیتے نہیں بات مُنہ پر آرہی ہے لب ہلانا منع ہے

ولہ

اے آہ زیچ نکل نہ کہیں دل چھلک پڑے یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

ولہ

کون سے زخم کا کھُلا ٹانکا آج پھر دِل میں درد ہوتا ہے

صاف تھا جب تک تو ہم کو بھی جواب صاف تھا

اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا

کل کی رسوائی تجھے کچھ کم نہ تھی اے ننگ خلق
اس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

بقا شیخ بقاء اللہ اکبر آبادی حافظ لطف اللہ خوشنویس کے بیٹے تھے۔ دلی میں پیدا ہوئے مگر لکھنؤ میں توطن اختیار کیا۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین اور اردو میں شاہ حاتم اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ فارسی میں حزیں اور اردو میں بقا تخلص کرتے تھے۔ جو اپنے استاد شاہ حاتم کے کہنے سے رکھا تھا۔ میر و سودا دونوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان دونوں سے اور اُن سے اکثر چوٹیں چلتی تھیں۔ چنانچہ جب ان کے دوآبہ کا مضمون میر صاحب نے بھی باندھا تو انہوں نے جل کر کہا ہے

میر نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا
اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو
یا خدا میر کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے
اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تر بینی ہو

ایک اور موقع پر میر صاحب کی اس طرح خبر لیتے ہیں ہے

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر
اور بستی نہیں یہ دلی ہے

ایک جگہ میر و مرزا کی شاعری کا فرق اپنے مذاق اور ٹھٹول میں اس طرح دکھایا ہے ہے

میر و مرزا کی شعر خوانی نے
بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے
اے بقا ہم نے جب زیارت کی
کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن
ایک تو تو کہے ہے اک ہی ہی

یعنی ایک کلام میں روکھی پھیکی اخلاق آموزی ہے اور دوسرے کے یہاں محض ظرافت و تمسخر۔ مفلسی سے تنگ آکر تسخیر کواکب کے اعمال کا شوق کیا تھا۔ اس سے ان کا دماغ خراب ہو گیا۔ آخر کار ہر طرف سے مجبور ہو کر ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء میں عتبات عالیات کی زیارت کو چلے مگر راستے ہی میں انتقال کیا۔ اپنے زمانہ کے مشہور شاعروں میں تھے۔ صاحب دیوان ہیں۔

حزیں | میر محمد باقر حزیں مرزا مظہر جانجاناں کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ بزرگ اُستاد سے بہت حسن عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

جس طرح جی چاہتا ہے ہو نہیں سکتی حزیں
حضرت اُستاد یعنی شاہ مظہر کی نثار

مصائب روزگار سے تنگ آکر دِلّی سے پٹنہ عظیم آباد پہنچے۔ وہاں نواب صولت جنگ نے ان کی بڑی قدردانی کی۔ ایک دیوان یادگار ہے جس میں قصائد اور غزلیں ردیف وار موجود ہیں۔ دو تین شعر بطور نمونہ کے یہاں دیے جاتے ہیں ؎

کچھ کہا شاید اُس نے قاصد سے
دِل میں میرے وہ اضطراب نہیں

حال اے قاصد مرا جو کچھ کہ تو جاتا ہے دیکھ
اس طرح سے اس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہوا

ہر نصیحت میں تری مانوں گا اے ناصح پر ایک
دلبروں کے دیکھنے میں جی مرا ناچار ہے

بیان | خواجہ[1] احسن اللہ کشمیری النسل تھے اور دِلّی میں پیدا ہوئے۔ مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد اور مولانا فخر الدین کے مرید تھے۔ آخر عمر میں حیدر آباد گئے اور نواب آصف جاہ ثانی کی ملازمت میں زندگی عزت سے بسر کی۔ ۱۲۱۳ھ میں وفات پائی اور حیدر آباد ہی میں مدفون ہوئے ان کی وفات کی تاریخ ہے: "اُستاد از جہاں رفت"۔ میر حسن اپنے تذکرہ میں ان کے بڑے معترف ہیں لکھتے ہیں: "شاعر عذب البیان از خوش گویان زمان خواجہ احسن اللہ المتخلص بہ بیان از تلامذۂ مرزا مظہر جانجاناں۔۔۔ در ہیچ نامہ از مشہور ست بسیار خوب گفتہ رباعیات دلپذیر دارد۔" نمونہ کلام یہ ہے۔

کوئی کسی کا بیان آشنا نہیں دیکھا
سوائے اس کے ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا

مصلحت ترکِ عشق ہے ناصح
لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

کہتا نہیں میں عرش پہ اے نالہ جا پہنچ
کانوں تلک تو اس کے تو اے نارسا پہنچ

---

[1] بعض لوگوں نے احسن الدین خاں نام لکھا ہے، ولادت سب کے نزدیک آگرے میں ہے۔ شاہ محمد حمزہ کہتے ہیں کہ ۱۱۸۲ھ مارہرے آئے تھے۔ ۱۲۱۳ھ / ۹۹-۱۷۹۸ء میں رحلت ہوئی۔ مرتضیٰ حسین۔ فاضل۔

عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آ سکتی نہیں
رحم آتا ہے بسیاں اب مجھ کو اپنی آہ پر

صاف منہ پر میں نہیں کہتا کہ ہوگا اس کے پاس
ورنہ کیا واقف نہیں میں دل میرا جس کے پاس

کافر ہوں گر زیادہ کچھ اس سے آرزو ہو — اک بے خلل مکان ہو بس میں ہوں اور تو ہو
وصل کی شب کا ماجرا کیا کہوں تم سے ہمنشیں — شام سے لے کے صبح تک وہ ہی نہیں نہیں رہی
بیاں کون ہے اب تلک پوچھتے ہو — تغافل کے قرباں تجاہل کے صدقے
جادو تھی کہ سحر تھی بلا تھی — ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی

راسخ شیخ غلام علی راسخ شاگرد میر سنہ ۱۱۶۲ھ میں پٹنہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے شروع میں مرزا فدوی اور مرزا اشرف کو کلام دکھاتے تھے۔ مگر آخر میں باقاعدہ طور پر میر تقی میر کے شاگرد ہو گئے تھے۔ اور میر صاحب ان کا بڑا خیال کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۲۱ھ تک کلکتہ، غازی پور، دلی، لکھنؤ کی سیاحت میں مصروف رہے۔ اس کے بعد اپنے وطن مالوف کو واپس آئے اور شعر و شاعری کا مشغلہ وہاں بہت زور شور سے شروع۔ چھہتر برس کی عمر پاکر ۱۲۳۶ھ یا ۱۲۴۰ھ[1] میں وفات پائی۔ زبان پاکیزہ اور طرز بیان صاف و سادہ ہے۔ سادہ اشعار کے ساتھ رنگین شعر بھی بہت ملتے ہیں جب لکھنؤ میں تھے تو نواب آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر کی تعریف میں قصیدے بھی کہے تھے۔

---

[1] آب بقا ص ۲۰۳ میں ہے: پیر کے دن ۲۰ جمادی الاول ۱۲۳۸ھ میں انتقال کیا۔ فاضل

باب ۸

اساتذۂ لکھنؤ

ناسخ و آتش کا زمانہ

مرکزِ شاعری لکھنؤ میں منتقل ہوتا ہے

شاعری کا مرکزِ ترقی دِلّی سے ہٹ کر اب لکھنؤ میں آ گیا۔ اس کے اسباب مختصراً یہ تھے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری فرمانروا بہت کمزور اور محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ سب سے پہلا حملہ جس نے قصرِ سلطنت کو متزلزل کر دیا نادر شاہ کا تھا جس سے شیرازۂ حکومت بکھر گیا اور درختِ اقبال کی جڑیں کمزور ہو گئیں۔ نادر شاہ کے حملے کی تباہی اور بربادی سے ابھی سلطنت نہیں سنبھلی تھی کہ احمد شاہ دُرّانی اور مرہٹوں کی قتل و غارت نے لوگوں کی جان و مال کو اور زیادہ غیر محفوظ کر دیا۔ شاہ عالم ثانی۔ بدبخت اور نمکحرام غلام قادر کے مظالم کا نشانہ بنے جس نے ایسے نیک دِل اور فرشتہ سیرت بادشاہ کی آنکھیں نکال ڈالیں اور اُن کو قید کر لیا۔ ستم رسیدہ بادشاہ نے اپنی اس مصیبت و پریشانی کی حالت میں سیندھیا اور انگریزوں سے مدد چاہی، چنانچہ ان کے اس

دردناک قصیدے کے جو اس مصیبت کے وقت میں لکھا تھا چند اشعار یہ ہیں ؎

شاہ[1] تیمور کہ دارد سر نسبت با من زود باشد کہ بیاید بمددگاری ما!

مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند من ست ہست مصروف تلافی بستمگاری ما

راجہ و راؤ زمیندار و امیر و چہ فقیر حیف باشد کہ نسازند بہ غمخواری ما

آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما

اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کے اُمرائے دولت بھی اپنے باہمی رشک و حسد اور فساد و عناد سے باز نہیں آتے تھے۔ اس عام بدامنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ وہ شاعر جو سلطنت کے دامن دولت سے وابستہ تھے مثلاً میرؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، انشاؔ وغیرہ انہوں نے بھی دلّی چھوڑ کر لکھنؤ کا رُخ کیا جو اس وقت اُن کا قدر شناس اور ان کے واسطے دولت خیز خطّہ تھا اور علم کی قدردانی میں دربار دہلی کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا۔ اس طور پر دلّی کا نقصان لکھنؤ کا نفع ثابت ہوا۔ شعرائے دہلی کو اہل لکھنؤ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ساتھ نہایت اخلاق و محبت سے پیش آئے۔ سلطنت کی طرف سے ان کے واسطے جاگیریں وظائف و انعام و اکرام مرحمت ہوئے۔ اور ان کی نازک مزاجیاں اور بددماغیاں تک بہت کشادہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں۔ بلکہ اکثر انہیں صفات کی تعریف کی جاتی تھی۔ سلسلہ روابط کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لیے نوابان عہد اور اُمرائے وقت نے اکثر شعراء کو اپنے دامن دولت سے وابستہ کر لیا اور ان کو اپنا رفیق و مصاحب بنا لیا۔ مگر سچ پوچھیے تو یہی ربط و ضبط اور دربار کا تعلق بالآخر شاعری کے حق میں سم قاتل ثابت ہوا۔ شروع میں جب کہ سرمایہ دارانِ شعر آزاد مزاج اور خوددار ہوتے تھے تو اس میل جول سے کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ اس نے شاعری

---

[1] تیمور شاہ والی کابل ان کے بہنوئی تھے۔ ۱۲

اور اُردو زبان کی ترقی میں بہت مدد دی۔ مگر مابعد کے زمانہ میں جبکہ شعراء اپنی عزت و آبرو کا بھی کچھ خیال نہیں کرتے تھے اور اپنے کلام کو اپنے عیش پرست مالکوں کے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔ اس سے بہت بُرے نتائج سرزد ہوئے۔ مرتبہ شاعری پست ہو گیا۔ شعراء نے اپنے ہاتھوں خود کو ذلیل کر لیا مثال کے لیے میرؔ و سوداؔ۔ اور انشاؔ و مصحفیؔ کی حالت پر نظر کرو اول الذکر دونوں اصحاب گو کہ سلطنت کے وظیفہ خوار تھے مگر نہایت بلند اور آزاد طبیعت رکھتے تھے وہ کبھی اپنے اشعار میں کسی کی دست اندازی یا کسی خاص رنگ کی پیروی جو ان کی طبیعت کے خلاف ہوتی گوارا نہیں کرتے تھے۔ برعکس اس کے مؤخر الذکر دونوں بزرگ دربار داری کے اثر سے متاثر ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری بجائے الہامی ہونے کے محض رسمی اور تکلفات کی رہ گئی۔

لکھنؤ کا طرز شاعری اس میں کوئی شک نہیں کہ لکھنؤ میں چراغ شاعری دِلّی والوں نے روشن کیا۔ اور شاعری کا مذاق یہاں انہوں نے پھیلایا۔ ان لوگوں کے آنے سے پہلے مشہور مقامی شاعر یہاں کوئی نہیں تھے۔ لکھنؤ کے مستقر الخلافت ہو جانے اور شعرائے دہلی کے یہاں بکثرت آجانے سے یہاں مذاق شاعری بہت پھیل گیا۔ اور شاعری کی بہت ترقی ہوئی۔ بادشاہ بڑے ذوق و شوق سے شاعروں کو اپنی مصاحبت میں جگہ دیتے تھے۔ سوداؔ کے بلائے جانے کا واقعہ مشہور ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے ان کو طلب کیا۔ اور ایک خوب صورت حیلہ سے انہوں نے اس کو ٹال[1] دیا۔ شعر کا اتنا چرچا پھیلا کہ جا بجا مشاعرے ہونے لگے۔ امراء اور رؤساء اور نیز عوام الناس بھی شاعری کے دیوانے تھے۔ عمدہ اشعار پڑھ کر اور سن کر لوٹ جاتے تھے۔ مشاعروں کی محفلیں ماہوار اور ہفتہ وار سے ترقی کر کے

---

[1] دیکھیے صفحات ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴

اکثر جگہ روزانہ ہوتی تھیں جس میں شعرا اپنی عمدہ غزلیں پڑھتے تھے اور سامعین کی تعریف سے اُن کے دل میں بڑھتے تھے۔ اس مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا۔ کہ علاوہ کلام کی کثرت کے لوگ ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتے تھے اور یہی فوقیت اور سرسبزی کا خیال لوگوں کے لیے مایۂ ناز تھا اسی کثرت شوق نے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی۔ جو بالکل مقامی تھا۔ دونوں اسکولوں کی نوعیت میں کوئی اہم اور اصولی فرق نہیں ہے مگر مضامین منتخب پسند طبع کے نمونے جُدا جُدا ہیں اور اسلوب بیان میں بھی فرق ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو جدت پسند طبائع نے قدامت پرستی سے گھبرا کر اپنے نام و نمود اور ندرت کے خیال سے نئی نئی راہیں نکالیں۔ اور شعرائے دہلی کی قدیم شاہراہ کو چھوڑ دیا ناسخ اس طرز جدید کے پیشوائے اعظم ہیں اور ان کے بعض مشہور شاگرد بھی ان کے قدم بقدم چل کر کامیاب ہوئے یہاں تک کہ زمانہ موجودہ میں وہ طرز خاص نامقبول ٹھہری۔ اب شاعری نے ایک جدید روش اختیار کی۔

طرز دہلی اور طرز لکھنؤ کا فرق اور ان کا تقابل

طرز دہلی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جذبات کی تصویریں سادہ اور پُر اثر الفاظ میں کھینچی جاتی ہے تخیّل اور جذبات پر رعایت لفظی کو مقدم سمجھتے ہیں۔ ناسخ۔ اور ان کے متبعین نے برخلاف اس کے اپنی تمام تر توجہ شعر کے حسن ظاہری اور رعایت لفظی اور صنایع بدایع پر صرف کر دی۔ یعنی الفاظ کی مصوری ایک بُرے اسلوب سے کی۔ شکوہ الفاظ پر بلند خیالی اور مصوّری جذبات کو قربان کر دیا۔ الفاظ میں صرف وہی لفظ منتخب کیے جو کسی پہلو سے مراعات النظیر میں شامل ہو سکتے تھے۔ مثلاً اگر کسی باغ کا منظر دکھانا ہوتا تو باغ ہی کی رعایت کے لفظ استعمال کیے جاتے۔ دوسرے الفاظ گو کتنے ہی مناسب اور موزوں ہوتے مگر ان کو جگہ نہ ملتی اور سختی

کے ساتھ ان کو برطرف کر دیا جاتا۔ اس رعایت لفظی کی بے انتہا پاسداری کا یہ اثر ہوا کہ شعر سے سادگی اور بے تکلفی جاتی رہی اور تکلف اور تصنع کی بھرمار ہو گئی۔ ایسے الفاظ ڈھونڈھے جانے لگے جو مضمون سے کسی نہ کسی جہت سے ظاہری تعلق رکھتے ہوں گو دیگر وجوہ سے وہ کیسے ہی نامناسب اور بے موقع ہوں۔ گویا محض رعایت لفظی شعر کی خوبی اور عمدگی کا دار مدار رہ گئی۔ اور الفاظ کے قربان گاہ پر درد و اثر، جذبات، سادگی، سلاست، فصاحت، بلاغت وغیرہ سب بھینٹ چڑھا دی گئیں۔ اور اس کمی کو اغراق، غلو، اور دور از کار تشبیہوں نے پورا کیا۔ اس طرز میں کیفیات اور صحیح جذبات کی نازک تحلیل نہیں ہوتی اور وہ روح کے اہتزاز کی پوری پوری ترجمانی نہیں کرتی۔ اس میں شعر الفاظ رنگین کا محض ایک خوش نما گھروندا ہوتا ہے۔ جو نظروں کو اچھا معلوم ہوتا ہے مگر کبھی دلکش نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے پیش نظر صائب اور بیدل کا کلام تھا جس کا مطالعہ انھوں نے غور سے کیا تھا۔ صائب کی طرح مثال دوسرے مصرع میں پیش ہوتی تھی۔ اور دعوٰی پہلے میں کیا جاتا تھا۔ یہ مثالیں کہیں کہیں تو عمدہ اور دلچسپ ہوتی ہیں مگر بسا اوقات بالکل معمولی اور بے مزہ۔ بیدل کی تتبع میں نازک اور باریک تشبیہوں اور نازک خیالیوں سے کام لیا گیا مگر اردو میں آ کر وہ محض نقل ہو گئیں اور گورکھ دھندا بن گئیں۔ اس قسم کی بے قابو تخیل پرانے شعرار کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ لکھنؤ کا طرز شاعری دماغ کو تو متوجہ کرتا ہے۔ مگر دل پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ ایسے کلام کی صورت ظاہری بہت اچھی ہوتی ہے اور اس کا وہی حال ہے جیسا کہ انگریزی میں پوپ[1] اور اس کے متبعین کی شاعری کا ہے جس میں سراسر تکلف اور تصنع ہے اور اصلیت اور درد و اثر مطلق نہیں۔ جس سے گو دماغ لطف اندوز ہوتا ہے مگر دل کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔ شعر گوئی کی زحمت کے مقابلہ میں

---

[1] ایک مشہور انگریزی شاعر کا نام ہے - ۱۲

ایسے اشعار کا نتیجہ بالکل بے حقیقت ہوتا ہے۔ پہلے پہلے تو تبدیل ذائقہ کے طور پر اس قسم کے اشعار اچھے معلوم ہوئے مگر جدّت پسند طبیعتیں ان سے گھبرا گئیں کیونکہ معمولی کاریگروں کے ہاتھ میں شاعری تمسخر انگیز ہو گئی۔ بے مزہ اشعار کی کثرت سے لوگوں کا دل بھر گیا۔ اور اب وہ انیسؔ و دبیرؔ کی جادو نگاری اور غالبؔ و مومنؔ کی مضمون آفرینی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ ہر دور کی شاعری اس وقت کا آئینہ ہوتی ہے۔ یہی حال لکھنؤ کی بھی شاعری کا ہے۔ ناسخؔ اور ان کے شاگردوں کا کلام اس زمانہ کی نسوانیّت کا پتہ دیتا ہے۔ ان کی غزلوں سے اس زمانہ کے زنانہ لباس اور زیور اور آرایش کی مکمل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ کبھی ان کے کلام سے زنانہ گفتگو مترشح ہوتی ہے جو دلّی والوں کے یہاں نہیں ہے۔ دلّی والے فارسی کے اوزان میں چھوٹی چھوٹی غزلیں کہتے اور پامال اور فرسودہ خیالات سے بہت بچتے تھے۔ بخلاف اس کے شعرائے لکھنؤ ایک ایک زمین میں چو غزلے اور پنج غزلے کہتے تھے اور یہ خراب رسم مصحفیؔ اور جراءتؔ کی نکالی ہوئی تھی۔ اسی کثرت کی وجہ سے اکثر اوقات شعر میں بدمزگی اور بے لطفی اور کبھی کبھی ابتذال پیدا ہو جاتا ہے۔

تحقیق الفاظ و رعایت لفظی کا زمانہ اس زمانہ میں اور نیز اس کے بعد کے زمانہ میں تحقیق الفاظ و رعایت لفظی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ جس کی ابتدا شیخ ناسخؔ نے کی اور اُن کے شاگردوں کی کوششوں سے یہ رنگ لکھنؤ اور رامپور میں پھیل گیا۔ یہی لوگ اصطلاح میں زبان داں کہلاتے ہیں۔ رشکؔ، بحرؔ، سحرؔ، منیرؔ، جلالؔ، برقؔ اور واجد علی شاہ اخترؔ، امیرؔ وغیرہ یہ سب لوگ مناسب الفاظ کے انتخاب میں نہایت جانفشانی کرتے تھے اور ہمیشہ خیال رکھتے تھے کہ صحیح الفاظ و محاورے اشعار میں استعمال کیے جائیں۔ ہندی الفاظ اور محاورات کے صحیح استعمال میں بھی یہی لوگ سند سمجھے جاتے

تھے۔ اس چھان بین اور دقتِ نظر کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے الفاظ خارج کر دیے گئے اور لغات شعریہ بہت کم رہ گئے۔ اسی وجہ سے زبان میں ایک کرختگی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ جو الفاظ و محاورات منتخب شدہ تھے وہ صرف مقرر کردہ طریقہ پر استعمال کیے جا سکتے تھے اور مقرر کردہ قواعد کی خلاف ورزی معیوب سمجھی جاتی تھی۔

اس جدید طرز لکھنؤ نے زبان میں بھی بعض اختلافات پیدا کر دیے۔ لکھنؤ کے شعراء اور عوام الناس نے بعض الفاظ و محاورات کو خاص خاص محل پر استعمال کرنا شروع کیا اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ استعمال دہلی کے طریقہ استعمال سے بہتر اور موزوں تر ہے۔ نیز یہ کہ ان کے پسند کردہ الفاظ و محاورات زیادہ تر لطیف و فصیح ہوتے ہیں۔ یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے زبان کی صرف و نحو تک پہنچ گیا اور تذکیر و تانیث میں فرق کیا جانے لگا۔ یعنی بعض الفاظ جو اہلِ لکھنؤ کے نزدیک مذکر ہیں وہ دہلی میں مؤنث بولے جاتے ہیں۔ اور بعض جو وہاں مونث ہیں یہاں مذکر بولے جاتے ہیں۔ یہ اختلاف جو بہت زیادہ اہم نہیں ہے اور صرف چند الفاظ تک محدود ہے۔ اس کی ابتداء میر علی اوسط رشک شاگرد ناسخ نے کی تھی۔ ان کے بعد سے یہ تصفیہ اب تک چلا آتا ہے۔ اور ان دونوں مقاموں کے شاعر اب بھی اس فرق کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ متوفی ۱۲۵۲ھ[1] مطابق ۱۸۳۸ء

شیخ امام بخش متخلّص بہ ناسخ زبان اردو کے بہت بڑے شاعر اور طرز لکھنؤ کے موجد تھے۔ ان کے خاندانی حالات صحیح طور پر نہیں معلوم ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص مسمیٰ خدا بخش خیمہ دوز نے جو لاہور کا ایک دولت مند سوداگر تھا اور کوئی اولاد نہیں رکھتا تھا۔ ان کو متبنّیٰ کر لیا تھا۔ اس نے ان کو بہت اچھی تعلیم دی اور مثل اپنی اولاد کے ان

---

[1] صحیح ۱۲۵۴ھ ہے۔ ناقل

سے محبت کرتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے بھائیوں نے وراثت کا جھگڑا کیا اور ناسخ کی تبنیت کو غلط ٹھہرا کر ان کو اپنے بھائی کا غلام بتایا۔ رفتہ رفتہ کچھ کی صورت پیدا ہوئی اور اسی اثنا میں ناسخ کو زہر دینے کی تدبیر کی گئی مگر وہ کارگر نہ ہوئی۔ یہ معاملہ بالآخر عدالت میں پہنچا، جہاں سے ناسخ کے حق میں فیصلہ ہوا۔ ان کے دیوان کی چند رباعیوں میں ان واقعات کی طرف حوالہ ہے مثلاً۔

(۱)

مشہور ہے گرچہ افترائے اعمام
پر کرتے نہیں غور خواص اور عوام
وارث ہوتا دلیل فرزندی ہے
میراث نہ پا سکا کہیں کوئی غلام

(۲)

کہتے رہے اعمام عداوت سے غلام
میراث پدر پائی مگر میں نے تمام
اس دعوئے باطل سے ستمگاروں کو
حاصل یہ ہوا کر گئے مجھ کو بدنام

فارسی اور عربی کی درسیات انہوں نے حافظ وارث علی اور علمائے فرنگی محل سے پڑھیں جو لکھنؤ میں ایک بہت بڑا تعلیمی مرکز ہے۔ وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعری میں ان کو کس سے تلمذ تھا۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ وہ میرؔ کے پاس بغرض شاگردی گئے تھے۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ یہ بات کسی قدر اعتبار سے مصحفی کی سند سے کہی جا سکتی ہے کہ ناسخ تنہا سے اصلاح لیتے تھے جو مصحفی کے شاگرد تھے مگر یہ تعلق زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا۔ وہ اپنی ہی طبیعت پر زور دیتے تھے۔ اور مشاعرہ کی غزلوں سے جوں جوں مزاولت بڑھتی جاتی تھی اسی قدر ان کو کلام پر قدرت حاصل ہوتی جاتی تھی۔ بالآخر استاد مانے جانے لگے اور خود بیسیوں شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح دینے لگے جن میں سے اکثر مرتبۂ کلام میں اُن سے کم نہیں ہیں۔ ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ بڑے تن و توش کے اور قوی ہیکل آدمی تھے۔

اور کھاتے بہت تھے۔ شادی نہیں کی تھی۔ دن میں صرف ایک مرتبہ کھاتے تھے۔ مگر اُس وقت تقریباً پانچ سیر غذا نوش جان کر لیتے تھے۔ رنگ سیاہ تھا۔ اسی وجہ سے ان کے حریف اور با مذاق لوگ دُم کٹے بھینسے کی پھبتی کہتے تھے۔ روزانہ معمول یہ تھا۔ کہ صبح سویرے اُٹھتے ورزش سے فراغت کر کے نہاتے پھر اپنے شاگردوں اور دوستوں سے ملتے۔ اس کے بعد قریب بارہ بجے کے کھانا کھاتے۔ اور تھوڑی دیر آرام کرتے سہ پہر کو پھر وہی شاگرد اور احباب جمع ہوتے اور شعر و شاعری کا چرچا ہوتا۔ رات کو فکرِ سخن کرتے۔ جس میں اپنی غزلیں بھی کہتے اور شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح بھی دیتے۔ بہت بڑے صاحب وضع تھے اور اسی پاسداری وضع کو دوسروں سے بھی چاہتے تھے جو ان سے ملنے آتے تھے۔ ان کی صحبت اور باتوں میں بڑی کشش تھی۔ اس واسطے کہ باوجود شاعرانہ بد دماغی اور آزاد مزاجی کے لوگ کثرت سے ملنے آتے تھے۔ جن میں اکثر لکھنؤ کے بڑے بڑے امراء اور رئیس ہوتے تھے۔ خود کبھی کسی کی ملازمت نہیں کی۔ اور اپنے قدر دانوں کی قدر شناسی اور فیاضی کی بدولت نہایت آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ ۱۸۳۱ء میں نواب آغا میر نے سوا لاکھ روپیہ ان کو دیا تھا۔ وہ انہوں نے کہیں رکھوا دیا تھا۔ لوگوں نے جانا انہی کے یہاں ہے۔ چور نے رات کو نقب لگائی مگر کچھ نہ پایا۔ انہوں نے تاریخ کہی ہے

دزد در خانۂ ناسخ چو زدہ نقب امشب — نہ زر و سیم نہ بُد مس خجل آمد بیروں

بہرِ تاریخ مسیحی چو بہ پیدم سرِ دزد — دزد از خانۂ مفلس خجل آمد بیروں

اس سے ہم کے تخرجہ کے بعد ۱۸۳۱ء نکلتے ہیں۔

ناسخ ایک مرتبہ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ سے چلے گئے تھے۔ وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ بادشاہ موصوف اُن کو اپنے دربار سے متعلق کرنا اور خطاب ملک الشعرائی دینا چاہتے تھے۔ ناسخ کو یہ امر بہت ناگوار ہوا اور یہ کر خطاب واپس کر دیا

کہ غازی الدین حیدر کو نہ تو شاہان دہلی کا مرتبہ حاصل ہے اور نہ سرکار انگریزی ایسا اقتدار۔ پھر میں ایسے بادشاہ کا خطاب لے کے کیا کروں۔ اس حقارت آمیز جواب سے بادشاہ کو غصہ آیا اور ناسخ کو وطن چھوڑنا پڑا۔ لکھنؤ سے وہ الہ آباد گئے جہاں چند روز قیام کیا۔ یہاں راجہ چندولال دیوان سلطنت آصفیہ حیدر آباد دکن نے اُن کو بارہ ہزار روپیہ بھیجے اور ایک خط لکھا کہ اگر آپ دکن آئیے تو وہاں حسب مراتب آپ کی قدر و منزلت کی جائے گی۔ وطن کی محبت سے انہوں نے اس قدر دُور دراز جانے سے انکار کیا۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ اور انہوں نے اسی قسم کا پیغام بھیجا تھا جس کے ساتھ پندرہ ہزار روپیہ بھی ارسال کیے تھے۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد وہ لکھنؤ واپس آئے۔ مگر حکیم مہدی کی دشمنی کی وجہ سے جو اُن کے سرپرست اور قدر دان آغا میر کے دشمن تھے۔ اُن کو پھر لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ اب کی مرتبہ فیض آباد الہ آباد بنارس کانپور اور پٹنہ میں تھوڑے دن قیام کیا۔ مگر وطن کی محبت کبھی نہ بھولے آخر کار حکیم مہدی کے انتقال کے بعد ۱۲۴۹ھ میں پھر لکھنؤ واپس آئے۔ جہاں چند[1] سال رہ کر ۱۲۵۴ہجری میں انتقال کیا۔ میر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی ہے

دلا شعر گوئی اُٹھی لکھنؤ سے

تصانیف ان کے تین دیوان ہیں جن میں سے دو زیادہ مشہور ہیں۔ ایک دیوان الہ آباد کے قیام میں مرتب کیا تھا جس کا سنہ تصنیف ۱۲۳۲ ہجری ہے اس کا نام دفتر پریشان رکھا۔ اس میں غزلوں اور رباعیوں اور تاریخوں کے سوا اور قسم کی نظم نہیں۔ دوسرے اور تیسرے دیوان کا سنہ تالیف علی الترتیب ۱۲۴۷ھ اور ۱۲۵۴ھ[2] ہے

[1] ناسخ کی ولادت ۱۱۶۶ھ (؟) اور وفات ۲ جمادی الاول ۱۲۵۳ھ پنجشنبہ ہے۔ نیز دیکھیے ہماری کتاب ناسخ کلام اور سوانح، طبع شیخ غلام علی۔ لاہور۔

[2] دیکھیے فٹ نوٹ صفحہ ۲۷۸۔

ان کے دیوانوں میں جو تاریخیں ہیں وہ اس لئے وہ بہت قابل قدر ہیں کہ ان سے نامی گرامی شعراء اور دیگر مشاہیر کا سنہ وفات معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ناسخ نے کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ ان کے کلام میں قصائد کی جگہ اکثر قطعات نے لی ہے ہجو اور مذاق کا بھی پتہ ان کے یہاں نہیں۔ ان کی ایک مثنوی بھی ہے۔ جس کا نام "نظم سراج"[۲] ہے، جو تاریخی نام ہے۔ اس سے ۱۲۵۴ھ نکلتے ہیں یعنی اس سال ان کے شاگرد رشک نے ان کی وفات کے بعد اس کو شایع کیا تھا۔ ایک مولود شریف بھی شیخ صاحب کی تصنیف ہے مگر یہ دونوں کتابیں مصنف کے پایہ سے گری ہوئی ہیں۔

ناسخ کا اثر شاعری اور زبان پر

شیخ ناسخ تین چیزوں کے واسطے مشہور ہیں۔ ایک ان کی قادر الکلامی جو ان کی غزلوں سے معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے وہ طرز جدید جو انہوں نے ایجاد کیا تھا۔ تیسرے ایک بڑی جماعت مشہور شاگردوں کی جن کو اپنے بعد وہ چھوڑ گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ناسخ ایک مسلّم الثبوت اُستاد

(حاشیہ صفحہ ۲۷۷) فقیر مؤلف کے پاس جو نسخہ کلیات ہے اُس کے آخر میں یہ عبارت ہے: "الحمد للہ کہ بفرمایش شاہزادہ والا جاہ مرزا فرخندہ بخت بہادر دام اقبالہٗ کلیات رئیس شعرائے زماں سر دفتر بلغائے دوراں مدظلہ وعلی، راسخ بن شیخ امام بخش متخلص بہ ناسخ دیوان اول مسمیٰ بہ "دیوان ناسخ" در متن و دیوان دوم مسمیٰ بہ "دفتر پریشان" بر حاشیہ و دیوان سوم مسمیٰ بہ "دفتر شعر" و ہر ردیف ملحق بہ دفتر پریشاں بتاریخ چہارم جمادی الاول ۱۲۶۲ھ در مطبع مولائی واقع بازار راجہ ٹکیت رائے منطبع گردید۔"

[۱] آب حیات میں ڈھونڈھ کے ایک تاریخ ان کی نکالی ہے جس سے ان کی تفریح طبع اور مذاق کا حال معلوم ہوتا ہے۔ میر گھسیٹا نام ایک شخص مر گئے تو شیخ صاحب نے فرمایا ؎

جب میر گھسیٹا مر گئے ہائے — ہر ایک نے اپنے منہ کو پیٹا
ناسخ نے کہی یہ سن کے تاریخ — افسوس کہ موت نے گھسیٹا

[۲] نظم سراج نہیں — "سراج نظم" ہے۔ ناضل۔

تھے۔ جن کو زبان اُردو و فارسی پر قدرت حاصل تھی۔ شعر کی آرائش ظاہری کما حقہٗ کرتے تھے۔ لکھنؤ کے حلقہ شعراء میں ان کا بہت بڑا اثر تھا۔ اور اب تک کسی متنازع فیہ ادبی مسئلہ میں مثلاً کسی محاورے یا لفظ کی صحت کے متعلق ان کا کلام سند میں پیش کیا جاتا ہے۔ الفاظ اپنی جگہ پر خوب صرف کرتے تھے اور ایسے الفاظ جو سوداؔ و میرؔ کے زمانہ کی یادگار رہ گئے تھے اُن سے اجتناب کرتے تھے۔ برخلاف ان کے مصحفیؔ زمانہ قدیم کے بہت بڑے متبع تھے۔ ناسخؔ کے کلام میں یہ نقص ضرور ہے کہ انہوں نے الفاظ کی تلاش و جستجو پر ضرورت سے زیادہ توجہ کی اور بدنصیبی سے کہیں کہیں مغلق اور ادق الفاظ فارسی و عربی داخل کرنا چاہیے جو غزل کے شایاں نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا کلام حُسن ظاہری سے تو آراستہ ہے مگر دلچسپی اور تاثیر سے خالی ہے یہی حال انگریزی میں پوپ شاعر کا ہے جس میں کوئی ظاہری سقم تو نہیں مگر درد و اثر مطلق نہیں ہے۔

ناسخ کی غزلیں ان کی غزلیں شاندار الفاظ اور طرح طرح کی تشبیہات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ مگر جذبات و اثرات سے خالی ہیں۔ تصنع ان کے کلام کا اصلی جوہر ہے۔ تشبیہیں اکثر نئی تو ہیں مگر عجیب ہوتی ہیں حسن ظاہری بجائے غرض ثانوی کے ان کے یہاں غرض اصلی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ الفاظ کی مناسبت کی بہتات میں شعر کا مضمون خبط ہو جاتا ہے۔ ان کی غزلیں صائبؔ اور مرزا بیدلؔ کے رنگ میں ہوتی ہیں یعنی اول الذکر کی تشبیہات اور آخر الذکر کی نازک خیالیاں کہیں کہیں ان میں پائی جاتی ہیں۔ ناسخؔ کے چند ایسے اشعار جن میں عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کیے ہیں بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں ؎

غیر کو تو کبھی دریا کا بیں سیاح نہیں بیشۂ شیر خدا بن کہیں سیاح نہیں
ظلم طولِ شب فرقت کے تطاول نے کیا داد رس کوئی بجز خالق الاصباح نہیں

بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلف یار پر — دوڑتا تھا جس طرح ثعبان موسیٰؑ مار پر
دیکھیو ناسخ سر شیخ معمم کی طرف — کیا کلس مسواک کا ہے گنبد دستار پر
کیونکر اے ناسخ خوار عجل دشمن ہو نہ خوار — کیسے موسیٰؑ کا علیؑ شیر خدا ہارون ہوا

معمولی کلام کا انداز یہ ہے :-

روئے جاناں کا تصوّر میں جو نظّارا ہوا — دِل میں تھا جو داغِ حسرت عرش کا تارا ہوا
وہ مہِ خانہ نشیں گلیوں میں آوارا ہوا — اے منجّم دیکھنا ثابت بھی سیارا ہوا
محفلِ مے میں جو آیا تو برائے میکشی — تھا جو شیشہ جوش مے سے ایک فوّارا ہوا
چشم بد دُور آج کیا آتے نظر ہیں گال صاف — سبزۂ خط کیا غزالِ چشم کا چارا ہوا
شب ہوا سے ہل گئی جو اس کی زلفِ عنبریں — دم میں موم شمع سارا عنبر سارا ہوا
پیٹھ پیچھے میرے بد کہنے سے زاہد یہ ملا — پیٹھ پہ بار گنہ کا جمع پشتارا ہوا
دُور پھینکا ساقیا لیتے ہی تیرے ہجر میں — ہاتھ میں جام مے گل رنگ انگارا ہوا
جب نہانے کو ہوا عریاں وہ پُتلا نور کا — حوض میں روشن بہ رنگ شمع فوارا ہوا

دوستو جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہ ہو
قتل آج اُس کی گلی میں ایک بیچارا ہوا

تاریخیں تاریخ گوئی میں اُن کو خاص ملکہ تھا۔ بات بات پر تاریخ کہتے تھے۔ بعض تاریخیں بہت عمدہ اور دلچسپ ہیں مثلاً کسی نے اُن کے خطوط چھپائے تو کہا ؎

سیاہ ہمچو قلم باد روئے حاسد من

پھر چار خط جاتے رہے تو کہا

صد حیف تلف چہار نامہ

پیارے شاگرد خواجہ وزیر کا بیاہ ہوا تو فرمایا ؎

شدہ نوشہ وزیر من امروز

جب ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو صبح کا وقت تھا فرمایا ؎

صبح طالع شد بر آمد آفتاب

جب حکیم مہدی معزول ہو کر فرخ آباد گئے تو انہوں نے تاریخ کہی ؎

افتاد حکیم از وزارت　　تاریخ بطرز نو رقم کن

از جائے حکیم ہشت برگیر　　سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

قصیدہ نہیں کہا تعجب ہے کہ اس صنف خاص میں انہوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ درحالیکہ اس کی ترتیب میں درد و اثر کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ بلکہ ان کا شوق شکوہ الفاظ کا اس کا ممد و معاون ہوتا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی فطری طبیعت کی آزادی نے خوشامد اور چاپلوسی کی اجازت نہ دی ہو۔ وہ تصوف سے بھی بے گانہ ہیں۔ ان کے بعض اشعار جو صوفیانہ کہے جا سکتے ہیں اُن میں بھی خود انہیں کا رنگ غالب ہے اور حقیقی تصوف کہیں چھو نہیں گیا ہے۔ مزاح و ظرافت کا بھی کہیں ان کے کلام میں ذکر نہیں۔ ان کی ہنسی بناوٹی ہوتی ہے اور مذاق پھس پھسا۔ کہیں کہیں مذہبی حملے اور طعن و تشنیع سے بھی کام لیتے ہیں، مگر اس میں کسی قسم کی لطافت اور خوبی نہیں ہوتی بلکہ ان کے مرتبہ سے گری معلوم ہوتی ہے۔

نقائصِ کلام کلام میں وہی نقائص ہیں جو عام طور پہ ان کے ایجاد کردہ طرز میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی کسی عمدہ خیال کا ان میں پتہ نہیں۔ ان کے کسی شعر پہ پڑھنے والے کا دل نہیں پھڑکتا۔ نہ اُس میں کسی قسم کا انعکاس اور باریک نظری ہے۔ اشعار پھس اور بے لوچ ہوتے ہیں۔ عام طور پر نقائص کلام یہ ہیں۔ تصنع اور تکلف۔ فارسی تشبیہات جو اُردو کا جامہ پہن کر بدنما ہو گئی ہیں۔ بڑے بڑے فارسی عربی مغلق الفاظ جن کی اُردو غزل متحمل نہیں ہو سکتی۔ شعر کی ظاہری آرائش کو مقدم سمجھنا۔ معمولی اور پست خیالات کا بے موقع اظہار شاندار الفاظ میں۔ سرقہ کا بھی الزام اُن پر لگا دیا جاتا ہے۔ مگر سچ پوچھیے تو

یہ دستور قدیم سے چلا آتا ہے۔

ناسخ کے کارنامے

ناسخ اپنے تخلص کے اعتبار سے طرز قدیم کے مٹانے والے تھے۔ مگر غور سے دیکھیے تو اس تغیر کا شوق اور خیال لوگوں کے دلوں میں پہلے سے چلا آتا تھا۔ مگر انہوں نے اس کی ابتداء کی اور اپنے کلام میں اس کو برتا۔ مرزا حاجی صاحب اس زمانہ کے ایک متموّل اور بارسوخ رئیس تھے۔ جو خود بھی ذی استعداد تھے اور ان کی سرکار میں مرزا قتیل اور قاضی محمد صادق خاں اختر وغیرہ ایسے باکمال لوگ جمع رہتے تھے۔ ناسخ کو خوش نصیبی سے مرزا کے دربار میں رسائی ہو گئی جہاں ایسے کامل لوگوں کی صحبت میں ان کو بھی زبان کی تراش و خراش اور تحقیق و تدقیق کا شوق پیدا ہوا اور ان کے دل بڑھ جانے سے کلام نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ طبیعت میں اُمنگ اور دل میں جوش بڑھ گیا۔ غرضکہ مرزا حاجی کی مہربانی سے ان کی شاعری خوب چمکی اور اس کو لکھنؤ میں خوب فروغ حاصل ہوا۔ ناسخ نے جو تغیرات غزل میں کیے ان میں سے بعض یہ ہیں۔ لفظ اُردو بجائے ریختہ کے استعمال کیا جو لکھنؤ میں جاری ہو گیا۔ مگر دِلّی میں عرصہ تک وہی پرانا لفظ قائم رہا۔ ایسی غزلیں کہیں جن کی ردیفیں اکہری۔ مثلاً کا۔ کو۔ ہے۔ نہیں۔ سے۔ پہ تک وغیرہ ہیں۔ افعال میں بھی تغیر کیا۔ مثلاً آئے ہے۔ جائے ہے کی بجائے آتا ہے۔ جاتا ہے۔ اور آئیاں دکھائیاں وغیرہ ترک کر دیا۔ یہ آخری فرق لکھنؤ اور دِلّی کی زبان کا بہت متمائز فرق تھا جو ابھی تک کسی قدر باقی ہے۔ نامہذب اور فحش الفاظ جو بعض قدماء کے کلام میں پائے جاتے تھے انہوں نے خارج کر دیے۔ عربی اور فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی طرف زیادہ توجہ کی اور ہندی لفظوں کو بسا اوقات بے ضرورت خارج کیا۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے سخت قواعد مقرر کیے۔ غزل کا دائرہ وسیع کیا۔ الفاظ کا صحیح استعمال مقرر کیا۔ ایک طولانی فہرست اس قسم کے تغیرات کی جو ان کے زمانہ میں عمل آئے۔ تذکرہ جلوۂ خضر اور شعر الہند

میں دی ہوئی ہے۔ ناسخ کی تعریف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مقرر کردہ قواعد پر خود بھی سختی سے عمل کیا اور اپنے شاگردوں کو بھی عمل در آمد پر مجبور کیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد میر علی اوسط رشک نے ان سب تغیرات کو ایک کتاب کی صورت میں منضبط کیا۔

شاگرد ناسخ کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سے چند مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں :۔

وزیر۔ برق۔ رشک۔ بحر۔ منیر۔ مہر۔ نادر۔ آباد۔ طاہر۔

برق فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق، مرزا کاظم علی خاں کے بیٹے اور واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے مصاحب خاص اور اُستاد بھی تھے۔ بادشاہ کے ساتھ اُن کو بہت محبت تھی۔ چنانچہ جب بعد انتزاع سلطنت بادشاہ کلکتہ گئے تو وہ بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ جہاں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔ یہ شعر ان کا اُن کے حسب حال ہے۔

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اُٹھے
جان دی آپ کے دروازہ پہ سر کر اُٹھے

برق شاعری کے علاوہ بانکپن میں بھی مشہور تھے۔ بانک بنوٹ وغیرہ اچھی جانتے اور تلوار خوب لگاتے تھے۔ لکھنؤ میں باعتبار ان کے عالی خاندان اور ذی مرتبہ ہونے کے اور نیز اُن کے اخلاق وسیر چشمی کی وجہ سے ان کی بڑی شہرت تھی۔ پُر گو شاعر تھے اور اپنے اُستاد ناسخ کے متبع تھے ان کے کلام میں بھی مثل ان کے اُستاد کے تکلف اور تصنع بہت ہے مگر زبان پہ قادرت اور شعر میں مزہ ہے ایک

ا؎ گل رعنا میں تاریخ وفات ۲۸، صفر ۱۲۷۳ھ درج ہے۔ میں نے وفا فرنگی محلی کے قطعہ تاریخ میں ۱۲۷۳ھ دیکھا ہے۔ فاضل

ضخیم دیوان چھوڑا۔ جس میں مختلف اصناف سخن موجود ہیں۔ ایک شہر آشوب لکھنؤ کی تباہی کا بہت درد انگیز لکھا ہے۔ یہ بھی گو کہ اپنے پرانے رنگ میں ہے مگر اکثر اشعار بہت مؤثر و درد انگیز ہیں۔ جلالؔ اور سحرؔ ان کے دو مشہور شاگرد تھے نمونۂ کلام یہ ہے:۔

کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا — اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا

ولہٗ

دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو — قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو

ولہٗ

اچھا ہوا جو خاک میں تم نے ملا دیا — نکلا غبار دل سے صفائی تو ہو گئی

ولہٗ

غم میں پھنسا ہوں دام محبت سے چھوٹ کر — آتا نہیں قرار دلِ بے قرار کو

بحرؔ — شیخ امداد علی بحرؔ، شیخ امام بخش اپنے استاد ناسخؔ کے ہمنام کے بیٹے تھے۔ عمر بھر پریشانی اور عسرت میں گزری۔ آخر عمر میں نواب کلب علی خاں والی رامپور اُن کی سرپرستی فرماتے تھے۔ رامپور ہی میں پچھتر ۷۵ برس کی عمر میں ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء میں اس دار فانی سے رحلت کی۔ ان کے دیوان کی ترتیب ان کے دوست نواب سید محمد خاں رندؔ شاگرد آتشؔ نے کی۔ ان کے کلام میں بھی پیچیدہ تمثیلیں اور دقیق استعارات پائے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی اس قدر تصنع اور الفاظ کی بھرمار نہیں ہے۔ جیسا کہ دیگر شاگردانِ ناسخؔ کے یہاں ہے۔ اکثر اشعار بہت صاف اور سلیس اور پُر اثر بھی ہوتے ہیں۔ صحت الفاظ اور تحقیق لغت کے استاد تھے۔ ناسخؔ اور رشکؔ کے بعد لکھنؤ کے دورِ متوسط کے شعراء میں بہت بڑا درجہ رکھتے تھے اور تحقیق الفاظ کے معاملہ میں خاص کر بہت مستند سمجھے جاتے تھے۔ کچھ صاف و سادہ

اشعار بطور نمونے کے پیش کئے جاتے ہیں ؎

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا
میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

ولہٗ

ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ
اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں

ولہٗ

مدت سے التفات مرے حال پر نہیں
کچھ تو کجی ہے دل میں کہ سیدھی نظر نہیں

ولہٗ

افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں
دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں!

ولہٗ

کیا کیا نہ مجھ سے سنگدلی دلبروں نے کی
پتھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح

آباد مرزا مہدی حسن خاں متخلص بہ آباد، مرزا غلام جعفر کے بیٹے تھے۔ ۱۲۲۸ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ نوابان فرخ آباد سے سلسلۂ قرابت رکھتے تھے اور لکھنؤ کے رؤسا میں شمار کیے جاتے تھے۔ شعر گوئی سے بڑا شوق تھا۔ مقررہ اوقات پہ اپنے مکان پر مشاعرہ کرتے تھے۔ اور دوسرے مشاعروں میں بھی بالالتزام جاتے تھے۔ پُرگو شاعر تھے۔ دو دیوان ایک مثنوی اور تین واسوخت یادگار چھوڑے ہیں جن میں سے ایک دیوان موسوم بہ "نگارستانِ عشق" لکھنؤ میں شایع ہوا تھا۔ ان کا ایک مجموعہ "بہارستان سخن" جس میں ناسخ و آتش کی ہمطرح غزلیں جمع کی ہیں بہت مشہور ہے۔ جس سے ان دونوں اُستادوں کے کلام کے موازنہ کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ آباد کے کلام میں کوئی خاص خصوصیت نہیں، البتہ کہیں کہیں کوئی پھڑکتا ہوا شعر نکل آتا ہے۔

خواجہ وزیر خواجہ محمد[1] وزیر المتخلص بہ وزیر خواجہ محمد فقیر کے بیٹے تھے۔ سلسلۂ خاندان

[1] مولود ۱۷۸۴ء وفات ۱۸۵۳ء - فاضل

ان کا باپ کی جانب سے حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ سے ملتا ہے۔ لکھنؤ میں عالی خاندان ہونے اور نیز اپنے ذاتی تقدس کی وجہ سے بڑی عزت سے بسر کی۔ آخر عمر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور شعر و سخن سے نفرت ہو گئی تھی۔ فتوح اور تسخیر اعمال کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت نقوش بھرا کرتے تھے۔ سو روپیہ ماہوار سے خرچ کم نہ تھا۔ مگر آمدنی کہیں سے کچھ نہ تھی۔ آزادی مزاج کا یہ حال تھا کہ واجد علی شاہ بادشاہ نے دو مرتبہ یاد فرمایا مگر وہ کچھ نہ کچھ عذر کر کے اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ بالآخر ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔ منشی اشرف علی شاگرد نسیم دہلوی نے مادۂ تاریخ خوب نکالا ہے۔

مزہ شعر کا ہائے جاتا رہا

ان کی وفات کے بعد ان کے دوستوں اور شاگردوں نے ان کا کچھ کلام بصورت غزلیات جمع کر کے شایع کیا اور اُس کا تاریخی نام "دفتر فصاحت" رکھا جس سے ۱۲۶۳ فصلی مطابق ۱۲۷۱ھ اس کی تاریخ اشاعت نکلتی ہے۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے۔ جن میں سب سے مشہور فقیر محمد خاں گویاؔ ہیں۔ خواجہ وزیر کا رنگ وہی ہے جو اُن کے اُستاد کا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اپنے اُستاد کے سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ محبوب شاگرد یہی تھے۔ مشکل مشکل طرحوں میں طبع آزمائیاں کی ہیں اور اپنے طرز کے موافق خوب خوب شعر نکالے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اپنے عہد کے شعرا میں خواجہ وزیر بہت بڑے پائے کے شاعر تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

چھڑا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمیں کرئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

ترچھی نظر دل سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ولہ

ہے چشمِ نیم باز عجب خواب ناز ہے	فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

ولہ

نہ کر عوض مرے جرم و گناہ بے حد پر	الٰہی تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں!

کہیں عدو نہ کہیں مجھ کو دیکھ کر محتاج	یہ اُن کے بندے ہیں جن کو کریم کہتے ہیں

رشک میر علی اوسط رشک میر سلیمان کے بیٹے تھے۔ بزرگوں کا وطن فیض آباد تھا[1] مگر ان کی نشو و نما لکھنؤ میں ہوئی اور یہیں ان کی شاعری بھی پروان چڑھی۔ ناسخ کے مشہور شاگرد رہے۔ زیادہ تر ان کی شہرت ان کی مبسوط اور جامع لغت موسوم بہ "نفس اللغۃ" پر مبنی ہے جو زبان فارسی میں ہے اور اردو اور ہندی الفاظ و محاورات کی صحت کی تحقیق اُس میں کی گئی ہے۔ یہ تاریخی نام ہے جس سے سن تالیف ۱۲۶۵ھ نکلتا ہے۔ وہ ان کی زندگی ہی میں مشہور و مقبول ہو چکی تھی۔ اب اس کا ایک حصہ نشتر کاکوروی نے چھپوا کر دفتر نور اللغات سے شایع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دو دیوان بھی ہیں جن کے علی الترتیب تاریخی نام "نظم مبارک" (۱۲۵۳ھ) اور "نظم گرامی" (۱۲۶۱ھ) ہیں۔ رشک کا بھی رنگ وہی ہے جو ان کے اُستاد ناسخ کا ہے۔ ان کا کلام بھی بالکل بے مزہ اور سیٹھا پھیکا ہے اور اس زمانے کے عیوب اس میں بھی سب موجود ہیں۔ رشک تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ بات بات پر تاریخ کہتے تھے۔ اپنے بعد انھوں نے بہت سے شاگرد چھوڑے۔ جن میں منیر مشہور ہیں۔ منیر پہلے ناسخ کے شاگرد تھے مگر اُن کے بعد رشک سے اصلاحِ سخن لیتے تھے۔ رشک کچھ دن کانپور اور الہ آباد میں بھی رہے۔ آخر عمر میں کربلائے معلّٰی چلے گئے تھے اور وہیں ۱۲۸۴ھ میں ستّر برس کی عمر میں وفات پائی، ان کا

---

[1] قاموس المشاہیر میں ہے۔ ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۹ء فیض آباد میں ولادت، اور ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۹ء کربلا میں وفات۔ فاضل

بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ صحت الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے اور خود اپنے اُستاد نے زمانے میں بھی اسی بات کے لیے مشہور تھے۔ ان کے کلام میں بلند خیالی اور مضمون آفرینی کا پتہ نہیں۔ معمولی باتیں کہتے ہیں اور بالکل معمولی طریقے سے کہتے ہیں۔ ان کو اس بات کا بڑا خیال تھا کہ جو لفظ جس طرح معمولی بول چال میں بولا جائے اسی طرح وہ نظم بھی کیا جائے۔ مثلاً ہم آپ میں آئیں گے تو وہ آئیں گے آپی (آپ ہی)

دل ہی میں سُراغ ور دلدار ملے گا

بہت پُر گو تھے مگر کلام رعایت لفظی اور ضلع جگت کی پیچیدگیوں میں ایسا پھنسا ہوا ہے کہ دو چار شعر بھی اچھے مشکل سے ملتے ہیں۔ ان کی ایک طویل غزل ہے جس کا قافیہ "لگاؤ" "تاؤ" وغیرہ ہے چونکہ قافیہ مشکل تھا انہوں نے محنت و جانفشانی سے بہت سے ہم قافیہ لفظ جمع کیے تھے۔ نمونے کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں ؎

یار کو ہم سے لگاؤ نہیں — وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں
پوزدں میں دستخط کروں کیا حال — ایک دو تین چار تاؤ نہیں
گنگ کو بحرِ غم سے کیا نسبت — یہ وہ دریا ہے جس میں ناؤ نہیں
اب کی جاڑے ہیں اور نالہ و آہ — اس طرح کا کوئی الاؤ نہیں
چاو دل الماس گوشت لخت جگر — فرقتِ یار میں پلاؤ نہیں
میرے کھانے سے کیوں فلک ہے کباب — پاؤ روٹی ہے نانپاؤ نہیں
ہجر میں کیوں طرح طرح نہ دبائے — بارِ غم پر مرا دباؤ نہیں
یہ زمینِ غزل وہ ہے اے رشک — جس میں ذرہ کہیں بھراؤ نہیں

اتفاق سے "بلاؤ" کا قافیہ رہ گیا تھا۔ اس کی کمی کسی ظریف نے پوری کردی اور خود انہیں کی طرف منسوب کر دیا ؎

دور سے چھیڑے دکھاؤ نہیں — رشک بیٹھا ہے بن بلاؤ نہیں

مہر مرزا حاتم علی بیگ متخلص بہ مہر ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور خاندان اصفہانی کے نونہال تھے۔ ان کے والد مرزا فیض علی بیگ قزلباش ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں علی گڑھ کے تحصیلدار تھے۔ ان کے دادا مرزا مراد علی خان بعہد نواب شجاع الدولہ لکھنؤ آئے اور خطاب رکن الدولہ سے سرفراز ہوئے۔ وہ کسی زمانہ میں رائے بریلی کے ناظم تھے۔ والد کا انتقال ان کی صغر سنی میں ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ ان کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا اور چودہ ۱۴ برس کے سن میں شعر کہنے لگے تھے۔ جب ان کے بھائی مرزا عنایت علی بیگ متخلص بہ ماہ آتش کے شاگرد ہوئے تو خود انہوں نے زانوے شاگردی ناسخ کے سامنے تہ کیا اور رہتے رہتے پختہ کار ہو گئے ۱۸۴۰ء میں سرکاری امتحان پاس کر کے چنار گڑھ ضلع مرزا پور کے مصنف ہوئے۔ چنانچہ ان کا یہ شعر اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

از بسکہ سوز ہجر سے خوگر ہوئے ہیں ہم
منصف چنار گڑھ کے مقرر ہوئے ہیں ہم

وہ عدالت العالیہ ہائی کورٹ کے وکیل بھی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں انہوں نے چند انگریزوں کو پناہ دی تھی جس کے صلے میں خلعت فاخرہ اور دو ۲ گاؤں جاگیر میں سرکار سے عنایت ہوئے۔ اس کے بعد وہ آگرے آ گئے جہاں وکالت کرتے رہے اور کچھ دنوں آنریری مجسٹریٹی بھی کی ہے۔ ۱۸۷۹ء میں بمقام ایٹہ انتقال کیا۔ وہاں ان کے بیٹے مرزا سخاوت علی کچھ دن تحصیلدار رہے ہیں۔

مہر مذہب امامیہ رکھتے تھے مگر متعصب بالکل نہ تھے۔ اکثر مشہور لوگوں سے دوستی تھی۔ مثلاً غالب، انیس، دبیر، غلام امام شہید، صبا، منیر وغیرہ۔ چنانچہ غالب

۱؎ ۷ہر جمادی الاول ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۴ء بروز شنبہ قریب شام وفات دوشنبہ غروب آفتاب ۲۸ہر شعبان ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸ اگست ۱۸۷۹ء۔ فاضل

کے اکثر خطوط اُن کے نام اُردوے معلّٰی میں موجود ہیں۔ مہاراجہ بلونت سنگھ راجہ بنارس جو اُن دنوں آگرے میں ٹھہرے تھے اِن کے شاگرد ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔

تصانیف: مہرؔ کی اکثر تصانیف زمانۂ غدر میں تلف ہو گئیں مگر کتب ذیل مطبوعہ و غیر مطبوعہ یادگار باقی ہیں۔

(۱) دیوان اُردو موسوم بہ "الماس درخشاں" تاریخی نام "خیالاتِ مہرؔ" (۱۲۷۸ھ) اس کو ان کے پوتے مرزا قاسم حسین قزلباش نے شایع کرا دیا ہے۔

(۲) "پیرایۂ عروض" ایک مختصر رسالہ فن عروض میں۔

(۳) "ایاغِ فرنگستان" ابتدائی عملداری انگریزی کی مختصر تاریخ ۱۸۷۳ء میں شایع ہوئی۔

(۴) "مثنوی داغِ نگار" جو ایک دن میں لکھی تھی۔

(۵) "داغِ دلِ مہرؔ" واسوخت۔

(۶) "مثنوی شعاعِ مہر" ۱۸۵۸ء میں شایع ہوئی جس کی تعریف مرزا غالبؔ نے اپنے خطوط میں بہت کی ہے۔

ان کے علاوہ "شبیہ عشرت" "ضبط انتقام" "ہمدم آخرت" "بیان بخشایش" "عید قیصریہ" "پنجۂ مہر" "توقیر شرف" اور کچھ نظمیں بھی ان کی طرف منسوب ہیں۔ بہت پُر گو تھے۔ مختلف مضامین پر لکھتے تھے اور تاریخ خوب کہتے تھے۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں مہرؔ کا مرتبہ بلند ہے۔ ان کے کلام میں سلاست و روانی، تناسب اور زبان پر قدرت ہے۔ بعض اشعار ان کے نہایت صاف و سلیس اور بہت پُر لطف ہوتے ہیں۔

منیر: سیّد اسماعیل حسین متخلص بہ منیرؔ[۱] خلف سید احمد حسین شادؔ شکوہ آباد ضلع مین پوری

---

[۱] ولادت ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۳ء۔ وفات شب جمعہ ۴ رمضان ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۲ اگست ۱۸۸۰ء یہ تاریخ بزمؔ اکبرآبادی کے دیوان سے لی ہے۔ فاضل۔

کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں عرصے تک رہے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اپنے اردو دیوان "منتخبات عالم" کے شروع میں جو فارسی دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے اکثر اپنے واقعات زندگی بیان کیے ہیں۔ پہلے ناسخ سے بذریعۂ خط و کتابت اصلاح سخن لیتے تھے پھر کانپور میں جب وہ نواب نظام الدولہ کی ملازمت میں تھے اور ناسخ وہاں پہنچے تو یہ اُن سے ملنے گئے اور شاگرد ہو گئے اور اُنہی کی ہدایت کے بموجب وہ رشک سے بھی مشورہ کرنے لگے۔ چنانچہ اپنے کلام میں ان دونوں بزرگواروں کا بہت ادب و احترام سے کرتے ہیں۔ اور ان کی قابلیت کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ کلکتہ، مرشد آباد، اور الہ آباد میں بھی رہے تھے مگر لکھنؤ کے عاشقوں میں تھے یہاں کی دلچسپیاں اُن کو مجبور کرتی تھیں کہ اپنی مستقل سکونت وہاں اختیار کریں۔ اور شعر و شاعری کے جلسوں میں برابر شریک ہوں۔ اس شوق کا ذکر ان کے کلام میں اکثر پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ وہ کم سے کم سال میں ایک مرتبہ ضرور آتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ یہاں ظفر الدولہ نواب علی اصغر خاں کے ملازم بھی ہو گئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد پھر کانپور واپس جانا پڑا جہاں تھوڑے دن رہنے پائے تھے کہ لکھنؤ کی کشش نے پھر زور کیا۔ اور اب کی مرتبہ نواب سیّد محمد ذکی متخلص بہ ذکی کے سلسلۂ رفقا میں داخل ہوئے اور ان کے کلام کو اصلاح بھی دینے لگے۔ لکھنؤ میں دو سال قیام کر کے نواب تجمل حسین خاں کی فرمائش سے فرخ آباد گئے۔ جہاں نواب موصوف کی حین حیات قیام کیا۔ اسی عرصے میں مہاراجگان دھالپور اور الور نے بھی ان کو اپنے دربار میں طلب کیا تھا مگر انہوں نے باندے میں ملازمت کر لی تھی۔ جہاں نواب علی بہادر والیٔ ریاست کے استاد مقرر ہو گئے۔ بعد غدر ایک رنڈی مسماۃ نواب جان کے قتل کی سازش میں ان پہ مقدمہ قائم ہوا۔ اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی مگر ۱۸۶۰ء میں قید سے رہائی پائی۔ بالآخر بعہد نواب کلب علی خاں رامپور میں قیام کیا اور یہیں کی خاک میں

۱۸۸۱ء میں آرام کیا۔

تصانیف تین دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔(۱) منتخبات عالم (۲) تنویر الاشعار (۳) نظم منیر (۴) مثنوی معراج المضامین جس میں ائمہ معصومین کے کشف و کرامات بیان کیے ہیں انہیں کی تصنیف ہے۔ بہت پُرگو شاعر تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے مرثیہ میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ قصیدے بڑے زور دار کہتے تھے اور قطعہ، رباعی، مخمس وغیرہ میں بھی بہت زور طبیعت دکھاتے تھے۔ ان کا رنگ ان کے استاد ناسخ اور رشک کا سمجھنا چاہیے۔ اکثر اشعار میں بلند پروازی اور عمدہ تخیل ہے۔ قطعات بہت صاف سادہ اور سلیس ہیں۔ غزلوں میں پورا لکھنؤ کا رنگ ہے مختصر یہ کہ منیر کا مرتبہ اس زمانے کے شعراء میں بہت بلند ہے۔

آتش متوفی ۱۲۶۳ھ ہجری خواجہ حیدر علی آتش[1] خلف خواجہ علی بخش دلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دلی چھوڑ کر فیض آباد آئے اور محلہ مغلپورہ میں سکونت اختیار کی۔ آتش کی ولادت فیض آباد میں ہوئی۔ یہ بہت صغیر سن تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اسی وجہ سے تعلیم سے بھی محروم رہے اور بُری صحبت میں بیٹھ کر مزاج میں شورہ پشتی اور بانکپن آگیا۔ نواب مرزا محمد تقی خاں ترقی کی ملازمت اختیار کر لی اور اُنہیں کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ یہاں اس زمانے میں مصحفی اور انشا کے زور دار مقابلے ہو رہے تھے۔ اسی کو دیکھ کر اُن کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا۔ مصحفی کے شاگرد ہو گئے اور چند روز کی محنت میں ایسی مشق بہم پہنچائی کہ خود صاحب طرز ہو گئے۔ ناسخ اور انشار

---

[1] میرے نزدیک آتش کی ولادت ۱۱۸۱ھ سے ۱۱۹۲ھ کے درمیان ہوئی۔ ترجیح ۱۱۹۲ھ کو ہے۔ وفات ۱۲۶۳ھ مطابق ۷-۱۸۴۶ء۔ دیکھیے میری کتاب آتش، انتخاب دیوان و سوانح۔ طبع غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔ فاضل۔

کی طرح اِن کی استعداد علمی درجۂ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی۔ البتہ درسی کتابیں دیکھی تھیں۔ اور رسالہ فنِ عروض کا عربی میں پڑھا تھا۔

ناسخ اور آتش کی طرزِ زندگی میں بھی مثل اُن کے کلام کے بیّن فرق تھا۔ آتش نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ جس میں تکلف اور تصنع کو مطلق دخل نہ تھا۔ وہ حُسن کے عاشق تھے اور آزاد مزاج واقع ہوئے تھے۔ سپاہیانہ وضع اور لباس رکھتے تھے۔ مگر اس میں بانکپن کو دخل تھا۔ تلوار باندھتے تھے اور مشاعروں تک میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ قناعت اور توکل کے ساتھ زندگی بسر کی۔ کبھی کسی امیر کی اُس کی دولت کی وجہ سے خوشامد نہیں کی۔ شاگرد کبھی کبھی خود سلوک کرتے تھے مگر ان کا دستِ سوال کسی کے سامنے دراز نہیں ہوا۔ اسّی روپیہ مہینہ بادشاہ کے یہاں سے ملتا تھا۔ جس سے بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔ اور کبھی کبھی کوئی شاگرد بھی اعانت کرتا تو کوئی انکار نہ تھا۔ محلہ مغالی خاں کی سرائے میں ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا۔ جس میں غریبانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مزاج میں انتہا درجہ کی وضعداری اور خودداری تھی۔ اُمرا سے بہت نوک کی لیتے تھے۔ مگر معمولاً بہت منکسر المزاج اور خلیق واقع ہوئے تھے۔ آخر میں ان سے اور ان کے اُستاد مصحفیؔ کا کچھ بگاڑ ہو گیا تھا۔ اصلاح لینا بند کر دی تھی۔ اور آپ اپنی غزلوں پر ایک گہری نظر اصلاحی ڈالتے تھے۔ ناسخ کے معاصر تھے۔ لکھنؤ اس عہد میں دو فرقوں پر منقسم تھا۔ ایک جانب دارانِ ناسخ، دوسرا طرف دارانِ آتش۔ اس آپس کے مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا۔ کہ دونوں اُستادانِ سخن مقابلہ کے خیال سے طبیعت پر بہت زور دے کر کہتے تھے۔ البتہ ایک لطیف پیرایہ میں ایک دوسرے سے نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ مگر انشا اور مصحفی کی طرح دائرۂ تہذیب سے باہر نہ ہوتے تھے۔ اس قسم کے دو چار شعر نموناً لکھے جاتے ہیں:۔

ناسخ ؎

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب
بوُمسیلم نے کہا تھا جیسے قرآں کا جواب

اِس پر آتش نے یہ کہا۔ آتش ؎

کیوں نہ دے ہر مومن اُس ملحد کے دیواں کا جواب
جس نے دیواں اپنا ٹھہرایا ہے قرآں کا جواب

آتش نے ایک مرتبہ کہا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لا غیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفہ میں بازیِ غلام نہیں

ناسخ کی طرف سے جواب دیا گیا۔

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسفؑ بکے غلام نہیں

مگر باوجود اِس سب کے آتش اپنے حریف ناسخ کا بہت احترام کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ناسخ کی وفات کے بعد انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ آتش نے ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا۔ رشک نے تاریخ کہی ؎

خواجہ حیدر علی اہائے وا مردند
۱۲

طرز کلام کلام میں اُن کے تخلص کے اعتبار سے گرمی بہت ہے۔ تصنع اور تکلّف مطلق نہیں۔ نہ معمولی اور مبتذل خیالات ہیں جن کا عیب شکوہ الفاظ سے چھپایا گیا ہو نہ بے جا اور فضول تمثیلوں سے شعر بے مزہ کیے گئے ہیں۔ ترشے ہوئے الفاظ آب دار موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر اشعار میں روانی، موسیقیت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ محاورات ایسے برمحل استعمال کیے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری میں تیز انعکاس اور میر کی طرح درد و اثر کی تڑپ نہیں ہے۔ پھر بھی ان کے بعض اشعار پوری اُردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میر و غالب کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہے۔ تو وہ آتش ہیں۔ بڑی خوبی ان کے کلام کی یہ ہے کہ جذبات کو نہایت موثر اور دلکش الفاظ

میں ادا کرتے ہیں۔ فوق البھڑک الفاظ ان کے یہاں بہت کم ہیں۔ زبان بہت مزے دار اور روز مرہ کی بول چال ہے۔ جس میں ابتذال نہیں ہے۔ شعر بآسانی سمجھ میں آ جاتے ہیں اور بہت لطف دیتے ہیں۔ محاورات بہت منتخب اور برمحل ہوتے ہیں۔ تلاش الفاظ بہت قابل تعریف ہے۔ خیالات میں بلندی ہے۔ اگرچہ غالب کی ایسی نہیں اور عموماً فواحش سے پاک و صاف ہیں۔

تصانیف — پہلا دیوان خود انہیں کی زندگی میں شایع ہو گیا تھا۔ اور نہایت مقبول ہوا تھا۔ دوسرا دیوان جسے پہلے دیوان کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے۔ ان کے عزیز شاگرد میر دوست علی خلیل نے ان کے مرنے کے بعد مرتب کر کے پہلے دیوان میں شامل کر دیا۔ انہوں نے سوائے غزل کے اور کسی صنف شعر میں طبع آزمائی نہیں کی۔

نقائص کلام — بعض کوتاہ نظر لوگ ان کے کلام میں یہ سقم نکالتے ہیں کہ اُن کے یہاں فقط باتیں ہی باتیں ہیں۔ کلام میں پختگی اور اشعار میں مضامین عالی نہیں اور اس سے نتیجہ اُن کی بے استعدادی کا نکالتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حقیقی شاعری علم و فضل پر مبنی نہیں ہے۔ گو اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ کم علمی کی وجہ سے وہ اکثر الفاظ غلط استعمال کرتے تھے۔ مثلاً المضاف بجائے المضاعف، حلوۂ بیدود بجائے حلوائے بیدود کفارا بجائے کفّارہ بتشدید فا، مطالع بجائے مطالعہ وغیرہ۔ اس کے جواب میں ان کی طرف سے یہ عذر پیش ہو سکتا ہے کہ انہوں نے تلفّظ مروّجہ کے موافق ان الفاظ کو استعمال کیا۔ اور لغوی صحت کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور بہت اچھا ہوا کہ انہوں نے زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا کیونکہ اسی چھان بین نے زبان کو سخت اور بے لوچ کر دیا اور اجنبی غیر ملکی الفاظ کی بھرمار کر دی۔

ناسخ اور آتش کا مقابلہ — دونوں زبان اُردو کے کامل اُستاد اور صاحب طرز تھے۔ اب اس زمانے میں ناسخ کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور لوگ اس کو پسند نہیں کرتے البتہ جب

وہ اپنے عروج پر تھا تو اس کی بڑی قدر تھی اور وہ بہت مقبول تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرۂ گلشن بیخار میں ناسخ کو آتش پر ترجیح[1] دیتے ہیں اور شیخ صاحب ہی کے کلام کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر غالب اپنے ایک خط میں آتش کو فوقیت[2] دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان کا کلام بہت مؤثر ہے حق یہ ہے کہ بندش کی چستی، الفاظ کی حلاوت اور مضمون کی بلندی میں آتش کو ناسخ پر یقیناً فوقیت حاصل ہے۔ آتش کے یہاں الفاظ نہایت شیریں اور مزے دار ہوتے ہیں۔ بخلاف ناسخ کے ان کو موٹے

---

[1] نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرۂ گلشن بیخار میں آتش کے حال میں جو اُن کا اور ناسخ کا مقابلہ کیا ہے وہ عجب گول گول الفاظ میں ہے جس سے کسی کی کمتری یا کسی کی برتری صاف طور پر نہیں ثابت ہوتی فرماتے ہیں۔ "مردم آں دیار آتش و ناسخ را کہ از اساتذۂ مسلم آنجاست قریب ہم انگارند و ہر دو را ہم وزن شمارند و قباحت ایں تحقیق لا یخفی علی من لہٗ حظ من الفہم"۔ اگر ناسخ کو وہ فوقیت دیتے تو یقیناً ان کے کلام کو بھی وہ ضرور پسند کرتے اور اس کے دیکھنے کا اشتیاق اُن کو ضرور ہوتا۔ مگر تعجب ہے کہ اسی تذکرہ میں ناسخ کے حال میں لکھتے ہیں "دیوانے دیگر از افکار و تادش فراہم آمدہ وہم در شہر رسید اما خاطر آسودگی جواز انتخاب آن بایستاد"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسرا دیوان دیکھنے کو نواب صاحب کا جی نہیں چاہا پھر کیونکر بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ وہ ناسخ کو آتش پر فوقیت دیتے تھے۔

[2] مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو چودھری عبد الغفور کے نام ہے یہ قطعہ نقل کیا ہے ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار ۔۔۔ زیک جام اند در بزمِ سخن مست

ولے با بادہ بعضے حریفاں ۔۔۔ خمارِ چشم ساقی نیز پیوست

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم ۔۔۔ ورائے شاعری چیزے دگر ہست

اس کے بعد اس "چیزے دگر" کی مثال میں میر تقی میر، سودا، مومن اور قائم کا ایک ایک شعر پیش کر کے لکھا ہے کہ "ناسخ کے یہاں کمتر اور آتش کے یہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں"۔

موٹے الفاظ کا شوق ہے۔ آتش کے اشعار نیچرل ہوتے ہیں۔ اُن میں بے تکلفی اور تڑپ ناسخ کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے آتش کے خیالات بہت رفیع ہیں اور ان کا کیریکٹر آزادانہ اور فقیرانہ ہے جس کی ناسخ کے یہاں کمی ہے۔ صوفیانہ مضامین بہ نسبت ناسخ کے آتش کے یہاں بہت زیادہ ہیں۔ مختصر یہ کہ ناسخ کے کلام میں صرف شکوہ الفاظ اور استعارات اور تشبیہیں ہیں اور جو مزہ اور حلاوت کہ آتش کے یہاں ہے اس میں مطلق نہیں ہے۔ زبان کی صحت اور صفائی دونوں کے یہاں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ بحیثیت ایک حقیقی شاعر کے آتش کو ناسخ پر ترجیح ہے۔

شاگرد آتش کے مشہور شاگرد حسب ذیل تھے۔

رند، صبا، خلیل، نسیم، نواب مرزا شوق اور آغا حجو شرف۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں
اس بت کے آستانہ کا پتھر رگڑ گیا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری
خط دیا لیکن نہ بتلایا نشانِ کوئے دوست

اُس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر نبھے
دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

مشتاق دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
دکھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

کوچۂ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں
در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

رخسار زرد پر مرے بہتے ہیں اشک خوں
یک جا دکھائے ہیں خزاں و بہار رنگ

یہ کیفیت اُسے ملتی ہے جس کے مقدر میں
مئے اُلفت نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر میں

پر کترنا ہے مرے صیاد تو کاٹ اِس طرح
حسرتِ پرواز بھی اُٹھ جائے بال و پَر کے ساتھ

باغ میں آئے ہو ساتھ اُن کے بھی پھر لو دو گام
کبک و طاؤس کا جھگڑا ہی چکاتے نہ چلو

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

پیامبر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

سوائے نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے
زمیں سے دب گئے دبتے جو آسماں سے نہ تھے

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہار بے خزاں ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

نقش پائے رفتگاں سے یہ صدا ہے آرہی
دو قدم میں راہ طے ہے شوق منزل چاہیے

افسوس ہے فرہاد کو پہلے ہی نہ سوجھی
سر پھوڑ کے مرجایئے اس کوہ کنی سے

رند نواب سید محمد خاں متخلص[1] بہ رند سراج الدولہ نواب غیاث محمد خاں کے بیٹے تھے ۱۲۱۲ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ چونکہ نواب وزیر کے خاندان سے قریبی تعلق تھا (ان کے والد نواب برہان الملک سعادت خاں کے حقیقی بھانجے تھے) اس واسطے بہو بیگم صاحبہ کے دامن تربیت میں ناز و نعمت سے پرورش پائی۔ جب تک فیض آباد میں رہے اپنا کلام میر مستحسن خلیق کو دکھلاتے اور وفا تخلص کرتے تھے۔ ۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ لکھنؤ آکر خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے۔ اور اب رند تخلص رکھا۔ پہلا دیوان جو گلدستۂ عشق کے نام سے مشہور ہے ۱۲۵۰ھ میں مرتب ہوا۔ دوسرا دیوان ان کی وفات کے بعد شایع ہوا۔ تخلص کی مناسبت سے رندانہ زندگی بسر کرتے تھے اور دربار اودھ کی مشہور عیش و عشرت اور مزہ داریوں کا پورا لطف اٹھاتے تھے۔ اپنے استاد آتش کے مرنے کے بعد شراب چھوڑ دی تھی اور منہیات سے تائب ہو گئے تھے۔ اسی عرصہ میں بارادۂ حج روانہ ہوئے۔ مگر راستہ میں بمقام بمبئی عین غدر شروع ہونے سے کچھ دنوں پہلے سفر آخرت اختیار کیا۔ کلام ان کا نہایت صاف اور سادہ ہے جس میں محاورات کی برجستگی اور تاثیر کا رنگ جھلکتا ہے۔ بلند پروازی اور خیال آفرینی

---

[1] قاموس المشاہیر۔ ۱۱ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ فیض آباد میں ولادت اور ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۳ھ میں وفات۔ فاضل

ان کے یہاں کم ہے۔ مگر مذاق شعر بہت سلیم ہے اور ان کے اشعار مہذب کانوں پر ناگوار نہیں ہوتے۔ کچھ ایسے بھی اشعار پائے جاتے ہیں جن میں روحانیت اور تصوف کی جھلک ہے۔ غرضکہ آتش کے شاگردوں میں ان کا بہت بڑا درجہ ہے۔

نمونۂ کلام یہ ہے:۔

دیدِ لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور　　میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشہ تیرا

ولہ

پھینک دیں گے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا　　تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

ولہ

اے عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں　　تو ہائے گل پکاریں چلاؤں ہائے دل

مقابلہ کیجیے

بنال بلبل اگر با منت سر یاریست　　کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست (حافظ)

اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم　　تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے (سعدی)

او دلِ ہدف تیر نگہ پھر کیا تو نے　　اگلے ہی مرے زخم جگر تھے ابھی آئے

ولہ

دو چار گام یاں سے ہے دولت سرائے دوست　　ٹوٹیں یہ پاؤں دیکھو تو آکر کہاں تھکے

قطعہ

بس اب آپ تشریف لے جائیے　　گزرنی ہے جو کچھ گزر جائے گی

طبیعت کو ہوگا قلق چند روز　　ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

خلیل میر دوست علی متخلص بہ خلیل سید جمال علی کے صاحبزادے تھے اور بڈولی ملک اودھ کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی آتش کے مشہور شاگردوں میں ہیں ۱۲۷۹ھ میں نواب نادر مرزا کی رفاقت میں کلکتہ گئے۔ ان کے کلام میں ناہمواری ہے۔

بعض اشعار نہایت عمدہ اور بلند اور بعض بالکل معمولی ہیں۔ ان کو بھی غیر مانوس الفاظ اور رعایت لفظی کا بہت شوق ہے۔ شعر عاشقانہ ہوتے ہیں مگر وہی عشق مجازی اور بعض میں ابتذال پایا جاتا ہے۔

نسیم پنڈت دیا شنکر کول متخلص بہ نسیم خلف پنڈت گنگا پرشاد کول، آتش کے شاگرد اور مثنوی گلزار نسیم کے مشہور مصنّف ہیں۔ پنڈت جی عموماً اپنے تخلّص ہی سے مشہور ہیں۔ ایک معزّز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۲۲۷ھ میں پیدا ہوئے اور عین جوانی کی حالت میں ۱۲۶۰ھ میں بعمر ۳۲ سال انتقال کیا۔ فارسی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اور بعہد امجد علی شاہ بادشاہ اودھ فوج میں بخشی گری کے عہدہ پر مامور تھے۔ بچپن ہی سے ان کو شعر و سخن سے شوق تھا۔ چنانچہ اکثر اساتذہ اُردو و فارسی کا کلام بخوبی پڑھا تھا۔ بعمر ۲۰ سال آتش کے شاگرد ہوئے۔ ان کی زندۂ جاوید تصنیف مثنوی گلزار نسیم مثنوی میر حسن کے جواب میں ہے۔ مشہور ہے کہ پہلے یہ بہت ضخیم تھی مگر اُستاد کے کہنے سے انہوں نے اس کو مختصر کر دیا۔ اور یہ اختصار کی ایک لاجواب مثال ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۴ھ اور سنہ اشاعت ۱۲۶۰ھ ہے اس وقت مصنف زندہ تھے۔ اور اس کی اشاعت سے دفعتاً ان کی شہرت ہو گئی۔ اس کا ایجاز۔ روانی۔ مناسبت الفاظ بر جستگی محاورات نادر تشبیہات و استعارات۔ یہ سب قابل تعریف ہیں۔ البتہ تصنّع ضرور ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کی حقیقی دلآویزی اور تاثیر میں کمی ہے۔ فن کے لحاظ اور تخیّل کے اعتبار سے یہ ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ مثنوی سحر البیان سے اس کا مقابلہ ایک فضول سی بات ہے کیونکہ دونوں کا طرز جُدا ہے۔ یہ مثنوی اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے بہت سے اشعار بطور ضرب المثل زبان پر چڑھ گئے ہیں۔ اس سے پنڈت دیا شنکر کا نام ہمیشہ کے لیے روشن ہے اور وہ اُردو کے ایک

مایۂ ناز شاعر کہلائے جانے کے قرار واقعی مستحق ہیں۔

صبا میر وزیر علی نام، میر بندہ علی کے بیٹے تھے، لکھنؤ وطن تھا۔ یہیں پیدا ہوئے اور یہیں ان کا نشو و نما ہوا۔ ان کے چچا میر اشرف علی نے اُن کو بیٹا بنایا تھا۔ اور انہوں ہی نے اُن کو بقدر ضرورت عربی اور فارسی کی تعلیم دی تھی۔ صبا بہت خلیق اور ملنسار اور بڑے یار باش تھے۔ اُن کے دوست احباب ہر وقت ان کے پاس رہتے تھے اور ان کی خاطر تواضع یہ دل کھول کر کرتے تھے۔ دو سو روپیہ واجد علی شاہ کی سرکار سے اور تیس روپیہ ماہوار نواب محسن الدولہ کے یہاں سے ملتے تھے۔ خود آتش کے مشہور شاگرد تھے اور اپنے بھی بعض مشہور شاگرد چھوڑے۔ ۱۲۷۱ھ[1] میں گھوڑے سے گر کر جان دی۔ ان کا ایک ضخیم دیوان عاشقانہ رنگ میں شائع ہو گیا ہے۔ جس کا نام "غنچۂ آرزو" (۱۲۷۲ھ) ہے۔ ایک مثنوی "شکار نامۂ واجد علی شاہ" بھی ان کی یادگار ہے۔ ان کے کلام میں تصنع اور آورد اور غیر مانوس الفاظ کی کثرت ہے۔ کبھی کبھی کوئی تڑپتا ہوا شعر اپنے اُستاد آتش کے رنگ کا بھی کہہ جاتے ہیں۔

آغا جو شرف میر سادات حسین خاں نام عُرف آغا جو واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے سمدھی یعنی مرزا حامد علی کوکب ولی عہد کے خسر تھے۔ غدر کے بعد اودھ کے مصیبت زدہ قافلہ کے ساتھ یہ بھی کلکتہ چلے گئے اور مٹیا برج میں ولی عہد کے ہمراہ تھے۔ اتفاق سے ولی عہد کا عین جوانی میں انتقال ہو گیا جس سے ان کو سخت صدمہ ہوا جو کلام سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ان کا طرز کلام وہی ہے جو لکھنؤ اسکول کے شعراء کا ہے۔ یعنی زبان نہایت صاف و سلیس۔ بندشیں اور ترکیبیں دل چسپ۔ البتہ مضمون آفرینی کی کمی ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ ان کے کلام میں بہت کم ہیں۔

---

[1] نگار، جنوری ۱۹۳۵ء میں سنہ وفات ۱۲۷۱ھ تحریر ہے

نمونۂ کلام یہ ہے :۔

جہاں میں حسن پرستوں کی جان لینے کو
نکھر نکھر کے نکلتے ہیں خوبرو کیا کیا

ٹپک ٹپک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ
چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیا کیا

زباں جو اُن کی شرف نشہ میں بہکتی ہے
مزے مزے کی وہ کرتے ہیں گفتگو کیا کیا

پھڑک کے جان نہ دیتا تو آہ کیا کرتا
قفس سے اور نکلنے کی راہ کیا کرتا

شاخِ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی
پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

دھوکے دھونی جو بیٹھا ہوں مانگ پہ اس کی
اسی لکیر کا مجھ کو فقیر ہونا تھا

اس دور میں زبان میں کیا تغیرات ہوئے

تذکرہ جلوۂ خضر اور شعر الہند میں ایک مختصر فہرست ان تغیرات کی دی ہے۔ جو ناسخ اور آتش اور نیز ان کے شاگردوں کے عہد میں نظم اردو میں وقوع میں آئے۔ وہ تغیرات یہ ہیں۔ غیر مانوس اور موٹے موٹے فارسی اور عربی الفاظ اور ترکیبوں کی کمی۔ اکثر ہندی الفاظ جو ترک کر دیے گئے تھے اُن کا پھر داخل شعر کیا جانا صرف ان محاورات کا استعمال جو حسن شعر کو بڑھائیں اور برمحل ہوں۔ معشوق کا خط و خال گل و بلبل سرو قمری وغیرہ کے رواج اور دور از کار تشبیہات و استعارات اور فضول مبالغوں کی کمی :۔

باب ۹

دربار لکھنؤ اور اس کے شعرا

واجد علی شاہ اختر کا عہد

جس طرح دلّی اُردو شاعری کا گہوارہ تھا۔ اسی طرح اس کے زوال کے بعد لکھنؤ اُس کا مسکن و مامن بن گیا۔ اس وجہ سے کہ دلّی کے سب پُرانے اُستاد مثل آرزو اور میر و سودا و سوز وغیرہ کے اپنا وطن چھوڑ کر اور فرمانروایانِ اُودھ کی داد و دہش اور جُود و سخا کے افسانے سُن کر لکھنؤ چلے آئے۔ شاہانِ اُودھ نے بادشاہانِ دہلی کے تتبع میں نہ صرف بڑے بڑے شاعر اپنے دربار میں جمع کیے تھے بلکہ خود بھی شعر و سخن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ فرمانروایانِ ذیل جن کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے سب شاعر تھے۔

آصف الدولہ آصف نواب آصف الدولہ[1] متخلص بہ آصف شعر و سخن کے بڑے قدردان و مُربّی تھے جن کی سخاوت اب تک ضرب المثل ہے۔ نواب یحییٰ خاں نام، مرزا امانی عرف آصف تخلّص تھا۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کے فرزند دلبند اور

---

[1] ولادت ۱۱۶۱ھ وفات ۱۲۱۲ھ۔ کلیات یادگار ہے۔ فاضل۔

جانشین تھے۔ ۲۷ برس کی عمر میں بمقام فیض آباد ۱۱۸۸ھ میں مسند نشین ہوئے۔ تاریخ جلوس یہ ہے ؎

گشت از پائے آصف الدولہ — رونق مسندِ وزارت ہند

(اس میں ہ کے تعمیہ سے جو لفظ آصف الدولہ کی آخری ہ کے عدد ہیں ۱۱۸۸ھ نکلتے ہیں) جب لکھنؤ دارالسلطنت ہوا تو انہوں نے مشہور محل اور عمارتیں یہاں تعمیر کرائیں جو اب تک ان کی یادگار موجود ہیں۔ ان کو فن تعمیر کا بہت شوق تھا۔ ان کے عہد میں انگریزوں کی آمد اودھ میں زیادہ ہوئی اور ان کا رسوخ بڑھتا گیا۔ کئی انگریز اجارہ داری نوکری و تجارت کے سلسلہ سے اودھ میں آئے۔ ریزیڈنسی کے خرچ کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس دربار میں ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے ملے تھے۔ راجہ نول رائے صفدر جنگ کے دیوان تھے۔ راجہ بینی بہادر شجاع الدولہ کے مشیر تھے۔ اور آصف الدولہ کے زمانے میں راجہ ٹکیٹ رائے مہاراجہ جھاؤ لال۔ اور خوشحال رائے پسر راجہ نول رائے جلیل القدر عہدوں پر ممتاز ہوئے۔ شعر و شاعری اور جملہ علوم و فنون کے بڑے قدرداں تھے، خود بھی شعر کہتے تھے اور اپنا کلام میر سوز کو برائے اصلاح دکھاتے تھے۔ نواب موصوف کے کلام میں اپنے استاد کی سی سادگی اور صفائی ہے اور تصنّع اور تکلّف جو ناسخ کے زمانہ میں وبالِ جان ہو گیا۔ ان کے یہاں نہیں ہے۔ ایک اُردو دیوان اُن سے یادگار ہے جس میں تقریباً ۳۰۰ صفحات میں غزلیں ۷۰ صفحات میں رُباعیاں اور مخمس اور ۰۰ اصفحات میں ایک مثنوی ہے۔ انہیں کے مبارک عہد میں ملک الشعرا مرزا رفیع سوداؔ اور خدائے سخن میرؔ اور میر سوزؔ وغیرہ دلّی سے لکھنؤ آئے اور انہیں کی سرکار دولت مدار کے مداح اور وظیفہ خوار رہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :-

جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں — وہاں اپنا سر ہم قلم دیکھتے ہیں

نواب آصف الدولہ بہادر شاہ اودھ

واجد علی شاہ اختر

جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں — خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں
گزرتے ہیں سو سو خیال اپنے دل میں — کسی کا جو نقشِ قدم دیکھتے ہیں
بتوں کی گلی میں شب و روز آصفؔ — تماشہ خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

نواب وزیر علی خاں متخلص بہ وزیر و وزیری

آصف الدولہ[1] کے بعد ۱۷۹۷ء میں ان کے بیٹے وزیر علی مسندِ وزارت پر بیٹھے۔ مگر چار ہی مہینے کے بعد ان کو انگریزوں نے معزول کر دیا۔ کہا یہ گیا کہ وہ نواب آصف الدولہ کے صلب سے نہیں ہیں ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ وزیر علی کے مزاج میں سرکشی تھی۔ معزولی کے بعد وہ بنارس بھیجے گئے جہاں غصہ میں انہوں نے مسٹر چیری رزیڈنٹ کو مار ڈالا اور سرکشی و بغاوت شروع کر دی۔ آخرکار جے پور میں جہاں کہ انہوں نے پناہ لی تھی، گرفتار ہو کر انگریزوں کے حوالے کیے گئے۔ پھر وہ سرکاری حکم سے قلعۂ فورٹ ولیم میں قید کیے گئے۔ وزیر علی شعر کہتے تھے اور وزیرؔ تخلص کرتے تھے۔ ایک غزل کے چند اشعار جو مصیبت کی حالت میں لکھے تھے درج کیے جاتے ہیں۔

جوں سبزہ رندے اُگتے ہی پیروں کے تلے ہم — اس گردشِ افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں — بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم
ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے — نرگس کے نہالوں میں تھے آصف کے پلے ہم
زمانہ اِن مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں — رہتے ہیں وزیری ہی سے دن رات ملے ہم

نواب سعادت علی خاں[2]

نواب آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی نواب سعادت علی خاں مسند وزارت پر متمکن ہوئے۔ ان کے عہد میں انگریزی گورنمنٹ سے ایک عہد نامہ کیا گیا۔ جس سے انگریزوں کا رسوخ بڑھ گیا۔ ان کا دو تہائی ملک ان کے قبضہ سے نکل کر انگریزی علاقہ شامل ہو گیا۔ چونکہ ملک میں ہر طرف امن و امان تھا۔ بادشاہ کو عیش و عشرت کے

---

[1] وفات ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۲ھ۔ [2] متوفی ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۴ء۔

سوائے اور کوئی کام نہ تھا۔ یہ بھی مثل اپنے بڑے بھائی آصف الدولہ کے علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے۔ اور خود بھی کبھی کبھی شعر کہتے تھے گو کہ ان کا کوئی کلام نہیں ملتا۔ مصحفیؔ اور انشا کے مشہور معرکے انہیں کے زمانہ کی یادگار ہیں۔ سید انشا سعادت علی خاں کے دربار کے شاعر تھے اور جان بیلی انگریزوں کی طرف سے ریزیڈنٹ۔

غازی الدین حیدر[1] نواب سعادت علی خاں کے بعد ان کے بیٹے غازی الدین حیدر مسند وزارت پر ۱۸۱۴ء میں جلوہ افروز ہوئے۔ اور پانچ برس بعد بعہد نواب گورنر جنرل بہادر لارڈ ہیسٹنگز نواب وزیر سے بادشاہ کہلائے جانے لگے چنانچہ جب ۱۸۱۹ء میں ان کی تخت نشینی ہوئی تو اس قدر ساز و سامان اور تکلف اس تقریب میں کیا گیا کہ زر و جواہر بکثرت لٹائے گئے۔ ناسخ نے تاریخ کہی ہے

بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید

غازی الدین حیدر اردو شعر کہہ لیتے تھے۔ مگر اُن کا کلام جو زیادہ تر منقبت اور مرثیہ کی صورت میں ہے اس قدر رُوکھا پھیکا اور بے مزہ ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر کا قول اُن کے متعلق سچ معلوم ہوتا ہے۔ کہ "اُن کے اشعار اس درجہ خراب ہیں کہ واقعی بادشاہ کا کلام معلوم ہوتے ہیں"۔

نصیر الدین حیدر[2] غازی الدین حیدر کے بعد اُن کے بیٹے نصیر الدین حیدر تختِ سلطنت پر بیٹھے۔ ان کا زمانۂ سلطنت ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک ہے۔ مسند نشینی کی تاریخ ہے۔

جاوداں سلطنت ہند مبارک باشد

جس سے بارہ سے تینتالیس نکلتے ہیں۔ یہ بھی مثل اپنے پدر بزرگوار کے آئمہ معصومینؑ کی شان میں اکثر کہا کرتے تھے۔ اور بادشاہ تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی یہ غزل

---

[1] متوفی ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء۔ [2] متوفی ۱۲۵۲ھ

مشہور ہے :-

یہ کس مست کے آنے کی آرزو ہے — کہ ساقی لیے ساغرِ مشک بو ہے
سمایا ہے جب سے تو نظروں میں میری — جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تُو ہے
جتاؤں میں کیا اپنا حالِ پریشاں — عیاں زلفِ دلدار سے مُو بمُو ہے
چلو قبرِ شبّر باد پر فاتحہ کو — مگر آبِ شیریں سے لازم وضو ہے
شفق بن کے ہوتا ہے گردوں پہ ظاہر — یہ کس کشتۂ بے گنہ کا لہو ہے
گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا — نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بُو ہے

رہے سایۂ پنج تن بادشہ پر
خداوندِ عالم نگہبان تُو ہے

نصیر الدین حیدر کے بعد اُن کے حقیقی چچا محمد علی شاہ (۱۸۳۷ء لغایت ۱۸۴۲ء) اور پھر ان کے بیٹے امجد علی شاہ (۱۸۴۲ء لغایت ۱۸۴۷ء) تخت نشین ہوئے۔ یہ بھی علوم فنون کے مُربّی اور شعر و سخن کے قدر داں تھے۔ اور ان کے زمانہ میں بھی شعراء انعام و اکرام اور وظائف اور مناصب سے سرفراز ہوتے تھے۔ اُن کے بعد واجد علی شاہ کا زمانہ آیا۔ جو کسی قدر تفصیل طلب ہے لہٰذا علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

اختر — یہ تخلص سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کا ہے۔ بعد وفات امجد علی شاہ اُن کے بیٹے سلطان عالم واجد علی شاہ بعمر ۲۶ سال ۱۸۴۷ء میں سریر آرائے سلطنت ہوئے ؎

مبارک مبارک ہو شاہانہ تاج
۱۲۶۳

تاریخ جلوس ہوئی۔ سلطان عالم کو فن تعمیر سے بے حد شوق تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی تعمیر قیصر باغ کا خیال پیدا ہوا۔ اُس کو عمارات و ایوان دلکشا۔ بارہ دری نہر و پُل سنگِ مرمر و تصاویر سنگی سے مزیّن کیا۔ مشہور ہے کہ دو کروڑ روپیہ اس عمارت میں صرف

ہوا۔ یہاں ہر برسات میں ایک خاص میلہ ہوتا تھا جس کے تکلّفات اور شان و شوکت بڈھے لوگوں کی زبانی اب تک سُنے جاتے ہیں۔ سلطان عالم کو شروع میں چند روز انتظامِ مملکت کا شوق اور عدالت و رعایا پروری کا ذوق رہا۔ مگر نالائق مصاحبوں اور بدخواہ ہم نشینوں نے رفتہ رفتہ مزاج بدل دیا اور عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا۔ اب بجز محفل رقص و سرود اور کوئی مشغلہ باقی نہ رہا۔ مثنوی "عزالہ و ماہ پیکر" کی تصنیف سے جلسہ رہس کی بنیاد پڑی۔ صدہا خوبصورت اور خوش گلو طوائفیں ملازم ہو گئیں، جو محفل شاہی کو اپنے پُر اثر نغموں سے محظوظ کیا کرتی تھیں۔ غرضکہ اسی عیش و عشرت اور ناچ رنگ کی بدولت ملک میں انتہا درجہ کی بدنظمی پھیل گئی۔ جس کی وجہ سے سلطنت انگریزی کو بار بار فہمایش کرنا پڑی۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر کار ۳۱ جنوری ۱۸۵۶ء کو انتزاع سلطنت کا حکم سنایا گیا۔ اور ایک ہفتہ کے اندر عظیم الشان ملک جس کی آمدنی دو کروڑ سالانہ سے کم نہ تھی، بادشاہ کے قبضہ سے نکل کر حکومت انگریزی میں شامل ہو گیا۔ سلطان عالم معزولی کے بعد کلکتہ بھیج دیے گئے اور یہ شعر کہتے ہوئے کلکتہ چلے گئے ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں ۔۔۔ رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

جہاں تقریباً ڈیڑھ دو سال قلعہ فورٹ ولیم میں نظر بند کیے جانے کے بعد محلہ مٹیا برج میں قیام اختیار کیا۔ چونکہ سلطان عالم کو ہمیشہ سے فنِ تعمیر سے دلچسپی تھی۔ یہاں بھی انھوں نے عالی شان کوٹھیاں اور پُر فضا باغات بنوانا شروع کیے اور تھوڑے ہی عرصہ میں مٹیا برج لکھنؤ کا ایک مختصر نمونہ بن گیا۔ سلطان عالم نے جو سفر لکھنؤ سے کلکتہ تک کیا تھا اس کا مختصر حال اپنی مثنوی جس کا نام "حزنِ اختری" ہے۔ قلمبند کیا ہے۔

سلطان عالم کو مختلف چیزوں سے شوق تھا۔ مگر ہر بات میں نفاست اور جدّت

طرازی ملحوظ رہتی تھی۔ جانوروں اور مختلف اقسام کی چڑیوں سے اتنا شوق تھا کہ ان کا کلکتہ کا چڑیا خانہ دیکھنے کے لیے لوگ دُور دُور سے آتے تھے۔ فن موسیقی اور علی الخصوص ناچنے اور بتلانے کے لطیف فن میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اسی طرح شعر و سخن کے بھی بے حد دلدادہ تھے۔ بڑے بڑے کامل اُستاد اِس فن کے اپنے دربار میں جمع کر لیے تھے۔ اگر سچ پوچھیے تو انہیں شوقوں کی زیادتی نے یہ روز بد دکھایا۔ علاوہ اُردو کے ٹھیٹ ہندی میں بھی ان کا کلام موجود ہے۔ اور ان کی بنائی ہوئی ٹھمریاں دادرے وغیرہ جس میں وہ "جانِ عالم پیا" تخلص کرتے تھے۔ اب تک لکھنؤ میں زباں زد خاص و عام ہیں۔ کلکتہ ہی میں ۱۸۸۷ء[1] میں اس دارِ فانی سے رحلت کی۔

تصانیف ان کی متعدد تصانیف اس وقت موجود ہیں۔ اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جس میں قصائد غزلیات، مثنویاں، مرثیہ، وغیرہ سب شامل ہیں۔ تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) چھ دیوان بہ تفصیل ذیل۔

شیوع فیض[۱]۔ قمر مضمون[۲]۔ سخن اشرف[۳]۔ گلدستۂ عاشقاں[۴]۔ ماہ ملک[۵]۔ نظم نامور[۶]۔

(۲) مثنویاں۔ حزن اختری[۱] (جس کا ذکر اوپر ہوا)۔ خطابات محلات[۲]، اس میں اُن محلات کا ذکر ہے جن کے ساتھ عقد ہوا یا جن کے ساتھ متعہ ہوا۔ اور کن کن سے اولاد ہوئی اور کن کن کو طلاق دیا گیا۔ یہ مثنوی اُس وقت کی تصنیف ہے جب بادشاہ ایامِ غدر میں فورٹ ولیم میں قید تھے۔ بنی[۳]۔ ناجو[۴]۔ دلہن[۵]۔ مثنوی[۶] در فن موسیقی۔ دریائے[۷] تعشق۔

(۳) مراثی۔ جن کی تین جلدیں ہیں۔ ایک موسوم بہ جلد مراثی[۱] جس میں ۲۵ مرثیہ یا دو ہزار ایک سو گیارہ بند ہیں۔ دفتر غم و بحر الم[۲]۔ اس میں بائیس مرثیہ ہیں۔ سرمایۂ ایمان[۳]

۱؎ صحیح تاریخ وفات ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء مطابق ۲ محرم ۱۳۰۵ھ ہے۔ فاضل

اس میں ۳۳ مرثیہ ہیں۔

(۴) قصائد اُردو و فارسی موسوم بہ قصائد المبارک۔

(۵) مباحثہ بین النفس والعقل۔

(۶) صحیفۂ سلطانی۔ اس میں کچھ ادعیہ اور آیات قرآنی ہیں۔

(۷) نصائح اختری۔

(۸) عشق نامہ۔

(۹) رسالہ ایمان دربیان مصائب اہل بیت۔

(۱۰) دفتر پریشاں۔

(۱۱) مقتل معتبر۔

(۱۲) دستور واجدی در سیاست مدن۔

(۱۳) صورت المبارک۔

(۱۴) ہیبت حیدری۔

(۱۵) جوہر عروض۔

(۱۶) ارشاد خاقانی۔

یہ آخری دو کتابیں علم عروض میں ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ۴۰ جلد ہوگی۔ اصلاح سخن میر مظفر علی اسیر اور نواب فتح الدولہ برق سے لیتے تھے۔ برق کو مزاج شاہی میں خاص خصوصیت حاصل تھی اور بادشاہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ساتھ ہی ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں چند ماہ بعد ۱۸۵۷ء[۱] میں انتقال کیا۔ یہ شعر اُن کے حسب حال ہوا ؎

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اُٹھے
جان دی آپ کے دروازے پہ مر کر اُٹھے

---

[۱] نگار لکھنؤ جنوری ۱۹۳۵ء میں تاریخ وفات ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء درج ہے۔ فاضل

اسیر برخلاف اس کے شرف رفاقت سے محروم رہے اور لکھنؤ ہی میں رہے۔ یہ بات سلطان عالم کو ناگوار گزری تھی۔ علاوہ اسیر اور برق کے اس عہد کے مشہور شاعر۔ امانت۔ قلق۔ بحر۔ سحر۔ ذکی۔ درخشاں۔ قبول۔ شفق۔ بیخود۔ ہنر۔ عطارد۔ بلال۔ سرور تھے۔ جن میں سے اکثر دامن دولت سے وابستہ بھی تھے۔ صاحبزادوں میں نواب ولی عہد بہادر کوکب اور نواب برجیس قدر بہادر برجیس تخلص کرتے تھے۔

طرز کلام طرز کلام وہی ہے جو اس زمانہ میں لکھنؤ کے شعراء کا عام رنگ تھا۔ رعایت لفظی کا اکثر خیال رہتا ہے۔ سوز و گداز کی کمی ہے۔ البتہ اُن کی مثنوی "حزن اختری" جس میں مصائب سفر کا بیان ہے۔ نہایت دلکش اور پُر تاثیر نظم ہے۔ اس کی سلاست اور فصاحت اور خوبی زبان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ دیوانوں اور مثنویوں کے علاوہ ان کے خطوط بھی بہت دلچسپ ہیں جو انہوں نے قیام کلکتہ کے زمانہ میں اپنی محبوب بیوی نواب زینت محل کے نام لکھے تھے جن کو نواب اکلیل محل یا ممتاز جہاں کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ یہ خطوط بادشاہ کی اجازت سے مقفّٰی اور مسجع دیباچہ کے ساتھ اکبر علی خاں توقیر نے جو بادشاہی منشی تھے جمع کیے۔ یہ خطوط بترتیب سنہ جمع کیے گئے ہیں اور ۱۲۷۶ھ میں شایع کیے گئے ہیں۔ ان میں اکثر شاعرانہ انداز کے ساتھ نہایت محبت اور اخلاص سے اپنا اشتیاق اور لکھنؤ کی یاد کا درد انگیز صورت میں بیان کیا ہے۔ یہ خط اس لیے جمع کیے گئے تھے کہ بادشاہ کو قید کے مصائب اور اپنی پیاری بیوی کی مفارقت سے کسی قدر تسکین ہو۔

نمونۂ کلام یہ ہے:-

اس عشق نے رسوا کیا میں کیا بتاؤں کیا کیا
آہ دل ناشاد نے اور آسماں پیدا کیا

کمر دھوکا۔ دہن عقدہ۔ غزال آنکھیں پری چہرہ
تکلم ہیرا۔ بدن خوش بو جبیں دریا۔ زباں عیسیٰ

برائے سیر مجھ سا رند میخانہ میں گر آئے
گرے ساغر۔ لنڈھے شیشا۔ ہنسے ساقی بہے دریا

یہی تشویش شب و روز ہے بنگلے میں | لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

یہ تمنّا ہے زیست میں اے بار خدا | پھر مجھے لکھنؤ دنیا میں دکھائے غربت
ہاں وطن دیکھوں تو شاداں ہو دلِ زار مرا | یہ بھی ممکن ہے کہ رونے کو ہنسائے غربت
وسعتِ خلد سے بڑھ کر ہے کہیں حُبّ وطن | تنگیٔ گور سے بدتر ہے فضائے غربت
یوں تو شاہان جہاں پر ہے پڑا وقت مگر | ختم ہے اختر بے کس پہ جفائے غربت

اسیرؔ سید مظفر علی خاں متخلص بہ اسیرؔ خلف سید امداد علی امیٹھی کے رہنے والے تھے۔ کتب درسیہ علمائے فرنگی محل سے پڑھیں مصحفیؔ سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں شاہی ملازمت شروع کی اور امجد علی شاہ کے عہد میں اقتدار پایا۔ اِس کے بعد آٹھ نو سال تک واجد علی شاہ کے مصاحب خاص رہے۔ اور تدبیر الدولہ مدبر الملک کے معزز خطاب سے سرفراز ہوئے۔ بادشاہ کبھی کبھی اپنے کلام میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ جب بادشاہ کلکتہ جانے لگے تو انھوں نے رفاقت منظور نہ کی جس سے بادشاہ آزردہ خاطر ہوئے۔ جس کا ذکر جابجا اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ بعد غدر نواب یوسف علی خاں والی رامپور اور پھر اُن کے صاحبزادے نواب کلب علی خاں نے ان کی اور ان کے کلام کی بڑی قدردانی کی۔ پھر مدت العمر آسی ریاست کے دُعاگو رہے اور چھ ماہ رامپور اور چھ ماہ لکھنؤ رہا کرتے تھے۔ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں بعمر ۸۱ برس لکھنؤ میں انتقال کیا اور یہیں مدفون ہوئے۔ بہت مشّاق اور پُرگو شاعر تھے۔ ان کی تصانیف میں چھ دیوان اُردو ہیں جس میں سے چار چھپ چکے ہیں۔ ایک دیوان فارسی اور ایک مثنوی "درۃ التاج" اور رسالۂ عروض بھی شایع ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ مرثیے اور قصاید بھی بہت لکھے ہیں۔ علم عروض اور فن نظم کے اُستاد کامل تھے۔ زبان پر

اُن کی حیرت انگیز قدرت سب کو تسلیم ہے۔ مگر کلام کا رنگ وہی ہے۔ جو اس زمانہ کے اہلِ لکھنؤ کا تھا۔ البتہ کبھی کبھی اس رنگ خاص سے علیحدہ ہو کر اچھے اچھے شعر نکالتے ہیں۔ شاگرد بھی بہت زبردست اور نامی گرامی پائے۔ مثلاً امیر مینائی ان کے علاوہ ان کے دونوں بیٹے متخلص بہ حکیم و افضل اور نیز شوقؔ اور واسطی بھی مشہور شاگرد اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست
مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

کس سے کہوں تلون ابنائے روزگار
دشمن یہ لاکھ بار ہوئے لاکھ بار دوست

ضد سے جتنا ہے یہاں کافر و دیندار میں فرق
زاہد اتنا تو نہیں سبحہ و زنار میں فرق

زنجیر تعلق مرے پاؤں سے تو نکلے
ہے فاصلہ دو گام کا ہستی سے عدم تک

آیا ہے ہم کو ہاتھ یہ مضموں چراغ سے
روشن اسی کا نام رہے جو جلائے دل

امانت سید آغا حسن خلف میر آغا رضوی لکھنوی روضۂ مشہد مقدس کے کلید بردار سید علی رضوی کی اولاد سے تھے۔ شروع میں مرثیہ گوئی کا شوق ہوا۔ میاں دلگیر کو جو اس زمانہ نے مرثیہ گویوں میں نامور تھے، اپنا کلام دکھاتے تھے چند روز بعد غزل گوئی کی طرف توجہ کی۔ چونکہ میاں دلگیر نے اصلاح دینے سے انکار کیا انہوں نے بھی اصلاح لینا ترک کر دی۔ ۱۲۵۱ھ میں بیس برس کی عمر میں کسی عارضہ کی وجہ سے قوت گویائی جاتی رہی اور گونگے ہو گئے۔ مجبوراً بذریعہ تحریر بات کرتے تھے۔ یہی حالت ۱۲۶۰ھ تک رہی۔ آخر کار خدا کی قدرت سے یہ مرض جاتا رہا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کربلا جا کر زبان خود بخود کھل گئی اور قوت گویائی عود کر آئی۔ امانت کو معما اور چیستان کہنے کا بہت شوق تھا۔ ان کی تصانیف سے دیوان خزائن الفصاحت گلدستۂ امانت اندر سبھا اور اکثر مرثیے شایع ہو چکے ہیں۔ ایک واسوخت بھی لکھا ہے۔ جو نہایت اعلےٰ درجہ رکھتا ہے۔ ان کی تصانیف میں واسوخت اور اندر سبھا

کو خاص شہرت حاصل ہوئی ۔ اندر سبھا کو انوکھی اور دلچسپ کتاب ہونے کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے اُردو ڈراما کی حیثیت سے یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اپنے جانشین دو لڑکے چھوڑے۔ لطافت اور فصاحت جو اپنے اپنے رنگ میں شعرائے لکھنؤ میں بہت نامور ہوئے۔ ان کا انداز کلام خاص ہے یعنی رعایت لفظی اور صنائع بدائع کا اس قدر شوق تھا کہ بعض شعر محض لفظی گورکھ دھندا معلوم ہوتے ہیں۔ لکھنؤ اسکول کے رنگ سب سے بڑے برتنے والے یہی ہیں۔ جن کے لفظ لفظ سے تصنع اور بناوٹ ظاہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں ؎

شمع روئے یار سے روشن مرا کاشانہ ہو
بزم عالم میں یہ ہر شب ہے امانت کی دعا

کانٹے اب دیکھے نہیں جاتے زبان خار کے
فی سبیل اللہ پانی ان کو دو اے آبلو

برعکس اس کے کہیں کہیں نہایت صاف اور مزیدار شعر بھی نکل آتے ہیں۔

آنسو رواں ہیں زلف سیہ کے خیال میں
موتی پرو رہا ہوں ترے بال بال میں

عشق کا خنجر لگا ہے دل پہ کاری اندنوں
زخم کی صورت ہے خوں آنکھوں سے جاری اندنوں

فصل گل میں رات دن بس ہم ہوں اور میخانہ ہو
ساقی مہوش ہو مے ہو۔ شیشہ ہو۔ پیمانہ ہو

کوچہ قاتل تلک اے دل رسائی کیجیے
کاسۂ سر ہاتھ میں لے کر گدائی کیجیے

آفتاب الدولہ قلق خواجہ ارشد علی خاں عرف خواجہ اسد اللہ ملقب بہ آفتاب الدولہ خواجہ وزیر کے بھانجے اور شاگرد بھی تھے۔ وہ اپنے آپ کو واجد علی شاہ کا بھی شاگرد بتاتے تھے۔ جو خوشامد اور زمانہ سازی پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور واقعیت سے دُور ہے۔ ان کے کلام میں محض لفظی تصنعات اور مثنوی میں تو اکثر جگہ ابتذال اور رکاکت بھی پائی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بلحاظ زبان کے اُن کا کلام

لہ سنہ وفات ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۰ء ہے میں نے قلق کے دیوان کا انتخاب اور سوانح مکمل کر لیے ہیں۔ (ناضل)

بہت مستند اور قابلِ قدر ہے مگر شعر کی حقیقی خوبیوں سے معرّا ہے۔ ان کی مشہور مثنوی طلسم اُلفت نہایت دلچسپ اور قابلِ قدر کتاب ہے۔ ان کے دیوان موسوم بہ مظہرِ عشق کے شروع میں چند قصیدے واجد علی شاہ کی تعریف میں ہیں۔ ایک مخمس بھی اُنکی تصنیف سے ہے جس میں بادشاہ کی نظربندی کا حال نہایت دردناک طریقہ سے لکھا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ رنج و افسوس محض اپنے عیش و عشرت کے مفقود ہونے کی وجہ سے ہے نہ کہ حبِّ وطن اور بادشاہ کی محبت کے خیال سے۔

ذکی | مہدی علی خاں متخلص بہ ذکی، شیخ کرامت علی کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے مگر آخر عمر میں مرادآباد جا رہے تھے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ آئے اور شیخ ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ ایک قصیدہ بادشاہ کی تعریف میں پڑھا جس کے صلہ میں انعام و اکرام پایا۔ یہاں سے وہ دہلی اور پھر دکن گئے جہاں اُن کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ دکن سے لوٹ کر واجد علی شاہ کے زمانہ میں پھر لکھنؤ آئے جنہوں نے ان کو ملک الشعرائی کا خطاب عنایت کیا۔ بعد انتزاع سلطنت مرادآباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مگر نواب یوسف علی خاں والی رامپور کی سرکار سے چند روز وابستہ رہے نواب صاحب کے انتقال کے بعد انبالہ گئے اور وہیں ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں انتقال کیا۔ علم عروض سے خوب واقف تھے اور اس فن میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے جو ۱۲۶۵ھ میں شایع ہوا تھا۔ مشّاق اور خوش گو شاعر تھے۔ اور دوسرے درجہ کے شعرائے لکھنؤ میں بلند پایہ رکھتے تھے۔

درخشاں | سید علی خاں مخاطب بہ مہتاب الدولہ کوکب الملک ستارۂ جنگ کا تخلّص ہے۔ اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے اور انہیں کی کوشش سے دربار رس ہو گئے تھے بادشاہ کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں انتقال کیا۔ فن نجوم سے بھی کچھ واقفیت رکھتے تھے۔ شاید اسی مناسبت سے یہ انتخاب دیا گیا ہو۔ معمولی قابلیت کے آدمی تھے۔

اختر قاضی محمد صادق خاں اختر قاضی محمد لعل کے صاحبزادے ہگلی بنگالہ کے قاضی زادوں میں تھے وطن چھوڑ کر لکھنؤ آرہے تھے۔ یہ غازی الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ جنہوں نے ان کو ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ اختر مرزا قتیل کے شاگرد ہو گئے اور مصحفی جرأت اور انشا وغیرہ کے مشاعروں میں شرکت کی۔ چند دن فرخ آباد میں بھی قیام کیا تھا۔ مشہور ہے کہ واجد علی شاہ نے ان کا تخلص ان سے مانگ لیا تھا اور اس کے صلے میں بہت کچھ انعام و اکرام دیا تھا۔ تھوڑے عرصہ میں واجد علی شاہ کچھ ناراض ہو گئے جس کی وجہ سے ان کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور اٹاوہ کے تحصیلدار ہو گئے جہاں ۱۸۵۸ء میں انتقال[1] کیا۔ اختر بڑے جامع کمالات اور لکھنؤ کے نامی شاعروں میں سے تھے فارسی بہت کہتے تھے۔ چنانچہ ان کی فارسی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

"محامد[1] حیدریہ" غازی الدین حیدر کی تعریف میں۔ "گلدستہ[2] محبت" جس میں گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال۔ "مثنوی[3] سراپا سوز" "صبح[4] صادق" جو اپنی سوانح عمری آپ ہی لکھی ہے۔ "تذکرہ[5] آفتاب عالمتاب" جس میں پانچ ہزار فارسی شعرار کا حال اور کلام فراہم کیا تھا۔ دیوان[6] فارسی، بہار[7] بے خزاں، بہار[8] اقبال، ہفت[9] اختر، ایک[10] دیوان ریختہ، یہ ان کی مشہور غزل قطعہ بند بطور نمونہ کلام پیش کی جاتی ہے۔

جب پردہ رُخ سے دُور کرے وہ نقاب کا
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہوا آفتاب کا

گل بن کے شیخ مجتہد عصر ساقیا
دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا

کہنے لگا زراہ تبختر مجھے بطنز
معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا

میں نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
کیجیے جو آپ مجکو نہ مورد عتاب کا

---

[1] تذکرہ گل رعنا اور خمخانۂ جاوید وغیرہ میں ان کے حال میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں وفات پائی۔

تقویٰ ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست　　اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا
مے ہووے کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش　　اور واں مخل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حجاب　　دے ذائقہ زبان کو دہن کے لعاب کا
کھینچے ہنسی سے اپنا ملا کر وہ منہ سے منہ　　یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگِ خضاب کا
منت سے یوں کہے کہ ہمارا ہو پیجئے　　گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو　　گر کچھ بھی خوف کیجیے روزِ حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

باب ۱

مرثیہ اور مرثیہ گو

مرثیہ کی تعریف

مرثیہ وہ صنفِ نظم ہے جس میں کسی مردہ شخص کی تعریف کی جائے۔ اہلِ اسلام اس کے بہت شایق رہے ہیں۔ یہ قصیدہ کے برعکس ہے۔ کیونکہ قصیدہ میں کسی زندہ شخص کی تعریف کی جاتی ہے۔ اصطلاح میں مرثیہ انہیں نظموں کو کہتے ہیں جس میں حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ اور دیگر شہدائے کربلا کی شہادت کا ذکر کیا جائے اور جو علی العموم محرّم کے زمانہ میں کسی مجلس عزا میں یا کسی تعزیہ کے ساتھ بہت سوز و گداز اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ ابتدا میں اس قسم کی نظمیں صرف بین کے اشعار تک محدود ہوتی تھیں یعنی اُن میں ممدوح کی صفاتِ حسنہ کا بیان ہوتا تھا اور اس کی موت پر اظہارِ افسوس کیا جاتا تھا۔ اس قسم کے مرثیے بہت مختصر ہوتے اور اُن کی غرضِ اصلی صرف گریہ و بُکا ہوتی تھی۔ امتداد زمانہ سے مرثیہ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور اس میں مختلف قسم کے نئے نئے مضامین داخل ہونے لگے۔ مثلاً چہرہ۔ ممدوح کے مناقب، دشمنوں کے معائب، مناظرِ جنگ، مناظرِ قدرت، رجز خوانی گھوڑے اور تلوار کی

تعریف، سامان حرب وضرب وغیرہ۔ اس قسم کے مضامین کے اضافہ سے مرثیہ کا مرتبہ بڑھ گیا اور آخرکار وہ اُردو نظم کی ایک مستقل صنف بن گیا۔

مرثیہ کی قدامت

عرب کی شاعری کی ابتدا، مرثیہ ہی سے معلوم ہوتی ہے مگر جب شاعری شاعر کے ذاتی مفاد پر مبنی ہو گئی تو مرثیہ کو زوال ہونا شروع ہوا۔ اس لیے کہ اس سے کسی قسم کے نفع کی امید نہ تھی۔ کیونکہ مرنے والا کسی کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس قدر قصیدہ گوئی کو جو ذاتی مفاد پر مبنی تھی ترقی ہوئی اُتنا ہی مرثیہ گوئی میں تنزل ہوا۔ فارسی شاعری کی بنیاد چونکہ تکلف، آورد، اور مداحی پر قائم ہوئی تھی اس لیے اس کی ابتدا قصیدہ گوئی سے ہوئی۔ اور وہ انواع سخن جن کو جذبات سے لازمی تعلق تھا جس میں مرثیہ بھی داخل ہے، دفعتاً پستی کی حالت میں آگئے۔ ہرچند کہ قدما کے یہاں ایسے بعض شعر ملتے ہیں جن میں فطرتی اثر اور جوش پایا جاتا ہے مثلاً شاہنامہ میں مادر سُہراب کا اظہار رنج و الم اپنے بیٹے سہراب کی موت پر، یا فرخی کا مرثیہ محمود غزنوی کی وفات پر جو دس بارہ بیتوں سے زیادہ نہیں۔ مگر یہ یا اس قسم کے اور اشعار جو بینے ہوں آج کل کے خیال کے مطابق بہ مشکل مرثیہ کہے جا سکتے ہیں اس کے بعد سعدی اور خسرو کا زمانہ آیا۔ انھوں نے بھی مرثیے لکھے مگر وہ مقبول نہیں ہوئے اور نہ لوگوں کے تتبع کا زیادہ خیال پیدا ہوا۔ ملا محتشم کاشی گو کہ بے مثل مرثیہ نگار تھے۔ مگر انھوں نے بھی طرز قدیم میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اسی طرح طالب آملی۔ عرفی۔ میلی۔ کلیم وغیرہ نے گو کہ اور اصناف سخن میں خوب خوب کہا ہے مگر ان کے مرثیے مشہور نہیں ہیں۔ اسی طرح ظہوری کے مرثیے جو علی عادل شاہ کے واسطے لکھے گئے تھے، بجز تعریفوں کے اور کچھ نہیں۔ البتہ ملا مقبل نے اس صنف میں ایک خاص زور اور جوش پیدا کیا جس سے ایران میں ایک تغیر عظیم پیدا ہو گیا۔ اور ایرانی شاعر اس کو بہت پسند کرنے لگے۔

اُردو مرثیہ کی ابتدا

جیسا ہم بیان کر چکے ہیں اُردو شاعری کی ابتدا دکن میں ہوئی تھی اور اس کی ابتدائی کوششوں میں صنف مرثیہ بھی داخل تھی۔ شاہان گولکنڈہ و بیجاپور نہ صرف شاعروں کے قدرداں تھے بلکہ خود بھی مذہبی آدمی ہونے کی وجہ سے مرثیہ وغیرہ خوب کہتے تھے مگر مرثیہ اُس زمانہ میں بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ وؔلی نے کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ البتہ چند بند شاہ وجیہ الدین کی تعریف میں ہیں ان کو مرثیہ سمجھیے یا کچھ اور[1]۔ اس کے بعد جب شعرائے دہلی کی ترقی کا زمانہ آیا تو یہ لوگ مرثیہ کے بہت شایق تھے اور اس کو ایک مذہبی فرض سمجھ کر لکھتے تھے۔ مرثیہ کی نظم میں چونکہ مذہبیت کا رنگ غالب ہوتا تھا اس لیے عیوب شاعری پر نکتہ چینی کی نظر نہ ڈالی جاتی تھی۔ میر تقی نے اپنے تذکرۂ نکات الشعرا میں اور میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اکثر ایسے شعرا کا حال لکھا ہے جو مرثیہ گو تھے۔ مثلاً میر امانی۔ میر عاصی۔ میر آل علی۔ درخشاں سکندر۔ صبر۔ قادر۔ گمان۔ ندیم وغیرہ۔ اسی طرح میرؔ و سوؔدا نے بھی مرثیے لکھے ہیں مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ ان میں حقیقی جذبات و اثر کی کمی ہے۔ میر ضاحک اور میر حسن کے مرثیے کوئی خصوصیت نہیں رکھتے البتہ اس لیے قابل قدر ضرور ہیں کہ یہ بزرگوار میر انیس کے اجداد میں تھے۔ سوؔدا کے وقت تک عموماً مرثیے چو مصرعے ہوا کرتے تھے۔ غالباً سب سے پہلے سوؔدا نے مسدس لکھا جو اب تک مروّج ہے اسی طرح ضمیر نے مرثیہ کے مضمون میں اضافہ کیا اور اس میں جدید تشبیہات و استعارات معرکۂ کارزار کے مفصل حالات۔ شاعرانہ استدلال اور دلچسپ مبالغے داخل کیے جو انیس و دبیر کے زمانہ میں معراج کمال تک پہنچ گئے۔ ضمیر نے کلام میں زور، بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی اور سوز کی جگہ تحت اللفظ پڑھنے کی بنیاد ڈالی۔

بزرگان انیس اور ان کی خدمات مرثیے کے ساتھ

ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ میر امانی۔ اور

---

[1] تذکرۂ گل رعنا میں لکھا ہے کہ ولی نے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھی ہے ۱۲۰

میر ضاحک اور میر حسن نے مرثیے کہے تھے مگر اب وہ ملتے نہیں۔ میر حسن کے چار بیٹے تھے جس میں سے تین یعنی خلیق اور خلق اور محسن شاعر تھے۔ خلق اپنے والد ہی کے شاگرد تھے۔ صاحب دیوان ہیں اور مرثیہ بھی کہتے تھے اور سو برس کی عمر میں انہوں نے انتقال کیا۔ خلیق بھی بجائے خود ایک نہایت مشہور شاعر تھے جن کے حالات علیحدہ ذیل میں قلمبند کیے جاتے ہیں :

خلیق | میر مستحسن خلیق میر حسن کے صاحبزادے عمر میں خلق سے چھوٹے تھے فیض آباد اور لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ سولہ برس کی عمر سے مشق سخن شروع کی اور چونکہ خود ان کو شعر گوئی کا بہت شوق تھا اور باپ کو بوجہ تصنیف مثنوی سحرالبیان فرصت نہ تھی۔ لہذا ان کو مصحفی کا شاگرد کرا دیا۔ تھوڑے دنوں میں یہ مشاق ہو گئے اور کلام اس قدر بامزہ ہونے لگا کہ ایک مرتبہ مرزا محمد تقی ترقی کے یہاں فیض آباد میں مشاعرہ تھا جس میں خواجہ حیدر علی آتش بھی بلائے گئے تھے اور خیال تھا کہ وہ وہیں معک لیے جائیں گے۔ جب شروع جلسہ میں خلیق نے غزل پڑھی۔ جس کا مطلع تھا

رشک آئینہ ہے اُس رشک قمر کا پہلو صاف ادھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

تو آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو پھر میری کیا ضرورت ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب میر حسن کا انتقال ہو گیا تو عیال کا بوجھ سر پر پڑا۔ چونکہ آمدنی کچھ نہ تھی لہذا غزلوں کی فروخت سے اپنا کام چلاتے تھے۔ میر خلیق ایک پُر گو شاعر تھے۔ ایک دیوان مرتب کر لیا تھا مگر وہ شایع نہ ہو سکا آخری عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور ضمیر اور فصیح اور دلگیر کے معاصر تھے۔ میاں دلگیر ناسخ کے شاگرد تھے مگر چونکہ زبان میں لکنت تھی اس لیے اپنا کلام خود نہ پڑھتے تھے۔ البتہ مرثیہ کو قدیم رنگ سے علیحدہ کر کے اس میں کچھ جدتیں پیدا کی تھیں۔ مرزا فصیح (شاگرد ناسخ و دلگیر) حج کو گئے اور وہیں رہ گئے۔ اب صرف ضمیر اور خلیق

کے واسطے میدان مرثیہ گوئی رہ گیا تھا۔ لہذا یہ دونوں باکمال ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کاوشیں کرتے تھے جس کا نتیجہ مرثیے کی تکمیل و ترقی کے واسطے بہت اچھا نکلا۔ مرثیہ کی صورت میں یہ تغیر ہوا کہ بجائے چو مصرعہ کے اب مسدّس کا رواج ہوا۔ اس کی ابتدا سودا سے ہوئی تھی اور خلیق نے اس کو پھیلایا۔ سلام بھی بطرز غزل کہے جانے لگے۔ مرثیہ پڑھنے کا طریقہ بجائے سوز کے تحت اللفظ مقرر ہوا۔ جو غزل مستزاد کے اسلوب پر کہی جاتی وہ نوحہ کہلاتی اور اس کو سوز ہی کے اسلوب میں پڑھتے تھے۔ پہلے مرثیہ چالیس پچاس بندوں تک محدود تھا۔ میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس کو طول دیا۔ اس طرح کہ پہلے تمہید پھر سراپا۔ پھر میدان جنگ کا نقشہ دکھایا اور خاتمہ شہادت پر کیا۔ اس جدت کی بڑی قدر ہوئی اور اس نے مرثیہ گوئی کے عالم میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اس وجہ سے کہ قدیم زمانہ میں مرثیے محض حصول ثواب کی غرض سے رونے رلانے کے واسطے ایک مقررہ طریقے پر کہے جاتے تھے اب اس میں دوسری چیز شامل کی جانے لگیں جن کی جانچ پڑتال بھی اسی طرح کی جاتی تھی جس طرح اساتذۂ شعرا کے کلام کی ہوتی ہے۔ ان جدید مطالب کے اضافہ سے مرثیہ کے قالب میں ایک نئی روح پھونکی گئی اور اس کی بوسیدہ ہڈیوں پر اس اضافہ سے نیا گوشت پوست چڑھایا گیا۔ اور اب وہ شاعری کی ایک موقر صنف قرار پایا جس سے کہ اب اکثر فرقہ ہائے اسلام یہاں تک کہ اہل ہنود بھی دلچسپی لیتے ہیں اور بہت ذوق و شوق سے سنتے ہیں۔ میر خلیق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے صفائی زبان اور صحت محاورہ پر بہت توجہ کی اور درد و اثر کو خالی تشبیہوں اور لفظی مناسبت کے مقابلے میں زیادہ ملحوظ رکھا۔ اور یہی فرق ان کے اور میر ضمیر کے یہاں مابہ الامتیاز ہے۔ انیسؔ نے بھی اس معاملہ میں اپنے پدر بزرگوار کی پوری پیروی کی۔ اسی طرح پڑھنے کے طریقے میں بھی میر انیس

نے اپنے والد ہی کا تتبع کیا۔ یہ زیادہ تر اعضا کی حرکت سے کام نہ لیتے تھے بلکہ صرف آنکھ کی گردش یا خفیف سی گردن کی جنبش سے کام نکالتے تھے۔ میر خلیق کا خاندان زبان اُردو کی صحت اور محاوروں کی صفائی کے لئے مشہور رہے چنانچہ ناسخ اپنے شاگردوں سے برابر کہتے تھے کہ اگر زبان سیکھنا ہو تو خلیق کے گھرانے سے سیکھو۔

میر انیس میر ببر علی انیس ۱۲۱۶ھ[1] (۱۸۰۱ء) یا ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں بمقام فیض آباد محلہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد رہتے تھے۔ اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی۔ لکھنؤ میں اس وقت آئے جب ان کے بڑے صاحبزادے میر نفیس پیدا ہو چکے تھے۔ چھوٹے بھائی اُنس ہمراہ تھے۔ ابتدا میں فیض آباد کے تعلقات بالکل منقطع نہیں ہوئے۔ اس وجہ سے کہ باپ اور بھائی وہیں رہتے تھے مگر جب بعد کو پورا خاندان لکھنؤ چلا آیا تو یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ابتدائی کتابیں مولوی حیدر علی صاحب سے اور صدر المفتی میر عباس صاحب سے پڑھی تھی۔ ورزش کے بہت شائق تھے اور فنون سپہ گری میر کاظم علی اور ان کے بیٹے میر امیر علی سے حاصل کیے جو اس فن میں اس زمانہ کے استاد مانے جاتے تھے۔ فنِ شہسواری سے بھی واقف تھے۔ فن سپہ گری کی معلومات جنگ کے مناظر وغیرہ دکھانے میں بہت کار آمد ثابت ہوئی۔ حُسن تناسب کے ایسے عاشق تھے کہ خواہ وہ انسان میں ہو یا کسی دوسری سے میں، اس کی دل سے قدر کرتے تھے۔ ان کو اپنی عزت خاندانی پر بڑا فخر تھا اور خودداری اور عزت خاندانی کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ وضعدار بھی بہت بڑے تھے۔ ملنے جلنے میں رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھتے تھے ایک وقت معینہ پر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے۔ کوئی شخص حتیٰ کہ ان کے گھر والے بھی بغیر اطلاع ان کے پاس نہیں آسکتے تھے۔ امرا سے بہت کھنچ کر ملتے تھے۔ یہاں تک کہ

---

[1] تاریخ وفات ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء ہے۔ فاضل

بادشاہ وقت کے یہاں بھی اس وقت تک نہیں گئے جب تک کہ ایک معتمد شاہی اُن کو لینے نہ آیا۔ وہ اپنی عزت خاندانی اور عزت پیشہ کو سب باتوں پر مقدم سمجھتے تھے۔ آئین وضع داری کے بہت سختی سے پابند تھے جس کو انہوں نے اپنے اور اپنے احباب اور ملنے والوں کے واسطے مقرر کر لیا تھا۔ وضع اور لباس بھی خاص تھا جس کو انہوں نے عمر بھر نباہا۔ لوگ جس طرح اُن کے کلام کی عزت کرتے تھے اسی طرح ان کی پابندی وضع کے بھی قدر داں اور مدّاح تھے۔ ایک مرتبہ نواب تہور جنگ ایک رئیس حیدرآباد نے میر صاحب کی جوتیاں اُٹھا کر اُن کی پالکی میں رکھ دیں اور اس پر ان کو بڑا فخر و ناز تھا۔ یہ ان کے مزاج کی خودداری، قناعت اور استغنا کا نتیجہ تھا کہ کبھی کسی کی تعریف میں یا روپیہ کے لالچ میں ایک حرف زبان سے نہیں کہا۔ البتہ اُمرائے لکھنؤ جو ہدایا و تحائف مدّاح آل رسول سمجھ کر پیش کرتے تھے، اُس کو قبول بھی کر لیتے تھے۔

میر انیس لکھنؤ سے تا انتزاع سلطنت کبھی باہر نہیں نکلے۔ جب کبھی باہر جانے کا ذکر ہوتا تو فرماتے کہ اس کلام کو اسی شہر کے لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں اور کوئی اس کی قدر کیا کرے گا اور ہماری زبان کا لطف کیا اٹھائے گا۔ لیکن تباہی لکھنؤ کے بعد پہلی مرتبہ ۱۸۵۹ء میں اور پھر ۱۸۶۰ء میں نواب قاسم علیخاں کی طلب اور اصرار سے پٹنہ عظیم آباد تشریف لے گئے اور واپسی میں بنارس میں بھی ایک مرتبہ ٹھہرے تھے۔ اس کے بعد ۱۸۷۱ء میں مولوی سید شریف حسین خاں کی تحریک اور نواب تہور جنگ بہادر کے سخت اصرار سے دکن حیدر آباد گئے۔ اور لوٹتے ہوئے الہ آباد میں قیام کیا۔ اور ان سب مقامات پہ اپنے معرکۃ الآرا مرثیوں سے لوگوں کو مستفیض اور داخل حسنات کیا۔ جس مجلس میں پڑھتے اس کثرت سے جمع ہو جاتے تھے کہ باوجود سخت انتظام اور پہروں کے بھی چپّہ بھر زمین سُننے والوں

سے خالی نہ رہتی تھی۔ جب دوسرے شہروں کا یہ حال تھا تو پھر خاص لکھنؤ کا کیا پوچھنا ہے جو قدر دانی اور کمال کا سرچشمہ تھا۔ میر صاحب کا انتقال بعارضۂ بخار ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں ہوا[1] اور اپنے باغ ہی میں دفن ہوئے۔

میر انیس بحیثیت شاعر میر صاحب خلقی شاعر تھے اور شاعری ورثہ میں پائی تھی۔ کوئی خاندان اتنا زبردست سلسلہ مشہور اور قابل شعراء کا نہیں پیش کر سکتا۔ لہٰذا جو فخر میر صاحب کو اپنے خاندان پر تھا وہ بجا تھا۔ میر صاحب نے بچپن ہی میں جب کہ فیض آباد میں قیام تھا شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے حزیںؔ تخلص کرتے تھے شاید اس مناسبت سے کہ ان کے پردادا میر ضاحکؔ اور مشہور شاعر شیخ علی حزیںؔ میں بہت ربط و ضبط تھا[2]۔ جب لکھنؤ آئے تو اُن کے والد اُن کو ناسخؔ کے پاس لے گئے۔ ناسخؔ نے کہا کہ تخلص کو بدل دو چنانچہ ایسا ہی کیا۔ انیسؔ تخلص اختیار کیا انہیں نے کم سنی سے مرثیہ کہنا شروع کر دیا تھا اور تھوڑے ہی دنوں کی مشق میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ ان کی شہرت ان کے والد کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ جب خلیقؔ اور ضمیرؔ میدان مرثیہ سے ہٹ گئے تو دبیرؔ و انیسؔ کا زمانہ آیا جنہوں نے اس فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔

---

[1] کسی نے کیا خوب مادۂ تاریخ نکالا ہے جس میں مصرعہ کے ایک جزو سے میر انیس اور دوسرے جزو سے مرزا دبیرؔ کی وفات کا سن نکلتا ہے۔ مصرعہ یہ ہے ؏

غم انیسؔ میں ہے ہے دیا دبیرؔ کا غم
۱۲۹۱ ۱۲۹۲

[2] یہ نسبت قرین عقل نہیں معلوم ہوتی اس وجہ سے کہ میر ضاحکؔ میر درد ؔ و سوداؔ کے معاصر تھے اور شیخ علی حزیںؔ خان آرزو کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے اور ان سے سن میں بڑے تھے لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ضاحکؔ نے اپنی بہت صغر سنی میں شیخ کو کہیں دیکھا ہو ورنہ ربط و ضبط تفاوت سن کی وجہ سے غیر ممکن ہے۔ ۱۲۔

تصانیف میر صاحب نے ہزارہا مرثیے، سلام، قطعات، رباعیاں لکھی ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کا پورا کلام اب تک شایع نہیں ہوا مگر جس قدر چھپ چکا ہے پانچ جلدوں میں ہے۔ باقی ان کے اعزہ کے پاس محفوظ ہے۔ مشہور ہے کہ انہوں نے ڈھائی لاکھ شعر کہے تھے جن میں کچھ غزلیں بھی تھیں۔ جس طرح اُن کا کلام لاجواب ہے اسی طرح ان کے پڑھنے کا طریقہ بھی لاجواب تھا۔ اُن کی آواز، قدوقامت، صورت، غرض ہر شے اس کام کے لئے موزوں واقع ہوئی تھی۔ پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ بڑا آئینہ سامنے رکھ کر تنہائی میں بیٹھتے اور پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔ میر انیس کا کلام ہموار ہے اور دوسرے شاعروں کی طرح رطب و یابس کا مجموعہ نہیں ہے۔

ادب اُردو میں میر انیسؔ ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ بحیثیت شاعر کے اُن کی جگہ صف اولین میں ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کو زبان اُردو کے تمام شعراء سے بہترین اور کامل ترین سمجھتے ہیں اور ان کو ہندوستان کا شیکسپیئر اور خدائے سخن اور نظم اُردو کا ہومر اور ورجل اور بالمیک خیال کرتے ہیں۔

انیس کی خدمت زبان کے ساتھ انیسؔ نے زبان اُردو کی بڑی خدمت کی اس کو خوب صاف کیا اور مانجا اور ان کا کلام اپنی فصاحت اور تازگی کے لئے مشہور عالم ہے۔ وہ صحت محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور اسی پر ان کو بڑا فخر و تھا۔ لغات کی معلومات ان کی بہت وسیع تھی اور الفاظ کی سجاوٹ میں ان کو کمال حاصل تھا۔ بہت سے نئے نئے محاورے ان کی وجہ سے داخل زبان ہوئے اور قدیم محاورات کا صحیح استعمال بھی انہوں نے بتایا۔ ابتدائی کلام میں کچھ قدیم محاورات پائے جاتے ہیں۔ بلکہ جوں جوں مشق بڑھتی گئی اور تجربہ وسیع ہوتا گیا۔ اسی قدر کلام صاف ہوتا گیا۔ میر صاحب کی زبان دہلّی اور لکھنو دونوں جگہ مستند مانی جاتی ہے۔ ان کا خاندان صحت محاورہ کا محافظ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ خود فرماتے تھے کہ میں فلاں

لفظ یا فلاں ترکیب کو اس طرح استعمال کرتا ہوں جیسا میرے گھرانے میں مروج ہے نہ کہ اس طرح کہ جیسے آپ اہل لکھنؤ بولتے ہیں۔ میر حسن اور میر خلیق کے تعلقات بہو بیگم صاحبہ کے خاندان کے ساتھ وابستہ تھے۔ مشہور ہے کہ فیض آباد میں ان کے یہاں ایک باقاعدہ دفتر تھا جس میں ایسے محاورے اور مثلیں جو بہو بیگم صاحبہ کے گھر میں بولی جاتی تھیں باقاعدہ درج ہوتی رہتی تھیں اور اس دفتر کے افسر اعلےٰ میر حسن اور میر خلیق تھے۔ ظاہر ہے کہ زبان کی صحت و صفائی کے لئے ان سے زیادہ کون مستند ہو سکتا تھا۔

میر صاحب کا مرثیہ زبان اُردو میں بہت خاص ہے اس وجہ سے جو احسان انہوں نے زبان کے ساتھ کیا وہ بھی خصوصیت رکھتا ہے اُردو باوجود اصناف نظم کی تنوع اور کثرت کے رزمیہ نظم سے اب تک تہیدست تھی۔ ان میں ہومر کی الیاڈ۔ ورجل کی اینیاڈ۔ دیاس کی مہابھارت، والمیک کی رامائن یا فردوسی کے شاہنامہ کی طرح کوئی تصنیف موجود نہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ زبان اُردو ایک نوخیز چیز ہے اور اس قسم کی تصانیف رزمیہ کے لیے ایک خاص مدت مدید کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ کمی کسی طرح پوری ہو سکتی تھی تو انیس کے مشہور مراثی سے ہوئی۔ ان کے مرثیوں کی تمہیدیں اور مناظر جنگ وغیرہ ایسی استادی اور کمال سے لکھے گئے ہیں کہ نظامی کے سکندر نامہ اور فردوسی کے شاہنامہ کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح مناظر قدرت اور جذبات انسانی جس زور کے ساتھ انہوں نے دکھائے ہیں اُس کا بھی جواب زبان اُردو میں کہیں نہیں ملتا۔

مرقع نگاری انیس کو مناظر قدرت کی ہو بہو تصویر کھینچنے میں کمال حاصل تھا۔ اس قسم کے بیانات مرثیہ سے غیر متعلق نہیں ہوتے بلکہ اصل مضمون کے تحت میں آجاتے ہیں مگر پھر بھی بالذات ایک مکمل چیز ہیں جو مرثیہ سے بے تکلف علیحدہ کیے جا سکتے ہیں۔ پورا مرثیہ ایک ایسا مرقع معلوم ہوتا ہے جس میں صدہا خوب صورت خوبصورت

مکمل تصویریں چسپاں ہیں۔ جو بظاہر ایک دوسرے سے تعلق نہیں رکھتیں مگر پھر بھی مجموعی حیثیت سے اسی کل کے تحت میں سب آتی ہیں۔ مثلاً صبح کا سماں۔ طلوع آفتاب۔ نسیم سحر کے خوشگوار جھونکے۔ شام کا سہانا وقت۔ چاندنی کا لطف یا تاریکی کا بھیانک منظر۔ باغ میں پھولوں کا کھلنا اور مہکنا۔ سبزہ کی بہار وغیرہ وغیرہ الگ الگ چیزیں ہیں مگر سب مرثیہ کے جزو ضروری ہیں۔

اظہار جذبات

مثل عالم ظاہر کے عالم باطن یعنی جذبات کے اظہار پر بھی میر صاحب کو بہت بڑی قدرت حاصل ہے۔ جذبات خوشی و غم۔ غصہ۔ محبت۔ رشک و حسد۔ بیم و رجا وغیرہ ایسی استادی سے بیان کرتے ہیں کہ دل وجد کرتا ہے۔ ایک اور کمال یہ ہے کہ کہنے والے کی عمر۔ جنس۔ حالت وغیرہ کا پوری طرح خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی بچہ کی زبان سے کچھ الفاظ کہے گئے ہیں تو خیالات اور زبان دونوں بچوں ہی کے ادا کیے جاتے ہیں۔ وہ کبھی اس نازک فرق کو نظرانداز نہیں کرتے جس سے ان کے اصول ڈرامانویسی کی کماحقہ واقفیت کا اندازہ اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح عورتوں کے مختلف رشتوں کے نازک فرق کو بھی بدرجۂ اتم ملحوظ رکھتے ہیں۔ معرکۂ جنگ میں مبارزوں کی رجز خوانی۔ حریف کا جواب۔ حملہ آوروں کے حملے۔ پہلوانوں کی لڑائیاں۔ سامان حرب و ضرب علی قدر مراتب اس خوبی سے دکھاتے ہیں کہ میدانِ کارزار کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ تلوار اور گھوڑے کی تعریف صدہا بلکہ ہزارہا جگہ کی گئی ہے مگر ہر دفعہ تشبیہ اور تخیل نئی ہوتی ہے اور نیا لطف دیتی ہے۔

مرثیوں میں تسلسل بیان ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ میر انیس ایک مستند مورخ کی حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ جن واقعات کو انھوں نے نظم میں باندھا ہے وہ من و عن ہرگز وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ ان کا وجود اگر ہے تو شاعر کے تخیل

میں ہے۔ مگر یہی تخیلی وجود مابعد کے شعراء اپنے ماقبل کے شعراء کے کلام سے اخذ کرتے چلے آتے ہیں۔ میر انیس کا کلام اغلاط سے بھی بالکل پاک نہیں۔ مولوی عبدالغفور صاحب نساخ نے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں انہوں نے انیس اور دبیر کی عروضی اور دوسری قسم کی غلطیاں دکھائی ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے طرفداروں نے بھی اس کے جواب میں رسالے لکھے اور اپنے اپنے استادوں کی جانبداری کا حق ادا کیا۔ مگر سچ پوچھیے تو واقعیت بین بین میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے اصلی حالت میں اور صحیح طور پر نہیں چھپے۔ ان میں کچھ کتابت کی غلطیاں ہیں۔ اور کچھ ان لوگوں کے حسب موقع تحریفیں ہیں جنہوں نے مرثیے پڑھے۔ کہیں کہیں پرانے محاورات بھی ہیں جو اب متروک ہو گئے۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تمام مرثیوں میں ہمواری نہیں ہے اور بعض اشعار تو انیس اور دبیر ایسے پختہ کار شاعروں کے درجہ سے گرے ہوئے ہیں اگر تعجب کی کیا بات ہے اس وجہ سے کہ انہوں نے لاکھوں شعر کہے۔ اگر کہیں کہیں غلطیاں بھی ہو گئیں تو اس سے ان کی استادی پر کیا حرف آتا ہے۔

میر انیس کا طرز میر انیس تمثیلوں۔ استعاروں اور صنائع بدائع میں کمال رکھتے ہیں۔ وہ فضول مبالغے اور بے جا اغراق کو ہرگز نہیں پسند کرتے جن کی اس زمانہ میں کثرت تھی صنائع بدائع کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ جس سے شعر پر کوئی بار نہیں پڑتا اور حسن بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی تمثیلیں بھی نہایت حسین اور بہت ارفع اور نہایت آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہیں۔ وہ ان سے ایک عجیب دلکش اثر پیدا کرتے ہیں۔ بڑی چیز کی مثال ہمیشہ بڑی چیز سے دیتے ہیں۔ ان کی تشبیہات کبھی معمولی اور ادنےٰ قسم کی نہیں ہوتیں۔ کلام حسب موقع کہیں صاف و سلیس اور کہیں رنگین ہوتا ہے۔ مگر فصاحت اور زور کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا۔ بیان میں روانی غضب کی ہوتی ہے۔ فصاحت نشست الفاظ اور زور یہ سب ان کے کلام میں ملے ہوئے

ہیں۔ اشعار بہت صاف اور سلیس اور جلد سمجھ میں آنے والے ہیں اور یہ آخری صفت بعض وقت دھوکا دیتی ہے اور عمق معنی کو اس گہرے غار کے پانی کی طرح پوشیدہ کر دیتی ہے جس کو صفائی اور موجوں کی روانی نے چھپا دیا ہو۔ ان کے قادر الکلام ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ایک ہی بات اور ایک مضمون کو اُسی سادگی اور دل آویزی کے ساتھ صدہا بار کہتے ہیں اور پھر ہر مرتبہ وہ نئی معلوم ہوتی ہے۔

انیسؔ کا مرتبہ اُردو شعرا کی صف اولین میں نہایت اعلےٰ وارفع ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس زمانہ میں جب تصنع اور تکلیف اور مبالغے اور اغراق کا بازار گرم تھا۔ ان کی شاعری جذبات حقیقی کا آئینہ تھی اور جس نیچرل شاعری کا آغاز حالی اور آزاد کے زمانہ سے ہوا اس کی داغ بیل انیسؔ نے ڈالی تھی۔ انیسؔ نے مرثیہ کو ایک کامل حربہ کی صورت میں چھوڑا جس کا استعمال حالیؔ نے نہایت کامیابی سے کیا۔ اُن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انگریزی داں طبقہ میں بہت مقبول ہیں جس کا دماغ معمولی شعر و شاعری کی عطر بیزی سے بعض وقت پریشاں ہو کر حقیقی شاعری کی نکہت کے لئے بیتاب ہوتا ہے ان کی شہرت برابر ترقی کر رہی ہے۔ اور ہماری رائے میں اس وقت تک ترقی کرتی جائے گی جب تک زبان اُردو ترقی کرے گی۔ بلکہ اسی وقت انیسؔ کی واقعی قدر کی جائے گی۔

دبیرؔ مرزا سلامت علی دبیرؔ دہلی میں ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے[۱]۔ ان کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ ارباب تذکرہ میں خاندان کی نسبت اختلاف ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ان عالی خاندان اور ان کے بزرگوں کو نہایت معزز ثابت کیا جائے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا دبیرؔ ایک شریف اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے بزرگ قدیم زمانہ میں کچھ اثر ضرور رکھتے تھے۔ ان کے

---

[۱] وفات ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء۔ فاضل

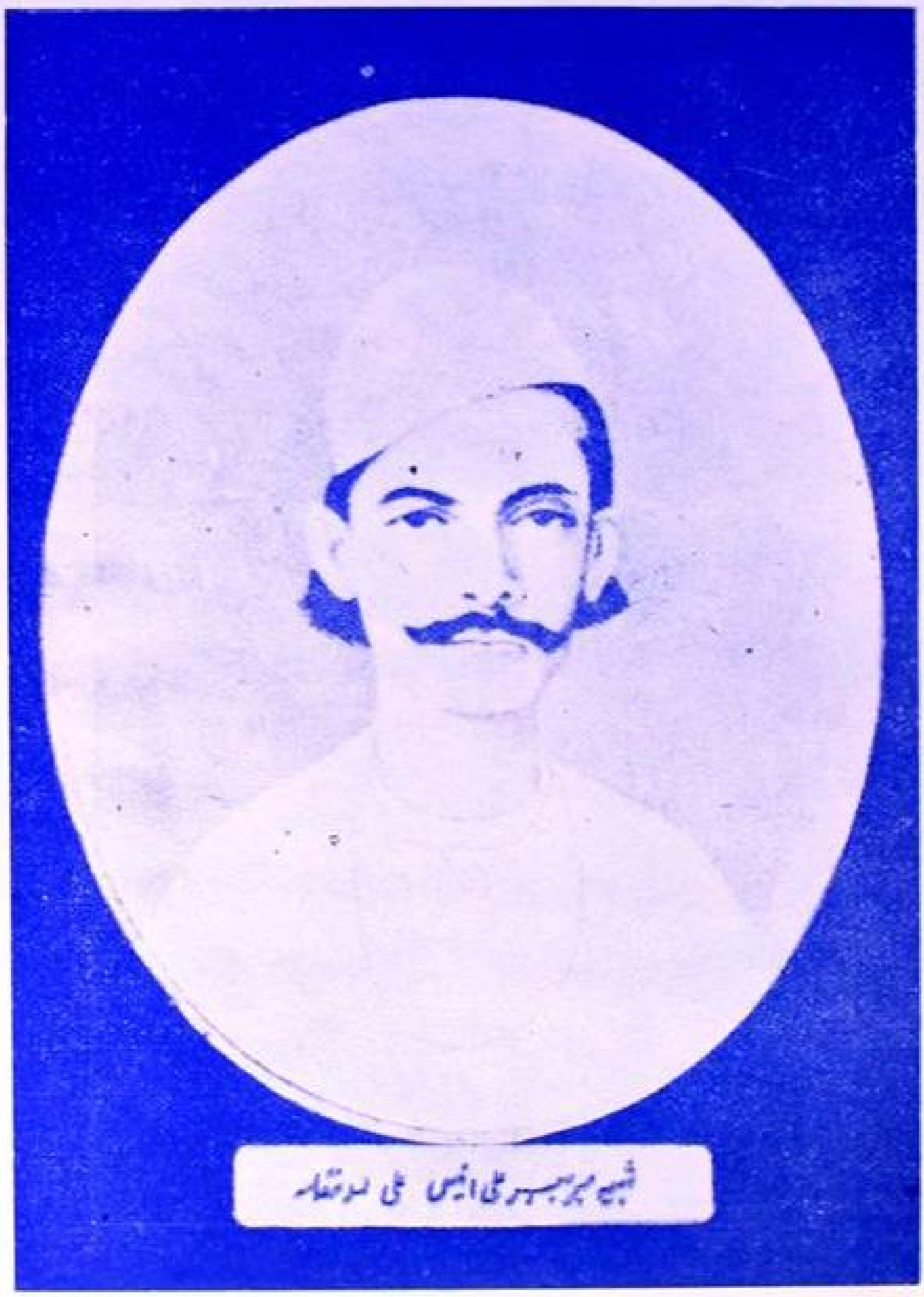

شبیہ میر ببر علی انیس طاب ثراہ

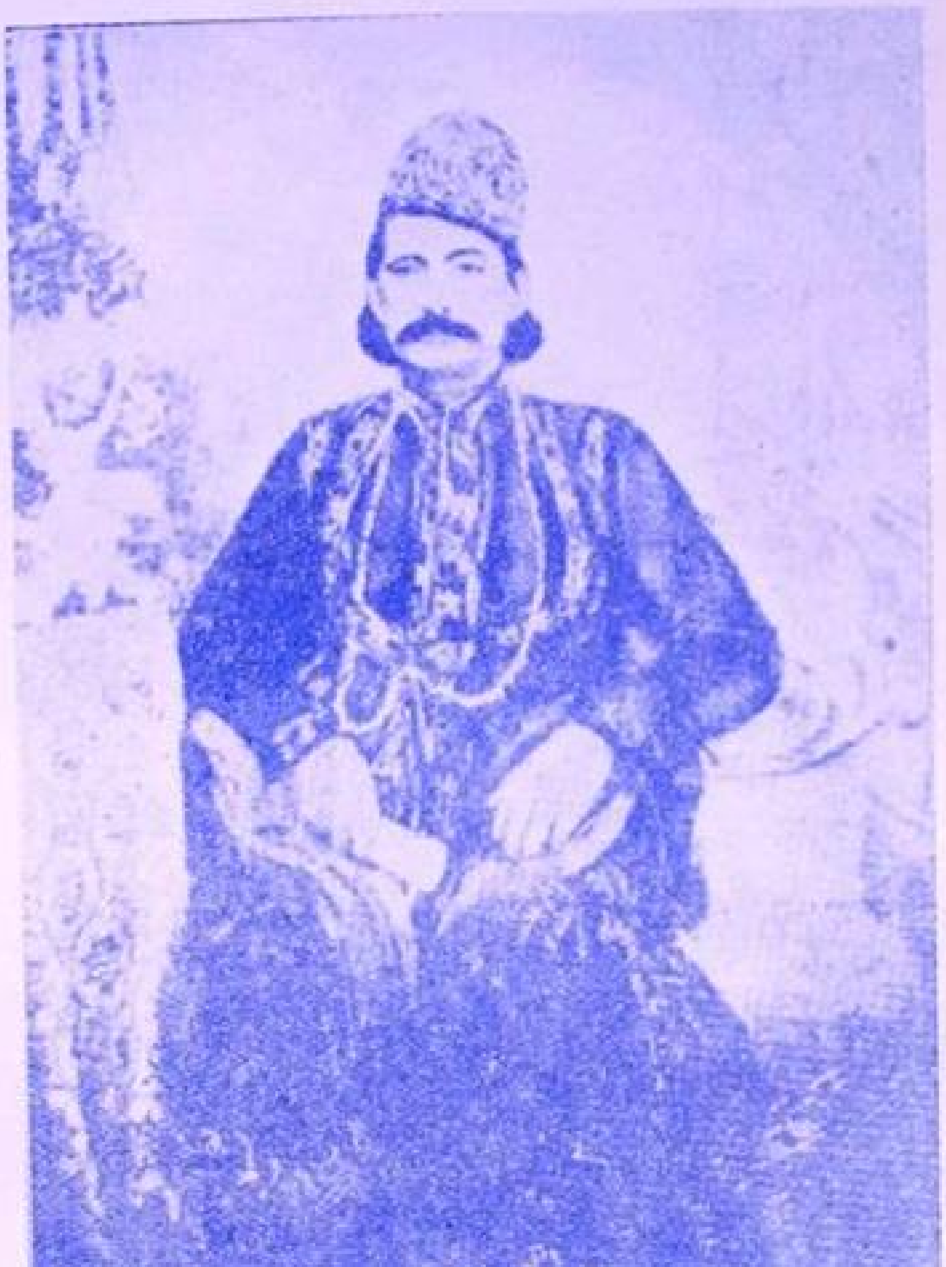

میر مونس لکھنوی

والد تباہی دہلی کے بعد لکھنؤ آئے اور یہیں شادی کر کے رہ پڑے۔ اس کے بعد جب دہلی میں تسلّط ہو گیا تو پھر دہلی واپس گئے۔ مگر دبیر اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ اس وقت آئے جب ان کی عمر تقریباً سات برس کی تھی۔ مرزا استعداد علمی معقول رکھتے تھے اور درس و تدریس اور بحث و مباحثہ کے بڑے شایق تھے جس سے ان کی ذہانت اور طباعی کو جولانی کا خوب موقع ملتا تھا۔ شعر و سخن سے قدرتی مناسبت رکھتے اور علی الخصوص مرثیہ گوئی کے بچپن ہی سے دلدادہ تھے۔ میر ضمیر کے شاگرد ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی ذہانت اور طبعی جودت سے اپنے ہم مشقوں پہ گوے سبقت لے گئے۔ اب ان کا شمار اچھے مرثیہ گویوں میں ہونے لگا چنانچہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں اُس وقت کے مشہور مرثیہ گویانِ لکھنؤ میں دبیر کا بھی ذکر کیا ہے۔ مرزا دبیر کی شہرت برابر ترقی کرتی گئی یہاں تک کہ ان کو بادشاہِ وقت کے سامنے پڑھنے کا بھی افتخار حاصل ہوا۔ لکھا ہے کہ اکثر روسائے لکھنؤ اور محلات شاہی بھی ان کی شاگرد ہو گئی تھیں اور اب یہ زبانِ اُردو کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ ان کی شہرت سے اور نیز اُستاد کی عزت و محبت کے برتاؤ سے بعض لوگ آتشِ رشک و حسد سے جلنے لگے اور استاد و شاگرد میں ایک خاص موقع پر جبکہ مرزا دبیر نے نواب افتخار الدولہ[1] کی مجلس میں اپنا مرثیہ پڑھا تھا، رنجش اور بددلی پیدا کرا دی۔ مگر غنیمت ہے کہ اس معاملے نے طول نہیں کھینچا اور مصحفی و انشا کی طرح تھکا فضیحتی کی نوبت نہیں آئی۔ آخر کار معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ مرزا صاحب ہمیشہ اپنے استاد کا نام ادب و احترام سے لیتے تھے اور لوگوں کو بھی کوئی موقع ان کو بُرا بھلا کہنے کا اپنے سامنے نہیں دیتے تھے۔ مرزا صاحب کا دامنِ شہرت وسیع ہو چکا تھا کہ میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے، اب میر ضمیر بوڑھے ہو گئے تھے۔

---

[1] آبِ حیات میں لکھا ہے کہ یہ مجلس نواب شرف الدولہ کے یہاں ہوئی تھی۔ ۱۲۰

مقابلہ آیندہ مرزا دبیر اور مرزا انیس میں شروع ہوا۔ یہ دونوں بزرگوار بھی نہایت تہذیب و متانت سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے اور جب کبھی کسی مجلس میں یکجائی کا موقع ہوتا تو ایک دوسرے کا بہت ادب و آداب کرتے تھے۔ ۱۲۹۱ھ میں مرزا صاحب کو ضعف بصارت کی شکایت ہوئی۔ چنانچہ بحکم واجد علی شاہ جو اس وقت مٹیابرج میں قیام گزیں تھے کلکتہ تشریف لے گئے جہاں ایک ہوشیار ڈاکٹر نے کامیابی سے ان کا علاج کیا مثل میر انیس کے یہ بھی غدر ۱۸۵۷ء تک گھر سے باہر نہیں نکلے تھے۔ مگر ۱۸۵۸ء میں مرشد آباد اور ۱۸۵۹ء میں پٹنہ عظیم آباد گئے۔ اور ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ میں اس دار ناپائدار سے رحلت کی اور اپنے ہی مکان میں مدفون ہوئے۔

دبیر بحیثیت مرثیہ گو | مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے اُستاد کامل تھے۔ انہوں نے اپنی پوری عمر اسی مشغلہ میں صرف کی۔ ان میں میر انیس کی اکثر خصوصیات موجود ہیں اور شکوہ الفاظ اس پر طرّہ ہے۔ مرزا صاحب سامعہ نواز الفاظ کے ساتھ اعلےٰ تخییل، نئی تشبیہات، اور تازگی مضامین کے بھی بہت دلدادہ ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ بسا اوقات ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا اور کوہ کندن وکاہ برآوردن کی مثل صادق آتی ہے۔ ان کے کلام میں ایک عالم فاضل کی جھلک برابر آتی رہتی ہے وہ آیات قرآنی اور احادیث کو باندھنے کے بہت شائق ہیں۔ اور بعض وقت اُردو کے ساتھ عربی کا جوڑ خوب بٹھاتے ہیں۔ دوسری صفت یہ تھی کہ بہت پُرگو اور زود گو تھے۔ ان کی کثرت خیالات حیرت انگیز ہے۔ مختصر یہ کہ اپنی حسین اور نادر تشبیہات سے، اپنی شاندار ابیات سے، اپنے اعلےٰ مضامین سے، اپنے پُرشکوہ الفاظ سے، اپنی طباعی و ذہانت سے اپنی زود گوئی اور پُرگوئی سے اور اپنی ایجاد پسند طبیعت سے وہ ضرور اس قابل ہیں کہ میر انیس کے پاس شعراء کی صف اوّلین میں اُن

کو جگہ دی جائے۔

انیس اور دبیر کا مقابلہ

ان دونوں کے مقابلے سے اہلِ لکھنؤ دو بڑی جماعتوں پہ منقسم ہو گئے۔ ایک طرف داران انیس دوسرے جانب داران دبیر جو بہ اصطلاح اہلِ لکھنؤ انیسیے اور دبیریے کہلاتے تھے۔ ان دونوں فریقوں کی جنبہ داری بعض اوقات حدِ اعتدال سے بڑھ کے سخف اور مضحکہ انگیز درجہ تک پہنچ جاتی تھی مگر ایک مؤرخ کا یہ فرض نہیں کہ ان جزئی مباحث میں پڑے پھر بھی ان نامور اُستادوں کے کلام کا مقابلہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ دونوں بزرگ ایک ہی زمانہ میں تھے یہاں تک کہ ایک سال کی کمی بیشی میں پیدا ہوئے اور ایک ہی سال کی کمی بیشی میں انتقال کیا۔ دونوں ایک ہی صنف (مرثیہ) میں مشغول و منہمک تھے۔ دونوں کی سوسائٹی اور ماحول ایک ہی تھا۔ دونوں نے اپنی تصنیفات از قسم مراثی و رباعیات و سلام وغیرہ بکثرت چھوڑے اور دونوں زبان اُردو کے مستند اور مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ اب فرق دیکھنا چاہیے کہ کیا ہے۔ انیس موروثی شاعر تھے شاعری اُن کو ورثے میں ملی تھی۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

گر مرزا دبیر کو یہ شرف حاصل نہ تھا۔ دونوں کا طرز بھی جدا جدا ہے۔ انیس کی خاص توجہ زبان کی صفائی اور حلاوت، بندش کی چستی اور محاورے کی درستی پر ہے۔ برخلاف اس کے مرزا دبیر کے یہاں جدت خیالات، بلند تخیّل، نئی نئی تشبیہیں اور پر شکوہ الفاظ زیورِ کلام ہیں۔ مختصر طور پر فصاحت اور سادگی میر انیس کے کلام کا جوہر ہے اور صنعت اور رنگینی مرزا دبیر کا مایۂ ناز ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر صاحب کا کلام ایسی بھدّی ترکیبوں اور دور از کار تشبیہوں سے پاک و صاف

ہے جو مرزا صاحب کے یہاں بکثرت ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، کہ مرزا صاحب کو عربی و ادبیات بہت مستحضر تھیں اور میر صاحب کو اس قدر نہ تھیں اور یہی کتابی علم کی کمی میر صاحب کی شگفتگی کلام کا باعث ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ایک فضول سی بات ہے۔ اس معاملہ میں آخری فیصلہ کن چیز ادبی ذوق ہے اور ہر شخص ذوق الگ الگ ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں یہ بات داخل فیشن ہو گئی ہے کہ دبیرؔ کے کلام کو کم کر کے دکھایا جائے اور ان کا مرتبہ انیسؔ سے بہت کم رکھا جائے مگر حق یہ ہے کہ دبیرؔ بھی مثل انیسؔ کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ جیسا کہ خود ان کے معاصرین امیر مینائیؔ اور اسیرؔ لکھنوی نے اعتراف کیا ہے۔ ان کی شہرت خود ان کے زمانہ میں بھی بہت تھی۔ جیسا کہ لفظ "اُستاد" سے ثابت ہے۔ جو ان کے واسطے برابر استعمال کیا جاتا ہے۔

مرثیہ کی مقبولیت کے اسباب

لکھنؤ ہمیشہ سے شیعیت کا مرکز رہا ہے اور اہل تشیع شہدائے کربلا کا دل سے ادب و احترام کرتے ہیں۔ اس شہر میں عشرۂ محرم بڑے دھوم دھام اور خاص اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں کے تعمیر پسند بادشاہوں نے بڑے بڑے امام باڑے بنوائے جہاں ایّامِ عزا میں مومنین جمع ہوتے ہیں اور شہدائے کربلا کی مجالس نہایت سیر چشمی اور تکلّف سے کرتے ہیں۔ امیر سے غریب تک اس مہینہ کو متبرک سمجھ کر جملہ مراسم عزاداری اُس میں انجام دیتے ہیں۔ اظہارِ غم کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ مرثیہ خوانی ہے۔ کوئی شخص یہاں تک کہ بڑے سے بڑا متشکک بھی علی الاعلان کسی کے مذہبی رسوم کی مخالفت کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مرثیہ لکھنا اور مرثیہ پڑھنا ہمیشہ سے ایک مذہبی کام سمجھا جاتا ہے۔ ہر شیعہ شخص اپنی بڑی خوش نصیبی سمجھتا ہے، اگر ایک بند بھی

امام مظلوم کی شان میں یا ایک شعر جناب امیرؑ کی تعریف میں حصول ثواب کی نیت سے وہ کہہ دے۔ یہاں کے بادشاہ ایسے لوگوں کی قدردانی اس غرض سے کرتے تھے کہ لوگ ان کو با مذہب خیال کریں۔ درحالیکہ وہ سال بھر دنیاوی عیش و عشرت میں منہمک رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک مہینہ کی عزاداری سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی۔ مگر علماء اور شعراء مرثیہ کی قدر ایک دوسرے نقطۂ نظر سے کرتے تھے۔ وہ اس کو ادبی چیز سمجھتے تھے۔ بہرطور جو کچھ وجہ بھی ہو وہ زمانہ مرثیہ کے عروج کا زمانہ تھا۔

مرثیہ سے کیا کیا فائدے پہنچے

میر ضمیرؔ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مرثیہ میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ رزمیہ۔ سراپا، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی طولانی تعریفیں نئی نئی تشبیہات اور عمدہ تخیّل کے ساتھ، مناظر جنگ، مع تفصیل جزئیات، غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں کا ترک، جن کو قدیم مرثیہ نویس مدّت دراز سے برتتے چلے آتے تھے غرض کہ یہ اور اسی قسم کی بہت سی جدّتوں کا سہرا میر ضمیرؔ کے سر ہے مگر انیسؔ و دبیرؔ نے انہیں چیزوں کو ترقی کی معراج تک پہنچایا اور ان میں چار چاند لگائے حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں نے اس صنف شاعری کو ترقی کے آسمان تک پہنچا دیا اور اسی زمانے سے مسدّس جس میں عموماً مرثیے لکھے جاتے ہیں۔ پُرجوش نیچرل نظموں کے لئے بھی مناسب خیال کیا جانے لگا" مدوجزر اسلام" حالیؔ کا مسدّس اسی عنوان پہ ہے۔ سرورؔ جہاں آبادی نے بھی اسی صنف کو اپنی قومی اور نیچرل نظموں کا آلۂ کار بنایا۔ اگر غور سے دیکھیے تو آزادؔ۔ حالیؔ اور سرورؔ وغیرہ کی دلچسپ اور زوردار نظمیں سب مرثیہ ہی کی خوشہ چین اور رہین منّت ہیں کیونکہ زمانۂ حال کے طرز میں وہ سب خصوصیات موجود ہیں جو مرثیہ میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً تمہید، تسلسل بیان، اعلےٰ جذبات کا اظہار، سلاست زبان،

تشبیہات، تخیّل وغیرہ، جو ہماری جدید شاعری کے بڑے عنصر ہیں، سب قریب قریب وہی ہیں جن کو مرثیہ کے اُستاد اب سے بہت پیشتر نہایت کامیابی سے برت چکے ہیں۔

قدیم طرز لکھنؤ کی مصنوعی اور مخرب اخلاق فضائے شاعری میں مرثیہ کی نمود اور اس کی سلاست و فصاحت اور ادب آموزی نے وہی کام کیا جو ریگستان میں ایک خوش نما سبزہ زار کرتا ہے۔ مرثیہ میں اُس حقیقی شاعری کا پرتو ہے جو اعلیٰ جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ اُس کی ادب آموزی ایسے وقت میں، جب دنیائے شاعری عیش پسند درباروں کی خوشامد اور تمتع میں نہایت ادنےٰ اور رکیک جذبات کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی، قابل صد ہزار آفریں ہے۔ ہر چند کوئی مرثیہ بلحاظ فن گرا ہوا ہو مگر پھر بھی وہ ایک اخلاقی نظم ضرور ہے۔ اور اس معنی میں اُس کے مفید ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ اس کا مضمون ضرور عالی اور مقدس ہوگا۔ لہٰذا شاعر گو غزل میں وہ کیسا ہی پست اور لااُبالی خیال کرے مگر مرثیہ میں مناسبت مضمون کے خیال سے وہ ضرور سنجیدہ اور اخلاق آموز شعر کہنے پر مجبور ہوگا۔ شجاعت عالی ہمتی، عفت، انصاف وغیرہ کی تعریفیں، جو ہم اس افسانۂ مصائب و غم میں برابر سُنتے رہتے ہیں۔ ہماری درستی اخلاق کے لئے اور ہم میں شریف اور اعلےٰ جذبات پیدا کرنے کے لئے ازبس مفید اور ضروری ہیں۔ لڑائیوں کے ہو بہو نقشے، اسلامی نبرد آزماؤں کے تنہا مقابلوں کی جیتی جاگتی تصویریں، مبارزوں کی پُرجوش رجزخوانیاں، مخالفین کے جوابات، کفار کا قتل و قمع، کمزوروں کی اعانت و مدد، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو مرثیہ کی بدولت ہماری نظم اردو میں صنف "ایپک" (رزمیہ) کا بیش بہا اضافہ کرتی ہیں جس کی اُس میں اب تک کمی تھی۔ ہمارے اُردو مراثی اکثر ایسے مکمل مرقعے پیش کرتے ہیں جو بلا تکلف دنیا کی بہترین رزمیات سے مقابلے

کے لئے تیار رہیں۔ زبان کے ساتھ بھی مرثیہ کی خدمات نہایت بیش بہا اور عظیم الشان ہیں۔ چار پانچ لاکھ بیت جو انیسؔ اور دبیرؔ کہہ کے چھوڑ گئے۔ ان سے ہماری زبان میں کیا کچھ کم قابل قدر اضافہ ہوا۔ پھر اس زمانہ سے اس وقت تک کے استعمال نے ان کو اور صاف کیا اور بالخصوص مرثیہ نے محدود میدان اردو کو وسیع کیا اور زبان اردو کے سلاح خانے میں ایک نہایت قیمتی اور ضروری حربہ اضافہ کیا۔

دیگر مرثیہ نویس اس زمانہ کے دیگر مرثیہ نویس میاں دلگیرؔ اور فصیحؔ تھے۔ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان سے پیشتر میاں مسکینؔ (جن کے مفصل حالات نہیں معلوم ہو سکے سوا اس کے کہ ان کا نام میر عبداللہ تھا) افسردہ۔ سکندر۔ گداؔ وغیرہ ہیں جن کے مرثیے اب بھی کبھی دیکھنے میں آجاتے ہیں۔

خاندان انیسؔ یہ عجیب بات ہے کہ علم و فضل اور شاعری اس مشہور خاندان میں پشت ہا پشت سے چلی آتی ہے اور اب تک ماشاءاللہ وہ سلسلہ جاری ہے۔ مشغل شاعری باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی چلی آئی ہے اور اب تک وہ روشن ہے۔ میر امامی (جو میر امامی موسوی ہروی کہلاتے ہیں) اس خاندان کے مورث اعلےٰ تھے۔ ان کے بعد سلسلۂ خاندان بصورت شجرہ حسب ذیل ہے :-

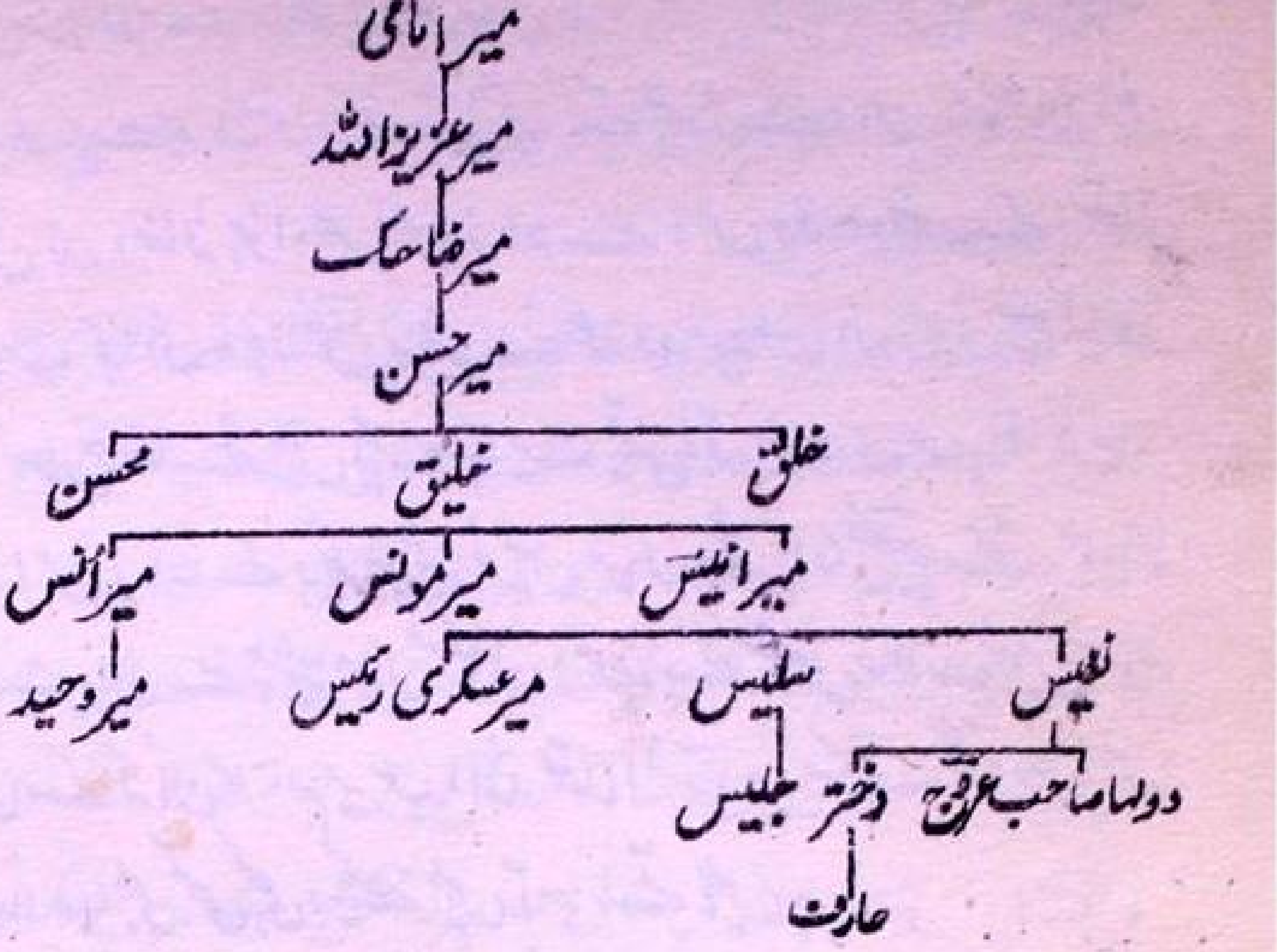

اس خاندان میں اصحاب ذیل کے کچھ مختصر حالات ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں :-

میر مونس میر محمد نواب مونس میر انیس کے چھوٹے بھائی تھے اور بہت اچھا مرثیہ کہتے تھے۔ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر میر انیس کی طرح مشہور نہ تھے۔ مرثیہ نہایت مؤثر اور دل کش طرح سے پڑھتے تھے۔ راجہ امیر حسن خاں صاحب مرحوم والی ریاست محمود آباد مرثیے میں ان کے شاگرد تھے اور ایک معقول مشاہرہ دیتے تھے۔ میر مونس کا انتقال ۱۲۹۲ھ میں ہوا اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔

میر نفیس میر خورشید علی نفیس میر انیس کے بڑے صاحبزادے اپنے بھائیوں میر سلیس اور میر رئیس سے زیادہ ممتاز اور مشہور تھے۔ لائق باپ کے لائق فرزند تھے اور انہیں سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ ان سے میر انیس بلکہ پورے خاندان کا نام روشن ہوا۔ بہت خوش گو اور قابل تھے اور اپنے بعد ایک بڑا ذخیرہ مراثی و سلام و رباعیات وغیرہ کا چھوڑ گئے۔ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں بعمر پچاسی سال

میر علی محمد عارف

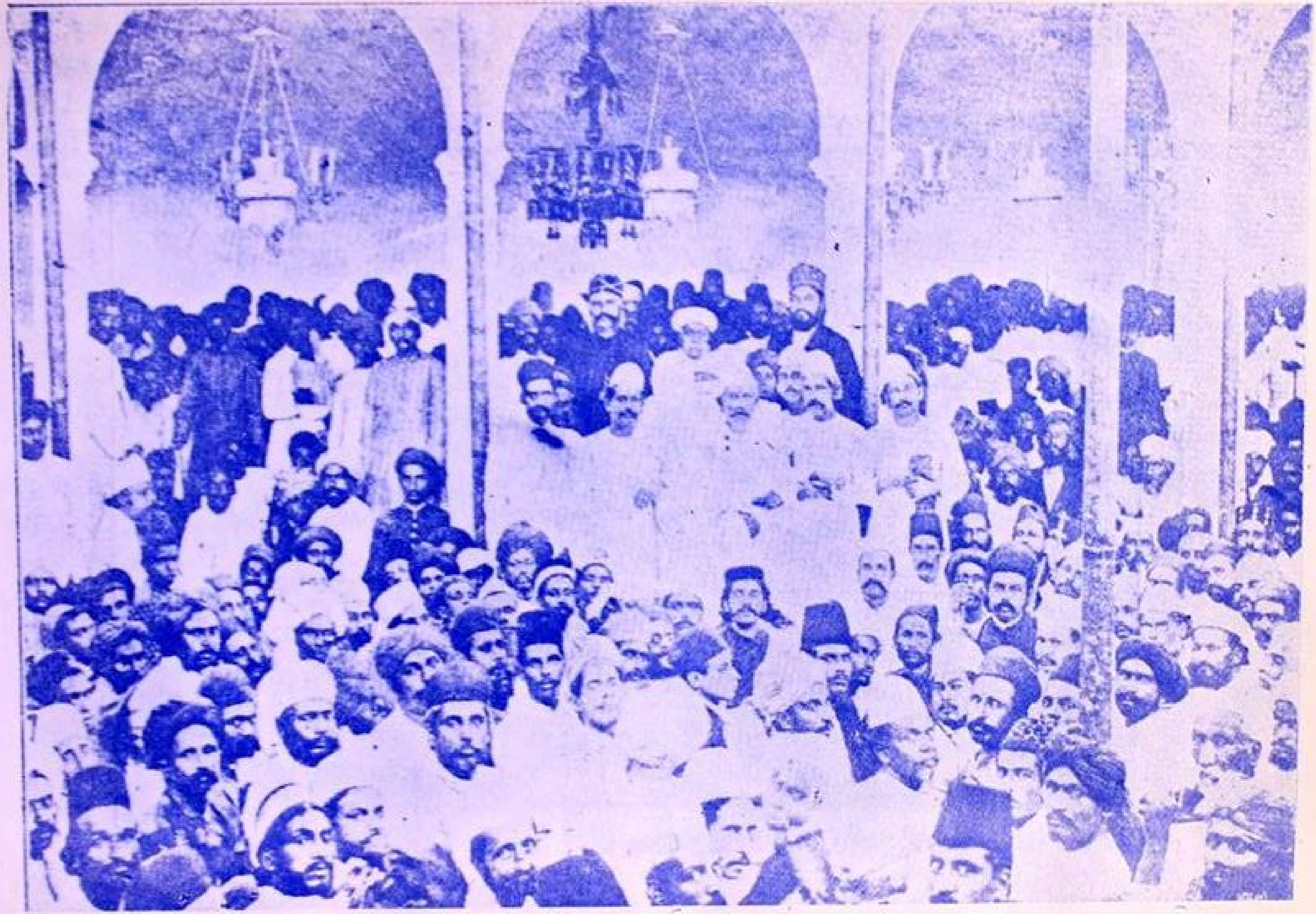

حیدر اباد مین میر نفیس لکھنوی ی ایک مجلس
میر نفیس وسط مین هین اور عارف انکے داهنی جانب هین

انتقال کیا۔

عارف سید علی محمد عارف سید محمد حیدر کے صاحبزادے میر نفیس کے نواسے تھے۔ سنہ ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے اور اپنے نانا کے زیرِ نگرانی تعلیم و تربیت پائی لہٰذا انہیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں والی ریاست محمود آباد اُن کے شاگرد تھے۔ اور مبلغ ایک سو پچیس روپیہ ماہوار سے ان کی خدمت کرتے تھے۔ عارف صاحب بہت بڑے زبان داں تھے اور لکھنؤ کے مرثیہ گویوں میں ایک خاص درجۂ امتیاز ان کو حاصل تھا۔ ان کے مرثیے نہایت فصیح و بلیغ اور زور دار ہوتے ہیں۔ ان کے مرثیوں میں مثل پیارے صاحب رشید کے بہار و ساقی نامہ وغیرہ نہیں ہوتا۔ وہ مرثیت کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ سنہ ۱۳۳۴ھ میں بعمر ۷۵ سال انتقال کیا۔

جلیس سید ابو محمد عرف ابو صاحب جلیس میر انیس کے صاحبزادے پیارے صاحب رشید کے شاگرد تھے۔ ہونہار شخص تھے مگر افسوس ہے کہ جوانی میں سنہ ۳۲۵ء میں انتقال کیا۔ مرثیہ اور غزل کہتے تھے۔ بالفعل اس خاندان میں دولہا صاحب عروج (میر نفیس کے صاحبزادے) اور فائق (عارف کے صاحبزادے اور قدیم (سلیس کے صاحبزادے) موجود ہیں اور اپنے کلام سے اہل لکھنؤ اور دیگر شائقین کلام کلام کو مستفیض اور محظوظ کرتے ہیں۔

سید میرزا انس کا خاندان یہ خاندان بھی لکھنؤ کے مرثیہ گویوں کا ایک مشہور خاندان ہے اس کے بھی مختصر حالات ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

سید میرزا انس سید محمد میرزا انس سید علی میرزا کے صاحبزادے اور سید ذوالفقار علی میرزا کے پوتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں مگر اب تک ان کا کلام چھپا نہیں اور ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔ ہر اتوار کو اس زمانے کے بڑے بڑے شاعر

مثل قلق، بحر، اسیر، امیر، تلو، عرش وغیرہ کے بلا ناغہ ان کے مکان پر جمع ہوتے تھے۔ اور شعر و شاعری کے تذکرے رہتے تھے۔ نوابی میں سو روپیہ ماہوار ان کو خزانۂ شاہی سے ملتا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اُنسؔ نے نواب منور الدولہ کی سفارش سے نواب ملکہ جہاں کی سرکار میں بحیثیت داروغہ ملازمت کر لی تھی اور بہت عزت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ۱۲۷۵ھ میں نواب کلب علی خاں والی رامپور نے اُنسؔ کو طلب کیا اور اپنے اُستاد منشی امیر احمد صاحب مینائیؔ کو اُن کے لینے کے واسطے لکھنؤ بھیجا۔ اُنسؔ رامپور گئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے قیام کے بعد پھر لکھنؤ واپس آئے جہاں ۱۳۰۲ھ میں بعمر ۹۵ سال قضا کی۔ چونکہ ان کا کلام چھپا نہیں لہٰذا اس کے متعلق کوئی رائے نہیں ظاہر کی جا سکتی۔ صرف اتنا کہہ سکتے ہیں۔ کہ ناسخؔ کے شاگرد اور کہنہ مشق شاعر[1] تھے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے۔ رشکؔ۔ تعشقؔ۔ صبرؔ۔ صابرؔ اور عاشقؔ۔

عشقؔ حسین مرزا عشقؔ، معروف بہ میر عشقؔ، اپنے زمانے کے نامی مرثیہ گو اور انیسؔ و دبیرؔ کے ہم عصر تھے۔ یہ بھی مثل انہیں استادوں کے مرثیہ کے اُستاد مانے جاتے ہیں اور ان کا کلام بہت اعلیٰ درجہ کا اور بے عیب ہے۔ سچ پوچھیے تو کلام کی عمدگی کے اعتبار سے ان کی شہرت کم ہے۔ ان کے پوتے عسکری مرزا مؤدبؔ[2] جو اپنے چچا رشیدؔ کے شاگرد ہیں اب بھی موجود ہیں اور مرثیہ اچھا کہتے ہیں۔

تعشقؔ سید[3] میرزا تعشقؔ مرثیہ اور غزل دونوں کے اُستاد تھے۔ لکھنؤ میں سید صاحب

---

[1] وصیت کے مطابق دیوان نہیں چھپ سکا۔ مہذبؔ صاحب نے دور تعشق میں کچھ اشعار نقل کیے ہیں۔ فاضل

[2] مؤدبؔ صاحب نے ۱۹۵۱ء کے بعد لکھنؤ ہی میں رحلت کی۔ تاریخ وفات اس وقت نہیں مل رہی۔ فاضل

[3] ولادت ۱۲۳۹ھ ۲۴ رمضان ۱۳۰۹ھ بروز شنبہ انتقال کیا۔ مہذبؔ صاحب نے دور تعشق لکھا۔ فاضل

سید مرزا تعشق لکھنوی

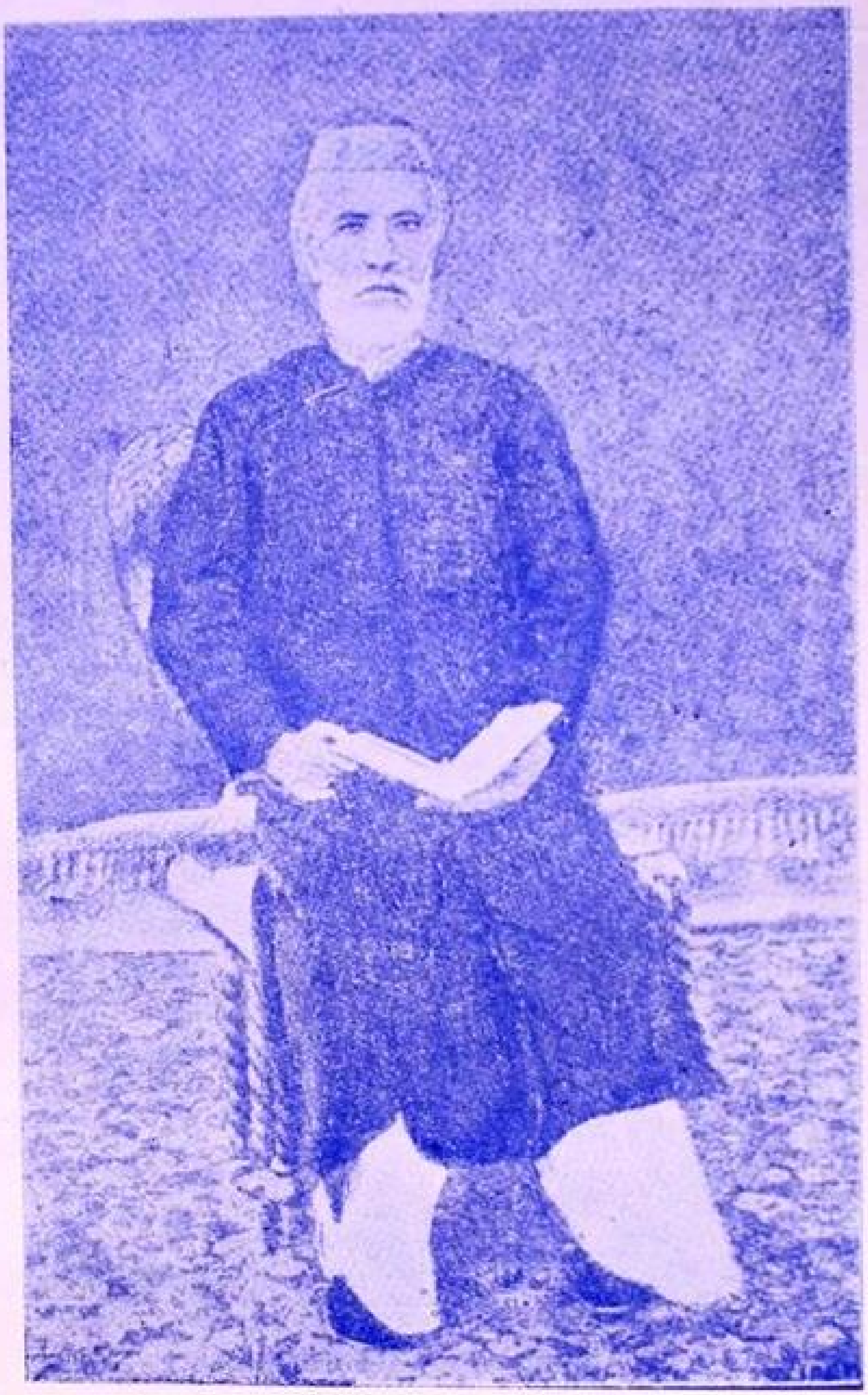

پیارے صاحب رشید

کے لقب سے مشہور رہیں۔ ایک عرصۂ دراز تک کربلا میں قیام کیا اور بعد اپنے بڑے بھائی میر عشق کے انتقال کے وہاں سے واپس آئے۔ مرثیہ اور غزل دونوں خوب کہتے تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ اور ان کا کلام جذبات، حسن بندش، نزاکت خیال اور تاثر کے لیے مشہور ہے۔ بعض لوگ تو ان کی نسبت بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ ایک فطری شاعر تھے اور ان کے کلام میں بہت سوز و گداز اور تاثیر ہے اور ان کا مرتبہ اپنے زمانے کے شعرا میں بہت بلند ہے۔

میر انیس ان کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے اور انہیں کی صحبت سے یہ برابر فیض یاب رہے۔ ۱۳۰۹ھ میں بعمر ۷۰ سال انتقال کیا۔

احمد میرزا صابر یہ اپنے مشہور بیٹے پیارے صاحب رشید کی وجہ سے قابل ذکر ہیں۔ ان کی شادی میر انیس مرحوم کی دختر سے ہوئی تھی جس سے دو مشہور خاندانوں کا اتحاد ہو گیا۔ یہ واجد علی شاہ کے وظیفہ خوار اور نواب ملکہ جہاں کے یہاں داروغہ تھے۔ واجد علی شاہ ان کو بہت مانتے تھے اور ان کو محل شاہی نواب زہرہ محل کی ڈیوڑھی کا داروغہ کر دیا تھا۔ جو منظوم خطوط بادشاہ اپنی محبوب بیوی کے نام بھیجتے تھے ان کے جوابات اسی طریقہ کی نظم میں ان کی طرف سے یہ قلم بند کرتے تھے ۷۲ سال کی عمر میں ۱۳۱۱ھ میں انتقال کیا۔

پیارے صاحب رشید سید مصطفےٰ میرزا معروف بہ پیارے صاحب المتخلص بہ رشید ۱۲۶۳ھ میں پیدا ہوئے اور ضروریات زمانہ کے مطابق تعلیم پائی۔ ان کی شادی میر عسکری رئیس خلف میر انیس کی صاحبزادی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اپنا کلام اپنے چچا میر عشق کو دکھلاتے اور کبھی کبھی میر انیس سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ عشق کے بعد اپنے چچا تعشق سے مشورۂ سخن کیا اور سچ پوچھیے تو انہیں کا رنگ ان کی غزلوں اور مرثیوں پر زیادہ غالب ہے۔ رشید کی توجہ زیادہ تر زبان پر تھی اور اس میں وہ اپنے

اُستاد انیسؔ کے قدم بقدم چلتے تھے۔ مرثیے غزلیں، سلام، رُباعیاں بکثرت لکھیں۔ کبھی کبھی قصیدے بھی کہے۔ ان کی غزلوں میں سلاست زبان، حلاوت اور پابندی محاورہ کا بہت خیال ہے۔ مگر جدّت خیال اور تاثیر کم ہے۔ ان کو فارسی ترکیبیں زیادہ پسند نہ تھیں۔ سلاموں میں غزلیت کا رنگ زیادہ ہے مگر رُباعیاں کثرت سے ہیں اور واقعی بہت عمدہ ہیں۔ علی الخصوص وہ رُباعیاں جو بڑھاپے پر لکھی ہیں بہت مؤثر اور دلچسپ ہیں۔ رشیدؔ بحیثیت مرثیہ گو کے زیادہ مشہور ہیں۔ مرثیہ میں انہوں نے دو نئی چیزیں یعنی ساقی نامہ اور بہار اضافہ کیں جس سے مرثیہ کی ادبی شان اور بڑھ گئی اور نفس مرثیہ میں کوئی خلل بھی نہیں آیا۔ کیونکہ ایسے اشعار حسب موقع وہ رکھتے ہیں۔ ان سے بیشتر بھی اکثر استادانِ فن اس قسم کے اشعار مرثیوں میں کہہ گئے ہیں مگر رشیدؔ نے اُن کو ایک ممتاز جگہ دی اور طول دے کر لکھا۔ ۱۸۹۲ء میں نواب رامپور نے رشیدؔ کو بُلایا تھا۔ رشیدؔ پٹنہ عظیم آباد بھی گئے تھے جہاں ان کی بڑی قدر اور خاطر و مدارت ہوئی۔ نواب بہرام الدولہ کے اصرار سے حیدرآباد دکن کا سفر کیا جہاں حضور نظام نے ان کا مرثیہ سُنا اور بہت پسند کیا۔ اسی طرح کلکتہ اور دیگر مقامات میں بھی سفر کا اتفاق ہوا تھا۔ رشیدؔ کا انتقال بعمر ۷۸ سال ۱۳۳۶ھ میں ہوا۔ اپنے بعد بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں سے مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں۔ سید باقر صاحب حمیدؔ (یہ ان کے بھائی تھے اور ۱۳۳۹ھ میں انتقال کیا) مؤدبؔ، پروفیسر ناصری، جلیسؔ مرحوم، اشہرؔ (مؤلف حیات رشید) شدیدؔ، ناظمؔ، فرہادؔ وغیرہ۔

پیارے صاحب رشیدؔ لکھنؤ کی ادبی دنیا میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے اور زبان کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ غزل اور دونوں خوب کہتے تھے۔

خاندانِ دبیر مرزا اوج مرزا دبیر کے صاحبزادے مرزا محمد جعفرؒ اوج اپنے والد کے تتبع اور انہیں کے رنگ میں کہتے تھے۔ ان کی بھی پٹنہ، حیدر آباد اور رامپور وغیرہ میں بڑی شہرت تھی اور ان سب مقامات سے ان کی حسب لیاقت خدمت کی جاتی تھی۔ مرزا اوج بھی مثل اپنے پدر بزرگوار کے بہت بڑے زباندان اور عروض کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک رسالہ بھی انھوں نے اس فن میں لکھا ہے۔ خسرو دکن نے ان کو بھی سُنا ہے

نعت نعت اس نظم کو کہتے ہیں جس میں پیغمبرِ اسلام کی مدح میں اشعار کہے جائیں۔ بہت سے شاعر گزرے ہیں جنہوں نے اس صنف نظم میں بہت کچھ کہا ہے۔ مگر ان سب میں امیر مینائی اور محسن کاکوروی بہت مشہور ہیں۔

سلہ اوج نے ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء اور ان کے فرزند جناب محمد طاہر رفیع نے ۲۷ر جنوری ۱۹۴۸ء مطابق ۱۴ر صفر ۱۳۶۷ھ میں رحلت کی اور ان کے بیٹے جناب ذاکر باپ کے سامنے جوان مرے۔ دبیر کے نام لیوا اور اوج کے شاگرد جناب خبیر نے ۱۷ر جون ۱۹۶۵ء میں رحلت کی۔ فاضل

باب ۱۱

نظیر اکبر آبادی اور شاہ نصیر دہلوی

نظیر اکبر آبادی ان کا تعلق کسی خاص دور سے نہیں ہے اور ان کا کلام بھی ایک خاص رنگ رکھتا ہے۔ لہذا ان کا ذکر علیحدہ کیا جاتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی بعہد محمد شاہ ثانی تقریباً اُس زمانے میں پیدا ہوئے جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا۔ اس وجہ سے وہ میر و سودا اور دیگر قدیم شعرائے دہلی کے معاصر کہے جا سکتے ہیں۔ مگر چونکہ عمر زیادہ پائی تھی۔ اس وجہ سے انشا جرأت اور ناسخ تک کا زمانہ دیکھا۔ یہ ان کی خصوصیت ہے کہ بسبب اپنی طویل عمر کے مختلف عہد کے شعراء ان کی نظر سے گذرے۔ ان کا طرز کلام بھی ایک عجیب رنگ رکھتا ہے۔ قدما میں ان کا شمار اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ ان کا اکثر کلام زمانہ حال کا معلوم ہوتا ہے۔ متوسطین شعرائے دہلی میں بھی یہ نہیں لیے جا سکتے۔ اس وجہ سے ان کے کلام میں بہت آزادہ روی ہے اور ان کے اور ان کے مضامین اور انداز میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لکھنؤ کا قدیم طرز تو ان میں چھو نہیں گیا ہے۔

کیونکہ ان میں بوٹ اور رنگینی جو طرز لکھنؤ کی خاص پہچان ہے مطلق نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح دورِ جدید کے شعرائے دہلی مثلاً غالب، ذوق اور مومن وغیرہ سے بھی یہ بالکل علیحدہ ہیں اس وجہ سے ان کے یہاں سادگی ہے اور فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کا ان کو مثل ان کے مطلق شوق نہیں ہے۔

نظیر کا نام[1] ولی محمد اور ان کے باپ کا نام محمد فاروق تھا۔ نظیر کی ولادت شہر دہلی میں ہوئی چونکہ اپنے باپ کی بارہ[2] اولادوں میں سے صرف یہی بچے تھے لہذا باپ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت نظیر اپنی ماں اور نانی کو لے کر آگرہ چلے گئے۔ جہاں محلہ تاج گنج میں جو تاج محل کے قریب واقع ہے، سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کی شادی ایک عورت مسماۃ تہور بیگم دختر محمد رحمٰن سے ہوئی تھی جن سے ایک لڑکا خلیفہ گلزار علی اور ایک لڑکی امامی بیگم تھیں۔ نظیر فارسی کی معمولی قابلیت کے علاوہ تھوڑی بہت عربی بھی جانتے تھے اور فن خوش نویسی سے واقف تھے جس کا اس زمانے میں بہت چرچا تھا۔ نظیر کی طبیعت میں آسودگی اور قناعت اس درجہ تھی کہ انہوں نے حسب الطلب نواب سعادت علی خاں لکھنؤ آنے سے اور اسی طرح بھرت پور کے جانے سے بھی انکار کر دیا۔ اوائل عمر میں متھرا گئے تھے جہاں کسی جگہ معلمی کی نوکری کر لی تھی۔ مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد آگرہ واپس آگئے اور یہاں لالہ بلاس رام کے لڑکے کو بمشاہرہ سترہ روپیہ ماہوار پڑھایا کرتے تھے۔

آخری عمر میں مرض فالج میں مبتلا ہو گئے تھے اور اسی مرض میں بہت کبر سنی کی حالت میں ۱۶۔ اگست سنہ ۱۸۳۰ء میں انتقال کیا جیسا کہ ان کے شاگرد کی تاریخ سے

[1] سنہ ۱۷۳۵ء مطابق سنہ ۱۱۴۸ھ دلی میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۸۳۰ء مطابق سنہ ۱۲۴۶ھ میں فوت ہوئے۔ فاضل۔

معلوم ہوتا[1] ہے۔ لائل صاحب ۱۸۳۲ء اُن کا سنہ وفات بتاتے ہیں۔ مگر کوئی سند نہیں دیتے۔

نظیر بہت صحبت پسند آدمی تھے اور مختلف قسم کے لوگوں کی سوسائٹی میں ملتے جلتے رہتے۔ اسی وجہ سے اُن کا تجربہ بہت وسیع تھا۔ جس سے انہوں نے اپنے اشعار میں بہت بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کو گانے سے، کسرت سے اور سیر تماشے سے بہت شوق تھا۔ نہایت حلیم الطبع منکسر المزاج، اور اسی کے ساتھ نہایت ظریف اور بامذاق واقع ہوئے تھے۔ کسی طرح کا تعصّب اور خود بینی اُن کے مزاج میں نہ تھی۔ ہندو مسلمان سب اُن کو مانتے۔ اور سب ان سے محبت رکھتے تھے۔

جوانی میں البتہ بہت رنگین مزاج تھے اور عشق و عاشقی کا ذوق رکھتے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر کلام میں ان کے فواحش ہیں وہ اسی دور کی یادگار ہے۔ مشہور ہے کہ ایک رنڈی سے جس کا نام موتی تھا، اُن سے تعلق تھا اور آزادانہ زندگی شاید اسی زمانے میں بسر کرتے ہوں گے۔ اس زندگی کی جو جیتی جاگتی تصویریں ان کے کلام میں موجود ہیں وہ یقیناً اُسی عہد کی یادگار ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو فواحش کو مستثنیٰ کر کے ان میں بیشتر مرقعے اس سوسائٹی کے ہیں جس میں وہ اُس ملتے جلتے تھے۔ مگر بڑھاپے میں یہ باتیں سب بدل گئی تھیں۔ گذشتہ گناہوں سے توبہ کر کے وہ ایک صوفی صافی ہو گئے تھے۔ اس زمانے کا ان کا کلام نہایت قابل قدر اور پُر اثر ہے۔

---

[1] وہ مصرع تاریخ یہ ہے ع مخمس بے سروپا۔ بیت بے دل۔ فرد بے سرشدہ

خ + م + ب + ت + ر + د

۶۰۰ ۴۰ ۲ ۴۰۰ ۲۰۰ ۴ ۱۲۴۶ھ

بہت پرگو شاعر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دو لاکھ سے زیادہ شعر کہے تھے مگر وہ سب کلام تلف ہو گیا بالفعل جس قدر موجود ہے۔ اس کی تعداد تقریباً چھ ہزار سے زیادہ نہ ہو گی، اور یہ لالہ بلاس رام کی کاپیوں سے نقل کر کے لیا گیا ہے کیونکہ خود ان کو اپنے کلام کے محفوظ رکھنے کی مطلق پروا نہ تھی۔

نظیر بحیثیت واعظ و ناصح اگر نظیر کے کلام میں سے ان کے معمولی اشعار نکال ڈالے جائیں تو ان کا شمار بڑے بڑے فلسفیوں اور ناصح شعرا میں ہو سکتا ہے۔ ان کے اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ولی کامل دنیا و مافیہا کی بے ثباتی اور بے حقیقی پر پُر زور لکچر دے رہا ہے اور ایک دوسری زندگی کی تعلیم ہم کو دیتا ہے۔ جو رذائل اور معائب سے بالکل پاک ہے۔ ان کی دس گیارہ ایسی دلچسپ اور مؤثر نظمیں ہیں[1] جن کے اکثر اشعار فقیر اور سادھو لوگ خوش الحانی سے پڑھ پڑھ کر ہمارے دلوں کو بے تاب کرتے ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں وہ "دنیا ہیچ ست و کار دنیا ہمہ ہیچ" کے پوری طرح سے قائل ہیں۔ وہ خیر و خیرات کے بہت معترف ہیں اور دنیا کو مزرع آخرت سمجھتے ہیں۔ ان کی تمثیلیں بہت اعلیٰ اور دل کش ہوتی ہیں۔ اُن کی نظم "موت پہ" اور "بنجارہ نامہ" مغرور اور سرکش لوگوں کے لیے ایک تازیانۂ عبرت ہے اور ان کو آگاہ کرتا ہے کہ دنیا دارِ فانی ہے اس کو چھوڑو اور عاقبت کی فکر کرو۔ نظیر کا مقابلہ اس معنی میں شیخ سعدی سے خوب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دونوں کا کلام صاف اور سلیس اور دونوں میں تصوف کا رنگ ہے۔ دونوں عاشقانہ رنگ کے اُستاد اور دونوں اپنی اپنی جگہ پہ اور اپنے اپنے رنگ میں نصیحت گو بھی ہیں۔ نظیر چونکہ صوفی مشرب آدمی تھے لہذا ان کی تمام

[1] مثلاً زر کی محبت جو تجھے تڑپائے گی بابا" یا "ٹک مار اجل کا آپہنچا ٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا" وغیرہ

مذہبی جھگڑوں اور مناقشوں اور نیز مذہبی پابندیوں سے بالکل بے تعلق تھی ان کی صوفیانہ نظمیں بہت ہی اعلےٰ درجہ کی ہیں اور اس حیثیت سے ان کا مقابلہ کسی دوسری زبان کے بہتر سے بہتر اخلاقی شاعر سے ہو سکتا ہے وہ "الوحدۃ فی الکثرۃ" کے دل سے قائل اور ع "یا مسلماں اللہ اللہ یا برہمن رام رام" کے پورے عامل تھے اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان دونوں ان سے دلی محبت رکھتے اور ان کو اپنا مرشد اور گرو سمجھتے تھے چنانچہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے جنازہ کے ساتھ ہزارہا ہندو شریک تھے اور اپنی رسم رواج کے مطابق نہایت ادب اور احترام سے اس کو لے گئے۔ نظیر مثل گرونانک کے ایسے تارک الدنیا فقیروں اور سادھوؤں کے خاص شاعر تھے جو لوگوں کو ترک ماسوا اللہ کا سبق دیتے ہیں۔ انگریزی شعراء میں یہی حال ورڈس ورتھ کا ہے جس کی سانٹ (غزل) "دنیا ہمارے ساتھ بہت ہے" بہت مشہور ہے۔ نظیر کی وسیع النظری، آزاد خیالی، ہمہ گیری اور بے تعصبی، ایسی خصوصیات ہیں جو ان کے کلام کو تمام دوسرے شعراء کے کلام سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے۔

نظیر بحیثیت حقیقی ہندوستانی شاعر کے

نظیر کی ہمدردی و محبت بنی نوع انسان کے ساتھ محدود نہیں ہے بلکہ وہ حیوانات اور بے جان اشیاء سے بھی ایک خاص اُنس و محبت رکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں جانوروں کے متعلق مثلاً "ریچھ کا بچہ" "گلہری کا بچہ"، "جنگ جانوراں"، "ہرن کا بچہ"، "بلبلوں کی لڑائی" وغیرہ اسی قدر دلچسپ ہیں اور اس قدر جزئیات سے مملو ہیں کہ پڑھنے والے کو ان کی عام واقفیت اور ہمہ دانی پہ تعجب ہوتا ہے۔ اسی طرح چھوٹے بچے ان کی نظمیں مثلاً "کبوتر بازی"، "پتنگ بازی"، "تربوز"، ع "کیا وقت تھا وہ جب تھے ہم دودھ کے چھوڑے" ع "کیا دن تھے وہ بھی یارو جب ہم تھے بھولے بھالے"، "ہولی"، "دیوالی"، "بسنت"، "عید" وغیرہ کو پڑھ کر

یا غ بلاغ ہوتے ہیں۔ نظیر زندگی کے تمام لطفوں اور حظوں سے خوب بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ وہ ہندو مسلمانوں کے تہواروں میں شریک ہوتے اور ان کے میلے ٹھیلوں کی بہت سیر کرتے تھے۔ انہیں سیر تماشوں میں ان کا پائے تہذیب کبھی پھسل جاتا ہے۔ اور بے تکان وہ اُڑانے لگتے ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ انہیں چیزوں سے وہ مفید مطلب اور اخلاقی نتائج بھی نکالتے ہیں اور بقول شیکسپیر پتھر سے وعظ سُنتے ہیں اور ہر چیز میں اچھائی دیکھتے۔" یہ ان کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے دنیا کے مختلف اشغال اور کھیل تماشوں کا حال اس مزے سے اور ایسے جوش مُسرّت کے ساتھ لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ بچّوں کی طرح وہ خود ان سب میں شریک ہیں پھر معمولی معمولی چیزوں کو ایسی دلچسپ تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ بغیر تعریف کیے رہا نہیں جاتا۔ اُنکی معلومات غیر محدود، اُن کا خزانۂ لغات غیر مختتم، اور ان کی صفائی بیان دلکش ہے۔ ان کے مزاج میں جو مذہبی تعصب اور اور ناروا داری نہ تھی۔ بلکہ کٹّڑپن کو وہ نہایت نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اسی وجہ سے وہ ہندوؤں سے بہت خلط ملط رکھتے تھے اور ان کے رسم و رواج، اُن کی زبان، اُن کے خیالات، ان کے تہوار اور ان کے معتقدات تک کو ایسے دلچسپ طریقہ سے اور اس قدر صحت کے ساتھ بیان کر گئے ہیں کہ ہم کو ان کی ہمہ دانی پر تعجب معلوم ہوتا ہے۔ وہ دوسرے مذہب کی چیزوں کے ساتھ کبھی تمسخر نہیں کرتے اور نہ ان کو حقارت کے ساتھ دیکھتے ہیں اسی سے اُن کے کلام میں ایک مقامی رنگ ہے جو اکثر ہمارے شعرائے اُردو میں کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ البتہ کہیں کہیں سودا اور انشاء کے کلام میں اس کا پتہ چلتا ہے۔ نظیر ایک خالص ہندوستانی شاعر تھے کیونکہ ان کے خیالات، ان کی زبان، ان کے مضامین سب مقامی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ان کی خدمت زبان کے ساتھ	اُن کی خدمت زبان کے ساتھ بہت قابل قدر ہے۔

انہوں نے ایسے الفاظ سے بہت فائدہ اٹھایا جن کو شعراء ادنے اور بازاری سمجھ کے چھوڑ دیتے ہیں۔ چونکہ ایسے الفاظ مروجہ مضامین شعر سے میل نہیں کھاتے اس وجہ سے عام شعرا ان کو معمولی اور سوقیانہ سمجھ کے ترک کرتے ہیں اور شعر میں ان کو داخل کرنا خلاف شان سمجھتے ہیں۔ نظیر نے کمال کیا کہ ایسے ہی الفاظ کو اپنے اشعار میں جگہ دی اور دنیا کو دکھلایا کہ ان میں وہ خوبیاں چھپی ہوئی ہیں جن کو ظاہر بین نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔ البتہ اس میں بھی شک نہیں کہ اس قسم کے سب الفاظ اس عزت کے مستحق نہیں تھے جو ان کو حاصل ہوئی مگر بہت سی چیزیں باوجود مخالفت اور احتیاط کے بھی ادبی دنیا میں داخل ہو گئیں۔ نظیر کی مستعملہ لغات تین قسموں پر تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

(۱) ایسے الفاظ جو اُن کے ابتدائی رنگ کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور اب بالکل خلاف تہذیب سمجھے جاتے ہیں۔

(۲) ایسے الفاظ جو معمولاً اُردو شاعری کے مایۂ بساط ہیں۔

(۳) وہ جواہر ریزے جن سے حسن شعر بڑھ جاتا ہے۔ اور خزانۂ زبان مالا مال ہو جاتا ہے۔

نظیر پر بحیثیت شاعر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے بلکہ ایک معمولی غلط گو شاعر تھے اور اپنے اشعار سے بازاری لوگوں کا دل خوش کیا کرتے تھے۔ ان کا کلام غیر مہذب بلکہ فحش درجہ تک پہنچ جاتا ہے اور انہوں نے اپنے عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ کی آمیزش سے ہماری زبان کو غارت کر دیا۔ ان الزامات کے متعلق ہم آگے لکھیں گے مگر بالفعل مختصر طور پر اتنا کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو چیز نظیر کی خامی اور کمزوری سمجھی جاتی ہے وہی ہماری رائے میں فی الحقیقت ان کی بڑی خصوصیت اور صفت ہے۔ مثلاً وہ ایسی معمولی چیزیں اور مناظر (میلے ٹھیلے وغیرہ)

جن کو عام لوگ بہت پسند کرتے ہیں دیکھنے کے بہت شائق تھے اور ان کے بیان کے لیے ان کو عام فہم اور سیدھے سادے الفاظ کی ضرورت تھی لہٰذا اُن کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ عوام الناس کے خیالات و جذبات اور ان کی بول چال کو خود انہیں کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو فلسفیانہ نظر سے یا دُور سے کھڑے ہو کر بطور تماشہ کے دیکھنا نہیں چاہتے نہ ان میں کوئی نقص یا اعتراض نکالنا چاہتے ہیں بلکہ ان کا سچا فوٹو من و عن کھینچ دیتے ہیں وہ ایسے منظروں اور مجمعوں کو حکیمانہ یا جارحانہ نظر سے نہیں دیکھتے اسی وجہ سے ان کا بیان ان چیزوں کا نہایت دلچسپ اور نیچرل ہوتا ہے۔ تصنع اور بناوٹ ان کے کلام میں مطلق نہیں ہوتی (حالی نے شاید اسی کثرتِ الفاظ کے لحاظ سے نظیر کو میر انیس پر ترجیح دی ہے)۔ نظیر ایسے موقعوں پر کوئی نکتہ چینی نہیں کرنا چاہتے بلکہ خود ان میں شریک ہو کر ان سے لُطف اُٹھانا چاہتے ہیں۔ انکی یہ بھی خصوصیت ہے کہ جس طرح کسی کی ہجو نہیں کہی اسی طرح کسی کی تعریف میں کوئی قصیدہ بھی نہیں لکھا۔ یہ دونوں باتیں ہمارے نزدیک ان کے کلام کا بڑا جوہر ہیں اور ان لغزشوں کی تلافی کر دیتی ہیں جو ابتدائے عمر میں ان سے سرزد ہوئی ہوں گی۔

نظیر جدید رنگ کے پیشرو تھے

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ زمانۂ موجودہ کی فطری اور قومی شاعری، جس کی ابتدا مولانا آزاد اور حالی وغیرہ سے کہی جاتی ہے۔ اُس کے پیشرو بلکہ موجد نظیر اکبر آبادی کہے جا سکتے ہیں۔ جس طرح انیس اور دبیر نے فاضلانہ قابلیت کے ساتھ مناظر جنگ اور مناظر قدرت کے بے مثل مرقعے اپنے اشعار میں دکھائے ہیں۔ اسی طرح نظیر نے بھی معمولی معمولی چیزوں کی ہو بہو تصویریں، جن کی گنجایش شعر میں مطلق نہ تھی۔ سیدھے سادے مؤثر الفاظ میں کھینچ دی ہیں، جس سے ان کا کلام عوام الناس میں بہت مقبول ہے۔ اس مقبولیت کی ایک وجہ

یہ بھی ہے کہ فارسی کے دقیق لفظ اور ترکیبیں اور پیچیدہ تشبیہیں اور استعارے ان کے کلام میں کہیں نہیں۔ ان کی تحریر سادہ اور بے تکلّف، اور ان کا بیان صاف اور اصلیت کے مطابق ہوتا ہے مگر مجرد نیچر کی پرستش سے وہ ناواقف ہیں، جنگلوں اور پہاڑی چوٹیوں کا حال ان کے یہاں نہیں ہے۔ قدرتی مناظر کا فوٹو وہ صرف اسی حالت میں کھینچتے ہیں۔ جب ان مناظر کا تعلق انسان سے ہوتا ہے، مثلاً باغوں میں روضۂ تاج گنج کو انہوں نے منتخب کیا۔ ان کی نظمیں برخلاف معمولی اُردو نظموں کے مسلسل ہوتی ہیں۔ ان کے کلام میں وہ وسیع النظری اور گہرائی نہیں ہے جو متاخرین شعرائے دہلی کے کلام میں ہے۔ غرضکہ اپنے سادہ بیان سے اپنے بے تکلّف مگر پُر زور الفاظ سے، اپنے عام دلچسپی کے مضامین سے اپنے دل کش اشعار سے جن میں تصنع اور یک رنگی کا نام نہیں۔ نظیر اکبر آبادی ایک ایسے طرز کی بناء ڈال گئے جو آگے چل کر ہماری زبان اور ادب کی ترقی بلکہ ہمارے قومی احساس کے از سرِ نو زندگی کا بہت بڑا باعث ہوا۔

> نظیر کا ظریفانہ رنگ، اُن کا مقابلہ انشا کے ساتھ

نظیر کا ظریفانہ رنگ خاص ہے اور عجیب قسم کا ہے، اس رنگ کی ترقی کا باعث ان کا عام لوگوں کے ساتھ میل جول اور ربط ضبط ہے۔ چونکہ وہ عام لوگوں سے بے تکلفانہ اور مساویانہ ملتے تھے۔ اور ان کے شادی و غم میں برابر شریک رہتے تھے لہٰذا ان کی فطرت انسانی کے مطالعہ کا خوب موقع ملتا تھا اور معلومات کے ساتھ اُن کی خوش طبعی اور ظرافت میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ وہ افلاس اور مصیبت کی تکلیفوں کو نہایت تحمّل اور خندہ پیشانی سے برداشت کرتے اور لطمہائے حوادث کو اپنے مذاق میں اڑا دیتے تھے۔ اُن کی ظرافت نہ تکلیف دہ ہے نہ اس میں شہد پن ہوتا ہے۔ نظیر اور انشا دونوں اپنے

اپنے رنگ میں ظرافت کے اُستاد تھے. مگر ان دونوں کی ظرافتوں میں فرق ہے. انشا کی ظرافت ایک ایسے درباری کی ظرافت ہے جو پُر مذاق باتوں سے اپنے مالک کو خوش کرنا چاہتا ہے اور اس کوشش میں وہ بھانڈوں کی طرح اپنی اور دوسروں کی بے عزتی کی بھی مطلق پروا نہیں کرتا. ہر چیز کو اپنے آقا کی خوشنودی مزاج پر وہ قربان کر دیتا ہے. نظیر ایک آزاد ظریف ہے جو اپنی بامذاق باتوں سے کسی کو رنج دینا نہیں چاہتا نہ کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے اور سب کو خوش رکھتا ہے. مختصر یہ کہ انشار کی ظرافت میں خوشامد اور پھبتی کی بُو آتی ہے اور نظیر ان عیوب سے پاک ہے. باوجود اس کے انشا اور نظیر میں کئی باتوں میں مماثلت بھی ہے. دونوں شاعروں نے مشکل ردیف اور قافیوں میں طبع آزمائی کی ہے. اور بعض غزلیں ہم طرح بھی کہی ہیں، دونوں عربی مصرعے اشعار میں کامیابی کے ساتھ موزوں کرتے ہیں. دونوں کے کلام میں مقامی رنگ یعنی ہندی الفاظ اور ہندی رسم و رواج وغیرہ کثرت سے ہیں. دونوں نے مختلف زبانوں میں شعر کہے، دونوں کے کلام میں تصوّف کا سُنہرا رنگ جلوہ گر ہے. زبان کے بارے میں دونوں آزاد ہیں مگر فارسی اور عربی الفاظ صحت کے ساتھ استعمال کرنے میں انشا مشّاق ہیں. اور بمقابلہ نظیر کے اُن کے یہاں متروکات کم ہیں. اور ان کی ظرافت کا رنگ بہت زیادہ گہرا ہے.

نظیر بحیثیت مُصوّر کے چونکہ نظیر کو فنِ موسیقی سے بہت شوق تھا اس لئے ان کو انتخاب الفاظ میں اس فن سے بہت مدد ملی. وہ ایک آرٹسٹ اور بہت بڑے مرقع نگار ہیں. ان کو اپنے اشعار کے واسطے انتخاب الفاظ میں وہی انہماک تھا جو انگریزی شاعر ٹینیسن کو تھا. وہ صنعت تجنیس کے بہت شائق ہیں اور اکثر ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کی آواز سے اظہار مطلب ہو جاتا ہے مثلاً لڑائی بھڑائی

کے موقع پر وہ ثقیل حروف لاتے ہیں۔ شادی و مسرت کی محفلوں اور تہواروں کے بیان میں انہیں کے مناسب سُریلے اور دل کش الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ دور از کار تشبیہات ان کے کلام میں کم ہیں اور دیگر صنائع بدائع بھی نہایت اعتدال سے ہیں۔ اور آورد وغیرہ سے ان کا کلام پاک ہے۔

اُردو کا شکسپیئر ہمارا کون شاعر ہو سکتا ہے

یہ سوال بہت دل چسپ ہے کہ اُردو کا شیکسپیئر ہمارا کون شاعر ہے۔ اصل یہ ہے کہ ڈراما کا وجود اہلِ عجم میں تھا ہی نہیں اور نہ ہمارے اُردو شعراء نے اُس کو سنسکرت سے اخذ کیا۔ سوداؔ اپنی اعلیٰ درجہ کی طباعی، اپنی زبردست شخصیت اپنی عام واقفیت اور قدرتِ زبان کی وجہ سے ضرور قابلِ لحاظ ہیں۔ انہوں نے بے مثل ہجویں لکھی ہیں اور اسی وجہ سے وہ ایک زبردست کمیڈی نگار ہو سکتے تھے۔ مگر اُن میں ٹریجڈی لکھنے کا مادّہ یعنی فطرت انسانی کے ساتھ ہمدردی اور اس کا وسیع علم بہت محدود ہے۔ میرؔ کی حالت یہ ہے کہ سوز و گداز تو ان کے یہاں بدرجۂ اتم ہے مگر کیرکٹر نویسی سے وہ ناواقف ہیں۔ سوائے غزل اور مثنوی کے دیگر اصنافِ سخن اور نیز دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ان کی واقفیت بہت محدود ہے۔ انشاؔ کے یہاں تمسخر اور ظرافت کی بہتات ہے اور وہ اپنی قوتِ نقالی اور قدرت زبان کی وجہ سے خود ایکٹر بننے کے لئے زیادہ موزوں تھے۔ مگر ان کے درباری تعلق نے ان کو ایک دوسری راہ پر لگا دیا اور تعمق خیال بھی ان میں بہت کم ہے۔ انیس و دبیر فطری شاعر تھے۔ زبان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی۔ کیرکٹر نویسی کے بھی مشّاق تھے۔ مگر اُن کا دائرۂ عمل محدود ہے۔ یعنی وہ محض مرثیہ نگار رہے۔ اور یہ تخصیص ان کے واسطے قوّت اور کمزوری دونوں کا باعث تھی۔ ایرانی پیشن پلے (یعنی تعزیہ داری وغیرہ) جس کا مقابلہ مریکل (معجزات) کے ڈراما اور مسٹری (مذہبی اسرار) کے ڈراما سے

قریب تر ہیں اور یہی انیسؔ و دبیرؔ کے موضوع ہیں۔ لیکن اُس مذہبی جوش سے جو ان کی نظموں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ معمولی معمولی کیفیات و جذبات انسانی نظر انداز ہوتے رہے۔ نظیرؔ کو بھی مثل سوداؔ، انشاؔ اور انیسؔ کے زبان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی، اُس کی خصائل انسانی کی معلومات اکثر مشاہیر شعراء سے بڑھی ہوئی تھی وہ ہندو اور مسلمان بچے اور بوڑھے، امیر و غریب، خواص و عوام دنیا دار اور تارک الدنیا سب سے ملتا جلتا تھا۔ اور سب کا دوست اور بہی خواہ تھا۔ عورتوں کا علم بھی اُس کو کافی تھا۔ گو اس کے یہاں ایسے مرقعے جیسے شیکسپیئر کے یہاں 'ایموجن، ڈسڈیمونا، پورشیا اور افیلیا کے ہیں، موجود نہیں ہیں جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہماری ہندوستانی سوسائٹی میں پردہ کا رواج ہے اور عورتیں آزادی کے ساتھ مردوں سے نہیں مل سکتیں، اور اسی وجہ سے نظیرؔ کو عورتوں سے ملنے اور اُن ان کے خیالات اور جذبات دریافت کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ان کو صرف شاہدان بازاری کا تجربہ ہوا لہٰذا اس کے اشعار میں اسی مخصوص جماعت کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔ اس کو کیرکٹر نگاری کا بڑا ملکہ تھا اور قوت بیانیہ بھی بڑے غضب کی پائی تھی مگر شیکسپیئر کی طرح اُس کے خیالات میں عمق نہیں ہے۔ اور نہ شیکسپیئر کی ایسی اعلیٰ درجہ کی ذہانت اُس میں ہے۔ اس کی دو۲ نظمیں ایسی ہیں جن میں ڈراما کی کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ گو وہ پوری طرح ڈراما نہیں کہی جا سکتیں۔ ایک "لیلےٰ مجنوں" جو ٹریجڈی ہے اور دوسری "مہادیو کا بیاہ" جو اپنے انبساطی رنگ کی وجہ سے کمیڈی کہے جانے کی مستحق ہے۔ اسی طرح اس کی نظمیں "ریچھ کا بچہ" اور "بلبلوں کی لڑائی" نہایت مزے کی اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ (نظیرؔ میں سوداؔ کا زور، میرؔ کی بلند پروازی، انشاؔ کی ظرافت، انیسؔ و دبیرؔ کا جوش و خروش نہیں ہے مگر یہ سب صفات اس میں ایک حد تک ضرور پائی جاتی ہیں۔

نظیر کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ معمولی چیزوں کے بیان میں ایسی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے جو دوسروں کے یہاں اعلٰے مضامین میں بھی نہیں پائی جاتی۔ جب غزل کی یک رنگی اور قصیدہ کی لفاظی سے جی اکتا جاتا ہے تو نظیر کے اس قسم کے مضامین بہت پسند آتے ہیں۔ اس نے شعر میں نئے نئے مضامین اختیار کیے اور ادب اردو کو بہت وسعت دی۔ یہ سچ ہے کہ وہ کوئی فاضل شاعر نہیں اور نہ وہ کیفیت اشیاء کو فلسفیانہ طریقہ سے یا بہت گہرائی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ فحش بھی کہہ جاتا ہے اور ایسے موقعوں پر اس کی صاف بیانی سے تہذیب کے دل کو چوٹ لگتی ہے۔ وہ بڑے پایہ کا شاعر بھی نہ سہی۔ اور اس کے کلام میں بعض جگہ متروکات و اغلاط بھی ضرور ہیں۔ زبان اور خیالات بھی بہت شستہ و رفتہ نہیں۔ مگر باایں‌ہمہ وہ ایک خالص ہندوستانی شاعر ہے اور ہندوستانی مضامین پر لکھتا ہے۔ ہندوستانی جذبات اس کے دل میں جوش زن ہیں اور وہ مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بالکل پاک و صاف ہے۔ اپنے تنوع مضامین، اپنی ناصحانہ روش، اپنی وسیع النظری، اپنی ہر طبقہ کے ساتھ دلچسپی، اپنی خالص ہندوستانیت، اور علی الخصوص ایک جدید رنگ کی ایجاد کے سبب سے نظیر پوری طرح اس کا مستحق ہے کہ اس کو شعرائے اردو کی محفل میں ایک ممتاز جگہ دی جائے۔

شاہ نصیر دہلوی متوفی ۱۸۳۰ء

شاہ نصیر کا شمار مثل نظیر اکبرآبادی کے زبان اور زمانہ دونوں اعتبار سے طبقہ متقدمین میں کیا جا سکتا ہے مگر ان کو شہرت شعرائے متوسطین کے زمانہ میں حاصل ہوئی۔ اس لیے ان کو دور متقدمین و متوسطین کے بیچ کی کڑی سمجھنا چاہیے۔ نصیر الدین نام نصیر تخلص، اپنے سیاہ رنگ کی

وجہ سے میاں کلو کے عرف سے مشہور تھے۔ شاہ غریب کے بیٹے دلی کے رہنے والے تھے۔ باپ ایک گوشہ نشین فقیر تھے اور آمدنی چند مواضعات جاگیر سے ہوتی تھی اُس پر بسر اوقات تھی۔ ہر چند کہ غریب باپ نے تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی مگر نصیر کو سوائے شاعری کے اور کچھ نہ آیا۔ شاعری کی طرف اُن کا رجحان بچپن سے تھا۔ شاہ محمدی مائل کے شاگرد ہو گئے جو شیخ قیام الدین قائم سے اصلاح لیتے تھے اور اس نسبت سے شاہ نصیر کو سودا اور خواجہ میر درد سے بھی ایک تعلق شاگردی پیدا ہو گیا تھا۔ خاندانی وجاہت اور نیز شاعری کی وجہ سے شاہ عالم کے دربار میں نصیر کی رسائی ہو گئی۔ جہاں ان کی قدر دانی خوب ہوتی تھی۔ اور انعام و اکرام سے بھی سرفراز ہوتے تھے۔ شاہ نصیر نے سفر بہت کیے اور اکثر شہروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا علی الخصوص لکھنؤ اور حیدر آباد متعدد مرتبہ گئے تھے۔ اپنے وطن دہلی میں اپنے مکان پر اکثر مشاعرے کرتے تھے جن میں اُس زمانہ کے مشہور شعراء جمع ہوتے تھے ایسے ہی مجلسوں میں اُن کے شاگرد ذوق کو اپنی ابتدائی بلند پروازیوں کے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملتا تھا۔

جب دلی میں تباہی آئی اور شعراء ادھر اُدھر منتشر ہونے لگے۔ تو شاہ نصیر بھی ہراول ڈھونڈھنے باہر نکلے۔ دو مرتبہ لکھنؤ آئے اور چار مرتبہ حیدرآباد گئے۔ لکھنؤ میں جب یہ پہلی مرتبہ پہنچے تو مصحفی، انشاء اور جرأت کا زمانہ تھا۔ جن سے خوب خوب مقابلے رہے۔ دوسری مرتبہ ناسخ اور آتش کا آوازۂ سخن بلند ہو رہا تھا۔ ناسخ سے بھی ان کے مقابلے ہوئے اور یہ کامیاب ہوئے۔ حیدرآباد

لہ دیکھیے "بدن اُس رخ تھا" چمن اس رخ تھا" والی غزل مصحفی کے حالات میں اور اسی طرح میں شاہ نصیر کی غزل اُن کے حالات میں آب حیات ۱۲ سے ۔ دیکھیے نٹ نوٹ آئندہ تحریر پر۔

جانے کی یہ تقریب ہوئی کہ دیوان چندولال جو شاداںؔ تخلص کرتے تھے اور اہلِ کمال خصوصاً شعرائے دہلی کے بڑے قدردان تھے۔ ان کی داد و دہش کا شہرہ سُن کر یہ وہاں پہنچے۔ مشہور ہے کہ دیوان موصوف نے ذوقؔ اور ناسخؔ کو بھی حیدرآباد بُلا بھیجا تھا مگر انہوں نے انکار کیا۔ شاہ نصیرؔ نے اپنے حیدرآباد کے قیام میں بہت سے شاگرد جمع کر لیے اور ان کے سبب سے وہاں بازار شاعری بہت گرم ہو گیا تھا۔ بالآخر چوتھی مرتبہ جب وہ حیدرآباد گئے تو چند روز قیام کر کے ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں وہیں انتقال کیا[۱]

تصانیف شاہ نصیرؔ ایک پُرگو شاعر تھے۔ ساٹھ برس تک مشغلۂ شعر میں منہمک رہے۔ اس طویل مدت میں ایسے ذہین و ذکی شخص نے جو اس قدر شاعری کا دلدادہ ہو، کیا کچھ نہ کہا ہو گا۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا اکثر کلام تلف ہو گیا۔ اس لئے کہ ان کو کلام کے جمع کرنے اور حفاظت سے رکھنے کی عادت نہ تھی ان کے ایک شاگرد مہاراج سنگھ نے ان کا کچھ کلام بصورت دیوان کے جمع کیا۔ جس میں تقریباً ایک لاکھ شعر کہے جاتے ہیں۔ مگر بعض اصحاب تذکرہ لکھتے ہیں۔ کہ ان کے دیوان کی ترتیب میر عبدالرحمٰن خلف میر حسین تسکینؔ شاگرد مومنؔ نے کی تھی۔ جس کا ایک قلمی نسخہ نواب صاحب رامپور نے اپنے کتب خانہ کے لیے خرید لیا تھا۔

شاہ نصیرؔ نہایت متین و مہذب مگر اس کے ساتھ ہی بڑے بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ سینکڑوں شاگرد دہلی لکھنؤ اور حیدرآباد میں چھوڑے۔

تذکرۂ گل رعنا میں لکھا ہے کہ آپ کی مرتبہ جیسی ان کی قدر ہونا چاہیے تھی نہیں ہوئی ۱۲۔

[۱] قاضی مخدوم موسیٰ کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔ ایک شاگرد نے "چراغ گل" کے الفاظ سے تاریخ نکالی (آب حیات ذکر شاہ نصیرؔ) ۱۲۔

حنفی المذہب تھے مگر تعصب مطلق نہیں رکھتے تھے۔ آخر آخر میں اپنے مایہ ناز شاگرد ذوق سے چشمک ہو گئی تھی۔ کیونکہ کثرت مشق نے ذوق کے دل میں ایک قسم کی انانیت پیدا کر دی تھی۔ اور وہ سودا و میر ایسے باکمالوں کی برابری کا دعویٰ کرنے لگے تھے۔

ان کا مرتبہ شاعری میں

شاہ نصیر کی خصوصیت یہ ہے کہ سنگلاخ زمینوں اور مشکل مشکل ردیف و قافیہ میں غزلیں کہتے تھے جن میں اچھے شعر نکالنا ہر کسی کا کام نہیں۔ مثلاً

شب کو کیوں کر تجھ کو ہے پھبتا سر پر طرہ ہار گلے میں
جوں پھولن والی مہ تھا سر پر طرہ ہار گلے میں

بادہ کشی کے سیکھلاتے ہیں کیا ہی قرینے ساون بھادوں
کیفیت سے ہم نے جو دیکھا دو ہیں مہینے ساون بھادوں

دقت نماز ہے اُن کا قامت گاہ خدنگ و گاہ کماں
بن جاتے ہیں اہل عبادت گاہ خدنگ و گاہ کماں

ولہ

خال پشت لب شیریں ہے عسل کی مکھی
روح فرہاد پیٹ بن کے جبل کی مکھی

شکوہ الفاظ کے بھی عاشق تھے۔ ان کے بعض استعارات اور تشبیہیں بہت نادر اور دلچسپ ہوتے ہیں[1]۔ مثل صائب کے متالیہ اور اخلاقی مضامین

---

[1] دیکھیے فٹ نوٹ آخرہ صفحہ ۳۶۰ پر۔

بھی خوب باندھتے ہیں۔ فی البدیہہ کہنے میں بھی مشّاق تھے۔ علمی استعداد کم رکھتے تھے اور کہیں کہیں متروک الفاظ بھی نظم کر گئے ہیں۔ گو کہ کلام میں زور و اثر ہے مگر بلند پروازی اور اعلیٰ خیالات کم ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعراء میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں البتہ اپنے زمانہ کے استاد تھے اور صدہا لائق شاگرد چھوڑ گئے۔

سلہ مثلاً۔ دیہات، جاگیر کے تعلق سے ایک دفعہ تحصیلدار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے، اور کچھ رنگترے دلّی سے بطور سوغات ساتھ لے گئے۔ تحصیلدار نے کہا کہ جناب شاہ صاحب! رنگتروں کی تکلیف کیا ضرور تھی۔ آپ کی طرف سے بڑا تحفہ آپ کا کلام ہے۔ ان رنگتروں کی حسنِ تشبیہ میں کوئی شعر ارشاد فرمائیے۔ اسی وقت رباعی کہی اور سنائی ؎

اے نیّرِ برجِ آسمانِ اقبال — ان رنگتروں پر غور سے کیجیے گا خیال
یہ نذرِ حقیر ہو قبولِ خاطر — پردہ میں شفق کے ہیں گرہ بند ہلال

(آبِ حیات ذکر شاہ نصیر)

نظیر اکبر آبادی

مومن دہلوی

باب ۱۲

طبقۂ متوسطین شعرائے دہلی

ذوق و غالب کا زمانہ

دلی کی شاعری کا دوبارہ عروج

دلی کا از سرِ نو پھر عروج ہوا۔ صفحات گذشتہ میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اردو شاعری کا مرکز ترقی دلی سے لکھنؤ منتقل ہو کر آگیا تھا لیکن قدما کی تخم ریزی بے کار نہیں گئی۔ ان کی کوششیں سرسبز ہوئیں اور وہ درخت جس کو دلی کے قدیم شاعروں نے بڑی کدوکاوش سے سینچا تھا۔ اب وہ نئے سرے سے پھلنا شروع ہوا۔ دنیا میں مد و جزر، ترقی و تنزل اور تنزل و ترقی کا قاعدہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے یہی دلی کا بھی حال ہوا۔ تھوڑے سے عرصہ کی خاموشی کے بعد شاعری دہلی کی بلبل ہزار داستان نے پھر نغمہ سرائی شروع کی۔ اور تمام اردو داں پبلک کو اپنی خوش نوائیوں کا گرویدہ بنا لیا۔ غالب، ظفر، ذوق، مومن وغیرہ اس دور کے نامی گرامی شعرا ہیں۔ غالب کی خداداد ذہانت اور طباعی کا مقابلہ تو دنیا کے بہترین شعراء سے کیا جا سکتا ہے۔ ذوق، مومن گو کہ غالب کے مقابلہ میں نہیں چمک سکتے تھے مگر پھر بھی اپنے معاصرین میں بہت نمایاں درجہ رکھتے تھے بلکہ بعض کوئی معمولی

درجہ کے شاعر نہ تھے اور چونکہ مشاغل حکمرانی کی زیادہ فکر نہیں رکھتے تھے۔اس لیے شعر کے مشغلہ سے دِل بہلاتے رہتے تھے، وہ ذوق و غالب کے شاگرد تھے۔ اس زمانہ کے شعرائے دہلی جدید طرز لکھنؤ کے بالکل متبع نہ تھے جہاں تصنع تکلف اور رعایت لفظی وغیرہ شاعری کی جان سمجھی جاتی تھی۔ ان کا کلام حقیقی شاعری اور صحیح جذبات سے مملو ہے۔ غالب اور مومن کے یہاں فارسی الفاظ و محاورات کثرت سے ہیں اس وجہ سے کہ وہ فارسی کے بڑے زبان داں اور شاعر تھے۔ ان حضرات کے ابتدائی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قدما کی سیدھی سادی ہندی ترکیبیں نکال کر اُن کی جگہ فارسی الفاظ رکھ دیے ہیں۔ اس زمانہ کا اُن کا کلام محض فارسی الفاظ کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ ہندی لفظ اور محاورے یہ اُسی وقت استعمال کرتے تھے کہ جب وہ کسی فارسی لفظ یا ترکیب کے ساتھ میل کھاتے تھے اور کلام کا حُسن بڑھاتے تھے۔ مومن اور غالب کے بعد غلبہ فارسی میں ایک معتدبہ کمی واقع ہوئی۔ جملوں کی ترکیبیں سہل ہوگئیں۔ شعروں میں صفائی اور روانی پیدا ہوئی۔ اسی وجہ سے غالب و مومن کے شاگردوں کا کلام بہت صاف ہے۔ مثال کے لیے حالیؔ، سالکؔ، ظہیرؔ، انورؔ، اور مجروحؔ کے کلام کو دیکھنا چاہیے۔

مومن ۱۲۱۵ھ لغایت ۱۲۶۸ھ
مطابق ۱۸۰۰ع لغایت ۱۸۵۱ع

حکیم مومن خاں حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے۔ ان کے دادا حکیم نامدار خاں جن کی اصل نجباۓ کشمیر سے تھی۔ سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے اور شاہ عالم کے زمانہ میں چند مواضعات جاگیر میں پائے۔ جب سرکار انگریزی کی حکومت ہوئی ان کی پنشن مقرر ہوگئی جس کا کچھ حصہ مومن خاں کو بھی ملتا تھا۔ مومن خاں کی ولادت ۱۲۱۵ھ میں ہوئی۔ بچپن ہی سے ذہانت اور طباعی اور شعر کہنے

کی استعداد ان میں موجود تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا۔ جو بات سُنتے تھے فوراً یاد ہو جاتی تھی۔ عربی و فارسی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ فن طب جو ان کا موروثی پیشہ تھا اپنے باپ اور چچا سے حاصل کیا۔ شاعری کے علاوہ نجوم میں بھی انہوں نے کمال حاصل کیا تھا اور ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ ان کے احکام (پیشین گوئیاں) سُن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ اکثر احکام کے صحیح ہونے کے سبب سے لوگ اُن کے بڑے معتقد تھے اور اکثر آیندہ کی باتیں ان سے دریافت کیا کرتے تھے۔ شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی۔ اور دلّی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ مگر ان تمام مشاغل اور فنون کو انہوں نے ذریعہ معاش نہیں بنایا تھا۔ آدمی بہت خوبصورت، خوش وضع اور عاشق مزاج تھے۔ عشق بازی کے لیے دلّی ایسا وسیع شہر پایا تھا۔ جہاں اُن کے عشق و محبت کے افسانے لوگوں کے زبان زد تھے۔ جب جوانی کی ہوس ناکی ختم ہو گئی تو انہوں نے تمام بُری باتوں سے توبہ کر لی تھی۔ اور نماز روزہ کے سختی سے پابند ہو گئے تھے۔ جو کلام اُن کی جوانی اور آزادہ روی کے زمانہ کا ہے۔ وہ عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مگر آخر عمر میں کلام میں بہت پختگی اور متانت آگئی تھی۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ مگر چند روز کے بعد ان سے اصلاح لینی چھوڑ دی۔ اور اپنی ہی ذہانت اور طباعی پہ بھروسہ رکھتے تھے۔ دلّی سے پانچ مرتبہ باہر نکلے اور رامپور۔ سہسوان۔ جہانگیر آباد اور مہاران پور کی سیر کی چنانچہ کہتے ہیں ؎

دلّی سے رامپور میں لایا جنوں کا عشق ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم
چھٹ دلّی کو سہسوان آیا ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

مگر وطن کی محبت نے پھر اپنی طرف جلد بلا لیا۔ جب مرزا غالب نے ۱۸۴۲ء میں

دلّی کالج کی پرشین پروفیسری قبول کرنے سے انکار کیا تھا تو ٹامسن صاحب نے یہی جگہ بمشاہرہ اسّی روپیہ ماہوار اس شرط پر کہ باہر جائیں مومن خاں کو دینی چاہی مگر انہوں نے باہر جانے سے انکار کیا۔ اسی طرح کپورتھلہ بھی بمشاہرہ تین سو پچاس پر نہ گئے۔ کیونکہ سن لیا تھا کہ وہاں ایک گویّے کی یہی تنخواہ ہے۔ نواب وزیرالدولہ بہادر والیٔ ٹونک نے ایک مرتبہ اُن کو بُلا بھیجا اور اپنے پاس رکھنا چاہا مگر انہوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ ٹونک میں دلّی کی پُرلطف صحبتیں کہاں میسّر ہوں گی۔ مومن خاں نہایت آزاد مزاج قانع اور وطن دوست تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی درباداری اور خوشامد سے ان کو سخت نفرت اور عار تھا۔ یہی ان کے کیرکٹر کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ ان کا دیوان اُمراء کے مدحیہ قصائد سے خالی ہے۔ سوائے اس قصیدہ کے جس کا مطلع ہے۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری ۔۔۔ کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمعِ خاوری

یہ قصیدہ بطور اظہار شکریہ کے راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ کی شان میں لکھا تھا۔ جنہوں نے اُن کو ایک ہتھنی بطور تحفہ کے دی تھی۔

اپنی قابلیت اور جوہر ذاتی کا حکیم مومن خاں صاحب کو اس درجہ خیال تھا کہ اُس کے مقابلہ میں لوگوں کی فصاحت و بلاغت وا ہیچ سمجھتے تھے مشہور ہے کہ گلستان سعدی کو بھی ایک معمولی کتاب کہتے تھے۔ جب سعدی کی نسبت ان کا ایسا خیال تھا تو اپنے معاصرین ذوق و غالب کو کیا خطرہ میں لاتے۔ اُن کے کلام کو نگاہ حقارت سے دیکھتے اور ان کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ تاریخ گوئی میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ تاریخ میں تخرجہ اور تعمیہ بُرا سمجھا جاتا ہے مگر اُن کی طبع رسا نے اس کو محسنات میں داخل کر دیا تھا۔ تاریخیں نئے نئے طریقہ سے نکالتے تھے مثلاً اپنی صغیر سن بیٹی کی تاریخ وفات کہی ہے

خاک بر فرق دولت دنیا من فشاندم خزانہ بر سر خاک

اس میں "خزانہ" کے اعداد سرِ خاک یعنی (خ) کے اعداد کے ساتھ ملائے سے ۱۲۶۳ نکلتے ہیں ایک بیٹی کی ولادت کی تاریخ اس طرح کہی ہے

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے کہی تاریخ دختر مومن

"دختر مومن" کے اعداد سے "نال" کے اعداد خارج کرنے سے تاریخ نکل آتی ہے۔ اسی طرح شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث دہلوی کی وفات کی تاریخ عجیب طریقہ سے نکالی ہے ہے

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہوگئے فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

اس میں دوسرے مصرعہ کے الفاظ کے صرف بیچ کے حروف سے مادہ تاریخ نکالا ہے۔

تصانیف تصانیف میں ایک دیوان جس میں چھ مثنویاں شامل ہیں یادگار چھوڑا دیوان میں جمیع اصناف سخن جو شعرائے اُردو کو مطبوع ہیں بکثرت موجود ہیں۔ دیوان کی ترتیب اُن کے مشہور شاگرد نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے کی تھی اور ۱۸۴۶ء میں مولوی کریم الدین صاحب مؤلف تذکرۂ شعرائے ہند نے اُس کو شایع کیا۔

رنگ کلام مومن خاں کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرۂ آفاق ہے۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں اور کلام میں ایک خصوصیت پیدا کر دیتے ہیں اُس میں بلند پروازی کے ساتھ صحیح جذبات نگاری کا جوہر بھی ہے اور یہی چیز اُن طرز لکھنؤ سے علیحدہ کر دیتی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے وہ اُستاد کامل ہیں۔ ان کی علمی لیاقت اور طباعی ان کو معمولی پامال مضامین سے بچاتی ہے۔ مثل غالب کے وہ بھی کلام میں فارسیت کے بہت دلدادہ ہیں کیونکہ فارسی میں اُن کو

بھی وہی تبحر حاصل تھا۔ بعض وقت یہ غرابت کی کثرت اچھی نہیں معلوم ہوتی اور کو سخت اور گنجلک کر دیتی ہے۔ اُن کی مثنویاں سر تیز نشتر ہیں۔ جن میں حرماں نصیب عاشق کے سوز محبت کا اظہار ہے۔ وہ جذبات سے بھری ہوئی ہیں اور مضطرب دلوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ یہ ان میں کمی ہے کہ عشق بازاری ہے اور طرز ادا بلند نہیں ہے۔ اس معنی میں وہ طلسم الفت اور زہر عشق وغیرہ کے رنگ کی کہی جا سکتی ہیں۔ مومن کے یہاں الفاظ کا طلسم ہے اور اسی لفظی ہیر پھیر سے تخیل کے نئے راستے کھل جاتے ہیں۔ مثالاً چند شعر درج ہیں :۔

روز جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

پس شکستن خم زجر محتسب معقول گناہ گار نے سمجھا گنہ گار مجھے

نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف خون فرہاد سر گردن فرہاد رہا

کیوں غش ہوئے دیکھ آئینہ کو کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم

آئینۂ زنگ غم نے توڑا کیونکر اُسے منہ دکھائیں گے ہم

مومن کا مرتبہ بحیثیت شاعر مومن شعرائے اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ نہ صرف اپنی ذہانت اور طباعی اور دل فریب شاعری کی وجہ سے۔ یا اس لیے کہ اُن کے معاصرین اُن کی بڑی قدر کرتے تھے بلکہ اس وجہ سے وہ ایک صاحب طرز ہیں جن کے پیرو نسیم دہلوی۔ منشی امیر اللہ تسلیم۔ حسرت موہانی وغیرہ ایسے نام بر آوردہ لوگ ہیں مومن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں :۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ صاحب دیوان و تذکرۂ گلشن بے خار۔ میر حسین تسکین میر غلام علی وحشت۔ اصغر علی خاں نسیم وغیرہ۔ مومن کا انتقال ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء کوٹھے سے گر کر ہوا۔ انہوں نے حکم لگایا تھا کہ پانچ دن یا پانچ مہینے یا پانچ برس میں مر جاؤں گا۔ چنانچہ پانچ مہینے کے بعد مر گئے۔ گرنے کی تاریخ خود کہی تھی۔

دستِ بازو بہ شکست

چونکہ اسی سال انتقال ہو گیا تھا۔ لہٰذا یہی تاریخ ان کے مرنے کی سمجھنا چاہیے۔

شیفتہ	١٢٢١ھ / ١٨٠٦ء
لغایت	١٢٨٦ھ / ١٨٦٩ء

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ خلف الصدق نواب مرتضیٰ خاں جنہوں نے لارڈ لیک کے ساتھ رہ کر بڑے بڑے کام کیے تھے اور اس کے صلے میں ہوڈل پلول کا علاقہ جاگیر میں پایا تھا۔ علاقہ جہانگیر آباد واقع ضلع بلند شہر خود نواب مصطفٰے خاں صاحب نے خرید کیا جو اب تک ان کی اولاد کے قبضہ میں ہے۔ نواب صاحب موصوف کی ولادت ١٢٢١ھ مطابق ١٨٠٦ء میں دہلی میں ہوئی اور غدر ۱۸۵۷ء تک وہیں قیام رہا۔ اس کے بعد اپنے علاقے جہانگیر آباد میں قیام گزیں ہوئے۔ نواب صاحب کو شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی۔ پُر گو شاعر تھے۔ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلّص کرتے تھے مشہور ہے کہ فارسی میں غالب سے اور اُردو میں مومن سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ شاید واقعہ یہ ہو کہ پہلے اپنا کلام مومن کو دکھاتے ہوں اور اُن کے بعد غالب سے جو اُن کے بہت بڑے دوست تھے، رجوع کی ہو۔ شیفتہ کی قابلیت کا نشو و نما۔ علم و فن اور شعر و سخن کے ایسے جمگھٹے میں ہوا، جس میں مولوی امام بخش صہبائی، عبد اللہ خاں علوی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ۔ غالب۔ ذوق۔ شاہ نصیر، احسان، تسکین۔ حکیم آغا جان عیش وغیرہ شریک تھے۔ مفتی صدر الدین خاں اور خود نواب صاحب کے یہاں ہفتہ ہفتہ باری باری سے مشاعرہ ہوتا تھا۔ اہلِ کمال اس میں جمع ہو کر لطفِ سخن اُٹھاتے تھے۔ نواب صاحب کی سخن فہمی کی اتنی شہرت تھی۔ کہ غالب ایسا صاحب کمال اپنے اشعار کی اچھائی اور بُرائی کی کسوٹی نواب صاحب کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے اور کہتا ہے۔

غالب بفن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفٰے خاں خوش نکرد

ایک دوسری جگہ ان کی طباعی اور ذہانت کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

غالبؔ ز حسرتی چہ سرائیم کہ در غزل — چوں او تلاشِ معنیٔ و مضمون نکردہ کس

نواب صاحب کو سفر حج کے بعد سے شعر گوئی سے ایک بے توجہی سی ہو گئی۔ کبھی احباب کے اصرار سے کچھ کہہ لیتے تو کہہ لیتے۔ زیادہ وقت اپنا طاعت و عبادت اور اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے اور تمام منہیات سے تائب ہو گئے تھے۔ تصانیف میں ایک فارسی دیوان ایک اردو دیوان۔ ایک مجموعہ انشائے فارسی جو فارسی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک سفرنامہ موسوم بہ ترغیب السالک الیٰ احسن المسالک، جس کا فارسی نام رہ آورد ہے اور ایک مبسوط تذکرہ شعرائے اردو کا زبان فارسی میں مشہور بہ گلشنِ بے خار ان کی یادگار ہیں۔

شیفتہ بہ نسبت شاعر کے ناقد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ اپنے زمانہ میں بھی ان کو یہی شہرت حاصل تھی اور اردو اور فارسی شاعری کے اعلےٰ درجہ کے نقاد اور سخن سنج سمجھے جاتے تھے۔ ان کا تذکرہ گلشنِ بے خار ایک مبسوط اور مشہور تصنیف ہے اور ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے۔ اردو میں شیفتہ اپنے اُستاد مومنؔ کے پیرو ہیں۔ اُن کا کلام اخلاق تصوّف کے مضامین سے لبریز ہے اُن کے کلام میں وارفتگی مطلق نہیں ہے۔ ان کے اردو اشعار گو بہت اعلےٰ درجہ نہ سہی مگر بلند مضامین۔ صاف اور بامحاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات رکھتے ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں ان کا درجہ ممتاز ہے۔ ان کے صاحبزادے نواب محمد اسحاق خاں نے اردو فارسی کلام مع ایک مفید دیباچہ اور حالات ۱۹۱۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے چھپوا کر شایع کیا۔

تسکینؔ ۱۲۱۸ھ تا ۱۲۶۸ھ — میر حسین تسکینؔ میر احسن عرف میراں صاحب کے بیٹے تھے

دِلّی میں پیدا ہوئے اور مولوی امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھیں۔ شعر و سخن میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر ان کے انتقال کے بعد مومنؔ کے شاگرد ہوئے اور شہرت حاصل کی۔ تلاش معاش میں لکھنؤ اور میرٹھ گئے۔ مگر جب وہاں کچھ مقصد برآری نہ ہوئی تو رامپور آرہے جہاں نواب یوسف علی خاں نے ان کی بڑی قدردانی کی۔ چند روز رامپور میں آرام سے بسر کرکے پچاس برس کے سن میں ۱۲۶۳ھ میں رامپور ہی میں انتقال کیا اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ مومنؔ کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے۔ اپنے اُستاد کے قدم بقدم چلتے ہیں بلکہ کلام میں اس قدر ہم رنگی پیدا ہوگئی ہے کہ اگر دونوں کا کلام مخلوط کر دیا جائے تو تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔ تسکینؔ کے بیٹے میر عبدالرحمٰن آسیؔ رامپور میں نواب کلب علی خاں کے زمانہ تک تھے۔ یہ بھی ایک نامور اردو شاعر تھے۔

نسیم دہلوی
۱۷۹۴ء لغایت ۱۸۶۴ء

مرزا اصغر علی خاں متخلص بہ نسیمؔ نواب آقا علی خاں کے بیٹے تھے۔ دِلّی میں ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پایا۔ ضروریات زمانہ کے موافق تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں سے ناموافقت ہوگئی اور وہ اپنے بڑے بھائی مرزا اکبر علی خاں کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے اور یہیں رہ پڑے۔ بعد کو بھائیوں نے عفو تقصیر کرا کے ملنا چاہا۔ مگر انھوں نے ایک نہ مانا۔ اور پھر دِلّی نہیں گئے تمام عمر لکھنؤ میں فقر و فاقہ کی حالت میں رہے مگر کسی کے سامنے دستِ سوال نہیں پھیلایا۔ بڑے پابند مذہب اور احکامِ قرآنی کے سختی سے عامل تھے غدر کے بعد منشی نول کشور کے مطبع میں الف لیلہ کے منظوم ترجمہ کی خدمت پر مقرر ہوئے ایک جلد ختم کی تھی کہ مطبع کی طرف سے تکمیل کتاب کی جلدی ہوئی جو اُن کو

ناگوار خاطر ہوئی اور وہ علیحدہ ہو گئے۔ ان کے بعد منشی طوطا رام شایاں نے بقیہ کتاب کو پورا کیا۔ تعجب ہے کہ جس وقت لکھنؤ کا طرز زوروں پہ تھا اُسی وقت نسیم دہلوی کو خود اپنے طرز میں لکھنؤ میں بڑی شہرت اور کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ بڑے زود گو تھے مگر اسی کے ساتھ مزاج میں وارستگی اس قدر تھی کہ جو کچھ لکھتے اُس کی نقل اپنے پاس نہیں رکھتے تھے جس کی وجہ سے بہت کچھ کلام تلف ہو گیا۔ اُن کا دیوان ان کے شاگرد حافظ عبد الواحد خاں مالک مطبع مصطفائی نے چھپوا دیا تھا۔ مگر اس کو وہ اپنے لئے ننگ سمجھتے تھے۔ ان کی غزلوں کو مرزا غالب بھی پسند کرتے تھے۔ باوجود دہلوی ہونے اور اپنے شہر کی زبان پہ فخر کرنے اور اس کی سختی کے ساتھ پابندی کے اکثر اہلِ لکھنؤ نسیم کے شاگرد ہوئے۔ جن میں عبد اللہ خاں مہر، منشی اشرف علی اشرف اور منشی امیر اللہ تسلیم مشہور رہیں۔

طرزِ کلام نسیم میں مومن کا رنگ بہت پایا جاتا ہے۔ ان کا نہایت ہی لطیف طرزِ بیان اور نازک خیالی کے ساتھ ملا ہوا ہے جو مومن کا فیض تھا۔ نسیم کو تازگی کلام اور صحت محاورات کا بہت خیال تھا۔ لکھنؤ کی تصنعات اور لفاظی کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں خیال کی دل فریبی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی بہت نمایاں ہے۔ اپنے اُستاد کی طرح وہ بھی فارسی ترکیبیں بہت استعمال کرتے تھے اور نزاکت خیال اور طرزِ بندش اور روانی کلام میں بھی انہیں کے پیرو ہیں۔ نسیم کا مرتبہ شعرائے درجہ دوم میں بہت برتر ہے۔

ذوق سنہ ۱۲۰۴ھ لغایت ۱۲۷۱ھ
مطابق ۱۷۸۹ء لغایت ۱۸۵۴ء

شیخ ابراہیم ذوق ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے جن کو نواب لطف علی خاں رئیس دہلی کی

لہ دیکھیے نٹ نوٹ آیندہ صفحہ ۱۷۳ پر۔

حرم سرا کے کاروبار کی خدمت سپرد تھی۔ گو وہ کسی بڑے گھرانے سے نسبت نہ رکھتے تھے مگر اپنے جوہر ذاتی اور فنی قابلیت سے ہزاروں شریفوں اور عالی خاندانوں سے بڑھ کر مشہور ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ایک شخص حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی جو معمولی درجہ کے شاعر بھی تھے اور جن کے پاس محلے کے اکثر لڑکے پڑھنے آتے تھے۔ حافظ صاحب کو شعر سے بہت شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ انہیں کے ساتھ ہمارے نوعمر ذوقؔ بھی مشاعروں میں جایا کرتے تھے۔ جہاں لوگوں کے اشعار سُن کر ان کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی اور شعر کہنے کا شوق دل میں پیدا ہوتا۔ اس زمانہ میں اچھے اچھے اشعار یاد کر لیتے اور ان کو بار بار پڑھا کرتے تھے اس زمانہ کا کلام حافظ جی ہی کو دکھاتے اور اُن ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ ذوقؔ کے ہم محلّہ اور ہم سبق میر کاظم حسین شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے جن کا اس وقت دلّی میں بڑا شہرہ تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی ذوق کو بھی خیال پیدا ہوا کہ شاہ نصیر کے شاگرد ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور ایک دن میر کاظم حسین کے ساتھ جاکر شاہ صاحب کے شاگرد ہو گئے۔ نوجوان شاگرد کی غیر معمولی ذہانت اور طبّاعی سے تجربہ کار اُستاد کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاگرد اُستاد سے بڑھ جائے۔ اسی خیال سے وہ کبھی ان کی غزلوں کو بغیر اصلاح پھیر دیتے کبھی مُنہ بنا کر کہتے "یہ کچھ نہیں" طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ ادھر ذوقؔ کو ان کے دوستوں نے اُستاد کے خلاف اُبھار دیا غرض کہ انہیں وجوہ سے رشتۂ اُستادی و شاگردی منقطع ہو گیا۔ ذوقؔ اپنے کلام کو بہ نظر اصلاح

بقول آزاد۔ ار ذی الحج ۱۲۰۴ھ۔ بقول بعض بغیر تصریح تاریخ و ماہ ۱۲۰۳ھ۔ اسی کو ترجیح دی گئی ہے۔ وفات چہار شنبہ صفر ۱۲۷۱ھ۔ دیکھیے ہماری کتاب ذوقؔ۔ انتخاب۔ اور ڈاکٹر تنویر کی محققانہ کتاب ذوقؔ۔ فاضل

خود دیکھنے لگے۔ اور اس کی درستی و چستی میں بڑی کد و کاوش کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے کلام نے جلد شہرت حاصل کر لی اور ان کی غزلیں محفلوں اور مجلسوں حتیٰ کہ کوچہ و بازار میں گائی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں مرزا ابو المظفر ولی عہد سلطنت کے یہاں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے اور بسا اوقات غزلیں فی البدیہہ کہی جاتی تھیں جس سے شاعرانہ جودت اور تیز ہوتی تھی اور نو آموز شعرا کا شوق اور زیادہ ہوتا تھا۔ ان مشاعروں میں اکثر پرانے اور کہنہ مشق شاعر مثلاً فراقؔ۔ احسانؔ۔ شکیباؔ۔ قاسمؔ۔ عظیمؔ۔ منتؔ وغیرہ برابر شریک ہوتے تھے۔ انہیں میں بہ توسط میر کاظم حسین بیقرارؔ ذوقؔ کی بھی رسائی ہوئی۔ اتفاق سے اس زمانہ میں شاہ نصیرؔ دلّی چھوڑ کر کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ولی عہد سلطنت ظفرؔ کی غزلوں کی اصلاح میر کاظم حسین کے سپرد تھی۔ اتفاقاً اُن کو بھی بحیثیت میر منشی جان الفنسٹن صاحب کہیں باہر جانا پڑا اور اب اصلاح کا کام ذوقؔ کے سپرد ہو گیا جس کا صلہ چار روپیہ ماہوار بطور مشاہرہ مقرر ہوا۔ یہ تنخواہ گو بہت کم تھی مگر اس کی کمی کی تلافی ان کی قدر و منزلت اور شہرت کی زیادتی سے بخوبی ہو گئی۔ اس وجہ سے کہ اب شہر کے تمام امیر و رئیس اور نیز کہنہ مشق شاعران کو اُستاد ماننے لگے۔ دلّی میں نواب الٰہی بخش خاں متخلص بمعروف (مرزا غالبؔ کے خسر) ایک عالی خاندان امیر تھے۔ اور علوم ضروری سے باخبر ہونے کے علاوہ کہنہ مشق شاعر بھی تھے، پہلے شاہ نصیرؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ جب ذوقؔ کا شہرہ ہوا تو انہیں بھی اشتیاق ہوا اور (بقول مولانا آزادؔ) ذوقؔ کے شاگرد ہو گئے۔ اس وقت ذوقؔ کی عمر تقریباً بیس[۲۲] سال تھی۔ ان دو مشہور آدمیوں کی شاگردی سے نہ صرف ذوقؔ کی شہرت میں اضافہ ہوا بلکہ ان کو اپنے کلام کی پختگی و صفائی کا انتہائی خیال ہوا۔ اور اسی وجہ سے وہ نہایت

عمدہ شعر کہنے لگے اور یہی مشق آیندہ ان کے کام آئی۔ کیونکہ ان کو نواب صاحب کے کلام کی اصلاح میں بڑی کاہش کرنا پڑتی تھی اور ان کی غزلوں کو جو کبھی سودا کبھی جرأت کبھی درد کے طرز میں ہوتی تھیں بڑی دقتِ نظر سے بنانا پڑتا تھا[1]۔

شاہ نصیر سے معرکہ جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو اپنا علمِ استادی پھر بلند کیا۔ ادھر ہونہار اور طبّاع شاگرد کے دل کو بھی اتنے دنوں کی مشق اور کاوش نے اور بڑھا دیا تھا۔ مشکل بحروں اور ردیف قافیوں میں کہتے کہتے بڑی مشّاقی اور روانی پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ نصیر نے دکن میں کسی کی فرمایش سے نو شعر کی ایک غزل کہی تھی جس کی ردیف تھی: "آتش و آب و خاک و باد" وہ غزل دلّی کے مشاعرہ میں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل لکھے اس کو میں استاد مانتا ہوں۔ شاہ صاحب کی مبارزطلبی پر ذوق نے مقابلہ کا بیڑا اٹھا لیا اور ایک غزل اور تین قصیدے لکھ کر تیار کیے۔ شاہ صاحب کو شاگرد کی جرأت و گستاخی بہت ناگوار ہوئی۔ ایک شاگرد سے اعتراض کرایا جس کے جواب میں ذوق نے اکثر اسناد پیش کیے اور اس مقابلہ میں ذوق ہی کو کامیابی ہوئی اس کے بعد سے ان کی استادی مسلّم ہو گئی۔ ان کے اعلیٰ قصائد[2] کے صلہ

[1] مصنف تذکرۂ گلِ رعنا اس معاملہ میں آزاد سے بالکل مختلف رائے رکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "آزاد نے آبِ حیات میں جس طرح سے ظفر مرحوم کی کاوشِ فکر پر پانی پھیرا ہے۔ ان کے (معروضے کے) نتائجِ فکر کو بھی اپنے استاد ذوق کے دامنِ کمال سے وابستہ کیا ہے باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اس وقت چھیاسٹھ برس کی تھی اور ذوق بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہوں گے۔ مگر جوشِ عقیدت میں اس کا خیال نہیں رہا (تذکرۂ گلِ رعنا فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۴)۔ اور نیز نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم نے بھی ایک مضمون میں نہایت مدلّل طریقہ سے آزاد کے اس بیان کی تردید کی ہے۔"

[2] دیکھیے آیندہ صفحہ پر

میں اکبر شاہ ثانی نے اُن کو "خاقانی ہند" کا معزز خطاب عطا کیا تھا۔ جب مرزا ابوالمظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے تو انہوں نے پہلے یہ قصیدہ گزرانا ؎

روکش ترے رُخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگِ شفق　　ہے ذرّہ تیرا پرتو نورِ سحر رنگِ شفق

اِس کے صلہ میں اُن کی تنخواہ چار روپیہ سے پانچ روپیہ ہو گئی اور پانچ سے سات رفتہ رفتہ سو تک اضافہ ہوا تھا اور عید بقرعید کے موقع پر خلعت و انعام سے سرفراز ہوتے تھے۔ آخر ایّام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے۔ جب شفا پائی تو انہوں نے قصیدہ کہہ کر گذرانا[1]۔

واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا　　مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا

اس کے صلہ میں خلعت کے سوا خطاب خان بہادری اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی عنایت ہوا۔ پھر ایک دوسرے قصیدے کے صلے میں ۔

شب کو میں اپنے سرِ بستر خواب راحت　　نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

ایک گاؤں جاگیر میں عنایت ہوا۔ ذوق نے بعمر اسٹھ سال ۱۲۷۱ھ میں انتقال[2] کیا۔ ذوق اپنی تیزی ذہن، براقی طبع اور قوت حافظہ کے لئے مشہور تھے۔ بڑے

مثلاً وہ قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن　　آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

[1] غالباً مرزا غالب نے اسی موقع پر یہ غزل کہی ہو گی جس کا یہ مطلع و مقطع ہے ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی　　کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب　　شاہ دیندار نے شفا پائی

[2] ظفر نے تاریخ کہی

شب چار شنبہ بہ ماہ صفر　　بحکم خدا وند جاں داد ذوق

ظفر روئے اردو بہ ناخن زغم　　خراشید و فرمود اُستاد ذوق ۱۲۷۱ھ

خدا ترس اور ہمدردی انسانی سے لبریز تھے۔ خوف خدا یہ حال تھا کہ کبھی کوئی جانور بلکہ ایک چڑیا تک ہلاک نہیں کی۔ مختلف اذواق سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مثلاً موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ۔ شعر گوئی ان سب پر حاوی تھی اس میں ان کو فنائیت کا مرتبہ حاصل تھا۔ جوں جوں عمر گذرتی گئی ان کی قابلیت اور کمال میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کو فقہ، تصوّف، تفسیر، حدیث۔ تاریخ وغیرہ میں دستگاہ کامل تھی دنیاوی ترقی کے حوصلے ان کو مطلق نہ تھے۔ دلّی سے ان کو اس قدر محبت تھی کہ جب راجہ چندو لال نے جو شاداںؔ تخلّص کرتے تھے اور شعر و شاعری کے بڑے دلدادہ اور شعرا کے مربّی تھے ان کو حیدرآباد بلوا بھیجا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور یہ شعر لکھ کر بھیج دیا ؂

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن ۔۔۔ کون جائے ذوقؔ پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

ایک تنگ گلی کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتے تھے جس میں کوئی زیب و زینت بلکہ آرام و آسایش تک کا سامان مہیّا نہ تھا۔ اُسی مکان میں ہر وقت بند اپنی فکر شعر و سخن میں محو و مستغرق دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہتے تھے۔ احکام قرآنی کے پورے عامل اور نماز روزہ کے سختی سے پابند تھے۔ دن رات میں اکثر اوقات اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے۔

تصانیف ایک ایسے شخص سے جس نے اپنی عمر کے پچاسؔ برس سے زیادہ شعر و سخن کی مشق میں صرف کیے ہوں اور سوائے شعر و سخن کے اُس کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ رہا ہو۔ اُمید کی جا سکتی ہے کہ متعدد دیوان لاکھوں ابیات کے اس نے یادگار چھوڑے ہوں گے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ انہوں نے بہت کچھ لکھا تھا۔ اگر اُن کا سب کلام اس وقت جمع کیا جاتا تو کئی جلدیں تیار ہو تیں۔ مگر افسوس ہے کہ سارا کلام زمانۂ غدر کی لوٹ مار میں ضایع ہو گیا۔ مولوی محمد حسین آزادؔ اُن کے

شاگرد رشید نے اس واقعہ کو نہایت دردناک طریقہ سے اپنی کتاب "آبِ حیات" میں لکھا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ اُن کا جس قدر کلام ہمارے سامنے ہے وہ خود اُن کی اور حافظ غلام رسول ویراؔن کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ذوقؔ غزل اور قصیدہ دونوں کے استادِ کامل تھے۔ جن کی تعداد کافی مقدار میں وہ چھوڑ گئے ہیں۔ آب حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عشقیہ خط بطور مثنوی جس کا نام "نامۂ جہاں سوز" رکھا تھا اور پانچ سو ابیات کے بعد ہنوز ناتمام تھا ایّام غدر کی دستبرد میں ضایع ہو گیا۔ انہوں نے اکثر مخمس رُباعیات اور تاریخیں بھی لکھی تھیں جن میں سے اکثر ضایع ہو گئیں مگر چند دیوان موجودہ میں شامل ہیں۔ اپنے شاگرد رشید ظفرؔ کے واسطے کچھ گیت وغیرہ بھی کہے تھے البتہ سلام اور مرثیہ اور ہجو وغیرہ ان کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔

ذوقؔ کی خدمت زبان کے ساتھ	

ذوقؔ کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے زبان کو خوب صاف کیا اور اس پر جلا دی۔ وہ ایک بہت بڑے صنّاع تھے۔ اور الفاظ کی نشست اور مناسب استعمال سے کماحقہٗ واقف تھے۔ محاورات اور امثال کے استعمال میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ الفاظ کا بر محل استعمال۔ فن عروض سے واقفیت۔ موسیقیت کلام۔ زورِ تخیّل اور بلندی مضامین یہ سب چیزیں مل کر اُن کے کلام کا جوہر اعلےٰ بن گئی ہیں۔ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں لطفِ الفاظ کے ساتھ خوبیِ معنی اس قدر نہیں پائی جاتی۔

اندازِ کلام	

ذوقؔ کی شاعری میں تکلف اور تصنع مطلق نہیں ہے ان کے یہاں تشبیہات

لہ مصنف خمخانۂ جاوید اس سعی میں انورؔ اور ظہیرؔ کو بھی شریک بتاتے ہیں۔ دیکھیے حال انور دہلوی۔ ۱۲ ذوقؔ کے کمالِ کلام کی محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے متعدد شاگردوں نے الگ الگ دیوان مرتب کیے اور چھاپے۔ آزادؔ کا تو یہ حال تھا کہ بھرے گھر سے صرف استاد کا کلام لے کر نکلے۔ فاضل۔

اور استعارات اور دیگر صنایع بدایع نہایت مناسبت سے کالملح فی الطعام استعمال ہوئے جس کی وجہ سے شعر کا حُسن دو بالا ہو جاتا ہے۔ ان کے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر اپنی قابلیت اور علم و فضل کا زبردستی اظہار کرنا چاہتا ہے۔ کلام میں روانی اور ترنّم بہت ہے اعلیٰ تخیّل اور بلندی مضامین کبھی الفاظ کی خوب صورتی اور صرف برمحل کے مزاحم نہیں ہوتے۔ ہر شعر برمحل اور حشو و زوائد سے پاک ہوتا ہے۔ سست اشعار اُن کے دیوان میں نہیں ہیں۔ قوت کلام اور تنوّع مضامین کے اعتبار سے اُن کا مقابلہ سودا سے کیا جا سکتا ہے اور انہیں کے وہ متبع تھے بھی۔ مگر اُن کے یہاں اور اُستادوں کا بھی رنگ موجود ہے۔ مثلاً خواجہ میر درد اور جرأت و مصحفی۔ قصیدہ میں وہ کامل اُستاد مانے گئے اور اپنے تمام معاصرین پر سبقت لے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے اکثر قصائد ضایع ہو گئے مگر جو کچھ ہمارے سامنے ہیں وہ ان کی قادر الکلامی، اعلیٰ تخیّل اور بلند پروازی اور روانی کلام کے بے مثل نمونے ہیں۔ اس صنف میں وہ آپ اپنی نظیر تھے۔ ان کی غزلیں، تازگی مضامین، خوبی محاورہ، سادگی اور صفائی کے لیے مشہور ہیں۔ ان کے کلام میں شاہ نصیر، سودا، درد، مصحفی اور جرأت سب کا رنگ پایا جاتا ہے اسی وجہ سے ان کے کلام کو گلدستہ کلہائے رنگارنگ کہنا بے جا نہیں۔ ان کی وہ غزلیں، جو جرأت کے رنگ میں ہیں مگر جرأت کے عیوب سے پاک ہیں۔ نہایت اعلےٰ درجہ کی ہیں۔ ان کے کلام پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ معائب سے پاک نہیں ہے۔ اور عام لوگوں کے لیے ہے۔ ایسی صورت میں جب اُن کے اکثر معاصرین بڑے بڑے فارسی عربی داں شاعر تھے جن کا کلام معمولی آدمیوں کی سمجھ سے باہر تھا یہ اعتراض بے جا بھی نہیں ہے۔ نازک خیالی اور معانی آفرینی میں اگرچہ وہ غالب سے کم ہوں مگر سادگی اور صفائی اور ترنّم الفاظ کے لحاظ سے وہ اُن سے بڑھے ہوئے ہیں اور قصیدہ میں تو ان سے کہیں زیادہ ہیں مختصر یہ کہ آسمان

شاعری پر ذوق ایک درخشاں تارہ بن کر چمکے اور زبان اردو کے بہترین شعرا میں ان کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

شاگرد ان کے سینکڑوں شاگرد تھے جن میں نواب مرزا خاں داغ۔ ظفر۔ آزاد۔ ظہیر اور انور بہت نامور ہوئے ہیں۔ ان کے ایک بیٹے تھے خلیفہ محمد اسماعیل، جو اُن کے فرزندانِ رُوحانی کی طرح زمانۂ غدر میں دنیا سے اٹھ گئے۔

ظہیر متوفی ۱۹۱۱ء سید ظہیر الدین نام ظہیر تخلّص سید جلال الدین حیدر کے بیٹے دِلّی کے باشندے تھے۔ اُن کے والد ابو المظفر بہادر شاہ کے خوش نویسی میں اُستاد مرصع رقم خان بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔ خود ظہیر بھی کم سنی ہی میں شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے اور راقم الدولہ خطاب اور ایک مرصع دوات انعام میں پائی تھی۔ شعر و سخن سے بچپنے ہی سے شوق تھا۔ چودہ برس کے سن میں اُستاد ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ناچار دِلّی سے نکلنا پڑا۔ جھجر۔ سونی پت۔ نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی آئے اور یہاں سے لکھنؤ کا ارادہ کیا مگر وہاں کے ابتر حالات سُن کے کچھ دنوں بریلی میں رہ کر رام پور چلے گئے۔ وہاں چار برس رہے۔ اس کے بعد دِلّی آئے۔ اور محکمۂ چنگی میں ملازمت مل گئی۔ اُس کے تھوڑے عرصے کے بعد اخبار "جلوۂ طور" کے ایڈیٹر ہو گئے جو بلند شہر سے نکلتا تھا۔ اُن کے مضامین کو مہاراجہ شیو دھان سنگھ والی الور نے پڑھا اور بہت پسند کیا۔ اُن کو

ملہ۔ نواب مرزا عرفیت اور ظہیر کے نام سے شہرت پائی۔ ۷ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ حیدر آباد میں وفات پائی موصوف کی آخری غزل کا یہ شعر بھی یادگار ہے ؎

آتی ہے سانس سانس سے آوازِ الرحیل
باندھو کمر ظہیر کہ سب ہم سفر گئے

قاموس المشاہیر۔ فاضل

الور بلوا بھیجا۔ جہاں یہ چار برس رہے۔ وہاں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو گئے مجبور ہو کر پھر دلّی آئے۔ اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور کے محکمۂ پولیس میں اُن کو ایک معقول جگہ مل گئی جے پور میں کم و بیش اُنیس ۱۹ سال رہے۔ والی ریاست کے مرنے پر اُن تعلق ریاست سے منقطع ہو گیا۔ چند روز پریشانی میں بسر ہوئے تھے کہ نواب محمد علی خاں خلف نواب امیر خاں والی ٹونک نے بُلا بھیجا اور جب تک نواب زندہ رہے یہ بہت عزت و آبرو سے ان کے ساتھ رہے نواب کے مرنے کے بعد ان کے صاحبزادے نواب ابراہیم علی خاں نے اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس طریقہ سے تقریباً پندرہ ۱۵ سولہ ۱۶ برس ٹونک میں رہے۔ آخر عمر میں حیدر آباد جانے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ ٹونک سے رخصت لے کر حیدرآباد گئے۔ جہاں آٹھ مہینے کے قیام کے بعد باریابی ہوئی مگر تنخواہ مقرر ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے ساری امیدوں اور آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا۔ بیکاری کے زمانہ میں جب پریشاں حال ہو گئے تھے تو مہاراجہ سرکشن پرشاد نے ان کی بہت مدد کی تھی۔

ظہیر ایک پُر گو شاعر تھے تصنیفات کا حال یہ ہے کہ ایک دیوان مسمّٰی "گلستانِ سخن" آگرہ میں چھپ گیا ہے۔ دیوان دوم ۲ و سوم ۳ کا حق تصنیف قاضی عبدالکریم مالک مطبع کریمی بمبئی نے خرید لیا تھا اور یہ بھی چھپ گئے ہیں۔ چوتھا دیوان جس میں بقول حسرت موہانی تین ۳ سو غزلوں کے علاوہ بہت سے قصائد اور مسدّس شامل ہیں۔ اُن کے نواسے کے پاس ہے۔

ظہیر اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے۔ گو کہ ذوق کے شاگرد تھے۔ مگر کلام میں مومن خاں کا رنگ زیادہ پایا جاتا ہے۔ جس کا اعتراف بعض غزلوں کے مقطعوں میں خود انہوں نے کیا ہے ؎

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھا جب تک کہ ظہیر
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگِ غزل نے نہ دیا

کیا نباہی طرزِ مومن اے ظہیر
طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم

آخری دور کے بڑے نامور شاعر تھے اور اپنے زمانہ میں زبان اور شاعری دونوں کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ ان کے مشہور شاگرد نجم الدین احمد ثاقب بدایونی ہیں جو پہلوانِ سخن کے لقب سے مشہور ہیں۔

انورؔ سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا متخلص بہ انورؔ ظہیرؔ مذکورۂ بالا کے چھوٹے بھائی تھے اور یہ بھی ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ ذوقؔ کے بعد کلام مرزا غالبؔ کو دکھلاتے تھے۔ نہایت قابل اور ہونہار شاعر تھے مگر افسوس ہے کہ جے پور میں عین جوانی میں بعمر ۳۸ سال انتقال کیا۔ ان کے تمام معاصرین ان کی بڑی عزت اور قدر کرتے تھے۔ اور ان سب مشاعروں میں شریک رہ چکے ہیں جو غدر کے دس سال بعد دِلّی میں ہوا کرتے تھے۔ جن میں داغؔ، حالیؔ، ظہیرؔ، مجروحؔ، سالکؔ، ارشدؔ، مشتاقؔ وغیرہ اپنی لاجواب غزلیں سناتے تھے۔ ان کے دو دیوان ضایع ہو گئے مگر محترمی لالہ سری رام صاحب قابل مصنّف خمخانۂ جاوید نے بڑی محنت اور مشقّت سے متفرق اور پریشان مسودوں سے ایک دیوان جمع کر کے چھپوایا ہے انورؔ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ذوقؔ غالبؔ اور مومنؔ تینوں کا رنگ کچھ کچھ ملتا ہے۔

غالبؔ ۱۲۱۲ھ لغایت ۱۲۸۵ھ
۱۷۹۶ء لغایت ۱۸۶۹ عیسوی

زبانِ اُردو کے بہت بڑے ماہر آسمانِ شاعری کے سب سے درخشندہ تارے۔ اپنے زمانے کے استاد کامل فلسفی شاعر مرزا اسد اللہ خاں متخلص بہ اسدؔ و غالبؔ ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۶ء[2] میں

---

[1] ولادت ۱۲۶۲ھ وفات ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۵ء ۔ فاضل

[2] ولادت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۶ء ۔ وفات دو شنبہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ ۔ فاضل ۔

بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ لقب مرزا نوشہ تھا اور خطاب نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ بادشاہ دہلی سے عطا ہوا تھا۔ مرزا کو جس طرح اپنی ذاتی قابلیت پر اسی طرح اپنی اصل و نسل اور عالی خاندان ہونے پر بھی بڑا فخر تھا۔ جیسا کہ اُن کے اکثر اُردو فارسی کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے لیے یہ چند شعر کافی ہیں ؎

غالب از خاک پاکِ تورانیم — لاجرم در نسب فرہمندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی — بسترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعت اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم
فیض حق را بہینہ شاگردیم — عقل کل را مہینہ فرزندیم
بہ تلاشے کہ ہست فیروزیم — بہ معاشے کہ نیست خورسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمے گرییم — ہمہ بر روزگار مے خندیم

اشعار مذکورہ بالا سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندانی سلسلہ ایبک ترکمانوں سے جو وسط ایشیا کے رہنے والے تھے، ملتا ہے جو اپنے آپ کو سلاطین سلجوقیہ کی وساطت سے فریدوں کی نسل میں سمجھتے تھے۔ مرزا کے دادا سب سے پہلے ہندوستان آئے اور شاہ عالم کے دربار میں عزت پائی۔ مرزا کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں نے ایک متلون زندگی بسر کی۔ کچھ دنوں دربار اودھ میں رہے پھر حیدرآباد گئے جہاں نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی برس بعد گھر آئے اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی سرکش گڑھی کی لڑائی کے موقع پر ۱۲۱۷ھ میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کا سن پانچ برس کا تھا۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی جو فوج کے کمیدان اور آگرہ کے مشہور رئیس تھے۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا کی پرورش اور تعلیم و تربیت

اُن کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی جو انگریزی فوج میں رسالدار تھے اور حُسنِ خدمات اور وفاداری کے صلہ میں سرکار انگریزی سے جاگیر پائی تھی۔ ان کا انتقال بھی ۱۲۲۱ھ میں ہوگیا۔ اس وقت غالب کی عمر نو برس کی تھی۔ اس کے بعد ان کی خبر گیری ان کی نانہال میں ہوتی رہی۔ اُن کے چچا کی جاگیر کے عوض میں سرکار انگریزی سے پنشن بھی ملتی رہی۔ مرزا کا بچپن آگرہ میں گزرا جہاں وہ ایک کہنہ مشق اُستاد مولوی شیخ معظّم سے تعلیم پاتے رہے اور کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی سے بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں جب ان کی عمر چودہ[۱۴] برس کی ہوئی تو ہرمز نام کے ایک پارسی سے جو ژند و پاژند کا عالم اور بڑا سیّاح تھا، ان کی ملاقات ہوگئی۔ ہرمز نے آخر مذہب اسلام قبول کرلیا تھا اور عبدالصمد نام رکھا تھا۔ یہ ان کے ساتھ تقریباً دو[۲] برس رہا۔ اور چونکہ فارسی کی طرف ان کو قدرتی مناسبت تھی لہٰذا اُس سے انہوں نے پوری طرح اکتساب کمال کیا۔ اس کے فیضانِ صحبت کا مرزا کو فخر تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی تعلیم و تربیت کے اثر سے مرزا میں وہ صحیح اور بامحاورہ فارسی قدیم لکھنے کا مادہ بخوبی پیدا ہوگیا جو صرف ایک اہلِ زبان ہی کی مدد سے ہوسکتا ہے۔

غالب دہلی میں پہلی مرتبہ ۱۲۱۶ھ میں آئے جب ان کے چچا کی شادی نواب فخر الدولہ کے خاندان میں ہوئی تھی اور خود ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی کے ساتھ، جو نواب فخر الدولہ والی لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے ۱۲۲۵ھ میں ہوئی، جبکہ ان کا سن تیرہ[۱۳] برس کا تھا۔ دہلی کی فضا میں اس وقت شاعری گونج رہی تھی۔ مشاعرے جگہ بہ جگہ ہوا کرتے تھے۔ شادی بھی ایک مشہور و معروف شاعر کی بیٹی کے ساتھ ہوئی، ان سب اسباب سے نوعمر غالب کی نوخیز طبیعت پر شاعری کا گہرا اثر پڑا۔ شروع میں فارسی کہتے تھے اور اس میں بہت کچھ کہا۔ مگر رفتہ

رفتہ اُردو شاعری کی روز افزوں ترقی اور ماحول کے اثر سے اُردو کی طرف توجہ کی۔ پہلے اسدؔ تخلص کرتے تھے۔ جب کسی شخص کا یہ شعر سُنا ؎

اسدؔ تم نے بنائی یہ غزل خوب   ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

یہ سُنتے ہی اس تخلص سے نفرت ہو گئی۔ کیونکہ ان کا یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام الناس کے ساتھ شریک حال ہونے کو بہت بُرا جانتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ میں اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب" کی رعایت سے غالبؔ تخلص اختیار کیا۔ لیکن جن غزلوں میں اسدؔ تخلص تھا، انہیں اسی طرح رہنے دیا۔ مرزا ۱۸۳۱ء میں کلکتہ بھی گئے تھے۔ بہ سلسلہ اپنی پنشن کے جو اُن کے چچا کو جاگیر ضبط ہو جانے کے عوض ملتی تھی، اور آخر میں بند ہو گئی تھی مگر باوجود متعدد کوششوں کے اور ولایت میں اپیل دائر کرنے کے بھی مرزا اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔ کلکتہ کے راستے میں مرزا نے لکھنؤ اور بنارس کی بھی سیر کی تھی، اور ایک قصیدہ نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے واسطے اور ایک نثر وزیر سلطنت کی مدح میں پیش کی تھی۔ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی سرکار سے بھی پانچ سو روپیہ سال ان کے واسطے مقرر ہوئے تھے۔ مگر دو برس کے بعد جب انتزاع سلطنت ہوا تو وہ موقوف ہو گئے۔ ۱۲۶۲ھ میں غالبؔ تین ماہ کے واسطے کوتوال شہر کی عداوت کی وجہ سے قید ہو گئے تھے۔ مگر قید میں ان کے مرتبہ کے موافق ان کا احترام کیا گیا۔ ۱۸۴۲ء میں غالبؔ ایک فارسی پروفیسری کے لیے جو دلّی کالج میں خالی ہوئی تھی امیدوار تھے مگر چونکہ ٹامس صاحب سکریٹری گورنمنٹ نے بروقت ملاقات مرزا کا استقبال نہیں کیا اس لیے انہوں نے اپنی کسرشان سمجھ کر ملازمت قبول نہ کی۔ ۱۲۶۶ھ (مطابق ۱۸۴۹ء) میں خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بادشاہ نے دربار میں عطا کیا۔ اور ایک تاریخ خاندان تیموریہ لکھنے کا حکم دیا اور پچاس روپیہ

مہینہ اس کے صلہ میں مقرر کیا۔ ۱۲۷۱ھ میں ذوق کی وفات کے بعد مرزا استادِ شہ مقرر ہوئے اور اصلاح کا کام ان کے سپرد ہوا۔ غدر کے ایام میں بوجہ سلسلہ ملازمت اور تقرب شاہی کے مرزا بھی مصائب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پنشن بند ہو گئی اور ان کے چال چلن کے متعلق تحقیقات کی جانے لگی۔ آخر میں جب پوری صفائی ہو گئی۔ اور یہ بے گناہ ثابت ہوئے تو ان کی پنشن بحال ہوئی اور عزت سابق واپس دی گئی۔ غالبؔ نواب یوسف علی خان والی رامپور کے استاد بھی تھے جو ان کو سو روپیہ ماہوار بطور پنشن کے عمر بھر دیتے رہے۔ غالبؔ کا انتقال ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء بہ عمر ۷۳ سال چار ماہ بمقام دہلی ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

عام حالات اور طبعی عادات

غالبؔ نہایت خلیق اور ملنسار واقع ہوئے تھے۔ اور ایک بڑی جماعت احباب اور قدر دانوں کی رکھتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا جس کو وہ نہایت باقاعدہ طور پہ وقت کی پابندی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ اور دور دراز شاگردوں کے کلام کی اصلاح بھی مراسلت ہی کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور وہ جواب دینے میں بہت مستعد تھے ان کی یہ عادت مرتے دم تک جاری رہی۔ محبت و ہمدردی ان کے خمیر میں پڑی تھی۔ جیسا کہ اُن کے خطوط اور اشعار سے مترشح ہوتا ہے۔ مذہبی تعصبات اور غلو سے کوسوں دُور رہتے تھے۔ سچ پوچھو تو ان کا مذہب بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور محبت تھی جس میں کسی فرقہ اور جماعت کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کی مذہبی آزادی اور غیر متعصبی کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے دوستوں اور شاگردوں میں متعدد ہندو تھے جن میں سب سے زیادہ نامی و گرامی منشی ہرگوپال تفتہ تھے جو فارسی شعر کہنے میں بڑا ملکہ رکھتے تھے گو کہ مرزا کبھی آسودہ حال اور دنیاوی جاہ و ثروت کے اعتبار سے فارغ البال نہیں ہوئے مگر پھر بھی جس قدر اُن کی

آمدنی تھی۔ وہ اپنی ضروریات کے ساتھ اپنے احباب اور ارباب احتیاج کے واسطے بلاتکلف وقف تھی۔ سخاوت کے ساتھ وہ صاف گوئی اور صاف باطنی کے لئے بھی مشہور تھے۔ چنانچہ خود اپنے عیوب اور کمیوں کو بھی کبھی نہیں چھپاتے بلکہ علی الاعلان اُن کو ظاہر کر دیتے تھے۔ مثلاً یہ سب جانتے ہیں کہ وہ شراب پیتے تھے مگر اس واقعہ کو انھوں نے کبھی نہیں چھپایا بلکہ اپنے اشعار میں اور نیز احباب کے خطوط میں کسی معقول توجیہ کے ساتھ لکھتے تھے اور اس طرح گویا کہ وہ اپنی ندامت کا اظہار کر رہے ہیں۔ خلق و تواضع کے ساتھ ان کو اپنی خودداری اور عزّت اور اپنے مرتبہ کا بھی بہت بڑا خیال رہتا تھا۔ بڑے بڑے امراء سے وہ برابری سے ملتے اور اپنی علو شان کا ہر وقت خیال رکھتے تھے جیسا کہ اس واقعہ سے پایا جاتا ہے جب اُنھوں نے دلّی کالج کی پروفیسری کو نامنظور کیا۔ کبھی کبھی ان کا یہ خیال حدِ اعتدال سے تجاوز بھی ہو جاتا تھا۔ مگر اپنے وسیع حلقۂ احباب کے ساتھ وہ ہمیشہ رفق مدارا اور انکسار و تواضع ہی سے پیش آتے تھے۔ اُن کے خانگی تعلقات خاص کر اپنی بیوی کے ساتھ شگفتہ نہ تھے۔ مرزا کی شادی تیرہ[۱۳] برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اپنی بیوی سے زیادہ محبّت نہیں رکھتے تھے مگر پھر بھی کوئی ظاہری رنجش نہ تھی اور نہ میل ملاپ میں کوئی فرق تھا۔ مرزا کی کئی اولادیں ہوئی تھیں مگر وہ سب بچپنے میں مر گئیں۔ مرزا کے چھوٹے بھائی جو فاتر العقل تھے اور اُنھیں کے ساتھ رہتے تھے غدر کے زمانے میں مرے۔ مرزا اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف سے بہت محبّت کرتے تھے۔ یہ بہت ہونہار شاعر تھے اور مرزا کے سامنے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے دو بچوں سے مرزا صاحب کو کمال محبّت تھی۔ آخر عمر میں مختلف امراض و آلام نے مرزا صاحب کو بہت پریشان کر دیا تھا۔ پھر اس زمانہ میں ان کی مالی حالت بھی درست نہ تھی۔ ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اپنے افکار و مصائب کو شراب نوشی سے ہلکا کر دیتے تھے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو　　اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

میر کی طرح غالب بھی مصائب و آلام کا مزہ چکھے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں بھی مثل میر کے ایک خاص درد و اثر ہے۔ مرزا صاحب کے کلام میں تفاخر بے جا نہیں ہے بلکہ اس سے حسن شعر میں اضافہ ہوتا ہے اور کلام کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ نہایت مدلل اور لطیف پیرایہ میں ادا کیا جاتا ہے جیسے فرماتے ہیں ؎

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب　　میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

سب سے زیادہ قیمتی اور نمایاں جوہر مرزا صاحب کے کلام میں اُن کی نہایت لطیف ظرافت اور شگفتہ مزاجی ہے جس کی بدولت بڑی سے بڑی تکلیفوں کو بھی ہنس کھیل کر کاٹ دیتے تھے۔ اسی خیال کو نہایت فلسفیانہ طریقہ پر ظاہر کرتے ہیں ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

تاریک سے تاریک موقعوں پر بھی ان کی ظرافت اور لطافت کی بجلی چمک جاتی ہے، جس سے مصائب کی تیرگی کافور ہو جاتی ہے۔ اُن کی ظرافت میں کسی قسم کی تیزی اور بدمزگی نہیں ہوتی بلکہ اس میں مناسبت اور جدت اسلوب کے ساتھ ہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں اُن کے کلام میں بیزاری کا پرتَو ہے مگر یہ کیفیت تنفر سے پیدا نہیں ہوتی۔ اُن کی ظرافت و مذاق سے کوئی نہیں چھوٹا حتیٰ کہ اپنی بیوی کی نسبت بھی ایک خط میں لکھتے ہیں "کہ ایک اُوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے۔ تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔" اگر مرزا صاحب کے اس قسم کے لطائف و ظرائف بالاستیعاب دیکھنا ہوں تو مولانا حالی کی یادگار غالب دیکھنا چاہیئے جس میں ایسی باتیں بکثرت مذکور ہیں۔

غالب بحیثیت شاعر کے

مرزا کا پایہ شاعری میں بہت بلند ہے اور اُس کو سب نے تسلیم کیا ہے وہ نہایت وسیع النظر اور کثیر المعلومات تھے اور اُن کے معاصرین

بھی اس بارے میں اُن کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اُن کو فارسی سے اس قدر شغف تھا کہ وہ ہمیشہ یہ خواہش ظاہر کرتے کہ میری قابلیت کا اندازہ میرے فارسی کلام سے کیا جائے اور اس بات پر نہایت افسوس کرتے کہ لوگ اس قدر فارسی سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں کہ اُن کے کلام کا قدر دان اور سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔

بیاوریدگر اینجا بود زباں دانے　　　غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

یہ عجیب بات اور نیرنگیِ قسمت ہے کہ اُن کی شہرت کا باعث اُن کی فارسی شاعری نہیں بلکہ اُردو شاعری ہوئی جس کی خود وہ کوئی قدر نہیں کرتے تھے۔

فارسی بیں تابہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ　　　بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

اردو وہ کبھی کبھی تبدیلِ ذائقہ کے لیے اور اپنے احباب کے اصرار سے کہہ لیا کرتے تھے مختلف کتابیں ان کی نظر سے گزری تھیں اور نہایت تعمق کی نظر سے ان کو پڑھا تھا۔ قوتِ حافظہ کا یہ حال تھا اور اُس پر اتنا اعتبار تھا کہ کتابیں عاریت لے کر پڑھتے اور خود کبھی نہ مول لیتے تھے۔ فی البدیہہ اشعار کہنے کی بھی عادت تھی جیسا کہ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے جبکہ کلکتہ میں ایک دوست مولوی کرم حسین کی فرمائش سے چکنی ڈلی کی تعریف میں فوراً چند اشعار کہہ دیے تھے۔ عربی میں گو اُنھوں نے درس نظامیہ کی تکمیل نہیں کی تھی مگر مہارت کافی حاصل تھی۔ فنِ عروض کے اُستادِ کامل تھے اور اس کے علاوہ نجوم میں بھی کچھ دخل تھا۔ تصوف سے کماحقہ، واقف تھے اور اس کے مسائل اپنے اشعار میں نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیے ہیں۔ تاریخ، ریاضی اور ہندسہ سے اُن کو مطلق دلچسپی نہ تھی گو کہ تعجب یہ ہے کہ وہ تین کتابیں تاریخ کی خود تصنیف کر گئے اسی طرح مرثیہ اور تاریخ گوئی سے بھی اُن کو کوئی لگاؤ نہ تھا[1]۔ البتہ فارسی میں بہت سے نسخے موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے

---

[1] یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مرزا کو تاریخ گوئی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ یوں تو اُن کے اُردو دیوان میں بھی دو تین تاریخیں موجود ہیں مگر فارسی میں تو متعدد عمدہ تاریخیں ان کے قطعات میں شامل ہیں (باقی صفحہ ۴۰۳ پر)

کہ وہ ایک بہت بڑے فلسفی شاعر تھے اور اُن کی ذہانت کے مختلف پہلو تھے جس کی وجہ سے ایک شاعر کا تبحر ایک مصوّر کی چابک دستی کے ساتھ مل گیا تھا۔

تصانیف حسب ذیل تصانیف ان کی یادگار ہیں:۔

(۱) عودِ ہندی (۲) اُردوئے معلّیٰ (۳) کلیاتِ نظم فارسی

(۴) کلیاتِ نثر فارسی (۵) دیوانِ اُردو (۶) لطائفِ غیبی

(۷) تیغِ تیز (۸) قاطعِ برہان (۹) پنج آہنگ

(۱۰) نامۂ غالب (۱۱) مہرِ نیم روز (۱۲) دستنبو

(۱۳) سبدِ چین

"عودِ ہندی" اور "اُردوئے معلّیٰ" اُردو خطوط کا مجموعہ ہیں جو اُنھوں نے اپنے احباب کو لکھے تھے۔ اور اوّل مرتبہ بصورت کتاب ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئے تھے۔ عودِ ہندی

(بقیہ صفحہ ۳۸۷)

مثال کے طور پر ہم دو تاریخی مادے لکھتے ہیں جو بالکل ایک نئے ڈھنگ سے نکالے گئے۔ تاریخ وفات مرزا امیتا بیگ

زسالِ واقعۂ میرزا امیتا بیگ — مآت راست شمارائمہ امجاد

صحیفہ ہائے سماوی مُبیں از عشرات — حدیقہ ہائے بہشتی مشخص از آحاد

بحسرتِ دہ ودو ہادی و چہار کتاب — کہ در نشیمنے از ہشت خلد جائش یاد

اس سے بارہ سیکڑے چار دہائیاں اور آٹھ اکائیاں یعنی ۱۲۴۸ھ نکلتے ہیں اسی طرح ایک دوسری تاریخ میں فرماتے ہیں۔

جُستم از سالِ رحلتش اثرے — گفت غالب کہ خود ز روئے شمار

از بروجِ سپہر جوے مآت — عشرات از کواکبِ سیّار

گفتم آحاد گفت شرمت باد — از خداوندِ واحد القہار

اس میں بارہ سیکڑے سات دہائیاں اور ایک اکائی یعنی کل ۱۲۷۱ نکلتے ہیں ۔ ۱۲

میں علاوہ خطوط کے چند دیباچے اور تقریظیں بھی شامل ہیں۔ "لطائف غیبی" مباحثے میں ہے اور سیف الحق کے فرضی نام سے لکھی ہے۔ "تیغ تیز" اور "نامۂ غالب" بھی اُسی مناظرے سے تعلق رکھتی ہیں جو قاطع برہان کی وجہ سے ہوا تھا۔

"پنج آہنگ" میں فارسی انشا پردازی کے مختلف نمونے ہیں۔ "کلیاتِ نظم غالب" ان کے فارسی قصائد[1] اور غزلیات، قطعات، مثنویات، رباعیات وغیرہ کا بیش بہا مجموعہ ہے۔ "مہرِ نیمروز" تاریخ ہے۔ مرزا نے اس کو حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے ایما سے لکھا تھا اس کی پہلی جلد میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال قلمبند کیا اور مہر نیمروز نام رکھا۔ ارادہ تھا کہ اکبر سے لے کر بہادر شاہ تک کا بھی حال دوسری جلد میں لکھیں اور "ماہ نیم ماہ" نام رکھیں کہ اس اثنا میں غدر ہو گیا اور وہ کتاب رہ گئی۔ "دستنبو" میں گیارہ مئی ۵۷ء سے یکم جولائی ۵۸ء تک حال بغاوت تباہی شہر اور اُس کے ساتھ اپنے حالات بھی بیان کئے ہیں۔ "سبد چین" میں چند قصائد اور قطعات فارسی میں اور کچھ خطوط ہیں۔

---

[1] مرزا کے فارسی قصائد کل چونسٹھ ہیں جن میں سترہ قصیدے حسب تفصیل ذیل انگریز حکام کی شان میں ہیں۔

نام ممدوح	تعداد قصائد	نام ممدوح	تعداد قصائد
کوئین وکٹوریا	۳	مسٹر اسٹرلنگ	۱
لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل	۱	ولیم فریزر	۱
لارڈ الن برا ایضاً	۲	مسٹر کالون	۱
سر چارلس مٹکاف ایضاً	۱	لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل	۱
جمس ٹامسن	۱	مسٹر ایڈمنسٹن	۱
مسٹر ہیملٹن	۱	لارڈ کیننگ گورنر جنرل	۱
ٹامس میڈک	۱	مسٹر منٹگمری لفٹننٹ گورنر	۱

ان کے علاوہ تین چار قطعات بھی انگریزوں کی شان میں ہیں۔ ۱۲

مرزا صاحب سے مباحثے پہلا مباحثہ اس طرح ہوا کہ جب مرزا کلکتہ میں تھے تو بعض لوگوں نے ان کے کلام پر کچھ اعتراض کیے اور سند میں قتیل کے اقوال پیش کیے۔ مرزا جن کا قول تھا ؎

آنکہ طے کردہ این مواقف را   چہ شناسد قتیل و واقف را

وہ بھلا قتیل کو کب ماننے والے تھے۔ اُنھوں نے اپنے کلام کی تائید میں اساتذہ اہلِ زبان پیش کیے اور کہا ؎

دامن از کف کنم چگونہ رہا   طالب و عرفی و نظیری را

خاصہ روح و رواں معنی را   آں ظہوری جہان معنی را

مخاصمین جو قتیل کے شاگرد تھے اس پر اور برافروختہ ہو گئے اور مرزا صاحب کے کلام پر اور اعتراض وارد کیے۔ یہ سب واقعات ان کی مثنوی "باد مخالف" میں مذکور ہیں۔

دوسرا مباحثہ اس وجہ سے ہوا کہ مرزا نے فارسی کی مشہور لغت "برہان قاطع" پر اعتراض کیے اور ان کو کتابی صورت میں شایع کیا اور "قاطع برہان" نام رکھا۔ اس کے ایک سال بعد اس کتاب کو ترمیم کر کے اس کا نام "درفش کاویانی" رکھا۔ اس کتاب سے مرزا کی انتہائی قابلیت اور تبحر کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے اکثر جواب لکھے گئے۔ کلکتہ سے ایک شخص مرزا احمد بیگ نے "موید البرہان" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ غالب نے اس کا جواب "تیغ تیز" سے دیا اور ایک دوسری کتاب "ساطع برہان" کا جواب "نامہ غالب" سے دیا گیا۔

مرزا کے فارسی کلام پر اس کتاب میں کوئی رائے دینا بے موقع ہے مگر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ وہ نظم و نثر فارسی دونوں کے اُستاد کامل تھے اور ان کا مقابلہ ہندوستان اور ایران کے بڑے بڑے شعرا خسرو، نظیری، فیضی، بیدل و حزیں وغیرہ سب بے تکلف

کیا جا سکتا ہے۔

غالب کی شاعری کے تین دور

غالب کی شاعری تین مراتب یا ادوار پر تقسیم کی جا سکتی ہے جس سے اُن کی شاعری کی ترقی اور نیز ہر دَور کی خصوصیات کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے۔

یہ بات ضرور پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ غالب اپنی قابلیت اور کلام کو اپنے اُردو دیوان کی معیار سے کبھی نہیں جانچنا چاہتے تھے۔ اُن کا قول تھا ؎

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ　　　بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

اور وہ ہمیشہ اپنے فارسی کلام ہی کو اپنا مایۂ ناز سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنا مقابلہ کبھی کسی اُردو شاعر سے نہیں کیا۔ البتہ اہل زبان کے کلام سے اپنے کلام کو تولنے پر ہمیشہ مستعد تھے۔ مگر باایں ہمہ اُن کی ذہانت وطبّاعی اور اُن کی فطری شاعری کا پورا اثر اُن کے اُردو کلام میں بھی اسی طرح جلوہ گر ہے جس طرح اُن کے فارسی کلام میں ہے۔ مرزا کا اُردو دیوان تقریباً اٹھارہ سو ابیات سے زیادہ نہ ہوگا۔ مگر اُس کو زبان اُردو کا بہترین خزانہ اور اُردو شاعری کا نہایت گراں قدر سرمایہ سمجھنا چاہیئے۔ مرزا کی شاعری کا پہلا دَور اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب سے کہ انھوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ تا عمر پچیس سال جبکہ اُنھوں نے اپنے اُردو دیوان کو چھانا اور اس میں سے فارسی کی غیر مانوس ترکیبیں اور بندشیں نکال ڈالیں۔ اب وہ قدیم کلام جو مروّجہ دیوان سے خارج کیا گیا تھا ایک عرصۂ دراز کے بعد بڑی کوشش اور کاوش سے بہم پہنچا کر چھاپا گیا ہے۔ اور اس کے مطالعہ کے بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی افکار مرزا کی کس قسم کی ہوتی تھیں۔ نیز یہ کہ کن کن ترکیبوں اور بندشوں کو اُنھوں نے ترک کیا جو ابتدا میں اُن کو پسند تھیں۔ اس نئے دریافت شدہ کلام کی نازک خیالیاں اور نئی نئی ترکیبیں قرون وسطیٰ کے ان یورپی شعرا سے ملتی جلتی ہیں جن کو انگریزی اصطلاح میں "اسکولمن" کہتے ہیں۔ اس دَور کی شاعری میں فارسی ترکیبوں اور نازک خیالیوں کی بہت کثرت ہے۔ علی الخصوص مرزا عبدالقادر کا تتبع معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالب — ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب — عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

"طرز نازک خیالی کے متبعین کی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حقائق شعری کو سیدھے سیدھے الفاظ میں کہنے کے بجائے وہ مضمون کو تخیل کی پیچیدہ گھاٹیوں سے گزارتے ہیں اور اسی اشکال میں وہ اپنی خصوصیت اور ناموری سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات اُن کی یہ بلند پروازیاں نازک خیالیاں اس قدر بلند ہو جاتی ہیں کہ نظروں سے اوجھل ہو کر شعر کا مطلب اور اثر بالکل جاتا ہے۔ ایسے ہی اشعار پر "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کی مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ مرزا کو یہ رنگ بہت پسند آیا۔ اس وجہ سے کہ ان کے مزاج کی افتاد یہ واقع ہوئی تھی کہ وہ ہر چیز میں اپنے آپ کو عام لوگوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے شاعری میں بھی اُنھوں نے یہ رنگ اپنے واسطے منتخب کیا۔ اس وجہ سے کہ اس میں فارسیت کا غلبہ تھا اور فارسی کا ذوق اُن کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ طرز ان کے اعلیٰ خیالات کے اظہار کا ایک بڑا آلہ کار تھا۔ مرزا بیدل کے وہ صرف متبع ہی نہیں بلکہ خلوص کے ساتھ اُن کے معروف بھی ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا شعروں سے معلوم ہوا۔ یہ رنگ اگرچہ کچھ اچھا نہ تھا۔ مگر تھوڑی مدت تک مرزا کی طبیعت پر غالب رہا بعد کو وہ خود سنبھل گئے اور اپنے واسطے ایک نیا راستہ نکالا جس میں نہ صرف بیدل کی پیروی ترک کی بلکہ اس طرز کا کلام بھی اپنے دیوان سے خارج کر دیا۔ اُن کے ابتدائی کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

عجیب و غریب تشبیہیں۔ ایسی بلند پروازیاں جن سے شعر کے معنی مبہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فارسی کی ایسی بندشیں اور ایسے غیر مانوس الفاظ جو شعر کی روانی اور فصاحت کلام کے منافی ہیں۔ ابتدائی کلام میں نہ پختہ کاری۔ وہ اثر اور وہ عمیق جذبات جو اُن کے بعد کے

کلام میں ہیں نہیں پائے جاتے۔ ان کے ایسے اشعار محض فارسی الفاظ کی لڑیاں معلوم ہوتے ہیں جن میں اُردو کی آمیزش محض اس وجہ سے ہے کہ شعر اُردو کہا جا سکے اور ادنیٰ تغیر سے وہ فارسی ہو جاتا ہے۔ گو ان کے ابتدائی کلام کا مضحکہ بھی اڑایا جاتا تھا جیسے کہ حکیم آغا جان عیش نے جل کر کہا کہ قطعہ

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے، اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے بھی اُن کے اعلیٰ درجہ کی دماغی قوت اور آئندہ کے ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کی اس دَور کی شاعری بھی نہایت ممتاز اور مخصوص ہے اور ان کی اُفتادِ طبع سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آئندہ وہ کتنی ترقی کرنے والے ہیں۔ ان کی ابتدائی فکر میں بھی ایسی ایسی نازک خیالیاں، نئی نئی تخلیلیں اور پُر لطف تشبیہیں ملتی ہیں کہ اُردو شعرا میں اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتیں۔ اپنے مخالفین کے اعتراضات اور مضحکہ انگیز نقالی اور اپنے مخلص احباب مثلاً مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ وغیرہ کی دوستانہ صلاح اور خود اپنی انصاف پسند طبیعت کے تقاضا سے مرزا نے آخر کار یہ رنگ ترک کر کے ایک دوسری روش اختیار کی۔

دوسرے دَور میں فارسیت کا وہ غلبہ اور نازک خیالیوں کا وہ انداز نہیں جو پہلے مرزا کو مرغوب تھا۔ اس میں زبان صاف ہو گئی ہے۔ الفاظ پر پوری قدرت ہے اور فارسی بندشوں اور محاورات میں ایک معتد بہ کمی ہے۔ مگر فارسی کے اعلیٰ خیالات ویسے ہی ہیں جو مذاق سلیم پر گراں نہیں گزرتے بلکہ سامع کے دل و دماغ میں ایک پُر لطف ہیجان پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار تھوڑی سی کاوش کے بعد جب سمجھ میں آجاتے ہیں تو مسرت کاوش غضب کی ہوتی ہے۔

مرزا کی شاعری کا تیسرا دَور اُن کے کمال فن کا لُبِ لباب اور ارتقائے کمال کی

آخری منزل ہے۔ اس دور کے بعض اشعار جامعیت اور اختصار میں فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اس عہد کی غزلوں میں ندرتِ خیال کے ساتھ لطافت زبان اور شستگی کلام عجیب لطف دیتی ہے۔ اُن میں ایجاز کے ساتھ سادگی۔ سلاست و روانی، نازک خیالی اور جدت تخیل سب کچھ بدرجۂ احسن موجود ہے۔ اور انھیں سے غالب کو شعرائے اُردو کی صف اوّلین میں نہایت ممتاز جگہ ملی ہے۔

غالب کے خصوصیات

پہلی خصوصیت جدت پسندی

ہماری رائے میں مرزا کے قصر شاعری کی مستحکم بنیاد۔ اُن کی جدت طرازی پر قائم ہے۔ جس میں جدتِ تخیل، جدتِ طرز ادا، جدت تشبیہات، جدت استعارات، جدت محاکات، جدت الفاظ، غرض ہر قسم کی جدتیں شامل ہیں۔ پامال مضامین مرزا صاحب کی خاص طرز ادا سے بالکل نئے معلوم ہونے لگتے ہیں اور معمولی سے معمولی واقعات ایک ایسے اسلوب سے بیان کرجاتے ہیں کہ گویا اس سے پہلے کبھی نہیں سُنے گئے تھے۔ نئے خیالات کے ادا کرنے کا طریقہ بھی نیا ہوتا ہے۔ اس جدتِ اسلوب سے معمولی سے معمولی خیال اور پامال سے پامال مضمون بہت مرتفع ہوجاتا ہے۔ اس جدت طرازی اور اُپچ کی وجہ سے شعر میں کبھی کبھی معمّا کی سی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ جس کا حل ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے۔ غالب اور اکثر شعرائے اُردو اور نیز بعض شعرائے فارسی میں بڑا فرق یہ ہے۔ کہ غالب کے یہاں الفاظ خیالات کے تابع ہوتے ہیں اور اور لوگوں کے یہاں معاملہ برعکس ہے جس سے اُن کے اشعار میں تصنع اور بدمزگی پیدا ہوجاتی ہے اور اسی قسم کے کلام سے اُن کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ مرزا صاحب کے یہاں بخلاف اُن کے تُک بندی اور قافیہ پیمائی نہیں بلکہ خیال آفرینی ہے۔

غالب نبود شیوۂ من قافیہ بندی ظلمیست کہ بر کلک و ورق میکنم امشب

دوسری خصوصیت نظر فریب طرز تحریر

اسی سے متعلق اور ملتی جلتی اُن کے کلام میں نظر فریبی اور

بات سے بات پیدا ہوتا ہے۔ وہ ایک سُر چھیڑتے ہیں اور سامع کا ذہن پورا راگ منضبط کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مجہول الکیف سامع مرزا غالب کے شاعرانہ ترانوں سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ مرزا کسی چیز کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے۔ بلکہ پڑھنے والے کا خیال خود اس کے لوازم جمع کر لیتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ مرزا صاحب کی شاعری کا خاص طغرائے امتیاز جادۂ عام سے علیحدگی ہے جس کا شوق بلکہ عشق اُن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ وہ کسی چیز میں اپنی شرکت عام لوگوں کے ساتھ پسند نہیں کرتے تھے۔ تخلص بدلنے کا واقعہ جس کا ذکر اُوپر ہو چکا اس کا بیّن ثبوت ہے۔ اسی طرح وہ اپنے لباس، وضع قطع، بات چیت، طرزِ تحریر، غرضکہ ہر چیز میں اسی علیحدگی کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ ان کے خطوط، اُن کے اشعار، ہر چیز سے مترشح ہے کہ وہ عام باتوں سے سخت متنفر تھے۔

ڈرتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر　　کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا

اُن کی ابتدائی مشکل پسندی اسی علیحدگی پسندی پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اُن کی شاعری سے عام دماغ لُطف نہیں اُٹھا سکتے۔ اُن کے الفاظ میں خیالات کا اس قدر زور ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ خیالات قیدِ الفاظ کو توڑ ڈالیں گے۔ ع

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

تیسری خصوصیت
ذاتی جذبات کا اداکرنا

مرزا میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے اشعار اُن کے خیالات کا صحیح فوٹو ہوتے ہیں۔ وہ زندگی اور مختلف کیفیات زندگی کے ترانے گاتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ سے اپنے دلی کیفیات اپنے کلام کے پڑھنے والے کے سامنے پیش کرتے ہیں جن میں کہیں غم و الم کے نالے۔ کہیں اُن کی مانند عظمت کا مرقع، کہیں اُن کی حرماں نصیبی، کہیں ہجومِ ناامیدی، کہیں جانکاہ مصائب، کہیں سعی بے حاصل، کہیں دنیا سے تنفر اور بیزاری، کہیں رحم خداوندی پر پورا پورا اعتماد، کہیں تعلقات دنیاوی

سے دلبستگی اور اس کی خوشی اور اُس کے آلام کا بیان ہوتا ہے۔ غرضکہ ان کے لطیف اشعار اُن کی کیفیات قلبیہ کا جو وقتاً فوقتاً اور آناً فاناً وارد ہوتی رہتی ہیں، صحیح بیرامیٹر ہیں۔

چوتھی خصوصیت
فلسفیت اور حقیقت طرازی

مرزا ایک بہت بڑے فلسفی ہیں اور ان کے اکثر اشعار حقایق فلسفہ کو نہایت آسانی اور سادگی سے ظاہر کرتے ہیں۔ وہ رموز و حقایق تصوف سے پوری طرح واقف اور فرقہ بندی اور مذہبی تعصبات سے بالکل مبرا تھے۔ فرماتے ہیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

اور اُن کے یہ خیال زبانی نہ تھے بلکہ وہ ان پر پوری طرح عامل تھے۔ ان کی زندگی مذہبی وسعادری آزادہ روی کی ایک درخشاں مثال تھی اسی طرح اُن کا تخیل عبادت بھی بہت بلند ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جنت کے اس خیال سے کہ اس میں نہریں جاری ہوں گی اور وہی سب لطف حاصل ہوں گے جو دنیا میں ہوتے ہیں، وہ متفق نہیں بلکہ اس کو اخلاق اعلیٰ سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اُن کے نزدیک مصیبت عظمیٰ خود زندگی ہے جس سے احساس وجود پیدا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ اپنے مبدا سے جُدا ہوتی ہے۔ نغمہ زندگی کو ایک نالۂ نے سمجھنا چاہیئے۔ جو نیستان سے جُدا ہونے پر بے اختیارانہ کرتی رہتی ہے۔ اسی مضمون کو مرزا صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بحیثیت ایک صوفی صافی کے وہ دنیا کے شادی و غم سے بالکل متاثر نہیں ہوتے بلکہ ایک

مرتفع مقام سے ترانہ سنجی کرتے ہیں ؎

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ — جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

کس قدر خوبصورتی سے وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ عالم ظاہر مظہر روح حیات ہے مگر خود روح حیات نہیں ہے۔ بقول برگسن کے یہی روح حیات اجسام میں جلوہ گر ہے مگر وہ خود اس عالم سے منزہ ہے غالب کہتے ہیں ؎

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

پانچویں خصوصیت — جذبات نگاری

حقایق فلسفہ کے علاوہ مرزا صاحب کی شاعری جذبات سے بھی مملو ہے اُن کے یہاں جانکاہ مصائب، دلگداز تکلیفیں، ناقابل برداشت مصیبتیں، جو لازمۂ زندگی ہیں نہایت موثر الفاظ میں بیان کی گئی ہیں۔ گویا زندگی ایک ایسا جنازہ ہے جس کے ساتھ دُور سے قضا کے قہقہوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ چنانچہ اسی زندگی اور غم کے لازم و ملزوم ہونے کے متعلق مرزا کہتے ہیں۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غم اگرچہ جانگسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے — غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مرزا کے کلام میں بچّوں کی سی ضد اور اپنے معاصر انگریزی شاعر شیلی کی طرح تنک مزاجی پائی جاتی ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ اُن کو اُن کے حال پر کیوں نہ چھوڑا جائے اور اُن کے معاملات میں کیوں دست اندازی اور مزاحمت کی جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

بچّہ کی بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس کو تکلیف کیوں ہو۔ اسی طرح اس شعر میں ؎

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مرزا کے اشعار میں خود اُنھیں کے آلام و مصائب کے نقشے نظر آتے ہیں۔ ان کے اشعار کو پڑھ کر رنج و غم کی رفعت اور مصیبت کی عظمت معلوم ہوتی ہے اور گناہ کی ظلمت دُور ہو کر اس میں ایک نورانیت معلوم ہونے لگتی ہے۔ مندرجۂ ذیل شعر میں انتہا درجہ کا انکسار اور عاجزی اور دلی پشیمانی اور اپنی بے حقیقتی کا اظہار کس پُر اثر اور درد انگیز طریقے سے کیا ہے ؎

قدر سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری

کلام میں ظرافت و شوخی مرزا کی شاعری میں جو مایوسی اور درد کی تاریکی ہے اُس کو اُن کی طبعی ظرافت اور شوخی اکثر دُور کر دیتی ہے۔ اکثر اشعار میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حزن و یاس کے ابر میں ظرافت کی دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ اُن کی ظرافت کی لطافت اور شوخیٔ کلام کی نزاکت کو ہم بے تکلف ایک تازگی پھول کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں۔ مگر اُن کی ظرافت کبھی حد اعتدال سے بڑھ کر پھکڑ نہیں ہو جاتی اور متین سے متین آدمی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

اُن کے اکثر اشعار نفسِ شاعری کی جان اور فصاحت و بلاغت کے روحِ رواں ہیں۔ سادہ الفاظ کی سطح کے نیچے عمیق معنی اس طرح پنہاں ہیں جیسے دریا کے شفاف پانی کے نیچے دریا کی تہ، اُن کی ہر تصویرِ الفاظ کے پیچھے اُن کے ہر نقشِ خیال کی پشت پر ایسے ایسے تخیل کے وسیع مناظر نظر آتے ہیں جن کی محیط فضا حیات و ممات کے سربستہ رازوں سے معمور ہے۔

غالب ایک کامل مصوّر ہیں اور اُن کو خیالی تصویروں کے کھینچنے کا عجیب و غریب ملکہ حاصل ہے ؎

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

مرزا کو عجب قدرت ایجاز حاصل تھی۔ اُن کے بعض اشعار ایجاز و اختصار اور بات سے بات پیدا کرنے کے بے مثل نمونے ہیں۔ مثلاً

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

شعر نہایت پُر تاثیر ہے۔ ظاہر میں تو ارتکاب شدہ گناہوں کے حساب سے بچنا چاہتا ہے مگر در پردہ کہتا ہے کہ بہت سے گناہ ایسے بھی ہیں جن کے نہ کرنے سے دل میں حسرتوں کے داغ پڑ گئے۔ یہ ایک نڈر اور صاف گو گنہگار کی تصویر ہے جو خدا سے بے دھڑک کہتا ہے کہ کردہ گناہ میرے کم ہیں مگر ناکردہ گناہوں کی حسرت زیادہ ہے اور اسی کی میں تجھ سے داد چاہتا ہوں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے[1]

غالب کا مقابلہ اپنے معاصرین شعرا سے

علو خیال، فلسفہ حیات، اور ذہانت و طباعی میں غالب اپنے معاصرین ذوق و مومن سے بڑھ کر ہیں۔ مگر روزمرہ اور سادگی بیان اور محاورہ بندی کے اعتبار سے ذوق اُن سے بڑھے ہوئے ہیں، گو کہ مومن اس بھی اُن سے کم ہیں۔ یورپ کے شاعروں میں جو اُن کے معصر یا قریب العہد تھے۔ اُن کے

---

[1] مرزا کے اس خیال کی تائید کہ اکثر گناہ ایسے تھے جن سے میں بچا لہٰذا اُن کی حسرت کی بھی داد دی جائے یعنی اس کا ثمرہ نیک ملے۔ اس آیت واقی الہدایت سے ہوتی ہے۔ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى۔ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى ٥

سورۃ النازعات سیپارہ ۳۰

کلام کا توازن شعرائے ذیل کے کلام سے کیا جا سکتا ہے۔

(۱) رابرٹ براؤننگ سے جو انگلستان کا اسی عہد کا ایک فلسفی شاعر تھا۔ پروفیسر سینفٹسبری براؤننگ کی نسبت لکھتے ہیں کہ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وُہ روح کا تجزیہ کرتا ہے۔ مرزا غالب تجزیہ اس قدر نہیں کرتے جتنا کہ رموز روحانی کے عمق کو دریافت کرتے ہیں۔ حقائق کی جھلکیاں وہ دیکھتے ہیں۔ ان کا کلام مثل مولٰنا روم وغیرہ کے سراپا اسرار تصوف نہیں ہے اور نہ من اولہ الی آخرہ کوئی فلسفہ ہے۔ مگر حقائق و رموز کا ان کے کلام میں جابجا پرتو موجود ہے۔ ان کو صوفی براؤننگ کہنا بجا ہے۔ ہر چند کہ براؤننگ کے کھرّے پن اور اکھّڑ پن سے ان کا کلام پاک ہے۔

(۲) مضامین حزن و یاس میں اُن کا مقابلہ جرمنی کے شاعر "ہین" سے خوب ہو سکتا ہے۔

(۳) مگر فی الحقیقت اگر کوئی فلسفی شاعر ان کا مدمقابل یورپ میں گزرا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور و معروف "گوئٹے" ہے۔ غالب میں ان تین چیزوں کا اجتماع ہو گیا ہے یعنی فلسفی کی عقل ادراک۔ صوفی کی نگاہ۔ دور بیں۔ چابک دست مصوّر کا نازک ہاتھ۔ اُن کی صنعت پُرکاری اور پُرکاری صنعت ہے۔ اور حُسن حق ہے اور حق حُسن ہے۔ وہ ایک صوفی صاف دل تھے اور ان کا یہ قول بالکل صحیح ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں   غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اُن کا تصوّف کوئی شغل دلچسپی نہیں اور نہ اُن کی شاعری محض خیالی شاعری ہے بلکہ وہ واقعات اور واردات سے لبریز ہے اور اسی وجہ سے اُس کا شمار دنیا کی بہترین شاعری میں کیا جا سکتا ہے۔

غالب کے شاگرد غالب کے بکثرت شاگرد تھے جن میں اصحاب ذیل کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں:-

مرزا اسد اللہ خان غالب دہلوی

میر مہدی مجروح

نواب ضیاء الدین خاں نیّر و رخشاں تخلص کہ ان کے عزیز بھی تھے۔ میر مہدی مجروح مرزا قربان علی بیگ سالک، خواجہ الطاف حسین حالی۔ مصنّف یادگار غالب، منشی ہرگوپال تفتہ نواب علاؤالدین خاں علائی۔ ذکی۔ عزیز۔ مشتاق و جوہر وغیرہ۔ ان میں سے بعض کے مختصر حالات آگے درج ہیں[1]۔

میر مہدی مجروح
متوفی ۱۹۰۲ء

میر مہدی مجروح[2] خلف میر حسین فگار مرزا غالب کے محبوب اور سب سے عزیز شاگرد دِلّی کے رہنے والے تھے۔ غدر کے ہنگامہ میں وطن چھوڑ کر پانی پت چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ کچھ عرصہ بعد جب کہ غدر کا طوفان فرو ہوا اور دلّی میں گونہ امن و امان کی صورت پیدا ہوئی تو پھر دِلّی آگئے اور اپنے قدیم مشغلۂ شعر و سخن سے دلچسپی لینے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ بعد چند روز کے بہ تلاش معاش الور گئے جہاں مہاراجہ شیو دھان سنگھ والی ریاست نے ان کی قدر دانی کی۔ آخر عمر میں نواب صاحب رام پور کی قدر دانی اور عنایت و مہربانی سے اسی ریاست میں چلے آئے اور بفراغت زندگی بسر کی۔ ۱۳۱۶ھ میں اپنا ایک دیوان "مظہر معانی" کے نام سے چھپوایا۔ میر مجروح کی زبان نہایت صاف و سادہ اور شیریں ہے، چھوٹی بحروں میں اُن کا کمال بوجہ احسن معلوم ہوتا ہے۔ خیالات میں ندرت اور مضامین میں جدّت ان کے کلام میں نہیں ہے مگر طرز ادا اُستادانہ ہے اور اشعار عیوب شاعری سے پاک ہیں۔ مولانا حالی ان کے بڑے معترف تھے۔ میر مجروح ان لوگوں میں ہیں جن کو اردو شاعری کی آخری یادگار سمجھنا چاہیئے۔ انہوں نے

---

[1] مصنف کتاب بابو رگھوپتی سہائے صاحب اور مسٹر صلاح الدین خدا بخش اور آنریبل شیخ عبدالقادر صاحب کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ حضرات کے بیش بہا مضامین سے جو غالب کی شاعری پر نکلے، انہوں نے بہت فائدہ اُٹھایا۔

[2] ۱۸۳۳ء کے قریب پیدا ہوئے اور ۱۵ ارمئی ۱۹۰۳ء مطابق ۱۷ صفر ۱۳۲۱ھ وفات ہوئی۔ فاضل۔

اُردو شاعری کی روایات قدیمہ کو حتی الامکان خوب نباہا۔ مرزا غالب کے اکثر دلچسپ خطوط عودِ ہندی اور اُردوئے معلّٰی میں اُن کے نام موجود ہیں۔

سالک متوفی ۱۸۹۳ء مرزا قربان علی بیگ[1] سالک نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ مگر بعض کے نزدیک مسقط الراس دِلّی ہے بہرحال کہ دلّی میں نشو و نما پائی۔ پہلے قربان تخلص کرتے اور مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر جب ان کا انتقال ہو گیا تو یہ غالب کے شاگرد ہوئے اور سالک تخلص اختیار کیا۔ غدر کے زمانہ میں یہ دِلّی چھوڑ کر الور چلے گئے۔ جہاں کچھ عرصے تک وکالت کرتے رہے۔ اس کے بعد حیدرآباد گئے۔ اور وہاں محکمۂ تعلیمات میں سررشتہ دار ہوئے حیدرآباد میں مخزن الفوائد کے نام سے ایک اُردو رسالہ زیر سرپرستی نواب عماد الملک بہادر نکلتا تھا۔ سالک کچھ عرصے تک اس کے مدیر رہے۔ ۱۲۹۱ھ میں حیدرآباد ہی میں انتقال کیا۔ "ہنجار سالک" دیوان کا نام ہے۔ یہ بھی غالب کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ کلام خیال اور زبان دونوں کے اعتبار سے اچھا ہے۔ مگر جدت سے خالی ہے۔ اُن کا شہر آشوب دہلی کی تباہی پر اور اپنے استاد غالب کا مرثیہ بہت پُرزور اور درد انگیز ہے۔

ذکی متوفی ۱۹۰۳ء نواب سیّد[2] محمد زکریا خاں رضوی متخلص بہ زکی ایک عالی خاندان شخص تھے۔ دِلّی میں ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب سید محمد خاں اور نانا نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں معظم جنگ متخلص بہ سرور ہیں۔ یہ دونوں بھی مشہور شاعر اور صاحب دیوان ہیں اور سرور کا ایک تذکرہ بھی ریختہ گو شعراء کا ہے۔ ذکی کی تعلیم دِلّی میں ہوئی اور ان کو زبان فارسی اور عربی پر عبور حاصل۔ اس کے علاوہ فن طب،

---

[1] ولادت ۱۲۴۴ھ وفات ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۱ء۔ فاضل

[2] ولادت ۱۸۳۹ء وفات ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء۔ فاضل

مرزا حاتم علی مہر

نواب سید محمد زکریا خان ذکی دہلوی

حدیث و فقہ اور تصوف اور نجوم وغیرہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ موسیقی اور فن خوشنویسی سے بھی باخبر تھے۔ مولانا صہبائی اور پنڈت رام کشور بسمل کے علوم درسیہ میں شاگرد تھے۔ فن شعر میں مرزا غالب کو کلام دکھلاتے تھے جن سے ان سے کچھ قرابت بھی تھی۔ مرزا ان کا بہت خیال کرتے اور بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ مرزا کے ہاتھ کی ایک سند کا عکس ان کے دیوان میں دیا ہوا ہے۔ ذکی کو شعر و سخن سے بہت شوق تھا اور اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ جہاں کہیں جاتے تھے شعر و سخن کی محفلیں گرماتے تھے۔ غالب کے شاگرد رشید اور ان کے طرز کے متبع تھے۔ خیال آفرینی اور جدت تخیل ان کے کلام کا جوہر ہے۔ البتہ درد و اثر اس قدر کلام میں نہیں ہے۔ مثل ظہیر و انور اور سالک وغیرہ کے ان کو بھی تلاش معاش میں وطن سے نکلنا پڑا۔ میرٹھ۔ گورکھ پور الہ آباد وغیرہ میں ملازمت سرکاری کرکے ۱۹۰۱ء میں بدایوں میں بحیثیت ڈپٹی انسپکٹر مدارس پنشن اور وہیں ۱۹۰۳ء میں انتقال کیا۔ ان کا دیوان اُن کی زندگی میں چھپ گیا تھا۔ اپنے زمانے میں طرز قدیم کے استاد مانے جاتے تھے۔ بہت سے شاگرد چھوڑے جن میں مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ اور پنڈت جواہر ناتھ کول ساقی تخلص زیادہ مشہور تھے۔

رخشاں متوفی ۱۸۸۳ء

نواب[1] ضیاء الدین احمد خاں متخلص بہ رخشاں و نیر۔ نواب احمد بخش خاں رئیس لوہارو کے چھوٹے بیٹے تھے۔ نواب صاحب لوہارو نے اپنی جاگیر اپنے چھوٹے بیٹوں کے نام منتقل کردی تھی جس کا انتظام نواب امین الدین احمد خاں کرتے تھے۔ نیر اور غالب سے رشتہ داری بھی تھی اور مرزا ان کو اپنا خلیفہ کہا کرتے تھے۔ نیر اپنے زمانہ کے اہل علم اور اہل ثروت میں ایک خاص درجہ امتیاز رکھتے تھے۔ اور شعر و سخن کے بڑے ماہر اور پرکھنے والے سمجھے جاتے تھے۔ تاریخ سے ان کو بہت دلچسپی

۱؎ ولادت اکتوبر ۱۸۲۱ء وفات ۲۷ جون ۱۸۸۹ء - ۱۳ رمضان ۱۳۰۲ھ ناقل

تھی۔ چنانچہ ایلیٹ صاحب نے اپنی مشہور تاریخ ہندوستان کی تیاری میں ان کی علمیت اور معلومات سے بہت کچھ مدد لی۔

نواب شہاب الدین احمد[1] خاں متخلص بہ ثاقب نیر کے بڑے بیٹے غالب کی بیوی کے بھتیجے اور غالب کے شاگرد بھی تھے۔ شعر اُردو و فارسی دونوں میں کہتے تھے۔ سنہ ۱۸۶۹ء میں عین عالم شباب میں بعمر اُنتیس سال انتقال کیا۔

دوسرے بیٹے نواب سعید الدین احمد خاں متخلص بہ طالب، جن کی ولادت ۱۸۵۲ء میں ہوئی، اپنے بڑے بھائی ثاقب اور ان کے مرنے کے بعد میر مجروح و سالک و حالی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ کچھ عرصے تک دلی کے آنریری مجسٹریٹ رہے۔ پھر ۱۸۷۹ء میں پنجاب کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے۔ ۱۸۸۲ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے عہدہ سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔

مرزا شجاع[2] الدین احمد خاں متخلص بہ تاباں نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے بیٹے شاداں اور داغ کے شاگرد ہیں۔ ان کے دو دیوان ہیں۔ ان کی شادی مرزا باقر علی خاں کامل کی لڑکی سے ہوئی۔ یہ وہی مرزا باقر علی خاں ہیں جن کو غالب نے پالا تھا۔ تاباں اب حضور نظام کے پنشن خوار ہیں۔

نواب[3] مرزا سراج الدین احمد خاں متخلص بہ سائل خلف نواب شہاب الدین احمد خاں داغ کے ایک سربرآوردہ شاگرد اور ایک مشہور و معروف شاعر ہیں۔

آزردہ ۱۲۰۴ھ لغایت ۱۲۸۵ھ

مفتی صدر[4] الدین خاں آزردہ خلف الرشید مولوی لطف اللہ

---

1. ولادت سنہ ۱۸۴۰ء وفات ۱۰ اپریل ۱۸۶۹ء مطابق ۲۸ محرم ۱۲۸۶ھ فاضل۔

2. ۲۳ دسمبر ۱۸۶۱ء ولادت اور ۱۶ اپریل ۱۹۲۸ء وفات پائی۔ فاضل

3. ولادت ۲۰ شوال ۱۲۸۰ھ مطابق ۲۹ مارچ ۱۸۶۴ء۔ وفات ۱۵ دسمبر ۱۹۴۵ء۔ فاضل

4. جمعرات ۲۴ ربیع الاوّل ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء وفات پائی۔ فاضل۔

مولانا سید علی حیدر صاحب طبا طبائی شارح دیوان غالب

نواب مرزا سعیدالدین احمد خان طالب دہلوی

کشمیری اپنے زمانہ کے جیّد فاضل اور تبحر عالم تھے۔ اس زمانہ کی علمی اور ادبی سوسائٹی میں ان سے بڑھ کر اور کوئی ممتاز شخص نہ تھا۔ شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی اور مولانا فضل امام سے فیض تربیت حاصل کیا تھا۔ عہدہ صدر الصدور پر فائز تھے جو اس زمانہ میں ہندوستانیوں کے واسطے سب سے بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ عربی فارسی، اُردو تینوں زبانوں میں ان کو دستگاہِ کامل حاصل تھی ان کے علم و فضل کی اس قدر شہرت تھی کہ نواب یوسف علی خاں والی رامپور اور نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم رئیس بھوپال نے ان کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا تھا۔ سر سید مرحوم بھی ان کے شاگرد تھے اور ہمیشہ ان کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کرتے تھے۔ ان کو درس و تدریس کا اس قدر شوق تھا کہ بعد انجام دینے اپنے فرائض منصبی کے اپنے اکثر شاگردوں کو سبق دیتے تھے۔ غالبؔ۔ مومنؔ۔ ذوقؔ۔ شیفتہؔ وغیرہ ان کے احباب میں سے تھے۔ غدر کے زمانہ میں یہ بھی مصیبت میں مبتلا ہوئے اور نصف جاگیر ضبط ہو گئی۔ آزردہ تینوں زبانوں یعنی عربی، فارسی، اُردو میں شعر کہتے تھے۔ اُردو میں اصلاحِ سخن پہلے شاہ نصیرؔ سے اور پھر مجرمؔ اکبر آبادی اور آخر میں میر ممنونؔ سے لیتے تھے۔ ان کے اشعار نہایت صاف و سلیس اور پُر اثر ہوتے ہیں مگر کبھی دیوان کی صورت میں مرتب نہیں کیے گئے۔ ان کا ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا بھی ہے مگر اب نہیں ملتا۔ ان کی شہرت بحیثیت ایک شاعر یا تذکرہ نویس کے اس قدر نہیں ہے جتنی کہ ان کے علم و فضل کی ہے۔

باب ۱۳

دربار رام پور و حیدر آباد
امیر و داغ کا زمانہ

بعد انتزاع سلطنت اودھ اور غدر ۱۸۵۷ء جبکہ واجد علی شاہ کلکتہ اور ابوالمظفر بہادر شاہ قید کر کے رنگون بھیجے گئے لکھنؤ اور دلّی جو ایک عرصہ تک اُردو شاعری کے مسکن و مامن رہ چکے تھے، ادبی لحاظ سے ویران ہو گئے اور یہاں کے شاعر اب ہندوستانی ریاستوں کی طرف نہایت اشتیاق اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

مٹیا برج کلکتہ میں شعراء کا مجمع

وہ شعرائے لکھنؤ جو لکھنؤ میں حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ ان میں سے بعض تو اپنے آقائے نامدار کے ساتھ ہی اور بعض غدر کے بعد جب کسی قدر تسلّط اور امن و امان ہو گیا تو راہی کلکتہ ہوئے چنانچہ بادشاہ نے جن کو مناسب نام و خطاب دینے کا خاص ملکہ تھا، اُن سات بڑے شاعروں کو جو مٹیا برج میں ان کے ساتھ تھے سبعہ سیارہ کا خطاب دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک بڑے بڑے معزز شاہی خطاب

سے بھی سرفراز تھا۔ ان لوگوں کی وجہ سے مٹیا برج کی صحبتوں میں بڑی گرما گرمی تھی مشاعرے آئے دن ہوا کرتے تھے۔ اور مٹیا برج سواد کلکتہ نہیں بلکہ لکھنؤ کا ایک محلّہ معلوم ہوتا تھا۔ اس سبعہ سیّارہ میں جن کا ذکر اوپر ہوا، بعض شعراء کے نام یہ ہیں:۔ فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برقؔ، جناب الدولہ کوکب الملک ستارہ جنگ متخلص بہ درخشاںؔ۔ مالک الدولہ صولتؔ۔ گلشن الدولہ حاجی مرزا علی متخلص بہ بہارؔ شاگرد رشکؔ۔ عیشؔ۔ منظفر علی ہنرؔ۔ جو غزل میں صباؔ کے اور مرثیہ میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے اور مخدرہ عظمیٰ نواب بادشاہ محل متخلص بہ عالمؔ اور نواب محبوب عالم صاحبہ کے کہ یہ دونوں بیویاں واجد علی شاہ کی تھیں، استاد تھے۔ اسی پر کُلفت مجمع میں داغؔ اور نظم طباطبائی بھی پہنچ گئے تھے۔ ان صحبتوں اور مشاعروں سے زبان اور شاعری اُردو کا بنگال میں بہت چرچا ہو گیا تھا۔ وہاں کے مقامی شعراء میں اُس زمانہ میں مولوی عبدالغفور نسّاخؔ[1] جو اُس وقت راج شاہی کے ڈپٹی کلکٹر تھے بہت ممتاز اور معزّز سمجھے جاتے تھے۔ نسّاخ ایک ذی کمال سخن گو سخن سنج اور اچھے نقّاد سخن تھے۔ چنانچہ تذکرۂ سخن شعراء۔ دفتر بے مثال، قطعۂ منتخب، چشمۂ فیض، شاہد عشرت، مرغوب دل۔ اشعار نسّاخ، گنج تواریخ، قند پارسی، ارمغان، بارغ فکر وغیرہ اُن سے یادگار ہیں۔ دبیر و انیس کے کلام پر ایک تنقیدی نظر ڈالی ہے جو اکثر مقامات پر صحیح تو نہیں مگر دلچسپ اور مفید ضرور ہے۔ ان کے مشہور شاگردوں میں انسخؔ تھے۔

شعرائے دہلی اپنا وطن چھوڑ کر نکلتے ہیں

پہلا سفر شعرائے دہلی کا اپنے وطن مالوف سے جس کا اشارہ صفحات گذشتہ میں کئی بار ہو چکا ہے۔ چند اسباب پر مبنی ہے۔ اور وہ یہ ہیں یعنی افغانوں اور مرہٹوں کے حملے اور دہلی کی تباہی ان کے ہاتھ سے

[1] ولادت یکم شوال ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۱ فروری ۱۸۳۴ء وفات ۱۳۰۶ھ۔ فاضل

شاہانِ دہلی کی عظمت قدیم کا جاتا رہنا۔ رعایا کی جان و مال کا عدم تحفظ۔ تلاشِ معاش کی دقتیں۔ شعراء کی بے قدری اور بیکاری پس یہی وجوہ تھیں جن کی بناء پر شعراء اپنا وطن چھوڑنے اور دوسرے مقامات میں تلاش روزگار کے لیے نکل جانے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ فرخ آباد۔ فیض آباد۔ عظیم آباد۔ مرشد آباد اور حیدر آباد دکن نے دہلی کے ان شوریدہ بختوں کو اپنی آغوشِ محبت میں بے تکلف جگہ دی۔ فرخ آباد اور فیض آباد دہلی سے بہ نسبت دوسرے مقامات کے زیادہ قریب تھے۔ مگر چونکہ فرخ آباد ایک چھوٹا مقام تھا اور رؤسا وہاں کم تھے۔ لہذا شعرائے دہلی نے پہلے فیض آباد کا اور جب فیض آباد بدل کر لکھنؤ دارالسلطنت قرار پایا تو پھر لکھنؤ کا رُخ کیا۔ لکھنؤ کے انتخاب کے خاص اسباب آگے چل کر ہم وضاحت سے بیان کریں گے۔

فرخ آباد فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رندؔ جو نواب احمد خاں بنگش کے ایک معزز رکن دربار تھے۔ خود بہت بڑے شاعر اور موسیقی داں تھے۔ شعر و سخن میں انہوں نے میر سوزؔ سے اور جب مرزا سوداؔ دِلّی سے فرخ آباد آئے تھے تو اُن سے بھی اصلاح لی تھی۔ سوداؔ نے ان کی تعریف میں کچھ قصیدے بھی کہے ہیں۔ کچھ دنوں بعد جب نواب موصوف کا خاندان برسراقتدار نہ رہا تو شعر و شاعری کا چرچا بھی وہاں کم ہوگیا۔

عظیم آباد مہاراجہ شتاب رائے جو اس زمانہ میں بنگال کے حاکم اعلیٰ تھے شاعروں کے قدر دان اور خود بھی شاعر یکتا تھے۔ اُن کے بیٹے جو راجہ تخلص کرتے تھے، میر ضیاء الدین ضیاؔء معاصر سوداؔ کے شاگرد تھے کہ وہ لکھنؤ کے بعد عظیم آباد چلے گئے تھے اسی طرح اشرف علی خاں فغاںؔ بھی مہاراجہ موصوف کے دربار میں پہنچ گئے تھے اور ان کی مہاراجہ بہت قدر کرتے تھے۔ میر باقر حزیںؔ شاگرد مرزا مظہر جان جاناں،

نواب سعادت جنگ رئیس عظیم آباد کے دامن دولت سے وابستہ تھے اور وہیں انتقال کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بہار میں شعرائے دہلی کی بڑی قدر تھی اور شعر و سخن کا چرچا یہاں خوب تھا۔

مرشد آباد نوابان مرشد آباد نے بھی اسی طرح شعرائے دہلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ان کی قدر دانی اور ان کے ساتھ بڑی مہربانی کی۔ میر سوز اور میر قدرت اللہ قدرت معاصر میر و سودا مرشد آباد گئے اور آخر الذکر وہیں ۱۲۰۵ھ میں پیوند خاک ہوئے مرزا ظہور علی خلیق، نواب نوازش محمد خاں شہاب جنگ کے بلانے سے بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی مرشد آباد آئے تھے۔ یہ اُس زمانہ کے مشہور مرثیہ گو اور مرثیہ خوان تھے۔

ٹانڈہ ٹانڈہ جو آنولہ ضلع بریلی اور رام پور کے قریب واقع ہے نواب محمد یار خاں متخلص بہ امیر کا قیام گاہ تھا۔ نواب صاحب نواب فیض اللہ خاں والی رامپور کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے اور خود بھی شاعر اور شعرا نواز تھے۔ انہوں نے پہلے میر سوز اور سودا کو بلوایا مگر جب وہ نہیں آئے تو قائم چاندپوری کو جو خواجہ میر درد و سودا کے شاگرد تھے، طلب کیا اور ان کو وہ سو روپیہ ماہوار دیتے تھے اور انہیں کے شاگرد بھی تھے۔ مصحفی۔ فدوی لاہوری۔ میر محمد نعیم پروانہ اور عشرت وغیرہ بھی اس دربار کے زلہ خوار رہ چکے ہیں۔ نواب صاحب کا انتقال بمقام رامپور ۱۱۸۶ھ میں ہوا۔

حیدر آباد پہلی مرتبہ شعراء اُس ملک کی جانب کم متوجہ ہوئے۔ اس وجہ سے کہ دُور دراز کا سفر اور راستہ مرہٹوں اور پنڈاریوں کی غارت گری کی وجہ سے پُرخطر تھا۔ مگر اس پر بھی کچھ باہمت لوگ پہنچ ہی گئے۔ چنانچہ خواجہ احسن اللہ بیان شاگرد مظہر آصف جاہ ثانی کے عہد میں حیدر آباد پہنچے اور وہیں ۱۲۱۳ھ میں رحلت کی۔

ان کے ایک شاگرد رائے گلاب چند ہمدم نے "استاد از جہاں رفت" تاریخ کہی شاہ نصیر بھی متعدد بار حیدر آباد گئے تھے۔

فیض آباد و لکھنؤ

انتخاب فیض آباد کی وجوہ

(۱) دلّی سے فیض آباد بہ نسبت دیگر مقامات مذکورہ کے قریب تر تھا۔

(۲) شعراء کی قدر وہاں بہ نسبت دیگر مقامات کے زیادہ ہوتی تھی۔

(۳) امۃ الزہرا بیگم معروف بہ بہو بیگم صاحبہ شجاع الدولہ کی بیوی اور آصف الدولہ کی ماں محمد شاہ بادشاہ دہلی کی بہت لاڈلی لے پالک بیٹی تھی۔ ان کا وطن اصلی دہلی تھا اس وجہ سے ان کو اپنے اہل وطن یعنی دلّی والوں سے کمال محبت اور ہمدردی تھی اور ان کے ساتھ اعلیٰ قدر مراتب بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتی تھیں۔

(۴) نواب آصف الدولہ بہادر کو دہلی کے رئیس اعظم خانخاناں کی بیٹی منسوب تھیں اس وجہ سے لکھنؤ کو دہلی کے ساتھ ایک دوسرا پیوند محبت نصیب ہو گیا تھا۔ کچھ شعراء پر موقوف نہیں، دہلی کے تجار، ارباب حرفہ و پیشہ، ارباب نشاط، غرض کہ ہر جماعت اور پیشہ کے لوگ فیض آباد میں بکثرت موجود تھے۔ مشہور تو یوں ہے کہ بہو بیگم صاحبہ کی داد و دہش کا شہرہ سُن کر آدھی دہلی ادھر کھنچ کر آ گئی تھی۔ برخلاف اس کے ریاست ہائے نظام و ٹیپو سلطان اور کرناٹک اور مرشد آباد دلّی سے بہت دُور تھے۔ پس کوئی تعجب نہیں کہ فیض آباد میں اتنا مجمع ہو گیا ہو۔ پھر جب نواب آصف الدولہ نے لکھنؤ کا رخ کیا اور اس کو اپنا مستقل دارالحکومت بنا لیا تو یہ ساری محفل وہاں سے اُٹھ کر لکھنؤ چلی آئی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں یا اس کے قریب قریب یہ لوگ فیض آباد اور لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ یعنی مرزا سودا، میر تقی، میر سوز، مرزا محمد تقی خاں ترقی شاگرد میر سوز، طالب علی خاں عیشی شاگرد فتیل، جعفر علی حسرت، بقاء اللہ خاں بقاء، میر حسن، میر ولی اللہ محب، شاگرد سودا، میر حیدر علی حیراں شاگرد سرب سنگھ

دیوانہ، میر ضاحک، مرزا فاخر مکین۔ میر غلام حسین برشتہ شاگرد میر۔ ضیاء۔ فغاں۔ قائم۔ مصحفی، انشا۔ جرأت۔ رنگین۔ قتیل، قاضی محمد صادق خاں اختر (جو ہوگلی کے رہنے والے تھے) ان کے علاوہ دیگر شعراء بھی مختلف اوقات میں دہلی سے لکھنؤ آتے اور لکھنؤ کی صحبت شعر و سخن کو گرماتے رہے نیز مرزا جواں بخت ولی عہد شاہ عالم جو تھوڑے دنوں لکھنؤ رہ کر بنارس چلے گئے اور مرزا سلیمان شکوہ، مرزا جواں بخت کے چھوٹے بھائی جو بعد کو آئے اور بڑے تزک احتشام سے لکھنؤ میں رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے بھی شعر و شاعری کو بہت فروغ ہوا بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ گلستان لکھنؤ عنادل خوش الحان سخن کے دل کش ترانوں اور پر لطف نواسنجیوں سے معمور اور مست ہو رہا ہے۔

شعرائے دہلی و لکھنؤ کا دوسرے مقامات پر منتشر ہو جانا

طرز لکھنؤ کو نقصان پہنچانے والی پہلی ضرب انتزاع سلطنت اودھ کو سمجھنا چاہیے جس کا نتیجہ یہ ہوا واجد علی شاہ کلکتہ بھیج دیے گئے۔ اسی کے ساتھ دوسری ضرب کاری جس نے ہماری اردو شاعری کو سخت نقصان پہنچایا۔ غدر ۱۸۵۷ء اور دہلی اور لکھنؤ کی تباہی و بربادی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اس وجہ سے کہ یہی دونوں شہر بغاوت اور نیز انتقام بغاوت دونوں چیزوں کے بڑے مرکز تھے۔ بہادر شاہ کو مجرم ٹھہرا کر اور قید کر کے ہندوستان سے باہر بھیج دیا۔ قلعۂ معلیٰ کے رہنے والے جو اب تک شعرائے دہلی کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا۔ ادھر ادھر تتر بتر ہو گئے۔ شعر و سخن کا کیا خاک خیال آتا۔ جب جان و مال کے ساتھ عزت و آبرو بھی خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ انہیں اسباب سے اور اسی حالت میں لکھنؤ اور دہلی کے شاعر اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اکثروں نے رامپور کا رخ کیا کیونکہ وہ دہلی اور لکھنؤ سے قریب تھا۔ پھر وہاں کے والی ریاست بھی اہل سخن کے بڑے قدر داں اور مربی تھے۔ کچھ لوگ حیدر آباد پہنچے۔ کچھ اطراف و جوانب کی ہندوستانی

ریاستوں۔ مثلاً الور۔ جے پور۔ بھرت پور۔ پٹیالہ۔ کپورتھلہ وغیرہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ اسلامی ریاستوں یعنی ٹونک، بھوپال، منگرول (کاٹھیاوار) مالیرکوٹلہ اور بہاولپور نے بھی اکثر خانماں برباد شاعروں کو اپنی طرف کھینچا۔ چنانچہ کچھ تو یہاں کے درباروں میں نوکر ہو گئے کچھ ان ریاستوں میں رہ کر وہاں کے والیان ملک کی فیاضیوں سے بہرہ مند ہونے لگے۔ مختصر یہ کہ رامپور اور حیدرآباد ہی ایسے دو بڑے دربار تھے جنہوں نے ان خستہ اور دل شکستہ شاعروں کی بڑی قدر کی۔ لہذا ان دو مقامات کے شعرار کا کچھ حال ہم اسی باب میں آگے کسی قدر تفصیل سے لکھیں گے۔ الور نے بھی جہاں کے حکمران مہاراجہ شیودھان سنگھ مشہور قدردان سخن تھے۔ ظہیر۔ تصویر۔ تشنہ شاگردان ذوق اور میر مجروح اور سالک شاگردان غالب کی بڑی قدر کی۔ مہاراجہ موصوف نے مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانہ عجائب کو بھی اپنے یہاں بلایا تھا۔ اسی طرح ظہیر اور ان کے چھوٹے بھائی انور جے پور چلے گئے اور آخرالذکر کا انتقال بھی وہیں ہوا ارشد گورگانی مالیرکوٹلہ اور بہاولپور میں رہے۔ ٹونک منگرول اور بھوپال کا علیحدہ علیحدہ ذکر آتا ہے۔

ٹونک والی ٹونک نواب محمد ابراہیم علی خاں ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے اور اپنے پدر بزرگوار نواب محمد علی خاں کی معزولی کے بعد ۱۸۶۶ء میں مسند آرائے حکومت ہوئے یہ شاعر ہیں اور خلیل تخلص فرماتے ہیں۔ پہلے بسمل خیرآبادی شاگرد امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مضطر خیرآبادی سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ ان کے دربار میں اور بھی بہت سے شاعر تھے جن میں ظہیر اور نواب سلیمان خاں متخلص بہ اسد زیادہ مشہور ہیں۔ اسد میر مظفر علی اسیر کے شاگرد اور صاحب دیوان ہیں۔ نواب صاحب موصوف نے ان کو خاص طور پر ٹونک طلب کیا تھا۔ ان کے شاگرد وہاں موجود ہیں۔ مثلاً اصغر علی خاں آبرو۔ حبیب اللہ ضبط۔

عبدالرحیم خاں شرف۔ خواجہ سید کرامت علی غلش داغ کے شاگرد تھے انہوں نے اپنے بعد ایک غیر مطبوعہ دیوان اور بہت سے شاگرد چھوڑے اور ۱۹۰۲ء میں انتقال کیا۔ نواب صاحب موصوف کے صاحبزادے بھی شاعر ہیں اور اپنے پدر بزرگوار کے قدم بقدم چلتے ہیں۔

منگرول | کاٹھیاوار میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست ہے اس دُور دراز مقام میں بھی اُردو شاعری کا خوب چرچا ہوا۔ جس کی وجہ والی ریاست نواب حسین میاں بہادر کی توجہ اور قدردانی کہی جاسکتی ہے۔ ان بزرگوار نے لکھنؤ اور دِلّی کے اُس وقت کے اکثر نامور شاعروں کو اپنی ریاست میں یکے بعد دیگرے طلب کیا تھا۔ چنانچہ داغ۔ تسلیم۔ جلال اور تمشاد جو ناسخ کے مشہور شاگرد اور لکھنؤ میں اُستاد مانے جاتے تھے اس قدردان سخن کی فیاضیوں سے وقتاً فوقتاً بہرہ یاب ہوتے رہے۔ مقام کی دُوری اور آب و ہوا کی ناسازگاری کی وجہ سے ان لوگوں نے وہاں قیام تو زیادہ نہیں کیا مگر اکثر ان میں سے ریاست سے ماہانہ تنخواہ پاتے رہے جو ان کو ان کے مکان پر برابر بھیج دی جاتی تھی۔

بھوپال | فرماں روائے ریاست[1] ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ بالقابہا اپنی ریاست کیا بلکہ تمام ہندوستان کے تعلیمی معاملات میں بے حد دلچسپی لیتی ہیں۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی اور اسی طرح کی دیگر قومی تعلیم گاہوں کے قیام میں انہوں نے ہمیشہ بہت بڑی فراخدلی سے حصّہ لیا ہے اور شاہانہ عطیے ان کو عنایت کیے ہیں۔ خود بھوپال میں صدہا اسکول اور مدارس ان کے عہد مبارک میں اور ریاست ہی کے روپیہ سے قائم ہوئے جو ہمیشہ ان کی علم دوستی اور ہنر پروری کی یادگار رہیں گے۔ آپ

---

[1] موجودہ فرمانروائے ریاست ہز ہائینس نواب حمید اللہ خاں بہادر بالقابہ ہیں ۱۲۔ (نواب صاحب بھی ۱۹۵۵ء کے بعد فوت ہو گئے۔ فاضل)

مختلف علوم و فنون میں کافی دستگاہ رکھتی ہیں اور متعدد کتابوں کی مصنّفہ ہیں۔ بہت سے قابل ابنائے وطن کو جو ناسازگاری زمانہ کی وجہ سے اپنے علمی کارناموں کو شایع نہ کر سکے، آپ کی ذات سے بہت بڑی مدد پہنچی ہے۔ سیرت نبوی کی تکمیل کے واسطے جس کا بہت بڑا حصّہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے تیار کر دیا تھا۔ اب تک معقول رقم ماہانہ عطا فرماتی رہتی ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ بھی بہت اچھی شاعرہ تھیں اور اُردو میں شیریںؔ اور بعد کو تاجورؔ اور فارسی میں شاہجہاںؔ تخلص کرتی تھیں انہوں نے اپنا عقد ثانی نواب صدیق حسن خاں صاحب سے کر لیا تھا۔ نواب صاحب موصوف عربی و فارسی کے بڑے عالم و فاضل اور اپنے زمانہ کے ایک مشہور محدث اور مفسر سمجھے جاتے تھے۔ مفتی آزردہ کے شاگرد تھے اور تقریباً ڈیڑھ دو سو کتابوں کے مصنّف تھے۔ شعرا اور اہل علم کے بڑے قدر دان تھے۔ اُردو میں توفیقؔ اور فارسی اور عربی میں نواب تخلص کرتے تھے۔ نواب شاہجہاں بیگم کے والد ماجد نواب جہانگیر محمد خاں مرحوم بھی خوب شعر کہتے تھے اور دولتؔ تخلص کرتے تھے۔ اُن کا دیوان چھپ گیا ہے۔ علاوہ خاندان ریاست کے بھوپال میں اور بھی بہت خوش گو شاعر ہمیشہ رہے ہیں۔

چونکہ ترقی شاعری کے آخری عہد میں رام پور و حیدر آباد نے شعرا کے اجتماع اور قدر دانی میں بہت نمایاں حصّہ لیا ہے۔ لہذا اُن کا حال اختصار کے ساتھ علیحدہ علیحدہ لکھا جاتا ہے۔

رام پور ہمارے نزدیک اس امر کی کہ رام پور میں بہ مقابلہ اور شہروں کے شعرا کا مجمع خاص طور پر زیادہ ہوا تین وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دلّی اور لکھنؤ کے درمیان اور ان دونوں شہروں سے مساوی فاصلہ پر واقع ہے۔ دوسرے یہ کہ فرمانروایان ریاست خود بھی زبردست شاعر اور سخن سنج اور شعرا کے قدردان تھے اور شعرا کی

جناب نواب سید کلب علی خان بہادر خلد آشیان

نواب سید یوسف علی خان بہادر فردوس مکان والی رامپور

محنت و جگر کاری کے بدلے ہمیشہ ان کو بیش بہا انعامات و وظائف سے سرفراز کرتے رہتے تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ علماء و ادباء اور شعراء کو اپنا ملازم نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان سے مساویانہ برتاؤ کرتے اور اکثر ان کی نازک مزاجیاں برداشت کرتے تھے۔ ان کا دربار اسی قسم کے اہل علم و فضل کا مجمع تھا اور نواب صاحب خود اُن کی دلچسپیوں میں حصہ لیتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بڑی بڑی تنخواہوں پر بھی اول تو رامپور سے نکلنا ہی نہیں چاہتے تھے اور اگر جاتے بھی تو ہمیشہ رامپور کو یاد کرتے رہتے تھے۔

نواب یوسف علی خاں

نواب[1] یوسف علی خاں خلف نواب محمد سعید خاں بڑے علم دوست ہنرپرور اور شعراء کے مربی رئیس تھے۔ خود بھی شاعر تھے اور اردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں ناظم تخلص کرتے تھے۔ صاحب دیوان تھے۔ ابتداء میں حکیم مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ اُن کے بعد مرزا نوشہ غالب پھر میر مظفر علی اسیر کو کلام دکھلانے لگے۔ دلّی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد جو شاعر وہاں سے نکلے اُن کو رامپور ہی میں جگہ ملی تھی۔ مولانا فضل حق خیرآبادی۔ مرزا غالب۔ امیر حسین تسکین۔ میر مظفر علی اسیر اور بہت سے علماء و شعراء ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ نواب صاحب موصوف نے شعرائے دہلی و لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع کرکے اردو شاعری کو گنگا جمنی کر دیا تھا۔ یعنی ان دونوں طرزوں کو ملا کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی تھی۔ جس نے ان کے بلند اقبال صاحبزادے نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں بڑی ترقی کی۔

نواب کلب علی خاں
۱۲۵۰ھ تا ۱۳۰۴ھ

نواب کلب علی خاں[2] کے عہد میں جو ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء میں اپنے والد نواب یوسف علی خاں کی جگہ مسند نشین ہوئے اردو شاعری نے

---

[1] مولود ۵ مارچ ۱۸۱۶ء مطابق ۵ ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ متوفی ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء مطابق ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ۔ فاضل

[2] ولادت اتوار ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۷ اپریل ۱۸۳۵ء وفات ۲۴ جمادی الآخر ۱۳۰۴ھ۔ فاضل۔

رام پور میں پہلے سے بھی زیادہ ترقی کی۔ برخلاف فریڈرک اعظم بادشاہ جرمنی کے جو اپنے زمانہ میں کل بادشاہان یورپ میں علم و ہنر کا بڑا مربّی اور قدردان سمجھا جاتا تھا۔ نواب صاحب موصوف بڑے سخی اور فیّاض تھے اور ہمیشہ انعام و اکرام سے شعراء کی قدر افزائی کرتے تھے۔ ان کا مبارک عہد ادبی حیثیت سے رام پور کا زرّیں عہد کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی دانش مندی قدردانی اور مردم شناسی سے اپنی چھوٹی سی ریاست میں بڑے بڑے اہل کمال اور ارباب فن کو جمع کر لیا تھا جس کی نظیر ہندوستان کی کسی دوسری ریاست میں نہیں ملتی تھی۔ اس ریاست میں اُس وقت کے بہتر سے بہتر حکماء۔ کامل نبّاض۔ شعراء خوش نویس یہاں تک کہ ہر ایک حرفہ اور پیشہ کے بھی مشہور اہل کمال مثلاً چوبدار، باورچی، رکاب دار وغیرہ سب موجود تھے۔ علماء کے گروہ میں علامہ عبدالحق خیرآبادی، علامہ عبدالحق مہندس۔ مولانا ارشاد حسین۔ سید حسن شاہ محدث اور مفتی سعداللہ وغیرہ، حکما اور اطبّا کے طبقہ میں حکیم محمد ابراہیم اور ان کے صاحبزادے حکیم عبدالعلی حکیم علی حسین اور حکیم احمد رضا و حکیم حسین رضا وغیرہ تھے۔ شعراء کی جماعت بہت زبردست تھی۔ یوں تو اور بہت سے تھے مگر مشہور لوگوں میں یہ حضرات زیادہ نامور ہیں۔ میر مظفر علی اسیر۔ شیخ امداد علی بحر۔ اکبر۔ داغ۔ تسلیم جلال۔ منیر۔ قلق۔ عروج۔ حیا۔ جان صاحب آغا حجو شرف شاگرد آتش۔ اُنس شاگرد ناسخ۔ شاغل۔ شاداں۔ غنی۔ ضیا۔ خواجہ محمد بشیر۔ منصور۔ رضا وغیرہ۔ ان مشاہیر کے علاوہ اور سینکڑوں قابل اور لائق شخص پڑے ہوئے تھے جن کی پرورش اور قدردانی ریاست کرتی تھی۔ مقرب لوگوں کے قیام کے واسطے ایک اعلےٰ درجہ کا مکان مخصوص تھا۔ جو مصاحب منزل کے نام سے مشہور تھا مگر باوجود ان اخراجات شاہانہ کے اسراف کا الزام ریاست پر عائد نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ جتنے لوگ تھے۔ سوائے مولانا ارشاد حسین مولوی عبدالحق اور منشی امیر احمد مینائی کے کسی کی تنخواہ سو روپیہ سے زیادہ نہیں تھی

علاوہ اس کے کسی کو مفت اور فضول تنخواہ نہیں ملتی تھی اور یہ سب لوگ ریاست کے مختلف کاموں پر باعتبار اپنی قابلیت اور سن کے مقرر تھے ۔ مگر یہ ضرور ہے کہ نواب صاحب اپنے تمام ملازمین سے قطع نظر انعام و اکرام کے نہایت شفقت اور محبت سے پیش آتے رہتے تھے ۔ عید بقرعید اور اکثر خوشی کے موقعوں پر تمام معزز اور مقرب لوگوں کو خلعت اور انعام سے سرفراز فرماتے اور جن سے زیادہ خصوصیت ہوتی اُن کی خبرگیری خاص طور پر فرماتے ۔ قرض داروں کا قرض ادا کر دیتے اور مختلف طریقوں سے ان کو رہین منت کرتے تھے ۔

نواب کلب علی خاں نے درسیات معقول و منقول مولانا فضل حق خیرآبادی سے پڑھی تھیں پہلے انہوں نے اُردو فارسی نثر لکھنے کی مزاولت کی ۔ اور اکثر کتابیں تصنیف کیں منجملہ جن کے بلبل نغمہ سنج ۔ ترانۂ غم ۔ قندیل حرم اور شگوفہ خسروی زیادہ مشہور ہیں ۔ فارسی میں ان کا دیوان تاج فرخی کے نام سے مشہور ہے ۔ اُردو میں اپنا کلام امیر مینائی کو دکھلاتے اور انہیں سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور چار دیوان ان کی یادگار اور ان کی اعلیٰ قابلیت کے نمونے ہیں ۔ نشید خسروانی ۔ دستنبوئے نغمۂ قاآنی ۔ درۃ الانتخاب ۔ اور توقیع سخن نواب صاحب نوابؔ تخلص کرتے تھے اور نہایت عمدہ شعر کہتے تھے ۔ ان کو تحقیق لفظی کا خاص شوق تھا ۔ اور الفاظ کی صحت و عدم صحت کے مناظرے ان کے سامنے اکثر ہوا کرتے تھے ۔ جن میں بحرؔ تسلیمؔ جلالؔ ۔ امیرؔ ۔ اور منیرؔ وغیرہ ، جو اس فن خاص میں خاص بصیرت اور دلچسپی رکھتے تھے ، نمایاں حصہ لیتے تھے ۔ اسی وجہ سے نواب صاحب کا بیشتر کلام متروکات اور غیر فصیح الفاظ اور ترکیبوں سے پاک ہے ۔

اس اجتماع شعراء کا یہ نتیجہ بہت اچھا ہوا کہ اس کی وجہ سے دلّی اور لکھنؤ کے مختلف طرز آپس میں مل گئے اور ایک نئے طرز کی بنیاد پڑی جس کی ابتداء نواب

یوسف علی خاں کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ یہ اُردو شاعری کا ایک ایسا اہم اور غور طلب مسئلہ ہے جس کی طرف کافی توجہ اب تک منعطف نہیں ہوئی ہے۔ ناسخ کا طرز ان کے شاگردوں کے زمانہ میں جو کہ اپنے اُستاد کی اُستادانہ روش کو قائم نہ رکھ سکے تھے، بد سے بدتر ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کے کلام میں اس طرز کے تمام عیوب تو موجود تھے۔ مگر خوبیاں مفقود تھیں۔ اس طرز کے برتنے والے رامپور میں بحر۔ منیر۔ خلق اور اسیر تھے۔ برخلاف اس کے طرزِ دلی کے پیرو داغ و تسلیم تھے۔ داغ گو کہ ذوق کے شاگرد تھے مگر انہوں نے ایک ایسا دلکش طرز اختیار کیا تھا۔ جس میں جرأت کا کچھ رنگ ملتا جلتا تھا۔ ان میں اور لکھنؤ والوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ان کے اشعار بہت مقبول ہوئے۔ ہر شخص ان کے رنگ کا دلدادہ تھا۔ تسلیم گو کہ لکھنؤ کے تھے مگر رنگ بالکل دلی کا اختیار کیا تھا۔ وہ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے جو مومن کے شاگرد تھے۔ نسیم کے طرز کی کیفیت ہم ان کے حالات میں مفصل بیان کر چکے ہیں۔ ان کے شاگرد تسلیم پر ناسخ کے رنگ کا جادو کبھی نہ چلا وہ اُس کو ہمیشہ بُرا سمجھتے رہے اور جہاں کہیں رہے، اپنے استاد اور استاد الاستاد یعنی نسیم اور مومن کی پیروی کرتے رہے۔ مومن اور غالب تھوڑے عرصہ تک رامپور میں رہے تھے۔ اس وجہ سے ان کا اثر کچھ زیادہ نہ پڑ سکا اور میر حسین تسکین کوئی ایسے بلند مرتبہ شخص نہ تھے کہ اپنا اثر اپنے وقت کی زبان اور شاعری پر ڈالتے۔ مختصر یہ کہ یہ دونوں اسکول یعنی لکھنؤ اور دلی۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے لغو مباحثہ کرتے رہے۔ جس کا نتیجہ شاعری کے لئے عموماً اچھا ہوا یعنی ناسخ کے زمانہ سے جو ایک بے جا لفاظی اور تصنع کا شوق داخل زبان ہو گیا تھا وہ جاتا رہا یا کم سے کم اس کو شدید نقصان پہنچا۔ اور اسی کے ساتھ لفظی تحقیق کا یہ مبارک نتیجہ ہوا کہ ایسے الفاظ اور ترکیبیں جو قدما کی یادگار اور اہل دہلی کی مایۂ ناز تھیں رخصت ہو گئیں۔ اب لوگ

شاعری کے صحیح جذبات اور ان کے مناسب الفاظ سے واقف ہو گئے۔ لکھنؤ کے طرز قدیم سے شیداؤں نے دیکھ لیا کہ اب اس جدید کے رنگ سامنے ان کا رنگ نہیں جم سکتا مجبوراً اُن کو طرز دہلی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ چونکہ داغ کو مقبولیت عام حاصل ہو رہی تھی جیسا کہ ہم ابھی اوپر کہہ چکے ہیں۔ لہٰذا ان نے معاصرین کو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ پبلک کی پسند کا اتباع کرتے ہوئے وہی طرز اختیار کریں۔ چنانچہ امیر جو داغ کے بڑے حریف اور مدِمقابل تھے۔ ان کا بھی اس راستے عام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور اسی وجہ سے ان کا دوسرا دیوان یعنی "صنم خانۂ عشق" داغ کے رنگ میں ہے۔ گو کہ کہیں کہیں اپنے خاص رنگ میں بھی کہہ جاتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے "جوہر انتخاب" اور "گوہر انتخاب" ایک میر اور دوسرا خواجہ میر درد کے رنگ میں کہہ کر اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ دلی کے رنگ کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاگردان امیر علی الخصوص ریاض۔ جلیل اور حفیظ نے ایک قدم اور بڑھایا بلکہ ان کے اکثر اشعار تو ایسے ہیں جو داغ اور شاگردان داغ کے کلام سے علیحدہ نہیں کیے جا سکتے۔ یہی حال جلال کا بھی سمجھنا چاہیے۔ جلال، رشک اور برق کے شاگرد تھے۔ اور ان کی نشو و نما بالکل لکھنؤ کے طرز پہ ہوئی تھی۔ مگر تعجب ہے کہ انہوں نے بھی اس رنگ کو چھوڑ کر دلی کا رنگ اختیار کیا۔ چنانچہ ان کا ایک دیوان بالکل اسی رنگ کا ہے اور اس میں انہوں نے میر کی بہت پیروی کی ہے۔ مگر ہمارے اس لکھنے سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ امیر و جلال بالکل اپنے رنگ کو بھول گئے تھے البتہ ایک بڑی حد تک اس کی پیروی کرتے تھے۔ ہمارے خیال میں قدیم رنگ کا خاتمہ اس وقت ہوا جب کہ انجمن معیار لکھنؤ میں قائم ہوئی جس کے ماہوار رسالے اور اس کی تحقیقات نے طرز قدیم کو لوگوں کے دل سے محو کر دیا۔

موجودہ فرماں روائے رامپور

موجودہ فرماں روائے رامپور[1] یعنی ہز ہائینس نواب سید حامد علی خاں صاحب بہادر بجمیع القابہ ایک نہایت روشن خیال تعلیم یافتہ اور مثل اپنے اسلاف کرام کے نہایت اعلےٰ درجہ کے شعر اور سخن فہم اور شعراء کے مربی اور سرپرست ہیں۔ ان کے زمانہ میں بھی شعراء اور ہر قسم کے باکمالوں کا رام پور میں مجمع رہتا ہے۔ اور یہ لوگ ہمیشہ کے جود و سخا سے بہرہ یاب ہوتے رہتے ہیں۔ اس زمانہ کی تمام قومی درس گاہیں اور مفید تحریکیں ان کے فیوض نامتناہی سے فیض یاب ہوتی رہتی ہیں۔

امیر مینائی
۱۲۲۴ھ لغایت ۱۳۱۶ھ

منشی امیر احمد[2] مینائی امیرؔ تخلص خلف مولوی کرم محمد ۱۸۲۸ء میں بہ عہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ حضرت مخدوم شاہ مینا کے، جن کا مزار لکھنؤ میں مرجع خاص و عام ہے، خاندان میں ہیں۔ اسی تعلق سے مینائی کہلائے۔ درسی کتابیں مفتی سعد اللہ مرحوم اور ان کے ہم عصر علمائے فرنگی محل سے پڑھی تھیں اور عربی و فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ منشی صاحب اپنی ذات سے بڑے منکسر المزاج صاحب زہد و تقویٰ اور صوفی مشرب بزرگ تھے۔ طب جفر و نجوم وغیرہ سے بھی واقف تھے۔ نہایت ذکی و طباع محنتی اور جفاکش تھے۔ اسی وجہ سے اپنے معاصروں میں جس طرح اپنی وضع داری اور سادگی کی وجہ سے مشہور تھے۔ اسی طرح اپنے علم و فضل اور کمال و قابلیت میں بھی ان سے ممتاز تھے۔

---

[1] نواب حامد علی خاں کے بعد نواب رضا علی خاں رامپور کے فرماں روا ہوئے اور ماشاءاللہ اب تک زندہ ہیں۔ ریاست ضبط ہو چکی ہے۔ فاضل

[2] ۱۶ ر شعبان ۱۲۴۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ۱۹ ر جمادی الآخر ۱۳۱۸ھ حیدرآباد میں وفات ہوئی۔ فاضل۔

شعر و سخن کا شوق بچپن ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس فن میں آپ کو منشی مظفر علی اسیر سے تلمذ تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمہ دانی اور طبیعت کی روانی سے اپنے استاد سے بھی بڑھ گئے۔ ان کے وقت میں تمام فضائے لکھنؤ شاعری سے بھری ہوئی تھی۔ شاگردان آتش و ناسخ کے مناقشے روز مرہ کے مشاعرے جس میں شہر کے اساتذہ مثل صبا و خلیل و رند و سحر وغیرہ کے شرکت کرتے تھے، مراثی کے زور و شور اور انیس و دبیر کے معرکے غرض کہ ان تمام چیزوں نے ہونہار شاعر کی منچلی طبیعت پر بہت بڑا اثر ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کی محنت و جانکاہی میں ایسی مشق سخن بہم پہنچائی اور اتنی شہرت حاصل کی کہ ۱۸۵۲ء میں ان کے اشعار کا تذکرہ سلطان عالم واجد علی شاہ کے دربار میں ہوا اور ان کو بلا کر ان کا کلام سنا گیا اور حسب الحکم دو کتابیں "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" انہوں نے تصنیف کیں۔ جن کے صلہ میں خلعت فاخرہ اور انعام عطا ہوا۔ اسی وقت سے ان کی شہرت کا زمانہ شروع ہوا جو برابر ترقی کرتا گیا۔ مگر الحاق اودھ اور غدر کی وجہ سے شعرائے دربار کے تمام حوصلے پست ہو گئے۔ اور وہ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ بعد غدر امیر نے دوستوں کے کہنے سے سرکاری ملازمت کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر جب عہدۂ صدر اعلیٰ کے واسطے صاحب جج کو درخواست دینے کے متعلق ان سے کہا گیا تو ان کو یہ بات اچھی نہ معلوم ہوئی اور ملازمت کا خیال ہی ترک کر دیا۔ تھوڑے روز کی بیکاری اور خانہ نشینی کے بعد فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والی ریاست رامپور نے ان کو طلب کیا جو شعرائے لکھنؤ و دہلی کے اُس وقت بڑے سرپرست تھے۔ نواب موصوف کے انتقال کے بعد خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کا عہد حکومت آیا۔ جس میں اُردو شاعری کو بھی فروغ ہوا۔ ان سخن فہم اور رتبہ شناس رئیس کے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تمام

ہندوستان کے نامی وگرامی شعراء اور باکمالوں کو بُلا کر اپنے دامنِ دولت کے سائے میں لے لیا تھا۔ غرض کہ یہ زمانہ یعنی امیرؔ کے قیام کا زمانہ ان کی شاعری اور اقبال دونوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس میں ان کو نواب کی استادی کا فخر حاصل ہوا۔ رام پور میں ان کو بڑی عزت حاصل تھی اور وہ ایک بڑی ادبی اور سوشل ہستی سمجھے جاتے تھے۔ تنخواہ بھی معقول تھی۔ جس کی وجہ سے بڑے مزے سے آزادانہ زندگی بسر کرتے اور شعروشاعری اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہتے تھے۔ غرض کہ ۴۳ برس رامپور میں نہایت عزت وآبرو سے بسر کرکے، جس میں اکثر مرتبہ لکھنؤ بھی آنا ہوا تھا۔ بالآخر حیدرآباد کو روانہ ہوئے۔ وہاں جانے کی تقریب اس طرح ہوئی تھی کہ سنہ ۱۹۰۰ء میں جب نظام حیدرآباد کلکتہ سے واپس آرہے تھے تو راستہ میں بنارس بھی ٹھہرے۔ امیرؔ نے ایک قصیدہ ان کی تعریف میں لکھ کر بمقام بنارس ان کی حضور میں پیش کیا۔ حضور نظام کو وہ بہت پسند آیا اور امیرؔ سے حیدرآباد آنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۰ء میں وہ عازم حیدرآباد ہوئے۔ یہاں تھوڑے دن قیام کیا تھا کہ بیمار ہوئے اور تہتر برس ڈیڑھ مہینے کی عمر میں رحلت کی۔ علالت کے زمانہ میں داغؔ اور پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ ان کی عیادت کو جاتے تھے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بھی اکثر تشریف فرماتے تھے جیسا کہ منشی صاحب اس رباعی سے ظاہر ہوتا ہے ؎

رُباعی

ہے آپ کا اخلاص جو ہمدرد مرا | رشکِ دمِ عیسیٰ ہے دمِ سرد مرا
فرماتے ہیں ہر روز عیادت میری | درماں مرے حق میں ہو گیا درد مرا

داغ نے وفات کی یہ تاریخ کہی

وائے دیلا چل بسا دنیا سے وہ	جو مرا ہم فن تھا میرا ہم صفیر
مصطفےٰ آباد سے آیا دکن	یہ سفر تھا اُس مسافر کا اخیر
کیا کہوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں	کیا لکھوں تفصیل امراض کثیر
مبتلائے حدتِ صفرا و تپ	مورد آزار و اسہال و زحیر
گو بظاہر تھا امیر احمد لقب	در حقیقت باطناً پایا فقیر
شاہ مینا سے ہے نسلی سلسلہ	شاعری میں خاص تلمیذ اسیر

ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی

قصرِ عالی پائے جنت میں امیر

۱۳۱۸ھ

تصانیف امیر بہت پر گو شاعر تھے۔ ان کی بعض نثر کی کتابیں اور ایک اُردو دیوان موسوم بہ "غیرت بہارستان" سُنا جاتا ہے کہ زمانۂ غدر میں تلف ہو گئے پھر دوسری آفت یہ آئی کہ ۱۸۹۵ء میں ان کے مکان میں آگ لگ گئی جس میں اُن کی اکثر تصانیف اور قیمتی کتابیں جل کر خاک ہو گئیں۔ موجودہ تصانیف میں جن کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے، اُن کے دو دیوان عاشقانہ یعنی "مراۃ الغیب" اور "صنم خانۂ عشق" اور ایک نعتیہ اشعار میں موسوم بہ "محامد خاتم النبیین" نیز "امیر اللغات" نہایت قابل قدر اور مشہور و معروف تصانیف ہیں۔ ان کی تصانیف ترتیب وار حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ارشاد السلطان۔

(۲) ہدایت السلطان

(۳) غیرت بہارستان۔ اس میں وہ غزلیں ہیں جو قبل غدر مشاعروں میں پڑھی تھیں۔ نیز چند قصائد در مدح واجد علی شاہ۔ یہ کلام غدر میں تلف ہو گیا۔

(۴) نور تجلّی

(۵) ابرِ کرم۔ یہ دونوں مثنویاں بھی غدر سے پہلے لکھنؤ میں لکھی تھیں۔

(۶) ذکرِ شاہِ انبیاء بصورتِ مسدّس مولود شریف ہے۔

(۷) صبحِ ازل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ولادت کے بیان میں۔

(۸) شامِ ابد۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے وصال کے بیان میں

(۹) لیلۃ القدر۔ معراج کے حال میں۔

(۱۰) مجموعۂ واسوخت۔ چھ واسوختوں کا مجموعہ جن کے تاریخی نام حسب ذیل ہیں اور سنہ تصنیف ۱۲۸۰ھ ہے۔ یعنی "بانگِ اضطرار"۔ "واسوختِ اردو"۔ "شکایاتِ رنجش"۔ "صفیرِ آتشبار"۔ "حسدِ اغیار"۔ "غبارِ طبع"۔ اس مسدّس کو ایک عمدہ دیباچہ کے ساتھ "مینائے سخن" کے نام سے دائرہ ادبیہ لکھنؤ نے چھاپا ہے۔

(۱۱) محامد خاتم النبیین۔ مولفہ ۱۲۸۹ھ نعتیہ دیوان ہے۔

(۱۲) انتخابِ یادگار۔ رامپور کے شعرائے اردو کا تذکرہ ہے جو نواب کلب علی خاں بہادر کے حکم سے ۱۲۹۰ھ میں لکھا تھا۔ جیسا کہ تاریخی نام سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۱۳) خیابانِ آفرینش۔ نثر میں مولود شریف ہے۔

(۱۴) مرآۃ الغیب۔ اردو غزلوں اور قصائد کا پہلا دیوان ہے۔

(۱۵) صنم خانۂ عشق مطبوعہ ۱۳۱۳ھ۔

(۱۶) جوہرِ انتخاب

(۱۷) گوہرِ انتخاب۔ مولفہ ۱۳۱۰ھ یہ دونوں میر تقی میر اور خواجہ میر درد کے رنگ میں کچھ غزلیں لکھی گئی ہیں۔

امیر مینائی

داغ دہلوی

(۱۸) تیسرا دیوان جو ہنوز غیر مطبوع ہے۔ اس میں چند قصائد اور رباعیات شامل ہیں۔

(۱۹) سُرمۂ بصیرت۔ جو ایسے عربی و فارسی الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جو اُردو میں غلط استعمال ہوتے ہیں۔ اس میں اُن کا صحیح طریقہ استعمال مع اسناد کے بتایا ہے۔

(۲۰) بہارِ ہند۔ ایک مختصر لغت اُردو محاورات و الفاظ کی جس کو امیر اللغات کا نقش اوّل کہنا چاہیے۔

(۲۱) امیر اللغات جس کو منشی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہ گئی۔ صرف دو جلدیں الف ممدودہ اور الف مقصورہ کی اب تک تیار ہوئی ہیں۔ اس کتاب میں قابل مصنف کے تبحر اور جامعیت اور تیز زبان کی بے حد کد و کاوش اور محنت و جانکاہی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی دو جلدیں چھپ گئی ہیں۔ تیسری بھی تیار تھی مگر شایع نہ ہو سکی۔ ابتداءً آٹھ جلدوں میں اس کے نکالنے کا ارادہ تھا۔ نواب کلب علی خاں بہادر کے عہد میں شروع ہوئی تھی اور اس کے بڑے سرپرست ہز آنر سر الفرڈ لائل لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ تھے۔ جنرل عظیم الدین خاں نائب پریسیڈنٹ کونسل آف ریجنسی رامپور نے بھی اس کی سرپرستی کی تھی۔ منشی صاحب نے اپنے خطوط میں اس کتاب کا اکثر ذکر کیا ہے۔

(۲۲) خطوط اور متفرق چیزیں نظم و نثر میں۔ منشی صاحب کے شاگرد اور دوست بہت کثرت سے تھے اور منشی صاحب کو خط لکھنے کا بہت شوق تھا لہٰذا ان کا مجموعۂ خطوط بہت دلچسپ ہے اس کو ان کے شاگرد رشید مولوی احسن اللہ خاں ثاقب نے ایک نہایت مفید اور دلچسپ دیباچہ کے ساتھ شایع کیا ہے۔

ان خطوط سے منشی صاحب کے عادات و اطوار اور کیرکٹر پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے اور اگر کوئی لکھنا چاہے تو ان کی سوانح عمری کا بہت عمدہ مواد اُن سے فراہم ہو سکتا ہے۔ نیز اُن میں فن نظم اور زبان کے متعلق اکثر مشکل مسائل کو حل کیا ہے۔ رسالۂ اسرارِ نظم" اور "زاد الامیر" اور "مناجات" وغیرہ کو ان کے متفرق تصانیف میں سمجھنا چاہیے۔

شاگرد منشی صاحب کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:
ناظم۔ نواب۔ صفدر۔ جاہ۔ جلیل۔ ریاض۔ برہم۔ زاہد۔ کوثر خیرآبادی۔ وسیم۔ حیران۔ محسن کاکوروی۔ عابد۔ رعنا۔ دل۔ قرار۔ ثاقب۔ اصغر۔ مضطر۔ سرشار۔ حفیظ جونپوری آہ۔ اختر۔ قمر۔ ان میں ریاض۔ جلیل۔ مضطر اور حفیظ بہت مشہور ہیں۔

امیر کی شاعری امیر نہ صرف ایک طباع شاعر بلکہ ایک متبحر عالم بھی تھے۔ اور ادبی دنیا میں ان کی شہرت انہیں باتوں پر مبنی ہے۔ ان کا پہلا مطبوعہ دیوان مراۃ الغیب کسی قدر ناموزوں ہے۔ کیونکہ ابتدائی کلام کے ساتھ بہت بھدا اور بے مزہ ہے بعد کی غزلیں جن سے مشاقی اور پختگی معلوم ہوتی ہے، ملی جلی ہیں۔ ان کے ابتدائی کلام میں وہ سب عیوب موجود ہیں جو ناسخ کے رنگ کے لیے مخصوص ہیں۔ یعنی بے جا رعایت لفظی، ابتذال، رکیک اور بدنما تشبیہیں۔ عورتوں کا لباس اور سامان زینت مثلاً انگیا، کرتی۔ اور کنگھی چوٹی وغیرہ۔ غرض کہ اس میں کوئی چیز نئی اور بے تکلف نہیں ہے۔ بلکہ وہی پرانے فرسودہ مضامین ہیں جو اُلٹ پلٹ کر رنگین عبارت میں بیان کیے گئے ہیں۔ البتہ اُن کا دوسرا دیوان "صنم خانۂ عشق" ان کے مُنھ چڑھے حریف اور معاصر داغ کے طرز پر ہے۔ اور اس میں اعلےٰ تخیل سلاست روانی اور دلکش عاشقانہ ترکیبیں بکثرت موجود ہیں۔ ان کے نعتیہ اشعار گو کہ قدیم مقررہ طرز میں ہیں مگر اکثر اعلےٰ تخیل۔ فصاحت و بلاغت اور جوش اعتقاد کے بہترین نمونے ہیں۔

غرض کہ منشی صاحب کو مختلف اصناف سخن ۔غزل ۔قصیدہ ۔رباعی ۔مخمس ۔مسدس وغیرہ پر عبور تام حاصل ہے ۔ان کا کلام اعلےٰ خیالات فصاحت ، بلاغت ، روانی وسلاست ، توازن الفاظ اور ایجاز کے لیے مشہور ہے ۔حشو و زوائد اور صنائع بدائع لفظی کی کثرت سے ان کا کلام پاک ہے ۔ان کے اشعار میں شگفتگی ، نزاکت خیال ، بلند پروازی ۔شیرینی ۔زور اور قادر الکلامی بدرجہ احسن موجود ہے ۔تصوف کی چاشنی بھی کہیں کہیں جلوہ گر ہے جو مشرقی شاعری کی جان اور ادب آموزی کی خاص پہچان ہے ۔اس قسم کے خیالات کسی ایک شاعر کی ملک خاص نہیں ہوتے بلکہ مختلف لوگوں کے کلام میں بہ تبدیل الفاظ پائے جاتے ہیں ۔

اخلاق و عادات منشی صاحب ایک پیکر متانت اور مجسم تہذیب تھے ۔شرم و حیا ان کے اخلاق کا خاص جوہر تھی ۔طبیعت نہایت محبت والی پائی تھی ۔راستبازی سے بھرے ہوئے ، نہایت متقی و پرہیزگار اور سادہ مزاج واقع ہوئے تھے کبھی کسی لفظِ فحش سے زبان کو آلودہ نہیں کیا اور نہ کسی کی ہجو کہی ۔سچے پاک باز صوفی مشرب احکام قرآنی کے پورے عامل تھے ۔اسی وجہ سے ان کے تقدس اور بے ریائی کی شہرت لوگوں میں اسی قدر تھی جس طرح ان کے علم و فضل اور کمالات شاعری کی ۔مزاج میں انکسار اور تواضع اس قدر تھی کہ اپنے معاصرین بالخصوص داغ سے کبھی مسابقت کی کوشش نہیں کی بلکہ تمام اپنے ہم عصروں سے نہایت خلوص اور محبت کا برتاؤ رکھتے تھے ۔ادبی مسائل کا جو اُن سے پوچھے جاتے تھے ، نہایت آزادی سے جواب دیتے تھے اور کسی شخص یا جماعت کی پاسداری کبھی نہیں کرتے تھے ۔اپنے بعد چار بیٹے چھوڑے ۔قمر ۔آرزو ۔ضمیر اور اختر ۔جو خدمات زبان کی منشی صاحب نے انجام دیں اُس کا ذکر ہم امیر اللغات کے سلسلہ میں اوپر کر آئے ہیں ۔منشی صاحب ایک بہت

قابل اور طباع شاعر تھے۔ اور ان کے اکثر اشعار زبان زد خلائق ہیں۔ ان کا مرتبہ شعرائے اودھ میں بہت بلند ہے۔

چند اشعار بطور نمونہ چند اشعار بطور نمونہ یہاں لکھے جاتے ہیں ؎

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

(اس شعر کو مسٹر جسٹس محمود نے اپنے ایک فیصلے میں بطور سند کے لکھا تھا)

اے روح کیا بدن میں پڑی ہے بدن کو چھوڑ
میلا بہت ہوا ہے اب اس پیرہن کو چھوڑ

سیدھی نگہ میں ہیں تری تیر کے خواص — ترچھی ذرا ہوئی تو ہیں شمشیر کے خواص
ترکش میں تیر میان میں شمشیر بے قرار — دیکھو تو بے قراری نخچیر کے خواص
کہتا ہے شعر سن کے کوئی واہ کوئی آہ — کچھ میرزا کے مجھ میں ہیں کچھ میر کے خواص
کیا یہ شوق نے اندھا مجھے نہ سوجھا کچھ — دگر نہ ربط کی اس سے ہزار راہیں تھیں
وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب — مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا
جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی — وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا
ایک دل ہمدم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا — سب تڑپنے تلملانے کا مزا جاتا رہا
کھو گیا دل کھو گیا رہتا تو کیا ہوتا امیر — جانے دو اک بے وفا جاتا رہا جاتا رہا
موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا — بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا
صورت تری دکھا کے کہوں گا یہ روزِ حشر — آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا
ملا جب وہ کھلا تب یہ معمّا — کیا کرتے تھے اپنی جستجو ہم

جدا ہے دخترِ رز کا نام ہر صحبت میں اے ساقی
پری ہے میکشوں میں حور ہے پرہیزگاروں میں

ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم اُن کی نہیں جاتی
نگہ نیچی کیے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

نیم جاں کر کے مجھے سر پہ کھڑے ہیں چپکے ہاتھ اُٹھاتے بھی نہیں ہاتھ لگاتے بھی نہیں

اُلفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو! ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو

آنکھیں کھولیں بھی بند بھی کیں وہ شکل نہ سامنے سے سرکی

کیا تنگ ہے جلاد مری سختیٔ جاں سے ہر وار پہ کہتا ہے کہ ظالم کہیں مر بھی

وائے قسمت جو سب کی سُنتا ہے وہ بھی عاشق کی التجا نہ سُنے

باقی ہے امیر اب تو فقط جان کا جانا ہوش و خرد و تاب و تواں جا چکے کب کے

خودی سے بیخودی میں آ جو شوقِ حق پرستی ہے جسے تو نیستی سمجھا ہے اے غافل وہ ہستی ہے

بڑھے جا اے آہ رسا اب کنگرے پر عرش کے پہنچی بلندی کو بلندی جاننا ہمت کی پستی ہے

نہ گھبرا اے دلِ واماندہ اب منزل قریب آئی اسی بستی کے آگے اور آباد ایک بستی ہے

نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے آج کی بات کو کیوں کل پہ اُٹھا رکھا ہے

ہم چلے دیر سے کعبہ کو تو وہ بُت بولا جا کے لے لیجیے کعبہ میں خدا رکھا ہے

انگور میں تھی یہ تے پانی کی چار بوندیں جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لے لو اور معشوقوں کی ہوتی ہے نزاکت کیسی

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے سَو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

نہ چوک وقت کو پا کر کہ ہے یہ وہ معشوق کبھی اُمید نہیں جس سے جا کے آنے کی

داغ دہلوی ۱۸۳۱ء لغایت ۱۹۰۵ء

نواب[1] مرزا خاں داغ ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۶ھ

[1] سالِ ولادت ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء۔ وفات ۶ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۵ء۔ فاضل۔

میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شمس الدین خاں، نواب ضیاء الدین خاں والی لوہارو کے بھائی تھے۔ ان کا انتقال ۱۲۵۲ھ میں ہوا جب کہ داغ تقریباً چھ سات برس کے ہوں گے۔ دادا کا نام نواب احمد حسین خاں تھا۔ والد کے انتقال کے بعد داغ کی ماں نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو بہادر خلف بہادر شاہ کے ساتھ نکاح کر لیا اور شوکت محل کا خطاب پایا۔ ماں کے ساتھ یہ بھی لال قلعہ پہنچے۔ جہاں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ قلعہ میں شعر و سخن کا چرچا بہت تھا۔ داغ کی منچلی طبیعت پر اپنے گرد و پیش کا بڑا اثر ہوا اور یہ بھی شاعری کی مقناطیسی قوت کے اثر سے متاثر ہو گئے۔ چونکہ بادشاہ اور مرزا فخرو دونوں ذوق کے شاگرد تھے یہ بھی استاد ذوق کے شاگرد ہو گئے۔ اور ان کے ساتھ مشاعروں میں جاتے اور دادِ سخن لیتے رہے۔ ابتدا میں فارسی اور عربی کی تعلیم بھی کچھ حاصل کی تھی چنانچہ فارسی مولوی غیاث الدین مؤلف غیاث اللغات اور مولوی احمد حسین صاحب سے پڑھتے تھے۔ خوشنویسی، شہسواری، بانک پٹے وغیرہ کا بھی بہت شوق تھا اور یہ فنون انہوں نے باقاعدہ استادوں سے حاصل کیے تھے۔ شعر کا شوق ان کو جبلّی تھا اور طبیعت چونکہ مناسب پائی تھی۔ اس لیے تھوڑے ہی دنوں کی مشق سے پختہ کار شاعر ہو گئے۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو نے وفات پائی۔ مربی باپ کا مرنا ان کے واسطے کیا کم مصیبت تھی کہ دوسرے ہی سال یعنی ۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامے نے ان کے رہے سہے حواس اور کھو دیے اور وہ بھی ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی طرح دلی چھوڑنے پہ مجبور ہوئے۔ جب کسی قدر ہنگامہ فرو ہوا تو مع اہلِ خاندان کے رامپور آئے جہاں نواب یوسف علی خاں بہادر جو ان کو پیشتر سے جانتے تھے اُس وقت سریر آرائے حکومت تھے۔ داغ پہلی مرتبہ ولیعہد ریاست نواب کلب علی خاں بہادر کے مصاحب مقرر ہوئے اور داروغۂ اصطبل کی خدمت

ان کے سپرد ہوئی۔ اس خدمت کو انہوں نے نہایت قابلیت اور محنت کے ساتھ انجام دیا تھا اور اس وقت سے ان کو گھوڑوں سے اور شہسواری سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ داغ نے اپنی عمر کے ۲۴ سال نواب کلب علی خاں بہادر کی ملازمت میں رام پور میں گزارے۔ جہاں یہ نہایت عزت و آبرو۔ عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ رام پور میں ان کو اس قدر آرام تھا کہ اس کو آرام پور کہتے تھے۔ نواب کی ہمراہی میں حج و زیارت سے بھی مشرف ہوئے تھے۔ انہوں نے دلّی لکھنؤ۔ پٹنہ اور کلکتہ کا بھی سفر کیا۔ جہاں ان کی بڑی قدر ہوئی اور ان کے واسطے مشاعرے منعقد کیے گئے۔ کلکتہ میں تین چار ماہ قیام کیا اور وہاں کے مشاعروں میں برابر شرکت کی۔ اپنے قیام کلکتہ کا ذکر انہوں نے اپنی مثنوی "فریاد داغ" میں کیا ہے ۱۸۸۶ء میں نواب کلب علی خاں کی بے ہنگام موت سے ان کی تمام آرزوئیں اور امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ان کو بھی بعض اور لوگوں کی طرح جن کو اس مصیبت عظمیٰ سے نقصان پہنچا تھا، رامپور چھوڑنا پڑا۔ چنانچہ وہ دلّی چلے گئے اور وہاں کچھ دن قیام کرکے نکلے اور راستے میں مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ۱۸۸۸ء مطابق ۱۳۰۵ھ میں حیدرآباد پہنچے۔ راستے میں لاہور، امرتسر، کشن کوٹ، آگرہ، علی گڑھ، متھرا، جے پور اور ریاست منگرول واقع کاٹھیاوار میں ٹھہرتے ہوئے اور تھوڑے تھوڑے دن قیام کرتے ہوئے گئے تھے۔ اور ان سب مقامات میں بیسیوں آدمی اُن کے شاگرد ہوئے۔ پہلی مرتبہ اعلیٰ حضرت حضور نظام سے بتوسط راجہ گردھاری پرشاد متخلص بہ باقی ملاقات ہوئی تھی۔ مگر چونکہ کوئی صورت حسب مراد اس وقت نہیں نکلی لہذا دلّی واپس آئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۱۳۰۸ھ میں سر آسماں جاہ بہادر کی طلبی اور حکم سے پھر حیدرآباد گئے اور اب کی مرتبہ قسمت نے یاوری کی۔ اعلیٰ حضرت (میر محبوب علی خاں) کے استاد مقرر ہوگئے اور بیش قرار تنخواہ اور انعام و

اکرام کے علاوہ "مقرب السلطان بلبل ہندوستان جہاں استاد ناظم یار جنگ دبیرالدولہ فصیح الملک" کا معزز خطاب عنایت ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی عزت افزائی کے بعد داؔغ کی عمر حیدرآباد میں نہایت کامیابی اور خوشی و خرمی سے گزرنے لگی۔ ان کی تنخواہ پہلے ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے تھے۔ مگر چند روز کے بعد ایک ہزار پندرہ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوگئے، جو بیش بہا صلے اور انعام و اکرام تقریبوں کے موقع پر یا قصائد وغیرہ کے صلے میں ملتے تھے وہ اس کے علاوہ تھے۔ حیدرآباد میں داؔغ کو دنیاوی ثروت کا جس قدر عروج حاصل ہوا۔ ہمارے خیال میں کسی اردو شاعر کی کسی رئیس کے دربار میں نہ اس قدر عزت و منزلت کی گئی اور نہ اتنی بیش قرار تنخواہ کبھی کسی کو ملی ہوگی۔ یہ ترقی ایسی نہ تھی جو حاسدوں کی آنکھوں میں نہ کھٹکتی۔ چند لوگوں نے اعتراضات کرنا شروع کیے۔ ان میں ایک ڈاکٹر مائل حیدرآبادی بھی تھے۔ تھوڑے مقابلے کے بعد مخالفین کے منہ بند ہوگئے۔ داؔغ تقریباً اٹھارہ برس حیدرآباد میں رہے جہاں حضور نظام سے لے کر تمام امرا و رؤسا ان کی عزت کرتے تھے۔ اُن کی وجہ سے بازارِ شاعری جو شاہ نصیؔر کی وفات کے بعد کسی قدر سرد پڑ گیا تھا، پھر گرم ہو گیا۔ سیکڑوں شاگرد اُن کے حیدرآباد میں ہوگئے اور مشاعرے کثرت سے ہونے لگے۔ داؔغ کے فروغ اور ترقی کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ریاست کے سیاسیات سے بالکل الگ رہے اور نہ کسی پارٹی یا جماعت کی سازشوں میں کبھی شریک ہوتے۔ اسی وجہ سے وہ وہاں بہت ہر دل عزیز اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے آخری زمانۂ قیام حیدرآباد میں امیؔر مینائی بھی رام پور سے آگئے تھے اور ان ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ مگر قبل اس کے کہ حضور نظام کی حضوری حاصل ہو انتقال کر گئے۔ داؔغ بعارضۂ فالج ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد میں مرے اور وہیں دفن ہوئے۔

سید مرتضیٰ حسین بیان یزدانی میرٹھی

مولانا عبدالحلیم شرر

عام عادات و اخلاق نواب مرزا خاں داغ خوش طبع، رنگین مزاج، بذلہ سنج اور ہشاش بشاش تھے۔ مزاج میں خود داری تھی۔ خوشامد اور تملق سے دُور رہتے تھے۔ کثیرالاحباب تھے اور اپنے سب احباب کے ساتھ نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ اپنے معاصر شعرار مثلاً جلال، امیر، تسلیم، ظہیر وغیرہ سے ان کے تعلقات بہت مخلصانہ اور دوستانہ تھے۔ رقابت پیشہ کی وجہ سے کبھی دوستی اور ملاقات میں فرق نہیں آیا۔ انہوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کہی اور نہ کبھی اپنے مخالفین اور معترضین سے لڑے جھگڑے البتہ معاصرین سے کبھی کبھی شاعرانہ نوک جھوک رہتی تھی۔ بڑے رسا اور اسرار و ذرائع ترقی سے واقف تھے اور یہی وجہ دربار نظامت میں اُن کی ترقی کی تھی۔

داغ کی شاعری داغ اپنے زمانے کے بہت مشہور شاعر تھے۔ ان کی زبان میں فصاحت و سادگی اور بیان میں ایک خاص قسم کی شوخی اور بانکپن ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین امیر، جلال، تسلیم وغیرہ سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کا طرز عام پسند اور بہت دلچسپ ہے۔ اسی وجہ سے ان کے متبعین کثرت سے ہیں مشہور ہے کہ ان کے شاگردوں کی تعداد پندرہ سو سے متجاوز ہے۔ یہی شہرت و عزت اور شاگردوں کی کثرت ان کے جوہر ذاتی اور شاعرانہ قابلیت پہ دال ہے۔ داغ نے ایک باضابطہ دفتر کھول دیا تھا۔ جس کے کارکن بعض ان کے شاگرد اور اکثر تنخواہ دار منشی بھی تھے۔ اس دفتر میں اصلاح کلام کا کام جاری تھا۔

تصانیف چار دیوان ان سے یادگار ہیں۔ گلزار داغ[۱]۔ آفتاب داغ[۲]۔ مہتاب داغ[۳] یادگار داغ[۴]۔ آخر الذکر یعنی یادگار داغ کا ایک ضمیمہ بھی ہے اور یہ ضمیمہ اور اصل دیوان دونوں ان کی وفات کے بعد شایع ہوئے تھے۔ ایک مثنوی موسوم بہ فریاد داغ[۵] بھی لکھی ہے۔ ان کے علاوہ چند قصاید حضور نظام اور نواب صاحب رامپور کی تعریف

ہیں۔ ایک پُر جوش شہر آشوب دلّی کی تباہی پر اور چند قطعات و رباعیات بھی ان سے یادگار ہیں "گلزار داغ" اور "آفتاب داغ" دونوں رام پور میں چھپے تھے۔ اور ان میں زیادہ تر وہ غزلیں ہیں جو رامپور کے مشاعروں میں امیر مینائی اور تسلیم و جلال وغیرہ کی ہم طرحی میں کہی گئی ہیں۔ اس زمانہ کے کلام میں اُن کی بے انتہا مشّاقی اور نیز بڑی محنت و جاں فشانی معلوم ہوتی ہے۔ مہتاب داغ اور یادگار داغ دکن کی تصنیف ہیں۔ ان میں بھی کلام کی روانی اور فصاحت جو ان کا خاص انداز ہے خاص طور پر قابل تعریف ہے۔ گلزار داغ جوانی کی تصنیف ہے۔ جب جذبات عشق و محبت محض خیالی نہ تھے بلکہ ذاتی تجربہ کا آئینہ تھے۔ آفتاب داغ بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں واردات قلبیہ اور جذبات حقیقی کی اصلی تصویریں شاندار الفاظ میں کھینچی گئی ہیں۔ مگر بر خلاف اس کے مہتاب داغ اس زمانہ کی تصنیف ہے جب کہ حرارت عشق و جوانی دھیمی اور ہلکی ہو کر ضیا نے ماہتاب کی مانند نہایت خوشگوار ہو گئی ہے اور شباب کی ولولہ انگیزیاں اور ہنگامہ آرائیاں رخصت ہو کر ان کی جگہ کہولت کی پختہ کاری اور سکون و اطمینان نے لے لی ہے۔ مثنوی فریاد داغ میں اپنے عشق کا حال جو کلکتے کی ایک مشہور رنڈی مُنّی بائی حجاب کے ساتھ ان کو تھا اور جو رامپور کا میلہ بے نظیر دیکھنے کی غرض سے آئی تھی۔ ایک شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ اس مثنوی کے بہت سے اشعار نہایت اعلےٰ درجہ کے ہیں اور سادگی اور روانی و عمدگی ان کی قابل داد ہے۔ علی الخصوص عاشق کا معشوق کی تصویر سے تخاطب نہایت دل کش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر بعض جگہ تعیش اور خراب جذبات کی تصویریں متانت اور تہذیب سے گری ہوئی ہیں۔ قصاید میں ان کا مرتبہ بہت کم ہے یعنی سودا اور ذوق وغیرہ سے تو کوئی نسبت ہی نہیں۔ ہمارے نزدیک امیر مینائی کے قصائد کو بھی وہ نہیں

پہنچتے۔ ان میں کسی طرح کے بلند مضامین اور علوِ تخیل نہیں ہیں۔ غزل گوئی کا رنگ ان پر غالب ہے اور اکثر اشعار قصیدے سے گئے نہیں بلکہ غزل کے معدوم ہوتے ہیں اور مقررہ قواعد قصیدہ گوئی کے منافی ہیں۔ تشبیہ و استعارے میں بھی کسی قسم کی جدت نہیں پائی جاتی اور ان میں بھی وہی عاشقانہ رنگ جھلکتا ہے۔ اُنکی رُباعیات کا بھی یہی حال ہے یعنی بجائے ادب و اخلاق وغیرہ سکھانے کے ان کے مضامین زیادہ تر عاشقانہ ہی ہیں۔ البتہ تاریخیں بہت اچھی اور استادانہ کہی ہیں۔

طرزِ کلام داغ کی عظمت ان تین چیزوں پر موقوف ہے یعنی (۱) ان کی شہرت عام (۲) اُن کا طرزِ خاص (۳) وہ خدمات جو انہوں نے زبان کے ساتھ انجام دی ہیں۔ داغ میٹھی، رسیلی اور عاشقانہ شاعری کے مسلّم الثبوت اُستاد ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پیچیدہ اور گنجلک ترکیبوں اور موٹے موٹے غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ کو انہوں نے اپنے کلام میں جگہ نہیں دی۔ اسی سے ان کا کلام تصنع اور تکلف سے خالی ہے۔ الفاظ نہایت سادہ اور معمولی۔ ترکیبیں سیدھی سادی اور درست۔ بندش نہایت چُست۔ شعر کی ظاہری زیب و زینت یعنی صنایع بدایع کی کثرت اور دور از کار تشبیہوں اور مبالغہ اور حشو و زوائد سے بھی ان کا کلام پاک ہے۔ اشعار بالکل تلے نپے زوردار اور مؤثر ہوتے ہیں۔ کلام میں زندگی اور رچہ نچالی پائی جاتی ہے ان کا کلام مختلف مضامین سے مملو اور غزل کے جس قدر موضوع ہیں ان سب پر حاوی ہوتا ہے۔ کہیں شوخ حاضر جوابی کہیں طریفانہ بذلہ سنجی، کہیں کسی واعظ پر چوٹ کی ہے۔ کہیں کسی زاہد کی داڑھی کھسوٹی ہے کسی کسی جگہ معاملہ بندی میں نیاز عاشقانہ اور ناز معشوقانہ کے بے مثل مرقعے کھینچے ہیں کسی مقام پر ہجر کی حرماں نصیبیوں کا ذکر ہے۔ کسی موقع پر رقیبوں کی عیاریوں اور سازشوں کا بیان ہے۔ غرض کہ اشعار کسی نہ کسی جذبۂ انسانی کے سچے فوٹو ہیں اور

چونکہ ان جذبات کا اظہار نہایت سلیس اور عام فہم عبارت میں ہوتا ہے۔ اِس لیے وہ دلوں پر ہمیشہ تیرو نشتر کا کام دیتے ہیں۔ ان کے اکثر اشعار میں جرأت کی معاملہ بندی اور رِند کی صفائی ملی جلی معلوم ہوتی ہے۔ اور خوبی محاورہ اور لطافت زبان اُس پر طُرّہ۔ ان کا رنگ ان کے زمانے میں اس قدر مقبول ہوا کہ سیکڑوں پیرو اور ناقل ان کے پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کے بڑے حریف مقابل منشی امیر احمد مینائی نے بھی اپنے دوسرے دیوان میں زیادہ تر ان ہی کا رنگ اختیار کیا۔

کلام پر اعتراض زیادتی شہرت بعض وقت الزام و اعتراض کا باعث ہوتی ہے۔ داغؔ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ ارباب نشاط کے شاعر تھے اور ان کے اشعار ہیج اور مخرب اخلاق ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بڑی زیادتی ہے اس وجہ سے ان کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں شعر ایسے نکلیں گے جن میں خیالات نہایت پاک و صاف اور بہت بلند ہیں۔ ان کی ہر چیز کھوٹی نہیں ہے بلکہ اِسی زر اندود کلام میں سونے کے ریزے بھی بہت ہیں۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے یہاں اصلیت (اوریجنیلٹی) اور متانت بہت کم ہے فلسفہ ان کے کلام میں مطلق نہیں نہ کسی اعلیٰ خیال کی تشرح و بسط ہے فلسفہ حیات اور فلسفہ عشق سے وہ بہت کم تعلق رکھتے ہیں۔ جس عشق کا وہ بیان کرتے ہیں، اس میں بھی کوئی عظمت یا کوئی سچائی اور حقیقی حُسن کی جلوہ گری نہیں ہے۔ ان کے معشوق اکثر معشوقِ بازاری ہیں جو اپنے حُسن اور ناز و انداز کو سرِ راہ لے کر بیٹھتے ہیں جن کا بوس و کنار اور اختلاط مثل اشیاء بازاری کے خریدا اور بیچا جاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے بعض اشعار مہذب کانوں کے سُننے کے لائق نہیں ہوتے اور صرف ایسی محفلوں میں گائے جا سکتے ہیں جہاں رندان قدح خوار

جمع ہوں اور ارباب نشاط کے جمگھٹے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے اشعار میں عشق و عاشقی کے صرف سطحی جذبات ہوتے ہیں اور ان سے قلب کے اندرونی پہلو متاثر نہیں ہوتے اور نہ ان کے سمجھنے میں جولانی خیال کا موقع ملتا ہے۔ داغ کے اشعار صرف ایسے عشق سے تعلق رکھتے ہیں جس کو خلوص اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ اُن میں میر کا ایسا درد و اثر ہے نہ غالب کی سی معنی آفرینی و نازک خیالی۔ ان کی تشبیہات بھی نادر اور عالی نہیں بلکہ وہی معمولی اور پامال تشبیہیں ہیں جن کو سُنتے سُنتے کان تھک گئے ہیں۔ ان میں جدت اور ندرت مطلق نہیں۔ ان کی مثنوی (فریاد داغ) میں تو ایک معشوقِ بازاری کے عشق کا حال ہے جس میں کوئی بلند "آیڈیل" مطلق نہیں۔

مگر بااین ہمہ وہ ایک بلند مرتبہ شاعر ضرور ہیں اور ان کی زبان کے ساتھ اس خدمت کی ضرور قدر کرنا چاہیے کہ انہوں نے سخت اور مغلق الفاظ ترک کیے اور سیدھے سادے شیریں الفاظ اور محاورے اپنے کلام میں استعمال کیے جس سے کلام کی بے ساختگی اور فصاحت اور بڑھ گئی۔ یہ بھی ان کا کمال ہے کہ طویل اور مشکل بحریں سُریلے اور میٹھے الفاظ میں لکھیں۔ چُست اور برجستہ اور نہایت فصیح اور بے حشو و زوائد اشعار نکالے۔ غرض کہ ان ہی سب خوبیوں کی وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ ان کو مشہور و معروف لوگوں کی استادی کا فخر حاصل ہے۔ ان کا مرتبہ شعرائے متاخرین میں بہت بلند ہے۔ تغزل میں داغ کی شاعری کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ حالی لکھتے ہیں ؎

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سُنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

اقبال نے بھی ایک پُر زور مرثیہ ان کی نسبت لکھا ہے۔ ان کے حریف و معاصر امیر مینائی کا صحیح معنوں میں کوئی مد مقابل اگر ہے تو یہی ہیں۔

شاگرد شاگردوں کی فہرست بہت طولانی ہے جن میں سے چند نام جو بہت مشہور ہیں یہاں لکھے جاتے ہیں :۔

اعلیٰ حضرت حضور نظام حیدرآباد خلد آشیاں یعنی نواب میر محبوب علی خاں متخلص بہ آصف۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ سائل دہلوی۔ احسن مارہروی۔ بیخود دہلوی۔ بیخود بدایونی۔ نوح ناروی۔ نسیم بھرت پوری۔ جگر مراد آبادی۔ آغا شاعر دہلوی وغیرہم۔

امیر و داغ کا مقابلہ یہ مقابلہ بھی اُسی قبیل سے سمجھنا چاہیے جیسا کہ میر و مرزا کا مقابلہ ان کے حالات میں لکھا گیا ہے۔ امیر اور داغ دونوں اپنے اپنے رنگ میں مسلم الثبوت اُستاد مانے گئے ہیں۔ دونوں بزرگوار اپنے زمانے کے بہت بڑے غزال تھے اور اکثر ہم طرح غزلوں پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ دونوں نے ماشاء اللہ بکثرت شاگرد پائے اور دونوں کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے دونوں وسیع الاخلاق دوست پرست اور حلیم الطبع تھے۔ دونوں ذکی الطبع اور ذہین اور شاعری کے دلدادہ تھے۔ داغ کو امیر پر اس معنی میں فوقیت ہے کہ دنیاوی جاہ و جلال اور مرفہ الحالی کے اعتبار سے اپنے آخر زمانہ میں وہ اُن سے بڑھ گئے۔ اسی کا نتیجہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کو امیر سے زیادہ شہرت بھی حاصل ہوئی۔ داغ کا کلام مطبوع عام و پسندیدۂ انام ہے جس طرح اُس سے عالم و فاضل اور شاعر محظوظ ہو سکتے اسی طرح اس کو پڑھ کر یا دوسرے سے سن کر ایک عامی بھی اُس سے لطف اُٹھاتا ہے مگر صاحب ذوق جو قوت ممیزہ سے کام لیتے ہیں اور جن کو داغ کے سطحی اور معمولی اشعار پسند نہیں آتے اُن کو امیر ہی کا کلام اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں متانت و تہذیب کے ساتھ بلند خیالی بھی ہے اور وہ ضروریات شعریہ کو بھی پورا کرتا ہے مگر اصل یہ

ہے جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ کلام کا فرق دراصل کلیم کا فرق ہے۔ خود شاعر کے مزاج ماحول اور افتادِ طبیعت کو اس کے کلام میں بڑا دخل ہوتا ہے یہ سب جانتے ہیں کہ داغ ایک بڑے زندہ دل رند مشرب شخص تھے ان کا مزاج پارہ کی خاصیت رکھتا تھا۔ پھر ان کی نشو و نما دلّی کی شاعرانہ فضا میں ہوئی تھی۔ برخلاف اس کے منشی صاحب ایک مولوی منش تقدس مآب بزرگ تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں عرصہ تک رہے۔ دامن سلطنت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس عہد کے شعرائے شاہی سے بھی گاڑھا دوستانہ رکھتے تھے۔ آسیر ان کے اُستاد اور برقؔ، صبؔا، بحرؔ، قلقؔ وغیرہ ان کے یار تھے۔ پس ان لوگوں کے اثر اور نیز اُن کے طرز سے وہ کیسے بچ سکتے تھے۔ وہ اس زمانہ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور یہی حالت ان کی برابر رہی یہاں تک کہ قیام رام پور اور داغ وغیرہ کی صحبت نے ان کا پرانا رنگ ایک حد تک زائل کر دیا۔ منشی صاحب کا اوائل عمر کا جس قدر کلام ہے وہ ناسخ اور شاگردانِ ناسخ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے چنانچہ ان کا پہلا دیوان "مرأۃ الغیب" اس دعوے کی بڑی دلیل ہے۔ ان میں اگر کہیں کہیں عمدہ اشعار ملتے ہیں تو ان کے ساتھ ہی ساتھ رکیک و مبتذل خیالات بھدّی اور بے مزہ تشبیہیں، انگیا کرتی، کنگھی چوٹی وغیرہ نامناسب رعایت لفظی کی بھی بھرمار ہے۔ دیوان مذکور اگرچہ لائق مصنف کی استادی اور قدرت کلام کا پتہ دیتا ہے مگر پھر بھی ناہمواری مندرجۂ بالا سے مملو ہے۔ داغ کا رنگ اگرچہ دلّی میں قائم ہوا مگر انہوں نے اُس میں کچھ جدت پیدا کر کے اپنا ایک خاص طرز بنا لیا۔ یعنی جرأت کی معاملہ بندی کو آتش کی صفائی زبان اور محاورہ گوئی کے ساتھ سمو دیا اور اسی سے وہ چیز پیدا ہو گئی جو داغ کا طرز خاص کہلاتا ہے۔ یعنی روزمرہ اور زبان، محاورات کا برمحل استعمال لفظوں کی نشست و ترتیب اور خیالات کی

دل نشینی، ان کے اشعار کا ظاہری یا خارجی حصہ تو بہت اچھا ہوتا ہے مگر داخلی یا معنوی حصہ بہت سطحی ہے۔ ان کا کلام لوگوں کو بہت پسند آیا کیونکہ ان کے مذاق کے موافق تھا اور یہی بہت بڑا راز ان کی شہرت و کامیابی کا ہے۔ منشی صاحب نے داغ کے رنگ کی مقبولیت اور اپنی شہرت کے مٹ جانے کے خیال سے انہیں کا رنگ اختیار کیا اور ہرچند یہ صحیح ہے کہ اس تبدیلیِ رنگ کی وجہ سے اُن کے مابعد کے کلام میں پیشتر سے بہت زیادہ صفائی اور روانی پیدا ہو گئی مگر پھر بھی وہ داغ تک نہ پہنچ سکے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہ اُن سے کم رہے اسی وجہ سے ان کا دوسرا دیوان "صنم خانۂ عشق" گلزار داغ "سے، اگر وہ داغ کے طرز کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بہت کم ہے۔ بہرحال یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ منشی صاحب نے یہ کیا کم کمال کیا کہ اپنے طرز قدیم کو چھوڑ کر طرز جدید میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کر لی۔

اگر ایک بلند نقطۂ نظر سے ان دونوں استادوں کی شاعری کو دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ حقیقی شعریت اور آتش الہامی جو قدیم اُستادوں کے یہاں پائی جاتی ہے ان دونوں کے یہاں بہت کم ہے۔ مگر بایں ہمہ باعتبار شکوہ الفاظ اور متانت اور نازک خیالی کے امیر کو داغ پر فوقیت حاصل ہے۔ عروض اور ضروریات شعری کے اعتبار سے امیر بہت بڑے استاد تھے ان کے کلام میں اس قسم کے سُقم شاذ و نادر ہی ملیں گے اور قصیدہ گوئی میں تو وہ داغ سے یقیناً بہتر ہیں۔ داغ کو اس صنف خاص سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ گو کہ ان کے معتقدین اس بارہ میں بھی ان کی افضلیت کے قائل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ داغ ایک بہت بڑے غزل گو اور ایک طرز خاص کے موجد تھے اور یہی ان کی شہرت کا باعث کہا جا سکتا ہے۔ منشی صاحب جامع الکمالات تھے۔ شاعر کے علاوہ وہ بہت بڑے نثار اور ناقد بھی تھے اور علمی قابلیت

تو داغ سے یقیناً بہت بڑھی رکھتے تھے "امیر اللغات" اور ان کے وہ خطوط جن میں انہوں نے اکثر نہایت پیچیدہ نکات ادبیہ حل کیے ہیں ان کی قابلیت اور تلاش کے شاہد عادل ہیں۔ قصیدہ میں وہ سودا اور ذوق کے ہم پلہ کہے جا سکتے ہیں۔ البتہ ظہیر دہلوی شاگرد ذوق اس صنف میں ان کے قریب ہیں۔ ان دونوں میں یہ بھی ایک بہت بڑا فرق ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ منشی صاحب کی شاعری ترقی کرتی رہی اور داغ کا رنگ آخر عمر میں کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ ان کا بہترین زمانہ اُن کے قیام رام پور کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ جب سے وہ حیدر آباد گئے اور وہاں ثروت و عیش ان کو نصیب ہوا۔ شاعرانہ جگر کاوی اور محنت کے وہ عادی نہ رہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ آخری فیصلہ کن چیز اس معاملہ میں نقاد کا رنگ طبیعت اور رجحان مذاق ہے۔

داغ کا کلام اس قدر مقبول اور مشہور ہے کہ اس کا کچھ انتخاب دینا ایک فعل عبث معلوم ہوتا ہے مگر پھر بھی چند اشعار بطور نمونہ کے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ تاکہ ناظرین ان سے لطف اٹھائیں۔

خدا کریم ہے یوں تو مگر ہے اتنا رشک ۔۔۔ کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا
آج راہی جہاں سے داغ ہوا ۔۔۔ خانۂ عشق بے چراغ ہوا
ڈر گئے نام تشفی سن کے ترے خواہش مرگ ۔۔۔ منہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا
جو عاشقی میں خاک ہوا کیمیا ہوا ۔۔۔ کہتا تھا آج خاک میں کوئی رلا ہوا
وائے غفلت کہ اب کیا ہم نے ۔۔۔ جو ہمیں پہلے کام کرنا تھا
جو ہو سکتا ہے اس سے وہ کسی سے ہو نہیں سکتا
مگر دیکھو تو پھر کچھ آدمی سے ہو نہیں سکتا
کچھ آگے داور محشر سے ہے اُمید مجھے ۔۔۔ کچھ آپ نے مرے کہنے کا اعتبار کیا

لطف فرما جو وہ رہتا تو ٹھکانا ہی نہ تھا — عین حکمت تھی وہ کافر جو دل آزار رہا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا — جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ — ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

وعدے پہ مرے ان کے قیامت کی ہے تکرار — اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے ادھر آج

کل تاب فغاں تھی تو یہ تاثیر کہاں تھی — کیا کیا لب خاموش پہ قرباں ہے اثر آج

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغؔ — ہر شخص پوچھتا تھا کہ حضرت ادھر کہاں

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے — سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

کیسا جواب حضرت دل دیکھیے ذرا — پیغامبر کے ہاتھ میں ٹکڑے زباں کے ہیں

لُطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد — ہائے کم بخت تُو نے پی ہی نہیں

اڑ گئی یوں وفا زمانے سے — کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں!

بظاہر رہتا ہیں اور دل میں بدگمانی ہے — ترے کوچے میں جو جاتا ہے آگے ہم بھی ہوتے ہیں

جو کہتا ہوں کہ مرتا ہوں تو فرماتے ہیں مر جاؤ — جو غش آتا ہے مجھ پر تو ہزاروں دم بھی بھرتے ہیں

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں — اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

مریض عشق کی کیا پوچھتے ہو یہ پوچھو — کہ زندہ کوئی بھی تیماردار باقی ہے

گرے ہوتے الجھ کر آستاں سے — چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

ہر دل میں نئی طرح سے ہے یاد کسی کی — ملتی نہیں ہے فریاد سے فریاد کسی کی

مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائے گی زاہد — کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم — بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ — ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

جلال لکھنوی ۱۲۵۱ھ — ۱۳۲۵ھ

حکیم سید[1] ضامن علی جلال حکیم اصغر علی داستاں گو

[1] ولادت ۱۲۵۱ھ ۔ وفات ۲۰ شوال ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۹ء سہ شنبہ بوقت دس بجے شب۔ فاضل۔

کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ میں ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ کتب درسیہ فارسی و عربی سے نواب آصف الدولہ کے مدرسے میں فراغت حاصل کر کے اپنے آبائی پیشہ طبابت کی تکمیل کی طرف توجہ کی۔ زمانے کے رنگ کے موافق ان کو شعر و سخن کا شوق بچپنے ہی میں پیدا ہو گیا تھا اور کچھ دنوں بعد اس میں اس قدر محو ہو گئے کہ بجائے حکمت کے شاعری کو اپنا مستقل فن قرار دیا۔ ابتدا میں امیر علی خاں ہلالؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ جب کلام میں کچھ پختگی آ گئی تو انہیں کے توسط سے ان کے اُستاد رشکؔ کے شاگرد ہو گئے۔ رشکؔ اس زمانے میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔ وہ ناسخؔ کے بہت ممتاز شاگردوں میں تھے اور استاد اس قدر ان کا خیال کرتے تھے کہ جو غزلیں اصلاح کے واسطے ان کے پاس آتیں وہ ان کو بہ نظر اصلاح رشکؔ کے حوالے کرتے۔ جب رشکؔ سفرِ عراق پہ روانہ ہونے لگے تو انہوں نے نوجوان جلالؔ کو نواب فتح الدولہ برقؔ کے سپرد کیا جن کی شاعری کا اس زمانہ میں بڑا زور شور تھا۔ روزانہ مشاعرے منعقد ہوتے جن میں بڑے بڑے اساتذۂ وقت مثل بحرؔ، سحرؔ، اسیرؔ، امیرؔ، قلقؔ وغیرہ کے شریک ہوتے تھے۔ جلالؔ بھی ان مشاعروں میں بے تکلف جاتے اور استادوں کے کلام کو سُنتے اور خود اپنی غزلیں سناتے۔ غدر ۱۸۵۷ء نے ان صحبتوں کو درہم برہم کر دیا اور شعرا کو بجائے شعر کی تخیل کے اب اپنے پیٹ کا خیال پیدا ہوا اسی زمانہ میں اور انہیں افکار کی بدولت جلالؔ نے ایک دواخانہ شہر لکھنؤ میں ایک شخص بخشی نند رائے کے مکان میں کھول لیا تھا جو ان کے والد کے دوستوں میں تھے اور شاعر بھی تھے۔ مگر اس شغل میں بھی وہ اپنی محبوب شاعری کو کبھی نہیں بھولے اور اس میں بھی اس کی مشق برابر جاری رہی۔ بالآخر نواب یوسف علی خاں والی رامپور کی قدر دانی نے ان کو رامپور گھسیٹ بلایا جہاں ان کے والد داستان گویوں میں ملازم تھے تھوڑے عرصہ بعد جب نواب کا انتقال ہوا اور والی ریاست

نواب کلب علی خاں ہوئے تو انہوں نے حکیم صاحب کو بمشاہرہ سو روپیہ ماہوار ملازم رکھ لیا۔ حکیم صاحب اپنی تنک مزاجی اور نازک دماغی کی بدولت کئی مرتبہ ملازمت سے کنارہ کش ہوئے مگر نواب صاحب کی قدردانیوں اور فیاضیوں نے کبھی ان کو رام پور سے ترک تعلق نہ کرنے دیا۔ وہ تقریباً بیس[۲۰] سال رام پور میں رہے اور برابر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے جہاں ان کے معاصر اور حریف نواب مرزا خاں داغ، منشی امیر اللہ تسلیم اور منشی امیر احمد مینائی بھی شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے کے ان چاروں استادوں کی غزلیں جو اکثر ہم طرح ہوتی تھیں خالی از لطف نہیں رہیں کیونکہ ان سے تقابل کلام کا اور ہر ایک شاعر کا رنگ طبیعت دریافت کرنے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ نواب کلب علی خاں بہادر کے انتقال اور کونسل آف ریجنسی کے قائم ہونے سے یہ پُر لطف صحبتیں بھی قائم نہ رہ سکیں اور شعراء سب تتر بتر ہو گئے۔ حُسن اتفاق یہ کہ ایک چھوٹی سی ریاست منگرول واقع کاٹھیاوار کے رئیس با اختیار نواب حسین میاں نے جن کو شعر کی قدردانی اور شعراء کی سرپرستی کا بڑا فخر حاصل ہے، حکیم صاحب کو اپنے یہاں طلب کر لیا۔ مگر وہاں بوجہ دُوری اور ناموافقت آب و ہوا وہ تا عرصہ تک نہ رہ سکے۔ چند ہی دن میں اپنے وطن مالوف لکھنؤ میں واپس آ گئے جہاں نواب صاحب موصوف ان کو پچیس[۲۵] روپیہ ماہوار اور مبلغ سو روپیہ ہر قصیدے کا صلہ جو وہ ان کی خدمت میں بھیجتے تھے برابر عنایت کرتے رہے۔ آخر عمر میں حکیم صاحب کا سوائے شعر و شاعری اور اصلاح کے کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔ بعمر چھہتر[۷۶] سال بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء انتقال کیا۔

تصانیف	تصانیف حسب ذیل موجود ہیں:-

(۱) "چار دیوان"

(۲) "سرمایہ زبان اُردو" جو محاورات و اصطلاحات زبان اُردو کی ایک مبسوط

حضرت جلال لکھنوی مرحوم

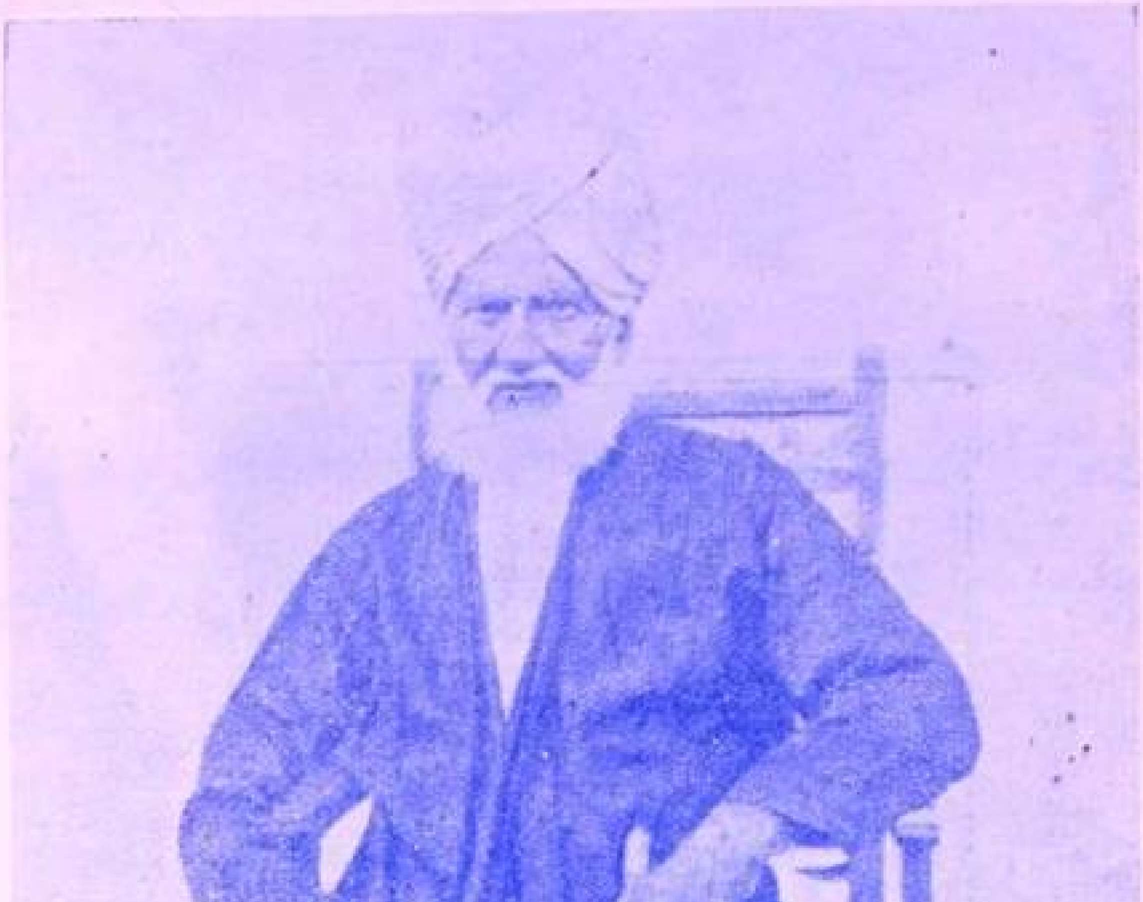

منشی امیراللہ تسلیم لکھنوی

کتاب ہے۔

(۳) "افادۂ تاریخ" فن تاریخ گوئی پر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔

(۴) "منتخب القواعد" اس میں اکثر ہندی الفاظ کی اصل بتائی ہے اور مفرد و مرکب الفاظ کی تحقیق کی ہے۔

(۵) و (۶) دو لغات زبان اردو کے موسوم بہ "تنقیح اللغات" و "گلشن فیض"۔

(۷) "رسالہ دستور الفصحا" جو فن عروض پہ ایک مختصر رسالہ ہے۔

(۸) "مفید الشعراء" ایک رسالہ در باب تحقیق تذکیر و تانیث۔

فہرست مذکورہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تحقیق زبان کے ساتھ بڑا شغف تھا اور مثل اپنے استاد رشک کے انہوں نے بھی اکثر رسالے اور لغات زبان اردو کے الفاظ و محاورات و اصطلاحات کے متعلق تصنیف کیے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کام کو رشک نے شروع کیا تھا۔ اس کو انہوں نے درجہ تکمیل کو پہنچایا ہرچند کہ ان کی یہ تصانیف ایک ابتدائی صورت میں ہیں اور ان کے بعد اب بڑی بڑی کتابیں اسی موضوع میں نہایت شرح و بسط اور زیادہ تفصیل و تنقید کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ مگر پھر بھی جلال کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہیے ان کو بچپن سے حجت و تکرار اور بحث و مباحثہ کا شوق تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی وہ اساتذۂ وقت کے اسقام سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ بے تکلف ان کی غلطیاں ان کے منہ پہ کہہ دیتے تھے۔ اور یہ عادت ان کی آخری عمر تک باقی رہی۔ اسی کی وجہ سے ان سے اور ان کے معاصرین سے معرکۃ الآرا مناظرے اور مباحثے اس معاملہ میں ہوتے رہے۔

مزاج کی کیفیت کہا جاتا ہے کہ جلال ایک مغرور و متکبر اور ہمچو من دیگرے نیست کے خیال کے آدمی تھے۔ مشہور ہے کہ وہ اکثر مشاعروں میں صرف اس وجہ سے شرکت

نہیں کرتے تھے کہ غرور سخن ان کو اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اپنے زمانے کے اکابر شعرا تک سے ملنے میں ان کو عار تھا۔ دوسروں کے اشعار کی تعریف کرنے کی انھوں نے قسم کھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا حقارت آمیز برتاؤ جھگڑے اور فساد کا باعث ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ تسلیم کے ایک شاگرد ظہیر احسن شوق نیموی نے دو کتابیں لکھ ڈالیں جس میں کہ جلال کی خوب خبر لی گئی۔ ان کے کلام کی غلطیاں نکالی گئیں اور ان پر صدہا اعتراض وارد کیے گئے۔ مگر حق یہ ہے کہ جلال اپنے شاگردوں اور دوستوں سے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے اور دوسروں کے کلام کی اصلاح بہت محنت اور محبت سے دیتے تھے۔

خصوصیات کلام جلال کو طرز لکھنؤ کا آخری تبع سمجھنا چاہیے۔ وہ قدیم اساتذہ لکھنؤ کے قدم بقدم چلتے تھے اور اس شاہراہ عام سے کبھی ہٹنا نہیں چاہتے تھے ان کے متعدد دیوانوں میں کسی قسم کی دل آویزی اور خصوصیات اور مایہ الامتیاز کوئی شے نہیں ہے۔ البتہ زبان میں تصنع بہت کم اور بے عیب ہے پھڑکتے ہوئے اشعار کہیں کہیں نکلتے ہیں۔ مگر عام طور پر کلام بے نمک اور معمولی ہے۔ جذبات یا انعکاس کا اس میں کہیں پتہ نہیں۔ خیال آفرینی کم ہے۔ اکثر وہی معمولی معمولی باتیں ہیں اور بعض اشعار تو ان کی استادی کے درجہ سے بہت گرے ہوئے ہیں۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ کنگھی چوٹی اور عورتوں کی زیب و زینت کے مضامین جو قدیم طرز لکھنؤ کا مایۂ ناز تھے۔ ان کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ اس کے علاوہ صحت الفاظ کا بھی ان کو بڑا خیال رہتا ہے اور کلام تعقید اور نامناسب الفاظ سے پاک ہے۔ جلال اپنے آپ کو صحت الفاظ و محاورہ کا بادشاہ سمجھتے تھے۔ بہت پُرگو تھے۔ اور شاید یہ پُرگوئی ہی بدمزگی کلام کا باعث ہو۔ مشہور ہے کہ بیس پچیس غزلوں کی اصلاح اور تین چار غزلوں کی تصنیف ان کا روزمرہ کا معمول تھا چنانچہ

اس زمانے کے گلدستے ان کی اور ان کے شاگردوں کی غزلوں سے بھرے رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ کلام کے بہت اچھے ناقد تھے اور اُردو کے دوسرے درجہ کے شعرا میں ان کا پایہ بلند ہے۔

شاگرد ان کے مشہور شاگردوں میں اشخاص ذیل قابل ذکر ہیں یعنی خود ان کے بیٹے کمال،[1] جو ریاست رام پور میں ملازم تھے اور اب انتقال ہوگیا۔ میرزا اکبر حسین یاس اور ان کے صاحبزادے آرزو۔[2] احسان شاہجہاں پوری اور سردار اُردھم سنگھ۔

آرزو سید انور حسین[2] صاحب لکھنوی آرزو تخلص خلف سید ذاکر حسین یاس مثل اپنے والد کے جلال کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ کے بہت نامور شاعروں میں ہیں۔ اور کمال کے انتقال کے بعد جلال کے جانشین یہی سمجھے جاتے ہیں۔ پہلے اُمید تخلص کرتے تھے اب آرزو کرتے ہیں۔ فن عروض میں ان کو پوری دستگاہ حاصل ہے۔ اور تمام اصناف سخن میں شعر کہنے پر قادر ہیں۔ مرثیے بھی کہے ہیں اور اب ڈراما نویسی کا شوق ہے۔ گو کہ لکھنؤ کے باشندے ہیں مگر طرز دلّی والوں کا ہے آرزو کا کلام ان کے اُستاد جلال کے رنگ کا بہت اچھا نمونہ ہے جنہوں نے اپنے طرز کو دلّی کے رنگ میں سمو دیا تھا۔ ان کے کلام میں سادگی اور روانی اور حلاوت اور جذبات سب کچھ موجود ہے۔ موجودہ شعرائے لکھنؤ میں بلند پایہ رکھتے ہیں۔

احسان احسان[3] علی خاں نام، احسان تخلص، قاسم علی خاں کے صاحبزادہ ہیں۔

---

[1] سید محمدی کمال کی تاریخ وفات بزم اکبرآبادی کے دیوان میں سنہ ۱۹۱۱ء مرقوم ہے۔ فاضل

[2] ولادت سنہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء لکھنؤ۔ وفات سنہ ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۱ء کراچی۔ فاضل

[3] ولادت ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۵۵ء بقول بعض ۱۲۷۲ھ۔ وفات ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۷ء فاضل

۱۲۶۷ھ میں بمقام اوڈ ضلع بریلی پیدا ہوئے اس کے بعد ان کے والدین شاہجہانپور چلے گئے جہاں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ سولہ برس کی عمر سے ان کو شعر کہنے کا شوق ہوا۔ ابتدائی کلام حافظ نثار احمد خاں نائب کو دکھاتے تھے۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں جلال کے شاگرد ہوئے۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں محکمہ بند و بست گورکھپور میں سرکاری ملازمت پائی اور بعد کو قانون گوئی منصرمی اور پیشکاری کے عہدوں پر فائز ہوئے ۱۸۹۰ء میں ملازمت چھوڑ کر مختاری کا امتحان دیا اور شاہجہانپور میں کام شروع کیا۔ ۱۸۹۶ء میں ایک گلدستہ موسوم بہ "گلدستہ ارمغان" نکالا جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔ سنہ ۱۸۹۳ء میں ان کا پہلا دیوان "خمکدۂ خیال" چھپا تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ کتابیں بھی ان کی تصنیف سے ہیں۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں منگرول اور وہاں سے حیدرآباد گئے تھے۔ احسان ایک خوش گو شاعر ہیں مگر کوئی خصوصیت ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ جلال کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔

تسلیم سنہ ۱۸۲۰ء تا سنہ ۱۹۱۱ء

قصر شاعری رام پور کے چوتھے رکن منشی امیر اللہ تسلیم تھے سنہ ۱۸۲۰ء[1] میں بمقام منگلسی جو نواح فیض آباد میں ایک گاؤں ہے پیدا ہوئے ان کے والد مولوی عبد الصمد پہلے بدر سرائے میں جو دریا آباد کے قریب واقع ہے قیام کرتے تھے بعد کو فیض آباد چلے آئے اور وہیں توطن اختیار کیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد لکھنؤ آ گئے اور محمد علی شاہ کے عہد میں صیغۂ فوج میں بمشاہرۂ تیس روپیہ ماہوار ملازمت کر لی۔ تسلیم بھی بچپنے میں اپنے باپ کے ساتھ فوج میں داخل ہوئے تھے اور ان کی علیحدگی کے بعد ان کے عہدے پر فائز ہوئے فارسی و عربی کی تعلیم خود اپنے والد سے اور مولوی شہاب الدین اور مولوی سلامت اللہ

---

[1] ولادت ۱۲۳۵ھ مطابق سنہ ۱۸۲۰ء۔ وفات ۱۳۲۹ھ مطابق سنہ ۱۹۱۱ء۔ ۹۴ سال عمر پائی۔

محمد یحییٰ تنہا نے ۱۳۶۹ھ لکھا ہے جو غلط ہے۔ فاضل

رامپوری سے حاصل کی تھی۔ فن خوشنویسی[1] کے ایک اُستاد تھے۔ اور مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں بمشاہرہ بیس روپیہ ماہوار ملازم تھے۔ شعر و سخن میں وہ نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ اور طرز دہلی کے تتبع پر بڑا فخر کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

مجھ کو طرزِ شاعرانِ لکھنو سے کیا غرض
میں ہوں لے تسلیم شاگردِ نسیم دہلوی

تھوڑے عرصہ کے بعد واجد علی شاہ کے زمانہ میں جب ان کی پلٹن توڑ دی گئی تو یہ بیکار ہو گئے۔ انہوں نے ایک منظوم عرضداشت اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھ کر مقبول الدولہ مرزا مہدی علی خاں قبول شاگرد ناسخ کی وساطت سے پیش کی۔ بادشاہ نے دیکھا اور اس پر یہ حکم لکھا ؎

بشنو اے خوشنویس و اے خوش گو
ہر دو فن می کنی و ہر دو نکو!

اسم تو مندرج بہ دفتر شد
بست و دہ روپیہ مقرر شد

چنانچہ ان کا تیس روپیہ ماہوار مقرر ہو گیا اور شعرائے شاہی کے زمرہ میں یہ داخل ہو گئے بعد انتزاع سلطنت یہ رام پور چلے گئے جہاں کچھ عرصہ تک نہ کوئی معقول ملازمت ملی اور نہ مقبول شعراء کے حلقے میں داخل ہو سکے۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک قصیدہ مدحیہ نواب کلب علی خاں کے حضور میں جو اس وقت ولی عہد ریاست تھے پیش کرنے کا موقع ملا۔ غدر کا ہنگامہ فرد ہونے کے بعد تسلیم رامپور سے لکھنؤ واپس آئے اور یہاں اپنے بچھڑے ہوئے اعزا سے ملے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ منشی نولکشور کے مشہور مطبع میں جس کو قائم ہوئے اُس وقت تھوڑا عرصہ گزرا تھا نصحوں میں ملازم ہو گئے جہاں ان کے اُستاد نسیم نے بھی کچھ دنوں ملازمت کی تھی۔ لکھنؤ میں نواب محمد تقی خاں کی سرکار سے بھی دس روپیہ ماہوار ان کو ملتے تھے اور نواب صاحب اپنا کلام اصلاح کے لیے ان کو دکھاتے تھے۔ ان کے طلب فرمانے سے یہ پھر رامپور گئے۔ اور

---

[1] راقم الحروف نے بھی فن خوشنویسی میں چند روز آپ سے استفادہ کیا ہے۔ ۱۲۔ مترجم

اب کی مرتبہ تیئس^۲۳ روپیہ ماہوار تنخواہ ہوئی جو بعد کو پچاس^۵ روپیہ تک بڑھا دی گئی اور عہدۂ نظارت و پیشکاری سے ترقی کر کے مدراس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے نواب صاحب موصوف کی رحلت کے بعد یہ پھر رامپور سے نکلے اور ٹونک ہوتے ہوئے منگرول پہنچے جہاں کچھ دنوں قیام کر کے نواب عالی شان نواب سید حامد علی خاں بہادر والی رامپور کے طلب فرمانے سے پھر رام پور آ گئے۔ اس مرتبہ نواب صاحب نے از راہ قدر دانی چالیس روپیہ ماہوار بطور پنشن مقرر کر دیے جو ان کو آخر وقت تک ملتے رہے۔ تسلیم نے اکانوے^۹۱ برس اس دنیائے ناپائدار کی سیر کر کے ۱۹۱۱ء میں سفر آخرت اختیار کیا۔

تصانیف کہا جاتا ہے کہ ان کا پہلا دیوان زمانۂ غدر میں ضایع ہو گیا مطبوعہ دیوان ان کے حسب ذیل ہیں:-

(۱) "نظم ارجمند" یہ لکھنؤ میں چھپا ہے اور اس میں قبل غدر کا بھی کچھ کلام اور ان کی دو^۲ مثنویاں بھی ہیں۔

(۲) "نظم دل افروز" مطبوعہ رام پور۔

(۳) "دفتر خیال" ایضاً۔ چوتھا دیوان ناتمام سُنا جاتا ہے کہ ان کے کسی شاگرد کے پاس رام پور میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ مثنویاں حسب ذیل ہیں:-

(۱) نالۂ تسلیم (۲) شامِ غریباں (۳) صبحِ خنداں (۴) دل و جاں (۵) نغمۂ بلبل (۶) شوکتِ شاہجہانی (۷) گوہرِ انتخاب (۸) تاریخ رام پور۔ ان کے علاوہ انہوں نے نواب صاحب رامپور بالقابہ کا سفر نامۂ یورپ منظوم لکھا ہے جس میں تقریباً بیس پچیس ہزار شعر ہیں۔

انداز کلام کلام نہایت سلیس بے تکلف ٹھوس اور زور دار ہے تمام اصناف سخن میں مثنوی سب سے اچھی ہے اور اس میں وہ اپنے ہمعصروں پر گوئے سبقت

لے گئے ہیں۔ اسی میں وہ خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ بعض قصیدے بھی بہت زوردار لکھے ہیں۔ غزلیں اکثر پُر معنی اور پُر لطف ہوتی ہیں اور ان کا پہلا دیوان "نظم ارجمند" ہماری رائے میں سب دیوان سے بہتر ہے۔ مگر پُرگوئی نے ان کے ساتھ بھی وہی کیا جو دیگر شعرا کے ساتھ کیا ہے یعنی کلام کو پھیکا اور بے مزہ بنا دیا ہے۔ تسلیم تین باتوں کے واسطے مشہور ہیں۔ اپنی غزلوں اور مثنوی کے لیے دوسرے مومن کے تتبع کے واسطے۔ تیسرے اس وجہ سے کہ ہمارے زمانہ کے ذہین اور قابل شاعر حسرت موہانی کے وہ اُستاد ہیں۔

تسلیم نے اپنی عمر کا اکثر حصہ مصیبت و افلاس میں بسر کیا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات فقر و فاقہ کی نوبت آگئی۔ اکثر اوقات ان کے احباب اور اُن کے شاگرد ان کی اعانت کرتے تھے۔ ان کی طویل عمر مصائب کی ایک طولانی داستان تھی جو آخر کار موت پر ختم ہوئی۔ مگر مفلسی اور پریشان حالی نے ان کے مزاج میں کسی قسم کا چڑچڑاپن اور غم و غصہ پیدا نہیں کیا تھا بلکہ برعکس اس کے وہ نہایت ملنسار اور قانع واقع ہوئے تھے۔ اور کسی مرفہ الحال ہم پیشہ شاعر پر ان کو رشک و حسد کبھی نہیں ہُوا۔ تسلیم کے ساتھ قدیم رنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

ان کے شاگرد بہ کثرت ہیں جن میں مولانا حسرت موہانی۔ عرش گیاوی۔ حاجی محمد اسماعیل خاں صبر معروف بہ بُلبُلِ تسلیم بہت ممتاز اور قابل ذکر ہیں حسرت موہانی کا کچھ مختصر حال ہم آگے چل کر حصہ نثر میں لکھیں گے۔

چند چیدہ اشعار بطور نمونہ نذر ناظرین کیے جاتے ہیں۔

ہائے کب تنگ تہ میں گھبراؤں گا اے وحشت جنوں
اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ نکل جاؤں گا

نالہ کھنچتا ہے، دل ہے خفا، شوق ہے اُداس
تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

آبرو گر چاہتا ہے کنج خلوت کر قبول
قطرۂ نیساں صدف میں آ گئے گوہر ہو گیا

عمر بھر رشکِ عدو ساتھ تھا کہتا کیا حال
وہ ملا بھی کبھی تنہا تو مَیں تنہا نہ ہوا

قطرۂ خوں بھی نہیں دل میں مرے
ہائے تر ہو گی زبانِ تیر کیا

کچھ کہہ دو جھوٹ سچ کہ توقع بندھی رہے
توڑو نہ آسرا دلِ اُمیدوار کا

تسلیم کس کے واسطے بیٹھے ہو گھر چلو
کیا اعتبار وعدۂ بے اعتبار کا

دل مرا تھا، گر گیا، گم ہو گیا، جاتا رہا
غم تمہیں کاہے کا ہے جاتا رہا جاتا رہا

ڈھونڈھتا ہے روز و شب لیکر چراغ مہر و ماہ
کیا ترا اے آسمانِ پُر جفا جاتا رہا

مرقد میں سفیدی جو کفن کی نظر آئی
سمجھا میں پسِ مرگ مرے ساتھ گڑی دھوپ

اور ہیں، جن کو ہے شاگردی پہ اے تسلیم ناز
مَیں نسیمِ دہلوی کے کفش برداروں میں ہوں

واعظ خدا شناس نہ ہو گا تمام عمر
اب تک پڑا ہوا ہے حرام و حلال میں

پستا ستمِ چرخ سے اُف منہ سے نہ کرتا
یہ بات مرے دل میں ہے یا برگِ حنا میں

ڈراتا کیوں ہے اے تسلیم واعظ مجھ کو دوزخ سے
مرا حصہ نہیں ہے کیا خدا کے فضل و احساں میں

گردشیں بہت دیکھ چکے اے تسلیم
چل کے میخانہ میں اب گردشِ ساغر دیکھو

کرتے ہیں سجدے اس لیے دیر و حرم میں ہم
کیا جانیے وہ شوخ کہاں ہو کہاں نہ ہو

طفلی سے جو بُت شوخ ہو آفت کا بنا ہو
وہ فتنہ جوانی میں قیامت نہ ہو کیا ہو

کعبے کا ارادہ کیے نکلے تو ہیں گھر سے
آجائے وہ بُت سامنے اس دم تو مزا ہو

عرش ضمیر الدین[1] عرش، صوبہ بہار سے تعلق رکھتے ہیں۔ منشی بندہ علی وکیل گیا کے صاحبزادہ ہیں۔ ایک عرصہ تک اخبارات و رسائل سے تعلق رکھنے کے بعد انہوں نے ریلوے کی ملازمت اختیار کر لی۔ پہلے شمشاد شاگرد ناسخ کے شاگرد ہوئے مگر بعد کو تسلیم کو کلام دکھانے لگے۔ ان کی اکثر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔ پہلے ایک دیوان موسوم بہ "فکرِ عرش" داغ کے رنگ میں لکھا مگر وہ شایع نہیں ہوا۔ دوسرا دیوان

[1] ولادت سنہ ۱۲۹۷ھ مطابق سنہ ۱۸۸۰ء۔ وفات سنہ ۱۳۵۵ھ مطابق سنہ ۱۹۳۰ء ناقل۔

موسوم بہ "نظم نونگار" تسلیم کے رنگ میں اور انہیں کا اصلاح کردہ ہے ان کے علاوہ ایک تیسرا دیوان بھی لکھا ہے۔ دو مختصر رسالے زبان اور فن عروض پہ اور ایک تاریخ آگرہ و دہلی موسوم بہ "بارگاہ سُلطانی" بھی ان کی یادگار ہیں۔ کچھ عرصہ تک بہار پنچ کی ایڈیٹری بھی کی ہے۔ اکثر غزلیں نیچرل رنگ میں خوب لکھتے ہیں اور اسی رنگ میں مشہور ہیں۔

دربارِ حیدر آباد

حیدر آباد دکن اپنی روایات علم و ادب کے واسطے ہمیشہ سے مشہور ہے نظام الملک آصف جاہ اوّل جس طرح شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ کے ملک کے وارث قرار پائے۔ اسی طرح ان کے مذاق علمی اور سرپرستی سخن کے بھی وارث وہی ہوئے۔ حیدر آباد ہمیشہ سے علم و فن اور شعر و شاعری کا مرکز اور ملکی و غیر ملکی ہر قسم کے شعراء اور اہل کمال کا ملجا و ماوا رہا ہے۔ فرماں روایان سلطنت اور امرائے دولت کا آوازۂ سخاوت اور شہرۂ فیاضی سُن سُن کر شعراء۔ علماء۔ فقہاء۔ محدثین شمالی ہند اور نیز دُور دراز اقطار و امصار مثلاً ایران۔ عربستان۔ بخارا۔ سمرقند وغیرہ سے آتے تھے۔ اور یہاں کی فیاضیوں سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ یہ باکمال لوگ افکار دنیاوی سے فارغ ہو کر علم و ادب کی خدمت کرنے اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے اور ریاست کی بڑی زیب و زینت سمجھے جاتے تھے۔ خود فرمانروا بھی محض شاعری کے قدر دان اور سرپرست ہی نہ تھے بلکہ خود بھی شعر و سخن کا ذوق سلیم رکھتے تھے۔ اگرچہ بعض عہدوں میں شاعری کا بازار سرد رہا مگر بھی شمع سخن جو ایک مرتبہ روشن ہو چکی تھی وہ کبھی بجھی نہیں۔ فرماں روایان سابق اس زمانہ کے

موافق فارسی زیادہ کہتے تھے۔ مگر زمانہ حال میں اُردو کا چرچا زیادہ ہوگیا ہے جس کی تفصیل آیندہ سطور میں کی گئی ہے۔

نظام الملک آصف جاہ اوّل
۱۶۷۱ء تا ۱۷۴۸ء

بانی خاندان نظام الملک آصف جاہ اوّل کا نام میر قمر الدین خاں تھا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اور دو دیوان اس زبان میں یادگار چھوڑے ہیں۔ "شاکر" تخلص کرتے اور مرزا عبد القادر بیدل سے اصلاح لیتے تھے۔ کلام میں تصوّف کا رنگ بہت غالب تھا۔ مشہور ہے کہ نظم و نثر کئی زبانوں میں لکھ سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ اُردو میں بھی کہا ہو مگر ان کا کلام اب دستیاب نہیں ہوتا۔

میر محبوب علی خاں متخلص بہ آصف
۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء عیسوی

ہز ہائینس مظفر الملک فتح جنگ نواب میر محبوب علیخاں بہادر نظام الملک آصفجاہ ششم ۱۸ اگست ۱۸۶۶ء مطابق ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور کچھ کم تین برس کی عمر میں ۲۹ فروری ۱۸۶۹ء کو مسند آرائے ریاست ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت مختلف علوم و فنون میں مختلف اوقات میں اصحاب ذیل کے سپرد ہوئی۔

مولوی محمد زماں خاں شہید۔ مولوی مسیح الزماں خاں۔ مولوی انوار اللہ خاں۔ مولوی اشرف حسین۔ مظفر حسین خوشنویس۔ مرزا نصر اللہ خاں۔ مسٹر کلارک۔ سرور جنگ۔ افسر جنگ اور مٹو خاں وغیرہ۔ آپ کی زبان عربی و فارسی، اُردو انگریزی سب میں عبور حاصل تھا۔ علوم مروجہ کے علاوہ فنون سپہ گری و شہسواری کے ماہر کامل تھے۔ نشانہ بے مثل لگاتے تھے۔ آپ کے علم و فن اور شعر و سخن کی قدر دانی کی وجہ سے تمام علماء و فضلائے عصر اور مشہور شعرائے عہد کا مجمع دار السلطنت حیدرآباد میں ہوگیا تھا۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ مولانا کرامت علی۔ مولانا حیدر علی مصنف منتہی الکلام۔ مولوی امین الدین خاں خلف علامہ رشید الدین خاں دہلوی۔

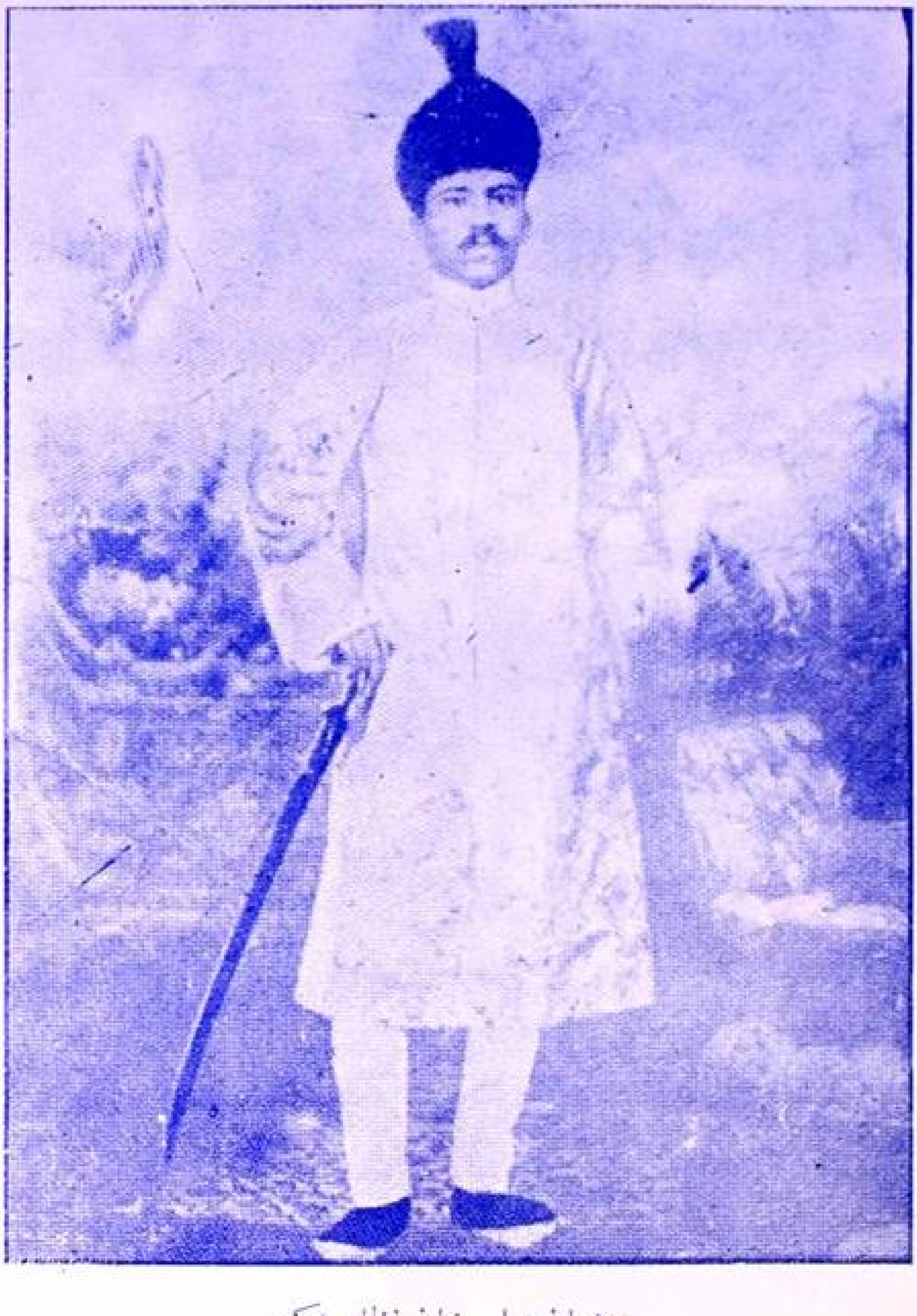

عثمان علی خان نظام دکن

نواب میر محبوب علی خان آصف جاہ

مولوی وحید الزماں خاں۔ مولوی مہدی علی۔ مولوی مشتاق حسین۔ مولوی سید حسین وسید علی بلگرامی مولوی نذیر احمد۔ مولوی عزیز مرزا وغیرہ اور ان کے علاوہ سیکڑوں باکمال تھے کہ جو لکھنؤ اور دلی اور نیز دیگر مقامات سے شہریار دکن کی فیاضیوں اور حیدرآباد میں ہُن برسنے کا شہرہ سُن سُن کر حیدرآباد چلے گئے تھے۔ نظام مرحوم کی علمی سرپرستی اور قدردانی کی بیّن مثال مولوی سید احمد دہلوی کی مشہور اُردو لغت فرہنگ آصفیہ کی طباعت و اشاعت ہے جس کے واسطے اعلیٰ حضرت نے نصرت زرِ کثیر مصنّف کو عنایت کیا بلکہ اس کے صلہ میں پچاس روپیہ ماہوار بطور پنشن کے عمر بھر کے واسطے مقرر کر دیا تھا۔ اسی شاہانہ فیّاضی اور سرورانہ قدردانی کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بعض اور مشہور کتابیں اس مبارک عہد میں تصنیف کی گئیں۔ مثلاً تمدّن عرب مرتّبہ و مترجمہ مولوی سید علی بلگرامی اور سوانح عمری نواب سالار جنگ بہادر۔ تاریخ دکن وغیرہ۔ اسی در دولت سے مولانا شبلی نعمانی۔ مولانا حالی۔ مولوی عبد الحق صاحب مصنّف تفسیر حقّانی۔ قدر بلگرامی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ مولوی عبد الحلیم شرر۔ پروفیسر شہبازؔ اور بیسیوں ایسے کاملانِ فن برابر فیض یاب ہوتے رہے اور عمر بھر نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے مشاغل علمیہ میں معروف رہے۔ اُستاد شاہ بُلبُل ہندوستان نواب مرزا خاں داغؔ کی شہرت و ثروت کا ایسا عروج ہوا جو اس سے پیشتر کسی رئیس کی وجہ سے کسی شاعر کو میسّر نہیں ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ آخر میں ان کی تنخواہ پندرہ سو روپیہ ماہوار ہو گئے تھے۔ علاوہ ان بیش بہا انعامات اور خلعت وغیرہ کے جو وقتاً ان کو ملتے رہتے تھے۔

ہر چند کہ امیرؔ مینائی اس معاملہ میں ناکام رہے اس وجہ سے کہ ان کی عمر نے وفا نہیں کی مگر ان کے صاحبزادے اخترؔ مینائی اور ان کے مشہور شاگرد و حافظ جلیل حسن جلیلؔ[1] اب

---

[1] ولادت ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۹ء۔ وفات یکشنبہ ۲۸ جنوری ۱۹۴۶ء مطابق ۱۳۶۵ھ فاضل

تک درباری شاعر ہیں۔ اور جلیل کو تو موجودہ حکمران کی اُستادی کا فخر حاصل ہے۔

میر محبوب علی خاں آصف تخلص فرماتے تھے اور اپنے استاد داغ کے تتبع تھے۔ دو دیوان آپ کی یادگار ہیں۔ کلام میں داغ کا رنگ ہے اور حسن الفاظ کے ساتھ حسن معنی بھی بہت کچھ جلوہ گر ہے۔ نہایت سلیس فصیح اور بامحاورہ، چپٹ پٹا کلام ہوتا تھا اور حسن ظاہری کے ساتھ حسن باطنی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

موجودہ فرمانروائے دکن ہز اگزالٹڈ ہائنس اعلیٰ حضرت سرعثمان علی خاں بہادر مجمع القابہ شعر و سخن میں اپنے پدر بزرگوار کے تتبع ہیں۔ آپ بھی نہ صرف قدردان و مربی فن بلکہ بہت بڑے ناقد اور دلدادۂ سخن ہیں آپ نے بھی اپنے دربار دُربار میں ایک مجمع شعراء و ادباء اور علماء و فضلاء کا جمع کیا ہے۔ آپ کے مبارک عہد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام جس سے کہ زبان اُردو کی ترقی اور وسعت میں بہت بڑا اضافہ اور اس کو لے انتہا استحکام حاصل ہوا اور نیز دارالترجمہ کا قیام جس سے بہت سی بیش بہا غیر زبانوں کی کتابیں اُردو میں ترجمہ ہوگئیں۔ آپ کے عہد زرّیں کی ایسی یادگاریں ہیں جس کے احسان سے ہماری زبان اور ہمارا ادب کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ آپ عثمان تخلص کرتے تھے۔ اور آپ کا ایک دیوان غزلوں کا چھپ گیا ہے۔ آپ حضرت جلیل سے استفادۂ سخن کرتے ہیں کلام میں صفائی سادگی بے تکلفی اور فصاحت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ زوائد سے کلام پاک ہے۔ ہز اگزالٹڈ ہائنس زبان فارسی اور عربی میں بھی اچھا دخل رکھتے ہیں اور کبھی کبھی ان زبانوں میں بھی طبع آزمائی فرماتے رہتے ہیں۔

مہاراجہ چندولال شاداں ۱۷۶۶ء تا ۱۸۴۵ء امراء و رؤسائے ریاست عہد قدیم میں بحیثیت سرپرست شعراء اور اہل کمال کے جو مرتبہ مہاراجہ چندولال کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ شاداں تخلص کرتے تھے اور ایک عرصے

تک پیشکار ریاست یعنی وزیر اعظم کے عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہے۔ مہاراجہ بہادر قوم کے کھتری تھے۔ علاوہ خود اہل کمال ہونے کے اہل کمال کے بڑے مربی اور سرپرست تھے اور اس عہد میں جود و سخا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کی سخاوت کی مثالیں اب تک بطور ضرب المثل حیدر آباد میں مشہور ہیں۔ اپنے زمانہ میں اس قدر مشہور تھے کہ ریاست حیدر آباد کو ان کے نام کے ساتھ نسبت دی جاتی تھی اور حیدر آباد چندو لال کا حیدر آباد کہلاتا تھا۔ اُن کی سخاوت کا شہرہ سُن کر ہندوستان اور ایران کے اکثر شعراء اور اہل کمال وہاں جمع ہو گئے تھے اور مشاعرے خود انہیں کے محل سرا میں ہر رات کو ہوتے تھے ان میں یہ صاحبان فن جمع ہو کر اپنا اپنا کمال دکھاتے تھے۔ انہیں مشاعروں میں نصیر دہلوی نے بھی اکثر شرکت کی ہے اور بیش بہا انعامات سے مالا مال ہو کر واپس ہوئے ہیں۔ ذوق اور ناسخ بھی طلب کیے گئے۔ مگر حب وطن اور راہ کی تعب نے اس طرف جانے سے ان کو باز رکھا۔ مہاراجہ موصوف اُردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ چنانچہ دو دیوان اُردو اور ایک دیوان فارسی ان کی یادگار ہیں۔ مشہور ہے کہ ان کے زمانہ میں تین سو سے زیادہ شاعر حیدر آباد میں جمع تھے۔ جن کی تنخواہ سو روپیہ سے ہزار روپیہ تک فی کس تھی۔ ایک کتاب موسوم بہ "عشرت کدۂ آفاق" بھی ان کی تصنیف ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے خاندانی حالات اور خود اپنے سوانح اور اپنی خدمت کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔

راجہ گرد ھاری پرشاد باقی سنہ ۱۸۴۴ء تا سنہ ۱۹۰۶ء

راجہ گرد ھاری پرشاد معروف بہ محبوب نواز راجہ بنسی دھر قوم کے سکسینہ کایستھ تھے۔ فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے اور عربی میں بھی اچھا دخل رکھتے تھے۔ یہ بھی مشاہیر حیدر آباد سے ہیں اور ان کو بھی شعر و سخن کا ذوق اور سرپرستی شعراء کا شوق تھا۔ انہوں نے نواب مرزا خاں داغ کی جب وہ حیدر آباد گئے ہیں۔ بڑی قدر اور مدد کی۔ اکثر کتابیں ان کی تصنیف ہیں جن میں حسب ذیل زیادہ

مشہور ہیں:-

بھگوت گیتا کا ترجمۂ فارسی منظوم۔ کیشو نامہ۔ کلیات باقی۔ قصائد باقی۔ پرنس نامہ کنز التاریخ۔ بقائے باقی۔ سیاق باقی۔ پیرایۂ عروض۔ آئینۂ سخن۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی رواداری کس قدر برتتے تھے۔ ان کے کلام میں تصوف کا رنگ بہت ہے۔ فلسفہ اور مذہب سے اُن کو بڑی دلچسپی تھی اور ایک سچے درویش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی رباعیات نہایت مؤثر اور دلچسپ ہیں۔ ان کے کلام سے بڑی علمی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شمس الدین فیض کے شاگرد تھے۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد متخلص بہ شادؔ
سنہ ولادت[1] ۱۸۶۴ء

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر وزیر اعظم حیدرآباد زمانۂ حال کے بہت ممتاز اور مشہور شاعر اور اِسکالر ہیں۔ سلسلۂ خاندانی ایک نہایت قدیم اور معزز دلّی کے خاندان سے ملتا ہے جن کا کوئی رکن نظام ہائے سابق میں سے کسی کے ساتھ حیدرآباد آیا تھا۔ ان کے دادا مہاراجہ نریندر پرشاد اُس کونسل آف ریجنسی کے ایک رکن تھے۔ جو جنت آشیاں میر محبوب علی خاں کے زمانۂ نابالغی میں قائم ہوئی تھی۔ مہاراجہ چندو لال اور یہ ایک ہی خاندان سے ہیں۔ ان کے دادا نے ان کو زبان عربی و فارسی میں بڑے قابل اُستادوں سے اعلےٰ درجہ کی تعلیم دلائی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے انگریزی اور تلنگی اور مرہٹی زبانوں میں بھی کافی دستگاہ بہم پہنچائی۔ مہاراجہ صاحب موصوف عربی و فارسی و اُردو نہایت بے تکلفی اور صفائی سے لکھتے ہیں۔ علاوہ نظم کے نثر کا اسلوب بھی نہایت دل کش ہوتا ہے۔ شادؔ تخلص فرماتے ہیں اور حضور نظام سابق یعنی میر محبوب علی خاں کے شاگرد ہیں۔ جنہوں نے ان کو "شاگرد خاص آصف جاہ" کے معزز لقب سے ممتاز کیا تھا۔ دو اُردو جرائد یعنی "دبدبۂ آصفیہ" اور "محبوب الکلام" کی کرسیٔ ادارت پر

[1] ولادت ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء۔ وفات ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء۔ فاضل۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب شاد

بھی چند روز آپ متمکن رہے۔ "محبوب الکلام" میں حضور نظام سابق بھی اپنا کلام اکثر شایع ہونے کے لیے عطا فرماتے تھے۔ مہاراجہ صاحب موصوف ایک اچھے خاصے صوفی ہیں اور اُن کا کلام مسایل تصوف سے لبریز ہے۔ اُن کے دیوان اُردو و فارسی شایع ہو چکے ہیں۔ ایک دیوان معروف بہ "خمکدۂ رحمت" میں صرف نعتیہ اشعار ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تعصبات سے مرتفع ہو کر آپ مذہب کو کس بلند نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اخوتِ انسانی کے کس قدر قائل ہیں۔ خاندانی روایات بذل و عطا پر بھی آپ پوری طرح عامل ہیں اور مہاراجہ چندو لال کے نقش قدم پر چلنے کے لیے ساعی رہتے ہیں۔ تقریباً ۴۰ تصانیف آپ کی موجود ہیں جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:-

بزم خیال (۳ جلدوں میں)، رُباعیات شاد۔ ہدیۂ شاد۔ فریاد شاد۔ مطلع خورشید ایمان شاد۔ خمار شاد۔ نغمۂ شاد۔ ارمغان وزارت۔ مخزن القوافی۔ مثنوی۔ آئینۂ وجود مثنوی سروجود۔ وغیرہ کلام بہت دلچسپ اور بے تکلف ہوتا ہے۔ علی الخصوص فارسی و عربی اشعار کا اُردو شعر میں ترجمہ یا تضمین بہت دل کش اور دل فریب ہوتی ہے کلام میں حُسن صوری و معنوی دونوں موجود ہیں۔ ۱۸۹۲ء میں اپنے خاندانی عہدۂ وزارت سے سرفراز ہوئے اور خطاب "راجۂ راجگان مہاراجہ بہادر جو اُن کے بزرگوں کا تھا ان کو عطا ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں وزیر اعظم مقرر ہوئے اور "یمین السلطنۃ" کا خطاب عنایت ہوا۔ ۱۹۰۳ء میں کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ اور ۱۹۱۰ء میں جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ گورنمنٹ انگلشیہ سے ملا۔ ۱۹۱۲ء میں عہدۂ وزارت سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ مگر تھوڑے عرصہ سے پھر قلمدانِ وزارت آپ کے سپرد ہوا ہے۔

انجمن ترقی اُردو یہ مشہور و معروف انجمن حیدرآباد میں تیرہ ۱۳ چودہ برس سے قائم ہے جب سے یہ عالم وجود میں آئی اپنے قابل اور ہر دل عزیز آنریری سیکرٹری مولوی

عبدالحق صاحب بی۔ اے کی سرپرستی اور نگرانی میں برابر ترقی کر رہی ہے۔ سیکرٹری صاحب موصوف کی ان تھک کوششوں اور چند لائق اور قابل اشخاص کی قلمی امداد و اعانت اور سب سے بڑھ کے اعلیٰ حضرت فرمانروائے دکن کی نظرِ کیمیا اثر کی بدولت یہ انجمن زبانِ اُردو کی ترقی اور اشاعت کے نہایت مفید کام سرانجام دے رہی ہے۔ زبان انگریزی کی اکثر مفید اور مشہور کتابیں نہایت قابلیت اور احتیاط کے ساتھ ترجمہ ہو گئیں یا ہو رہی ہیں۔ مثلاً بکل کی تاریخ تمدن۔ ایبٹ سوانح عمری نپولین بوناپارٹ پلوٹارک کی سوانح عمریاں حکمائے یونان وغیرہ کی۔ لیکی کی تاریخ اخلاق۔ ان کے علاوہ بیسیوں مستند کتابیں۔ سائنس۔ فلسفہ۔ اخلاق۔ اقتصادیات تاریخ کی۔ خواہ بصورت تالیف یا ترجمہ شائع ہو چکی ہیں یا پیش نظر ہیں۔ اسی طرح اُردو کی اکثر پرانی کتابیں اور تذکرے بھی نہایت صحت اور عمدگی اور مفید فاضلانہ دیباچوں کے ساتھ نکل چکے ہیں۔ اُردو رسم الخط کی اصلاح و ترقی اور اس کو باقاعدہ اور سہل القراۃ بنانے والے کے واسطے قابل اور تجربہ کار اصحاب کی کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادب ایران اور نکلسن کی تاریخ ادب عرب بھی سنا ہے کہ ترجمہ ہو گئیں۔ اور چھپنے کے واسطے تیار ہیں۔ انگریزی و اُردو کے علاوہ عربی فارسی اور فرانسیسی کی بیش بہا تصانیف سے بھی انجمن غافل نہیں ہے۔ ترجمہ کی آسانی کے واسطے سائنس اور علوم و فنون کے اصطلاحات کا اُردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور وہ بصورت لغت یا فرہنگ کے شائع بھی ہو گیا ہے۔ اسی طرح لغات اور محاورات اور صناعوں اور پیشہ وروں کی مخصوص اصطلاحیں بھی مرتب کی گئی ہیں آکسفورڈ کی مختصر زبان انگریزی کی لغت کے اُردو ترجمہ کا حکم ہو گیا ہے اور اس کام کے لیے تقریباً بیس پچیس آدمی مقرر ہیں۔ جب یہ تیار ہو جائے گی تو یقیناً مفید ثابت ہو گی۔ سنا ہے کہ انجمن اُردو کا نستعلیق ٹائپ تیار کرنے کی فکر میں ہے جس سے کتابوں کے چھپنے اور بعد کو ان

کے پڑھنے میں بہت آسانی ہو گی۔ مختصر یہ کہ انجمن کے اشغال متعدد اور مختلف ہیں اور سب قابل تعریف ہیں۔ البتہ زیادہ ہمت زیادہ مستعدی اور زیادہ محنت کی ضرورت ہے اور کام کرنے والے بھی زیادہ ہونے چاہئیں تاکہ جو کام شروع کیا جائے وہ جلد ختم ہو جائے اور پبلک کو زحمتِ انتظار نہ اُٹھانا پڑے۔ انجمن کا مشہور و معروف سہ ماہی رسالہ "اُردو" جو زیر ادارت سیکرٹری صاحب موصوف نکلتا ہے۔ ہندوستان کے نہایت کارآمد اور مشہور رسائل اور جرائد میں سے ہے اور اس میں زبان اور ادب اُردو کے متعلق نہایت قابل قدر اور دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔ حال میں انجمن نے ایک رسالہ موسوم بہ "سائنس" زیر ادارت ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی جاری کیا ہے جس میں صرف مضامین سائنس ہوتے ہیں۔ یہ بھی مثل "اُردو" کے نہایت مفید اور کارآمد مضامین کا حامل ہے جس سے انشاء اللہ ملک کی بہت کچھ توقعات پوری ہوں گی۔

عثمانیہ یونیورسٹی "عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے وہ روز افزوں علمی و ادبی عمیق قومی جذبات پورے ہو گئے جو اعلےٰ تعلیم کی زبان مادری میں نشر و اشاعت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں عرصۂ دراز سے موجزن تھے اور جن کے واسطے وہ بہت بے چینی سے انتظار کر رہے تھے"۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا تقرر ابتدائی مباحث و مراحل طے ہو جانے کے بعد بالآخر ہز اگزالٹڈ ہائنس حضور نظام کے فرمان خسروی مؤرخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء کے بموجب عمل میں آیا۔ بالفعل تمام شعبہ ہائے علوم کی تعلیم زبان اُردو میں ہوتی ہے۔ انگریزی صرف بطور زبان ثانوی کے ایک ضروری سبجکٹ رکھی گئی ہے تاکہ طلباء اس زبان سے بھی ناآشنا اور انگریزی بولنے والی دنیا کے حالات و خیالات سے بے خبر نہ رہیں۔ اب تک صرف ایک کالج یونیورسٹی سے متعلق ہے جس کا افتتاح ۱۹۱۹ء میں ہوا تھا۔ یونیورسٹی نمایاں ترقی کر رہی ہے اور

طلبار کی تعداد برابر بڑھتی جاتی ہے گورنمنٹ آف انڈیا نے یونیورسٹی کی حیثیت تسلیم کرلی ہے اور اس کے امتحانات اور ڈگریوں کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو اسی درجہ کی برٹش انڈیا کی کسی یونیورسٹی کے امتحانوں اور ڈگریوں کو حاصل ہے۔ بالفعل یونیورسٹی میں شعبہ ہائے الٰہیات (تھیالوجی) علوم وفنون (سائنس و آرٹس) اور قانون کی تعلیم دی جاتی ہے۔

دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے واسطے ضروری کتابیں فراہم کرنے کی غرض سے دارالتصنیف والترجمہ قائم ہے جو یونیورسٹی کے زیر نگرانی نہایت عمدہ اور مفید کام انجام دے رہا ہے۔ ابھی پانچ چھ برس ہی کی مختصر عمر میں اس کی قابل قدر کوششوں سے وہ تمام کتابیں تیار ہوگئی ہیں۔ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے کے درجوں کے واسطے درکار ہیں۔ اس میں آٹھ قابل مترجم زیر نگرانی ایک افسر اعلےٰ کے، جو ایک مشہور فاضل مصنّف ہیں، کام کرتے ہیں اور دارالترجمہ کی خدمات قابل تحسین و آفریں ہیں۔ خاص کر ہم اُن دقّتوں کا خیال کرتے ہیں جو علوم وفنون کی کتابوں کے ترجمہ میں اور اُردو میں سائنٹفک الفاظ کے وضع کرنے یا اُن کے مرادف قائم کرنے میں مترجموں اور مصنّفوں کو ہوتی ہیں۔ سُنا گیا ہے کہ اس خاص کام کے واسطے ماہران فن کی کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں جن کے متعلق وضع الفاظ و اصطلاحات علمیہ کا کام سپرد ہے۔ حال ہی میں اِس موضوع پر ایک مفید لغت بھی شایع ہوگئی ہے۔ دارالترجمہ کی ابتدار شروع میں بطور ایک عارضی دفتر کے ہوئی تھی مگر کام کی اہمیت کے لحاظ سے ہز اگزالٹیڈ ہائنس نے اس کی عمر میں دس برس کی اور توسیع کردی ہے۔ دارالترجمہ کی خدمات میں علاوہ مکمّل یونیورسٹی کورس کے علوم ذیل کی کتابوں کی تصنیف وتراجم داخل ہیں۔ تاریخ (جس میں مشرقی اور مغربی اور قدیم وجدید ہر قسم کی تاریخ داخل ہے)۔ فلسفہ۔ اقتصادیات۔ ریاضی

(خالص اور مخلوط دونوں) طبیعیات۔ کیمیا اور قانون۔ جب فن تعلیم (انجینیری اور طب) کے شعبے یونیورسٹی میں کھلیں گے تو ان فنون کی کتابیں بھی ترجمہ کی جائیں گی جس کے واسطے ابھی سے خیال رکھا گیا ہے۔ مصنفہ اور مترجمہ کتابوں میں ڈیڑھ سو سے زیادہ تیار اور شایع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے اکثر داخل درس ہونے کے قابل ہیں۔ مختصر یہ کہ دارالترجمہ زبان اردو کی اشاعت اور توسیع کے واسطے ایک نہایت مفید محکمہ ہے۔ اور خدمات کے لحاظ سے درازی عمر کا مستحق ہے۔

باب ۱۴

اُردو شاعری کا جدید رنگ

آزاد اور حالی کا زمانہ

طرزِ جدید کے پیش رو

اُردو مرثیہ نگاروں اور نیز نظیر اکبرآبادی نے اس نئی روشنی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ جو بالآخر زمانۂ مابعد میں جدید رنگ میں جلوہ گر ہونے والی تھی۔ ان لوگوں نے اس جدید رنگ کے واسطے ایک شارع عام اپنے زمانہ کے خیال کے موافق تیار کر دیا تھا۔ جس پر راستہ چلنے والے بعد کو آئے اور شاعری میں اصلاح کا رُخ دکھا دیا تھا۔ ہماری رائے میں قدیم زمانہ کے مرثیوں میں طرز جدید کا تخم یقیناً موجود تھا جس کی آبیاری بعد کے آنے والوں نے کی۔ اور انہیں کے مبارک ہاتھوں سے وہ درخت پروان چڑھا اور برگ و بار لایا۔ مناظر قدرت واقعات کے سچے فوٹو الفاظ میں انسان کے قلبی جذبات کا من و عن اظہار، نصائح آموزی، کیفیات قلبیہ کا اظہار، الفاظ میں سلاست و روانی، تشبیہ و استعارے کا حد سے متجاوز نہ ہونا یہ سب باتیں جو زمانۂ حال کی شاعری کی جان ہیں، پُرانے مرثیوں میں کم و بیش ضرور پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح نظیر اکبرآبادی نے بھی اپنے

کلام میں اس آنے والے انقلاب کی خبر دے دی تھی اور ہمارے نزدیک زیادہ صفائی اور زیادہ وضاحت سے دی تھی اس وجہ سے کہ مراثی میں تو یہ چیزیں بطور فروع و تمہید کے تھیں اور نظیر کے یہاں وہ ایک مستقل عنوان کی صورت میں ہیں مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس زمانے کے لوگوں نے اس رنگ کو قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھا اور اس کو ایک فضول چیز سمجھ کے اختیار نہیں کیا۔ اسی وجہ سے مرثیہ گو بڑے شاعر کہلاتے تھے اور نظیر کو تو طرز قدیم کے دل دادہ ایک عامی اور جاہل شاعر سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں کیونکہ اُس نے ان کے خیال کے بموجب قواعد مقررہ کی پابندی نہیں کی اور وہ عالم و فاضل نہیں تھا اور الفاظ کی تراش و خراش کی اس نے کبھی پروا نہیں کی۔ یہ لوگ چونکہ شعر کے حُسن ظاہر کو دیکھتے تھے۔ اسی وجہ سے نظیر کا بے تکلف اور نیچرل کلام ان کو پسند نہیں آیا۔ ان پرانے خیالات کو محو کرنے کے لیے کسی زبردست قوت کی ضرورت تھی جس کی مختصر کیفیت سطور ذیل میں بیان کی گئی ہے۔

انقلاب کا اثر انقلاب زمانہ اُردو شاعری کے قدیم رنگ کے موافق ثابت نہیں ہوا۔ دلّی اور لکھنؤ کی سلطنتیں مٹ جانے سے شعراء کے سرپرست اُٹھ گئے اب یہ لوگ بے پشت و پناہ رہ گئے اور معمولی آدمیوں کے دست نگر ہو گئے جن کی نسبت زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دل میں شوق تو تھا مگر اتنا روپیہ اُن کے پاس کہاں تھا کہ مثل بادشاہوں یا اُمراء کے شعراء کی سرپرستی کر سکیں۔ ہر چند جیسا کہ پیشتر کہا جا چکا ہے۔ اکثر لوگ روزی کی تلاش میں رامپور و حیدرآباد اور دوسری ہندوستانی ریاستوں میں چلے گئے۔ مگر وہاں بھی عرصہ دراز تک ان کے پاؤں نہ جم سکے اور تھوڑے عرصے کے بعد یا تو ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہے یا اپنے وطن کو واپس آ گئے۔ اسی کے ساتھ انقلاب زمانہ نے امراء کو صرف

دولت کے اور بھی بہت سے مفید استعمال سکھائے جس سے شعر کی قدر اور شاعروں کی مالی نفع پر بہت کچھ اثر پڑ گیا۔ لوگ اب زیادہ مادّہ پرست اور کاروباری ہوگئے تھے جن کی دنیا میں نثر کی صاف اور سادی اور صحیح نظم کی خوش رنگ شفق سے بہتر ہے اب وہ پرانے رنگ کے تغزل میں کوئی لطف نہیں پاتے تھے۔ ہر چند کہ صنف غزل مقبول رہی اور اب تک مقبول ہے۔ دہلی کی تباہی انتزاع ملک اودھ، غدر ۱۸۵۷ء اور ان ہنگاموں کے انقلابات نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور اب وہ خواب غفلت سے چونکے اور افکار دنیاوی میں مبتلا ہوگئے۔ ہندوستانی ریاستیں گو ان ہنگاموں سے محفوظ تھیں مگر رفتار زمانہ کے موافق اُن کو بھی اپنے معاملات کی اصلاح کرنا ضروری تھی۔ اس وجہ سے وہ ریاستیں جو شعرا کی ملجا و ماوا بنی ہوئی تھیں وہ بھی اس انقلاب سے محفوظ نہ رہ سکیں جس کا اثر شعرا کی تنخواہوں اور منافع پر بھی بہت کچھ پڑا۔

انگریزی تعلیم کا اثر انگریزی تعلیم سے بھی اُردو نظم و نثر دونوں پر بہت کچھ اثر پڑا اور اُن کو بڑی تقویت پہنچی۔ انگریزی تعلیم نے زبان اُردو کے ساتھ ہندوستان میں وہی کیا جو انگلستان میں خود زبان انگریزی کے ریناسانس[۱] نے سولھویں صدی میں اور رومانس و افسانہ نگاری کے شوق نے اٹھارہویں صدی میں کیا تھا۔ ترجموں سے اس انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ انگریزی ادب نے جس میں نظم، نثر اور ڈراما سب کچھ داخل ہے، بہت گہرا اثر ڈالا اور ہمارے رہنماؤں کے دل میں اُردو زبان کے اسی نئے طرز پر ترقی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ابتدائی نقوش البتہ زیادہ گہرے نہیں تھے کیونکہ نقاش یا تو زبان انگریزی سے بالکل نا آشنا تھے یا بہت کم واقفیت رکھتے تھے وہ اس جدید رنگ سے ان تراجم کے ذریعہ سے واقف ہوئے تھے جو خود انگریزوں کے ایما سے

---

[۱] نشاۃ ثانیہ یعنی پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں اور علی الخصوص اٹلی میں فنون لطیفہ بلکہ جمیع مروجہ علوم و فنون کا قرون وسطیٰ کے اثر سے نکل جانا اور ایک نیا طرز اختیار کرنا۔ ۱۲۔

کرائے گئے تھے۔ مگر باوصف اس کمی کے وہ اس جدید رنگ کی تمام خوبیوں سے بخوبی واقف تھے۔ اور انہوں نے اب ارادہ کر لیا تھا کہ طرزِ قدیم کو جس میں زمانۂ حال کی روش کے اعتبار سے اکثر خرابیاں پائی جاتی تھیں، بدل ڈالیں اور اس میں ایک جدت کی چاشنی پیدا کریں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تغیر فوراً اور دفعۃً نہیں ہوا۔ بلکہ آہستہ آہستہ اور بتدریج عمل میں آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے طرز کے ساتھ پرانا طرز بھی قائم رہا۔ برخلاف رینا سانس اور رومانس کے دلدادوں کے ہماری زبان کے راہ نماؤں نے اپنے قدیم شعراء کے ادب واحترام اور نیز اُن کے رنگ کی طرح سرائی اور قدر دانی میں کسی قسم کی کمی نہیں۔ مولانا حالی کی "یادگارِ غالب" اور آزاد کا مطبوعہ "دیوان ذوق" ہمارے اس دعوے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں۔ ہمارے راہبر قدامت شکن نہ تھے بلکہ جدید رنگ کی تائید و تلقین کرنے کے باوجود وہ قدامت پرست رہے۔ ان کی غرض صرف یہ تھی کہ ادب اُردو کا دائرہ اتنا وسیع ہوجائے کہ اس میں جدید رنگ بھی شامل ہوکر اس سے پُرانے رنگ کا تصنّع اور تکلّف جاتا رہے۔ فضول مبالغے دور از کار تشبیہیں، بے مزہ لفاظی۔ ان چیزوں کے وہ مخالف تھے اور ان کی اصلاح کی بنیاد انہیں خرابیوں کے دُور کرنے پر پڑی تھی۔

جدید رنگ کی خصوصیات جوں جوں جدید رنگ پھیلتا گیا اور قوی ہوتا گیا، اسی قدر وہ مقبول ہوا۔ اور اس کے معرف اور برتنے والے پیدا ہوتے گئے۔ نئی پود جو قدیم رنگ سے بالکل ناآشنا تھی اس نے اس جدید رنگ کو بہت شوق کے ساتھ اور بہت جلد قبول کیا اس رنگ کے خاص خصوصیات یہ ہیں۔ نئے سبجکٹ اور مضامین تلاش کیے گئے غزلوں کا دائرہ جدید خیالات کے اظہار کے لیے تنگ اور نامناسب پایا گیا۔ مسدّس اور مثنوی کا دَور دورہ ہوا کیوں کہ ان اصناف کے لکھنے والوں کو زیادہ آسانی ہوتی ہے قافیوں پر قابو ہوتا ہے اور اظہار خیال مسلسل کیا جا سکتا ہے جو غزل میں مشکل ہے

ایسے مضامین جن کی عبارت میں تکلّف اور تصنّع کی ضرورت تھی ترک کیے گئے۔ رُباعی اور قطعات پر زیادہ توجہ کی گئی۔ نیچرل مضامین جو قدیم شاعری میں پس پشت ڈال دیے گئے تھے اب پیش پیش ہو گئے اور ان پر بالاستیعاب لکھا جانے لگا۔ مثلاً برکھا رُت، جاڑے اور گرمی کی بہاریں۔ دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کے خوش نما مناظر۔ اب ہماری جدید شاعری میں داخل ہو گئے جو قدما کے یہاں خال خال نظر آتے ہیں۔ اسی طرح خیالی نظمیں، بیانیہ نظمیں، تاریخی نظمیں، نصیحت آمیز اور اخلاقی نظمیں، پولیٹیکل نظمیں، اشعار بصورت سوال و جواب وغیرہ وغیرہ بھی جدید شاعری میں جگہ پانے لگے۔ غزلوں میں بھی بہت بڑا انقلاب ہوا۔ اب وہ پرانے فرسودہ مضامین زلف و کاکل، کنگھی چوٹی، مسّی کاجل وغیرہ کے معیوب سمجھے جانے لگے اب جذبات انسانی اور کیفیات قلبی کا من و عن اظہار اور بے ثباتی دنیا وغیرہ کا نہایت پُر اثر الفاظ میں بیان کیا جانا داخل فیشن ہو گیا۔ حسرت موہانی اور عزیز لکھنوی کی غزلیں اسی قبیل کی ہوتی ہیں۔

اصناف سخن میں جدتیں ایجاد اور اختراع کے شوق کی ترقی کے ساتھ کچھ لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے انگریزی نظموں کی بعض بحریں اُردو میں داخل کرنے کی کوشش کی مگر اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ اس قسم کی نظمیں بہ لحاظ اپنی نوعیت کے زبان اُردو سے میل نہیں کھاتیں۔ اسی طرح بلینک ورس (نثر مرجّز) کے بھی بہت شائق پیدا ہو گئے۔ مگر اس کو بھی پبلک مذاق نے پسند نہیں کیا اور یہ صنف بھی اُردو میں بالکل نامقبول رہی۔ ابتدا میں بعض مشہور اور کہنہ مشق استادوں نے اس پر طبع آزمائی کی تھی۔ مثلاً مولوی سیّد علی حیدر صاحب طباطبائی، مولانا شرر مرحوم، آنند کا کوروی وغیرہ۔ اور اب بھی کچھ لوگ اس قسم کی بے قافیہ نظمیں لکھتے ہیں مگر ان کو رواج عام شہرت نہیں دیتا۔ مولوی عظمت اللہ نے یہ جدت کی ہے کہ ہندی دوہرے دل کی

پیروی اُردو نظم میں شروع کردی اور الفاظ اور مضامین وغیرہ بھی ہندی ہی میں ہوتے ہیں۔ اکثر ایسی نظمیں نہایت دلکش اور بامزہ ہوتی ہیں۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ قدیم طرز اور معمولی اصناف سخن بالکل بھلا دیے گئے تھے۔ ایسا نہیں ہوا۔ مسدس یعنی چھ مصرعہ والی نظم جو مرثیہ کے واسطے مخصوص ہوگئی تھی۔ مولانا حالی نے اپنی مشہور کتاب "مدّ و جزرِ اسلام" معروف بہ "مسدس حالی" لکھ کے شہرت جاودانی بخشی اس کتاب کی اشاعت کے بعد سے اس صنف خاص کا بہت رواج ہوگیا اور اب یہ اس قدر مقبول ہے کہ ہر قسم کی نظمیں نیچرل بیانیہ، مدحیہ، اخلاقی، سیاسی، وطنی ترانے تاریخی نظمیں سب اسی صورت میں لکھی جاتی ہیں اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اس کی بحریں نہایت زوردار اور خوش آیند معلوم ہوتی ہیں۔ سلسلۂ بیان کا اس صنف میں بہت موقع ملتا ہے۔ چاروں مصرعوں کے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی جس سے شعر کا لطف اور ترنم بڑھ جاتا ہے۔ مسدس کے علاوہ اور اصناف نظم میں بھی مضمون کے ساتھ مناسبت اور میل کا بہت لحاظ رکھا جاتا ہے۔ نفس شعر میں یہ تغیر ہوا ہے کہ یادہ گوئی اور مبالغہ آمیز باتیں ترک کردی گئی ہیں۔ اور اب سادگی صفائی اور واقعیت شعر کی جان سمجھی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے زمانہ موجودہ کی نظمیں بہت مؤثر اور جذبات سے بھری ہوتی ہیں۔

جدید رنگ کے اثرات انگریزی طرز تعلیم نے اس عام افسردگی کو دُور کردیا جو آخر آخر میں لکھنؤ اور دِلّی کی شاعری پر چھاگئی تھی۔ اس نے شاعری کا دائرہ وسیع کیا۔ اور ایک نئی رُوح آزادی اور بلند خیالی کی پھونکی۔ نثر کی ترقی اور جدید فن تنقید اور ڈرامہ نویسی کے رواج کا بھی وہی باعث ہوئی۔ اس کی وجہ سے ایک وسیع اور قیمتی ذخیرۂ الفاظ، نئے تخیلات، نئی تشبیہات، نئے نئے مضمون، نئے نئے مناظر اور شعر کے نئے نئے سامان زینت فراہم ہوئے۔ نئے نئے خیال ہاتھ آئے اور ان خیالات

کے اظہار کے لیے نئی طرزیں اور صورتیں اختیار کی گئیں۔ اس کی مدد سے اکثر جدید الفاظ زبان میں داخل ہوئے اور زبان اس قابل ہو گئی کہ معنی کا نازک نازک فرق الفاظ کے ذریعہ سے ادا کر سکے۔ انگریزی تعلیم کے اثر نے زبان اردو کی قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کیا۔ جس نے لوگوں کے دل و دماغ کو ایسا جکڑ رکھا تھا۔ کہ ان کے خیالات میں تنوع باقی نہیں رہا تھا ان کی مطمح نظر محدود ہو گیا تھا اور ان کی ذہانت و طباعی زنگ خوردہ ہو گئی تھی۔ ہندوستان کی دیسی زبانوں میں اس کی وجہ سے گویا کایا پلٹ ہو گئی اور اب وہ ایک درخشاں مستقبل اپنے سامنے رکھتی ہیں اور نئے تجارب اختیار کرنے اور نئے خیالات کے اظہار میں ان کو اپنے اوپر پورا بھروسہ ہے۔ اس نے ان میں اتنا تغیر عظیم پیدا کر دیا ہے کہ زمانۂ حال کی تصانیف ان زبانوں میں گویا دوسری زبان کی تصنیفیں معلوم ہوتی ہیں مگر اس میں بھی شک نہیں کہ ان خوبیوں کے باوجود بعض خرابیاں بھی اسی کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ مثلاً مقررہ قواعد عروض سے لاپروائی۔ ہر قسم کے قابل و ناقابل مضمون کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا انگریزی الفاظ کی بھرمار۔ پھر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے فوائد نقصانات سے زیادہ ہیں اور خرابیاں بھی جو آج پیش نظر ہیں کسی وقت رفع ہو جائیں گی۔

جدید ادب اردو کے تین طرز

پہلا طبقہ

پہلا طرز ان لوگوں کا ہے جو پس پُشت دیکھنا اپنا نصب العین سمجھتے ہیں۔ یعنی قدامت پسند فرقہ جو بجائے زمانۂ خود کے گذشتہ زمانہ میں زندگی بسر کرتا معلوم ہوتا ہے ان کو اگلے وقت کی زبان تو پسند ہے اور خود اپنی زبان کسی طرح پسند نہیں آتی۔ اپنے کلام کو قدیم سانچے میں ڈھالتے اور جدید طرز سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک معمولات زندگی پر غور کرنا بھی ایک گناہ کبیرہ ہے اور یہ اس کو ایک بڑے فخر کی بات سمجھتے ہیں کہ

ایسے مضامین جس میں کچھ فلسفہ کچھ تصوّف اور کچھ عاشقانہ رنگ کی آمیزش ہو بس انہیں میں اشعار کہے جائیں۔ اگر ان کو حقیقی تصوف اور عاشقانہ رنگ سے لگاؤ ہوتا تو البتہ معذور تھے مگر بغیر کسی تعلق کے یہ یا تو قدما کے محض نقّال کہے جا سکتے ہیں یا لفاظی کے شعبدہ باز۔ پرانے مضامین کے ساتھ پرانی بحریں اور الفاظ استعمال کرنے میں بھی ان کو انہماک ہے۔ یہ لوگ اس وجہ سے شعر کہتے ہیں کہ صرف شاعری کو دلیل علم و قابلیت جانتے ہیں ایسے ہی لوگوں پر انگریزی شاعر پوپ کا شعر صادق آتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"وہ شعر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ان کے باپ بھی شعر کہتے تھے اور اپنی عدم ذہانت سے اپنی نا خلفی کا اظہار کرتے ہیں"

ظاہر ہے کہ ایسے لوگ سچے شاعر کہلانے کے کیونکر مستحق ہو سکتے ہیں البتہ شاعروں کے نقّال کہے جا سکتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگوں کے کلام سے آج کل کے رسالے اور گلدستے بھرے ہوتے ہیں مگر ان کے ساتھ ہی کچھ ایسے بھی ہیں جو قدیم طرز کی پیروی زیادہ قابلیت اور ہوشیاری سے کرتے ہیں اور قدما کی جانشینی کے مستحق سمجھے جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کے بعض طبیعت دار نوجوان ان لوگوں کے کلام کو بھی پسند نہیں کرتے، غرض کہ طرز قدیم کے قابل اور نا قابل دونوں قسم کے پیرو زمانۂ موجودہ کی رفتار سے پیچھے ہٹتے جاتے ہیں اور فی الحقیقت اگر زمانہ موجودہ کی ضروریات پر نظر ڈالی جائے تو یہ کوئی مفید خدمت بھی انجام نہیں دیتے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ان کی کوششوں سے شاعری کا لنگر حرکت میں ضرور ہے۔

دوسرا طبقہ یہ طبقہ طبقۂ اوّل کی بالکل ضد ہے۔ یہ ہر مغربی چیز کا عاشق و دلدادہ ہے۔ اپنے ملک کی پرانی روایات کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے۔ مغربی شاعری

کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور اتنا نہیں سمجھتا ہے کہ مغربی شاعری مشرقی لوگوں کے کہاں تک حسب حال اور مناسب ہو سکتی ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ مغربی تعلیم کی شراب نے اُن لوگوں کے دماغوں کو چکرا دیا اور اتنا مدہوش کر دیا ہے کہ وہ کوئی صحیح رائے قائم کر سکتے۔ اس طرز کے بانیوں نے محض نقل کو اصل الاصول قرار دیا ہے۔ وہ ہر چیز کو نئے رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ پُرانے زمانے سے اور پُرانے زمانے کی باتوں سے یا تو شرماتے ہیں یا اُن کو بے اعتنائی سے ٹال دیتے ہیں ایسے لوگوں کے نزدیک جدت اور صرف جدت شاعری کی جان ہے۔ یہ لوگ اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ ان کا کلام کسی قسم کا اثر کرتا ہے یا نہیں اور حالاتِ ملکی کے مناسب ہے یا نہیں اسی قسم کے لوگوں نے کتابوں کے مارکٹ کو ترجموں سے بھر دیا ہے۔ وہ بھی نہایت بے سلیقگی سے محض فروخت کی غرض سے کیے گئے ہیں۔ ان ترجموں میں یہ بہت بڑا نقص ہے کہ علاوہ غلط اور غیر معتبر ہونے کے وہ عمدہ اور مستند کتابوں کے بھی ترجمے نہیں ہوتے بلکہ صرف ایسی کتابوں کے ترجمے ہوتے ہیں جو پسندیدۂ عوام ہیں۔ مثلاً انگریزی ناولسٹ رینالڈس کے تراجم۔ اور اس پر بھی غضب یہ ہے کہ اکثر ترجمے اصل سے نہیں کیے جاتے بلکہ ترجمہ در ترجمہ ہوتے ہیں جس سے اصلیت بالکل مفقود ہو جاتی ہے۔ اس ترجمہ کے شوق بلکہ ناکارہ کتابوں کے ترجمہ کے ساتھ ایک نیا طرز تحریر بھی اختیار کیا گیا ہے جس کو انگریزی ہور نیکیس، کہتے ہیں یعنی ایک ایسی ناقص اور نامکمل زبان جو نہ پوری طرح سے خیالات کے اظہار پہ قادر ہے نہ معنی کے نازک نازک فرقوں کو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر کر سکتی ہے۔ یہ حال عام طور پہ ان کے کرایہ کے ٹٹو ناول نویسوں کا ہے جن کی لغو اور غیر معتبر تصانیف سے بازار بھرا ہوا ہے نیز جلد باز اخبار نویسوں کا بھی یہی حال ہے۔ پرانے طرز کو ترک کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ طرز ادا نامکمل ہو،

رنگ فوق البھڑک ہو اور عبارت طرفہ معجون بن جائے۔ ادیبوں کو اس کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ بدنمائی کو خوب صورتی پر، بھدے پن کو حسن تناسب پر، اور شور و غل کو نغمے پر ہرگز ترجیح نہ دیں۔

تیسرا طبقہ — یہ اُن اعتدال پسندوں کا اہم طبقہ ہے جو قدیم و جدید دونوں طرزوں کی خوبیوں کا خیال رکھتے ہوئے دونوں کو ملانا چاہتے ہیں۔ یہ گو زمانۂ موجودہ میں ہیں مگر زمانۂ گذشتہ کی عظیم الشان روایات سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔ یہ روایات قدیمہ کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر اپنے خیالات اپنے ہی ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ان میں اوریجنلٹی یعنی اصلیت ہے۔ ان کی غرض وہی ہے جو قدیم یونانی علم الاصنام کی روایات کے مطابق جیسن کی تھی جو ایک سنہری بھیڑی کی تلاش میں ملکوں ملکوں پھرتا تھا۔ یہ لوگ بھی اسی طرح اپنے کسی محبوب تخیل کی تلاش میں ملکوں ملکوں کے ادب و شاعری کی سیر کرتے ہیں۔ ان کو ایک ایسا تاجر نہ سمجھنا چاہیے جو ایک ملک سے مال خریدتا اور دوسرے میں بیچ ڈالتا ہے بلکہ یہ راس المال شاعری کے صناع ہیں اور اپنے مصنوعات کے واسطے جنس خام اپنے ہی ملک سے تلاش کرتے ہیں اور ان سے نئی نئی خوبصورت چیزیں بناتے ہیں یہ اپنے شعروں سے اپنے اور نیز اپنی قوم کے دل و دماغ کے واسطے غذائے روحانی تیار کرتے ہیں۔ یہ زمانۂ گذشتہ کو خوب سمجھتے ہیں اور اس سے محبت رکھتے ہیں۔ خود اپنے زمانہ کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ اور زمانۂ آیندہ سے مقابلہ کا خوف نہیں کرتے۔ اسی طبقہ میں ذیل کے مشہور شعرا، اور نثاروں کو داخل سمجھنا چاہیے۔

مثلاً حالی، آزاد، شرر، سرشار، سرور، مولوی محمد اسماعیل۔ اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر سر محمد اقبال اور حسرت وغیرہ جن میں سے بعض کے مختصر حالات ذیل میں قلمبند کیے جاتے ہیں۔ ان حضرات نے دونوں طرزوں کی خوبیوں اور عمدگیوں کو اخذ کر لیا

ہے اور انہیں پر آیندہ ترقی کی امیدوں کا دار و مدار ہے۔

حالی ۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء[1] میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ننھیال سادات کے ایک معزز گھرانے میں تھی اور پدری سلسلہ ان کا ایک بزرگ خواجہ ملک علی تک پہنچتا ہے۔ جو اپنے وقت کے ایک مشہور و معروف عالم تھے اور بہ زمانۂ غیاث الدین بلبن ہرات سے ہندوستان آئے تھے اور کچھ گاؤں پانی پت کے قریب ان کے گزارہ کے واسطے بادشاہ نے مقرر کر دیے تھے وہ پانی پت کے قاضی بھی مقرر ہوئے تھے اور اجناس بازاری کے نرخ کا تقرر اور عیدین میں نماز پڑھانے کی خدمت ان کے سپرد ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب کے والد خواجہ ایزد بخش غربت اور ناداری کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو خواجہ صاحب کی عمر نو برس کی تھی۔ ان کے والد کو ایک مجنونانہ کیفیت رہتی تھی لہذا ان کی تعلیم و تربیت کا بار اُن کے بڑے بھائی اور بہن پر پڑا۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد انہوں نے رسمی تعلیم عربی و فارسی کی شروع کی۔ سید جعفر علی میر ممنون دہلوی کے بھانجے سے فارسی پڑھی اور اور مولوی ابراہیم انصاری سے جو بعد فراغت علوم لکھنؤ سے واپس گئے تھے عربی شروع کی۔ ابھی درسیات سے فراغت نہیں ہوئی تھی اور ہنوز سترہ برس کی عمر کو نہیں پہنچے تھے کہ ان کی شادی ان کی مرضی کے خلاف کر دی گئی تحصیل علم کے شوق میں اور نیز اس خیال سے کہ بیوی کے خبر گیراں خوش حال ہیں یہ چپکے سے گھر چھوڑ کر ۱۸۵۴ء میں دلّی چلے گئے۔ یہاں مولوی نوازش علی سے جو اس زمانہ کے ایک مشہور معلّم اور واعظ تھے۔ ڈیڑھ سال تک عربی پڑھتے رہے۔ اس وقت ان کو صرف و نحو، منطق،

---

[1] غالباً ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء۔ جیسا کہ خود حالی نے لکھا ہے۔ نقوش آپ بیتی نمبر

عروض وغیرہ میں کافی دستگاہ ہوگئی تھی۔ مگر ۱۸۵۵ء میں اپنے اعزا کے اصرار پر پھر پانی پت واپس گئے۔ یہاں اپنے طور پر کتب بینی کا مشغلہ جاری رہا۔ ۱۸۵۶ء میں کلکٹری حصار میں ایک ملازمت کر لی مگر غدر ۵۷ء کے ہنگامہ کی وجہ سے پھر اپنے وطن واپس آئے۔ اب کی مرتبہ منطق و فلسفہ کے ساتھ حدیث و تفسیر بھی نظر سے گزریں۔ غرض کہ تین چار برس پانی پت میں قیام کے بعد ان سے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے جو کہ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کے رئیس اعظم تھے ملاقات ہو گئی اور ان کی مصاحبت میں رہنے کا موقع مل گیا۔ نواب صاحب موصوف ایک جید فاضل اور مشہور شاعر تھے اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ آیا حالی نے اپنا کلام شیفتہ کو دکھلایا اور ان سے اصلاح لیتے تھے یا نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں، جیسا کہ خواجہ صاحب کو خود اعتراف ہے کہ نواب صاحب کی ملازمت اور صحبت سے ان کو بہت کچھ فائدہ پہنچا۔ ان کے اس شعر سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیفتہ سے استفاضۂ سخن کرتے تھے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں ۔۔۔ شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

جہانگیر آباد کی شاعرانہ فضا۔ نواب صاحب کی صحبت، وہاں کی فارغ البالی کی زندگی۔ ان سب چیزوں نے پرانا شعر و شاعری کا شوق جو ایک مدت سے افسردہ ہو رہا تھا از سر نو تازہ کر دیا اور اب یہ اپنی غزلیں مرزا غالب کے پاس برنظر اصلاح دلّی بھیجنے لگے وہ شیفتہ کے پاس بحیثیت ان کے رفیق اور ان کے بیٹوں کے معلّم کے تقریباً آٹھ برس رہے۔ اس کے بعد وہ قسمت آزمائی کے لیے لاہور آئے جو اس وقت دلّی سے بعد غدر نکلے ہوتے لوگوں کا ملجا و ماوا ہو رہا تھا۔ یہاں ان کو گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک جگہ مل گئی جس میں ان کو سر رشتۂ تعلیم کی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت دیکھنا اور درست کرنا پڑتی تھی۔ چونکہ اس کام میں انگریزی ادب

سے ایک قسم کی بالواسطہ واقفیت حاصل ہو گئی اور انگریزی خیالات اور طرز ادا سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی تھی لہذا مشرقی شاعری اور مشرقی انشاء پردازی کی فضول باتوں کی وقعت ان کے دل میں کم ہو گئی اور اسی کے ساتھ اپنی زبان اور اپنی شاعری میں بھی اسی طرز کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ یہ اس جگہ پر تقریباً چار برس رہے ہوں گے کہ وہاں سے دلّی واپس آنا پڑا۔ جہاں ان کو انگلو عربک اسکول میں ٹیچری کی جگہ مل گئی۔ لاہور میں چیفس کالج میں بھی آٹھ مہینے تک وہ ٹیچر رہ چکے تھے مگر وہ جگہ ان کو پسند نہیں آئی تھی۔ دلّی میں سرسیّد مرحوم سے ان کی ملاقات ہوئی جن کی خاص فرمائش سے مشہور و معروف "مسدس حالی" لکھا۔ ۱۸۸۶ء میں جب کہ وہ عربی کالج میں معلّم تھے، سر آسمان جاہ علی گڑھ آئے ہوئے تھے جن سے سرسید مرحوم نے اُن کا تعارف کرا دیا اور انہوں نے از راہ قدر دانی و مردم شناسی پچھتر روپیہ ماہوار نظام گورنمنٹ سے ادبی خدمات کی انجام دہی کے واسطے ان کا مقرر کرا دیا۔ بعد کو جب کہ مولانا حالی علی گڑھ کالج کے ڈیپوٹیشن کے ساتھ حیدر آباد گئے تھے تو یہ تنخواہ مبلغ سو روپیہ ماہوار کر دی گئی تھی۔ ملازمت سے دست کشی کے بعد مولانا نے پانی پت میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں ایک قسم کی فارغ البالی کے ساتھ اپنے محبوب شغل تصنیف و تالیف میں وہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں خطاب شمس العلماء بجلدوے ان کی قابلیت اور تعلیمی خدمات کے سرکار سے عطا ہوا۔ بالآخر ستتّر برس کی طویل عمر میں ۱۴ صفر ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء کو اس دار ناپائدار سے رحلت کی۔

مولانا حالی پُرانے زمانے کے یادگار لوگوں میں تھے۔ نہایت خلیق، ملنسار، حلیم الطبع اور سچے فدائی قوم تھے۔ دنیوی جاہ و ثروت کا خیال ان کے دل میں مطلق نہ تھا۔ ان کی زندگی ایک سچے انشاء پرداز کی زندگی تھی جس نے اپنے تعلیمی و تصنیفی مشاغل

سنہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء۔ فاضل

کے آگے دنیوی مرتبہ و عزت کو ہمیشہ ہیچ سمجھا۔ قومی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ فرقہ وارانہ اختلافات سے وہ بالکل علیحدہ تھے۔ ان کا مطمح نظر بہت بلند تھا اور لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کے وہ پورے عامل تھے۔

حالی کی شاعری اور اس پر غالب اور شیفتہ کا اثر

حالی کی شاعری کی ابتدا دہلی میں ہوئی۔ جب کہ وہ سترہ برس کی عمر میں چھپ کر گھر سے نکل گئے تھے۔ دلی میں وہ مرزا غالب کی صحبت میں اکثر آتے جاتے تھے اور انہیں کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا تھا۔ اس اثناء میں وہ مشاعروں میں بھی شریک ہوتے اور نکات شعریہ مرزا غالب ہی سے حل کرتے تھے۔ مرزا بھی ان سے بہت خوش تھے اور ان کی طباعی اور مستعدی کی قدر کرتے تھے۔ دلی چھوڑنے کے بعد وہ جہانگیر آباد آئے جہاں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبت میں ان کی شاعری کے رنگ میں پختگی آئی۔ نواب صاحب کی صحبت اُن کی شعر گوئی کی محرک ہوئی تھی اور یہیں انہوں نے اپنا رنگ بدلا اور مقصد شاعری کو بھی تبدیل کیا اور اب ان کو پرانے رنگ کی فضول باتیں اور بے لطف مبالغے پسند نہیں آتے تھے۔ کسی چیز کا من و عن بیان سیدھے سادے الفاظ میں جس میں حقیقی جذبات کا بھی کچھ شمول ہو۔ اب ان کو مرغوب ہونے لگا۔ مرزا غالب سے اب بھی وہ اصلاح لیتے تھے اور انہیں کا رنگ ان پر غالب تھا۔ ہر چند کہ شیفتہ کا اثر اور رنگ ان کے اس زمانہ کے کلام میں بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد وہ جہانگیر آباد سے لاہور آئے۔ مگر یہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا اور یہاں کا قیام وہ اپنے واسطے ایک قید سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ کے لاہور کے حالات اور وہاں کے لوگوں کی بے اعتنائی کا حال جو انہوں نے قلمبند کیا ہے اس سے ان کے دلی خیالات کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مگر یہیں لاہور میں گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت میں ان کو انگریزی علم ادب سے ترجموں کے ذریعہ سے واقفیت حاصل

ہوئی جس کا اثر ان پر بہت اچھا پڑا۔ یہ زمانہ ان کی علمی زندگی کے رُخ بدل جانے کا زمانہ تھا اور ان کے اس زمانہ کی تحریروں میں ہم کو اُس جدید رنگ کی ابتدا بھی نظر آتی ہے جو بعد کو ان کی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ ثابت ہوا۔ وہ انگریزی شاعری کے بڑے مداح تھے اور ان کی سادگی اور صفائی اور بلند نظری کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ کاش یہی سب چیزیں ہمارے ملک کی شاعری میں بھی داخل ہو جائیں۔ اسی زمانہ میں لاہور میں ۱۸۷۴ء میں ایک ادبی انجمن قائم تھی جس کے بانی مولانا محمد حسین آزاد اور کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب اس کے سرپرست تھے۔ اس انجمن کے جلسوں میں گو مشاعرے ہوتے مگر وہ اس زمانہ کے مشاعروں کی طرح نہیں تھے۔ یعنی نہ تو کوئی مصرعۂ طرح مقرر کیا جاتا نہ کسی خاص ردیف و قافیہ کی پیروی کی جاتی۔ لوگ اپنے اشعار جو کسی خاص مضمون پر لکھے جاتے جو انجمن کی طرف سے پہلے سے مقرر ہو جاتا تھا انجمن کے جلسوں میں پڑھتے تھے۔ حالی گو کہ اس انجمن کے بانیوں میں نہ تھے مگر اس کے ابتدائی شرکا میں ضرور تھے اور اس کے جلسوں کی شرکت میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ ان کی چار نظمیں "برکھا رُت۔ نشاطِ امید۔ مناظرۂ رحم و انصاف اور حُبِّ وطن" اسی انجمن کے مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں اور بہت مقبول ہوئی تھیں۔

سرسید کا اثر غالب اور شیفتہ کا اثر ان کی شاعری پر سطور بالا میں بیان ہوا اب دیکھنا چاہیے کہ سرسید مرحوم نے ان کی شاعری پر کیا اثر ڈالا۔ سرسید اس زمانہ میں مسلمانوں کو ان کے خوابِ غفلت سے چونکانے اور ان کی اصلاح کے کام میں مشغول تھے۔ جب انہوں نے حالی کی طبیعت کا رنگ دیکھا تو ان سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کے زوال کے متعلق ایک نظم لکھ دو۔ مسدس حالی اسی کوشش کا نتیجہ تھا۔ یہ نہایت کامیاب کتاب ثابت ہوئی اور چھپنے کے ساتھ ہی فوراً مقبولِ عام ہو گئی۔ اُن

کا رنگ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے بہت سے ناقل پیدا ہو گئے۔ مگر اب تک کسی شخص کو اس صنف میں وہ کامیابی نہیں نصیب ہوئی جو مولانا حالی کو ہوئی جس کے وہ فی الواقع مستحق تھے۔ اب وہ ایک قومی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے مسدس کے بعد بعض اور نظمیں دہلی کی تباہی اور بربادی پر اور حکیم محمود خاں صاحب کا مرثیہ جس میں مسلمانوں کی زمانہ گذشتہ کی عظمت اور زمانہ موجودہ کی پستی کا نہایت مؤثر الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے اسی رنگ میں لکھا گیا۔ ان نظموں سے ان کی شہرت ایک رفارمر اور خطیب کی ہو گئی۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کو اپنے پُر زور اور مؤثر الفاظ کے ذریعہ سے ابھارتے تھے کہ اب وقت آگیا ہے کہ کمرِ ہمت باندھیں اور اپنی قوم کو قعرِ مذلت سے نکالنے میں جو کچھ ان سے ہو سکے مدد دیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُن کے مخاطب ان کے اہل مذہب ہی نہیں بلکہ کل اہل وطن یعنی اہل ہند تھے۔ اُن کے اعلےٰ خیالات شریف عورتوں کے متعلق "چپ کی داد" اور "مناجات بیوہ" کی صورت میں ظاہر ہوئے جو نہایت مؤثر اور دل کش نظمیں ہیں۔ آخر عمر میں ان کے اشعار فلسفیانہ اور عمیق ہوتے تھے جیسا کہ ان کے ترکیب بند "تحفۃ الاخوان" سے ظاہر ہے۔

تصانیف مولانا حالی کی منظوم تصانیف حسب ذیل ہیں۔ ان کی نثر کی تصانیف نثر کے باب میں بیان کی جائیں گی۔

(۱) مثنویاں۔ مناظرۂ تعصب و انصاف۔ رحم و انصاف۔ برکھارت۔ نشاط امید۔

(۲) مسدس حالی

(۳) شکوۂ ہند

(۴) "کلیات حالی" جس میں اُن کا دیوان مع مقدمۂ شعر و شاعری شائع ہوا ہے۔

(۵) مناجات بیوہ، اور چپ کی داد۔

(۶) مراثی غالب و حکیم محمود خاں و تباہی دہلی وغیرہ۔

(۷) مجموعۂ نظم حالی جس میں اُردو کی متفرق نظمیں ہیں۔

(۸) مجموعۂ نظم فارسی۔ جس میں فارسی کا کلام ہے۔

مثنویاں ان کی مثنویاں بہت مقبول ہوئیں۔ یہاں تک کہ بعض تو یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل ہیں۔ ان کی عبارت بہت صاف اور بے تکلف مشرقی مبالغے اور صنایع بدایع سے خالی ہے ان میں اخلاقی تعلیم نہایت مؤثر اور دلفریب انداز سے دی گئی ہے اور کہیں کہیں بصورت مکالمہ ہے جس میں ہر فریق کی اچھائیاں اور برائیاں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ واقعات تاریخی کے حوالوں سے بیان کی گئی ہیں مثلاً مثنوی رحم و انصاف میں رحم اور انصاف دونوں اپنی اپنی فضیلتیں اور دوسرے کی خرابیاں اور نقص ایک دلکش انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ان کا فیصلہ عقل کے سپرد کیا جاتا جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم اور معاون و مددگار ہو۔ مثنوی برکھا رُت بھی نہایت عمدہ اور دلچسپ مثنوی ہے۔ اس میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا حال بڑی خوبی اور دل فریبی سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً بارش کے فائدے پہاڑوں اور میدانوں میں اس موسم میں فرشِ زمردیں کا بچھ جانا۔ کل جاندار ہستیوں میں ایک خاص قسم کی زندگی اور اُمنگ کا پیدا ہونا وغیرہ۔ ان کی زبان بے تکلف اور سہل اور طرز ادا نہایت نیچرل ہے۔ فضول مبالغے اور دُور از کار تشبیہیں اور استعارے ان میں مطلق نہیں۔ یہ اس رنگ کی ابتدائی تصنیف ہے جس میں مولانا کو آخر عمر میں کمال حاصل ہوا۔ البتہ اگر پُرانے شعراء کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ نظمیں بہ لحاظ زبان و تخیل کے کوئی اعلےٰ درجہ کا کمال نہیں رکھتیں۔ مگر اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک ایسے رنگ کی راہبر ہیں جس میں لوگوں کے اب یہ دل نشین ہو جاتا ہے کہ علاوہ

معمولی فرسودہ مضامین شاعری کے کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن پر شاعر بخوبی طبع آزمائی کر سکتا ہے۔

مسدس حالی مولانا کی یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔ یہ ایک نیا دور پیدا کرنے والی کتاب ہے۔ اس کی مقبولیت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ یہ ایک الہامی کتاب ہے اور اس کو تاریخ ارتقاء ادب اُردو میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک نیا تارہ ہے جو اُردو کے اُفق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ایسی پُراثر اور پُردرد نظموں کے واسطے مسدس نہایت موزوں چیز ہے۔ اس کے بہت سے نقال پیدا ہوئے مگر کوئی شخص اب تک بہ لحاظ جوش اور زور تخیّل اور طرز ادا کے مولانا تک نہیں پہنچا۔ اس میں اسلام کی گذشتہ عظمت، مسلمانان سابق کے کارنامے۔ ان کے بلند خیالات اور اولوالعزمیاں اور برخلاف اس کے زمانۂ موجودہ میں ان کی پستی و زوال اور سُستی و کاہلی کا ذکر ہے۔ آخر میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ تاریخ عالم میں جو ان کا مرتبہ پہلے تھا، اب پھر اس کو حاصل کرنے کے لیے کمر ہمت باندھیں۔ یہ کتاب بوڑھے۔ جوان۔ بچے سب کے دل پسند ہے۔ اس نے کاروان مسلم کے لیے بانگ جرس کا کام کیا۔ کہ اُٹھیں اور آمادۂ کار ہوں، طبع ہوتے ہی اس کی عظیم الشان اشاعت ہوئی۔ زمانۂ حال کی کوئی اُردو کی کتاب مقبولیت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا مسلمان اس سے آشنا ہے اور کچھ عرصہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو تو یہ حفظ تھی اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام قومی اچھائیوں اور برائیوں کا ایک ساتھ جائزہ لیتی ہے یعنی اچھائیاں زمانۂ گذشتہ کی اور برائیاں زمانۂ موجودہ کی۔ اس میں مناظر زمانۂ جاہلیت کی حالت، جزیرہ نمائے عرب کی تمام متمدن دنیا سے انقطاعی صورت

عرب اقوام کا آپس میں ذرا ذرا سی بات پر لڑنا جھگڑنا ان کا تعصب اور ناروا داری ان کا طغیان و بُت پرستی وغیرہ وغیرہ نہایت صحیح واقعہ نگاری کے طریق پر دکھایا ہے۔ اسی حالت میں پیغمبر اسلام کا ظہور ہوتا ہے۔ آپ کی تبلیغ کے ابتدائی ثمرات اعلائے کلمۂ حق توسیع علوم۔ استیصال ظلم و تعصب۔ اصلاح اخلاق اور ان تمام خوبیوں کی نشر و اشاعت جن کے مفقود ہونے سے آج کل اہل اسلام مورد آفات ہو رہے ہیں اور جن کی کیفیت آخر کتاب میں نہایت وضاحت اور اثر سے لکھی ہے۔ اس میں اسلام کی وہ تمام بیش بہا خدمتیں بیان کی گئی ہیں جو اس نے اپنے علوم و فنون کے ذریعہ سے اخلاقی اور علمی دنیا میں کی ہیں۔ پھر مسلمانوں کی تعمیر بلاد اور سیر و سیاحت کا ذکر ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ وہ اپنے وطن سے نکل کر دور دراز مقامات پر مثلاً اسپین میں جبرالٹر اور ہندوستان میں کوہ ہمالہ تک پہنچ گئے۔

ہمالہ کو ہیں واقعات ان کے ازبر نشان ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر

سرسید مرحوم اس کتاب کے متعلق یوں رائے زنی کرتے ہیں:

"یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنف نظم میں ایک نیا دور پیدا کر دیا اس کی عبارت کی خوبی اور صفائی اور روانی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ امر کچھ تعجب خیز نہیں کہ اتنا مہتم بالشان مضمون اس قدر واقعیت کی پابندی کے ساتھ اور بلا اغراق، و مبالغہ اور تمثیل و استعارہ کے جو کہ ہماری شاعری کی جان اور شاعروں کا ایمان ہے اور پھر اس قدر موثر اور سلیس اور فصیح طریقہ سے بیان کیا جائے اس کے بہت سے بند تو ایسے ہیں کہ ان کو پڑھ کر سخت سے سخت دل کے لوگ بھی بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتے۔ کیوں نہ ہو جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ ضرور

دِل میں گھر کرتی ہے"

شکوۂ ہند — شکوۂ ہند اور قصیدۂ غیاثیہ بھی مسدس مد و جزر اسلام کے طرز میں ہیں یعنی ان میں بھی وہی بیان اسلام کی قدیمی شان و شوکت اور موجودہ پستی و نکبت ہے جو اب ہندوستان میں رُونما ہے۔ ترک لذات کی جگہ مزے داری۔ سادگی کی جگہ آرام طلبی، قوت اور مردانگی کے عوض ضعف اور بوداپن، چالاکی و مستعدی کے بدلے سُستی و کاہلی اب گھر گھر نظر آتی ہے۔ اس مرقع میں کہیں کہیں تصاویر کا رنگ شوخ اور تیز ہو گیا ہے مگر صرف اس غرض سے کہ خوابیدہ جماعت چونکے اور اپنے خواب غفلت سے بیدار ہو۔[۱]

مراثی — مراثی مرزا غالب و حکیم محمود خاں وغیرہ بھی نہایت دلچسپ مؤثر اور قابل قدر نظمیں ہیں۔ اوّل الذکر علی الخصوص نہایت ہی درد انگیز اور پُرزور مرثیہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا رنج و غم مشکّل بہ نظم ہو گیا ہے وہ سچّے جذبات اور حقیقی تاثر سے لبریز اور غم زدہ دل کی کیفیات کی سچی تعبیر ہے۔ سادگی یعنی شائبۂ اغراق و مبالغہ سے اُس کا معرّا ہونا مشرقی شاعری کا جوہر ہے، اُس کا نشان امتیاز ہے اور فی الحقیقت یہی ایک کتاب مولانا حالی کی شہرت شاعری کے واسطے بالکل کافی ہے حکیم محمود خاں صاحب کے مرثیہ کا رنگ مسدّس اور شکوہ کا رنگ ہے۔ اس میں دِلّی کی تباہی اور مسلمانوں کی پستی کا ذکر نہایت اثر کے ساتھ عبرت انگیز طریقہ سے کیا ہے۔

مناجات بیوہ — یہ چھوٹی سی عجیب و غریب کتاب مولانا کی ہمارے نزدیک "مسدّس" اور "شکوہ" سے بھی زیادہ مطبوع خلائق ہے اس کی بحر کسی قدر غیر معمولی ہے جو اصطلاح

---

[۱] اس کا جواب بیان یزدانی نے "رخصت عروس" کے نام سے لکھا ہے جس طرح شکوہ میں حالی نے ہندوستان کی شکایت کی ہے کہ اس نے ہم کو خراب کیا اسی طرح رخصت عروس میں یزدانی نے خود اپنی شکایت کی ہے کہ ہم نے ہندوستان کو خراب کیا ۱۲۔

علم عروض "صوت الناقوس" کہلاتی ہے۔ فعلن فعلن فعلن فعلن۔ سوشل معاملات کی اصلاح کی ہو۔ اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ بنگال میں ودیا ساگر، بیوہ عورتوں کے حامی تھے۔ "مناجات بیوہ" میں بیوہ عورتوں کی دردناک حالت میں اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ اس کو پڑھ کر یا سُن کر دل پھٹ جاتا ہے۔ اس کا ترجمہ ہندوستان کی اکثر زبانوں میں ہو گیا ہے۔ اس کتاب کے متعلق کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اس کو پڑھتے وقت اکثر شوہر دار عورتیں کہتی ہیں کہ کاش ہم بیوہ ہوتے تو اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتے۔ اس کی تعریف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔

چپ کی داد اس کتاب میں عورتوں کی خوبیوں اور نیز ان کے اعلےٰ فرائض منصبی کا ذکر ہے۔ یہ حیدر آباد دکن میں مصنف نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جس کے صدر مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم ریاست تھے، پڑھ کر سنائی تھی۔ یہ کتاب بھی مولانا کے خاص رنگ کی ہے۔ یعنی اس میں بھی وہی سلاست بیان اور صفائی زبان اور سیدھی سیدھی باتیں ایک لطیف پیرایہ میں ہیں جو ان کا خاص شیوہ ہے۔ ان تمام نظموں کی یہ خاص خوبی ہے کہ فرقہ وارانہ اختلافات سے مصنف مرتفع ہیں۔

دیوان حالی اس کے شروع میں مقدمہ شعر و شاعری ہے جس میں کہ نفس شاعری کی حقیقت سے نہایت فاضلانہ طور پر بحث کی گئی ہے۔ دیوان میں حسب معمول قدیم غزلیات قدیم و جدید دونوں رنگ کی رباعیات، قصائد، ترکیب بند، تاریخیں سب کچھ ہیں۔ قطعات میں اکثر کسی اخلاقی مسئلہ کو بصورت قصہ یا مکالمہ کے بیان کرتے ہیں۔ بعض قطعات فی الواقع نہایت بلیغ اور عمیق خیالات پر مشتمل ہیں۔ غزلیات اور اصناف سخن میں سب سے زیادہ ہیں۔ اور مغلق و پیچیدہ خیالات سے خالی ہیں۔ طرز جدید کی غزلوں میں پرانا رنگ بدل کر زمانۂ حال کی روش کی

ابتذال معلوم ہوتی ہے۔ یہ سب غزلیں جذبات سے لبریز ہیں۔ بعض اشعار میں کوئی خیال یا واقعہ مسلسل قطعہ بند صورت میں بیان کیا گیا ہے جو موجودہ رنگ کی خاص پہچان ہے۔ رباعیات مختلف مضامین پہ اکثر اخلاقی او نصیحت آمیز ہیں۔ ان میں مفید اور کار آمد باتیں مؤثر اور نمدار الفاظ میں قدما کے طرز بیان کی گئی ہیں جو بہت مقبول ہیں اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں ان کا ترجمہ انگریزی میں مسٹر جی ای۔ وارڈ نے کر دیا ہے، قصائد کی یہ شان ہے کہ بر خلاف طریقۂ سابق کے مادح کی ساری قابلیت ممدوح کی مدح اور محض لفظی شان و شکوہ میں صرف نہیں ہوتی بلکہ ممدوح اپنے اہم فرائض اور ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے۔ اور موقع موقع پر نصیحت و عبرت کی باتیں بھی اس کو سنائی جاتی ہیں۔ موجودہ حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی تخت نشینی کا قصیدہ مثال کے طور پہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

مقدمۂ شعر و شاعری اس نفس میں شعر و شاعری سے بحث اور شعر کے اعلےٰ آئیڈیل یعنی ملتہائے مقصود کا ذکر ہے۔ ماہیت شعر کے متعلق مشرقی اور مغربی شعرا اور ناقدین کی رائیں نہایت تفصیل و وضاحت سے مثالوں کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ مقدمہ گو کہ بڑی قابلیت سے لکھا گیا ہے مگر کسی قدر سطحی ہے۔ لائق مصنف کا خیال ہے کہ اردو غزل اور نیز دیگر اصناف سخن اصلاح کے محتاج ہیں لہذا ان میں ضروری اصلاح ضرور ہونا چاہیے۔ وہ غزل میں مروجہ بیان حسن و عشق کو نہیں پسند کرتے بلکہ اس کو اس بلند پایہ پر دیکھنا چاہتے ہیں جس میں صرف بہترین اور اعلےٰ ترین مظاہر دوستی و محبت کا بیان ہو۔ اسی طرح وہ عورتوں کے بناؤ سنگار اور شیخ و زاہد سے چھیڑ چھاڑ کے بھی غزل میں حامی نہیں ہیں[1]۔ دائرۂ غزل کو وسیع ہونا چاہیے۔ اور اس میں نہ صرف عاشقانہ فلسفیانہ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ہوں بلکہ ان کے علاوہ اس میں نیچرل قومی اور سیاسی مضامین بھی جگہ پائیں۔ درستی زبان

---

[1] دیکھیے فٹ نوٹ آئندہ صفحہ ۴۸۶ پر

بھی بہت ضروری شے ہے اور الفاظ اور محاورات کی صحت کا ضرور خیال رکھا جائے۔ اسی طرح صنایع بدایع یعنی شعر کے ظاہری تکلفات کی بہتات نہ ہونا چاہیے اور نہ شعر کی خوبی کا دارومدار ان پر رکھا جائے سنگلاخ زمینیں اور مشکل ردیف قافیے جن کے مستحق اور

(حاشیہ صفحہ ۴۸۵)

لہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ لائق مصنف نے اس موقع پر مولانا حالی کا مفہوم نہیں سمجھا اور عام طور پر لکھ دیا کہ شیخ و زاہد پر جو پھبتیاں کسنے اور ان کو بنانے کا اُردو شاعری میں عام رواج ہو گیا ہے۔ اس سے لوگوں کو باز رہنا چاہیے۔ مولانا نے اس موقع پر جو عبارت واعظ اور زاہد کے متعلق تھا اور ان پر نکتہ چینی کے تعلق لکھی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی صرف دو صورتوں میں جائز ہو سکتی ہے۔ ورنہ بالکل بے کار ہے اور اس کو ترک کر دینا چاہیے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اس قسم کی نکتہ چینی انہیں لوگوں کو زیبا ہے۔ جن کو فی الواقع اس جماعت سے کسی قسم کی مخالفت ہو، دوسری صورت یہ ہے کہ اگر اس قسم کی کوئی مخالفت نہ ہو تو یہ طنز و تشنیع ایسے طریقہ سے کی جائے جس سے مقصود اصلی ان معائب کا اظہار ہو جو اُس جماعت میں عموماً پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ریا۔ مکر۔ سالوس۔ خشونت۔ درشتی۔ بدخلقی وغیرہ نہ یہ کہ ان کی ذات پر بلا وجہ حملہ کیا جائے یا ان کی پستی میں اپنی بلندی ثابت کی جائے۔ مولانا حالی نے اس مجوزہ نظریہ کے ثبوت میں ذوق کے دو شعر پیش کیے ہیں ؎

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو　　تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اور اس کے آگے لکھا ہے کہ چونکہ اس شعر میں اس خصلت کی طرف اشارہ ہے جو طبقۂ زہاد و عباد میں اکثر پائی جاتی ہے کہ اوروں کو ذرا ذرا سی بات پر ملامت کرتے ہیں اور آپ اپنی اصلاح سے بے خبر ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے اشعار پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دوسرا شعر یہ ہے ؎

ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر　　وسمہ آب بنگ سے مہندی نئے گل رنگ سے

اس شعر میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جو شیخ پر طعن کی وجہ معقول ٹھہرے۔ سوائے اس کے کہ بیچارے شیخ کی داڑھی سفید ہے اور محض اس جرم میں اس کو بھنگڑ اور شرابی بنایا گیا ہے۔ (بقیہ آئندہ صفحہ ۴۸۷ پر)

شاہ نصیر وغیرہ دلدادہ تھے۔ ان سے احتراز کرنا چاہیے۔ حتی الامکان ردیف بھی اڑا دی جائے۔[1]

ادبیات حالی | حالی کا مرتبہ ادب میں خاص طور پر ممتاز ہے۔ سب سے پہلے اُن ہی نے غزل و قصیدہ میں جدید رنگ شامل کیا۔ مسدس کی اہمیت عملی طور پر ثابت کی۔ اور مسلمانوں کے انحطاط کا تذکرہ غزل اور مسدس میں مؤثر طریقہ سے کیا۔ وطن یعنی مادرِ ہند پر نظمیں لکھیں۔ طرزِ قدیم پہ کہ جس میں تکلف و تصنع اور خلاف واقعہ باتیں چیزِ غالب تھیں

(بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ ۴۸۶)

اسی اصول کے تحت میں دو چار شعر مختلف لوگوں کے اس مبحث پر لکھے جاتے ہیں جن سے ناظرین خود اندازہ کریں گے کہ کون سا قاعدہ کس پر منطبق ہوتا ہے اور کس قسم کی طعن و تشنیع کی اجازت اور کس کی ممانعت ہے۔

شیخ صاحب برائیاں مے کی | اور جو کوئی چھیت کی آ جائے (ریاض)
ایک ٹیپ دی تھی حضرت زاہد کو اے ریاض | اب ہاتھ مل رہا ہوں کہ اچھی بُری نہیں (〃)
کبھی اے کش کو دیں سے تخنۂ انگور کی خدمت | جناب شیخ ٹھیکہ سے چکے ہیں باغ رضواں کا (راسخ)
مے بزہاد مکن عرضہ کہ ایں جوہر نایاب | پیش ایں قوم بشوربۂ زمزم نہ رسد (غالب)
دیکھنا ناسخ سرِ شیخ معمم کی طرف | کیا کلس مسواک کا ہے گنبد دستار پہ (ناسخ)
کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ | پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے (غالب)
کب کسی در پہ جبہہ سائی کی ! | شیخ صاحب نماز کیا جانیں (داغ)

[1] اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مولانا حالی ردیف کے خارج کرنے کی صلاح نہیں دیتے! بلکہ اُن کا منشاء یہ ہے کہ غزل گوئی میں جہاں تک ممکن ہو آسانی مدنظر رکھی جائے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔ کہ "شاعر کو چاہیے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیے سے میل کھاتی ہوئی ہو اور ردیف و قافیہ دونوں مل کر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ مردف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہئیں اور صرف محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہیے۔" ۱۲

ضرب کاری لگائی۔ ہمواری خیال کو مدنظر رکھا اور عبارت کو تعقید و تکلف سے پاک کیا۔ سیاسی مضامین اپنے کلام داخل کیے آزاد کے ساتھ حالی کو بھی اردو شاعری کے جدید رنگ کا بانی سمجھنا بالکل بجا ہے۔ ان کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

نیچر کی پیروی۔ مبالغہ اور اغراق سے احتراز۔ سادگی اور صفائی۔ جذبات اور درد و اثر۔ ان کی عبارت بہت صاف سادہ اور جلد سمجھ میں آنے والی ہے۔ صنایع بدایع بہت کم اور احتیاط کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ فضول تعلی اور بے جا اظہار علم و فضل سے محترز رہتے ہیں۔

نقائص حالی وہ کہیں کہیں قواعد عروض سے باہر نکل جاتے ہیں اور صحت الفاظ و محاورات کا خیال نہیں رکھتے۔ غیر مانوس انگریزی الفاظ بھی کہیں کہیں لکھ جاتے ہیں شاید اس غرض سے کہ کلام میں ایک خصوصیت پائی جائے اور معاصرین کے کلام سے متمیز ہو۔ کبھی ان کا تخیل بہت اعلےٰ ہوتا ہے اور کبھی محض تک بندی کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ ایک رفارمر اور نیشنلسٹ کی حیثیت بھی کہیں کہیں کلام کے مزے کو پھیکا کر دیتی ہے لیکن باوجود اس کے بھی ان کے کمال شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جس طرح وہ قومی اور وطنی نظموں کے موجد ہیں اسی طرح مناظر قدرت اور نیچرل شاعری میں بھی ان کا کلام لاجواب ہے اور ان کا یہ احسان کبھی نہ بھولے گا کہ انہوں نے اردو شاعری کو ایک بڑی حد تک ان مضر اخلاق چیزوں سے پاک و صاف کر دیا جو اس میں سرایت کیے ہوئے تھیں اور اس میں ایک نئی روح پھونکی۔ مختصراً یہ کہ ہر چند وہ شعرائے اردو کی صف اولیں میں شامل نہ بھی کیے جائیں مگر ادب اردو کے سب سے بڑے محسن وہ ضرور شمار کیے جائیں گے۔

مولانا محمد حسین آزاد شمس العلماء[1] مولوی محمد حسین آزاد کو جدید رنگ کا بانی اور ادب اردو کا

[1] ولادت ۱۸ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء۔ وفات ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء مطابق ۱۳۲۸ھ۔ فاضل

مجدّد سمجھنا بالکل بجا ہے۔ زمانۂ حال کے بہت بڑے ادیب، بہت مشہور نقّاد، نامی گرامی نقاد فنِ تعلیم کے بہت بڑے ماہر اور ایک مشہور و معروف اخبار نویس تھے۔ ان کمالات کے علاوہ جدید فارسی کے اُستادِ کامل اور فلالوجی (علم الالسنہ) کے بھی بڑے ماہر تھے اور ان کی خدمات اور احسانات زبان اُردو پر بے حد ہیں، اُردو شاعری میں اس رنگ کا بانی اور اس میں ایک نئی رُوح پھونکنے والا اگر کوئی فی الحقیقت کہا جا سکتا ہے تو وہ مولانا کی ذات ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ادیب تھے۔ ان کے کچھ مختصر حالات آئندہ حصّہ نثر میں بھی بیان کیے جائیں گے جس سے ان کا حقیقی تعلق ہے یہاں اُن کی شعر و شاعری کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

آزاد کی شاعری آزاد فطری شاعر تھے۔ اور ازل سے شاعرانہ طبیعت لائے تھے۔ اُن کی نثر بھی اس قدر دلچسپ اور شاعرانہ تخیل رکھتی ہے کہ کسی طرح شعر سے کم نہیں ہے۔ ان کے والد چونکہ اُستاد ذوقؔ کے دوست تھے اور ان کی صحبت میں بیٹھتے اُٹھتے تھے لہٰذا آزاد بھی اوائل عمر میں اپنے والد کے ساتھ اُستاد کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوتے۔ انہیں کی معیّت میں دِلّی کے بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے جہاں مشہور اساتذۂ فن سے شناسائی کے علاوہ ان کے کلام کے حُسن و قبح سے بھی بخوبی واقف ہوتے جاتے تھے۔ اُستاد ذوقؔ سے نوجوان آزاد کو بڑی حُسنِ عقیدت تھی اور انہیں کے فیضِ صحبت اور حُسنِ تربیت کا یہ اثر ہوا کہ آزاد کے دِل میں جذبۂ شاعری پیدا ہو گیا۔ دِلّی کی آخری عظمت و شان کی یاد دلانے والی صحبتیں گرم تھیں کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا اور فلک تفرقہ پرداز نے اُن مجمعوں کو منتشر کر دیا۔ اب لوگ اِدھر اُدھر تلاشِ معاش میں سرگرداں ہو گئے۔ چونکہ لاہور دِلّی سے قریب تھا۔ اس وجہ سے دِلّی کے اکثر تباہ حال اشخاص وہاں چلے گئے ان ہی لوگوں میں محمد حسین آزاد، رائے بہادر منشی پیارے لال، پنڈت من پھول میر منشی،

مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ، مولوی کریم الدین، اور خواجہ الطاف حسین حالی تھے۔ جن کو تقدیر نے ایک جگہ جمع کر دیا تھا۔ حُسن اتفاق سے پنجاب میں اس وقت کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیمات تھے جو علاوہ زبان فارسی اور اُردو پر عبور رکھنے کے زبان اُردو کی توسیع و ترقی کا دِل سے خیال رکھتے تھے۔ انہیں کے ایما سے مولانا آزاد نے ایک ادبی انجمن "انجمن پنجاب" کے نام سے لاہور میں قائم کی جس کے جلسے اسی انجمن کے مکان پر ماہوار ہوا کرتے تھے۔ اس انجمن کے قیام کی خاص غرض یہ تھی کہ اُردو شاعری میں جو مبالغہ کے طوفان اور تشبیہ و استعارہ کے انبار ہیں وہ سب نکال دیے جائیں نیز یہ کہ مشاعروں میں جو طریقہ مصرعۂ طرح دینے کا مروّج ہے وہ موقوف کیا جائے اور بجائے اس کے کہ شعرا خاص خاص مضامین و عنوان پر طبع آزمائی کیا کریں۔ قبل اس کے کہ اس قسم کے مشاعرے شروع ہوں مولانا نے انجمن کے جلسوں میں اپنے فاضلانہ لیکچر اور دلچسپ نظموں سے پہلے لوگوں کو تیار و آمادہ کر دیا اور یہ دکھا دیا کہ یہ جدید رنگ عنقریب مقبول عام ہو جائے گا اور حقیقی شاعری کیا چیز ہے۔ اس کی ضروریات بتائیں اور وہ خرابیاں بھی دکھا دیں جو بالفعل پُرانے رنگ کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ مئی ۱۸۷۴ء میں جو ایڈریس انجمن کے افتتاح کے موقع پر انہوں نے پڑھا تھا اس میں اُردو شاعری کے عیوب، تکرار مضامین، غلو و مبالغہ، فضول تشبیہات و استعارات، اس کا تصنّع اور خلافِ فطرت رنگ۔ غرضکہ جو جو عیوب موجودہ شاعری میں پائے جاتے ہیں وہ سب بہ وضاحت بیان کر دیے اور صاف صاف کہہ دیا کہ اُردو شاعری کی بقا منظور ہے تو ہم کو چاہیے کہ عشق و عاشقی کے پُرانے ڈھکوسلے ترک کریں اور عروس شاعری کو تیرہ و تار حجروں سے نکال کر زمانۂ موجودہ کی روشنی میں لائیں۔ شاعروں سے کہا گیا کہ پُرانے مضامین ترک کرو، سادگی اظہار اصلیت اور درد و اثر بھاشا سے اور صاف بیانی فائدہ رسانی اور وسعت نظر مغربی شاعری سے سیکھو۔

تصانیف منظوم | آزاد نے جو کچھ زبان سے کہا اس پر خود عمل بھی کیا انہوں نے اسی نئے رنگ میں متعدد چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور نظمیں لکھیں۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اُستاد ذوق کی صحبت نے ان کے دل میں شاعری کا شوق اور جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اُستاد کی وفات کے بعد وہ حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگے اور اپنا کلام دِلّی کے مشاعروں میں سنانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا اس زمانہ کا کلام غدر کے ہنگامہ میں سب ضائع ہو گیا۔ غدر کے بعد اُن کو ریاست جنید میں ایک جگہ مل گئی تھی جہاں وہ مشق نظم کرتے اور سلام، رباعیاں، مرثیے، غزلیں، قصیدے وغیرہ سب کچھ کہتے رہے۔ اس زمانہ کا کچھ کلام ان کے بیٹے مولوی محمد ابراہیم نے ۱۸۹۹ء میں "نظم آزاد" کے نام سے شائع کیا ہے۔ لاہور میں ۱۸۷۴ء میں اس مشاعرے کی بنیاد پڑی تھی جس کا ذکر اوپر ہوا۔ اسی میں انہوں نے اپنی وہ دل چسپ نئے رنگ کی نظم پڑھی تھی۔ جو مثنوی شب قدر کے نام سے مشہور رہے اور جس میں رات کی آمد اور شام کی کیفیت کا ذکر ہے۔ پرانے خیال کے لوگوں نے اس جدّت کی بڑی مخالفت کی جس سے نئی اُمنگوں پر تو کوئی اثر نہ پڑا مگر اتنا ضرور ہوا۔ کہ مشاعرہ ایک سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا مشاعرہ کے بند جانے سے بھی مولانا اپنی کوششوں سے باز نہ آئے اور کچھ نہ کچھ اس رنگ میں کہتے رہے۔ کبھی کبھی وہ اُردو نظمیں انگریزی نظموں کے طرز پر کہتے تھے جن میں کسی انگریزی چیز کا ترجمہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ انگریزی خیالات کو زبان اُردو کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ مثلاً ان کی نظم اولوالعزمی کے لیے کوئی سدّ راہ نہیں، انگریزی شاعر ٹینی سن کی نظم "اکسلسیر" کے انداز پر ہے۔ مگر اس کا ترجمہ ہرگز نہیں ہے۔ اسی رنگ کی دوسری نظمیں حسب ذیل ہیں۔ مثنوی شرافت حقیقی معرفت الٰہی۔ سلام علیک جیسے چاہو سمجھ لو۔ جغرافیہ طبعی کی پہیلی۔ مبارک باد جشن جوبلی ایک تارے کا عاشق۔ محنت کرو۔ یہ سب نظمیں مجموعۂ نظم آزاد میں موجود ہیں۔

آزاد کا قدیم و جدید رنگ | قبل اس جدید رنگ اختیار کرنے کے آزاد اسی پرانے رنگ میں

طبع آزمائی کرتے تھے۔ چنانچہ مجموعۂ نظم آزاد کے آخر میں ان کے پرانے رنگ کی غزلیں اور قصائد موجود ہیں جن میں کچھ کچھ اشعار دل چسپ زوردار اور صوفیانہ رنگ کے بھی نکل آتے ہیں۔ اسی کو ان کے آیندہ رنگ کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیے۔ جدید طرز کی مثنویاں حسب ذیل ہیں :-

(۱) مثنوی شب قدر۔ یہ اُن کا شاہکار ہے۔ اور اس میں مختلف لوگوں کے اشغال شب کے وقت کے نہایت عمدگی اور رنگ آمیزی سے بیان کیے ہیں۔ طالب علم۔ مہاجن اور چور کی کیفیت علی الخصوص پڑھنے کے قابل ہے۔

طالب علم

ہیں مدرسے کے طالب علم اپنے حال میں ۔۔۔ کل صبح امتحان ہے سو اُس کے خیال میں
مل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دُور سے ۔۔۔ پڑھتے جُدا جُدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے
کرلیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے ۔۔۔ کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے
جی چھوٹ بیٹھے مرد یہ ہمت سے دُور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے پہ محنت ضرور ہے

مہاجن

اور وہ جو لکھ رہا ہے مہاجن جہان میں ۔۔۔ آدھی بجی ہے پر وہ ابھی ہے دُکان میں
گنتی میں دام دام کی سے دم دیے ہوئے ۔۔۔ بیٹھا ہے گود میں بہی کھاتا لیے ہوئے
ہے سارے لین دین کی میزان تمام کی
لیکن غضب ہے بدھ نہیں ملتی چھ دام کی

چور

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں / دزدِ سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکاں میں ہے / اور ہاتھ ڈالا اس کے ہر اک این وآں میں ہے
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر / ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر
لے جائے گا غرضکہ جو کچھ ہاتھ آئے گا
دیکھو کمایا کس نے ہے اور کون اُڑائے گا

شاعر

اس تیرہ شب میں شاعرِ روشن دماغ ہے / بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے / اُڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پر خیال کے
لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اُتار کر / جاتا زمیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر
پڑھتا ہے ذرّہ ذرہ پہ افسوں نئے نئے / ہو جاتے ہیں وہی دُرِ مضموں نئے نئے
مضمون تازہ گر کوئی اس آن مل گیا / یوں خوش ہے جیسے نقشِ سلیمان مل گیا
اس تیرہ شب کے پردہ میں شاعر جو چور ہے / پھرتا ٹٹولتا ہوا مانندِ کور ہے
مطلب اُڑاتا شعر سے مضمونِ غزل کے ہے / لاتا پھر ایسے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے
تعریفیں اس کی کرتے ہیں جو شعر سنتے ہیں
مضمون لیا ہے جن کا وہ بیٹھے دُھنتے ہیں

اپنے متعلق

عالم ہے اپنے بسترِ راحت پہ خواب میں / آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں

پھیلائے ہاتھ صورتِ اُمیدوار ہے اور کرتا صدق دل سے دعا بار بار ہے

مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض رکھتا نہیں زمانہ کے جنجال سے غرض

یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے

وہ بات دے زبان پہ کہ دِل میں اثر کرے

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں کرتا ہے اُس کو خرچ عدو کے علاج میں

کرجاتا صاف دُشمن بدبیں پہ چوٹ ہے اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے

کھوٹا اگر زباں کا ہے دل کا کھرا تو ہے

اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

(۲) مثنوی حُبِ وطن۔ اس میں انہوں نے ایک دوسرا رنگ اختیار کیا ہے اور اپنے مطالب کو بعض سچے اور بعض فرضی واقعات سے ثابت کیا ہے۔

(۳) مثنوی خوابِ امن۔ ایک نہایت زوردار مثنوی ہے جس میں یہ دکھلایا ہے کہ ہر قسم کی تمدّنی ترقیاں کسی ملک میں صرف امن ہی کی صورت میں ہوسکتی ہیں۔

(۴) مثنوی ابرِ کرم۔ اس میں ہندوستان کے موسم بہار یعنی برسات کا سماں دکھلایا ہے۔ یہ حالی کی برکھا رُت کے طرز پر ہے۔

(۵) صبح امید۔ اس میں نہایت مؤثر طریقہ سے دکھلایا ہے کہ مختلف کاروبار عالم مثلاً زراعت تجارت، ملک گیری، تعلیم وغیرہ میں اُمید ہی کام کرتی ہے اور کامیابی کا دارومدار اسی پر ہے۔

آزاد و حالی کا فرق آزاد مثل حالی کے شاعری کے دلدادہ نہ تھے۔ ان کا کلام بھی عیوب شاعری سے پاک صاف نہیں ہے۔ حالی سرسید مرحوم کی وجہ سے اور نیز اپنی مناسبت طبعی سے ایک قومی شاعر ہوئے اور تنزلِ اسلام کے راگ کو اکثر اپنے پرجوش کلام کی نَے میں الاپا۔ آزاد کو اس قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ ان کی افتادِ طبیعت

خواجہ الطاف حسین حالی

مولوی محمد اسمعیل میرٹھی

عالمانہ تھی اور وہ علاوہ کامل نثار و شاعر ہونے کے ایک مشہور ماہر تعلیم اور جدید نگار اور ناقد بھی تھے۔ انہوں نے ضروریات زمانہ کا لحاظ کر کے اپنے میلان طبیعت کو جو اُس زمانہ کا عام رنگ تھا۔ جدید رنگ تھا۔ جدید رنگ سے بدلا اور ایثار نفس سے کام لیکر اسی میدان شہادت علمی کا درجہ حاصل کیاہے۔ ان کے مختصر مجموعۂ نظم سے پایا جاتا ہے کہ وہ نظم سے نثر کو زیادہ ضروری اور متقدم سمجھتے اور اسی میں اپنے ملک اور اپنے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود دیکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے دلی جذبات اور قلبی واردات کا اظہار جس قدر کہ نثر میں ہوا وہ نظم میں نہ ہو سکا۔ ان کی نثریں گو نظم نہیں مگر حقیقی معنی میں بے تکلف اُن پر شعریت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی مولوی محمد اسماعیل صاحب ۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ میرٹھ وطن تھا۔ سولہ سال کی عمر میں سررشتہ تعلیم کی ملازمت اختیار کی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ترقی کر کے فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہوئے۔ پہلے سہارن پور میں پھر میرٹھ میں ایک عرصہ تک اسی عہدہ پر رہ کر ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل سکول آگرہ کو تبدیل ہو گئے جہاں بارہ برس تک قیام کر کے ۱۸۹۹ء میں پنشن لی۔ بعد پنشن اپنے وطن مالوف یعنی میرٹھ واپس آئے۔ اور یہیں قیام اختیار کر کے بقیہ عمر تالیف و تصنیف میں ختم کر دی۔ ان کی اعلیٰ قابلیت اور خدمات ادبی کے صلے میں خطاب خاں صاحب بھی سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ بالآخر یکم نومبر ۱۹۱۷ء میں اس دنیائے ناپائدار سے رحلت کی۔ آگرہ کے قیام میں مولوی صاحب موصوف نے اپنی وہ اُردو ریڈریں اور پرائمری تصنیف کیں جو گورنمنٹ کی منظوری سے ایک عرصہ دراز تک داخل کورس رہیں یہ درسی کتابیں نہایت سادہ بے تکلف اور دلکش طرز میں لکھی گئی ہیں جو بچّوں کی سمجھ میں بخوبی آسکتی ہیں۔ اور ان کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ اس معاملہ میں مولوی صاحب موصوف نے ممالک متحدہ کے واسطے وہی کیا جو مولانا محمد حسین آزاد

نے صوبہ پنجاب کے واسطے کیا تھا بلکہ ایک معنی میں ان سے بھی زیادہ خدمت انجام دی۔ یہ سب ریڈریں سلاست زبان اور عمدگی مضامین کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں، بلکہ سچ پوچھیے تو ان کا جواب سررشتہ تعلیم کی منظور شدہ کتابوں میں کسی صوبہ میں اب تک نہیں ہوا ہے۔

مولوی صاحب شاعر اور نثّار دونوں تھے۔ ان کا خاص رنگ ان دونوں صنفوں میں سادگی اور صفائی ہے جس کے وہ اُستاد کامل تھے۔ شاعری میں طرز جدید اور طرز قدیم دونوں پر انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور تمام اصناف سخن میں کچھ نہ کچھ کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے۔ چنانچہ عاشقانہ، سیاسی، اخلاقی، سوشل اور نیچرل غرضکہ ہر قسم کی نظمیں ان کی کہی ہوئی موجود ہیں اور حق یہ ہے کہ بے تکلفی اور سادگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ مولانا شبلی نعمانی کا قول تھا کہ حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔ مولوی صاحب موصوف کا کلیات سنہ ۱۹۱۰ء میں شایع ہوا تھا اور اس میں ان کی تمام قدیم وجدید ہر رنگ کی نظمیں ہیں۔ ان کے کلام میں تصوّف کا رنگ بھی کچھ پایا جاتا ہے اور طبّاعی اور قادر الکلامی ان کے لفظ لفظ سے ظاہر ہے۔ مولوی صاحب کو تصوّف کا بھی ذوق تھا اور حضرت غوث علی شاہ پانی پتی کے مریدان خاص میں تھے۔ ان کے جدید رنگ کی نظمیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں اور زمانۂ موجودہ کی نیچرل نظموں کی پیش رو ہیں۔ اُردو میں بلینک ورس یعنی بغیر قافیہ والی نظم یا نثر مرجّنہ میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی اور نہایت دل آویز طریقہ سے خیالات کو ادا کیا ہے۔ علاوہ غزلیات کے جس میں صوفیانہ اور اخلاقی مضامین ہیں۔ انہوں نے اکثر اخلاقی نظمیں قصّے کہانی کے طرز پر مثل الیناپس فیبلس کے لکھی ہیں جن سے عمدہ اخلاقی نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ قلعہ آگرہ کے متعلق بھی اُن کی ایک مشہور نظم ہے اس میں انہوں نے مسلمانوں کی ابتدائے ترقی کے دور نہایت موثر

طریقے سے دکھا کر موجودہ ترقی کے راستے بتائے ہیں۔ ان کا یہ بھی قصد تھا کہ لغات اُردو کی ترتیب اور قواعد اُردو کی تکمیل نئے طرز سے کریں۔ چنانچہ ان کے مسوّدات محفوظ ہیں۔ اور اُمید کی جاتی ہے کہ کسی نہ کسی وقت ضرور شایع ہوں گے آخر عمر میں وہ حضرت امیر خسرو کے کلام کی تنقید اور ان کی سوانح عمری مستند کتابوں اور تاریخوں کے حوالے سے مرتب کر رہے تھے اور قران السعدین کی تنقید مکمل ہو چکی تھی کہ موت نے اس کام کو روک دیا۔ اسی طرح یہ بھی سُنا جاتا ہے کہ ادب اُردو کی ایک تاریخ لکھنے کا بھی ارادہ تھا مگر وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔ مختصر یہ کہ مولوی صاحب زمانۂ حال کے شاعروں اور نقّادوں میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے اور طرز قدیم و جدید دونوں کا مجموعہ تھے۔

سُرور جہان آبادی منشی دُرگا سہائے سُرورؔ کو بھی اُردو شاعری کے طرز جدید کا ایک رکن رکین سمجھنا چاہیے۔ یہ ان لوگوں میں تھے جنھوں نے رنگ جدید کی طرف سب سے پہلے رہنمائی کی۔ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے رہنے والے تھے ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ اور کلام پُرانے اور نئے دونوں رنگوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ ان کا عمل "خذ ما صفا و دع ما کدر" پر تھا۔ یعنی پرانے اور نئے رنگوں میں جو جو باتیں عمدہ اور قابل قدر تھیں وہ لے لیں اور باقی کو چھوڑ دیا۔ مثلاً قدما کا دردو اثر اور بلند خیالی اور الفاظ کے ایجاز و اختصار کے ساتھ جدید رنگ کے تازہ مضامین اور حُب الوطنی کے جذبات نہایت خوبی کے ساتھ ملے جلے ہیں۔ اور زمانۂ حال کی معمولی بے لطف باتوں اور زمانہ گذشتہ کی غیر مہذب معاملہ بندی سے کلام پاک ہے۔ شُستگی الفاظ کے ساتھ بلند خیالی اور پاکیزگی ملی ہوئی ہے۔

سُرورؔ کو شعر و شاعری سے حد درجہ کا شوق تھا۔ بلکہ ان کی نسبت یہ کہنا بجا ہے۔ کہ اُن کو فنا فی الشعر کا درجہ حاصل تھا۔ ان کے تمام افعال و اقوال حرکات و سکنات شعریت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور ایک حقیقی شاعر کا پتہ دیتے تھے جیسا کہ اکثر شعرا کا حال تھا مگر سرور

بھی نہایت آزاد مزاج اور رند مشرب واقع ہوئے تھے۔ فکر فردا سے ہمیشہ آزاد رہتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ مصیبت و عُسرت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر یہ عُسرت و مصیبت ان کے شاعرانہ شوق اور جذبات کو کبھی دھیما نہ کر سکی۔ وہ مذہبی تقشف اور تعصب سے بالکل بیگانہ تھے۔ نہ ان کو نمائش اور ظاہرداری کا شوق تھا بلکہ ان کی زندگی بے پروائی اور سادگی کا ایک بہترین نمونہ تھی۔ ان میں دنیا کا مکر و فریب مطلق نہ تھا اور جو کچھ عیوب ان میں تھے وہ بھی ہنر معلوم ہوتے تھے۔ سب سے بڑا عیب ان میں مے نوشی کا تھا۔ مگر یہ بھی مرزا غالب کی طرح ان کی شاعری اور خیال آفرینی میں اکثر معین ہوتی تھی۔ گو کہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسی کم بخت عادت کی بدولت ان کی ہونہار اور قابل قدر زندگی کا بہت قبل از وقت خاتمہ ہو گیا۔ صرف بعمر ۳۷ سال ۱۹۱۰ء میں انہوں نے انتقال کیا۔

ان کی شاعری کے خصوصیات

(۱) سب سے بڑی خصوصیت اُن کی شاعری کی جذبات نگاری اور درد و اثر ہے۔ اس رنگ میں وہ اپنے زمانہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مثل اُستاد الشعراء میر تقی میر اور مُسرّ ور کے مزاج میں بھی حزن و یاس اور رنج و الم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے مثل میر کے ان کا کلام بھی جذبات نگاری کا ایک مرقع ہوتا تھا۔ ان کی اس قسم کی نظمیں حسب ذیل ہیں:-

دیوار کہن، حسرت شباب، اندوہ غربت، مرغان قفس، یاد طفلی، بلبل کا فسانہ، حسرت دیدار، ماتم آرزو وغیرہ۔

(۲) دوسری خصوصیت حب الوطنی ہے۔ اس میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ مگر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ وہ کسی خاص جماعت یا فرقہ کی جنبہ داری نہیں کرتے بلکہ ان کو ہندوستان کا قومی شاعر کہنا بالکل بجا ہے ان کے مخاطب صرف ان کے ہم مذہب نہیں بلکہ ہندوستان کی پوری پبلک ہے۔ اس قسم کی ان کی نظمیں یہ ہیں۔ خاکِ وطن،

حضرت سرور جہان آبادی

عروس حب وطن۔ حسرت وطن۔ یاد وطن۔ مادر ہند وغیرہ۔ یہ مادر ہند بابو بنکم چندر چٹرجی کی مشہور نظم بندے ماترم کے طرز پر لکھی ہے۔ ان تمام نظموں میں حب وطن کا سچا جوش اور اعلےٰ خیالات ہیں۔ ان کے سوا بعض عاشقانہ نظمیں بھی اسی طرز کی ہیں مثلاً فسانۂ گل و بلبل۔ شمع و پروانہ وغیرہ۔

(۳) اس کے بعد ان کی تاریخی اور مذہبی نظموں کا نمبر ہے۔ ان میں بھی صحیح جذبات، صداقت، فصاحت، بے تکلفی اور روانی بدرجۂ کمال پائی جاتی ہیں۔ پدمنی، پدمنی کی چتا۔ سیتاجی کی گریہ و زاری۔ مہاراجہ دسرتھ کی بے قراری۔ جمنا، گنگا پر یاگ کا سنگم۔ ستی نور جہاں کا مزار۔ حسرت دیدار اور نل دمنتی۔ اس قسم کی نظمیں ہیں جو سب اعلےٰ خیالات اور درد و اثر سے مملو ہیں۔ ان سب میں "گنگا" اور جمنا خاص طور پر تعریف کے قابل ہیں جو محاسن شعری کے علاوہ جذبات اور اثر سے لبریز ہیں۔ یہ فی الحقیقت نہایت اعلےٰ درجہ کی نظمیں ہیں۔ "جمنا" میں علی الخصوص ہندوؤں کے قدیم تاریخی حوالے بہت دلچسپ ہیں۔

(۴) سرورؔ کی چوتھی خصوصیت جو ان کو ان کے ہمعصروں سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ یہ ہے کہ انہوں نے اُردو اشعار میں ہندی الفاظ کو کھپایا اور اس طرح کھپایا کہ اس سے شعر کے محاسن میں اضافہ ہو گیا۔ علی الخصوص مذہبی نظموں میں انہوں نے پُرانے ٹھیٹ ہندی اور بھاشہ کے لفظ بہت اُستادی سے صرف کیے ہیں جن سے کلام کا لُطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رامائن اور دیگر مذہب ہنود کی کتابوں کے بعض سین نہایت پُر زور لکھے ہیں۔ ان کی تمام اس قسم کی نظمیں اہل ہنود نہایت ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

انگریزی نظموں کے ترجمے سرورؔ کو زبان انگریزی کا بہت محدود علم تھا۔ مگر چونکہ طبیعت نہایت رسا اور شاعرانہ پائی تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے جو ترجمے انگریزی نظموں کے

کیے ہیں وہ ہر چند کہ لفظی نہیں مگر پھر بھی اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی چیزیں بہت ہیں۔ تقریباً بیس سے کم نہ ہوں گی۔ بعض میں اُنھوں نے صرف کسی انگریزی نظم کا نام لے لیا ہے اور اس پر بالکل ہندوستانی طریقہ سے طبع آزمائی کی ہے۔ مُرغابی۔ ترانۂ خواب۔ بچہ اور ہلال۔ کارزارِ ہستی۔ اُمید و طفلی۔ موسم سرما کا آخری گلاب۔ یہ سب اسی قسم کی نظمیں ہیں اور اپنے طریقہ میں بہت عمدہ اور دل کش ہیں۔ ایسی ہی نیچرل نظموں میں اُن کی "بیر بہوٹی" اور "کوئل" کو بھی سمجھنا چاہیے۔

سرورؔ نے بعض اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مگر یہ خیال رکھا ہے کہ شعر کی خوبی اور دلکشی وعظ و نصیحت کی رُوکھی پھیکی باتوں سے کم نہ ہونے پائے۔ وہ شاعری کو وعظ پر مقدم جانتے تھے۔ زن خوش خُو۔ بے ثباتی دنیا ادائے شرم۔ اسی قسم کی نظمیں ہیں جن میں اعلیٰ خیالات نہایت حسین پیرایہ میں ظاہر کیے گئے ہیں۔

سُرورؔ کو شعر گوئی میں کمال حاصل تھا وہ ہمیشہ شاعرانہ خیالات میں غرق رہتے تھے اور نہایت زود گو اور بے تکلف کہنے والے تھے۔ ہر چند کہ انھوں نے مثنوی۔ غزل۔ رُباعی۔ قطعہ۔ قصیدہ۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند۔ غرض کہ سب اصنافِ سخن میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ مگر مسدس اُن کو بہت محبوب تھا اور اس میں وہ بہت زورِ طبیعت دکھاتے تھے۔

مختصراً اُن کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جذبات نگاری۔ درد و اثر۔ اعلےٰ تخیل۔ نہایت پیاری اور میٹھی زبان۔ قلبی کیفیات کا من و عن اظہار۔ تنوع خیالات اور ان کا اظہار نہایت شاعرانہ اور لطیف طریقہ سے خوب صورت الفاظ میں اور وسیع النظری۔ ان کا کلام دو مجموعوں میں شایع ہوا ہے ایک وہ، جو زمانہ پریس کانپور سے ان نظموں کا نکلا جو بہ اوقات مختلف رسالہ زمانہ میں "خمخانۂ سرورؔ" کے نام سے چھپیں۔ دوسرا "جامِ سرورؔ" کے نام سے انڈین پریس الہ آباد سے

شایع ہوا ہے۔ ان کا اکثر کلام ضایع ہو گیا۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر قابلِ افسوس یہ بات ہے کہ اکثر لوگوں نے ان کا کلام ہتھیا لیا۔ کبھی معاوضہ کے ساتھ اور کبھی معاوضہ بھی ہضم کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد جو خطوط شائع ہوئے ان سے صاف طور سے یہ ثابت ہے کہ کسی صاحب نے اُن سے مختلف مضامین پر کچھ نظمیں لکھوائی تھیں اور ان کو اپنے نام سے شایع کرا دیا تھا۔ اس سے یہ حقیقت کھُل گئی کہ بعض حضرات جو خود تو شاعری سے بہرہ نہیں رکھتے مگر شعراء کی صف اوّل میں اپنا نام شمار کرانا چاہتے۔ دوسروں سے کچھ دے لے کے کہلوا لیتے ہیں اور پھر اس کلام کو اپنے اسم گرامی کے ساتھ بے تکلف شایع کر دیتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی اکبر اپنے زمانہ کی ایک بہت بڑی ہستی تھے۔ اُنہوں نے ایک نئے طرز کی بنا ڈالی جس کے وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے۔ اور اس طرز خاص میں ان کی نقل بالکل محال ہے۔ ان کا کلام ممتنع التقلید اور ناقابلِ رسائی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ایک بے مثل شاعر ہونے کے علاوہ ناصح قوم اور بلند پایہ صوفی صافی بھی تھے۔ نثر کے خطوط بھی نہایت دل چسپ لکھتے تھے۔ اور ان سب کے ادب سوسائٹی، اور حکومت کے زبردست نقاد اور ماہر سیاسیات تھے۔ پھر مذاق و ظرافت میں تو یکتائے روزگار تھے۔

سید اکبر حسین رضوی نام۔ ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء تاریخ ولادت ہے۔ ان کے والدین مرفہ الحال نہ تھے۔ ابتدائی تعلیم مدارس بعد سرکاری اسکولوں میں پائی۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۹ء میں ہائی کورٹ کی مثل خوانی کی جگہ ملی۔ ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے ۱۸۸۰ء تک وکالت کی پھر ملازمت سرکاری کی طرف میلان طبع ہوا اور منصف مقرر ہو گئے۔ ۱۸۸۸ء میں سبارڈنیٹ جج اور ۱۸۹۴ء میں عدالت خفیہ کے جج ہوئے۔ اس کے بعد

خان بہادر کا خطاب گورنمنٹ سے حاصل کر کے ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا اور دنیائے ادب کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔

اخلاق و عادات

طبعاً نہایت خلیق اور منکسر المزاج تھے۔ مذاق اور ظرافت ان میں کُوٹ کُوٹ کر بھرا تھا۔ سوسائٹی کے روح رواں سمجھے جاتے تھے۔ احباب کو جو اُن سے ملنے آتے تھے اپنی بذلہ سنجی اور ظرافت طبعی سے بہت مسرور کرتے۔ خلق و مدارات تہذیب، صداقت، ہمدردی اور مہماں نوازی ان کے خاص جوہر تھے۔ بعض باتیں جو اُن کے کلام میں "پالیسی" یعنی مصلحت اندیشی اور زمانہ سازی پر محمول کی جاسکتی ہیں وہ اُن کے اُن خطوط میں جو خواجہ حسن نظامی، عزیز لکھنوی، منشی دیا نرائن نگم وغیرہ کے نام ہیں۔ ان کی راست بازی اور صداقت شعاری پر دلالت کرتی ہیں انہوں نے بعض ایسی چیزیں بھی کہی ہیں جن کی اُن سے توقع نہیں ہو سکتی تھی مگر وہ صرف اس لیے کہ وہ خود کو اور دوسروں کو پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ مذہباً وہ سُنّی تھے مگر شیعوں سے کوئی مخالفت اور تعصّب نہیں رکھتے تھے۔ اسی طرح عقائد میں ہر چند کہ وہ ایک پکے مسلمان تھے مگر مذہبی نارواداری اور عصبیت سے کوسوں دُور تھے۔ آخر عمر میں عوارض اور مصائب سے دل شکستہ ہو گئے تھے اپنی اہلیہ اور محبوب بیٹے ہاشم کے انتقال سے ان پر بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ آخر الذکر کی وفات پر ایک درد ناک قطعہ کہا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

وہ چمن ہی مٹ گیا جس میں کہ آئی تھی بہار | اب تجھے پاکر میں اے بادِ بہاری کیا کروں
بزمِ عشرت میں بٹھاتا تھا جسے وہ اُٹھ گیا | اب میں اے فردا تری امیدواری کیا کروں

اکبر کی شاعری

اکبر فطری شاعر تھے۔ بچپنے سے ان کو شعر کا شوق تھا چنانچہ اُن کا ابتدائے عُمر کا کلام ان کی کلیات میں موجود ہے۔ شروع میں اپنا کلام غلام حسین وحید کو دکھاتے

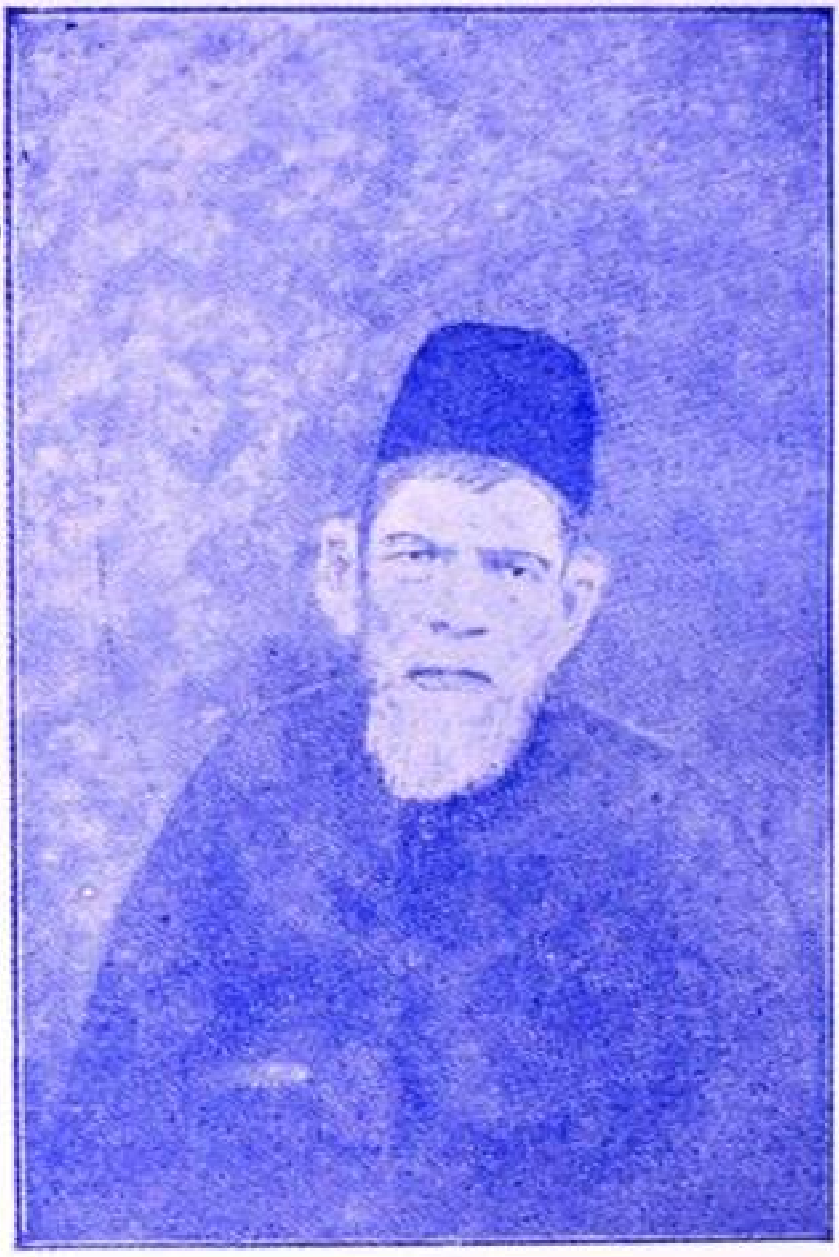

اکبرالہ آبادی

شاد عظیم آبادی

تھے جو آتش کے شاگرد تھے۔ اسی زمانہ میں فارسی اور عربی کی درسیات سے فراغت حاصل کی اور یہ معلومات اُن کو آخر عمر میں بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ملازمت کے زمانہ میں انہوں نے انگریزی پڑھی۔ اور اس میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی۔ اکبر کا دورِ شاعری ایک بسیط دور ہے جس کو انہوں نے خود پانچ حصوں پر تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور ابتدا سے ۱۸۶۶ء تک

پہلا دور ابتدائے مشق سے ۱۸۶۶ء تک کا ہے۔ اس زمانہ کا کلام پرانے رنگ کا ہے جو اُس زمانہ کا رنگ تھا۔ یہ زمانہ اُن کی نومشقی کا سمجھنا چاہیے۔ اس میں انہوں نے لکھنؤ اور دلی کے مستند اساتذہ کی تقلید اور ان کے رنگ میں غزلیں کہیں اور مشاعروں میں پڑھیں۔ اُن غزلوں کا وہی رنگ ہے جو قدیم میں برتا جاتا تھا۔ مضامین بھی وہی مقررہ تھے، جن پر برابر طبع آزمائی کی جاتی تھی۔ اگرچہ ان میں کہیں کہیں جذباتِ عشقیہ بھی ہیں۔ مگر صفائی، سادگی، حُسنِ بندش، روانی وغیرہ بدرجۂ احسن پائی جاتی ہیں۔ اس وقت کے کلام سے آئندہ کی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ اس میں کچھ تصنّع بھی شامل ہے۔

دُوسرا دور ۱۸۶۶ء سے ۱۸۸۴ عیسوی تک

اس عہد میں صداقت اور جذبات کلام میں زیادہ ہیں۔ اصلیت بھی صاف طور پر نمایاں ہے۔ مشاقی کی جلا کلام کا جوہر ہے اور قادر الکلامی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مروّجہ اور معیّنہ مضامین کم ہوتے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں اُن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ تصنّع، بے تکلفی اور اصلیت سے بدل گیا ہے۔ ذاتی رنگ محدود و معیّنہ پر غالب آرہا ہے۔ اشعار نے حشو و زوائد سے پاک ہو کر اپنی کینچلی بدل دی ہے۔ مگر غزلیں اس میں بھی دل پر چڑھی ہوئی ہیں۔ بہر طور اشعار کے زور و اثر، بندش اور طرزِ ادا میں بیّن فرق معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا دور ۱۸۸۲ء سے ۱۹۰۹ء تک

یہ زمانہ بہت بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس میں شاعر کو اپنے کلام پر پوری طرح قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ وہ راستہ کو ٹٹولتے نہیں اور نہ کہیں ٹھٹکتے ہیں، بلکہ ہمت اور اعتبار کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اب ان کے کلام میں پورا اُستادانہ رنگ آ گیا اور تجربہ اور نو مشقی کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ اب کلام میں نو کاری کی جھجک اور تردد نہیں باقی رہا۔ غزلیں اس دور میں بھی عنصر غالب ہیں۔ مذاق و ظرافت کا غلبہ ہے۔ جس میں ابھی وہ بات نہیں جو کہ بعد کو حاصل ہوئی۔ طنز سے بھی کلام آشنا ہوتا جاتا ہے۔ غزلوں کا رنگ اب پُرانے رنگ سے علیحدہ ہو کر اُن میں ایک اخلاقی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ جدّت ادا اور ظرافت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ رُوحانیت اور تصوّف بھی جلوہ گر ہے۔ غزلوں کا رنگ باعتبار مضامین اور طرز ادا کے تو بہت کچھ ترقی کر گیا ہے۔ مگر بھی خارجی رنگ زیادہ ہے۔ اس زمانہ کا کلام ان کے کلیات اوّل و دوم میں داخل ہے۔

چوتھا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک

یہ دور بہت بڑی ترقی کا حامل ہے۔ اس میں اور دورِ ماسبق کی نوعیت میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اسی کا متمم ہے۔ اس دور میں اکبر فی الواقع "لسان العصر" ہو گئے ہیں اس میں قدیم رنگ کی غزل گوئی گھٹتی جاتی اور حقائق و فلسفہ بڑھتا جاتا ہے۔ مذاق و ظرافت بدستور ہے بلکہ اور تیز ہو گئی ہے اور اسی رنگ میں واقعات حاضرہ اور مغربی تہذیب پر نہایت زبردست نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ اب ظرافت و شوخی بے لگام ہو گئی ہے۔ اخلاقی، روحانی، فلسفیانہ اور سیاسی رنگ کا کلام میں زور ہے مگر ساتھ ہی عاشقانہ رنگ بھی موجود ہے حُسن و عشق کی زیرلبی گفتگو خاموش نہیں ہوتی۔ مگر اب سیاسیات کا غل غپاڑے میں مدھم پڑ گئی ہے۔ اکبر اب اپنی صنعت

کے صنائع کامل ہو گئے ہیں اور کلام میں پختہ کاری آگئی ہے۔ خیالات میں تموج ہے قوت ابداع و ایجاد فن عروج کے قواعد اور مشکلات سے دبتی نہیں۔ اظہار خیال کے نئے نئے طریقے اور راستے ذہن میں آتے ہیں۔ اور ان کے واسطے نئے نئے دلچسپ قافیوں اور جدید استعاروں اور تشبیہوں سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ تصوف اور رُوحانیت بھی جلوہ گر ہے۔

پانچواں دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۱ء تک

اس زمانہ کا کچھ کلام کلیات سوم میں شایع ہو گیا ہے۔ اس دور میں عاشقانہ رنگ گھٹ کر بہت قدر قلیل رہ گیا ہے اور اب اشعار بالکل سیاسی، اخلاقی، روحانی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ یا پھر وہی ظرافت جلوہ فرما ہے۔ اس دور کو ان کی شاعری کی معراج سمجھنا چاہیے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے کلام میں وہ جوش و خروش اور بانکپن نہیں جو زمانہ شباب کے کلام میں ہے اور یہ سچ بھی ہے۔ اس لیے کہ طویل عمر نے ان کو زمانہ کے نشیب و فراز اور حقائق سے آگاہ کر دیا ہے۔ اب زندگی ان کی نظر میں ایک عمیق معنی رکھتی ہے اور دنیا کی بے ثباتی پر ان کی نظر زیادہ جاتی ہے۔ اب چونکہ تجربہ وسیع ہو گیا ہے لہذا اکثر اشعار اس قابل ہیں کہ آدمی اُن کو دستور العمل بنائے۔ اس زمانہ کا ان کا کلام بہت ہے۔ اس قدر کہ دو کلیات مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ سُنا ہے کہ بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن کو وہ صیغہ راز میں رکھنا چاہتے تھے یعنی جن کی اشاعت ان کو منظور نہ تھی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ انہوں نے اپنے مرنے سے پہلے ایک کتاب مسمیٰ بہ "گاندھی نامہ" رکھی جس کو نان کوآپریشن کی ایک تاریخ سمجھنا چاہیے مگر اس کتاب کو انہوں مصلحتہً نہیں شایع کیا۔

اُن کا مطبوعہ کلام تین کلیات میں شامل ہے جن میں سے دو ان کی زندگی میں طبع ہوئے تھے اور تیسرا ان کے صاحبزادے نے ان کے انتقال کے بعد شایع

ہونے کو باقی ہے۔ اکبر نثر کے خطوط بھی بہت خوب لکھتے تھے۔ ان کے مکتوب الیہ کثیر التعداد تھے جن سے اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ جو خطوط کہ انہوں نے خواجہ حسن نظامی۔ منشی دیا نرائن نگم احسن مارہروی۔ مرزا محمد ہادی عزیز اور مولوی عبد الماجد بی۔ اے دریا آبادی کے نام لکھے ہیں وہ چھپ گئے ہیں۔ اُن سے اُن کے اصلی مزاج کا رنگ اور بعض رنج کے واقعات بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں اور ایک عمدہ سوانح عمری تیار ہو سکتی ہے۔ یہ خطوط نہایت دلچسپ اور لطیف مقولوں کی شان رکھتے ہیں مگر پھر بھی مرزا غالب کے خطوط کی بات ان میں کہاں۔ اکبر کوئی بڑے نثار نہ تھے لہذا ان کی کوئی نثر کی چیز سوائے ان خطوط اور اودھ پنچ کے مضامین کے جو پڑھنے کے قابل ہیں موجود نہیں ہے اودھ پنچ ہی سے انہوں نے غالباً ظریفانہ رنگ اخذ کیا ہوگا۔

اکبر کی غزلیات چُستی بندش، روزمرہ، سلاست، روانی، بے تکلفی، اعلےٰ تخیل اور عمدہ تشبیہیں اکبر کی غزلوں کی جان ہیں۔ اُن کے اشعار دنیا کی بے ثباتی، دنیاوی جاہ و ثروت کی بے حقیقتی اور دنیاوی مسرتوں کی ناپائداری کے مضامین سے مملو ہیں اور درد و اثر اور حزن و یاس کے مضامین بھی بکثرت اُن میں موجود ہیں مگر اکبر کی شہرت زیادہ ان کی غزلوں پر مبنی نہیں۔ کیونکہ ان سے ان کی مجموعی قابلیتوں کا صرف ایک رُخ نظر آتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند منتخب اشعار ان کی غزلوں کے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

رنگِ قدیم

یہاں نشاطوں کے سوا کوئی نہ دیکھے سوے دوست
چال ہے تیغ قضا کی جنبش ابروے دوست

رقص کرتی ہے نسیم صبح کیوں مستانہ وار
گلشن دل سے اُڑا لائی مگر شاہد بوے دوست

مولانا حسرت موہانی

مرزا جعفر علی خان اثر لکھنوی

کیسے کیسے گل کھلے ہیں نقشِ پائے یار سے
غیرتِ داماں گلچیں ہو رہا ہے کوئے دوست

میں وہ آئینہ ہوں اس حیرت سرائے دہر میں
جس میں جوہر کے عوض رہتا ہے عکسِ روئے دوست

لکھا ہوا ہے جو رونا مرے مقدر میں
خیال تک نہیں جاتا کبھی ہنسی کی طرف

نگاہ پڑتی ہے ان پہ تمام محفل کی
وہ آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف

یہی نظر ہے جو اب قاتلِ زمانہ ہوئی
یہی نظر ہے کہ اٹھتی نہ تھی کسی کی طرف

ہزار جلوۂ حسنِ بتاں ہو اے اکبر
تم اپنا دھیان لگائے رہو اسی کی طرف

کوئی پہنچا نہیں اے یار تیرے قدِ رعنا تک
ہماری فکرِ عالی سرو سے ہو آئی طوبیٰ تک

زمیں پر شمع روشن ہے فلک پر ماہ تاباں ہے
تمہارے نور سے ہیں فیضیاب ادنیٰ سے اعلیٰ تک

جو اس نے ناز سے پوچھا کہ تیری آرزو کیا ہے
خوشی سے یہ ہوئے بے خود کہ ہم بھولے تمنا تک

کہیں دل ہوں کہیں میں باعثِ بیتابیٔ دل ہوں
کہیں اندازِ بسمل ہوں کہیں میں نازِ قاتل ہوں

کہیں جلوہ ہوں صورت کا کہیں ہوں شاہدِ معنی
کہیں ہوں محملِ لیلیٰ کہیں لیلائے محمل ہوں

کہیں عاشق کا مطلب ہوں کہیں معشوق کی خواہش
کہیں مجبورِ مطلق ہوں کہیں مختارِ کامل ہوں

کہیں تصویرِ حیرت ہوں کہیں محوِ پریشانی
کہیں ہوں شیفتہ رخ کا کہیں زلفوں کا مائل ہوں

کہیں ہوں ولولہ دل کا کہیں ہوں ضبط عاقل کا
روانی ہیں کہیں دریا کہیں رکنے میں ساحل ہوں

رنگِ متوسط

دنیا کا دیدنی وہ تماشا نکل گیا
اب گرد رہ گئی ہے وہ میلا نکل گیا

ہر ارادے میں نظر آتی ہے اک صورتِ یاس
شغل اب کچھ بھی نہیں فسخِ عزیمت کے سوا

مطمئن ہو کے لگاتا ہوں لحد میں بستر
اب اٹھاتا ہے مجھے کون قیامت کے سوا

پیغام آ رہا ہے دلِ بے قرار کا
قائم ہے سلسلہ مرے اشکوں کے تار کا

شائق ہوا ہے بوسۂ دامانِ یار کا / اللہ رے حوصلہ مرے مُشتِ غبار کا

باغِ جہاں میں کوئی روش بے خلش نہیں / دوڑاؤں گُل پہ ہاتھ تو کھٹکا ہے خار کا

شمس و قمر کو دیکھتے ہیں تجھ کو بھول کر / کیا شعبدہ ہے گردشِ لیل و نہار کا

اب تو ہے عشقِ بتاں میں زندگانی کا مزا / جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جائے گا

ہے سبب جوشِ جنوں کا رنجِ ہجراں اے حضور / آپ تو تشریف لائیں ہوش بھی آ جائے گا

عشقِ بُت میں کُفر کا مجھ کو ادب کرنا پڑا / جو برہمن نے کہا آخر وہ سب کرنا پڑا

تجربہ نے حُبِّ دنیا سے سکھایا احتراز / پہلے کہتے تھے فقط مُنہ سے اور اب کرنا پڑا

عالمِ ہستی کو تھا مدِّ نظر کتمانِ راز / ایک شے کو دوسری شے کا سبب کرنا پڑا

شعر غیروں کے اُسے مطلق نہیں آئے پسند
حضرتِ اکبرؔ کو بالآخر طلب کرنا پڑا

رنگِ آخر

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا / شدّتِ یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا

اس کی پروا نہ رہی خوش رہے دنیا مجھ سے / عاقلوں میں مری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا

حیرت افزا ہے مرا حال مگر کون سُنے / دیدنی بھی ہے مگر دیکھنے والا نہ رہا

دیکھنے کی تو ہے یہ بات رہا کیا اس میں
آپ اکبرؔ سے عبث پوچھتے ہیں کیا نہ رہا

بے تعلق منزلِ ہستی سے گزرا دل مرا / اس کی نظروں میں سزاوارِ تمنا کچھ نہ تھا

نہیں ہے کام زبان کا کچھ اب دُعا کے سوا / نظر کسی پہ نہیں ہے مری خدا کے سوا

کروں کیا غم کہ دنیا سے ملا کیا / کسی کو کیا ملا دُنیا میں تھا کیا

یہ دونوں مسئلے ہیں سخت مشکل — نہ پوچھو تم کہ میں کیا اور خدا کیا
وہاں قالو‌ا بلیٰ یاں بُت پرستی — ذرا سوچو کہا کیا تھا کیا کیا
الٰہی اکبر بے کس کی ہو خیر — یہ چرچے ہو رہے ہیں جا بجا کیا
میرے دل سے انلیا نزدی و فردا اُٹھ گیا — حشر بھی ماضی نظر آیا جو پردا اُٹھ گیا

جہانِ فانی کی حالتوں پر بہت توجہ عبث ہے اکبر
جو ہو چکا ہے وہ پھر نہ ہوگا جو ہو رہا ہے وہ ہو چکے گا

ترک دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا — غور جب ہم نے کیا سانس کو دنیا پایا
نبی کو سمجھا نہیں ہوں اب تک اگرچہ وہ اصل مدعا ہے
خدا کو البتہ جانتا ہوں خدا ہی ہے جو ہو رہا ہے
جدائی نے میں بنایا مجھ کو جدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا
خدا کی ہستی ہے مجھ سے ثابت خدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا
دوں گا ذرا سمجھ کے جواب ان کی بات کا — رُخ دیکھتا ہوں سلسلۂ واقعات کا

دہر میں سوختۂ گرمیِ بازار نہ ہو — دل میں ہو خون تو سودا کا خریدار نہ ہو
نقش دل ہو صفتِ معنیِ رنگین اے دوست — رنگ ظاہر پہ نہ جا نقش بہ دیوار نہ ہو
سانس کی طرح چلے منزل ہستی میں بشر — مدعا یہ ہے کہ دم بھر کو بھی بیکار نہ ہو
نہیں آزاد جو اپنوں سے تعلق کرے قطع — وہ ہے آزاد جو غیر دل کا گرفتار نہ ہو
بزم ہے شعلہ مزاجوں کی سنبھل اے اکبر — برق خرمن کہیں یہ گرمی گفتار نہ ہو

جنونِ عشق سے انسان کی طینت سنورتی ہے — یہی مستی وہ ہے جو عقل کو ہشیار کرتی ہے
یہ سچ ہے بے خبر ہے نصف دنیا نصف دنیا سے[1] — گر یہ عالم میں ہے مصروف اور وہ چین کرتی ہے

[1] مقابلہ کرو آدم اسمتھ کے اس مقولہ سے کہ " مفلسی ایک راز ہے جو نصف دنیا نصف دنیا سے چھپاتی ہے "۔ ۱۲

وہ ایذائیں مجھے مایوسیوں نے دی ہیں اے اکبر
کہ اُمید اب قائم رکھتے ہوئے بھی دل میں ڈرتی ہے

اکبر کی خوش طبعی اور ظرافت اکبر کی خاص شہرت ان کی ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیف طربیات پر مبنی ہے جو اُن کی زرّیں نظموں میں آب دار موتیوں کی طرح چمک رہی ہیں۔ اُن کا ابتدائی ظریفانہ رنگ اودھ پنچ کی نامہ نگاری سے شروع ہوا مگر وہ بہت جلد اس سے گزر کر ترقی کے مدارج اعلےٰ تک پہنچ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اوائل عمر ہی میں ان کو اس رنگ سے خاص لگاؤ تھا کیونکہ اس زمانہ کے کلام میں بھی متین اشعار کے ساتھ کہیں کہیں مذاقیہ اور ظریفانہ اشعار کہے جاتے ہیں۔ اُس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور سوسائٹی کا رنگ بدلتا گیا۔ ان کے اس رنگ میں ترقی ہوتی گئی اور پختہ کاری آتی گئی۔ اس رنگ نے ان کی تنوع طبیعت کے واسطے نئے نئے راستے کھول دیے اور انھوں نے اس سے نہایت مفید خاص خاص کام لینا شروع کیے اس رنگ میں حقیقتاً وہ بے مثال رہے اور ہر چند کہ بہت سے لوگوں نے ان کی نقل کرنا چاہی مگر صحیح معنوں میں کوئی ناقل نہ ہوا سب نقال رہے۔ وہ حقیقی ظرافت اور شاعرانہ دل و دماغ کا مجموعہ تھے۔ ان کا تیسرے دور کا کلام خاص کر اس رنگ میں بہت کامیاب ہے۔ اس میں ان کی ظرافت محض ظرافت ہے آخر عمر میں البتہ اس طرز و روش میں فرق آگیا ہے اور وہ ظرافت کے پردے میں اور بہت سے مفید مضامین ادا کر جاتے ہیں۔ اس وقت اگرچہ وہ نحیف و زار ہو گئے تھے۔ مگر شاعرانہ دل و دماغ برابر اپنا کام کرتا تھا۔ اس زمانہ میں وہ ظرافت اور بذلہ سنجی کو۔ اخلاقی، سیاسی، روحانی مسائل کے ادائے مطالب کا ایک مؤثر ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ مقصود بالذات صرف ظرافت نہ تھی بلکہ تعلیم حقائق مقصود اصلی تھی۔

اکبر کی ظرافت کے اجزا حسب ذیل ہیں۔

(۱) جدید اور لطیف تشبیہیں اور تمثیلیں جو عام مشاہدے کی چیزوں میں برتی جاتی ہیں۔ ان میں وہ تصنّع اور نازک خیالی سے کام نہیں لیتے بلکہ انہیں چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جن کو ہر شخص دیکھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ انہیں کے بیان میں ایک خاص جدّت اور لطف پیدا کر دیتے ہیں جس سے دل مزے لیتا ہے۔

(۲) نئے نئے بامذاق الفاظ مختلف زبانوں کے آخر شعر میں بطریق قافیہ استعمال کرتے ہیں۔

(۳) معمولی الفاظ ایسے انوکھے طریقے سے استعمال کرتے ہیں جو اس سے قبل کبھی نہیں سُنے گئے تھے۔

(۴) ایسے معمولی اور مُبک الفاظ جن کو شعرار عام طور پر استعمال نہیں کرتے وہ شعر میں نہایت جدّت طرازی اور شوخی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ کی اتنی کثرت ہے کہ اُن کی ایک مختصر فرہنگ تیار ہو سکتی ہے۔ مثلاً کلّو۔ فتّو۔ بُدھو۔ جُمّن وغیرہ کہ یہ ان کے خاص اصطلاحات ہیں اور وہ اُن کو خاص خاص معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ معمولی معمولی الفاظ۔ مثلاً گٹ پٹ خالتو۔ یا اکثر بازاری محاورے جو شعر میں نہیں کھپ سکتے اور عام طور پر کانوں کو بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کے کلام میں وہ نہایت عمدگی سے استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح ایسے بھی الفاظ ہیں کہ جو دیگر شعرار کے یہاں اور معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ مگر اکبر ان کو بالکل دوسرے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ بعض ایسے انگریزی الفاظ بھی لکھ جاتے ہیں۔ جو اردو میں ہنوز مروّج نہیں ہوئے اور کلام میں ثقیل اور بے میل معلوم ہوتے ہیں۔ اس تراش خراش میں انہوں نے محض اپنی طباعی اور ذہانت سے کام لیا ہے۔ کوئی رنگینیٔ عبارت یا عمقِ معنی پیدا کرنا مقصود نہیں ہے

بلکہ صرف ہنستا ہنسانا مقصود ہے۔

اکبرؔ کی ظرافت کو محض بذلہ سنجی اور تمسخر نہ سمجھنا چاہیے۔ اس کی تہ میں نہایت لطیف اور عمیق معنی ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی حقیقت خواہ وہ اخلاقی ہو یا تعلیمی سیاسی ہو یا معاشرتی ادب آموز ہو یا روحانی ہمیشہ اس میں پنہاں ہوتی ہے ان کے الفاظ اور معانی میں ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے پند و نصائح کبھی تلخ نہیں معلوم ہوتے اور نہ ان کا مذاق عامیانہ اور سوقیانہ ہوتا ہے۔ ان کی ظرافت بہت جامع اور وسیع ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی مخصوص شخص یا جماعت کا خاکہ نہیں اُڑاتے بلکہ ان کی ظرافت کے تیر بلا لحاظ مراتب سب طرف چلتے ہیں۔ البتہ واقعات و سیاسیات حاضرہ ان کی خاص دلچسپی کی چیز ہے۔ مغربی طرز تعلیم اور ہندوستان میں انگریزی تہذیب کی دلدادگی پر انھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کی خرابیوں اور تعلیمی اور مذہبی نقائص کو بھی نشانۂ ظرافت بنایا ہے۔ امیر و غریب۔ عالم و جاہل۔ ہندو مسلمان، سُنّی، شیعہ، سب کی بلا امتیاز و تفریق خبر لی گئی ہے۔ ان کے کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ سیاسیات سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ اس قسم کے بعض اشعار بادی النظر میں تو معمولی معلوم ہوتے ہیں مگر نظرِ غور سے دیکھا جائے تو اُن میں تیر و نشتر بھرے ہیں۔

اکبرؔ کی خاص اصطلاحات یہ ہیں:۔ مس۔ شیخ۔ سیّد۔ اونٹ۔ گائے۔ کلیسا۔ مسجد۔ مندر۔ بُت۔ کالج۔ برہمن۔ لالہ اور اسی قسم کے دیگر الفاظ جو ایک خاص معنی رکھتے ہیں۔ مس سے مغربی تعلیم کی نظر فریبی اور دلکشی۔ شیخ سے پرانے رنگ کے مسلمان جو اپنے مذہب کی باتوں سے واقف ہیں مگر انگریزی تہذیب سے بالکل ناآشنا ہیں۔ سیّد سے سرسیّد مرحوم جو انگریزی تعلیم و تہذیب کے دلدادہ تھے۔ یا اُن کے متبعین یعنی علی گڑھ کالج کی تعلیم کے عاشق۔ اسی طرح اونٹ سے مسلمانوں کی

تدیم شان و شوکت اور گائے سے مسلمان، ہندوؤں کا اتحاد مراد ہے۔

اقسام ظرافت اکبر کی ظرافت مندرجہ ذیل اقسام پر تقسیم ہو سکتی ہے۔

مذہب، سیاسیات، تہذیب جدید۔ پردہ و تعلیم نسواں۔ ظرافت الفاظ۔ طنزیات۔

ان سب اقسام کے نمونے بالترتیب مختصراً پیش کیے جاتے ہیں:۔

مذہب

داڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب
چہرے کے نیچے قہر ہے داڑھی کا جھول جھال

فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کرد ل
اس فرد کو بچائیے تفصیل ذیل سے

بجائیں شوق سے ناقوس برہمن اکبر
مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی

یہاں تو شیخ کو دھن ہے بگل بجانے کی
اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

پیتا ہوں شراب آب زمزم کے ساتھ
ہے عشق حقیقی و مجازی دونوں

رکھتا ہوں اک وظیفہ بھی ٹمٹم کے ساتھ
قوال کی بھی صدا ہے چھم چھم کے ساتھ

صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا مولانا خوش مولوی
پیارا ہے ہم کو شیخ ہمارا برا سہی

آسماں اب چاہتا ہے مولوی کش مولوی
چاقو ولایتی نہیں دیسی چھرا سہی

مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں ان کو
بے نمازوں ہیں وہ اور اس پہ شرماتے نہیں

دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں
یہ غنیمت ہے کوئی ٹوکے تو گرماتے نہیں

نیست کس معروف کار دیں بہ قلب مطمئن
شیخ پہ گو کہ رشک آتا ہے
ہیں مگر اونٹ پہ نہیں قابض

یک فنائی الانر مست و یک فنائی الدار ول
اونٹ کے سب نکات جانتے ہیں
کام کی ہم یہ بات جانتے ہیں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے ‌ ‌ ‌ کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آوازِ اذاں ‌ ‌ ‌ جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

مکہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے ‌ ‌ ‌ اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے

سیاسیات

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

انوکھے ہیں مشاغل حضرتِ اکبر کے ان روزوں
الم ترکیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں

مرید اُن کے تو تھرڈوں میں اُڑے پھرتے ہیں موٹر پر
نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے میں

بابو کہنے لگے بجٹ پہ لڑو ‌ ‌ ‌ ملک کو دیکھو اپنے حق پہ اڑو

کہہ دیا صاف ہم نے اے مہراج ‌ ‌ ‌ ہو مبارک تمہیں یہ کام یہ کاج

ما مقیمانِ کوئے دلداریم ‌ ‌ ‌ یا ڈپٹیشن سنت یا غم سیم

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو ‌ ‌ ‌ جب توپ مقابل ہے تو اخبار نکالو

یہ دال لبِ گنگ کبھی گل نہیں سکتی ‌ ‌ ‌ کلو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی

کامیابی کا شُدھی پر ہر اک دربست ہے ‌ ‌ ‌ چونچ طوطا رام نے کھولی مگر پربست ہے

اصل کا اُس بتِ خود بیں سے کوئی ہنٹ کہاں ‌ ‌ ‌ صرف بوسہ میں بھلا سلف گورنمنٹ کہاں

ممبر علی مراد ہیں یا سکھ ندہان ہیں
لیکن معائنہ کو وہی نابدان ہیں

تعلیم و تہذیب جدید

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

شوقِ لیلائے سول سروس نے اس مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

جامۂ ہستی کے ٹکڑے اُڑ رہے ہیں نزع میں
پھینکیے اب کوٹ کو تہہ کیجیے پتلون کو

نہ تیر افگنی ہے نہ اب حکمرانی
نہ وہ وضعِ ملت نہ قرآن خوانی

نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی
یہی کہتی پھرتی ہے لڑکے کی نانی

ہر اک شاخ میں پاس یہ اے بوا ہے
مرا لال کالج کا کاکا توا ہے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

ٹرخا دیا ہر ایک کو مغرب نے پاس کر کے
سید بھی کود رہے تھے برسوں مساس کر کے

سُنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات
انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجیے

پردہ و تعلیمِ نسواں

پردہ اُٹھتا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہنچ جائیں گی غلمان تو ہیں

غریب اکبر نے بحث پردہ کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب اُلٹ ہی دی اس نے کہہ کر کہ کر ہی لے گا مرا موا کیا

اُٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق
بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے

بے حجابی مری ہمسائے کی خاطر سے نہیں
صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

نظر میں تیرگی ہے اور لبوں پر ناتوانی ہے
ضرورت کیا ہے پردے کی جہاں بمبے کا پانی ہے

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم
اُستاد اچھے ہوں مگر اُستاد جی نہ ہوں

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

ہمارے ملک میں ہوتا ہے کیا تعلیم نسواں سے
بجز اس کے کہ بابا اور بھی گھبرائیں اماں سے

ظرافتِ الفاظ

روح حکومت کی جب یہاں نہ رہی
حنفی نفی ہیں معطل ہیں

ہر طرح اب ہے عاجزی ہم میں
اب ہمارے امام حنبل[1] ہیں

اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے
اسی پر شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

کہاں باقی رہے ہم میں وہ اوراد سحر گاہی
وظیفہ کی جگہ پاینیر یا آئی ڈی ٹی ہے

گئے ثروت کے دن یاروں کے آگے اب اے اکبر
کبھی سوڈا کبھی لمنڈ کبھی وسکی کبھی ٹی ہے

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ
گھر میں بیٹھے ہوئے دانتین پڑھا کرتے ہیں

عاشقی کا ہو برا اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے کر گئے

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور یہ فرما دیا
آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

پکالیں پیس کر دو[2] روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

عہد اسلام و عہد انگلش میں
سنیے قول اکبر سخن گو کا

پہلے توحید تھی تو اب تحصیل
آگے غل ایک کا تھا اب دو[2] کا

---

[1] انگریزی میں ہمبل بمعنی عاجز کے ہیں ۱۲

طنزیات

آنر اگر ملے جو ہے نام و نمود میں
کیا حرج زندگی ہو اگر حال زشت میں

دوزخ کے داخلے میں نہیں ان کو عذر کچھ
فوٹو کوئی لگا دے جو ان کا بہشت میں

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

ہماری مجلسیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں
بُنہ اُغنش تھے قبل اس کے اب اسپنسر کے ٹٹو ہیں

حال دنیا سے بے خبر ہیں آپ
گو تقدّس مآب بے شک ہیں

شیخ جی پر یہ قول صادق ہے
چاہ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

شیخ جی کو جو آگیا غصّہ
لگے کہنے یہ پھینک کر دُھسّہ

تم ہو شیطان کے مُطیع و مُرید
تم کو ہر ایک جانتا ہے پلید

ہے تمہاری نمود بس اتنی
جس طرح ہو پڑی پریڈ پہ لید

اِستحصال بالجبر

یعنی ایسے اشعار جو ادنیٰ تغیّر الفاظ سے کلام اکبر بن گئے ہیں۔

کریما بہ بخشائے بر حال قوم
صلوٰۃ است رائج در ایشاں نہ صوم

کریما بہ بخشائے بر حال بندہ
کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ

رشتۂ در گردنم افگندہ بیٹ
مے برد ہر جا کہ کیک است و پلیٹ

پہلے ہم لوگ یہ سمجھتے تھے
ہر چہ از باپ میرسد نیکوست

ہو گئی اب خیال کی اصلاح
ہر چہ از آپ میرسد نیکوست

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز بانیر — کہ زن چہ گفت و مل چہ شنید و ملر چہ کرد

ہیٹ را نہ بہ سرمن جائے دستار اے عزیز — مرد تا مسٹر تو اند شد چرا قبلہ شود

عمر گذری ہے اسی بزم کی طراری میں — دوسری پشت ہے چندہ کی طلبگاری میں

ڈنر سے تم کو کم فرصت یہاں فاقہ سے کم خالی — چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

الا یا ایہا الطفلک بجو راحت بہ ناو لہا — کہ قرآں سہل بود اوّل ولے افتاد مشکلہا

بکن تزئین پائے خود بہ بوٹ ڈاسن و پتلون — کہ مسر سید خبر دارد ز راہ و رسم منزلہا

سکۂ زر بابوے در دھوتی زر تار داشت — با وجودش نالہائے زار در اخبار داشت

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست — گفت تار اخون فیس و ٹیکس درایں کار داشت

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست — بعد ہر اسپیچ آخر چندہ ایست

یاد دار ایں قول مولانائے روم — مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

ہم ڈنر خواہی و ہم آروغ صاف
ایں خیال ست و محال ست و گزاف

اکبر کی سیاسی نظمیں اس قسم کی نظمیں ۲ دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جن میں محض ظرافت ہی ظرافت ہے یعنی ایک عمدہ خیال ظریفانہ طرز میں ادا کیا گیا ہے اور بس ان کا مقصد صرف خوش طبعی ہے۔ دوسری وہ جن میں ظرافت کے پردہ میں سیاسی معاملات اور حقائق مضمر ہیں۔ اس قسم کے اشعار میں مصنف کی رائے کے ساتھ ان کی ذاتی ناراضی اور غیظ و غضب بھی شامل ہے۔ ان میں ظریفانہ انداز صرف اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ حق بات کی تلخی دور ہو کر شاعر کا دلی مطلب سامع کے دل میں اتر جائے اس قسم کے اشعار سے وہ وہی کام لیتے ہیں جو ایک ہوشیار ڈاکٹر شکر آلود تلخ گولیوں سے لیتا ہے۔ معمولی اشخاص کے واسطے ایسے اشعار صرف ہنسنے ہنسانے کا کام دیتے ہیں۔ مگر جو لوگ ان کے اندازِ طبیعت سے واقف ہیں ان کے لیے وہ

بہت عمیق معنی رکھتے ہیں۔ پڑھنے والے کو چاہیے کہ اس قسم کے اشعار کا مطلب سمجھنے کے واسطے وہ ذرا غور و فکر سے کام لے۔ سیاسی اشعار میں وہ مغربی طرز معاشرت کی حقیقی اور اصلی کیفیت دکھلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سب دام ہیں جو مشرقی روحانیت کو شکار کرنے کے لیے بچھائے گئے ہیں۔ سیاسی حقوق کو وہ محض زنجیر غلامی کی مختلف کڑیاں تصور کرتے ہیں جو سیدھے سادے ہندوستانیوں کے پھانسنے کی تدبیریں ہیں۔ ان کے نزدیک سرکاری اسکول ایسے کارخانوں سے زیادہ نہیں جن میں کلارک لوگ تیار کیے جاتے ہیں اور غلامی ذہنیت اور بڑھائی جاتی ہے۔ اور انگریزی تعلیم سے زنجیر غلامی کی کڑیاں بھی کستی جاتی ہیں وہ محکمہ سی۔آئی۔ڈی سے معشوق کی کمر تلاش کراتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو اکبرؔ شوریدہ سر کا حال

خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

عیسائیت کے اس فرسودہ اعتراض کے جواب میں کہ اسلام بذریعہ شمشیر پھیلایا گیا وہ پوچھتے ہیں کہ کیا یورپ بھی اپنی توپوں اور مغربی ساز و سامان کی جھکا چوند سے روپیہ وصول نہیں کرتا اور رعایا کو دائمی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر بند کرنا نہیں چاہتا۔ مگر اس قسم کے اشعار کو ان کی ذاتی رائے سمجھنا ضروری نہیں کیونکہ اکبر ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ سیاست دان نہ تھے۔ انہوں نے علم پالیٹکس کی تعلیم نہیں پائی تھی بلکہ وہ ایک سرکاری ملازم تھے اور مختلف عہدہ ہائے سرکاری پر اپنے فرائض منصبی قابلیت سے انجام دے کر پنشن پا گئے تھے اور حسن خدمات کے صلے میں خان بہادری کا خطاب بھی ملا تھا۔ چونکہ وہ شاعر تھے لہٰذا ہر قسم کے خیالات کا اظہار شعر ہی میں کرتے تھے اس سے غرض نہیں کہ وہ خیال ان کا ذاتی ہوتا یا کسی دوسرے کا ہوتا تھا۔ ان کو خیال کی واقعیت سے سروکار نہ تھا بلکہ اس کے طرز ادا سے تھا۔ وہ کبھی گورنمنٹ کے موافق اور کبھی گورنمنٹ

کے خلاف لکھتے تھے اور چونکہ شاعر تھے لہذا نتائج کی گرفت سے بے خوف تھے۔ اُن کی رائیں جیسا کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہیں کسی ماہر سیاسیات کی مستقد رائیں نہیں شمار کی جاسکتیں۔ کیونکہ ان کے مقولوں میں بعض جگہ اختلافات بھی ہیں۔ وہ فطرتاً بہت محتاط تھے۔ اور کوئی ایسی رائے نہیں ظاہر کرسکتے تھے جس کے نتیجہ میں ان کو دشواریاں پیش آئیں۔ وہ شاعر پہلے ہیں اور ماسوائے شاعر بعد کو اُن کا مقدم فرض منصبی خوش کرنا ہے۔ خیالات کا اظہا اس کے مابعد ہے۔ وہ کسی گروہ یا جماعت کی کمزوریوں کی گرفت کرتے ہیں اور ان کو اپنے اشعار میں نہایت مختصر جامع اور ظریفانہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مسلمانوں کے معرف ہیں کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کوشاں ہیں۔ دوسرے مواقع پر وہ اسی تعلیم مغربی کے سخت مخالف ہیں کیونکہ یہ بے دینی اور لامذہبی کا زینہ ہے وہ اخلاقی مسائل کو کسی رفارمر یا فلسفی کی طرح شرح و بسط سے بیان کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان کو اپنے اشعار میں دل چسپ مختصر طریقہ سے بیان کرجاتے ہیں مگر یہی اختصار مضمون کو بہت معنی خیز اور پُر زور بنا دیتا ہے۔ پھر الفاظ کے انتخاب میں ان کو وہ ید طولیٰ حاصل ہے کہ ایک ہی لفظ سے کئی کئی معنی نکالتے ہیں جو بادی النظر میں عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ ان کے نزدیک تمام سیاسی امراض کی جڑ ہندوستان کی کمزوری ہے۔ ہماری خوشامد اور گڑگڑانے سے اور اسی طرح آہ و زاری اور اضطراب سے ہم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ قوی کا بیکار مصرف اور کمزوری کی نشانی ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے کانگریس کی کارروائیوں انتہا پسند جماعتوں اور جابرانہ "حکومت کے نقائص کا بھی خوب خاکہ اُڑایا ہے یہ سب مضامین نہایت نادر استعارات، لطیف اشارات اور بلیغ ظرافت کے پردہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ معمولی پڑھنے والوں کے واسطے تو وہ محض ایک زعفران زار ہیں مگر چشم حقیقت بیں ان کی تہ میں ایک معنی دیکھتی ہے

اُن کے اشعار میں محض سماعی اثر سے بہت زیادہ اثر ہے۔ اُن کے بعض اشعار پر گورنمنٹ کو جنگ عظیم اور بلوۂ مسجد کانپور کے زمانہ میں اُن کو متنبہ کرنا پڑا تھا کہ شورش انگیز مضامین لکھنے سے آیندہ اجتناب کریں۔ ان کے اشعار بہت موثر تھے اور ہر شخص کی زبان پر تھے۔ اس واسطے کہ ادنےٰ سے اعلےٰ اور عامی سے عالم تک ان کو پڑھتے اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اُن کا مطلب نکال کر ان سے محظوظ ہوتے تھے۔ ان کے کلام کی یہ بھی ایک خاص صفت ہے کہ اُردو اور ہندی زبان کے دلدادہ دونوں ان کو مساوی طریقہ پر پسند کرتے ہیں۔ سیاسی اور اخلاقی میدان میں اکبرؔ ایک قومی شاعر ہیں وہ اپنی قوم کے لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ تم نے اپنا قومی امتیاز اور قومی آئیڈیل چھوڑ دیے اور مغربی معاشرت اور مغربی تعلیم کے دلدادہ ہو گئے۔ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ روحانیت مادیت پر ضرور غالب آئے گی تمام سیاسی مشکلات کا ان کے نزدیک حل یہ ہے کہ احکام خداوندی کی تعمیل کی جائے اور قدرت خداوندی پر پورا بھروسہ رکھا جائے۔

اکبرؔ بحیثیت نکتہ چیں سوسائٹی

اکبرؔ کی شاعری کی نمود کا زمانہ وہ تھا جبکہ ہندوستان گویا نیا جنم لے رہا تھا۔ مغربی تعلیم اور مغربی معاشرت کی شراب خالص ہندوستانیوں کے دماغوں میں اثر کر گئی تھی جس کی وجہ سے اعتدال دماغی وہ کھو بیٹھے تھے۔ ہندوستان ایک عجیب انقلاب کا جولانگاہ تھا۔ مغربی تمدن، مغربی اخلاق و معاشرت، غرض کہ ہر قسم کی مغربیت آنکھوں کو خیرہ اور دماغوں کو تیرہ کر رہی تھی۔ ہندوستانی لوگ مغربیت کے اتنے دلدادہ ہو گئے تھے کہ انگریز بننا اپنا فخر سمجھتے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کو اس میں خاص لطف آتا تھا کہ پرانی تہذیب اور پرانے خیالوں کا خاکہ اڑائیں۔ وہ ہر ہندوستانی چیز کو نگاہ حقارت سے دیکھتے تھے۔ یورپی نام۔ یورپی لباس۔ یورپی طعام۔ یورپی وضع و قطع مرغوب خاطر تھی۔ انگریزی گفتگو ایک خاص طغرائے امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ ہر انگریزی

چیز خواہ کیسی ہی ہو ہندوستانی چیز سے بہتر خیال کی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ فاتحوں نے مفتوحوں کے عقل و تمیز ہوش و خرد پر بھی تسلط پا لیا تھا۔ قدیم رسم و رواج حتیٰ کہ مذہب کی بھی بے احترامی اور رسوم شکنی کی ہوا چلی ہوئی تھی۔ یہی پر آشوب زمانہ تھا۔ کہ اس میں کچھ انجام بیں ہستیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ یہ لوگ آیندہ خطرے سے واقف تھے۔ اُنہوں نے ان تیز رفتار لوگوں کو شتر بے مہار کی طرح منہ اُٹھائے چلے جاتے تھے آگے بڑھنے سے روکا اور راستہ کے خطرات سے آگاہ کیا بنگال کا نامور افسانہ نگار بنکم چندر چٹرجی اسی قبیل کا آدمی تھا۔ اس نے اپنے پُر زور اور دل چسپ ناولوں میں انگریزی تہذیب اور انگریزی سوسائٹی کا خاکہ اڑایا ہے اور جو کام اس کے افسانوں سے نکلا وہ بہترین وعظ و نصیحت اور سخت ترین نکتہ چینی سے ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ اکبر نے بھی یہی روش اختیار کی مگر ان کا حربہ بجائے نثر کے نظم تھا۔ انہوں نے بھی اُس زمانہ کی حماقتوں کو خوب تاڑا اور لوگوں کے غرور اور طرز و روش کا لطیف جوابات الزامی سے خوب خاکہ اُڑایا ہے مگر بعض جگہ وہ چوک گئے ہیں اور نشانہ خطا کر گئے ہیں۔ انہوں نے تناسب حالات اور مصالح وقت کا خیال نہ کر کے بسا اوقات مغربی تہذیب کے درخت کو بیخ و بُن سے اُکھاڑنا چاہا ہے وقت کے ساتھ چلنا نہیں چاہتے تھے اور مغربی تعلیم کے مستقل اور دیرپا فوائد کے بھی قائل نہ تھے۔ شاید اسی وجہ سے یعنی انتہائی قدامت پسندی سے پوری پبلک ان کے ساتھ نہ تھی اور اسی وجہ سے ان کی شہرت پر کسی قدر اثر[1] پڑا۔

لہ یہ مصنف صاحب کی ذاتی رائے معلوم ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اکبر ایک بہت مذہبی شخص تھے اور آخر عمر میں تو علی الخصوص ان کا کلام مذہب اور روحانیت سے مملو تھا وہ ترقی اور تہذیب کے کسی حال میں منکر نہ تھے عام اس سے کہ وہ مردوں میں ہو یا عورتوں میں۔ مگر جب اس ترقی و تہذیب کا تصادم مذہب سے ہوتا تھا وہ تو ہزار تہذیبوں کو مذہب پر قربان کرنا پسند کرتے تھے۔ (دیکھیے باقی صفحہ ۵۶۳ پر)

اس نئے انقلاب کے زمانہ میں سرسید سب سے پہلے شخص تھے جو مغربی تہذیب کے فوائد سے بہت متاثر ہو گئے تھے وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے خوابِ غفلت سے چونکانے اور ان کو قعرِ مذلت سے نکالنے کا بس یہی ایک ذریعہ ہے۔ برخلاف اس کے اکبر تہذیب جدید کی کامل تقلید اور اس کی ہر بات ماننے کے مؤید نہ تھے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ خیال کہ مغربی تعلیم و تہذیب تمام تر بُری اور ناقابل تقلید ہے صحیح نہ تھا۔ وقت کے سیلاب کو روکنا یا اس کے مخالف چلنا عقل کی بات نہیں ہے۔ اکبر جدید تعلیم کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ اس میں مذہب کو بالکل بھلا دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے لوگ آزاد خیال ہو کر مذہب کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ وہ پردے کے قیود کو کم کرنے یا توڑنے کے بھی سخت مخالف تھے کیونکہ اس کے نزدیک اس میں بڑے بڑے نقصان ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ انگلستان اور یورپ و امریکہ وغیرہ میں اس جنسی آزادی اور ارتباط سے بُرے بُرے نتیجے آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اس خیال سے کانپتے تھے کہ اگر اسی قسم کا اختلاط مردوں اور عورتوں میں ہندوستان میں واقع ہوا تو اس سے کتنا بڑا طوفان برپا ہو گا۔ ان کے نزدیک مشرقی اور مغربی تہذیب و تمدن میں بعد المشرقین واقع ہے۔ اس ملک کے حالات خیالات روایات رسوم و رواج یورپ سے بالکل مختلف اور اکثر متضاد ہیں۔ یورپی خرابیوں کی اصلاح کی تدابیر ہندوستان کے لیے موزوں نہیں ہیں کیونکہ اس میں اور ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح وہ مغربی طرز پر تعلیم نسواں

(بقیہ مضمون حاشیہ صفحہ ۵۲۲)

مگر اس سے ان کے کمال اور شہرت پر کوئی اثر نہیں پڑا اور کوئی طبقہ یا جماعت ایسی نہیں ہے کہ جو ان کے کمالِ فن کی قائل اور معترف نہ ہو محض اس وجہ سے کہ وہ ابن الوقت نہ تھے۔ بلکہ برعکس اس کے یہی احترام مذہب مثل ظرافت کے ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ۱۲ مترجم۔

کے بھی سخت مخالف ہیں۔ کیونکہ اس سے عورتوں کے اخلاق پر ضرور اثر پڑے گا۔ انہیں وجوہ سے انہوں نے مغربیت پسندی کا اپنے اشعار میں خوب خاکہ اڑایا ہے۔ اور جا بجا اس پر طنز کیے ہیں۔ ہندوستانی عشاق کو ان کی رائے ہیں کتاب محبت کا سبق اپنے ہم مشربان یورپ سے لینا پڑے گا اور ہندوستانی معاشیق کو ادا و ناز اور کرشمہ و غمزہ کا انداز اپنی یورپین ہم جنسوں سے سیکھنا پڑے گا۔ کمیٹیوں اور چندوں کا زمانہ ہے۔ مردوں اور عورتوں دونوں کے خیالات اور جذبات اور اخلاق ہر چیز میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے۔ پرانے قومی آئیڈیل لوگ کھو بیٹھے یا ان کو عمداً حوالہ ماضی کر دیا۔ علماء و عرفا نے اپنی قدیمی ورع کو چھوڑ کر شہرت پرستی اور نفس پرستی اختیار کر لی۔ صوفی اب اپنے زہد و ورع کی تجارت کرنے لگے۔ علماء مثل سابق کے شمع ہدایت نہیں رہے۔ عورتیں "چراغ خانہ" سے "شمع انجمن" بن گئیں۔ مادیت کا دور دورہ ہے۔ قناعت اور خودداری چھوڑ کر لوگوں نے ترقی کا زینہ خوشامد اور چاپلوسی کو ٹھہرا دیا۔ غرضکہ یہ امور مذکورۂ بالا اس نئے زمانہ کے تبرکات ہیں اور ان سے کسی قسم کا بھی فائدہ منصور نہیں ہے۔ اسی انتہائی قدامت پسندی کی وجہ سے وہ سر سیّد اور ان کے متبعین یعنی تعلیم علی گڑھ کے حامیوں کے سخت مخالف تھے۔ جس قدر سر سیّد کی رفتار ان کے نزدیک تیز تھی اسی قدر ہمارے نزدیک ان کی روش سست تھی۔ اکثر اس قسم کے اختلافات ضرورت شعری پر بھی مبنی کہے جا سکتے ہیں۔

اکبر نہ صرف جدید خیالات اور جدید تہذیب کی اشاعت کے شاکی ہیں بلکہ وہ قومی تہذیب و تعلیم کے زوال کے بھی نوحہ گر ہیں۔ وہ درستی اخلاق احیائے علوم قدیمہ اور ان کی خرابیوں کے جو مشرقی شایستگی میں بیرونی اثرات سے داخل ہو گئی ہیں۔ دور کرنے کے بڑے حامی ہیں۔ وہ تعلیم نسواں کے اصولاً خلاف نہیں مگر اس

کا صحیح طریقہ پر رواج چاہتے ہیں۔ ان کی غرض یہ ہے کہ عورتیں تعلیم پاکر اچھی بیویاں اور اچھی مائیں بنیں۔ قومی جائداد نہ بنیں۔

دو اسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

وہ پُرانی پاس وضع۔ سچائی۔ ہمدردی۔ قناعت۔ خودداری وغیرہ کے فقدان کا افسوس کرتے ہیں۔ اور زمانہ موجودہ کے مایہ ناز صفات پالسی۔ دوروئی۔ خودغرضی۔ بے حیتی پر غصّہ اور افسوس کرتے ہیں۔ ان کو افسوس آتا ہے کہ اپنی ذاتی ترقی کی کورانہ روش کے پیچھے لوگ اپنے والدین بھائی بہن اور دیگر متعلقین اور واسطہ داروں کے واجبی حقوق فراموش کر بیٹھے، یہاں تک کہ خدا کا احساس بھی ان کے دل سے اُٹھ گیا۔ دنیا کے بکھیڑوں کے پیچھے دین کو بھلا بیٹھے ہیں۔ یہ مادّہ پرستی کا دور جو صرف تیز رفتار ریل اور ٹیلیگراف اور ٹیلیفون۔ کے معجز نما اثرات کا قائل ہے۔ ہمارے دلوں کو کسی قسم کا سکون و اطمینان نہیں بخشتا۔ موجودہ دور کی سائنس کی معجز نمائیاں اور نئی نئی مشینوں کی سحر آفرینیاں سراپا فائدہ نہیں ہیں۔ مرگ ناگہانی جو اکثر کثرت اضطرار اور تیز حرکتوں کا نتیجہ ہے اور کم عمر اور خرابی صحت یہ سب اسی کے برکات ہیں۔ جدید طریقہ تعلیم بھی جیسا کہ خیال کیا جاتا تھا۔ اخلاقی و روحانی امراض کے لیے اکسیر صفت ثابت نہیں ہوا۔ سائنس کی ترقی اور نیچر کی مغلوبیت نے دل کی تکلیفوں کو کسی طرح رفع نہیں کیا اور نہ وہ مصائب دُور کیے جن کے رفع کرنے کی اُمید کی جاتی تھی۔ دونوں تہذیبوں کے درمیان میں ایک عمیق خلیج حائل ہے۔ مغربی تہذیب ہمہ تن دنیاوی جاہ و ثروت، تجارت و دولت کی طرف متوجہ ہے اور مشرقی تہذیب کا منتہائے نظر روحانی ترقی ہے۔ وہ بہ آسانی مختصر اور تھوڑی چیز پر قانع ہو جاتی ہے۔ فتوحات اور مُلک گیری کا اس کو شوق نہیں۔ قناعت اور تسلیم و رضا اُس کا آئین ہے۔

اکبر کے مذہبی عقائد علاوہ شاعر کے وہ ایک ناصح قوم، ریفارمر، واعظ اور فلسفی بھی تھے۔ وہ خدا کی وحدانیت اور تاثیرِ دعا کے دل سے قائل تھے۔ ان کا دلی اعتقاد تھا۔ کہ مذہب کا تعلق دل سے ہے اور اس میں فلسفہ سائنس اور منطق کا کوئی دخل نہیں وہ مذہبی جھگڑوں اور جزئی اختلافات اور تعصبات سے بالکل بری تھے۔ مذہب ان کے نزدیک ایک زندہ اور محبت کرنے کے قابل شے ہے۔ اس کو چند آرار اور حقائق فلسفیانہ کا مجموعہ نہ سمجھنا چاہیے۔ اکبر کوئی ایسی نکتہ چینی گوارا نہیں کر سکتے جو اعتقاد کے منافی ہو کیونکہ یہی مذہب کی جان ہے۔ ان میں تعصب اور کٹرپن مطلق نہیں اور اسی وجہ سے وہ مُلّائیت کی تنگ خیالی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام اور دیگر مذاہب کے جزئی اختلافات ایک وسیع النظر موحد کی نظر میں بالکل بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اکثر اشعار میں انسان کی بے حقیقتی کا ذکر کرتے ہیں تاکہ وہ ذہنی کامیابی پر مغرور نہ ہو۔ ان کا قول ہے کہ وہ ہر چند سائنس کی ترقیوں کے قائل ہو مگر خدا کو کسی حال میں دل سے نہ بھولو۔ وہ اصول اخلاق اور فلسفہ اور حقائق و معارف کے بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ظواہر مذہب کی وہ پرواہ نہیں کرتے۔ وہ نفس کشی اور ضبط خواہشات کو بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ رسوم ظاہری مثل پوست کے ہیں اور اصول اور افعال و اطوار مثل مغز کے، وہ تعصب اور غصہ کو بہت بُرا سمجھتے ہیں کیونکہ اس سے تنگ خیالی پیدا ہوتی ہے وسعت نظر اور بلند خیالی ان عیوب کو دفع کر دیتی ہے۔ آخر عمر میں وہ فلسفہ اور تصوف بہت کہتے تھے۔ ایک جگہ انہوں نے معاوضۂ آخرت کا مضمون بہت خوب لکھا ہے۔

نادر کاکوروی متوفی ۱۹۱۲ء نادر علی خاں[1] نادر طرز جدید کے بہت عمدہ کہنے والوں میں سے تھے۔ اس رنگ میں ان کی اکثر نظمیں بہت مشہور ہیں۔ درد و اثر اعلیٰ

---

[1] ولادت ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء۔ وفات ۱۳۳۱ھ مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۲ء

تخیل، حُبِ وطن ان کے کلام کی مخصوصات سے ہیں۔ یہ انگریزی شعراء بائرن اور ٹامس مور کے دلدادہ تھے اور چاہتے تھے کہ انہیں کا رنگ نہایت سلیس اور عمدہ طریقہ سے اُردو میں بھی داخل ہو جائے۔ ان کی نظمیں "شمع و پروانہ"، "شعاع امید"، "پیکرِ بے زبان"، "فلسفۂ شعری" بہت مشہور ہیں۔ اُن کو اپنے وطن یعنی ہندوستان سے عشق تھا۔ چنانچہ اسی وطنی جذبات کی نظمیں "مقدس سرزمین" اور "مادرِ ہند" دیکھنے کے قابل ہیں۔ ٹامس مور کی مشہور کتاب "لالہ رُخ" کے طرز پر انہوں نے بھی ایک مثنوی لکھی ہے اور اس کا نام بھی لالہ رُخ رکھا ہے۔ ان کا انتقال عین جوانی یعنی پینتالیس برس کی عمر میں ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ اس بے ہنگام سانحہ سے ادبی دنیا نے جو امیدیں ان کی ذات سے قائم کی تھیں ان سب پر پانی پھر گیا:۔

انڈکس حصۂ نظم

آباد ۲۸۳ - ۲۸۵
آبحیات (تذکرہ) ۱۲۶ - ۱۵۱ -
۱۵۲ - ۱۹۸ - ۱۹۹ -
۲۳۲ - ۲۳۹ - ۲۴۶ -
۲۷۹ -
آبرو (شاہ مبارک) ۵۹ - ۸۱ - ۱۲۲ -
۱۲۴ - ۱۲۵ - ۱۲۶ - ۱۲۹ -
۱۳۰ - ۱۳۵ - ۱۳۶ -
آبرو (اصغر علی خاں ۴۱۲
آتش ۶۶ - ۶۷ - ۱۳۹ - ۲۸۵ -
۲۹۲ - ۲۹۷ - ۳۰۲ -
۳۲۱ - ۴۳۹
آرائش معشوق (مثنوی) ۱۲۷ -
آرزو (سراج الدین علیخاں ۵۹ -
۱۲۲ - ۱۲۶ - ۱۲۷ تا ۱۲۹
۱۳۷ - ۱۵۲ - ۱۹۱ - ۲۰۰
۲۰۱ - ۳۰۳ -
آرزو لکھنوی ۴۴۷
آزاد (مولوی محمد حسین) ۶۹ -
۴۳ - ۱۱۱ - ۱۱۴ - ۱۲۷ - ۱۳۲ -
۱۶۴ - ۱۶۹ - ۱۹۵ - ۲۰۰ -
۲۰۱ - ۲۰۴ - ۲۳۹ - ۲۴۳
۳۵۱ - ۳۷۳ - ۳۷۸ - ۴۷۸
۴۸۸ - ۴۸۹ تا ۴۹۴ -
آزاد (فقیر اللہ دکنی) ۱۱۱ -
آزاد کاکوروی ۴۶۸ -
آزردہ ۲۵۹ - ۳۶۷ - ۳۹۳
۴۰۴ -
آسمان جاہ (مہر) ۴۴۱ - ۴۷۶
آصف (دیکھو محبوب علی خاں
آصفی ملکاپوری ۹۹ -
آغا شاعر (دہلوی) ۴۳۸ -
آغا میر (نواب) ۲۷۶
آفتاب (دیکھو شاہ عالم
آفتاب داغ ۴۳۳
آگاہ ۱۱۹
آہ سرد (رسالہ) ۱۴۵
ابراہیم زبیری ۱۰۷
ابراہیم عادل شاہ ۵۸ - ۹۲ -
۹۵ - ۱۰۴ -
ابراہیم علی خاں (نواب ٹونک
۳۸۴ - ۴۱۲ -
ابراہیم قطب شاہ ۹۵ -
ابراہیم (مولوی انصاری) ۴۷۲ -
ابرکرم (مثنوی) ۴۹۳
ابن نشاطی ۹۵ - ۱۰۰ -
ابوالحسن (قطب شاہ ۵۸ - ۹۷
۹۸ - ۱۰۳ -
ابوالفضل ۱۰۹
ابوالقاسم (مرزا) ۱۰۳
ابوالمظفر (دیکھو ظفر
ابوالمعالی ۱۱۴ -
اٹل ۴۲۵
اثر (دیکھو امداد امام)
اثر ۶۲ - ۶۴ - ۱۴۵
اجگر نامہ (مثنوی) ۲۰۹
احسان دہلوی ۲۵۴ - ۳۶۷ -

۳۷۲ ۔

احسان شاہجہانپوری ۴۴۷ ۴۴۸ ۴۴۹

احسن مارہروی ۴۳۸ ۔

احسن اللہ (احسن) ۱۳۰ ۔

احکام الصلوٰۃ ۱۰۸ ۔

احمد ۱۲۰

احمد آباد ۱۱۲ ۔ ۱۱۳

احمد بیگ (مرزا) ۳۹۰ ۔

احمد خاں بنگش ۱۵۴ ۔

احمد شاہ ابدالی ۱۳۶ ۔ ۱۴۴ ۔
۲۶۸ ۔

احمد شاہ ۔ بادشاہ ۱۳۶ ۔ ۱۹۱

احمد علی خاں ۱۴۳ ۔

احمد نظام شاہ ۹۵ ۔ ۱۰۰

احمد نگر ۹۷ ۔

اختر (مرزا محمد صادق خاں) ۲۸۲ ۔
۳۱۶ ۔ ۴۱۱ ۔

اختر مینائی ۴۵۶ ۔

اختر (دیکھو واجد علی شاہ)

اردو (رسالہ) ۴۶۱ ۔

اردوی دکن ۱۱۰ ۔

اردوئے قدیم ۱۱۰ ۔

اردوئے معلی ۱۷ ۔ ۳۸۸

اڑیا (زبان) ۴۲

اسپرنگر (ڈاکٹر) ۱۹۶ ۔ ۲۵۰ ۔
۳۰۶ ۔

اسپنسر ۱۶۲ ۔

اسحاق خاں (نواب محمد) ۳۶۸

اسد (دیکھو غالب)

اسرار الصلوٰۃ (رسالہ) ۱۴۵

اسکاٹ (سر والٹر) ۵۳

اسماعیل (عادل شاہ) ۱۰۳

اسماعیل (مولوی محمد) ۲۹۵ تا ۲۹۷

اسیر (جلال) (دیکھو جلال اسیر)

اسیر لکھنوی ۲۷۳ ۳۱۱ ۔ ۳۱۲
تا ۳۱۶ ۔ ۳۴۰ ۔ ۴۱۲ تا
۴۱۵ ۔ ۴۳۹

اشرف علی (منشی) ۲۸۵ ۳۷۰

اشہر ۳۴۲

اعجاز عشق (مثنوی) ۲۰۹

اعظم ارکاٹی ۱۲۰

اعظم دہلوی ۲۵۴

اعظم خاں ۱۹۲ ۔

افادۂ تاریخ ۴۴۴

افسق ۲۲۵ ۔

افسردہ ۳۳۷ ۔

افضل خاں ۱۰۵ ۔

اقبال (ڈاکٹر) ۶۹ ۔ ۴۳۷ ۔

اکبر الہ آبادی ۶۹ ۔ ۵۰۱ تا ۵۲۶

اکبر بادشاہ ۹۵ ۔ ۱۲۱ ۔

اکبر شاہ ثانی ۲۵۵ ۔ ۲۵۹ ۔ ۳۷۴

اکبری عہد ۵۷ ۔

اکرام علی ۷۰ ۔

الفرڈ لائل (سر) ۱۶۶ ۔ ۴۲۵ ۔

الف لیلہ ۱۰۰ ۔ ۱۰۱ ۔

الم (صاحب میر) ۱۴۸ ۔

الماس درخشاں ۲۹۰

الور ۳۷۹ ۔ ۴۰۱ ۔ ۴۰۲ ۔ ۴۱۲

الیاڈ ۳۲۷

الیٹ صاحب ۴۰۴

امامی (میر) ۳۳۸

امان اللہ (سید) ۱۹۰ ۔ ۲۰۵ ۔ ۲۰۶

امانی (میر) ۳۲۰ ۔

امجد علی شاہ ۳۰۷ ۔
امداد امام اثر ۱۶۶ ۔
امن (میر) ۳۶ ۔ ۷۰ ۔
اُمید قزلباش خاں ۱۲۲ ۔ ۱۳۸
اُمید (دیکھو آرزو لکھنوی)
امیر مینائی ۶۸ ۔ ۶۹ ۔ ۸۶ ۔ ۱۴۶
۲۳۳ ۔ ۳۴۰ ۔ ۳۴۳ ۔
۴۰۶ ۔ ۴۱۶ تا ۴۲۷ ۔
۴۳۳ ۔ ۴۳۴ ۔ ۴۳۶
۴۳۸ تا ۴۴۱ ۔ ۴۵۷
امیر (نواب محمد یار خاں) ۴۰۹ ۔
امیر خاں ۱۲۹
امیر اللغات ۴۲۵ ۔ ۴۴۱ ۔
امین ۱۱۰ ۔
انجمن پنجاب ۴۹۰ ۔
انجمن ترقی اُردو ۱۹۶ ۔ ۴۵۹ ۔
اندر سبھا ۴۲۶ ۔
انشار ۶۲ ۔ ۶۳ ۔ ۶۴ ۔ ۲۲۱ تا
۲۲۵ ۔ ۲۳۷ ۔ ۲۴۲ ۔ ۲۴۵
تا ۲۴۸ ۔ ۲۵۱ تا ۲۵۴ ۔
۲۶۹ ۔ ۲۹۲ ۔ ۳۰۶ ۔

۳۴۴ ۔ ۳۴۹ ۔ ۳۵۲ ۔
۴۱۱ ۔
انگریزی (زبان) ۴۱ ۔ ۴۳ ۔
انس ۳۳۸ ۔ ۳۳۹
انور ۳۶۲ ۔ ۳۷۸ ۔ ۳۸۰ ۔
۴۰۳ ۔ ۴۱۲ ۔
انوری ۸۶ ۔ ۱۶۵ ۔
انیس ۶۷ ۔ ۸۸ ۔ ۱۶۵ ۔ ۲۷۳
۲۸۹ ۔ ۳۲۰ ۔ ۳۲۲ ۔ ۳۳۳
۳۴۰ و ۳۴۱ ۔ ۳۵۱ ۔
۳۵۴ ۔ ۳۵۵ ۔ ۴۲۱
اوج (مرزا محمد جعفر) ۴۲
اودھم سنگھ (سردار) ۴۴۷
اورنگ آباد ۱۱۱ ۔ ۱۱۲
اورنگ زیب (عالمگیر) ۹۹ ۔ ۱۰۹
۱۱۱ ۔ ۱۱۳ ۔ ۱۲۱ ۔ ۱۲۲
ایاغ فرنگستان ۲۹۰
ایبک ۸۸ ۔ ۴۴۹
ایجاد رنگین ۲۵۰
ایلیا (شاعر) ۱۱۹ ۔
اینیاڈ ۳۲۷

بابر ۱۲۱
بادشاہ (دیکھو نصیر الدین حیدر)
باد مخالف (مثنوی) ۳۹۰
باسط (خواجہ) ۲۱۴
باغِ جانفزا ۱۱۱
بالمیک ۳۲۶
بحر ۶۷ ۔ ۲۷۳ ۔ ۲۸۳ ۔ ۳۱۱
۳۴۰ ۔ ۴۱۸ ۔ ۴۳۹
بحر المحبت (مثنوی) ۲۴۶
بحری ۶۸
بدر الدولہ ۱۲۰
برائنٹ ۸۴
براؤننگ (رابرٹ) ۸۶ ۔ ۴۰۰
برجیس قدر (برجیس) ۳۱۱
برسانہ ۱۰۲ ۔ ۱۹۲
برشتہ ۴۱۱
برق ۲۷۳ ۔ ۲۸۳ ۔ ۳۱۱ ۔
۴۰۷ ۔ ۴۳۹ ۔ ۴۳۳
برکھارت ۴۷۸ ۔ ۴۷۹
بسنت سنگھ ۲۲۸
بسمل ۴۱۲

بقا ۲۴۴ - ۲۶۵ - ۴۱۰
بلینک درس ۴۹۶
بلوم ہارٹ ۱۱۲ - ۱۸۴ - ۲۵۰
بلونت سنگھ (مہاراجہ) ۲۹۰
بنگلہ ۴۲
بوبو جی ۹۵
بوستان خیال (مثنوی) ۱۱۸
بہار الدین ۱۱۱ -
بہادر سنگھ ۱۹۲
بہادر شاہ (دیکھیے ظفر)
بہادر علی (میر) ۱۶۹
بہار شاگرد رشک ۴۰۷
بہار بیخزاں (تذکرہ) ۲۰۷
بہارستان سخن ۲۸۵
بہار و خزاں ۱۱۱
بہار ہند ۴۲۵
بھاشا ۴۸
بھاگ متی ۹۵
بھاگ نگر ۹۵
بہاولپور ۴۱۲
بہرام و گل اندام ۱۰۲

بھرت پور ۴۱۲
بہو بیگم ۳۲۶ - ۴۰۹
بھوپال ۴۱۲ - ۴۱۳
بیان (خواجہ احسن اللہ) ۶۱ - ۱۳۵ - ۲۶۶ - ۴۰۹
بیان (یزدانی) ۴۸۳ فٹ نوٹ
بیان بخشایش ۲۹۰
بیتاب ۲۳۱
بیجاپور ۹۱ - ۹۳ - ۹۴ - ۹۵ - ۱۰۴ - ۱۰۵ - ۱۰۹ - ۱۱۱
بیچارہ ۹۵
بیخود (بدایونی) ۴۳۸
بیخود (دہلوی) ۴۳۸
بیخود لکھنوی ۳۱۱
بیدار (بساون لال) ۱۳۵
بیدار (میر محمدی) ۲۶۲
بیدل ۷۰ - ۷۶ - ۱۲۲ - ۱۴۰ - ۲۷۲ - ۲۷۹ - ۳۹۰ - ۳۹۱ - ۴۵۴
بیل (مسٹر) ۱۳۲ - ۱۴۸ - ۱۴۹
بینی بہادر (راجہ) ۳۰۴

پٹنہ (عظیم آباد) ۳۳۲
پٹیالہ ۴۱۲
پدماوت ۵۷
پرتھی راج راسو ۳۹
پروانہ (میر محمد نعیم) ۴۰۹
پناہ ۱۱۹
پنج آہنگ ۳۸۹
پنجۂ مہر ۲۹۰
پنچھی نامہ ۱۱۰
پوپ ۲۷۲ - ۲۷۹ - ۴۷۱
پھول بن ۹۹
پیارے لال (رائے بہادر منشی) ۴۸۹

تاباں (عبدالحی) ۱۳۰ - ۱۳۳ - ۱۳۵
تاباں (مرزا شجاع الدین احمد خاں) ۴۰۴
تاجور (دیکھو شاہجہاں بیگم)
تانا شاہ (دیکھو ابوالحسن قطب شاہ)
تجمل حسین خاں (نواب) ۲۹۱
تحفۃ الاحباب ۱۲۰

تحفۃ الافغان ۴۷۹
تحفۃ الشعراء ۱۱۱
تحفۂ عاشقان ۱۱۰
تحفۃ النساء ۱۲۰
تحفۃ النصائح ۱۰۱
تخلص ۸۹
تذکرۂ آرزو (دیکھو مجمع النفائس)
تذکرۂ جہاں ۱۹۵
تذکرۂ خازن الشعراء ۲۲۷
تذکرۂ شعرائے اردو (میر حسن) ۴۸۔ ۱۴۲۔ ۱۶۸
تذکرۂ شعرائے دکن ۱۱۴۔ ۱۱۹
تذکرۂ شورش ۹۲
تذکرۂ قاسم ۲۰۵۔ ۲۰۶
تذکرۂ قدرت ۱۲۹
تذکرۂ لچھمی نرائن ۱۱۹
تذکرۂ موسوی خاں ۱۱۹
ترجیع بند ۵۱
ترقی (مرزا محمد تقی خاں) ۲۴۲۔ ۲۹۲۔ ۳۲۱۔ ۴۱۰
ترکیب بند ۵۱
تسکین (میر حسین) ۳۵۸۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۴۱۵۔ ۴۱۸
تسلیم ۶۸۔ ۳۶۶۔ ۳۷۰۔ ۴۱۳۔ ۴۱۷۔ ۴۳۳۔ ۴۴۷ تا ۴۵۱
تشنہ ۴۱۲
تصوف ۸۱۔ ۸۵
تصویر (شاعر) ۴۱۲
تعشق ۳۴۰۔ ۳۴۱
تفتہ (منشی ہرگوپال) ۳۸۴۔ ۴۰۱
تفضل حسین خاں علامہ ۲۲۶
تلسی داس ۵۷
تلنگی (زبان) ۹۰۔ ۹۵
تلہر ۱۶۹
تمدن عرب ۴۵۵
تنبیہ الجہال ۲۰۹
تنبیہ الغافلین ۱۲۸
تنویر الاشعار ۲۹۲
تنہا (محمد عیسیٰ) ۲۴۵۔ ۲۷۵
توفیق (دیکھو صدیق حسن خاں (نواب)
توقیر (اکبر علیخاں) ۳۱۱
توقیر شرف ۲۹۰
تیغ تیز ۳۹۰

ٹامس مور ۵۲۷
ٹامل (زبان) ۹۵
ٹامس صاحب ۸۴۔ ۳۶۴۔ ۳۸۳
ٹانڈا ۲۴۳۔ ۴۰۹
ٹکیٹ رائے (مہاراجہ) ۲۵۸۔ ۳۰۴
ٹوڈرل ۵۷
ٹونک ۴۱۲
ٹینیسن ۴۹۱

ثاقب (احسن اللہ) ۴۲۵
ثاقب بدایونی ۳۸۰
ثاقب (نواب شہاب الدین احمد خاں دہلوی) ۴۰۴

جاجمؤ ۱۳۱

جام نمرود ۵۰۰
جانسٹن ۲۵۸
جان صاحب ۶۴ ـ ۳۶۴
جان عالم پیا (دیکھو واجد علی شاہ)
جرأت (دہلوی) ۶۲ ـ ۶۳ ـ ۲۴۴ ـ ۲۴۰ ـ ۲۴۲ ـ ۲۴۵ ـ ۲۷۳ ـ ۳۴۴ ـ ۴۱۱ ـ ۴۳۹
جرأت (موسوی خاں) ۱۱۷
جعفر زٹلی ۲۲۵
جگر مراد آبادی ۴۳۸
جگل کشور (راجہ) ۲۰۲
جلال (اسیر) ۱۴۰ ـ ۲۴۳ ـ
جلال (لکھنوی) ۶۸ ـ ۶۹ ـ ۲۷۳ ـ ۴۱۳ ـ ۴۱۹ ـ ۴۳۲ ـ ۴۴۲ تا ۴۴۷
جلوۂ خضر (تذکرہ) ۱۴۰ ـ ۲۸۲
جلیل ۴۱۹ ـ ۴۵۷
جمالی (مولانا) ۱۲۱
جنیدی ۹۵ ـ ۱۰۲
جواں بخت (مرزا) ۲۵۵
جواں بخت (ولیعہد واجد علی شاہ) ۴۱۱
جواہر الاسرار ۱۰۸
جوش عشق ۲۰۹
جورنیلیس ۴۷۲
جودنیال ۱۵۹
جوہر ۴۰۱
جھاؤلال ۳۰۴
جیبین ۴۷۳
جے پور ۴۱۲

چار شربت ۱۶۵
چاسر ۵۹ ـ ۱۱۱
چپ کی داد ۴۸۴
چراغ علی (مولوی) ۷۳
چرکین ۲۲۵
چمنستانِ شعرا ۱۱۱ ـ ۲۲۵
چندکوئی ۳۹
چندو لال (دیوان سرکار آصفیہ) ۲۷۷ ـ ۳۵۷ ـ ۳۷۵ ـ ۴۵۶ ـ ۴۵۸ ـ ۴۵۹

حاتم ۶۰ ـ ۸۱ ـ ۱۱۱ ـ ۱۲۱ ـ ۱۲۴ تا ۱۲۶ ـ ۱۲۹ تا ۱۳۱ ـ ۱۴۰ ـ ۱۵۲ ـ ۲۵۰ ـ ۲۵۵ تا ۲۶۲ ـ ۲۶۵
حاجی (شاعر) ۱۱۹
حافظ (خواجہ) ۷۶ ـ ۱۴۰
حالی ۶۹ ـ ۷۳ ـ ۸۲ ـ ۳۵۱ ـ ۳۶۲ ـ ۴۰۱ ـ ۴۰۴ ـ ۴۵۵ ـ ۴۷۴ تا ۴۸۹ ـ ۴۹۴
حامد علی خاں (نواب رامپور) ۴۲۰ ـ ۴۵۰
حب وطن (نظم آزاد) ۴۹۴
حب وطن (نظم حالی) ۴۷۸
حجاب (منی بائی) ۴۳۴
حسرت غنا (رسالہ) ۱۴۵
حزنِ اختری ۳۰۹
حزیں (دیکھو انیس)
حزیں (دیکھو لقا)
حزیں (شیخ علی) ۱۲۸ ـ ۳۲۵
حزیں (محمد باقر) ۲۶۶ ـ ۴۰۸

حسرت (دہلوی) ۲۵۷ - ۲۵۹
تا ۲۶۱
حسرت موہانی ۶۹ - ۲۴۳ -
۳۶۶ - ۳۸۵ - ۴۵۱
۴۶۸
حسرتی (دیکھو شیفتہ)
حسن و عشق (مثنوی جرأت) ۲۴۱
حسن نظامی (خواجہ) ۵۰۲
حسین میاں بہادر (نواب منگرول)
۴۱۳ - ۴۴۴
حسینی (بہادر علی) ۷۰
حشمت ۱۱۹ - ۱۳۶
حفیظ ۴۱۹
حفیظ الدین ۷۰
حمید (باقر صاحب) ۳۴۲
حیدر آباد ۶۸ - ۸۲ - ۹۵
۹۸ - ۹۹ - ۱۱۱ - ۲۵۰
۳۵۷ - ۴۰۶ - ۴۰۸ -
۴۰۹ - ۴۱۱ - ۴۱۴
۴۵۳ تا ۴۶۳
حیدری ۷۰ - ۱۰۰

حیران (میر حمید علی) ۴۱۰

خافی خان ۱۰۴ - ۱۰۵ - ۱۱۷
خاقانی ۸۶ - ۱۶۵
خاکی ۲۵۱
خان آرزو (دیکھو آرزو)
خانخانان (عبد الرحیم) ۵۷
خاور نامہ ۱۰۶
خدیجہ سلطانہ ۱۰۵
خریطۂ جواہر ۱۳۴
خسرو (امیر) ۵۵ تا ۵۶ - ۵۷
۱۲۷ - ۲۳۰ - ۳۹۰ - ۴۹۷
خلش (کرامت علی) ۴۱۳
خلق ۱۶۹ - ۳۲۱ - ۳۳۸
خلیق (مرزا ظہور علی) ۴۰۹
خلیق (میر مستحسن) ۱۶۹
خلیل (دیکھو ابراہیم علی خاں)
خلیل (میر دوست علی) ۲۹۵
خمخانۂ جاوید ۲۴۷ - ۳۸۰
خمخانۂ سرور ۵۰۰
خمسۂ متحیرہ ۱۲۰
خمکدۂ رحمت ۴۵۹
خواب امن ۱۹۷ - ۱۹۸
خواب و خیال (مثنوی) ۲۲۴ ۲۰۹
خوشحال رائے ۳۰۴

دار الترجمہ ۴۶۲
داغ (دکھنی) ۱۱۹
داغ دل مہر (واسوخت) ۲۹۰
داغ (دہلوی) ۶۸ - ۶۹ ۲۲۲
۳۷۸ - ۴۰۴ - ۴۱۳ -
۴۱۸ - ۴۱۹ - ۴۲۳ -
۴۲۹ - ۴۴۲ - ۴۵۷
دال محل ۹۸
داغ نگارہ (مثنوی) ۲۹۰
داؤد (شاعر) ۱۱۶
دائرۂ ادبیہ ۴۲۴
دبیر ۶۷ - ۶۸ - ۲۷۳ -
۲۸۹ - ۳۲۲ تا ۳۳۵
۳۵۱ تا ۳۵۵ - ۴۲۱
دراوڑی (زبان) ۴۲
درخشاں ۳۱۱ - ۳۲۰ - ۴۰۷

درد (خواجہ میر) ۶۱ ۔ ۸۱ ۔ ۱۲۴ ۔ ۱۲۸ ۔ ۱۲۹ ۔ ۱۳۸ ۔ ۱۳۹ ۔ ۱۴۰ ۔ ۱۴۱ ۔ ۱۴۹ ۔ ۱۶۷ ۔ ۱۶۸ ۔ ۲۰۱ ۔ ۲۶۳ ۔ ۲۶۴ ۔ ۲۶۵ ۔ ۳۵۷
دردمند (محمد فقیہ) ۱۱۷ ۔ ۱۳۵
درفش کاویانی ۳۹۰
دریائے عشق ۲۰۹ ۔ ۲۴۶
دریائے لطافت ۱۷ ۔ ۲۲۹ ۔ ۲۳۶ ۔ ۲۵۳
دستور الفصحا ۴۲۵
دکن میں اُردو (تذکرہ) ۱۱۹
دکھنی (زبان) ۹۰
دلپذیر (مثنوی) ۲۵۰
دلگیر ۳۱۳ ۔ ۳۲۱ ۔ ۳۳۷
دوبیتی (دیکھو رُباعی)
دولت ۱۰۸
دولت (جہانگیر محمد خاں) ۴۱۴
دولھا صاحب (عروج) ۳۳۸
دھرپد (دیکھو نورس م)

دہ مجلس ۷ ۔ ۱۱۳
دیازائن نگم ۵۰۶
دیوان حالی ۴۸۴
دیوان ذوق (مرتبہ آزاد) ۳۹۸ ۔
دیوان زادہ ۱۲۶ ۔ ۱۲۹

ڈرچ ۴۱ ۔ ۴۲
ڈراما ۴۷ ۔ ۸۷ ۔ ۸۸

ذکا (امیر اولاد محمد) ۱۱۷
ذکاء اللہ (مولوی) ۷۳
ذکر میر ۱۸۹ ۔ ۱۹۶ ۔ ۱۹۸ ۔ ۲۰۱
ذکی (نواب سید محمد ذکی) ۲۹۱ ۔ ۳۱۱ ۔ ۳۱۵
ذوق ۶۴ ۔ ۶۵ ۔ ۸۶ ۔ ۱۳۰ ۔ ۱۳۹ ۔ ۱۶۲ ۔ ۲۵۶ ۔ ۳۴۵ ۔ ۳۵۷ ۔ ۳۵۸ ۔ ۳۶۱ ۔ ۳۶۷ ۔ ۳۷۰ تا ۳۷۸ ۔ ۳۹۹ ۔ ۴۱۱ ۔ ۴۴۱ ۔ ۴۵۷

راجو (شاہ حسینی) ۱۰۲
راسخ ۶۳ ۔ ۲۶۷
رام پور ۶۸ ۔ ۸۲ ۔ ۲۵۳ ۔ ۲۷۳ ۔ ۴۰۶ ۔ ۴۱۲ ۔ ۴۱۴ ۔ ۴۳۳
رام راؤ ۱۰۹
رام کشور (پنڈت) ۴۰۳
رباعی ۵۰ ۔ ۸۸
رتن پدم ۱۱۰
رخشاں ۱۲۷ ۔ ۴۰۳
رخصت عروس ۴۱۲، فٹ نوٹ
رسا (جان مرزا) ۱۱۷
رسمی ۱۰۵
رشک ۶۷ ۔ ۲۷۴ ۔ ۲۷۷ ۔ ۲۸۳ ۔ ۲۸۴ ۔ ۲۸۷ ۔ ۲۸۸ ۔ ۴۴۳ ۔ ۴۴۵
رشید ۳۴۱ ۔ ۳۴۲
رضا ۱۱۹
رعایت خاں ۲۰۳
رموز العارفین (مثنوی) ۱۸۵
رند (سید محمد خاں) ۲۸۴ ۔ ۲۹۷ ۔

۲۹۸
رند (نواب مہربان خاں) ۱۴۹ ۔
۱۵۴ ۔ ۴۰۸ ۔ ۴۲۱
رنگین (دکھنی) ۱۱۹
رنگین (دہلوی) ۶۳ ۔ ۱۳۰ ۔ ۱۱۹
۲۲۳ ۔ ۲۲۸ ۔ ۲۳۰
۲۴۹ ۔ ۲۵۳ ۔ ۴۱۱
روپ سنگھار (مثنوی) ۱۲۰
روح افزا ۱۲۰
رودکی ۱۱۱
روضۃ السلام ۱۲۰
روضۃ الشہدا ۱۰۵ ۔ ۱۰۹ ۔
۱۱۰
ریاض ۴۱۹
ریاض الجنان ۱۲۰
ریختہ ۴۶
ریختی ۶۳ ۔ ۱۵۰ ۔ ۲۲۳ ۔ ۲۵۱

زار ۲۵۴
زانی ۲۲۵
زکی ۴۰۱ ۔ ۴۰۲

زہر عشق ۳۶۶
زیچ نامہ ۲۶۶
زین العابدین خاں (عارف) ۳۸۵
زینت المساجد ۱۳۲

ست گڑھ ۱۱۰
ساطع برہان ۳۹۰
ساقی (پنڈت جواہر ناتھ) ۴۰۳
سالار جنگ (پسر اسحاق خان
موتمن الدولہ) ۱۹۴
سالار جنگ (سر) ۹۸
سالک ۳۶۲ ۔ ۴۰۱ ۔ ۴۰۲ ۔
۴۰۳ ۔ ۴۰۴ ۔ ۴۱۲
سامی (عبدالقادر) ۱۱۷
سانبھر (قصبہ) ۱۹۲
سانٹ ۸۲ ۔ ۳۴۸
سائنس (رسالہ) ۴۶۱
سبرس ۱۰۱
سحر ۹۷ ۔ ۳۱۱ ۔ ۴۲۱
سحر البیان ۶۴ ۔ ۸۷ ۔ ۱۶۸ ۔
۲۱۰ ۔ ۳۰۰ ۔ ۳۲۱

سراج ۱۱۶ ۔ ۱۱۹
سراج الدین علی خاں (دیکھو آرزو)
سراج اللغات ۱۲۸
سرب سنگھ (دیوانہ) ۲۶۱
سرشار (پنڈت رتن ناتھ) ۴۲۲
سرمایۂ زبان اردو ۴۴۴
سرمۂ بصیرت ۴۲۵
سرور ۶۹
سرور جہان آبادی ۳۳۵ ۔
۴۹۷ تا ۵۰۱
سرور (میر محمد خاں دہلوی)
۴۰۲
سرور (رجب علی بیگ) ۱۷ ۔
۱۰۰ ۔ ۳۱۱ ۔ ۳۲۳ ۔
۴۱۲ ۔
سری رام (لالہ) ۲۵۵ ۔ ۳۸۰
سعادت علی خاں (نواب)
۱۵۴ ۔ ۲۲۶ ۔ ۲۵۵
۳۰۵ ۔ ۳۴۵
سعداللہ (شاہ ۔ گلشن) ۷۹ ۔
۱۱۳ ۔ ۱۲۲ ۔ ۱۴۳ ۔

۲۲۳
سعدی (شیخ) ۱۲۱ - ۱۴۰ -
۳۴۷ - ۳۶۴
سکندر عادل شاہ ۱۰۹
سکندر نامہ ۸۷ - ۳۲۷
سلطان جہان بیگم (والیہ بھوپال)
۴۱۳
سلطان عالم (دیکھو واجد علی شاہ)
سلطان محمد تغلق ۹۱
سلیمان خاں (نواب - اسد) ۴۱۳
سلیمان شکوہ ۲۲۴ - ۲۲۵ -
۲۳۹ - ۲۴۳ - ۲۴۶
۲۴۹ - ۲۵۰ - ۲۵۴ تا
۲۶۰ - ۴۱۱
سلیمان قلی خاں (وداد) ۱۵۲
سلیس ۳۳۸
سنجر (میر) ۱۰۴
سودا ۶۱ - ۶۳ - ۸۱ - ۸۶ -
۱۲۴ - ۱۲۵ - ۱۲۸ - ۱۳۰
۱۳۲ - ۱۳۶ - ۱۳۸
۱۳۸ - ۱۴۱ - ۱۵۱ تا
۱۶۶ - ۱۹۷ - ۲۰۴ - ۲۱۶ -
۲۱۷ - ۲۲۰ - ۲۴۵ -
۲۴۶ - ۲۵۴ - ۲۶۹ -
۳۰۳ - ۳۲۰ - ۳۴۹ -
۳۵۵ - ۳۵۷ - ۳۷۷ -
۴۰۹ - ۴۱۰ - ۴۴۱
سورج مل جاٹ ۱۹۲
سوز ۶۱ - ۱۴۱ - ۱۴۹ - ۱۵۱ -
۱۵۴ - ۲۰۱ - ۲۴۵ - ۳۰۳ -
۳۰۴ - ۴۰۹ - ۴۱۰
سوگا شتبق ۱۰۰
سُولیفٹ ۱۶۱
سہ نثر ظہوری ۱۰۴
سید احمد خاں (سر) ۲۷ - ۳۷
۴۰۵ - ۴۷۶ - ۴۷۸ -
۴۸۲
سید احمد (مولوی - مؤلف فرہنگ
آصفیہ) ۳۰۴ - ۴۵۵ -
۴۹۰
سیّد محمد (قادری) ۶۴
سیرام پور ۴۲
سیرت نبوی ۴۱۴
سینٹسبری (پروفیسر)
۴۰۰
سیوا ۱۰۹

شاداں (دیکھو چند ولال - راجہ)
شاگرد (دیکھو نظام الملک)
شاہ بہرام و بانوئے حسن ۱۰۸
شاہجہاں بادشاہ ۲۶ - ۵۴ - ۵۸ -
۹۹ - ۱۲۲
شاہجہاں بیگم (والیہ بھوپال)
۴۱۴
شاہ سلیمان ۱۳۶
شاہ عالم ۱۲۴ - ۱۳۵ - ۱۴۴ -
۱۴۹ - ۲۰۹ - ۲۲۵ -
۲۴۴ - ۲۵۴ - ۲۶۸
شاہ قلی خاں ۱۰۳
شاہنامہ ۸۷ - ۳۲۷
شبلی (مولانا) ۲۳ - ۴۷ - ۴۹۶
شبیہ عشرت ۲۹۰
شتاب رائے ۴۰۸

شجاع الدولہ ۱۵۳-۲۰۱-۲۷۰

شجاع الدین (دیکھو نوری)

شدید ۳۴۲،

شرافت ۱۱۹،

شرر (دہلوی) ۲۶۷،

شرر (مولوی عبد الحلیم) ۲۵۵

۴۶۸،

شرف (آغا حجو) ۲۹۷-۳۰۱،

شرف (عبد الرحیم خاں) ۲۱۳،

شرف الملک ۱۲۰،

شعاع مہر (مثنوی) ۲۹۰،

شعر الہند ۱۴۰-۲۸۲-۳۰۲،

شعلۂ عشق (مثنوی) ۲۰۹،

شعیر ۹۵،

شفائی ۱۴۰،

شفیق (اورنگ آبادی) ۲۲۵،

شفیق لچھمی نارائن ۱۱۱-۱۱۷،

شکرستان ۲۵۸،

شکسپیر ۴۷-۳۵۴،

شکوۂ ہند ۳۸۳،

شکیبا ۳۷۲

شمس الدین خاں ۳۰۲،

شمس الدین فیض ۴۵۸،

شمس ولی اللہ (دیکھو ولی)

شمشاد ۳۰۱،

شمع انجمن (تذکرہ) ۱۱۹،

شمع محفل (رسالہ) ۱۴۵،

شمع و پروانہ ۱۰۷،

شوق (قدرت اللہ) ۱۳۳

شوق (قدوائی) ۸۷

شوق (ظہیر احسن نیموی) ۲۳۶

شوق (نواب مرزا) ۸۷-۲۹۷،

شہباز (پروفیسر) ۱۶۶-۴۵۵

شہید (سید احمد بریلوی) ۲۷،

شہید (غلام امام) ۲۸۹،

شہید (مرزا محمد باقر) ۱۱۹

شیریں (دیکھو شاہجہان بیگم)

شیر و برنج (مثنوی) ۲۳۲

شیفتہ (نواب مصطفےٰ خاں) ۲۴۶

۲۴۳-۲۵۰-۲۹۶-۳۶۵

۳۶۷-۳۶۸-۳۷۹-۴۷۵

۴۷۷،

شبلی ۱۶۳-۲۱۵،

شیودہان سنگھ (راجہ الور)

۳۷۸-۴۰۱-۴۱۲

صابر ۳۴۰-۳۴۱،

صارم ۱۱۹،

صائب ۶۷-۱۴۱-۲۷۲-

۲۷۹،

صبا ۶۷-۲۸۹-۲۹۷

صبح امید ۴۹۴

صبر (مرثیہ گو) ۳۲۰-۳۴۰

صبر (رام پوری) ۴۵۱،

صدیق حسن خاں (نواب -

رئیس بھوپال) ۴۰۵-۴۱۴

صفیر (بلگرامی) ۱۴۰،

صنمخانۂ عشق ۴۱۹-۴۲۴-

۴۲۶-۴۴۰،

صہبائی (مولوی امام بخش)

۳۶۸-۳۶۹،

ضابطہ خاں ۱۹۳،

ضاحک (میر) ۱۶۰-۱۶۷-۳۲۰-
۳۲۵-۳۳۸-۴۱۱،
ضمیر ۲۴۵-۳۲۰-۳۲۱-
۳۲۲-۳۳۵،
ضیا- ۱۶-۱۱۹-۱۶۸-۲۶۴
ضیا بخشی ۹۹،

طالب ۹۵،
طالب آملی ۱۴۰-۳۱۹،
طالب (نواب سعید الدین احمد
خاں) ۴۰۴،
طاہر ۲۸۳،
طبعی ۹۵-۱۰۲،
طبقات الشعراء ۱۶۵-۲۱۳،
طلسم الفت (مثنوی) ۳۱۵-۳۶۶،
طوطارام شایاں ۲۷۰،
طوطی نامہ مولوی حیدر بخش ۱۰۰،
طوطی نامہ غواصی ۱۰۰،
طوطی ہند (دیکھو امیر خسرو)

ظفر (بہادر شاہ) ۴۹-۶۵-۲۵۶-
۲۵۷-۳۶۱-۳۶۲-
۳۷۴-۳۷۸-۴۱۱،
ظفر (ظفر بیگ) ۱۱۷،
ظہور الدین (دیکھو حاتم)
ظہوری ۵۹-۷۰-۱۰۱-۱۰۴-
۳۱۹،
ظہیر (دہلوی) ۳۶۲-۳۷۸ تا ۳۸۰-
۴۰۳-۴۱۲-۴۴۲،
ظہیر فاریابی ۸۶،

عاجز ۱۰۹-۱۱۷،
عارف (لکھنوی) ۳۳۸،
عاشق ۳۴۰،
عاصی (میر) ۳۲۰،
عاقل خاں رازی ۱۰۷،
عاقل خاں خوانی ۱۰۵،
عالم (نواب بادشاہ محل) ۴۰۷،
عالمگیر (دیکھو اورنگ زیب)
عالمگیر ثانی ۱۲۹-۱۹۳-۲۰۳،
عباس صفوی ۹۵،
عباس (مفتی میر) ۳۲۳،
عبدالاحد خاں ۱۹۳،
عبداللہ (میر) دیکھو علی متقی)
عبداللہ بیگ خاں (مرزا) ۳۸۱
عبداللہ قطب شاہ ۵۸-۹۹-
۱۰۰-۱۰۳،
عبدالجبار خاں (دیکھو آصفی ملکاپوری)
عبدالحق (مولوی خیر آبادی) ۴۱۶
عبدالحق (مولوی سیکرٹری انجمن
ترقی اردو) ۱۰۱-۴۵۹،
عبدالحق (مولوی مصنف تفسیر
حقانی) ۴۵۵،
عبدالحق (مہندس) ۴۱۶،
عبدالحی (دیکھو تاباں)
عبدالرحمٰن آسی ۳۶۹،
عبدالرحمٰن چشتی ۱۱۷،
عبدالرسول خاں ۱۱۷،
عبدالسلام ندوی (مولوی)
۱۴۰-۲۰۷،
عبدالعزیز (شاہ) ۴۰۵،
عبدالغفور (دیکھو نساخ)
عبدالواسع (ملا) ۱۲۳،

عبدالولی (عزلت) ۱۱۱ - ۱۱۹ ،
عبدالوہاب (افتخار) ۱۱۷ ،
عبرۃ الغافلین ۱۵۵ ،
عثمان علی خاں (میر - والی حیدرآباد)
۴۵۷ ،
عثمانیہ یونیورسٹی ۷۴ - ۴۵۷ -
۴۶۱ -
عراقی ۱۱۹ ،
عرش (گیاوی) ۴۵۱ - ۴۵۲ ،
عرفی ۸۶ - ۱۴۱ - ۱۷۵ ،
عزیز دکھنی ۱۱۹ ،
عزیز (شاگرد غالب) ۴۰۱ ،
عزیز لکھنوی ۴۶۸ - ۵۰۲ ،
عزیز اللہ (میر) ۳۳۸ ،
عسکری (میر - رئیس) ۲۷۳ ،
عسکری مرزا (موتب) ۳۴۰ -
۳۴۳ ،
عشق (حسین مرزا) ۳۴۰ ،
عطارد (شاعر) ۳۱۱ ،
عطیہ کبریٰ ۱۲۹ ،
عظمت اللہ (مولوی) ۴۶۸ ،

عظیم ۳۷۲ ،
عظیم آباد ۴۰۸ ،
عظیم بیگ (مرزا) ۲۲۶ ،
عظیم الدین خاں (جنرل) ۴۲۵
علاؤالدین خلجی ۹۱ ،
علاء الدین خاں علوی ۴۰۱ ،
علم الکتاب ۱۴۵ ،
علی ابراہیم (نواب) ۱۱۲ ،
علوی (عبداللہ خاں) ۳۶۷
علی حیدر طباطبائی ۴۶۸ ،
علی عادل شاہ ۵۹ - ۱۰۴ - ۱۰۶ -
۱۰۷ - ۱۰۸ ،
علی متقی ۱۸۹ - ۱۹۸ ،
علی نامہ ۵۹ - ۱۰۶ ،
عنایت علی بیگ (ماہ) ۲۸۹ ،
عندلیب (خواجہ ناصر) ۱۴۲ ،
عود ہندی ۱۷ - ۳۸۸ ،
عید قیصریہ ۲۹۰ ،
عیسائی (پادری) ۷۳ ،
عیش (حکیم آغا جان) ۳۶۷ -
۳۹۳ - ۳۹۱ ،

عیش لکھنوی ۴۰۷ ،
عیشی ۲۴۵ - ۴۱۰ ،
عین الدین (شیخ - گنج العلم) ۹۴ ،

غازی الدین حیدر ۲۵۵ -
۲۷۷ - ۳۰۶ - ۳۱۶ ،
غالب (مرزا) ۴۴ - ۴۶ -
۶۵ - ۷۱ - ۷۹ - ۱۳۹ -
۱۶۲ - ۱۶۳ - ۲۵۶ -
۲۷۳ - ۲۸۹ - ۲۹۷ -
۳۶۱ - ۳۶۲ - ۳۶۳ -
۳۶۷ - ۳۷۰ - ۳۸۰ تا
۴۰۰ - ۴۰۱ - ۴۰۳ -
۴۰۴ - ۴۱۵ - ۴۱۸ -
۴۳۷ - ۴۷۷ - ۴۹۸ ،
غالب علی خاں (سید) ۲۵۶ ،
غرائب اللغات ۱۲۳ - ۱۲۸ ،
غریب (شاہ برہان الدین دولت
آبادی) ۱۱۶ ،
غریب (شاہ - دہلوی) ۳۵۷ ،
غزالہ و ماہ پیکر (مثنوی) ۳۰۸ ،

غزالی ۳۱۹ ،
غزل ۵۰-۶۱-۶۵-۸۰-۸۲ ،
غلام رسول (حافظ)
غلام علی (آزاد) ۱۱۷ ،
غلام مصطفےٰ (دیکھو یکرنگ)
غنچۂ آرزو ۳۰۱ ،
غواصی ۹۵-۱۰۰ ،
غیاث الدین بلبن ۴۷ ،

فاخر مکین ۱۵۴-۱۶۰-۲۶۵-۴۱۱ ،
فارسی ۳۷-۴۰-۴۱-۴۹
فارغ ۱۳۰ ،
فائز ۹۵ ،
فائق ۲۳۸ ،
فتح علی ۱۲۷ ،
فتوت ۱۱۱ ،
فخر ۱۱۹ ،
فخرد (مرزا) ۴۳۰ ،
فخری ۱۲۲ ،
فدوی لاہوری ۱۶۰-۲۶۷-۲۶۹ ،
فراق ۶۲-۱۲۲-۱۴۸-۲۶۲-۲۶۳ ،
فراقی ۱۲۲ ،
فرائد (رسالہ) ۱۲۰ ،
فرخ آباد ۱۵۴-۴۰۸ ،
فرخ سیر ۱۲۸-۱۸۶ ،
فرد ۵۲ ،
فردوسی ۲۳۴ ،
فرسنامہ ۲۵۱ ،
فرنچ ۱۴ ،
فرنگی محل ۲۷۵ ،
فرہاد ۳۴۲ ،
فرہنگ آصفیہ ۴۵۵ ،
فریاد داغ ۱۴۳-۴۳۳-۴۵۱ ،
فرید الدین عطار ۱۱۰ ،
فریڈرک اعظم (بادشاہ جرمنی) ۲۱۶ ،
فسانۂ عجائب ۸۰-۳۲۳ ،
فصاحت ۳۱۴ ،
فصیح ۳۲۱-۳۳۷ ،
فضل حق (مولوی - خیرآبادی) ۳۹۴-۴۱۵-۴۱۷ ،
فضلی ۱۱۴ ،
فطرت ۱۱۷-۱۲۲ ،
فغان ۱۳۷-۱۳۸-۲۴۵-۴۰۸-۴۱۱ ،
فغانی ۱۴۱ ،
فقیر (میر شمس الدین) ۱۲۲-۱۲۴-۲۵۸ ،
فورٹ ولیم ۶۹-۱۰۰-۳۰۸ ،
فولاد خاں (شیدی - کوتوال دہلی) ۱۶۰ ،
فیروز ۱۵۰ ،
فیروز جنگ (نواب) ۱۳۳ ،
فیلن (ڈاکٹر) ۱۳۶ ،
فیض آباد ۱۵۴-۱۶۷-۱۸۵-۲۶۰-۳۲۵-۴۱۰ ،
فیض علی ۱۹۲ ،
فیض میر ۲۰۸ ،
فیضی ۵۷-۱۰۹-۱۲۱-۳۹۰ ،

قاآنی ۸۶ ،
قادر ۱۱۹-۳۲۰ ،

قادری (دیکھو خاکی)

قادر (شمس اللہ) ۱۰۴-۱۰۵-۱۰۶-
۱۰۷-۱۰۸،

قاسم ۲۵۷-۳۷۲،

قاطع برہان ۳۹۰،

قانون اسلام ۱۰۹،

قائم ۶۱-۱۲۴-۱۴۸-۲۵۷-
۲۵۸-۳۵۷-۴۰۹-
۴۱۱،

قبول ۱۲۲،

قتیل (مرزا) ۱۶۵-۱۶۹-۲۳۶-
۲۵۵-۲۸۲-۳۶۰-
۴۱۰،

قدر دکھنی ۱۱۹،

قدر بلگرامی ۴۵۵،

قدرت ۶۱-۲۶۱-۴۰۹،

قدرت اللہ خاں (بقا) ۱۶۶،

قدرت اللہ خاں (قاسم) ۲۱۴،

قربان (دیکھو سالک)

قربیہ (رسالہ) ۱۰۸،

قصۂ رضوان شاہ (آگاہ) ۱۲۰،

قصۂ رضوان شاہ و روح افزا
(فائز) ۱۰۳،

قصۂ فیروز شاہ ۱۰۹،

قصۂ لال و گوہر ۲۰۹،

قصۂ منوہر و مدمالت ۶۵

قصیدہ ۵۰-۵۱-۵۲-۶۱-۶۵-۸۰-
۸۶،

قطبی ۹۵-۱۰۲،

قطعہ ۵۰-۸۰-۸۸،

قلق ۸۷-۳۱۱-۳۱۴-۳۴۰-
۴۱۸،

قلی قطب شاہ ۵۸-۹۵-۹۶-
۹۷-۹۸-۱۱۰،

قمرالدین (منت) ۱۹۹-۲۵۷-
۲۵۸-۲۵۹-۳۷۲،

قیصر باغ ۳۰۷،

کاظم ۱۱۹

کاظم حسین (بیقرار) ۳۷۲

کاظم علی (قطب شاہی) ۱۰۹

کامروپ کلا ۱۰۱،

کبیر ۵۷،

کپورتھلہ ۳۶۴،

کرناٹک ۱۰۵،

کریم الدین (منشی) ۲۵۰-۳۶۵-
۴۹۰،

کشن پرشاد (مہاراجہ سر)
۳۷۹-۴۲۲-۴۵۸-
۴۵۹-۴۸۴،

کلب علی خاں (سابق نواب
رام پور) ۲۵۴-۲۸۴-
۳۱۲-۳۳۹-۴۱۷ تا
۴۱۹-۴۲۱-۴۲۵-
۴۳۱-۴۴۴-۴۴۹،

کلیم (ایرانی) ۱۴۰-۳۱۹،

کلیم (میر محمد حسین) ۱۳۸،

کمہیر (قصبہ) ۱۰۲،

کیٹس ۱۶۳،

گارسن ڈیٹاسی ۱۰۲-۱۰۳-
۱۰۷-۱۱۲-۱۱۴-۱۳۲-
۱۴۷-۱۸۴-۲۵۰،

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

گدا ۳۳۷،

گردھاری پرشاد (باقی) ۱۳۴-۵۷۴،

گلاب چند (ہمدم) ۴۱۰،

گل رعنا (تذکرہ) ۱۰۴-۱۰۷-۱۱۴-۱۱۹-۱۲۲-۱۳۳-۳۷۳،

گلزار ابراہیم ۱۰۴،

گلزار ارم (مثنوی) ۱۸۴،

گلزار داغ ۴۰۴،

گلزار عشق ۱۲۰،

گلزار نسیم ۷۸،

گلشن (دیکھو سعد اللہ)

گلشن بیخار (تذکرہ) ۱۴۲-۱۶۶-۳۲۷-۳۶۶-۳۶۷،

گلشن ہند ۱۰۲-۱۰۴-۱۱۴-۱۳۶-۲۱۴،

گلکرسٹ (ڈاکٹر جان) ۶۴-۶۹-۷۰،

گل و ہرمز ۱۱۰،

گمان ۳۲۰،

گنگو (برہمن) ۹۲-۹۳،

گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب ۴۰۸،

گولکنڈہ ۹۱-۹۴-۹۵-۹۸-۹۹-۱۰۲-۱۰۹،

گوہر انتخاب ۴۱۹،

گویا (فقیر محمد خاں) ۲۸۶،

گوئٹے ۵۵-۴۰۰،

گیسو دراز (خواجہ سیّد) ۹۴

لاطینی (زبان) ۴۰-۴۵،

لائل (سر چارلس) ۷۷-۱۰۰-۱۰۳-۱۰۷-۳۴۶،

لطافت ۴۱۳،

لطف (مرزا علی) ۷۰-۱۱۲-۱۲۷-۱۴۸-۱۴۹-۱۵۱-۱۶۷-۲۱۳-۲۵۸-۲۶۱-۲۶۳،

لکھنؤ ۶۴-۸۳-۱۲۸-۱۴۱-۱۵۴-۱۸۵-۱۹۳-۲۲۶-۲۳۹-۲۵۸-۲۶۷-۲۶۸-۲۷۰-۲۷۴-۳۰۳-۳۵۷-۴۰۸-۴۱۰-۴۱۱،

مارکوئیس آف ہیسٹنگز ۲۵۸،

ماہ پیکر (مثنوی) ۱۰۲،

مالیر کوٹلہ ۴۱۲،

مائل (ڈاکٹر-حیدر آبادی) ۴۳۲،

متوازن ۵۲،

متوازی ۵۲،

متھرا ۳۶،

مٹیا برج ۳۰۱-۳۰۸-۳۲۴-۴۰۶،

مثلث ۶۲-۱۴۱،

مثنوی ۵۱-۸۰-۸۷،

مثنوی میر حسن (دیکھو سحر البیان)

مجالس رنگین ۲۵۱،

مجروح ۳۶۲-۴۰۱-۴۰۲-۴۱۲،

مجمع النفائس ۱۲۹،

محب ۴۱۰،

محبت خاں (نواب) ۳۳۹-

۲۶۱،
محبوب عالم (حرم واجد علی شاہ) ۴۰۷،
محبوب علی خاں (میر۔ سابق نظام دکن) ۴۳۱-۴۳۸-۴۴۴-۴۵۴-۴۵۷،
محرم ۱۱۹،
محسن (خلف میر حسن) ۳۲۱-۳۲۸،
محسن (کاکوروی) ۳۴۳،
محسن الدولہ (نواب۔ لکھنوی) ۳۰۱،
محسن الملک (نواب) ۳۷،
محمد افضل ۱۱۱،
محمد باسط ۱۹۱،
محمد رضی ۹۱-۱۹۲،
محمد شاہ ۱۱۳-۱۲۲-۱۳۱-۱۳۵-۱۸۵-۲۳۹-۴۰۹،
محمد علیخاں (نواب ٹونک) ۲۷۹،
محمد علی شاہ (بادشاہ اودھ) ۳۰۷،
محمد غوث (مولانا) ۱۲۰،
محمد غوث (گوالیاری) ۱۲۶-۱۲۸،
محمد قطب شاہ ۹۸-۹۹،
محمد یار خاں (نواب) ۲۴۳،
محمدی محل ۹۸،
محمود ۱۳۰،
محمود خاں (حکیم) ۴۸۳،
مخمس ۵۱-۶۲،
مدّ و جزرِ اسلام (دیکھو حالی)
مراۃ الجنان ۱۱۰،
مراۃ الغیب ۴۲۳-۴۲۶-۴۳۹،
مربّع ۵۱-۶۲،
مرثیہ ۶۲-۶۷-۸۰-۸۸-۳۱۸-۳۴۲،
مرجز ۱۲۶،
مرزا ۹۵،
مرزا حاجی ۹۳،
مرشد آباد ۳۲۳-۴۰۸-۴۰۹،
مرہٹی زبان ۴۲-۹۰-۹۵،
مستزاد ۵۱-۶۲،
مسجّع ۵۲،
مسدّس ۵۱-۸۹-۴۶۹،
مسدّس حالی (دیکھو حالی)
مشّاق ۳۷۵،
مشاعرہ ۸۸،
مصحفی ۶۲-۶۵-۱۲۷-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۳-۱۳۸-۱۴۳-۱۴۸-۱۵۰-۱۵۸-۱۶۷-۱۶۹-۱۹۵-۲۱۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۴-۲۲۶-۲۴۲-۲۴۹-۲۵۰-۲۵۵-۲۵۷-۲۶۳-۲۷۳-۲۷۵-۲۷۹-۲۹۳-۴۰۹-۴۱۱-۴۸۶،
مضطر خیر آبادی ۴۱۲،
مضمون (شیخ شرف الدین) ۸۱-۱۲۳-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۱-۱۳۶-۲۰۲،
مضمون اقدس (مثنوی) ۲۵۴،
مطبع منشی نولکشور ۴۴۹،
مطرف ۵۲،
مظہر (مرزا۔ جانجاناں) ۶۱-۸۱-۱۲۳-۱۲۵-۱۲۶-۱۲۷-۱۲۸-۱۳۰-۱۳۲ تا ۱۳۴-۱۳۶-۲۲۳-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۷،

منظر عشق (دیوان قلق) ۳۱۵،
معاملہ بندی ۹۳،
معاملات عشق (مثنوی) ۲۰۹،
معانی (دیکھو قطب شاہ)
معراج نامہ ۱۰۷،
معروف (نواب الٰہی بخش خاں)
۳۷۲،
معیار (انجمن لکھنؤ) ۴۱۹
مفید الشعراء (رسالہ) ۴۴۵،
مقبل (ملا) ۳۱۹،
مقدمہ شعر و شاعری ۴۸۵،
مکند راؤ مرہٹہ ۹۵،
مکہ مسجد ۹۸،
مکھن (شاہ) ۱۲۷،
ملک شاہ ۱۰۱،
ملک محمد جائسی ۵۷،
ملکۂ مصر (قصہ) ۱۱۹،
ممنون (میر) ۲۵۴-۲۵۶-
۲۵۷-۲۵۹،
مناجات بیوہ ۳۸۴،
مناظرہ رحم و انصاف ۴۷۸-
۴۷۹،
من پھول (پنڈت) ۴۸۹،
منتخب دیوانہا ۱۲۶،
منتخبات عالم ۴۸۲،
منتخب القواعد ۴۴۵،
منروا ۵۵،
منصور (شیخ) ۱۰۶،
منگرول ۴۱۳،
من لگی ۱۰۹،
منیر شکوہ آبادی ۲۸۳-۲۸۷-
۲۸۹-۲۹۰-۲۹۱-
۴۱۷،
مومن دہلوی ۴۴-۸۷-۲۷۳-
۳۴۵-۳۶۲-۳۶۶-
۳۹۹-۴۱۵-۴۱۸،
مومن دکھنی ۹۵،
مونس ۳۳۸،
موہبت عظمیٰ ۱۲۹،
مؤید البرہان ۳۹۰،
مہابھارت ۳۲۷،
مہا نرائن (دیوان) ۱۹۲،
مہتاب داغ ۴۳۳،
مہدی ۱۱۹،
مہدی (حکیم) ۲۷۷،
مہر دکنی ۱۱۹،
مہر (عبداللہ خاں) ۳۷۰،
مہر (مرزا حاتم علی بیگ)
۲۸۳-۲۸۹،
مہر نیمروز ۳۸۸،
میراں جی (شاہ) ۹۴،
میر تقی ۴۶-۶۱-۶۲-
۶۳-۸۱-۸۷-۱۱۷-
۱۲۴-۱۲۵-۱۲۷-۱۲۸-
۱۳۰-۱۳۱-۱۳۲-۱۳۵-
۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۱۴۱-
۱۴۲-۱۸۹ تا ۲۲۰-
۲۴۰-۲۴۲-۲۴۵-
۲۴۶-۲۵۴-۲۶۳-
۲۶۷-۳۰۳-۳۲۰-
۳۵۴-۴۳۷-۴۳۸،
میرٹھ ۳۷-۴۰۳،
میر حسن ۶۲-۶۴-۸۷-

۱۰۱-۱۰۳-۱۱۱-۱۱۲-
۱۱۷-۱۲۱-۱۲۴-۱۲۷-
۱۳۱-۱۳۲-۱۳۸-۱۳۹-
۱۴۰-۱۴۱-۱۴۸-۱۵۴-
۱۵۸، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۹۰-
۲۴۰-۲۵۵-۲۶۱-
۲۶۳-۲۶۴-۲۶۶-
۲۶۹-۳۲۰-۳۲۱-
۳۲۶-۳۲۷-۳۳۸-
۴۱۰،
میلی ۳۱۹،
مینا (شاہ) ۴۲۰،

ناجی ۱۲۳-۱۲۴-۱۲۵-۱۲۹-
۱۳۰-۱۳۵،
نادر شاہ ۱۲۸-۱۹۱-۱۹۶-۲۰۰-
۲۶۸،
نادر کاکوروی ۸۶-۸۷-۵۲۷،
نادر لکھنوی ۲۸۳،
ناسخ ۶۶-۶۷-۶۹-۱۲۶-
۱۳۰-۱۳۹-۱۶۲-
۱۹۶-۲۴۶-۲۷۱-
۲۷۳-۲۷۴-۲۷۴ تا ۲۸۳-
۲۹۱-۲۹۲-۲۹۶-
۳۰۲-۳۰۴-۳۲۵-
۳۴۰-۳۵۷-۴۱۸-
۴۲۶-۴۳۹-۴۵۷،
ناصر علی ۱۴۰-۲۴۲،
ناصری (پروفیسر) ۳۴۲،
ناظم (دیکھو یوسف علیخاں نواب
رامپور)
ناظم ۳۴۲،
ناگرمل (مہاراجہ) ۱۹۳-۲۰۲،
نالۂ درد ۱۴۵،
نالۂ عندلیب ۱۴۳،
نامۂ غالب ۳۹۰،
نثار (محمد امان) ۱۳۰-۲۵۰،
نثار احمد خاں (تائب- حافظ)
۴۴۸،
نثر ۴۳-۴۴-۴۶-۵۲،
نثر بے نظیر ۴۵،
نجم ۱۱۹،
نجم الدین (دیکھو آبرو)
ندیم (علی قلی خاں) ۱۲۲-۱۳۸،
نذیر احمد (مولانا) ۷۳،
نساخ (مولوی عبد الغفور) ۱۵۰-
۲۵۱-۲۶۱-۲۹۶-۴۰۷،
نسیم بھرت پوری ۴۳۸،
نسیم دہلوی ۳۶۶-۳۶۹-
۳۷۰-۴۴۸،
نسیم (دیا شنکر) ۸۷-۲۹۷-
۲۹۹-۳۰۰،
نشاط امید (نظم) ۴۷۸،
نشتر (کاکوروی) ۲۸۷،
نصرتی ۵۹-۱۰۱-۱۰۵-
۱۰۶-۱۰۷،
نصیر (شاہ) ۶۴-۲۵۴-۲۵۶-
۳۵۹ تا ۳۶۰-۳۶۳-
۳۶۷-۳۷۲-۴۰۹-
۴۳۲-۴۵۷-۴۸۶،
نصیر الدین حیدر (بادشاہ) ۲۵۵-
۳۰۶ تا ۳۰۷،
نصیر الدین ہاشمی ۱۱۰-۱۱۹،

نمبروں سے مراد صفحات ہیں

نظام الملک (آصف جاہ) ۴۵۳-
۴۵۴ ،
نظامی ۳۲۷ ،
نظم ۴۴-۴۹ ،
نظم آزاد ۱۹۴ ،
نظم طباطبائی ۴۰۷ ،
نظم گرامی ۲۸۷ ،
نظم مبارک ۲۸۷ ،
نظیر اکبر آبادی ۶۵-۳۴۲-۳۴۴-۳۵۶-
۴۶۴-۴۶۵ ،
نظیری ۴۷-۱۴۱-۲۴۳-۳۹۰ ،
نفس اللغۃ (دیکھو نظم گرامی)
نفیس ۳۳۸ ،
نکات الشعراء ۱۱۱-۱۱۷-
۱۲۹-۱۴۲-۱۶۵-۱۹۶-
۱۹۹-۲۰۱-۲۰۵ -
۲۰۸-۲۱۰-۳۲۰ ،
نکتہ (مرزا علی خاں) ۱۳۷ ،
نند رائے (بخشی) ۳۴۳ ،
نواب (دیکھو نواب صدیق حسن
خاں)
نواب (دیکھو کلب علی خاں)

نوادر الالفاظ ۱۲۳-۱۲۸ ،
نوازش علی خاں ۱۶۷ ،
نوازش علی (مولوی) ۴۷۴ ،
نور الدین نوید ۲۵۸ ،
نور المعرفت (رسالہ) ۱۱۴ ،
نورس ۱۰۴ ،
نورسپور ۱۰۵ ،
نوطرز مرصع ۷۰ ،
نول رائے (راجہ) ۳۰۴ ،
نوری (سید شجاع الدین) ۹۵-
۱۰۳-۱۰۸-۱۲۱ ،
نیر (نواب ضیاء الدین احمد خاں)
۴۰۱-۴۰۳ ،

واجد علی شاہ اختر ۶۸-۲۷۳-
۳۰۱-۳۰۳-۳۰۷-
۳۱۳-۳۱۵-۳۱۶-
۳۲۴-۳۴۱-۴۱۱ ،
واردات درد ۱۴۵ ،
واسوخت ۵۱-۶۲-۹۷-
۱۴۱ ،
واسوخت امانت ۳۱۵ ،
واقعات درد (رسالہ) ۱۴۵ ،
والیٹر ۱۶۱
وجدی ۱۰۰ ،
وجدیہ ۱۰۸ ،
وجہی ۱۰۱ ،
وجیہ الدین ۱۱۳ ،
وجیہ الدین خاں ۱۹۳-۳۲۱ ،
وحشت (میر غلام علی) ۳۶۶ ،
وحشی ۱۴۱ ،
وحید (غلام حسین) ۳۶۷ ،
وحید (میر) ۳۳۸ ،
وداد (سلیمان قلی خاں) ۱۲۴ ،
ورجل ۳۲۶ ،
ورڈسورتھ ۸۴-۱۴۲-۳۲۴ ،
وزیر (خواجہ) ۶۷-۲۸۳-۲۸۶ ،
وزیر علیخاں (وزیری) ۲۷۹-۲۸۰ ،
وفا (دیکھو رند)
ولا (مظہر علی) ۷۰ ،
ولی دکھنی ۵۹-۶۱-۸۱-۱۱۰-
۱۱۶-۱۱۸-۱۲۲-۱۲۳-

نمبروں سے مراد صفحات ہیں

۱۲۶-۱۲۹-۱۳۰-۱۳۵-
۱۹۹،
ولی (سید محمد فیاض) ۱۱۰،
ویاس ۳۲۷،
ویلور ۱۱۰،

ہاشم علی برہان پوری ۱۰۹،
ہاشمی ۹۴-۱۰۷-۱۰۸-۲۵۱،
ہالرائڈ (کرنل) ۴۸۷-۴۹۰،
ہجو ۶۲،
ہدایت ۹۹-۱۴۸-۲۶۳،
ہرمز (پارسی) ۳۸۲،
ہیسٹنگز (لارڈ) ۳۰۶،
ہشت بہشت ۱۲۰،
ہفت پیکر نظامی ۱۰۲،

ہلال ۳۱۱،
ہمدم ۱۱۹،
ہمدم آخرت ۲۹۰،
ہندی ۴۶،
ہنر ۳۱۱،
ہنر (منظفر علی)
ہومر ۳۲۶،
ہیٹر ۸۶،
ہیں (شاہ جرمنی) ۴۰۰،

یادگار داغ ۳۳۴،
یادگار غالب ۴۶۷،
یار ۱۱۹،
یاس (میرزا ذاکر حسین) ۴۴۷،
یحییٰ خاں (دیکھو آصف الدولہ)

یقسمن (انعام اللہ خاں)
۹۱-۱۳۵،
یکرنگ ۱۲۴-۱۳۰-
۱۳۵-۱۳۶-
۱۳۷،
یوسف (شیخ دہلوی) ۱۰۲،
یوسف زلیخا ۱۰۵-۱۰۷-
۱۰۹،
یوسف عادل شاہ ۹۵-
۱۰۴،
یوسف علی ۱۱۴،
یوسف علیخاں (نواب رام پور)
۳۱۲-۳۱۵-۳۶۹-۳۸۴-
۴۰۵-۴۱۵-۴۱۸-۴۲۱-۴۳۰-۴۳۴
یول (مسٹر) ۴۶،

نمبروں سے مراد صفحات ہیں

فہرست مضامین

حصۂ نثر

مضمون	صفحہ
باب ۱۵	
نثر اردو کی ابتدا اور ترقی	
نثر اردو کی تعویق آغاز کے اسباب	۳
زبان دکھنی میں قدیم اردو نثر کی تصانیف	۴
دہ مجلس فضلی مصنفہ ۱۷۳۲ء	۵
نوطرز مرصع ترجمۂ قصۂ چہار درویش مصنفہ ۱۷۹۸ء	۶
فورٹ ولیم کالج سے نثر اردو کے تعلق کے اسباب	۷
ڈاکٹر جان گلکرسٹ ۱۷۵۹ء لغایت ۱۸۴۳ء	۸
میر امّن دہلوی	۱۰
میر شیر علی افسوس	۱۱
میر بہادر علی حسینی	۱۳
سیّد حیدر بخش حیدری	۱۴
مرزا کاظم علی جوان	۱۶
نہال چند لاہوری	۱۷
مظہر علی خاں ولا	״
حفیظ الدین احمد	۱۸
مولوی اکرام علی	۱۹
للّو لال جی	۲۰
بینی نراین	״
مرزا علی لطف	۲۱

مضمون	صفحہ
مولوی امانت اللہ	۲۱
اس عہد کے دیگر منشی اور نثار	۲۲
تراجم قرآن شریف از مولانا شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز و شاہ عبدالقادر و شاہ رفیع الدین	۲۲
مولوی محمد اسماعیل دہلوی	۲۳
ترتیب صرف و نحو و لغات اُردو	۲۴
ہندوستانیوں کی مرتب کردہ لغات اور دیگر کتب	۲۶
عیسائی پادریوں کے کارنامے زبان اُردو کی توسیع اور ترقی میں	۲۷

باب ۱۶

نثر اُردو کا دَورِ متوسط اور دَورِ جدید

مضمون	صفحہ
مطبوعات لکھنؤ	۲۸
فقیر محمد خاں گویا بستان حکمت ۱۲۵۱ھ	"
مرزا رجب علی بیگ سرور متوفی ۱۲۸۶ھ	۲۹
فسانۂ عجائب	۳۲
سُرور کی دیگر تصانیف	۳۶
الف لیلیٰ کے ترجمے	۳۷
اُردو نثاروں میں سرور کا مرتبہ	۳۸
غالب بحیثیت نثّار	"
اُردوئے معلّیٰ اور عود ہندی	۳۹
نمونۂ نثر مرزا غالب	۴۱
مرزا کا قدیم رنگ یعنی مقفّیٰ اور مسجّع عبارت	۴۴
کتب و رسائل اسلامی سے اُردو کو تقویت	۴۵
چھاپہ کی ابتداء	۴۷
رسائل و جرائد و اخبارات	۴۹
سرسیّد احمد خاں	۵۰
سیّد صاحب کا طرزِ تحریر	۵۵
سیّد صاحب کے رفقائے کار	۵۶
نواب محسن الملک ۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۷ء	"
نواب وقار الملک ۱۸۳۹ء تا ۱۹۱۷ء	۵۸
مولوی چراغ علی ۱۸۴۴ء تا ۱۸۹۵ء	۵۹

مضمون	صفحہ
مولوی محمد حسین آزاد	۶۰
تصانیف	۶۳
ریڈریں اور اسکولی کتابیں	״
آبحیات	۶۴
نیرنگ خیال	۶۵
سخندان فارس	۶۶
قند پارسی اور نصیحت کا کرن پھول	״
دیوان ذوق	״
دربار اکبری	۶۷
دیگر تصانیف	״
آزاد کا مرتبہ اُردو نثاروں میں	״
حالی	۶۹
ابتدائی تصانیف	״
حیات سعدی	״
مقدمۂ شعر و شاعری	״
یادگار غالب	۷۰
حیاتِ جاوید	۷۱
مضامین حالی	״
طرز تحریر	۷۲

مضمون	صفحہ
مولانا نذیر احمد	۷۲
تصانیف	۷۴
کتب مناظرہ و متعلق مذہب	۷۵
اخلاقی ناول	۷۶
لیکچر و تقریریں	۷۷
بحیثیت شاعر کے	۷۸
اخلاق و عادات	״
طرز تحریر	۷۹
مولوی ذکاء اللہ	״
تصانیف	۸۰
مولوی سید احمد دہلوی	۸۱
فرہنگ آصفیہ	۸۳
شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء	
تعلیم اور ابتدائی مشاغل	״
قیام علی گڈھ	۸۶
ابتدائی تصانیف	״
قیام حیدر آباد	۸۷
ندوۃ العلماء	۸۸
دار المصنفین اعظم گڈھ	۹۲

مضمون	صفحہ
قابلیت اور خدمات کا	
اعتراف	۹۲
اخلاق و عادات	″
تصانیف	″
مولانا بحیثیت مورخ کے	۹۳
مولانا بحیثیت ناقد کے	″
طرز تحریر	″
سید سلیمان ندوی	۹۵
مولوی عبدالسلام ندوی	۹۶
مولوی عبدالماجد دریا آبادی	۹۷
جدید علوم کی ترویج دلی کالج کا قیام	۹۸
پروفیسر رامچندر	۱۰۱
مولوی امام بخش صہبائی	۱۰۲
مولوی غلام امام شہید	″
منشی غلام غوث بیخبر	۱۰۳
شمس العلماء سید علی بلگرامی	۱۰۴
سید حسین بلگرامی	″
مولوی عزیز مرزا	۱۰۵
مولوی عبدالحق سیکرٹری انجمن	

مضمون	صفحہ
ترقی اردو	۱۰۶
مولوی وحیدالدین سلیم	۱۰۸
شیخ عبدالقادر بی-اے	۱۱۰
پنڈت منوہر لال زتشی	۱۱۱
منشی دیا نرائن نگم	۱۱۲
لالہ سری رام دہلوی ایم-اے	۱۱۳
تذکرۂ ہزار داستان المعروف بہ خمخانۂ جاوید	۱۱۴
دیگر نثاران اردو	۱۱۶
جدید نثر اردو کے دو طرز	۱۱۹
پہلا طرز عربی اردو اور اس کے مقابلے میں بھاشا آمیز اردو	″
دوسرا طرز خیالی یعنی ٹیگوری اردو	۱۲۰
پرانی اخباری دنیا	۱۲۱
ادبی اردو رسالے	۱۲۳

باب ۱۷

اردو ناول کی ابتداء

مضمون	صفحہ
شرر اور سرشار کا زمانہ	
اُردو کے پرانے قصے	۱۲۵
اقسام قصص	۱۲۶
مطبع منشی نولکشور	״
داستان امیر حمزہ صاحبقران	۱۲۷
بوستان خیال	״
افسانہ اور ناول کی بیچ کی کڑی	۱۲۸
اودھ پنچ اور اس کی ادبی خدمات	۱۲۹
منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ	۱۳۲
مرزا مچھو بیگ عاشق	۱۳۳
ترکھون ناتھ ہجر	۱۳۵
نواب سید محمد آزاد	״
جوالا پرشاد برق	״
احمد علی شوق	۱۳۶
پنڈت رتن ناتھ سرشار	״
عام عادات و اخلاق	۱۳۹
تصانیف	۱۴۰
فسانۂ آزاد	״
سرشار کی مرقع نگاری	۱۴۲
سرشار کی شوخی اور ظرافت	۱۴۴

مضمون	صفحہ
سرشار کی کیرکٹر نگاری	۱۴۵
خوجی	۱۴۶
سرشار نے اپنے ناولوں سے اُن نیچرل چیزوں کو خارج کر دیا	۱۴۷
نقائص کلام	۱۴۸
سرشار بحیثیت ایک صاحبِ طرز کے	۱۴۹
سرشار اور سرور کا مقابلہ	۱۵۰
مولوی عبدالحلیم شرر	۱۵۶
اُن کی زندگی کے خود نوشتہ حالات	
مرزا محمد ہادی رسوا	۱۶۸
حکیم محمد علی	۱۶۹
راشد الخیری	״
نیاز فتحپوری	۱۷۰
طرز تحریر	״
خواجہ حسن نظامی	۱۷۱
پریم چند	״
سدرشن	۱۷۳
دیگر ناول نویس	۱۷۴

باب ۱۸

اُردو ڈراما

مضمون	صفحہ
اُردو ڈراما	۱۷۵
ڈراما کی عمومیت	″
سنسکرت اور ہندی ڈراما نے اُردو پر کیوں اثر نہیں کیا	۱۷۶
اُردو ڈراما کے عناصر خمسہ	۱۷۷
سنسکرت ڈراما	۱۷۸
ہندو مریکل پلے	″
سوانگ و نقلیں وغیرہ	۱۷۹
اسلامی نظمیں اور روایات	۱۸۰
انگریزی اسٹیج	″
اُردو ڈراما کے اقسام	″
اُردو ڈراما پر شاہی درباروں کا اثر	۱۸۱
اندر سبھا امانت	۱۸۲
اُردو ڈراما اور پارسی	۱۸۴
اوریجنل تھیٹریکل کمپنی	۱۸۵
وکٹوریہ ناٹک کمپنی	۱۸۵
طالب بنارسی	″
الفریڈ تھیٹریکل کمپنی	۱۸۶
احسن لکھنوی	″
بیتاب دہلوی	۱۸۷
نیو الفریڈ کمپنی	۱۸۸
آغا حشر کاشمیری	″
دوسری کمپنیاں	۱۹۰
آخر انیسویں صدی کے مشہور ڈراما نویس	″
شروع بیسویں کے بعض ڈرامانویس	″
ادبی۔ سیاسی اور سوشل ڈرامے	۱۹۲
اُردو ڈراما کی ترقی میں مختلف لوگوں نے کیا حصہ لیا۔	۱۹۴
ابتدائی ڈراموں کے نقائص	۱۹۵
موجودہ ڈراموں میں اصلاح و ترقی	۱۹۷
آئندہ اصلاح و ترقی کی ضرورت	۱۹۸
اُردو ڈراما کا مستقبل	۲۰۰

مضمون	صفحہ
باب ۱۹	
زبان اُردو کی خاص خوبیاں اور اُس کے متعلق بعض اہل الرّائے لوگوں کی قیمتی رائیں	
اُردو ایک فصیح اور شیریں زبان ہے۔	۲۰۱
ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہے۔	″
ہندوستان کی عام زبان ہے۔	۲۰۲

مضمون	صفحہ
ایک وسیع زبان ہے	۲۰۲
بعض یورپین محققین کی رائیں	″
اُردو کی نام نہاد کم مائگی	۲۰۳
اقسام ادب	۲۰۴
تصانیف	″
تراجم	۲۰۵
مذہبی لٹریچر	۲۰۶
ادب اُردو کے سرچشمے	″
ہندوستانی اکیڈمی قائم شدہ ۱۹۲۷ء۔	۲۰۷
اُردو کا رسم الخط	۲۰۸

فہرست تصاویر حصۂ نثر

تصویر	صفحہ	تصویر	صفحہ
مرزا غالب کچھ تحریر فرما رہے ہیں	۴۷	خواجہ امان دہلوی	۱۳۲
سر سید احمد خاں	۵۲	منشی سجاد حسین	۱۳۶
مولوی چراغ علی	"	مرزا مچھو بیگ عاشق	"
مولوی محمد حسین آزاد	۶۱	پنڈت تربھون ناتھ ہجر	"
مولوی نذیر احمد	۷۱	نواب سید محمد آزاد	۱۳۹
مولوی ذکاء اللہ	۸۱	جوالا پرشاد برق	"
مولوی سید احمد دہلوی	"	سرشار	۱۴۲
مولانا شبلی نعمانی	۹۰	پنڈت بشن نرائن در	"
اراکین دارالمصنفین	"	شوق قدوائی	۱۴۴
سید علی بلگرامی	۱۰۴	مولوی عبدالحلیم شرر	۱۵۸
مولوی عزیز مرزا	"	نیاز فتحپوری	۱۶۱
بابائے اردو۔	۱۰۸		
شیخ عبدالقادر بی۔اے	۱۱۳	چکبست	"
لالہ سری رام دہلوی	"	منشی پریم چند	۱۷۵
منشی نولکشور	۱۲۸	مہاشے سدرشن	۱۹۸
منشی بشن نرائن مالک مطبع نولکشور	"	پرشیں چندر	"
		ہندوستانی اکاڈیمی	۲۰۸

حصّۂ نثر

باب ۱۵

نثرِ اُردو کی ابتدا اور ترقی

فورٹ ولیم کالج کلکتہ

نثرِ اردو کی تعویق آغاز کے اسباب

اُردو نثر کی ابتدا در واقعی فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی۔ شمالی ہند میں اس کی عدم ترقی کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہاں فارسی کا رواج تھا درباری اور تعلیم یافتہ شرفاء کی زبان وہی تھی۔ مُراسلے، کتابوں کی تقریظیں اور دیباچے یہ سب فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے۔ اُردو شعراء کے تذکرے جن میں ان کے کچھ حالات بھی ہوتے تھے یہ بھی فارسی ہی میں ہوتے تھے۔ نثر کی شان یہ تھی کہ عبارت مقفیٰ اور مسجّع ظہوری اور بیدل کے طرز پر مروج تھی۔ اس وقت اُردو نثر نگار ظہوری اور پنج رقعہ کی ایسی پیچیدہ اور مغلق عبارت لکھنے کے شائق تھے اور اسی قسم کی عبارت لکھنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ فارسی کی مروجہ اقسام نثر یعنی مرجز مقفیٰ مسجع اور عاری اُردو میں بھی بے تکلف اختیار کی گئی تھیں اور جب کبھی کوئی بات نثر میں لکھنا ہوتی تو وہ نہایت رنگین اور پُر تکلف عبارت میں لکھی جاتی تھی۔ نظم کا عام رواج تھا۔ یہاں تک کہ خطوط بھی نظم میں لکھے جاتے تھے۔ نظم لکھنا قابلیت اور علمیت کی بڑی

دلیل سمجھی جاتی تھی اور ایک پڑھے لکھے آدمی کا یہی تقاضائے امتیاز تھا۔ نظم کا یہ عام رواج اور مقبولیت نثر کو بھی نظم نما بنائے ہوئے تھا۔ نثر بیچاری ایک گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی اپنی ترقی کا موقع دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ وہ دَور نظم کے عروج کا دَور تھا اور نثر کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ یہ اسباب اس کی ابتدا کی تاخیر کے ہوئے اور یہی اس بات کی بھی وجہ ہے کہ اس کی ابتدا ایسے مقام سے ہوئی جو شمالی ہند اور ادبی مرکز سے دُور تھا۔

زبان دکھنی میں قدیم اُردو نثر کی تصانیف

محققین زبان اور ریسرچ اسکالروں نے بحرِ تحقیق میں غوطہ زنی کر کے دکن کی قدیم نثر کے بہت سے نمونے دستیاب کیے ہیں۔ یہ کارروائی ہنوز جاری ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ بہت عرصہ نہیں گذرے گا کہ کافی مواد ایک مکمل اور معتبر تاریخ نثر اُردو کی تیاری کے لیے فراہم ہو جائے گا۔ ایسے محقق ہمارے نزدیک مولوی عبدالحق صاحب اور حکیم سیّد شمس اللہ قادری ہیں کہ جن کی کوششیں اس بارے میں بہت تحسین اور آفرین کے لائق ہیں۔ جہاں تک کہ قدیم ترین نمونے اس وقت تک دریافت ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ نثر اُردو کی تاریخ آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔ یہ نمونے چھوٹے چھوٹے رسالوں کی صورت میں ہیں جن میں دکن اور گجرات کے فقراء اور اہل دل کے اقوال و امثال قلمبند کیے گئے ہیں۔ یہ رسالے اکثر فارسی اور عربی کتابوں کے ترجمے ہیں اور زیادہ تر مذہبی رنگ میں ہیں مثلاً شیخ عین الدین گنج العلم (متوفی ۷۹۵ھ) کی تصانیف اور "معراج العاشقین" مصنفہ حضرت خواجہ گیسو دراز گلبرگوی جو اگرچہ کوئی ادبی حیثیت تو نہیں رکھتا مگر پھر بھی اس زمانہ کی زبان کا حال بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ اور آپ کے نواسے سیّد محمد عبداللہ الحسینی نے حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے رسالہ نشاط العشق کو دکھنی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح شاہ میرانجی شمس العشاق بیجاپوری نے شرح مرغوب القلوب لکھی۔ اور ان کے فرزند شاہ برہان الدین جانم متوفی ۹۹۰ھ نے متعدد کتابیں لکھیں جن سے دو کے نام "جل ترنگ" اور "گلباس" ہیں۔

مولانا وجہی کی "سب رس" سنہ ۱۰۴۵ھ کی تصنیف ہے جس کا ذکر حصۂ نظم میں مولانا وجہی کے بیان میں آچکا ہے۔ میراں یعقوب نے "شمائل الاتقیا و دلائل الاتقیا" کا اردو ترجمہ نہایت سلیس اور سادہ دکھنی زبان میں سنہ ۱۰۸۰ھ میں کیا۔ سید شاہ محمد قادری نے بھی جو اورنگ زیب کے زمانہ میں تھے اور رائچور کے نور دریا خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مختلف مذہبی رسالے لکھے ہیں۔ گیارہویں صدی میں سید شاہ میر نے ایک مذہبی کتاب زبان دکنی میں "اسرار التوحید" کے نام سے لکھی۔

دہ مجلس فضلی مصنفہ ۱۷۳۲ء

قبل اس کے کہ دکن کی اُردو شمالی ہند میں آئے یہاں بھی کچھ کتابیں نثر میں لکھی گئیں جو زیادہ تر قصہ کہانیوں کی صورت یا مذہبی رنگ میں تھیں اور فارسی سے ترجمہ ہوئی تھیں۔ انہیں کتابوں میں فضلی[1] کی دہ مجلس ہے جو بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی سنہ ۱۱۴۵ھ مطابق سنہ ۱۷۳۲ء میں لکھی گئی۔ اس وقت مصنف کی عمر بائیس برس کی تھی جیسا کہ وہ خود اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ یہ کتاب فارسی کی روضۃ الشہداء کا ترجمہ ہے جو مُلا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے۔ فضلی نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میری بڑی تمنا تھی کہ یہ کتاب نہایت سہل اور عام فہم زبان میں جو اُس وقت مروج تھی لکھی جائے مگر چونکہ مذہبی کتاب تھی اور میرے سامنے اس سے قبل کوئی نمونہ موجود نہ تھا لہٰذا مجھے اس کی تحریر میں بہت پس و پیش تھا۔ اسی حالت میں میں نے خواب میں سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ تشریف لائے ہیں اور آپ نے میرے مشکلات کو حل کیا اور امداد فرمائی۔ فضلی نے جو مذہب امامیہ رکھتے تھے۔ ائمہ معصومینؑ کی شان میں کچھ نظمیں اور مرثیے بھی لکھے ہیں مگر ان کو کچھ شہرت نہیں ہوئی۔ دہ مجلس حسین میں اصل میں بارہ مجلسیں ہیں۔ نثر اُردو کی ایک کامل کتاب تو نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ وہ اس زمانہ کی اُردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ عبارت میں خامی ہے جیسا کہ ہر ابتدائی کام میں

---

[1] ولادت تقریباً سنہ ۱۱۲۳ھ مطابق ۱۷۱۱ء وفات تقریباً سنہ ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۵ء۔ ناضل

ہوا کرتی ہے۔ جملے پیچیدہ پُر تصنّع اور مقفّیٰ ہیں۔ اسی طرح ایک مختصر نمونہ اس زمانہ کی نثر اُردو کا سوداؔ کے کلیات کے شروع میں موجود ہے جس سے اس زمانہ کا رنگ بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ زمانہ حال کی پابندی صرف و نحو اس میں بالکل نہیں ہے۔ صرف قافیہ دار الفاظ مثل نظم کے جملوں کے آخر میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ مضمون بھی تشبیہوں اور استعاروں سے مملو ہے۔ ایسی عبارت صرف موزوں نہ ہونے کی وجہ سے نثر کہی جا سکتی ہے۔ ورنہ اس میں اور نظم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انشاؔ اور قتیلؔ کی دریائے لطافت گو فارسی میں ہے۔ مگر نہایت دل چسپ کتاب ہے۔ اس میں اس وقت کے مختلف پیشہ وروں کی بولیاں مختلف رسوم و رواج اور معمولی بول چال اور ضرب الامثال اور دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا فرق اور متروکات قدیم اور مختلف ملکوں کی زبان کا زبان دہلی و لکھنؤ میں شامل ہونے سے اثر وغیرہ وغیرہ درج ہیں۔

نوطرز مرصّع ترجمہ قصہ چہار درویش مصنفہ ۱۷۹۸ء

دوسری مشہور کتاب اس عہد کی نوطرز مرصّع ہے جس کو میر محمد عطا حسین خاں متخلص بہ تحسینؔ نے امیر خسرو کے قصّہ چہار درویش سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۷۹۸ء اور یہ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں مکمل ہوا۔ جن کی تعریف میں ایک قصیدہ دیباچہ کے آخر میں دیا ہوا ہے۔ مصنّف مذکور مرصّع رقم کے لقب سے مشہور تھے اور محمد باقر خاں شوقؔ کے بیٹے اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کے دربار سے وابستہ تھے۔ بعد اس کے وہ جنرل اسمتھ کے میر منشی مقرر ہوئے۔ اور انہیں کے ساتھ کلکتہ گئے۔ جب صاحب موصوف ولایت گئے تو تحسینؔ پٹنہ چلے آئے اور وہاں وکالت کرنے لگے۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد وہ پٹنہ سے فیض آباد آ گئے جہاں نواب شجاع الدولہ کے ملازم ہو گئے۔ یہ سلسلہ ملازمت نواب آصف الدولہ کے زمانہ تک قائم رہا۔ تحسینؔ علاوہ خوشنویس ہونے کے منشی بھی نہایت اچھے تھے۔ چنانچہ "ضوابط انگریزی" جو اس زمانہ کی گورنمنٹ ہند کے قوانین کا مجموعہ ہے۔ اور

"تواریخ قاسمی" ان کی تصنیف ہیں۔ یہ دونوں کتابیں فارسی میں ہیں۔ "نوطرز مرصع" کی عبارت نہایت رنگین اور فارسی و عربی الفاظ سے مملو ہے۔ غالباً یہی وجہ ہوگی کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے قصۂ چہار درویش کا ایک دوسرا ترجمہ موسوم بہ "باغ و بہار" نہایت صاف اردو زبان میں میر امن دہلوی سے کرایا جس کا مفصل حال آگے آتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج سے نثر اردو کے تعلق کے اسباب

انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے تجارتی تعلقات کے سلسلہ میں بڑے بڑے قطعات ملک حاصل کر لیے تھے جن کے عمدہ انتظام کے واسطے ضروری تھا کہ ان کے اعلیٰ عمال اس ملک کی زبان سے جس کا انتظام عاملانہ خواہ تاجرانہ ان کے سپرد تھا اچھی طرح واقف ہو جائیں تجارتی تعلقات یوماً فیوماً کم ہوتے جاتے تھے مگر انتظامی معاملات بڑھتے جاتے تھے۔ مترجم جن کے ذریعہ سے اہل ملک کی زبان اور خیالات کو یورپی عمال یا تجار سمجھ سکتے تھے۔ اب بیکار ہو گئے تھے کیونکہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا۔ کہ کوئی قوم تاوقتیکہ مفتوح قوم کو زبان اور رسوم و رواج اور روایات تاریخی و مذہبی سے کماحقہٗ بلا واسطہ واقف نہ ہو گی اس پر پورے طور سے حکومت نہیں کر سکتی۔ اور ان سب باتوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ حاکم اپنے محکوموں کی زبان سیکھیں۔ لہذا کورٹ آف ڈائرکٹرز نے یہ دیکھ کر کہ ان کے عمال ہندوستان میں اپنے فرائض منصبی محض دیسی زبانوں کے نہ جاننے کی وجہ سے بہت بُری طرح سے ادھورے طریق پر ادا کرتے ہیں یہ تاکیدی حکم دے دیا کہ آئندہ سے ان کے حکام مقامی اپنے عمّال کے واسطے دیسی زبانوں سے کماحقہٗ واقفیت کو ضروری قرار دیں۔ اسی کے ساتھ چونکہ بڑے بڑے قطعات ملک انگریزی عملداری میں داخل ہوتے جاتے تھے۔ لہذا پارلیمنٹ انگلستان کو اب یہ محسوس ہونے لگا کہ رعایا کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کی ذمہ داری بھی ہمیں پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اب اس کی کوشش ہونے لگی کہ جو رکاوٹ خانہ جنگیوں اور ملکی لڑائیوں

کی وجہ سے لوگوں کے تعلیم میں پڑ گئی تھی جس کی وجہ سے تعلیم کو بہت سخت صدمہ پہنچ رہا تھا۔ اب دور ہو جائے۔ اسی اصول پر تعلیم انگریزی کی اشاعت شروع ہوئی۔ جس سے خیالات اور زبان دونوں میں انقلاب عظیم پیدا ہونا شروع ہوا جس کا اثر کہیں نظم پر پڑا اور کہیں نثر پر مختصر یہ کہ تعلیم انگریزی نے ہندوستان کے واسطے وہی کیا جو اب سے پانچ چھ سو برس پیشتر رینا سانس (نشاۃ ثانیہ) نے یورپ کے واسطے کیا تھا۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہر تغیر اور انقلاب کے ساتھ اچھائیوں کے ساتھ ساتھ کچھ برائیاں بھی ضرور آجاتی ہیں مگر اس صورت میں اچھائیوں کا پلہ بھاری رہا۔ یعنی اس تعلیمی تغیر سے دیسی زبانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ
۱۷۵۹ء لغایت ۱۸۴۱ء

ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے منتظم اعلیٰ تھے۔ نثر اردو کے مربی (باپ) کہلائے جانے کے فی الحقیقت مستحق ہیں۔ ان کی ان تھک کوششوں سے ملک کی دیسی زبان یعنی اردو مکمل ہو کر سرکاری زبان بننے کے لائق ہوئی اور اس میں اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی کی جگہ وہ سرکاری اور درباری زبان قرار پائی ڈاکٹر موصوف اسکاٹ لینڈ کے باشندے تھے۔ ۱۷۵۹ء میں بمقام ایڈنبرا پیدا ہوئے۔ جارج ہیریٹ کے درسگاہ میں جو اسی شہر میں واقع تھی تعلیم پائی ۱۷۸۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں بہ حیثیت ڈاکٹر داخل ہوئے۔ ابتدا ہی سے یہ خیال ان کے دل میں راسخ تھا کہ انگریزی افسروں کو فارسی دانی کی اس قدر ضرورت نہیں (جیسا کہ اس وقت دستور تھا) جس قدر کہ ملک کی دیسی زبانوں علی الخصوص زبان ہندوستانی کی ہے جو اس وقت ہر طبقہ اشخاص سے میل جول کے لیے سب سے زیادہ مشہور زبان سمجھی جاتی تھی گلکرسٹ نے خود اس معاملہ میں سبقت کی۔ ان کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ہندوستانی کپڑے پہنے ان مقامات میں جہاں اردو بہت صحیح اور با محاورہ بولی جاتی تھی برابر گھوما کرتے تھے۔

اور اُردو کے علاوہ سنسکرت فارسی و دیگر مشرقی زبانوں سے بھی باخبر تھے۔ اُن کی کامیابی کو دیکھ کر دیگر ملازمین کمپنی کے دل میں بھی اُردو پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ مختصر یہ کہ انگریزوں میں اُردو پڑھنے کا رواج اُسی وقت سے ہو گیا۔ لارڈ ویلیسلی نے جو اس وقت گورنر جنرل تھے۔ اس تجویز کی اہمیت اور ضرورت پر نظر کر کے اور گلکرسٹ کے مفید کاموں کے عمدہ نتائج کو دیکھ کر ان کو مالی امداد بھی بہت دی اور فورٹ ولیم کالج کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ یہ کالج ۱۸۰۰ء میں اس غرض سے قائم ہوا تھا کہ اس میں کمپنی کے انگریزی ملازمین کو ملک کی دیسی زبانوں میں تعلیم دی جائے۔ گلکرسٹ عرصہ تک اپنی جگہ پہ نہ رہ سکے علالت کی وجہ سے مستعفی ہو کر ۱۸۰۴ء میں پنشن لے کر ولایت چلے گئے۔ اردو زبان سے اُن کو اس قدر عشق تھا کہ ایڈنبرا میں ۱۸۱۶ء تک قیام کر کے لندن آ گئے جہاں امیدواران انڈین سول سروس کو وہ مشرقی زبانوں میں پرائیویٹ طریق پہ تعلیم دیا کرتے تھے۔ ۱۸۱۸ء میں وہ اورنٹیل انسٹیٹیوٹ میں زبان اُردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے جس کو اس سال ایسٹ انڈیا کمپنی نے لندن میں قائم کیا تھا۔ مگر ۱۸۲۵ء میں بند ہو گیا تھا۔ اس کے بند ہونے کے بعد بھی وہ تقریباً سال بھر تک شائقین زبان کو پرائیویٹ طور پر اُردو پڑھاتے رہے اور اپنے بعد اپنی جگہ پر ریورنڈ فورڈ آرنو اور ڈنکن فوربس کو جو مشہور مستشرق، مقرر کر گئے۔ گلکرسٹ کا انتقال ۸۲ برس کی عمر میں بمقام پیرس ۱۸۴۱ء میں ہوا۔ وہ بہت سی کتب متعلقہ زبان ہندستانی کے مصنف ہیں جن کی پوری فہرست ڈاکٹر گریرسن نے اپنی مشہور تصنیف "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" (ہندوستانی زبانوں کے تفتیشات) کی جلد نہم میں دی ہے۔ ان کی بعض مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:۔

(۱) انگریزی ہندوستانی ڈکشنری ۲ حصوں میں۔ مطبوعہ ۱۷۹۳ء۔

(۲) اورنٹیل لنگوسٹ (مشرقی زبان دان) جو زبان اُردو کا آسان مقدمہ ہے۔ مطبوعہ ۱۷۹۸ء۔

(۳) ہندوستانی گرامر۔ مطبوعہ ۱۷۹۶ء۔

(۴) ہندوستانی فلالوجی۔ گلکرسٹ ہی کے انتظام اور ماتحتی میں ایک جماعت ہندوستانیوں کی کالج میں قائم ہوگئی تھی جنہوں نے نہ صرف انگریزوں کے پڑھنے کے واسطے درسی کتابیں بلکہ زبان اُردو و ہندی میں مستقل تصانیف نہایت اعلےٰ درجہ کی تصنیف کیں۔ سلطنت مغلیہ کی تباہی کے بعد بعض مشہور اہل زبان و اہل قلم اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر ڈاکٹر گلکرسٹ کی شہرت اور فیاضی کا شہرہ سُن کر کلکتہ پہنچ گئے تھے انہوں نے اُن سب کو دنیز اکثر کلکتہ کے لوگوں کو اپنے کالج میں خوشی سے جگہ دی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ساتھ بعض اور مشہور افسروں۔ مثلاً کپتان روبک، کپتان ٹیلر۔ ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ کی خدمات بھی ضرور قابل تعریف ہیں۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے زمانہ میں مشہور ہندوستانی اہل قلم جو کالج میں جمع ہوگئے تھے حسب ذیل ہیں۔

میر امّن۔ افسوس حسینی۔ لطف۔ حیدری۔ جوان۔ للولال جی۔ نہال چند۔ اکرام علی ولا۔ سید محمد منیر۔ سید شیر علی افسوس اور مداری لال گجراتی۔

میر امّن دہلوی میر امّن[۱] دہلوی۔ متخلص بہ لُطفؔ دلّی کے رہنے والے تھے۔ ان کے آباو اجداد سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں وظائف اور جاگیروں سے معزز و ممتاز تھے۔ احمد شاہ دُرّانی نے جب دہلی پر حملہ کیا تو فوج کی لوٹ مار میں میر امّن کا گھر بھی شامل تھا۔ اور سُورج مل جاٹ نے ان کی خاندانی جاگیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ میر امّن اس مصیبت میں دلّی سے نکل کر پٹنہ پہنچے۔ یہاں کچھ عرصہ تک رہ کر کلکتہ روانہ ہوئے جہاں نواب دلاور جنگ بہادر کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی تعلیم و تربیت ان کی سپرد تھی۔ اسی زمانہ میں میر بہادر علی حسینی نے ان کا تعارف ڈاکٹر گلکرسٹ سے کرا دیا جن کی فرمایش سے انہوں نے اپنی مشہور معروف کتاب قصّہ چہار درویش لکھی جس کا تاریخی نام

---

[۱] ولادت ۱۱۴۷ھ۔ وفات ۱۲۱۷ھ۔ فاضل

باغ و بہار (۱۲۱۷ھ) ہے۔ یہ قصہ اصل میں فارسی میں تھا اور اس کو امیر خسرو دہلوی نے اپنے پیرو مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کے بحالت علالت دل بہلانے کے واسطے تصنیف کیا تھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد جب حضرت کو صحت ہوئی تو آپ نے دعا دی کہ اس قصہ کو جو کوئی سنے گا وہ بحکم خدا بیماری سے شفا پائے گا۔ یہ قصہ فارسی میں بھی بہت مقبول ہے اور اس کے دونوں اردو ترجمے یعنی تحسین اور میر امن کے ترجمے مع دیگر تراجم کے جو ہندوستان کے اکثر دیسی زبانوں اور نیز غیر ملکی زبانوں میں ہوتے ہیں، بہت مقبول ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء مطابق ۱۲۱۷ھ میں ختم ہوئی۔ تحسین کے ترجمہ کو میر امن نے اپنی زبان میں لکھا ہے کیونکہ اس میں اکثر غیر مانوس فارسی و عربی الفاظ تھے جن کو میر امن نے نکال دیا اور اپنی کتاب کو اس قدر صاف و سلیس و بامحاورہ عبارت میں لکھا کہ بقول سر سید مرحوم کے جو رتبہ میر تقی میر کو نظم میں حاصل ہے وہی میر امن کو نثر میں ہے۔ یہ قصہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ اس میں اس زمانہ کے رسم و رواج اور طرز معاشرت کے مرقعے نہایت فصاحت سے کھینچے گئے ہیں۔ دیباچہ میں سبب تالیف کتاب اور اپنا حال لکھ کر زبان اردو کی ایک مختصر سی تاریخ بھی بتا دی ہے جو زیادہ صحیح نہیں سمجھی جا سکتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ کتاب "باغ و بہار" انگریزوں میں بہت مقبول رہی ہے۔ چنانچہ اب تک وہ انگریزی حکام کے اردو امتحانوں میں داخل درس ہے۔ علاوہ اس کتاب کے "گنجینۂ خوبی" بھی میر امن کی تصنیف ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی اخلاق محسنی کے طرز پر ۱۸۰۲ء میں تحریر کی گئی۔ منشی کریم الدین کا خیال ہے کہ میر امن نے کوئی دیوان بھی ضرور مرتب کیا ہوگا۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہیں۔ ڈاکٹر فیلن نے خود میر امن کی زبانی سنا تھا کہ ان کو کسی سے فن شعر میں تلمذ نہ تھا۔

افسوس ۱۷۳۵ء لغایت ۱۸۰۹ء میر شیر علی دہلوی[1] متخلص بہ افسوس میر علی مظفر خاں

[1] ولادت تقریباً ۱۱۶۰ھ مطابق ۱۷۴۷ء۔ وفات ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء۔ فاضل

کے بیٹے تھے جو نواب میر قاسم کے سرکار میں داروغہ سلح خانہ تھے۔ یہ حضرت امام جعفر صادق کی اولاد میں تھے۔ اور ان کے آبا و اجداد خاف کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگوں میں ایک شخص سید بدرالدین نامی نارنول میں جو آگرہ کے قریب ہے سکونت گزیں ہوئے۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ان کے باپ اور چچا سید غلام علی خاں آگرہ سے دلی آئے اور عمدۃ الملک نواب امیر خاں کی سرکار میں ایک بلش قرار تنخواہ پہ ملازمت اختیار کی۔ افسوس دہلی میں پیدا ہوئے جن کو ان کے بزرگوں نے بطریق وطن کے اختیار کیا تھا۔ ۱۷۴۶ء میں جب نواب امیر خاں کا انتقال ہو گیا تو افسوس کے والد پٹنہ چلے گئے۔ جہاں نواب میر قاسم اور ان کے بعد نواب میر جعفر کی ملازمت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب آخر الذکر معزول کیے گئے تو وہ لکھنؤ آ گئے۔ وہاں سے حیدر آباد گئے جہاں ان کا انتقال ہوا۔ افسوس بھی اپنے والد کے ساتھ پٹنہ سے لکھنؤ آئے تھے۔ اور چونکہ میلان طبیعت شعر و شاعری کی طرف بہت تھا اور فضائے لکھنؤ میں زمزمۂ شاعری اس وقت گونج رہا تھا۔ انہوں نے بھی شعر کہنا شروع کر دیا۔ وہ اپنا کلام میر حیدر علی حیرآن کو دکھلاتے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ میر حسن۔ میر تقی اور میر سوز سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ میں اُن کی سرپرستی نواب سالار جنگ بہادر اور ان کے بعد ان کے بیٹے نواب مرزا نوازش علیخاں کرتے رہے۔ لکھنؤ ہی کے قیام میں نواب حسن رضا خاں نائب نواب آصف الدولہ کی وساطت سے افسوس کرنیل اسکاٹ صاحب سے ملے جنہوں نے ان کی قابلیت اور ذہانت و ذکاوت کو بہت پسند کر کے دو سو روپیہ مشاہرہ پہ ان کو کلکتہ بھیجا اور پانچ سو روپیہ زادِ راہ کے لیے بھی عنایت فرمائے۔ افسوس راستے میں مرشد آباد میں مرزا علی لطف صاحب گلشن ہند سے بھی ملے تھے۔ کلکتہ پہنچ کر وہ فورٹ ولیم کالج کے زمرۂ استادان میں ایک معزز عہدہ پر فائز ہوئے اُن کی تصانیف

حسب ذیل ہیں :-

(۱) اُردو ترجمہ گلستان سعدی موسوم بہ باغِ اُردو جو کلکتہ میں پہلی مرتبہ ۱۸۰۲ء میں چھپا تھا۔ اور نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

(۲) ۱۸۰۵ء میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب آرایش محفل لکھنا شروع کی جس میں علاوہ ہندوستان کے جغرافیائی حالات کے فتح اسلام تک ہندو راجاؤں کی ایک مختصر تاریخ بھی ہے۔ اس کی تصنیف میں اکثر تاریخوں سے مدد لی گئی مگر اس کا اصلی ماخذ منشی سوجن رائے بٹیالوی کا خلاصۃ التواریخ ہے۔ ان کے علاوہ افسوس نے میر بہادر علی کی نثر بے نظیر منشی عزت اللہ کی مذہب عشق اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کی بہار دانش کی تصنیف میں بھی مدد دی تھی اور کلیات سودا بھی اپنی تصحیح سے چھپوایا تھا۔ ان تصانیف کے علاوہ ان کا ایک دیوان بھی ہے جو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا۔ افسوس کا انتقال ۱۸۰۹ء میں ہوا۔

میر بہادر علی حسینی ان کے مفصّل حالات معلوم نہیں ہو سکے بہر حال اتنا معلوم ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں میر منشی تھے۔ اور کتب ذیل کے مصنّف ہیں :-

(۱) اخلاق ہندی۔ جو ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمایش سے ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی۔ یہ ہتو پدیش کے ایک فارسی ترجمہ کا جو شاہ نصیر الدین بہادری کے حکم سے مفتی تاج الدین نے مفرح القلوب کے نام سے کیا تھا۔ صاف اور سلیس اُردو ترجمہ ہے۔

(۲) نثر بے نظیر یعنی مثنوی میر محمد حسن نثر میں جو ۱۸۰۲ء میں تصنیف ۱۸۰۳ء میں یعنی دو برس قبل اصل مثنوی کے شائع ہوئی۔

(۳) رسالہ گلکرسٹ یعنی گلکرسٹ صاحب کی گرامر کا خلاصہ زبان اُردو کی صرف و نحو اور فن عروض کا رسالہ ہے مطبوعہ کلکتہ ۱۸۱۶ء۔

(۴) ترجمہ تاریخ آسام مصنفہ شہاب الدین تالش جس میں اورنگ زیب کے

مشہور جنرل میر جملہ کے حملۂ آسام ۱۶۶۲ء کا ذکر ہے۔ حسب الحکم کولبرک صاحب ترتیب پایا۔ ان کے علاوہ قصۂ لقمان اور قرآن شریف کے ایک ترجمہ میں بھی حسینی نے شرکت کی تھی۔

سید حیدر بخش حیدری سید حیدر بخش حیدری سید ابوالحسن کے بیٹے دِلّی کے رہنے والے تھے۔ ان کے آباو اجداد نجف کے باشندے تھے۔ ان کے والد لالہ سُکھ دیو رائے کے ساتھ دِلّی سے نکل کر بنارس پہنچے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ حیدر بخش اپنے والد کے ساتھ تھے۔ بنارس میں اُس وقت نواب علی ابراہیم خاں متخلّص بہ خلیل مصنف تذکرۂ گلزار ابراہیم عدالت انگریزی کے جج تھے۔ اُن کی سپردگی میں حیدری دیے گئے تاکہ نواب صاحب کے فیض صحبت سے اچھی طرح مستفیض ہوں۔ علوم مذہبی کی تعلیم ان کی مولوی غلام حسین غازی پوری کے سایۂ عاطفت میں ہوئی جو نواب صاحب موصوف کی عدالت کے ایک سربرآوردہ مولوی تھے۔ ۱۸۰۰ء میں یہ سُن کر کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قابل منشیوں کی مانگ ہے، حیدری نے ایک کتاب موسوم بہ "قصۂ مہر و ماہ" ترتیب دی جس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۴ھ ہے اور اس کو ڈاکٹر گلکرسٹ کی خدمت میں بطور اپنی قابلیت کے نمونہ کے پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو پسند کیا اور حیدری کو کالج مذکور کی ایک منشی گری پر ممتاز کیا۔ حیدری کی اکثر تصانیف ہیں جو زیادہ تر فارسی کتابوں کے تراجم ہیں۔ کتب ذیل زیادہ مشہور ہیں۔

(۱) قصۂ لیلیٰ مجنوں۔ جو امیر خسرو کی اسی نام کی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ غالباً ملازمت کلکتہ سے پیشتر تحریر ہوا تھا۔

(۲) طوطا کہانی۔ سید محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ مصنفہ ۱۸۰۱ء بحکم ڈاکٹر گلکرسٹ صاحب۔ اصل میں یہ قصہ سنسکرت میں شوکا شپتتی کے نام سے تھا۔ فارسی میں اسی نام کی ایک کتاب جو باون قصوں پر مشتمل تھی ضیائے نخشبی نے ۷۳۰ھ میں لکھی تھی جس سے

یہ دوسرا طوطی نامہ پینتیس ۳۵ قصّص کا سید محمد قادری نے ۱۷۹۲ء/۱۷۹۳ء میں مختصر اور صاف کرکے ترتیب دیا۔ یہ سب قصے مثل انگریزی کنگ آرتھر کے فسانوں کے ہندوستان میں بہت مقبول ہوئے اور ان کے ترجمے مختلف زبانوں میں مختلف اوقات میں ہوئے۔ مثلاً انگریزی میں اسمال صاحب نے ۱۸۷۵ء میں کیا۔ بنگلہ میں چنڈی چرن سیرام پوری نے ۱۸۰۶ء میں کیا اور طوطا اتہاس نام رکھا۔ ہندی میں انبا پرشاد دراسا نے۔ زبان دکنی میں نظم میں غواصی نے اور نثر میں ایک غیر معلوم شخص نے۔ ہندی میں اصل سنسکرت سے بھیروں پرشاد نے۔ گجراتی نظم میں سمالا بھٹ نے اور مرہٹی میں کسی غیر معلوم شخص نے۔

(۳) آرایش محفل۔ ترجمہ قصہ حاتم طائی۔ اس کو میر شیر علی افسوس کی آرایش محفل سے خلط ملط نہ کرنا چاہیے۔ یہ قصہ سب سے پہلے ۱۸۰۲ء میں کلکتہ میں چھپا تھا۔ اور اس کی زبان نہایت سلیس سہل اور دل چسپ ہے۔ اس کا ترجمہ بھی بنگلہ، ہندی اور گجراتی میں ہو گیا ہے۔

(۴) تاریخ نادر ترجمہ نادر نامہ منشی مرزا مہدی، مترجمہ ۱۸۲۴ء۔

(۵) گل مغفرت۔ جس کو انہیں کے گلشن شہیداں کا خلاصہ سمجھنا چاہیے جو ملا حسین واعظ کاشفی کے روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے۔ اس کا دوسرا نام دہ مجلس بھی ہے۔ سنہ تصنیف ۱۸۱۲ء اور مقام طباعت کلکتہ ہے۔ اس کا ترجمہ زبان فرانسیسی میں بھی ہو گیا ہے۔

(۶) گلزار دانش یعنی شیخ عنایت اللہ کی بہار دانش کا اردو ترجمہ جس میں عورتوں کے مکر و کید کے قصے درج ہیں۔

(۷) ہفت پیکر نظامی کی مشہور مثنوی ہفت پیکر کا جواب مصنفہ ۱۸۰۵ء/۱۸۰۶ء۔

(۸) ان کے علاوہ چند مراثی ایک دیوان غزلیات اور مجموعہ صد حکایات بھی

ان کی تصانیف سے ہیں۔ حیدری کا انتقال ۱۸۲۳ء میں ہوا جیسا کہ ڈاکٹر اسپرنگر نے فہرست کتب اودھ میں ذکر کیا ہے۔

مرزا کاظم علی جوان اصل میں دلی کے باشندے تھے مگر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جہاں ۱۷۸۲ء میں وہ موجود تھے۔ ان کا ذکر نواب علی ابراہیم خاں نے اپنے تذکرۂ گلزار ابراہیم میں کیا ہے۔ جن کے پاس بنارس میں انہوں نے اپنا کچھ کلام نمونتاً بھیجا تھا۔ ۱۸۰۰ء میں کرنل اسکاٹ صاحب نے ان کو منشی گری کی ایک جگہ دے کر لکھنؤ سے کلکتہ روانہ کیا تھا۔ منشی بینی نارائن اپنے تذکرہ جہاں میں جو ۱۸۱۲ء کی تصنیف ہے لکھتے ہیں کہ یہ اس وقت زندہ تھے۔ بلکہ ۱۸۱۵ء میں جو مشاعرے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ہوئے تھے۔ ان میں بھی یہ موجود پائے جاتے ہیں۔ کتب ذیل ان کی طرف منسوب ہیں۔

(۱) کالی داس کی مشہور کتاب شکنتلا ناٹک کا اُردو میں ترجمہ جس کے دیباچہ میں بطور تمہید کے وہ لکھتے ہیں کہ کالیداس کی اصل کتاب کا ترجمہ برج بھاشا میں ۱۷۱۶ء میں ایک شاعر نواز کبیشر نامی نے مولے خاں پسر خدای خاں سپہ سالار شہنشاہ فرخ سیر کے حکم سے کیا تھا۔ اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمایش سے یہ ترجمہ بھاشا سے بزبان اُردو ۱۸۰۱ء میں کیا گیا اور اس پر نظر للّو لال جی کبیشر نے کی اور کلکتہ میں ۱۸۰۲ء میں طبع ہوا۔

(۲) قرآن شریف کا ایک ترجمہ حسب فرمایش گلکرسٹ صاحب۔

(۳) ترجمہ تاریخ فرشتہ متعلقہ خاندان بہمنی۔

(۴) سنگھاسن بتیسی جس کی تصنیف میں للّولال جی بھی شریک تھے۔

(۵) بارہ ماسہ یا دستور ہند مطبوعہ کلکتہ ۱۸۱۲ء جس میں ہندوستان کی مختلف فصلوں اور موسموں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں کا ذکر ہے۔ یہ کتاب بجلد ترجمہ

شکنتلا ناٹک کے تحریر ہوئی۔

جواںؔ نے "خرد افروز" (جس کا حال آگے آتا ہے) اور میرؔ و سوداؔ کے کلام کے کچھ منتخبات بھی شائع کیے تھے۔ ان کے دو بیٹے عیاںؔ اور ممتازؔ بھی کسی قدر مشہور ہوئے۔

نہال چند لاہوری — دِلّی میں پیدا ہوئے مگر چونکہ لاہور میں زیادہ رہے۔ اس وجہ سے لاہوری کے لقب سے مشہور ہیں۔ ۱۲۱۷ھ میں کلکتہ گئے تھے۔ ان کے کچھ مزید حالات معلوم نہیں۔ سوائے اس کے جیسا کہ اپنی کتاب مذہب عشق کے دیباچہ میں وہ خود لکھتے ہیں کہ کپتان وتورٹ نے ڈاکٹر گلکرسٹ سے ان کا تعارف کرایا جن کی فرمائش سے انہوں نے قصّہ تاج الملوک اور بکاؤلی کا ترجمہ فارسی سے اُردو میں کیا۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) مذکورہ بالا مذہب عشق (جو تاریخی نام ہے) معروف بہ قصّہ گُل بکاؤلی جو شیخ عزت اللہ بنگالی کے اسی نام کے فارسی قصّہ مصنّفہ ۱۱۲۴ھ کا اُردو ترجمہ ہے۔ ایک دوسرا اُردو منظوم ترجمہ اسی قصّہ کا کسی شخص ریحان نامی نے ۱۲۱۲ھ میں کیا۔ جس میں چالیس باب ہیں جو گلگشت کے نام سے موسوم ہیں۔ نیز ایک اُردو مثنوی موسوم بہ تحفۃ المجالس اسی قصّہ کی بہت قدیم موجود ہے۔ یہ نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۵۳ھ نکلتے ہیں۔ اور اس سے بھی ایک قدیم تر نسخہ کا پتہ چلتا ہے جو زبان دکنی میں ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۱۳۵ھ ہے۔ مگر ان سب سے زیادہ مشہور مثنوی گلزارِ نسیم ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۹ھ ہے۔ مذہب عشق کا سنہ تصنیف ان تاریخوں سے جو کتاب کے آخر میں دی ہوئی ہیں ۱۲۱۷ھ اور ۱۸۱۳ء عیسوی نکلتا ہے۔

مظہر علی خاں ولاؔ — مرزا لطف علی معروف بہ مظہر علی خاں متخلص بہ ولاؔ سلیمان علی خاں ودادؔ کے بیٹے دِلّی کے رہنے والے تھے۔ مرزا جان طپشؔ اور مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔ گلشنِ بے خار میں میر نظام الدین ممنونؔ کو بھی اُن کا اُستاد لکھا ہے یہ بھی کلکتہ کے کالج

میں منشی تھے اور اکثر تراجم ان کی طرف منسوب ہیں۔ مثلاً

(۱) پندنامہ سعدی کا اردو ترجمہ منظوم مصنفہ ۱۸۰۲ء۔

(۲) ناصر علی خاں بلگرامی واسطی کی ہفت گلشن کا ترجمہ جو اخلاق و مواعظ کی ایک کتاب ہے اور سات بابوں پر مشتمل ہے۔ جو تاریخیں اس کے آخر میں دی ہوئی ہیں۔ اُن سے سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء نکلتا ہے۔ اس میں اخلاقی حکایتیں آداب گفتگو بزرگوں کی اطاعت و فرمانبرداری اور چند احادیث نبوی و اقوال حضرت علی رضی اللہ عنہ درج ہیں۔

(۳) قصۂ مادھونل وکام کنڈلا جو موتی رام کبیشر کی برج بھاشا کا اردو ترجمہ ہے۔ سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء ہے۔

(۴) صورت کبیشر کی بیتال پچیسی بھاشا کا اردو ترجمہ جو للّو لال جی کی شرکت میں کیا گیا، وجہ تسمیہ یہ ہے کہ پچیس قصّے کسی بیتال (بھوت) نے راجہ بکرماجیت کے سامنے کہے تھے۔ یہ ہندوستانی پبلک میں بہت مقبول ہے مگر اس میں کوئی ادبی نُدرت نہیں ہے۔

(۵) فارسی تاریخ شیر شاہی کا ترجمہ جو بعد کو انگریزی میں بھی ہو گیا ہے۔

(۶) ایک دیوان ریختہ تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کا جس میں غزلیات قصائد رباعیات وغیرہ مع سوانح عمری مصنف کے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ خود مصنف نے بطور یادگار کے فورٹ ولیم کالج کو ۱۸۱۰ء میں دیا تھا۔

حفیظ الدین احمد انہوں نے خرد افروز کے نام سے ۱۸۰۳ء میں ابوالفضل کی عیار دانش کا اردو ترجمہ کیا۔ اور عیار دانش خود مُلّا حسین واعظ کاشفی کی انوار سہیلی کی تلخیص اور انوار سہیلی کلیلہ دمنہ عربی کا ترجمہ ہے جو سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ انہیں قصّوں کا ایک ناتمام ترجمہ انوار سہیلی سے ایک شخص مرزا مہدی نامی نے کیا تھا جو کپتان ناکس

کے منشی تھے اور ان کے ساتھ کلکتہ اور گیا گئے تھے۔ کپتان ناکس نے گیا میں ایک مشہور داستان گو ہیبت خاں نامی سے بھی اسی کتاب کا ترجمہ کرایا تھا۔ اور ان دونوں کا مقابلہ کر کے مرزا مہدی کے ترجمہ کو ترجیح دی تھی۔ انوار سہیلی کا ایک ترجمہ دکھنی زبان میں بھی موجود ہے جو ایک شخص مسمی محمد ابراہیم بیجاپوری کی تصنیف ہے اور مدراس میں ۱۸۲۴ء میں چھپا ہے۔ بستان حکمت فقیر محمد خاں گویا کی بھی اسی کا ترجمہ ہے اور یہی سب سے بہتر ہے۔ نواب امیر علی خاں واسطی نے ۱۸۷۲ء میں ایک مختصر ترجمہ ستارۂ ہند کے نام سے کیا تھا اور ایک منظوم ترجمہ موسوم بہ ارژنگ ماضی بہاری لال بھرت پوری نے ۱۸۷۹ء میں کیا تھا۔

مولوی اکرام علی انہوں نے عربی کی مشہور و معروف اخلاقی کتاب اخوان الصفا کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اصل کتاب کے خاتمہ پر کشف الظنون کا حوالہ دے کر یہ لکھا ہے کہ رسائل اخوان الصفا کو جو تعداد میں اکاون ہیں اشخاص ذیل نے تحریر کیا۔

محمد بن نصر البستی معروف بہ مقدسی۔ ابوالحسن علی بن ہارون الزنجانی۔ ابو احمد النہرجوری عوفی۔ زید بن رفاعہ اور یہ سب کے سب حکیم تھے۔ اس پوری کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر ڈیٹرس نے ۱۸۵۸ء لغایت ۱۸۷۹ء میں کیا۔ مولوی صاحب موصوف نے اردو میں صرف اس قدر حصہ کا ترجمہ کیا ہے جس میں کہ حیوانات اور انسان کی برتری کا سوال شاہ جن کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ مختصر مضمون یہ کہ جانور اپنے مالک انسان کے ظلم و تعدّی سے عاجز آ گئے ہیں اور انہوں نے اپنا یہ مرافعہ بادشاہ اجنّہ کے پاس جس کا نام بیوراسب ہے پیش کیا ہے۔ اس مقدمہ کے فیصلہ کا ایک دن مقرر کیا گیا ہے جس میں سب جانور جمع ہوئے ہیں۔ اور ہر ایک اپنے اپنے فضائل و فوائد اور یہ کہ وہ انسان کو کیا نفع پہنچاتا ہے۔ اور انسان اس کے ساتھ کیا بدسلوکی کرتا ہے بیان کرتا ہے۔ چنانچہ گھوڑے۔ گدھے۔ اونٹ اور بھیڑ کے

بیان یکے بعد دیگرے بیے جاتے ہیں جو سب ایسے ہی دل چسپ ہیں جیسے کہ کنگربی کی مشہور انگریزی کتاب ایوننگز ایٹ ہوم۔ یہ ترجمہ کپتان ٹیلر صاحب کی فرمایش سے نہایت سلیس اور آسان اُردو میں کیا گیا۔ اور ۱۸۱۰ء میں شایع ہوا۔ کپتان لاکٹ کی سفارش سے جو اُس وقت فورٹ ولیم کالج کے افسر اعلےٰ تھے۔ مولوی اکرام علی ۱۸۱۲ء میں محافظ دفتر مقرر ہوئے تھے۔

للّو لال جی یہ گجراتی برہمن تھے۔ مگر شمالی ہند میں سکونت گزیں ہو گئے تھے۔ باوصف اس کے کہ ہندو تھے۔ مگر اُردو کے بھی بڑے ماہر تھے۔ چنانچہ شکنتلا ناٹک سنگھاسن بتیسی۔ بیتال پچیسی اور قصہ مادھونل کی تصنیف میں انہوں نے اصل مصنّفوں کو بہت مدد دی تھی جس کا حال اوپر بیان ہوا۔ علاوہ اس کے ۱۸۱۰ء میں انہوں نے ایک کتاب زبان ہندی میں لطیف حکایات کی تصنیف کی جو "لطایف ہندی" کے نام سے مشہور ہے۔

بینی نرائن بینی نرائن متخلص بہ جہاںؔ دیوان جہاں کے مصنّف ہیں جس میں ایک تذکرہ ہندوستانی شعرا کا بھی شامل ہے جو کپتان روبک صاحب سیکرٹری فورٹ ولیم کالج کی فرمایش سے ۱۸۱۲ء میں لکھا گیا اور انہیں کے نام پر معنون بھی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک فارسی قصہ کا ترجمہ "چار گلشن" کے نام سے کیا جس میں بادشاہ کیوان اور فرخندہ کے حالات درج ہیں۔ یہ قصہ ۱۸۱۲ء میں منشی امام بخش کے ایما و اصرار سے تیار کیا گیا اور کپتان ٹیلر صاحب کے سامنے پیش کیا گیا جنہوں نے اس کو پسند کر کے مصنّف کو انعام سے سرفراز کیا اور اس کی اصل کتب خانہ کالج میں داخل کرا دی۔ گارسن ڈیٹاسی کی تحقیق ہے کہ انہوں نے شاہ رفیع الدین صاحب کی تنبیہ الغافلین کا بھی ترجمہ اُردو میں ۱۸۲۹ء میں کیا۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں۔ بینی نرائن مسلمان ہو گئے تھے اور مولانا سید احمد صاحب بریلوی

سے بیعت بھی کر لی تھی۔

مرزا علی لطف کاظم بیگ خاں کے بیٹے تھے۔ جو استرآباد کے رہنے والے تھے۔ اور ۱۱۵۹ھ میں نادر شاہ کی ہمراہی میں آئے تھے اور بعد کو ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی دہلی میں داخل ہوگئے۔ لطف فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور اپنے باپ کے شاگرد تھے۔ جن کا تخلص ہجر یا ہجری تھا۔ اُردو شاعری کی نسبت لطف کا خود بیان ہے کہ میں کسی کا شاگرد نہیں ہوں۔ دکن حیدرآباد کے سفر کے ارادے سے نکلے تھے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے ان کو روک لیا۔ اور ان کا مشہور تذکرہ "گلشن ہند" ان سے لکھوایا۔ چنانچہ اس قصہ کا ذکر انہوں نے اپنے تذکرہ کے دیباچہ میں کیا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء اور ماخذ نواب علی ابراہیم خاں کا تذکرہ "گلزار ابراہیم" ہے گو کہ اس میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ بالکل نایاب تھا۔ جب حیدرآباد میں طوفان عظیم آیا تو اس کی ایک جلد موسٰی ندی میں بہتی ہوئی جارہی تھی۔ اتفاقاً وہ کسی قدردان کے ہاتھ آئی۔ اور اب وہ ایک نہایت نفیس مفید اور دل چسپ مقدمہ کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اُردو کے اہتمام سے شایع ہوگیا ہے۔ یہ تذکرہ نہایت دل چسپ ہے اس وجہ سے کہ اُس زمانہ کا طرز تحریر اس وقت کے مشہور مشہور شاعروں کے دل چسپ حالات جن سے کہ مصنف سے ملاقات ہوئی اور اس وقت کی سوسائٹی کے مرقعے اس میں موجود ہیں۔ ہرچند کہ صحت واقعات کے لحاظ سے یہ بہت زیادہ قابل وثوق نہیں اور عبارت بھی ضرورت سے زیادہ پُرتکلف و پُرتصنع مسجع و مقفٰی ہے۔

مولوی امانت اللہ ان کا تخلص شیدا تھا۔ انہوں نے اخلاق جلالی کا ترجمہ "جامع الاخلاق" کے نام سے کپتان جیمس مونٹ صاحب کے حکم سے ۱۸۰۵ء میں کیا۔ دیباچہ میں کپتان مذکور اور نیز گورنر جنرل مارکوئس آف ولزلی کی نہایت

مبالغہ آمیز الفاظ میں تعریف ہے۔ مولوی امانت اللہ نے ۱۸۰۳ء میں کتاب ہدایت الاسلام بزبان عربی و اُردو تحریر کی جس کا ترجمہ خود گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں کیا۔ ۱۸۱۰ء میں انہوں نے ایک منظوم صرف ونحو اُردو موسوم بہ "صرف اُردو" تصنیف کی۔

اس عہد کے دیگر منشی اور نثار

علاوہ ان لوگوں کے جن کا ذکر اوپر ہوا اس عہد کے بعض دیگر منشی و نثار یہ تھے۔ سید جعفر علی رواں لکھنوی۔ افتخار الدین شہرت۔ عبدالکریم خاں کریم دہلوی۔ مرزا ہاشم علی عیاں۔ مرزا قاسم علی ممتاز۔ میر عبداللہ مسکین۔ مرزا جان طپش۔ مولوی خلیل علی خاں اشک اور مرزا محمد فطرت۔ اشک نے ۱۸۰۹ء میں اکبر نامہ کا ترجمہ "واقعات اکبر" کے نام سے تیار کیا مگر وہ شایع نہیں ہوا۔ طپش نے ایک کتاب اُردو محاورات پہ لکھی اور ۱۸۱۱ء میں ایک طویل مثنوی بہار دانش کے نام سے لکھی۔ ان کا کلیات فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شایع ہو گیا ہے۔

تراجم قرآن شریف از مولانا شاہ ولی اللہؒ و شاہ عبدالعزیزؒ و شاہ عبدالقادر و شاہ رفیع الدینؒ

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی مشہور محدث و صوفی اٹھارویں صدی کے آخر اور اُنیسویں صدی کے شروع میں ہوئے ہیں۔ ان کے متعدّد تصانیف ہیں جن میں حجۃ اللہ البالغہ اور زالۃ الخفاء عن سیرۃ الخلفاء نہایت مشہور و ممتاز ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب بھی علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں اپنے والد بزرگوار سے کم نہ تھے۔ اُن کا انتقال ۱۲۲۹ھ میں ہوا۔ دوسرے صاحبزادے مولانا شاہ رفیع الدین (۱۱۶۳ / ۱۲۳۳ھ) بھی نہایت جیّد عالم تھے۔ جنہوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ قرآن شریف کا سب سے پہلا اُردو ترجمہ کیا۔ تیسرے صاحبزادے مولانا شاہ عبدالقادر تھے (۱۱۶۷ / ۱۲۳۰ھ) جو اپنے علم و فضل اور کمالات ظاہری و باطنی کے واسطے مثل اپنے پدر بزرگوار اور برادران محترم کے مشہور تھے۔ انہوں نے ۱۲۰۵ھ میں ایک دوسرا اُردو ترجمہ قرآن شریف کا کیا اور ایک تفسیر موضح القرآن کے نام سے تصنیف کی۔ ان کا ترجمہ نہایت سلیس سادہ

اور بامحاورہ اُردو میں ہے جس سے ان کا تبحر علمی بدرجہ اتم ظاہر ہے۔ یہ ترجمہ اس قدر مقبول ہوا اور اب تک ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب اپنے ترجمہ قرآن شریف میں ان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کا پورا خاندان اس علمی خدمت کے واسطے مشہور ہے اور حق یہ ہے کہ یہ حضرات مترجمین متاخرین کے واسطے کچھ نہیں چھوڑ گئے۔ کیونکہ ان لوگوں کے تراجم اصل میں قرآن شریف کے تراجم نہیں ہیں بلکہ خاندان شاہ ولی اللہ کے تراجم کے تراجم ہیں۔ ہمارے نزدیک شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے فی الحقیقت اس تغیر عظیم کا پتہ دیتے ہیں جو زبان اُردو میں ہونے والا تھا جب فارسی کا انحطاط ہو رہا تھا۔

مولوی محمد اسماعیل دہلوی مولوی عبدالغنی کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے پوتے تھے۔ ذہانت اور رسائی فکر میں یگانۂ روزگار اور اپنے عہد کے بہت بڑے عالم باعمل تھے۔ سید احمد مجاہد بریلوی کے ہمراہ جہاد کی نیت سے نکلے مگر قلعہ بالاکوٹ ملک پنجاب کے قریب شربت شہادت سے سیراب ہوئے یہ واقعہ ۱۲۴۶ھ کا ہے شاہ نصیر نے اس واقعہ کو مذاق کے طور پہ ایک قصیدہ کی صورت میں لکھا تھا جس کے دو شعر یہ ہیں :۔

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سیپارہ ۔۔۔ نہ یاد آئی حدیث اُن کو نہ کوئی نص قرآنی
ہرن کی طرح میدانِ وغا میں چوکڑی بھولے ۔۔۔ اگرچہ تھے دُمِ شملہ سے وہ شیرِ نیستانی

جب اس قسم کے طنز آمیز اشعار ان کے مُریدوں نے سُنے تو وہ شاہ نصیر کے مکان پر چڑھ دوڑے اور ان کی خوب خبر لینا چاہی۔ مرزا خانی کوتوال شہر کو[1] جب اس کی

---

[1] یہ مرزا خانی راقم آثم (مترجم) کے دادا تھے جن کی تعریف میں اسی قصیدہ میں بطور شکریہ کے شاہ صاحب نے یہ شعر کہا ہے ؂

نصیرالدین بیچارہ تو دستہ طوس کا بنتا ۔ نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی ۔ (دیکھیے آبحیات۔ ذکر شاہ نصیر)

خبر ہوئی تو وہ موقع واردات پر پہنچے اور شاہ صاحب کو ان لوگوں سے چھڑایا۔ مولانائے موصوف کی مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں ۔

رسالہ توحید ۔ صراط مستقیم ۔ تنویر العینین ۔ تقویۃ الایمان وغیرہ ۔

ترتیب صرف ونحو و لغات اردو

کتب درسیہ اور تراجم کے علاوہ ترتیب صرف ونحو و تراجم کے اوپر بھی پوری توجہ مبذول کی گئی ۔ کتب مذکورۂ ذیل ان یورپین اصحاب کی تصنیف و تالیف ہیں جن کو زبانِ اردو کی ترقی سے بہت دل چسپی تھی ۔ سب سے پہلی ہندوستانی گرامر وہ ہے جو ۱۷۱۵ء میں جان جوشوا کٹیلر نے تصنیف کی تھی جو بزمانہ شاہ عالم دجہاندار شاہ یعنی ۱۷۱۲ء میں مملکت ہالینڈ کی طرف سے ہندوستان میں سفیر تھے ۔ انہوں نے آگرہ، لاہور، دہلی وغیرہ کی بھی سیر کی تھی ۔ ۱۷۱۶ء میں اپنے ملک کی طرف سے ایران میں بھی سفیر ہوئے تھے ۔ انہوں نے ہندوستانی زبان کی ایک لغت تیار کی جس کو ایک انگریز ڈیوڈ ل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا ۔ کٹیلر مذکور کی گرامر میں جو نہ صرف ہندوستانی افعال کی گردانیں ہیں بلکہ احکام عشرۂ توراۃ اور "لارڈس پیرہ" کا ترجمہ بھی اردو میں کیا ہے ۔ سنہ ۱۷۴۵ء میں ایک مشہور جرمن پادری شلٹزنامی نے ایک دوسری ہندوستانی گرامر موسوم بہ "گرامٹیکا ہندوستانی کا" زبان لاطینی میں تیار کی ۔ جس میں ہندوستانی الفاظ بخط عربی و فارسی مع خط انگریزی کے تحریر کیے ۔ اس سنہ میں ل نے ہندوستانی حروف تہجی اور کچھ ہندوستانی الفاظ کے اوپر ایک رسالہ لکھا ۔ ۱۷۴۸ء میں بھی اس مضمون کی ایک کتاب جی ۔ اے ۔ فرٹز نے تصنیف کی ۔ جس میں ہندوستانی حروف تہجی کا دوسرے ممالک کے حروف سے مقابلہ کیا گیا ہے اور ۱۷۷۱ء میں اسی قسم کی ایک تیسری کتاب ایک اٹالوی پادری کیسیانو بیلی گاٹی نے تصنیف کی جس کا نام "الفابیٹم برہمانکم" رکھا ۔ اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی حروف اپنی خاص شکل میں ٹائپ میں لکھے گئے ۔ ۱۷۷۲ء میں ہیڈلی کی گرامر

اور ۱۷۷۸ء میں زبان پرتگالی میں ایک ہندوستانی گرامر موسوم بہ "گرامٹیکا اندوستانا" چھپی۔ اس کے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ کی تصانیف کا زمانہ آتا ہے جنہوں نے نہایت شوق اور تلاش سے متعدد رسائل گرامر اور لغات اور فرہنگیں اور تحقیقات زبان کے متعلق دوسری کتابیں تصنیف کیں اور چھپوائیں ان کی مدت تصنیف بیس برس ہے اور ۱۷۸۷ء سے شروع ہوتی ہے۔ انہوں نے تقریباً پندرہ کتابیں متعلق بہ صرف و نحو و علم الاسنہ و لغات و تراجم و امثال وغیرہ تصنیف کیں۔ اکثر ہندوستانی منشی اور پنڈت جو فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے۔ ان کے ساتھ یہ بھی شریک تصنیف رہے۔ اس کے علاوہ اُن کی نگرانی میں متعدد عمدہ عمدہ ادبی کتابیں تیار ہوئیں مختصر یہ کہ اس عہد کی تصنیفات و تالیفات کے وہ روح رواں تھے۔ اور علاوہ علمی قابلیت و استعداد کے ایسے خلیق متواضع اور ہمدرد واقع ہوئے تھے کہ مختلف اقطاع ملک سے قابل قابل لوگ ان کی قدردانی کا شہرہ سُن کر ان کے پاس جمع ہو گئے تھے ان کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف ایک انگریزی ہندوستانی ڈکشنری مطبوعہ ۱۷۹۶ء اور ایک ہندوستانی گرامر مطبوعہ ۱۸۰۹ء ہیں۔ اسی طرح کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر نے بھی ایک ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۰۸ء میں اور مولوی امانت اللہ نے ایک مختصر ہندوستانی صرف و نحو منظوم موسوم بہ صرف اُردو ۱۸۱۰ء میں تصنیف کیں۔ جان شیکسپیر کی ہندوستانی گرامر ۱۸۱۳ء میں اور ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۱۷ء میں شایع ہوئیں۔ کپتان پرائس اور ٹیبیس نے بھی ہندوستانی کتابیں لکھیں گارسن ڈیٹاسی مشہور مستشرق فرانس نے زبان اُردو کے متعلق متعدد کتابیں زبان فرانسیسی میں تصنیف کیں اور ڈنکن فاربس نے اپنی متعدد تصانیف سے جو از قسم گرامر اور لغت ہیں اور نیز اُردو کی قدیم کتابوں کو ایڈٹ کر کے زبان اُردو کو ممنون احسان کیا۔ سر ولیم ماتیر بانی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور ڈاکٹر فیلن نے بھی نہایت مفید

کتابیں بصورت گرامر اور لغت نے تصنیف کیں۔ پلیٹ کی گرامر ۱۸۷۴ء میں اور ڈکشنری ۱۸۸۴ء میں اور پادری کریون صاحب کی مختصر ڈکشنری ۱۸۸۱ء میں چھپ کر نکلیں اور یہ سب کتابیں طلبا کے لیے نہایت مفید سمجھی جاتی ہیں۔

ہندوستانیوں کے مرتب کردہ لغایت و دیگر کتب

اب دیکھنا چاہیے کہ خود ہندوستانیوں نے اپنی زبان کی ترقی و تدوین میں کیا حصہ لیا۔ انشاء اور قتیل کی متحدہ تصنیف "دریائے لطافت" جس کو زبان اُردو کی سب سے زیادہ مشہور اور قدیم صرف و نحو کی کتاب سمجھنا چاہیے ۱۸۰۲ء میں تحریر اور ۱۸۴۸ء میں بمقام مرشدآباد پہلی بار شایع ہوئی۔ منشی محمد ابراہیم نے ایک اُردو کی صرف و نحو ۱۸۴۵ء اور مولوی امام بخش صہبائی کا ترجمہ حدائق البلاغت ۱۸۴۹ء میں منشی کریم الدین کی قواعد المبتدی نثار علی بیگ فیض اللہ خاں اور محمد احسن کے رسالجات صرف و نحو مولوی محمد حسین آزاد کی کتاب "جامع القواعد" مطبوعہ لاہور ۱۸۴۵ء۔ جلال کی "گلشن فیض" مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۸۰ء جو اُردو ہندی الفاظ و محاورات کی تحقیق کی لغت ہے۔ یہ سب اسی زمانے کی تصنیف ہیں۔ زمانہ حال کی تصانیف میں منشی امیر احمد صاحب کی مشہور لغت امیر اللغات (جو افسوس ہے کہ ناتمام ہے) مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ چار جلدوں میں جو سالہا سال کی کاوش و محنت کا بہت اچھا نتیجہ اور حضور نظام کی سرپرستی اور دریا دلی کا ایک بہترین نمونہ ہے اور مولوی نور الحسن صاحب نیّر کاکوروی کی نور اللغات قابلِ ذکر ہیں۔ انجمن ترقی اُردو نے ایک مختصر رسالہ صرف و نحو ایک نئے طریقے سے ترتیب دیا ہے۔ مگر ہماری ناچیز رائے میں باوجود ان تمام کتب کے جن میں سے اکثر فی زمانہ موجود ہیں پھر بھی ایک مکمل سائنٹیفک اُردو گرامر کی اب بھی سخت ضرورت ہے نیز یہ کہ اگر اس زمانے کے فضلا کمرِ ہمت باندھ لیں اور امیر اللغات کی باقی جلدیں پوری کر دیں اور کوئی دریا دل رئیس اس کی طباعت کا اہتمام کر دے تو اس میں شک نہیں کہ اس

کتاب کے تکمیل سے زبان اُردو کی نہایت معقول اور عمدہ خدمت سرانجام پائے گی۔

عیسائی پادریوں کے کارنامے زبان اُردو کی توسیع و ترقی میں

سب سے قدیم اُردو ترجمے بائیبل کے وہ ہیں جو بنجمن شلز اور کالبرگ نے ۱۷۴۳ء تغایت ۱۷۵۰ء میں کیے۔ مرزا محمد فطرت اور دیگر کالج کے منشیوں نے "عہد جدید کا ترجمہ اُردو میں کیا جو بنظر ثانی ڈاکٹر ہنٹر ۱۸۰۵ء میں کلکتہ سے شایع ہوا۔ اسی طرح سیرام پور کے پادریوں نے بھی بائیبل کے ترجمے اُردو ہندی میں نکالے۔ پادری مارٹن نے ۱۸۱۴ء میں عہد جدید کا ترجمہ زبان یونانی سے اُردو میں کیا جس پر مرزا محمد فطرت نے نظر ثانی کی۔ پوری بائیبل کا ترجمہ سیرام پور کے پادریوں نے پانچ جلدوں میں ۱۸۱۶ء تغایت ۱۸۱۹ء میں شایع کیا۔ پادری لوگ اپنے مطالب عوام الناس پر دل نشین کرنے کے واسطے انہیں کی زبان میں اپنی تحریریں اور تقریریں کرتے تھے۔ اور اشاعت دین کی غرض سے متعدد رسالے پمفلٹ اور اخبار وغیرہ نکالتے تھے جن میں مذہبی روایتوں اور گیتوں کے علاوہ بہت سی مفید چیزیں بھی شامل ہوتی تھیں جن سے زبان کو بہت وسعت اور ترقی حاصل ہوئی ہے۔

باب ۱۶

نثرِ اُردو کا دَورِ متوسّط اور دَورِ جدید

مطبوعات لکھنؤ

ہر چند کہ نثرِ اُردو کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی تھی۔ مگر لکھنؤ بھی جو دلّی کی تباہی کے بعد علم و ادب اور شعر و سخن کا مرکز بن گیا تھا۔ نثرنگاری میں فورٹ ولیم کالج سے کچھ کم نہ رہا۔ کتب ذیل سب اسی اشرف البلاد کی طباعت کی یادگار ہیں:۔ بستان حکمت۔ کلیلہ دمنہ۔ گل بکاؤلی۔ گلشن نوبہار۔ گل وصنوبر۔ نورتن مصنفہ محمد بخش مہجور شاگرد جرأت وغیرہ وغیرہ۔

فقیر محمد خاں گویا
بستان حکمت ۱۲۵۱ھ

نواب فقیر محمد خاں لکھنؤ کے ایک نامور رئیس اور فوج شاہی کے ایک مشہور رسالدار تھے حسام الدولہ خطاب اور گویا تخلص کرتے تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ مگر خواجہ وزیر سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ صاحب دیوان ہیں گو کہ دیوان ان کے مرنے کے ایک عرصہ کے بعد مطبع منشی نولکشور لکھنؤ میں چھپا۔ گویا کا انتقال ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۵۰ء میں ہوا۔ ان کی تصنیف بستان حکمت انوار سہیلی کا مشہور ترجمہ ہے جو ۱۲۵۱ھ میں ختم ہوا اور شیخ ناسخ نے تاریخ لکھی جس کا مصرع تاریخ

ہوتا ہے ؏

خرد گفت بستان سیراب حکمت

سببِ تالیف اس کا مصنف یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک دن وہ اور خواجہ وزیر اور میاں فرخ شاعر کہ یہ دونوں شیخ ناسخ کے شاگرد تھے، اور چند احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور انوار سہیلی کا ذکر ہو رہا تھا۔ اور سب لوگ اس کی تعریفیں کر رہے تھے کہ اثنائے گفتگو میں سب اہل محفل نے مصنف سے اصرار کیا کہ اکثر زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے اگر تم اردو میں ترجمہ کرو تو خوب چیز ہو۔ غرضکہ ان لوگوں کے اصرار پر مصنف نے کمر ہمت باندھی اور ترجمہ شروع کر کے انجام کو پہنچایا۔ اگر کتاب کو بالاستیعاب پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترجمہ لفظی نہیں ہے بلکہ موقع موقع پر ایجاز و اطناب کو دخل دیا ہے۔ البتہ عربی و فارسی الفاظ بہ کثرت ہیں اور زبان بھی شگفتہ اور سلیس نہیں۔ عربی الفاظ اور امثال بکثرت استعمال کیے گئے ہیں جس سے کہیں کہیں بے مزہ اور مغلق ہو گئی ہے۔ مگر یہ بات قابل توجہ ہے کہ عبارت مقفیٰ اور مسجع نہیں جیسا کہ فسانہ عجائب کی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب ایک زمانے میں مقبول تھی مگر اب گو اس کو کم پڑھتے ہیں۔

مرزا رجب علی بیگ سرور
متوفی ۱۲۸۶ھ

لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور نثار مرزا رجب علی بیگ سرور ایک جامع الکمالات شخص تھے۔ باپ کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ ۱۲۰۱ھ یا ۱۲۰۲ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما اور تعلیم پائی۔ عربی و فارسی میں اچھا دخل رکھتے تھے اور اپنے زمانے کے مشہور خطاطوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اس فن میں حافظ ابراہیم کے شاگرد تھے جن کا ذکر فسانۂ عجائب میں موجود ہے۔ موسیقی سے بھی علمی اور عملی دونوں طور پر بخوبی واقف تھے۔ فن شعر میں آغا نوازش تلمیذ میر سوز کے شاگرد تھے جن کا ذکر اپنی کتاب میں

بہت محبت و ادب سے کرتے ہیں۔ حریف ظریف ہشاش بشاش وجیہ اور خوشرو آدمی تھے۔ ان کے دوستوں میں شرف الدین میرٹھی اور مرزا غالب بھی تھے۔ اور آخر الذکر نے فسانۂ عجائب اور گلزار سرور پر فاضلانہ تقریظیں بھی لکھی ہیں۔

۱۲۴۰ھ میں سرور کانپور گئے اور کہا جاتا ہے کہ غازی الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ سے جلا وطن کر دیے گئے تھے۔ وہ کانپور سے نہایت بیزار ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "ربیع الثانی کے مہینے ہیں کہ سنہ ہجری نبوی صلعم بارہ سو چالیس تھے۔ آب کا اتفاق مجبور آ کر وہ کانپور میں ہوا۔ بس کہ یہ بستی پوچ دلچر ہے۔ اشراف یہاں عنقا صفت ناپید ہیں۔ احیاناً جو ہوں گے تو گوشہ نشین عزلت گزیں۔ مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور دیکھ کر دل وحشت منزل سخت گھبرایا۔ کلیجہ منہ کو آیا۔ قریب تھا کہ جنون ہو جائے۔ تیرہ بختی روز سیاہ پیش لائے"۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ یہیں کانپور میں حکیم سید اسد علی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ جو میرے حال پر بڑی عنایت فرماتے تھے۔ ایک دن ان سے کہا کہ میں ایک قصہ لکھنا چاہتا ہوں۔ سن کر فرمایا۔ بیکار مباش کچھ کیا کر۔ اس وقت یہ کلمہ توسن طبع پر تازیانہ ہوا یعنی باعث تصنیف کتاب بن گیا۔ پھر اسی کے آگے ایک طنزیہ طور پر لکھتے ہیں کہ "میں ہیچ میرز ہوں۔ مجھ کو کچھ زبان کا دعویٰ نہیں۔ اگر شاہجہاں آباد کا رہنے والا ہوتا تو زباندانی کا دعویٰ کرتا۔ جیسا کہ میر امن نے کیا ہے جن کی نسبت یوں گلفشانی کرتے ہیں"۔ اگر وہاں (شاہجہان آباد میں) چندے بود و باش کرتا فصیحوں کو تلاش کرتا تو فصاحت کا دم بھرنا جیسا کہ میر امن نے چار درویش میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن وحصہ میں یہ بات آئی ہے دلی کے روڑے ہیں محاورے کے ہاتھ منہ توڑے ہیں پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے۔ کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"۔ مختصر یہ کہ

۱؎ اس سخت تنقید کا جواب خواجہ فخر الدین حسین صاحب سخن دہلوی مرحوم نے سروش سخن میں نہایت دندان شکن اور معقول دیا ہے۔ (دیکھو دیباچہ سروش سخن)

کانپور ہی میں یہ کتاب لکھی گئی۔ اس کے شروع میں چند سطور بادشاہ وقت غازی الدین حیدر کی مدح وثنا میں شاید اس غرض سے لکھی ہیں کہ ان کا قصور معاف کیا جائے اور لکھنؤ آنے کی اجازت دی جائے۔ یہ کتاب غازی الدین حیدر کے زمانے میں شروع ہوئی تھی۔ اور نصیر الدین حیدر کے عہد میں تمام ہوئی۔ جن کی تعریف میں سرور نے لکھنؤ کے حالات کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے اور آخر میں ایک دعائیہ غزل بھی ان کی شان میں ہے۔ جس کا مطلع ہے ؎

تا ابد قایم رہے فرمانروائے لکھنؤ
یہ نصیر الدین حیدر بادشائے لکھنؤ

اسی غزل کے چند مشہور شعر یہ ہیں ؎

یا تو ہم پھرتے تھے ان میں یا ہوا یہ انقلاب
پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کوچہ ہائے لکھنؤ

ان کی استغنا سے کیا کیا آرزو کرتی ہے رشک
جام جم پر تف نہیں کرتے گدائے لکھنؤ

جن و انس و وحش و طائر کیوں نہ سب محکوم ہوں
ہے سلیماں ان دنوں فرمانروائے لکھنؤ

یہ رہے آباد یارب تا بہ دور مشتری
میں کہیں ہوں مانگتا ہوں پر دعائے لکھنؤ

بلبل شیراز کو ہے رشک تا سنح کا سرور
اصفہاں اس نے کیے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

سرور کے اکثر اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب لکھنؤ میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ تحریر ہوئی مگر بعد اختتام بعہد نصیر الدین حیدر لکھنؤ میں آئی اس کا سنہ تصنیف ۱۲۴۰ھ ہے جیسا کہ آخر کے قطعات تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۴۶ء میں سرور کی بیوی کا انتقال اور اسی سال سرور واجد علی شاہ کے درباری شعراء میں بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار داخل ہوئے اور انہوں نے اپنا مدحیہ قصیدہ حضرت ظل سبحانی کی تعریف میں معرفت قطب الدولہ مصاحب شاہی پیش کیا۔ ۱۸۴۷ء میں بادشاہ کے حکم سے کتاب شمشیر خانی کا ترجمہ موسوم بہ سرور سلطانی کیا۔ اور ۱۸۴۷ء اور ۱۸۵۱ء کے اثنا میں اکثر چھوٹے چھوٹے قطعے تصنیف کیے جن میں سے ایک "شرر عشق" ہے جو نواب سکندر بیگم والی بھوپال کے حکم سے لکھا گیا۔

۱۸۵۶ء میں "شگوفۂ محبت" امجد علی خاں رئیس سندیلہ کی فرمائش سے تحریر ہوا۔ انتزاع سلطنت ۱۸۵۶ء کی وجہ سے سرور بہت خستہ حال اور پریشان روزگار ہو گئے تھے۔ کچھ دنوں سید قربان علی سررشتہ دار کاربنگی صاحب اور منشی شیو پرشاد ملازم کمسریٹ نے ان کی اعانت کی لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر نے اس ذریعہ کو بھی منقطع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مہاراجہ ایشری پرشاد نراین سنگھ والی بنارس کی طلبی پر سرور ۱۸۵۹ء میں بنارس گئے اور مہاراجہ صاحب نے وہاں ان کی بہت قدر افزائی اور خاطر مدارت کی۔ بنارس میں انہوں نے "گلزار سرور"۔ "شبستان سرور" اور دیگر نظم و نثر کی چھوٹی چھوٹی کتابیں تصنیف کیں۔ مہاراجہ بنارس کی طرح سرور کو مہاراجہ الور اور مہاراجہ پٹیالہ نے اپنی اپنی ریاستوں میں طلب کیا تھا۔ اور آخر الذکر نے ایک جوڑی طلائی کڑوں کی ان کو مرحمت فرمائی تھی۔ سرور کے ایک خط سے جو ان کی انشائے سرور میں چھپ گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلی لکھنؤ۔ میرٹھ اور راجپوتانہ بھی گئے تھے اس وجہ سے کہ اس خط میں انہوں اپنے سفر کی تکلیفوں کا حال مشرح طور پر لکھا ہے۔ انشائے مذکور میں جو خطوط درج ہیں۔ وہ ان کے سوانح زندگی اور اس عہد کے حالات پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان پر ایک الزام قتل بھی لگایا گیا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں سرور اپنی آنکھوں کے علاج کے لیے کلکتہ گئے تھے اور واجد علی شاہ سے بھی ملے تھے جو اس وقت مٹیا برج میں نظر بند تھے۔ مگر سرور وہاں سے ناکام آئے اور بالآخر اپنی آنکھوں کا علاج لکھنؤ میں ایک ہندوستانی ڈاکٹر سے کرایا اس کے بعد وہ بنارس گئے جہاں ۱۸۶۷ء (مطابق ۱۲۸۴ھ) میں (یعنی غالب سے ایک سال پیشتر) انتقال کیا۔[1]

فسانۂ عجائب سرور کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی تصنیف فسانۂ عجائب ہے۔ اس کا قصہ معمولی حسن و عشق کا افسانہ ہے جس کے مضمون و واقعات میں کوئی جدت نہیں اور عبارت

---

[1] صحیح یہ ہے کہ سرور کی وفات ۱۸۶۹ء ہی میں ہوئی ہے۔ فاضل

اسی زمانے کی مروجہ فارسی کی تقلید میں پُر تکلف و تصنع و مُقفّیٰ اور مسجع ہے اور یہ ایک ایسا فرضی افسانہ ہے جس میں طلسم سحر دیووں سے لڑائی جادوگروں سے مقابلے سفر کے عجائب و غرائب بکثرت ہیں۔ یہ نوجوان طبیعتوں کو بہت مرغوب ہے مگر سن رسیدہ لوگ نفس قصے سے کوئی دل چسپی نہیں رکھتے۔ البتہ ان کی زبان اور مصنوعی عبارت کو اکثر پسند کرتے ہیں۔ اس کی عبارت پُر تکلف ہے مگر اس میں واقعات کی فراوانی نہیں ہے بعض فقرات ضرور ایسے ہیں جو مثل نظم کے دل چسپ اور ادبی مُرصّع کاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس کتاب کو زمانۂ حال کے اصول تنقید سے جانچنا ایک فضول سی بات ہے اس وجہ سے کہ مصنف اگلے زمانے کے لوگوں میں ہیں قصہ بھی پُرانے رنگ کا ہے اور طرز عبارت اس زمانہ کا ہے جب فارسی عام طریقے سے رائج تھی۔ اُردو کے خطوط تک میں تصنع اور تکلف شامل تھا۔ اور سادگی عبارت کو لکھنے والے کی سادہ لوحی اور عدم قابلیت پر محمول کرتے تھے۔ ان قیود پر نظر کرتے ہوئے ہم کو ان لوگوں کا تہ دل سے ممنون ہونا چاہیے جنھوں نے قدیم فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر ایک نئی شاہراہ قائم کی۔ مثلاً مرزا غالب اور سرسیّد وغیرہ جس طرح نظم اُردو کی ابتدا، مرثیوں، غزلوں اور مثنویوں سے ہوئی۔ اسی طرح فرضی قصّوں اور افسانوں پر نثر اُردو کی بنیاد رکھی گئی اور جس طرح اصناف نظم مذکورہ تدریجی ترقی کرتی ہوئی اس درجے کو پہنچیں اسی طرح نثر اُردو بھی اپنے ابتدائی مدارج طے کر کے زمانہ حال کی سلیس اور متین سادہ روش پر آ گئی فسانۂ عجائب کا دیباچہ اس لیے اور بھی دل چسپ ہے کہ اس میں اس زمانے کی شہر لکھنؤ کی سوسائٹی وہاں کی طرز معاشرت۔ امراء و رؤساء کی وضع داریوں اُن کے پُر تکلف جلسوں شہر کے رسوم و رواج۔ کھیل تماشوں۔ دل چسپ مناظر۔ مختلف پیشوں اور اہل کمال کے حالات بازاروں کی چہل پہل۔ سودا فروشوں کی آوازوں وغیرہ وغیرہ کی دلکش اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو سرشار کی مُرقّع نگاری سے علیحدہ سمجھنا چاہیے۔ اس وجہ سے

کہ سرشار کے یہاں کیرکٹر اور مختلف سوسائٹیوں کے بحیثیت مجموعی نمونے دکھائے گئے ہیں۔ ان میں تفصیل و تطویل سے کام لیا ہے۔ اور اپنے ظریفانہ طرزِ بیان سے اس میں ایک دلکش اور نظر فریب رنگینی پیدا کر دی ہے۔ برعکس اس کے یہاں سوسائٹی کے مرقعے یا کیرکٹر نگاری کے کرشمے نہیں ہیں۔ نیز یہ کہ سرورؔ اپنے سلسلۂ بیان میں ان چیزوں پر جن کو وہ بیان کرنا چاہتے ہیں صرف ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرشار بحیثیت ایک ناولسٹ کے کیرکٹر نگاری اور تفصیل جزئیات کو مقدم سمجھتے ہیں اور اس کی سرورؔ کو چنداں ضرورت نہیں۔ اس موقع پر پنڈت بشن نرائن در کے وہ فاضلانہ خیالات سننے کے قابل ہیں۔ جو فسانہ عجائب کو پڑھ کر انہوں نے انگریزی میں قلمبند فرمائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"سرشار کے بہ نسبت سرورؔ کے یہاں لکھنؤ کا بیان بہت زیادہ مکمل۔ بہت زیادہ متناسب اور بہت زیادہ خوب صورت ہے۔ مگر سرورؔ آدمیوں کا حال نہیں لکھتے صرف چیزوں کا مرقع کھینچتے ہیں۔ حلوائی کی دکان کے پاس سے ہم گزرتے ہیں اور ہمارے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ تنبولیوں کے یہاں کی گلوریاں دیکھ کر ہمارا جی للچاتا ہے۔ بالائی کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ لکھنؤ کی بالائی کے آگے ڈیونشایر کی کریم (بالائی) کوئی چیز نہیں لیس فروش جوہری بنیے بقال۔ کبڑیے سب چوکھا مال لیے بیٹھے ہیں۔ چوک اور دوسری بازاریں اور سیرگاہیں (جو اب باقی نہیں رہیں) ہم اس کتاب میں دیکھتے ہیں اور اُن کی خوب سیر کرتے ہیں۔ ہماری نگاہ اُن بلند عمارتوں اور کمروں پر بھی جاتی ہے جہاں سے کچھ حسین صورتیں اپنی جادو بھری نگاہوں سے ہم کو جھانکتی ہیں)۔ ہم چوک میں ہو کر گزرتے ہیں مگر وہ ایک شہر خموشاں ایک سونی بستی معلوم ہوتا ہے۔ راہ گیر اور دکان دار سب سوئے ہوئے ہیں۔ ہم مجمع میں چلتے ہیں مگر کھوے سے کھوا وہاں نہیں چھلتا۔ کمرے والیاں ہمارے اشاروں کا جواب نہیں دیتیں۔ تنبولنیں کرشمہ و ناز میں مصروف ہیں مگر منہ سے کچھ

نہیں ہوتیں۔ کبڑیے بھرے ہیں۔ بساطی بدمست۔ حلوائی اُونگھ رہے ہیں، چیلو اُن کی مٹھائیاں جیبوں میں بھر کر لے چلیں زندگی کا پتہ نہیں۔ مشہور مشہور گویے ہمارے سامنے آتے ہیں مگر اُن کا گانا سُننے میں نہیں آتا۔ شعرا۔ فوجی سپاہی۔ پہلوان۔ بادشاہ۔ وزیر سب سامنے سے فانوسی تصویروں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ سب خاموش معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ سب تصویریں بے ہوشی کے عالم کی کھینچی ہیں۔ لہذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ سرور کا لکھنؤ وہ شہر خموشاں ہے جس کا نقشہ ٹینیسن نے اپنی مشہور نظم "ڈے ڈریم" (خواب روز) میں کھینچا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"کہیں بٹلر (خانساماں) اپنے دونوں گھٹنوں کے بیچ میں شراب کی بوتل دبائے بیٹھا ہے جو آدھی رہ گئی ہے۔ اور کہیں بڈھا اسٹوورڈ (باورچی) اپنے کام میں مصروف ہے۔ کہیں حسین میڈ (ماما) کا ہاتھ نو عمر خادم (پیج) نے پکڑ لیا ہے۔ میڈ کچھ کہنے کے لیے اپنا مُنہ کھولا چاہتی ہے۔ پیج بوسہ کے واسطے مُنہ پکاتا ہے۔ اور شرم کی سُرخی میڈ کے رُخساروں پر دوڑ جاتی ہے"!

اُس زمانے میں مقفیٰ مسجّع عبارت اس درجہ مقبول اور مروّج تھی کہ اس سے احتراز مشکل تھا۔ اسی وجہ سے فسانہ عجائب کی عبارت سلیس اور بول چال روزمرہ میں شمار نہیں کی جاسکتی بر عکس اس کے اس میں تعقید و تکلّف بے حد ہے اور سرور کی کھینچی ہوئی تصویریں جیسا کہ پنڈت بشن نرائن در نے اوپر بیان کیا ہے۔ اشخاص قصّہ کے صحیح خط و خال نہیں دکھاتیں بلکہ وہ محض ان اشخاص کے ماحول اور گرد و پیش کو ظاہر کرتی ہیں قافیہ کی پابندی کی وجہ سے سلسلۂ بیان کی روانی اور سلاست میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اور اکثر جگہ پڑھنے والا الفاظ کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ سرور نے اپنے جذبۂ وطنی کے جوش میں میر امّن بلکہ دِلّی والوں پر اکثر چوٹیں کی ہیں جس کا ذکر اوپر ہو اقصے میں

کیرکٹر تو سی کم ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ملکہ مہر نگار کے کیرکٹر میں سچی محبت، باوفائی دلبری۔ معاملہ فہمی جرأت اور متانت و بردباری کو نہایت واضح طریقے سے دکھایا ہے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ضمناً بعض قصے ایسے بھی بیان کیے ہیں جن کے ہیرو انگریز ہیں۔ مثلاً پسر تحسیٹن کا قصہ جس کے ذیل میں کچھ انگریزی الفاظ آگئے ہیں جو شاید اس سے پیشتر نثر اُردو میں شاذ و نادر استعمال ہوئے ہوں۔ دنیا کی بے ثباتی کا سبق جو بندر کی تقریر سے ملتا ہے اور جوگی کی عبرت افزا نصیحتیں نہایت مؤثر اور دلکش ہیں۔ اس کتاب کے جواب میں دو قصے اور بھی لکھے گئے ایک "سروش سخن" مؤلفہ خواجہ فخر الدین حسین سخن دہلوی جو ۱۸۶۰ء میں تحریر ہوا۔ اور جس میں سرور پر بہت سی چوٹیں کی گئی ہیں اور دلّی والوں کی تعریف میں ہیں۔ دوسرا "طلسم حیرت" مؤلفہ محمد جعفر علی شیون لکھنوی جو ۱۸۷۲ء میں تصنیف ہوا جس میں سرور بلکہ اہل لکھنؤ کی طرف سے "سروش سخن" کے مطاعن کا جواب دیا گیا ہے۔

سرور کی دیگر تصانیف (۱) ۱۸۴۸ء میں سرور سلطانی ترجمہ "شمشیر خانی" جو شاہنامہ فردوسی کا ملخص ہے اس کا بھی طرز عبارت مثل فسانہ عجائب کے مقفیٰ اور مسجع ہے جو تاریخ کے لیے مناسب نہیں۔ اس میں ایک مقام پر جذبۂ وطنیت کے جوش میں میں ہندوستان کی بہت تعریف کی ہے۔ جو قابل دید ہے۔

(۲) ۱۸۵۱ء میں "شرر عشق" میں بھوپال کے جنگلوں کے کسی واقعہ کو بیان کیا ہے کہ ایک سارس کا جوڑا جس کی محبت مشہور ہے۔ ایک جنگل میں پھر رہا تھا کہ نر کو کسی نے مار ڈالا۔ مادہ نے لکڑیاں جمع کیں اور اس پر نہایت باقاعدہ طریقے پر ستی ہو گئی وغیرہ۔

(۳) اسی سال "شگوفہ محبت" بھی لکھا گیا جس میں مہر چند کھتری کا پُرانا قصہ نئے انداز سے بیان کیا ہے اور واجد علی شاہ کے سفر کلکتہ کا بھی اس میں

ذکر ہے۔

(۴) "گلزار سرورؔ" جو ایک فارسی کتاب حدایق العشاق کا ترجمہ ہے جس میں ایک افسانہ کی صورت میں روح اور عشق کا مجادلہ دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک مذہبی مضمون ہے جس کو مصنف نے اپنی خاص رنگین عبارت میں لکھا ہے۔ اسی پر مرزا غالبؔ نے ایک دلچسپ تقریظ اُسی رنگ یعنی مقفی عبارت میں لکھی ہے۔

(۵) "شبستان" یعنی الف لیلہ کے چند قصّوں کا دلچسپ ترجمہ جس میں جابجا چیدہ اشعار داخل کر کے کتاب کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔

الف لیلہ کے ترجمے الف لیلہ کے قصّے ہندوستان میں ہمیشہ سے مقبول رہے اور ان کا ترجمہ اکثر لوگوں نے کیا ہے۔ منشی شمس الدین احمد نے ۱۸۳۶ء میں مدراس سے ایک ترجمہ نکالا جس کا نام "حکایات الجلیلہ" ہے اس میں صرف دو سو راتوں کی حکایات ہیں اور مدراس کالج کے طلباء کے واسطے یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ دوسرا ترجمہ منشی عبدالکریم نے ۱۸۴۷ء میں۔ فارسٹر صاحب کی انگریزی الف لیلہ سے کیا۔ جس کی زبان اس قدر صاف اور سہل ہے کہ ادبی ذوق کے لوگ اس کو معیار سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔ پھر ایک منظوم ترجمہ منشی نولکشور صاحب کی فرمایش سے ۱۸۶۲ء و ۱۸۶۸ء میں چار حصّوں میں نسیم دہلوی۔ منشی طوطا رام شایاںؔ اور منشی شادی لال چمنؔ نے کیا۔ جس کا ایک نثر کا ترجمہ منشی طوطا رام شایاںؔ نے ۱۸۶۸ء میں نکالا۔ اس کے بعد ۱۸۹۰ء میں حامد علی نے ترجمہ کیا۔ اور مرزا حیرتؔ دہلوی نے ۱۸۹۲ء میں "شبستان حیرت" کے نام سے بطرز ناول ترجمہ کیا۔

(۶) شاہزادہ ایڈورڈ (جو بعد کو ایڈورڈ ہفتم) کی شادی کے موقع پر سرورؔ نے ایک تہنیت نامہ موسوم بہ "نثر نثرہ نثّار" لکھا جس میں انگریزی حکومت کے فوائد اور برکات نہایت عمدہ الفاظ میں بیان کیے ہیں۔

(۷) انشائے سرور یعنی سرور کے خطوط جو انہیں کے خاص طرز میں ہیں۔

اُردو نثاروں میں سرورؔ کا مرتبہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم طرز کے اُردو نثاروں میں سرور کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اپنے طرز خاص میں وہ عدیم المثال ہیں۔ مگر بعد کو جب زمانے کا رنگ بدلا اور کاروباری دور شروع ہوا تو اس قسم کی پُرتکلف اور پُرتصنّع عبارت جس کے طویل جملوں اور ثقیل عربی و فارسی الفاظ سے لوگوں کا جی اُکتا گیا تھا اور موجودہ ضرورتوں کے اظہار کے لیے بھی وہ ناموزوں تھی، ترک کی گئی۔ بہرطور سرور نے اپنا رنگ خوب برتا اور اس رنگ کے وہ بڑے ماہر تھے۔ ان کی تمام تصنیفات میں لکھنؤ کے حالات اور یہاں کی سوسائٹی کے مرقعے خاص طور پہ بہت دل چسپ ہیں۔ نثر میں ان کو اتنا تشغف تھا اور اس میں وہ اتنے مشہور ہوئے کہ ان کے دیگر کمالات یعنی ان کی خوش نویسی، ان کی موسیقی دانی۔ یہاں تک کہ ان کی شاعری بھی اس کے سامنے فروغ نہ پاسکی۔ ان کا دیوان مفقود ہے مگر ان اشعار سے جو اُن کی نثر کی کتابوں سے جابجا ملتے ہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی ضرور اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔ سرور گو کہ لکھنؤ کے عاشقوں میں ہیں اور لکھنؤ ہی میں رہے مگر پھر بھی ان کے اشعار سے دلّی کا اتّباع معلوم ہوتا ہے کیونکہ لکھنؤ کے تصنّع اور مبالغہ سے وہ بری ہیں۔

غالبؔ بحیثیت نثّار عام لوگ غالب سے صرف بحیثیت ایک شاعر کے روشناس ہیں۔ اُن کی نثّاری کی حیثیت عام نظروں سے پوشیدہ ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ فارسی اور اُردو دونوں کے بے مثل نثّار بھی اُسی طرح ہیں جس طرح کہ بےنظیر و بے عدیل شاعر ہیں۔ ان کی نثر اُردو کی تصانیف زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں چند تقریظیں اور دیباچے ہیں اور تین مختصر رسالے یعنی لطائف غیبی، تیغ تیز اور نامۂ غالب[۱] جو سب برہان قاطع کے طرف داروں کے جواب میں لکھے گئے۔ اس کے سوا چند اجزا ایک

---

[۱] نامہ غالب کو آب حیات میں مرزا کی تصانیف میں رکھا گیا ہے۔

ناتمام قصّے کے بھی ہیں جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر ان سب میں ان کے وہ خطوط جو اُردوے معلّی اور عودِ ہندی کے نام سے مشہور ہیں اور نیز وہ تقریظیں جو چند کتابوں پر لکھی ہیں نثر اُردو کا بہترین نمونہ اور اُن کے خاص رنگ کا آئینہ ہیں۔

اُردوئے مُعلّٰی اور عودِ ہندی

سنہ ۱۸۵۰ء تک مرزا فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے جیسا کہ اُن خطوط سے پایا جاتا ہے جو پنج آہنگ میں چھپے ہیں اور نیز بعض جگہ خطوط اُردو میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اُنہوں نے اُردو میں خطوط لکھنا شروع کیے ان کا رنگ بالکل مخصوص اور انہیں پر نثر اُردو کی ایک خاص طرز کی بنیاد قائم ہوئی۔ مگر جہاں تک خیال ہے کوئی شخص ان کی پوری تقلید اور نقل میں کامیاب نہیں ہوا۔ یوں تو بہت سی انشاء اور رقعات کی کتابیں موجود ہیں۔ اکثر مشہور لوگوں کے مکاتیب بھی شایع ہو چکے ہیں۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو مرزا کا رنگ سب سے علیحدہ ہے۔ اس میں کسی قسم کا تکلّف اور تصنّع خشونت اور خشکی مطلق نہیں۔ عبارت کی روانی اور سلاست سے معلوم ہوتا ہے کہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں اور مضامین کی کثرت پتہ دیتی ہے کہ ایک دریائے مضامین اُمڈا چلا آتا ہے۔ یہ ایک خاص صفت ہے کہ ہرچند عبارت حد درجے کی بے تکلّف اور روزمرہ ہے مگر ابتذال اور سوقیت اس میں مطلق نہیں بلکہ اس میں ایک ادبی شان ہے۔ بطون ہر فقرے سے عیاں اور ظرافت ہر جملے کی تہ میں پنہاں ہے۔ مرزا اکثر ایسے خیالات کا جن سے ان کا مکتوب الیہ موافق نہ بھی ہو، اس جسارت اور صفائی سے اظہار کرتے ہیں جیسے کہ وہ جانتے ہیں کہ اُن کی تحریر کا زور اور ان کا انداز بیان ان کی زبان بند کر دے گا بلکہ اس کو اُن کے دامِ محبت میں اسیر کر لے گا۔ ان کی تحریر میں بالکل باتوں کا مزہ آتا ہے۔ اور بعض انہوں نے فی الواقع مکالمہ کی صورت میں لکھے ہیں۔ کسی میں مکتوب الیہ کو غائب فرض کر لیا ہے جس

سے مکتوب الیہ کوئی دوسرا شخص معلوم ہونے لگتا ہے۔ قلم کی ایک جنبش سے وہ ایسی سحر آفرینی کر دیتے ہیں کہ دل مزے اٹھانے لگتا ہے۔ مرزا نے اپنے خطوط میں علاوہ ایک طرز خاص اختیار کرنے کے یہ جدت بھی کی ہے کہ القاب و آداب کا فرسودہ طریقہ اور بہت سی اور باتیں جو عموماً خطوط میں لکھی جاتی ہیں مگر در حقیقت فضول اور بیکار ہیں سب چھوڑ دیں۔ وہ ترنج آہنگ میں لکھتے ہیں کہ خطوط نویسی میں میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لیے قلم و کاغذ اُٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے پکارتا ہوں اور اس کے بعد مطلب شروع کر دیتا ہوں القاب و آداب کا پُرانا طریقہ اور شکر و شکوہ و شادی و غم کا قدیم رویہ میں نے بالکل اٹھا دیا۔" مثلاً یہاں چند نمونے اسی نشان کے لکھے جاتے ہیں: "اہا ہا ہا میرا پیارا مہدی آیا، آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رام پور ہے، دار السرور ہے جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔" "آؤ میاں سید زادہ آزادہ دلی کے عاشق دلدادہ ڈھئے ہوئے اُردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے ..." "برخوردار نور چشم میر مہدی کو بعد دُعا ء حیات و صحت کے معلوم ہو بھائی تم نے بخار کو کیوں آنے دیا تپ کو کیوں چڑھنے دیا۔ کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا کہ تم مانع نہ آئے ..." "میری جان! تُو کیا کہہ رہا ہے پنیے سے سیانا سو دیوانا صبر و تسلیم توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے تجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا۔" سید صاحب اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے۔ بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہم زبان کر لینا۔

یہاں ہم مرزا کا ایک خط جو میر مہدی کے نام ہے تمام و کمال نقل کرتے ہیں تاکہ مرزا کی وہ تمام خصوصیات تحریر جن سے ان کی نثر بھی مثل نظم کے معجز نما معلوم ہوتی ہے بخوبی سمجھ میں آسکیں مثلاً خط سے القاب و آداب کا بالکل غائب ہونا اور بجائے اس کے ایک فرضی مکالمہ سے خط کا شروع کر دیا جانا۔ عبارت کی سادگی شوخی اور بے تکلفی۔

مذاق کے پیرایہ میں کچھ دوستانہ نصیحتیں ہی کرنا۔ جدید رنگ زمانہ یعنی جمہوریت پسندی کے برخلاف پرائیویٹ خطوں میں بھی "ملکہ انگلستان" کے پہلے لفظ "جناب" لکھنا جس سے ان کی حد درجے کی قدامت پسندی اور تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ ابتدائی چند سطور کو جن سے خط شروع ہوتا ہے۔ ہم مکالمے کی صورت میں لکھے دیتے ہیں۔ غ سے غالب اور م سے میرن صاحب سمجھنا چاہیے۔

خط بنام میر مہدی

غ۔ اے جناب میرن صاحب السلام علیکم۔

م۔ حضرت آداب۔

غ۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کے جواب لکھنے کی۔

م۔ حضور میں کیا منع کرتا ہوں۔ میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے۔ صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر کیوں تکلیف کریں۔

غ۔ نہیں میرن صاحب اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضروری ہے۔

م۔ حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خفا کیا ہوں گے۔

غ۔ میاں آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو۔

م۔ سبحان اللہ سبحان اللہ اے لو حضرت، آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔

غ۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔

م۔ کیا عرض کروں، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جائے۔

میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔

رغ۔ میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو، تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اس کو خط نہیں لکھا۔

(اس کے بعد مسلسل خط شروع ہوتا ہے)

لاحول ولاقوۃ۔ سنو میر مہدی۔ صاحب میرا کچھ گناہ نہیں۔ میرے پہلے خط کا جواب لکھو تب تو رفع ہو گئی پیچش کے رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں۔ تمہارا پرہیز اگر ہوگا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہوگا۔ حالات یہاں کے مفصل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے۔ دیکھو بیٹھے ہیں۔ کیا جانوں حکیم میر اشرف ہیں اور ان میں کچھ کونسل ہو تو رہی ہے۔ پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں تو ان سے یہ پوچھیو کہ جناب ملکہ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمہاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کر لیجیو کہ یہ جو فارسی مثل مشہور ہے کہ دفتر را گاؤ خورد اس کے معنے کیا ہیں۔ پوچھیو اور نہ چھوڑیو جب تک نہ بتائیں۔ اس وقت پہلے تو آندھی چلی پھر مینہ آیا۔ اب مینہ برس رہا ہے۔ میں خط لکھ چکا ہوں سرنامہ لکھ کر چھوڑوں گا۔ جب ترشح موقوف ہو جائے گا۔ تو کلیان ڈاک کو دے جائے گا۔ میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے۔ اللہ اللہ تم پانی پت کے سد لسان العلماء اور مجتہد العصر بن گئے۔ کہو وہاں کے لوگ تمہیں قبلہ وکعبہ کہنے لگے یا نہیں۔ میر نصیر الدین کو دعا۔"

اس کاٹ چھانٹ سے قدما کی طویل اور غیر دلچسپ طرز تحریر کی درستی ہو گئی اور یہ ایک نہایت عمدہ جدت کی مثال قائم ہو گئی جس سے اردو خطوط نویسی پرانے تکلف و تصنع اور بے موقع اظہار علمیت سے آزاد ہو کر نہایت شیریں اور دلچسپ

بن گئی۔ ہر چند کہ یہ اختراع ان کے معاصرین کو پسند نہ آیا مگر جوں جوں زمانہ بدلتا گیا اور وقت گذرتا گیا۔ اب لوگوں کو اس کی اہمیت کا ضرور احساس ہوا اور ہر طرف اس کے متبعین پیدا ہو گئے۔ مولانا حالی۔ سر سید۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولانا محمد حسین آزاد اور ان کے علاوہ دیگر ارباب قلم مثلاً امیر مینائی۔ اکبر وغیرہ نے بھی سادگی عبارت کو پسند کیا اور اپنے اپنے طریق پر نثریں لکھیں۔ مگر حق یہ ہے کہ مرزا کی سادگی و دلکشی شوخی و ظرافت جذبات نگاری و اظہار مافی الضمیر میں کوئی ان کا مدِ مقابل نہ ہو سکا۔

ان کے رقعات کی ایک بین خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ان کے حالاتِ زندگی کے مصفیٰ اور مجلیٰ آئینہ ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص یہ زحمت گوارا کرے کہ ان کے خطوط کو تاریخ تحریر کی ترتیب سے جمع کرے اور ان کے وہ حصے جو مرزا کے حالات زندگی کے متعلق ہیں علیحدہ کرتا جائے تو مرزا کی ایک مختصر خود نوشتہ سوانح عمری ان سے مرتب ہو جائے گی۔ یہ خطوط ان کی زندگی اور جزئیات زندگی کی تصویریں ہیں ان سے حیات، احباب اور معاصرین سے تعلقات کے متعلق ان کے نظریے اور ہم عصر اور قدیم شعراء کے متعلق ان کے خیالات سب بخوبی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ بعض کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی غرض اصلی مکتوب الیہ کے دل کو خوش کرنا اور اس کا غم غلط کرنا ہے۔ ان کا مذاق ظرافت بھی سب سے نرالا ہے۔ اردو نظم میں تو اس کا جواب ہی نہیں۔ اہل یورپ میں بھی اس قسم کی لطیف ظرافت مفقود ہے فرنچ شاعر والٹیر اور انگریزی نثار ڈین سویفٹ اپنے اپنے طرز میں ایک خاص رنگ ظرافت رکھتے ہیں مگر مرزا ان سب سے علیحدہ ہیں۔ والیٹر کی طرح ان میں نقالی اور سویفٹ کی طرح ان میں تیزی اور دل آزاری نہیں ہے۔ ان کی ظرافت کی لطافت اور نزاکت کا پرتو ایڈیسن میں کچھ کچھ پایا جاتا ہے۔ مرزا کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے نثر اردو کو خشکی اور بدمزگی کے الزام سے بچا لیا۔

مرزا کا قدیم رنگ یعنی مقفیٰ اور مسجع عبارت

مرزا ہر چند خطوط میں سادگی اور سلاست عبارت کے دلدادہ تھے مگر رواج زمانہ کے موافق احباب کی کتابوں پر تقریظیں اُسی پُرانے انداز میں لکھتے تھے۔ اس کی وجہ مولانا حالی کی زبان سے سُننا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں: مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہیے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرنے والے تھے وہ بغیر ان تکلّفات باردہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانہ میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے اس کو اب بھی بہت لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔ یہاں اُن کی دو تقریظوں کی کچھ عبارت بطور نمونہ دی جاتی ہے تاکہ اس رنگ میں بھی اُن کا انداز تحریر بخوبی معلوم ہو سکے۔

(۱) مرزا رجب علی بیگ سرور کی گلزار سرور کی تقریظ: "سبحان اللہ خدا کی کیا نظر فروز صنعتیں ہیں۔ تعالیٰ اللہ کیا حیرت آور قدرتیں ہیں، یہ جو حدائق العشاق" کا فارسی زبان سے عبارت اُردو میں نگارش پاتا ہے۔ بعینہٖ ارم کا بہینِ دنیا سے اُٹھ کر بہارستان قدس کا ایک باغ بن جاتا ہے۔ وہاں حضرت رضوان ارم کے نخل بندو آب یار ہوئے یہاں مرزا رجب علی بیگ سرور حدائق العشاق کے صحیفہ نگار ہوئے۔ اس مقام پر یہ ہیچ میرز جو موسوم بہ اسد اللہ خاں اور مخاطب بہ نجم الدولہ اور متخلّص بہ غالب ہے۔ خدائے جہاں آفریں سے توفیق کا اور خلق سے انصاف کا طالب ہے۔ ہاں اے صاحبان فہم و ادراک سرور سحر بیان کا اُردو کی نثر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہد معنی کے واسطے کیسا گراں بہا پیرایہ ہے مجھ کو دعویٰ تھا کہ انداز بیان اور شوخی تقریر میں فسانہ عجائب بے نظیر ہے جس نے میرے دعوے کو اور فسانہ عجائب کی یکتائی کو مٹا دیا یہ وہ تحریر ہے......"

(۲) منشی میر لعل کی کتاب "سراج المعرفت" کی تقریظ: "حق یوں ہے کہ حقیقت

ازروئے مثال ایک نامہ دہم بیچیدہ سربستہ کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے" لا موثر فی الوجود الا اللہ" اور خط میں مندرج ہے لاموجود الا اللہ اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور اور نام آور ہے کہ جس پہ رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں۔ آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی انبیائے پیشین صلوات اللہ علی نبینا علیہم اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ حجاب تعینات اعتباری کو اٹھا اور حقیقت بے رنگی ذات کی صورت الآن کما کان میں دکھا دیں۔ اب گنجینۂ معرفت خواص امت محمدی کا سینہ ہے اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ مفتاح باب گنجینہ ہے..."

کتب و رسائل اسلامی سے اُردو کی تقویت

ایک بہت بڑی تحریک جو ہر چند ادبی نوعیت نہیں رکھتی تھی مگر اس سے بلا تشبیہ نثر اُردو کو بہت فائدہ پہنچا، اور اُس کی تقویت کا باعث ہوئی۔ مولوی سید احمد شہید بریلوی اور ان کے بزرگ اُستادوں یعنی مشہور و معروف شاہ عبد العزیز اور شاہ عبد القادر کے زمانے میں اشاعت مذہب وہابیت کی صورت میں رونما ہوئی جس کی وجہ سے تبلیغ دین کی غرض سے مختلف کتب و رسائل عوام الناس کے فائدے کے واسطے صاف اور سہل زبان میں لکھے گئے یہ خیال برابر زور پکڑتا اور قوت حاصل کرتا گیا۔ اور گو اصل تحریک جو مولوی صاحب موصوف نے اُٹھائی تھی، ان کی وفات کے بعد امتداد زمانہ سے دب گئی تھی، مگر مشہور راہبر قوم سر سید احمد خاں کے تمام تعلیمی معاشرتی مذہبی اور سیاسی اصلاحات کی وہی رُوح رواں تھی۔[1]

[1] مصنف صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ جو تحریک مذہبی بصورت اشاعت وہابیت مولوی سید احمد شہید کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور جو ترمیمیں اور تاویلیں مذہب میں سر سید مرحوم نے پیش کیں یہ دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔ اس وجہ سے کہ وہابیوں کے اصول کے مطابق جملہ احکام شریعت میں کتاب اللہ اور سُنت رسول اللہ پر بلا کسی توجیہ اور تاویل کے عمل واجب ہے۔ (باقی آیندہ صفحہ ۴۶ پر)

سید صاحب اور ان کے رفقائے کار کے جدید اصولوں کی اشاعت نے گو ملک میں اس وقت بہت بے چینی اور مخالفت پیدا کر دی تھی اور اختلاف کی آندھی سے ملک کی فضا گرد آلود ہو گئی تھی مگر جس قدر کتب اور رسائل ان مسائل کی موافقت و مخالفت میں لکھے گئے ہر چند کہ وہ مذہبی رنگ کے تھے مگر چونکہ وہ سب صاف اور سلیس زبان میں ہوتے تھے اس وجہ سے زبان کو ان سے یقیناً بہت کچھ تقویت اور مدد پہنچی۔

مولوی سید احمد شہید ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوئے اور شاہ عبد العزیز اور شاہ عبد القادر صاحب ایسے بزرگوں سے علوم دینیہ کی تکمیل کی جنہوں نے بعد کو وہابی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چونکہ بڑے قابل اور فصیح شخص تھے لہذا ان کی تقریریں اور وعظ سُن سُن کر لوگ بکثرت ان کے مرید ہو گئے تھے۔ اپنے اصول کی تبلیغ پہلے دلّی میں مکمّل کر کے ۱۸۲۰ء میں کلکتہ گئے اور وہاں سے ۱۸۲۲ء میں حج بیت اللہ کی نیّت سے مکّے روانہ ہو گئے۔ وہاں کچھ دنوں قیام کر کے قسطنطنیہ چلے گئے اور چھ برس تک ٹرکی کی سیر و سیاحت اور نیز اپنے ہم خیالوں کی جماعت پیدا کرتے رہے جب دلّی واپس آئے اور یہاں کے مسلمانوں کے عقاید کا دیگر ممالک کے لوگوں سے مقابلہ کیا۔ تو نسبتاً زمین و آسمان کا فرق پایا۔ اور اسی سے ان کے دل میں اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ چونکہ آدمی پُر جوش تھے لہذا اشاعت دین کے متعلق ان کے جوش کی کوئی انتہا باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ پہلے سکھوں سے انہوں نے جہاد کا اعلان کیا اور ۱۸۲۶ء میں مولوی اسماعیل کو ساتھ لے کر پشاور کی طرف روانہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے مُریدوں اور معتقدوں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔ اور اکثر اُمرار اور مشاہیر نے جو ان کے معتقد اور ہم خیال تھے اس مذہبی کام کے واسطے کافی روپیہ سے ان کی مدد کی تھی۔ ۱۸۲۹ء میں اپنے اس

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) اور سر سید مرحوم اپنے معتقدات اور اصولوں کے ثابت کرنے میں دلائل عقلی اور سے بہت کچھ کام لینا چاہتے تھے جو عقائد وہابیہ کے بالکل منافی ہے۔

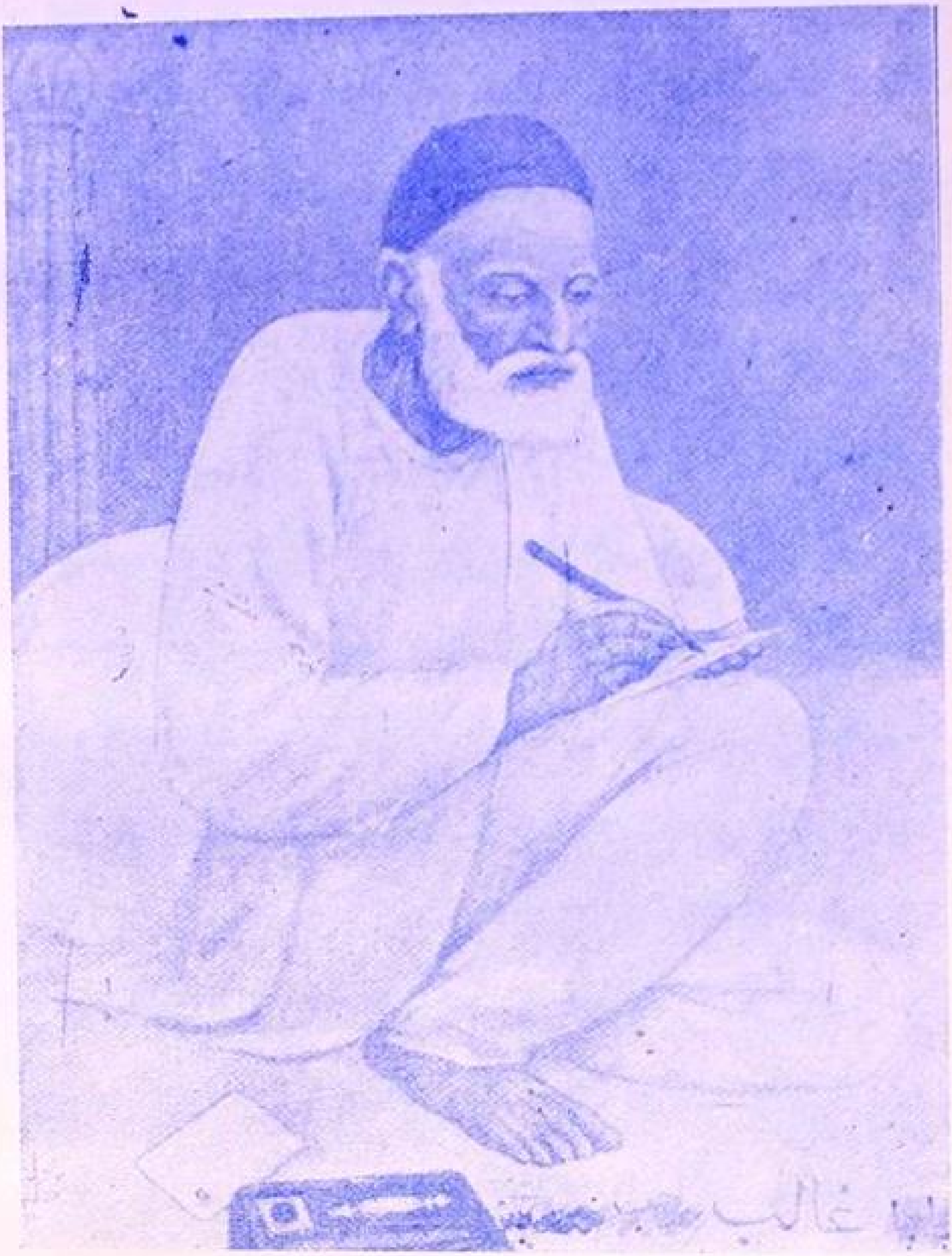

مرزا غالب کچھ تحریر فرما رہے ہیں

رشن میں ان کو اتنی کامیابی ہوگئی تھی کہ پورا پشاوران کے قبضے میں آگیا تھا۔ لیکن بعد کو ان کے اصولوں کی سختی دیکھ افغانوں نے جنہوں نے ان کو مدد دینے کا وعدہ کیا تھا اُن سے بے وفائی کی۔ یہ حالت دیکھ کر وہ دریائے اٹک کے اس پار پہاڑوں میں جا چھپے جہاں ۱۸۳۱ء میں سکھوں کے ایک دستہ سے جس کا سردار شیر سنگھ تھا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے قرآن شریف کی تفسیر عزیزی فارسی میں لکھی جس کا اب ترجمہ اُردو میں ہوگیا ہے اور ان کے بھائی شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو میں کیا جو ۱۸۰۳ء میں ختم ہوا۔ اور ایک شخص سید عبداللہ نامی نے جو مولوی سید احمد مذکور کے مرید تھے ۱۸۲۹ء میں بمقام ہگلی اس کو چھپوایا۔ اسی طرح مولوی سید احمد صاحب کی کتاب تنبیہ الغافلین جو اصل میں زبان فارسی میں تھی اس کا بھی اُردو ترجمہ انہیں مولوی عبداللہ نے ۱۸۳۱ء میں ہگلی سے شایع کیا۔ مولوی اسمٰعیل صاحب کا مشہور رسالہ تقویۃ الایمان اور نیز دیگر مریدان مولوی سید احمد کی تصانیف مثلاً ترغیب جہاد۔ ہدایۃ المومنین نصیحۃ المومنین۔ منح الکبائر والبدعات۔ مائۃ مسائل وغیرہ یہ سب اسی زمانے کی کتابیں ہیں جو اصل میں اشاعت دین کی غرض سے لکھی گئی تھیں۔ مگر جن سے زبان اُردو کو بھی ضرور تقویت پہنچی۔

چھاپہ کی ابتدا منجملہ اور اسباب کے چھاپے نے بھی اشاعت و ترقی زبان میں بہت بڑی مدد دی اور قدیم حالت میں ایک بہت بڑا تغیر پیدا کر دیا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ایک چھاپہ خانہ کھل گیا تھا جس میں ڈاکٹر گلکرسٹ اور کالج کے منشیوں کی تصانیف خود ڈاکٹر گلکرسٹ کے اہتمام میں چھپ کر تیار ہوتی تھیں۔ مگر ان کی تیاری میں اس قدر روپیہ خرچ ہوتا تھا کہ آخرکار یہ مطبع بند کر دینا پڑا۔ اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی بعض کتابیں بھی یہاں نہ چھپ سکیں۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں

جو ٹائپ کے حروف مروّج تھے وہ بھی نہایت بدنما اور بھدّے تھے۔ اسی زمانے میں سیرام پور واقعہ بنگال کے پادریوں نے بھی ایک چھاپہ خانہ کھولا تھا جس میں مختلف ہندستانی زبانوں کی کتابیں چھپتی تھیں۔ ۱۸۱۲ء میں اس چھاپہ خانہ میں آگ لگ گئی اور اکثر کتابیں جل کر خاک ہو گئیں۔ ۱۸۳۷ء میں ایک لیتھو کا چھاپہ خانہ دلّی میں قائم ہوا۔ جس نے اشاعت کتب کو بہت آسان کر دیا۔ اس میں پرانی کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دیگر غیر ملکی زبانوں کے تراجم یا اور کتابیں اور رسائل مختلف مضامین پر طبع ہوتے تھے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں بھی بہت صرف سے اور تکلّف کے ساتھ ایک مطبع ٹائپ کا کھولا گیا تھا جس میں ہفت قلزم چھپی تھی۔ دوسری کتابیں جو اس مطبع سے نکلیں حسب ذیل ہیں۔

مناقب الحیدر۔ بہ زبان عربی ۱۸۱۹ء میں۔ محامد حیدری فارسی میں ۱۸۲۲ء میں (یہ دونوں کتابیں غازی الدین حیدر کی تعریف میں ہیں)۔ گلدستۂ محبت جس میں نواب گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال فارسی زبان میں ہے۔ پنجسورہ بخط طغرا۔ تاج اللغات جو ایک عربی کی لغت زبان فارسی میں ہے ۱۸۳۰ء میں ایک انگریز مسٹر آرچر جنہوں نے ایک لیتھو کا چھاپہ خانہ کانپور میں کھولا تھا۔ نصیر الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ آئے اور یہاں بھی ایک مطبع جاری کیا۔ ایک اور مشہور کتاب جو اس زمانے میں لکھنؤ میں چھپی وہ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ تھی۔ جس کو لارڈ برہم نے سائنس کے فوائد اور اعمال پر تصنیف کیا تھا۔ اس کا ترجمہ سید کمال الدین حیدر معروف بہ میر محمد حسینی لکھنوی نے اسکول بک سوسائٹی کلکتہ کی فرمائش سے کیا اور مطبع سلطانی میں ۱۸۴۳ء میں چھپا۔ یہ ترجمہ نہایت صاف اور سلیس اردو میں ہے۔ سب سے پہلی کتاب جو لکھنؤ میں لیتھو میں چھپی شرح الفیہ تھی۔ ۱۸۴۸ء میں تقریباً بارہ چھاپہ خانے لیتھو کے لکھنؤ میں موجود تھے۔ جن میں مطبع میر حسن اور مطبع مصطفائی بہت مشہور ہیں۔ ۱۸۴۹ء میں

منشی کمال الدین حیدر رضوی نے جو رصد خانہ شاہی کے میر منشی تھے۔ بادشاہ کی خوشنودی مزاج کے واسطے خاندان شاہی کی تاریخ لکھنا شروع کی مگر کچھ باتیں بادشاہ کو پسند نہ آئیں جس کی وجہ سے رصد خانہ توڑ دیا گیا اور کتاب کی طباعت بھی روک دی گئی اور بہت سے اہل مطبع کانپور چلے گئے۔ مطابع کی تاریخ میں سب سے اہم واقعہ اس عہد کا یہ ہے کہ لکھنؤ میں منشی نولکشور صاحب نے اپنا مشہور مطبع جاری کیا جس کی بدولت پرانی پرانی فارسی و عربی و نیز سنسکرت و ہندی کی وہ کتابیں چھپیں جو کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھیں اور اگر شائع نہ ہوتیں تو معدوم ہو جاتیں۔ اس مطبع نے علم کے محدود دائرے کو وسیع کر دیا اور اس کے فوائد ملک کے تمام طبقوں کو یکساں طور پر پہنچائے تعلیم و تعلم کی ارزانی ہو گئی۔ اس میں حدیث و تفسیر قرآن شریف با ترجمہ فقہ اصول وغیرہ جملہ علوم اہل اسلام۔ و نیز وید پران بیدک وغیرہ علوم اہل ہنود یکساں طور پہ نہایت فراخدلی سے شائع کیے گئے۔ قرآن شریف کے مترجم چھپنے سے لوگوں کو اس کے مطالب سے آگاہی ہوئی اور اس سے وہی فائدہ مسلمانوں کو ہوا جو بائیبل کے ترجمے سے مسیحیوں کو پہنچا تھا۔

رسائل و جرائد و اخبارات طباعت کی آسانیوں کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ رسائل و جرائد اور اخبارات زبان اردو میں بکثرت جاری ہوئے جس سے پبلک کے معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا اور ان کو دنیا بھر کی خبریں بے تکلف معلوم ہونے لگیں۔ ہندوستانی اخبارات سے جو لیتھو میں چھپنے لگے پبلک کے لیے تمدنی و اقتصادی معلومات کا ایک دروازہ کھل گیا اور ترقیوں کی راہیں فراخ ہو گئیں۔ اور مضمون نویسوں کو علاوہ توسیع زبان کے یہ موقع بھی ملا کہ وہ اپنی زبان کو یورپی مضامین اور طرز کے موافق ڈھالیں۔ ۱۸۳۲ء میں بجائے فارسی کے اردو سرکاری زبان قرار پائی جس سے اس کا نہ صرف مرتبہ بڑھا بلکہ عربی و فارسی کے وہ سب الفاظ اور مصطلحات جو اب تک اس زبان میں رائج تھے اردو زبان

میں منتقل ہو گئے اور رواج پا گئے۔ مغربی تمدن کے اثر نے بھی زبان کو طرح طرح کے فوائد سے مالامال کیا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ فارسی کی تقلید میں جو عبارت اور لفظوں پر زور دیا جاتا تھا۔ وہ طریقہ متروک ہو کر زبان صاف اور سادہ ہوئی اور بجائے الفاظ کے نفس مطلب اور مضمون پہ زور دیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ درسی کتابیں جو تعلیمی ضرورت سے انگریزی یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئیں ان کا ترجمہ سوائے صاف اور سادہ زبان کے پیچیدہ عبارت میں ہو بھی نہیں سکتا تھا لہذا صاف اور سلیس عبارت میں ترجمہ کی گئیں۔ چنانچہ کلکتہ اور لاہور میں جو انگریزی کتابوں کے ترجمے کیے گئے وہ سب اسی قبیل کے تھے اور اب اردو فارسی سے بے نیاز ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی۔ اس اصلاح کو سرسید ایسے قابل بزرگ کے مساعی جمیلہ نے بہت تقویت پہنچائی۔ یہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کی ایک بزرگ ہستی اور مسلمانوں کے رہبر اور مصلح اعظم تھے۔ جن کا کچھ مختصر حال آگے لکھا جاتا ہے۔

سرسید احمد خاں ۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء جواد الدولہ عارف جنگ سر سید احمد خاں بہادر۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی ہندوستان کے مشہور لیڈر اور ایک فصیح البیان اور جلیل القدر مصنف فلسفی ریفارمر اور مدبر تھے۔

ان کی قابلیت اُن کی ہر دلعزیزی اور ان کی مقناطیسی قوت کے اثر سے بہت قابل قابل اہل علم و فضل ان کے گرد جمع ہو گئے تھے جن کے ادبی کارناموں سے نہ صرف ادب اردو مالامال ہوا بلکہ وہ ایک طرز خاص کے موجد ہوئے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے طرز زندگی اور معاشرت پہ ان کی مساعی جمیلہ کا بہت گہرا اثر پڑا چونکہ سید صاحب کی زندگی مختلف شعبوں اور مشاغل پہ منقسم ہے لہذا ان سب سے قطع نظر کر کے ہم یہاں اُن کا ذکر صرف ایک ادیب اور قومی لیڈر کی حیثیت سے کرتے ہیں۔

---

[1] ولادت ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء مطابق ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ وفات ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء مطابق ۱۳۱۵ھ۔

سرسید مرحوم دلی میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علو مرتبت اور اعزاز کے لحاظ سے ایک مشہور خاندان تھا۔ ان کے آباواجداد جو ابتداءً عرب کے رہنے والے تھے دامغان آئے اور وہاں کچھ دنوں قیام کرکے ہمدان اور ہرات پہنچے۔ ان کے بزرگ شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور یہاں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہوئے۔ عالمگیر ثانی نے سید صاحب کے داداکو جوادالدولہ کا خطاب دیا تھا جو حُسنِ اتفاق سے خود سید صاحب کو بھی عنایت ہوا۔ سید صاحب کے والد میر تقی ایسے قانع بزرگ تھے کہ کہا جاتا ہے جب اکبر شاہ ثانی نے ان کو عہدۂ وزارت پر ممتاز کرنا چاہا تو انہوں نے اس سے انکار کردیا۔ سید صاحب کی والدہ نے جن کا نام عزیز النساء بیگم تھا، جو ایک روشن دل خاتون تھیں، سید صاحب کی پرورش کی، اور ان کو زمانہ کی ضروریات کے موافق تعلیم دلائی۔ سید صاحب نے خوش نصیبی سے ایسا زمانہ پایا تھا جس میں غالب صہبائی، آزردہ شیفتہ، مومن وغیرہ کی طرح کے زندہ دل ارباب کمال موجود تھے۔ مرزا غالب اور سید صاحب میں اس قدر ارتباط تھا کہ سید صاحب اُن کو چچا کہتے تھے۔ ۱۸۳۸ء میں سید صاحب دلی میں بعہدۂ سررشتہ داری مقرر ہوئے اور یہ ان کی پہلی ملازمت تھی۔ ۱۸۳۹ء میں نائب میر منشی اور ۱۸۴۱ء میں امتحان منصفی پاس کرکے منصف ہوئے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دلی کے صدر امین رہے اور اسی زمانے میں اپنی مشہور و معروف کتاب آثار الصنادید لکھی جس میں دلی کے مشہور مقامات اور آثار قدیمہ اور نیز اپنے زمانے کے دلی کے تمام کاملین، اور فقراء، علماء اور شعراء وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کی اتنی شہرت ہوئی اور اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور فرنچ میں گارسن ڈیٹاسی نے ترجمہ کیا جو ۱۸۶۱ء میں شایع ہوا۔

سید صاحب نے ۱۸۴۲ء میں ایک کتاب موسوم بہ "جلاء القلوب" جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا حال ہے۔ ۱۸۴۴ء میں "تحفۂ حسن" ۱۸۴۵ء میں "تحصیل فی جرح السائل" (ترجمہ معیار العقول) ۱۸۴۶ء میں "فوائد الافکار" اور "قول متین" ۱۸۴۹ء

میں کلمۃ الحق ۔ ۱۸۵۰ء میں راہ سنت ۔ ۱۸۵۲ء میں سلسلہ ملوک ہند جس میں دلّی کے بادشاہوں کے مختصر حالات راجہ یدھشٹر کے وقت سے لکھے ہیں ۔ اور ۱۸۵۳ء میں ترجمہ کیمیائے سعادت تصنیف کیں ۔ ۱۸۵۵ء میں سید صاحب بجنور منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے تاریخ بجنور لکھی ۔ آئین اکبری کی تصحیح و تحشی کا فخر بھی سید صاحب کو حاصل ہے مسٹر بلاکمین جنہوں نے آئین اکبری کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے ۔ سید صاحب کی کاوش کے معترف اور ان کی تصحیح کے معترف ہیں ۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی سید صاحب نے مختلف طریقوں سے امداد کی اور جب ان کو ایک علاقہ ان کی خدمات کے صلے میں پیش کیا گیا تو انہوں نے اس کے لینے انکار کر دیا ۔ ۱۸۵۸ء میں انہوں نے اپنا مشہور پمفلٹ "اسباب بغاوت ہند" تصنیف کیا جو ۱۸۶۳ء میں شایع ہوا ۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب " وفادار مسلمانان ہند" کے نام سے شایع کی ۔ برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" کی ایشیاٹک سوسائٹی کی فرمائش سے تصحیح کی ۔ ۱۸۶۰ء میں ان کی تفسیر بائیبل موسوم بہ "تبیین الکلام" شایع ہوئی جس کو قدیم روش کے مسلمانوں نے ناپسند کیا اور اس پر نکتہ چینی کی مگر اہل یورپ نے اس کی بڑی قدر کی ۔ ۱۸۶۲ء میں سید صاحب بدل کر غازی پور آئے جہاں سائنٹیفک سوسائٹی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا ۔ اس سوسائٹی کے قیام کی غرض یہ تھی کہ مشہور اور مستند انگریزی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا جائے ۔ تاکہ اہل اسلام یورپ کے خیالات اور وہاں کے تمدن سے واقف ہوں ۔ ڈیوک آف آرگائیل جو اس زمانے میں سیکرٹری آف اسٹیٹ ہند تھے ۔ اس سوسائٹی کے مربّی (پیٹرن) اور لفٹننٹ گورنران پنجاب و بنگال اس کے وائس پیٹرن بنائے گئے ۔ ایک زمانے میں یہ سوسائٹی بہت مشہور و مقبول تھی اور اس کے ممبروں نے نہایت عمدہ عمدہ رسالے ، مختلف مضامین مثلاً تاریخ یوگرفی زراعت و فلاحت اقتصادیات پر لکھے ۔ ۱۸۶۴ء میں وہ علی گڑھ آئے ۔ اور ان کے ساتھ سوسائٹی بھی وہیں منتقل ہو کر آگئی ۔ ۱۸۶۶ء میں

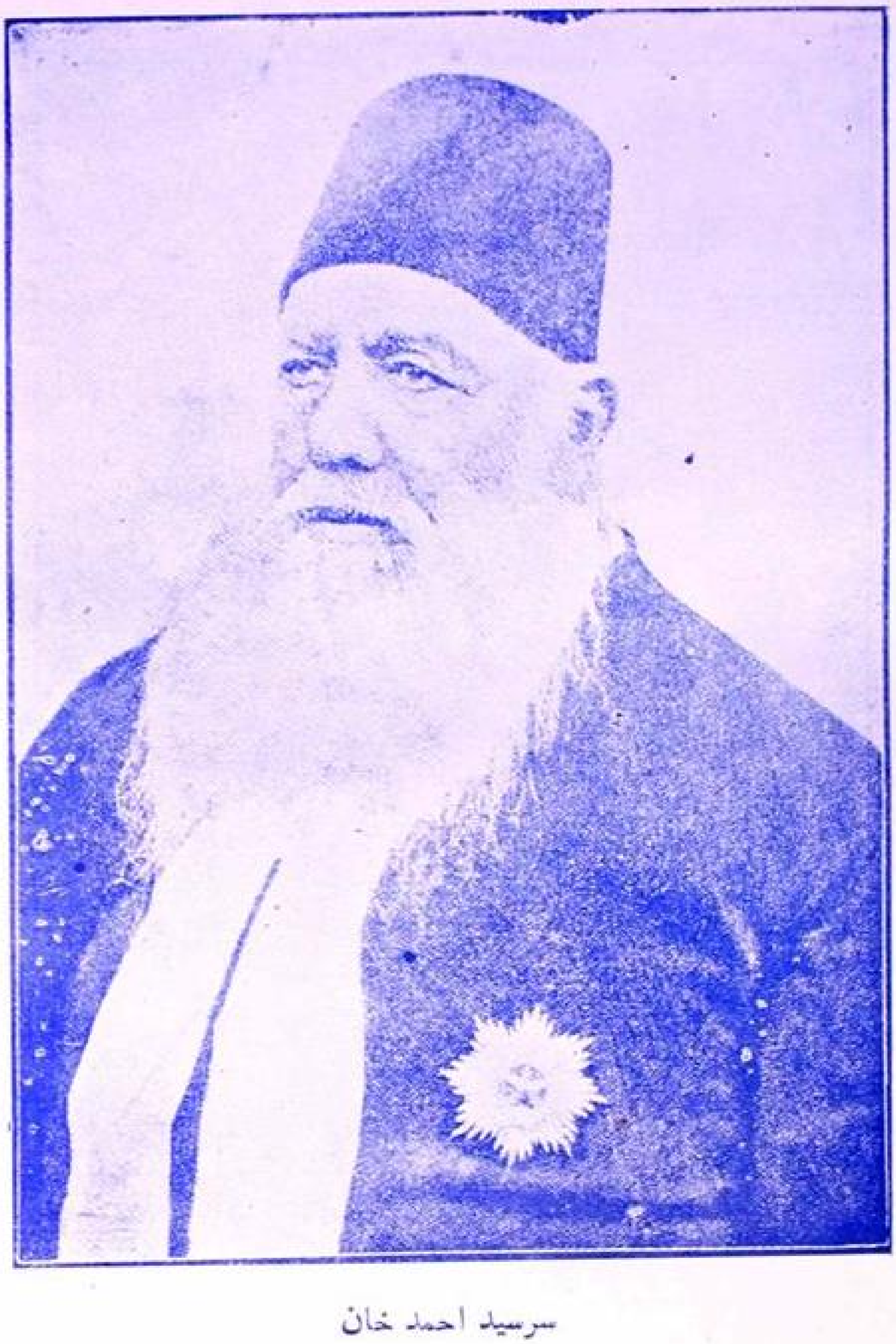

سرسید احمد خان

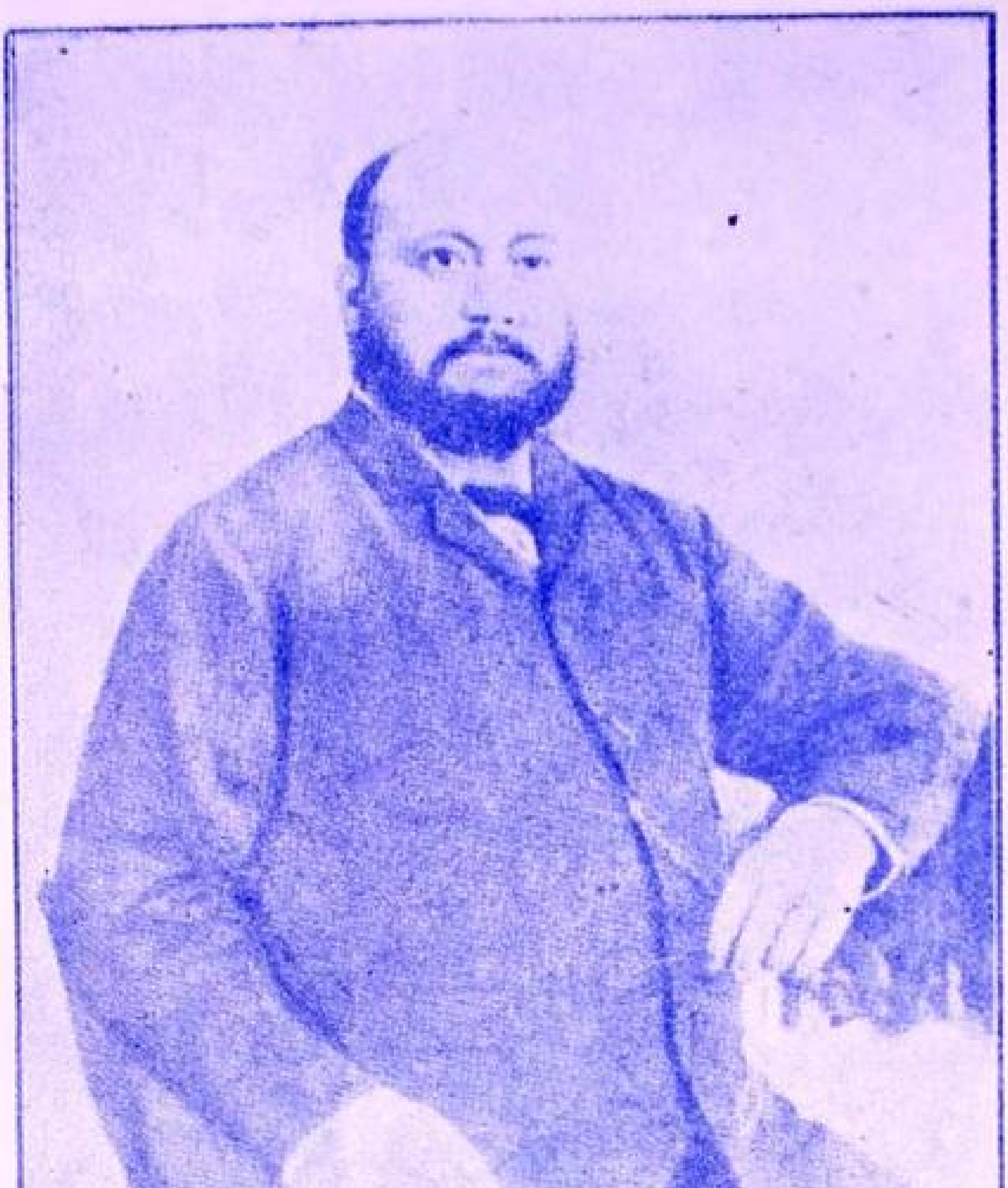

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی

انہوں نے ایک انگریزی اسکول مراد آباد میں اور ۱۸۶۴ء میں اسی طرح کا ایک اسکول غازی پور میں قائم کیا تھا۔ اور مختلف مقامات میں انگریزی تعلیم کے فوائد اور برکتوں پر لیکچر دیے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں انہوں نے ایک انجمن قائم کی جس کا نام برٹش انڈین ایسوسی ایشن تھا۔ اور نیز اپنی سائنٹیفک سوسائٹی کا ایک ماہوار رسالہ "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے نکالا جس میں وہ خود بھی مختلف قسم کے مضامین کچھ نہ کچھ لکھتے تھے۔ انگریزی اخباروں کے بھی اچھے اچھے مضامین اس میں ترجمہ کرا کے شایع کیے جاتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں ان کا بنارس کو تبادلہ ہو گیا۔ مگر ان کے ادبی اور تعلیمی کاموں میں اس سے کسی قسم کا حرج واقع نہیں ہوا۔ اسی عرصہ میں انہوں نے ایک ہندوستانی یونیورسٹی قائم کرنے کی بھی کوشش کی تھی اور گورنر جنرل کو اس مضمون کا ایک میموریل بھی بھیجا تھا اور ان کے اس خیال کے ساتھ ہمدردی بھی ظاہر کی گئی تھی۔ ۱۸۶۶ء میں رسالہ "احکام طعام یا اہل کتاب" تصنیف ہوا جس سے مذہبی لوگوں میں ایک قسم کی شورش پیدا ہو گئی اور سید صاحب ان باتوں کی وجہ سے بہت بدنام ہو گئے۔ ۱۸۶۹ء میں اپنے بیٹے مسٹر محمود کے ساتھ (جو بعد کو الہ آباد ہائیکورٹ کے جج ہو گئے تھے) ولایت گئے اور اہل یورپ کے طرز معاشرت اور اخلاق و عادات اور نیز ان کے سیاسی اور تعلیمی انتظامات کا مطالعہ خوب کیا۔ اسی زمانے میں سر ولیم میور کی مشہور کتاب "لائف آف محمد" (سوانحعمری آنحضرت صلعم) کا ایک دلیرانہ جواب انہوں نے لکھا اور نیز مسلمانوں کے واسطے ایک رہائشی کالج ولایت کے آکسفورڈ اور کیمبرج کالجوں کے انداز پر ہندوستان میں کھولنے کا خیال پیدا ہوا۔ ولایت میں ان کو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اور ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آئے۔ یہاں آکر انہوں نے اپنا مشہور و معروف ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس کے مطالعہ سے مسلمانان ہند کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوا۔ اس سے مسلمانوں کو وہی فوائد پہنچے جو اڈیسن اور

اسٹیل کے رسائل "ٹیٹلر" اور "اسپکٹیٹر" سے اہل انگلستان کو حاصل ہوئے تھے اس کے جاری کرنے کی یہ غرض تھی کہ مسلمانوں کے خیالات علی الخصوص مذہبی خیالات میں وسعت اور ترقی پیدا ہو اور وہ مغربی علوم کی طرف مائل ہوں جس سے ان کے تمام معاشرتی اور تمدنی معاملات میں ضرور اصلاح ہو جائے گی۔ اس میں مختلف قسم کے مضامین مذہب معاشرت اور تعلیم پر لکھے جاتے تھے اور لکھنے والے خود سرسید نواب محسن الملک نواب وقار الملک اور مولوی چراغ علی ایسے بزرگ تھے جو اپنے خیالات کو نہایت صفائی اور آزادی کے ساتھ ظاہر کر دیتے تھے۔ اس رسالہ کی یہ بڑی کوشش تھی کہ مسلمانوں کے دل سے یہ غلط خیال کہ اسلام علوم دنیاوی اور اصلاح کا دشمن یا مخالف ہے نکل جائے اور ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ کن اسباب سے اس قسم کے خیالات ان کے پیشرؤں کے دل میں پیدا ہو گئے تھے۔ وہ نقصان پہنچانے والے اور تکلیف دہ رسوم و قیود کو ترک کریں۔ وہ اپنے افلاس و ادبار کا احساس کریں اور کٹھ ملاؤں کے پنجے سے نجات پا جائیں۔ اسی زمانے میں ایک تفسیر قرآن بھی سید صاحب نے تصنیف فرمائی جس کی چھ جلدیں شایع ہوئیں مگر یہ نصف قرآن تک پہنچی۔ پہلی جلد ۱۲۹۷ھ میں طبع ہوئی تھی۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی باتوں پر جن کا حوالہ قرآن شریف میں ہے۔ بائیبل کے قصص سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ جہاد۔ دوزخ و بہشت۔ معراج وغیرہ پر جو دیگر اقوام نے اعتراضات اور نکتہ چینیاں کی ہیں ان کا شافی جواب دیا گیا ہے۔ بعض تاویلات اور ضعیف و غیر مستند احادیث سے احتراز کی ہدایت کی گئی ہے اور جو شکوک کہ علوم مادی کے پڑھنے سے قرآن کی الہامی کتاب ہونے میں پیدا ہوتے ہیں وہ رفع کیے گئے ہیں۔ مگر ان دونوں چیزوں سے قدیم روش کے مذہبی پیرو سید صاحب کے سخت مخالف ہو گئے۔ ان کو کافر، ملحد، نیچری کے خطابات دیے گئے۔ اکثر اخبارات اور

رسائل صرف اسی غرض سے جاری کیے گئے کہ سید صاحب اور ان کے جدید خیالات کا خاکہ اُڑایا جائے۔ اُردو کے مشہور ظریف اخبار اودھ پنچ میں اُن کے کارٹون نکلے اور مسخر آمیز مضامین نظم و نثر ان کے نسبت لکھے گئے۔ مگر سید صاحب اپنے مشاغل میں سرگرم رہے اور مخالفت کا ان پر مطلق اثر نہ پڑا۔ آخر عمر میں ان کو سوائے اپنے محبوب کالج کی ترقی کے اور کوئی خیال نہ تھا۔ ۱۸۷۶ء میں وہ سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے اور بقیہ عمر تعلیمی اور سیاسی مشاغل میں گزار دی۔ بالآخر ۱۸۹۸ء میں ایک طویل عمر پاکر اور ایک کامیاب زندگی بسر کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور تمام ہندوستان کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔

سید صاحب کا طرز تحریر یقیناً سید صاحب اُردو جرائد نگاروں میں ایک بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کا قلم بہت زبردست اور ان کا تبحر علمی بہت اعلیٰ تھا۔ ان کا طرز تحریر زوردار مگر صاف اور سادہ ہے۔ اس میں کسی قسم کی عبارت آرائی نہیں۔ کچھ غلطیاں بھی اس میں نکلیں گی مگر سید صاحب قواعد صرف و نحو کی پابندی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ مفروضہ قواعد انشا پردازی سے بالکل بے نیاز تھے۔ مگر یہی چیز اُن کی شہرت اور قابلیت کو نقصان پہنچانے کے بجائے اُس میں اور اضافہ کرتی تھی۔ اُن کے طرز جدید نے قدیم تصنع نگاری پر جو بیدل اور ظہوری کی فارسی کی تقلید میں اُردو میں بھی برتی جاتی تھی، ایک ضرب کاری لگائی اور یہ ثابت کر دیا کہ سادہ اور بے تکلف عبارت میں تصنع سے زیادہ خوبیاں ہیں۔ "مضمون کو دیکھو اور عبارت آرائی سے غرض نہ رکھو" یہ سید صاحب کا عمل تھا اور حقیقت میں یہی حال اُن کی تمام تحریروں کا ہے۔ ان کی عبارت ان کے ادائے مطالب میں کبھی قاصر نہیں ہوتی۔ ان کو زبان پر عبور حاصل ہے۔ نثر اُردو لکھنے میں وہ ایسے مشاق تھے کہ ان کے پیشتر کوئی ان کا ہم پلہ نہیں تھا۔ مولانا حالی تو ان کو نثر اُردو کا مورث اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی سید صاحب میں

یہ تھی کہ وہ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مضمون کو خواہ وہ مذہبی ہو سیاسی نہایت صاف اور بے تکلّف زبان میں ادا کر سکتے تھے اور نیز اپنے مضامین کے حسن و قبح کو بھی نہایت زور دار الفاظ میں وضاحت سے بیان کر سکتے تھے مگر سید صاحب اور غالب کے معاصرانہ تعلقات کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مرزا کی طرزِ خاص کا سید صاحب پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی اور بے تکلفی ان کی عبارت میں پائی جاتی ہے اُس کا نقشِ اوّل غالب کے ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا تھا۔

سید صاحب کے رفقائے کار دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے ساتھ والوں میں بھی اپنا ہی ایسا جوش و خروش اور صداقت و راست بازی پیدا کر دیتے ہیں، یہی حال سید صاحب کے حواریوں کا تھا۔ جن کی زبردست جماعت نے اپنے ادبی اور سیاسی کارناموں سے ہندوستان میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ خاص خاص لوگ جو اس جماعت میں شامل ہونے کا فخر رکھتے تھے یہ ہیں:۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، شبلی نعمانی، مولانا نذیر احمد اور مولوی زین العابدین۔ ان میں سے اکثر اصحاب کے کچھ مختصر حالات اس کتاب میں قلمبند کیے گئے ہیں۔ حالی قومی شاعر تھے۔ مولوی نذیر احمد اپنے نصیحت آمیز افسانوں اور ناولوں کے لیے مشہور ہیں۔ شبلی اور ذکاء اللہ فن نقد اور تاریخ کے امام تھے۔ مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے بیش بہا اور گراں قدر مضامین نے ادبِ اُردو کو ہمیشہ کے لیے ممنونِ احسان کیا۔ ان تمام بزرگوں کی مساعیٔ جمیلہ جو مسلمانوں کی اصلاحِ حال کے وقف تھیں نہایت بارآور اور کامیاب ثابت ہوئیں اور ان کی تصانیف سے زبانِ اُردو میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

نواب محسن الملک ۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۷ء محسن الملک نواب سید مہدی علی خاں بہادر ۱۸۳۷ء میں اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ معمولی درسیات سے فراغت کر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی

دس روپیہ ماہوار پر کلارک مقرر ہوئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے ۱۸۵۰ء میں اہلمد پھر سرشتہ دار اور ۱۸۶۱ء میں تحصیل دار سرکاری مقرر ہوئے۔ اپنے خدمات کی انجام دہی میں انہوں نے انتہا درجہ کی قابلیت اور کارگزاری کا ثبوت دیا۔ اور اسی اثناء میں دو کتابیں اردو میں ایک قانون مال اور دوسری قانون فوجداری کے متعلق تصنیف کیں جن کو اُس زمانے میں شہرت ہوئی ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کا مقابلہ کا امتحان کامیابی سے طے کر ۱۸۶۷ء میں مرزاپور کے ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ ان کی قابلیت کی شہرت دُور دُور پہنچی تھی۔ چنانچہ سر سالار جنگ اوّل نے ان کو حیدرآباد طلب کیا اور ۱۸۷۴ء میں وہ مالیات کے افسر اعلیٰ (انسپکٹر جنرل) مقرر ہوئے۔ قیام حیدرآباد کے زمانے میں اُنہوں نے اکثر کام نہایت مفید انجام دیے۔ مثلاً محکمہ بند وبست و پیمائش میں بہت مفید اصلاحیں کیں اور بجائے فارسی کے اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ ۱۸۷۶ء میں ریونیو سکرٹری یعنی اعلےٰ معتمد مال اور ۱۸۸۴ء میں فنانشل و پولیٹیکل سکریٹری کے معزز عہدے پر ممتاز ہوئے اور سرکار نظام سے "محسن الدولہ اور محسن الملک منیر نواز جنگ" کا خطاب پایا۔ سفر انگلستان بھی کیا تھا۔ اور گلیڈسٹون سے ملاقات کی تھی۔ بالآخر پولیٹیکل سازشوں کے سبب سے اپنے عہدہ سے علیحدہ ہو کر اور آٹھ سو روپے ماہوار پنشن پا کر علی گڑھ چلے آئے جہاں بقیہ عمر کالج کے انتظام اور سرپرستی اور تعلیمی خدمات میں صرف کی۔

سید صاحب سے اُن کے بہت قدیم تعلقات تھے۔ مشہور ہے کہ جب سید صاحب شروع شروع مذہب میں کچھ دست اندازیاں کر رہے تھے تو عام مسلمانوں کی طرح یہ بھی ان کو کافر ملحد سمجھتے تھے مگر بعد کو جب ان کی حقیقت سے آگاہ ہوئے تو ان کے بڑے مدّاح اور معاون ہو گئے۔ چنانچہ "تہذیب الاخلاق" میں اکثر بیش بہا مضامین اُنہیں کے قلم سے ہیں جو ایک مذہبی اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی غرض اصلی صرف یہ ہے کہ زمانۂ حال کے مسلمان جو نکبت و فلاکت کے گڑھے میں پڑے ہوئے

ہیں۔ اپنے بزرگان سلف کے قدم بہ قدم چلیں اور اپنے آپ کو ہر حیثیت یعنی تعلیم و اخلاق و سیاست کے اعتبار سے کامیاب بنائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام مضامین اُن کے تبحر علمی، وسیع النظری اور انصاف پسندی کے شاہد عادل ہیں۔ مولانا حالی نے بہت سچ لکھا ہے کہ "سید مہدی علی مسلمانوں کے دلوں کو ان کے بزرگوں کے کارنامے یاد دلا دلا کر اُبھارتے تھے اور جو کچھ کہ انھوں نے سرسید کی تائید میں لکھا وہ بڑے استدلال و استناد سے لکھا۔ اکثر ان کے مضامین جو ایک اچھی خاصی کتاب کے برابر ہیں بڑی تلاش اور محنت سے لکھے گئے ہیں"۔ اسی طرح مولانا شبلی بھی ان کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "کہ میدان ادب میں وہ کسی بڑے سے بڑے نثار سے پیچھے نہیں رہے اور اُن کا ایک خاص طرز تحریر ہے"۔

ان کے طرز تحریر کی خصوصیات یہ ہیں کہ عبارت نہایت زوردار ہوتی ہے مگر پھر بھی صفائی اور سلاست اور حسن بیان میں فرق نہیں پڑتا۔ اگر کہیں پُرانے طرز کی تقلید میں عبارت آرائی اور رنگینی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان کے صنایع بدایع اور استعارات و تمثیلات بُرے نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ حُسن عبارت کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ اس قسم کی پُر تکلف عبارت وہ زیادہ نہیں لکھتے تھے۔ ان کے زیادہ تر مضامین صاف سادہ اور سلیس ہیں۔ علاوہ مضامین مذکورۂ بالا کے ان کی کوئی مشہور تصنیف سوائے "آیات بینات" کے نہیں ہے اور یہ ایک مذہبی رنگ کی کتاب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولوی ظفر علی خاں نے ڈریپر کی مشہور کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" کا ترجمہ نواب صاحب موصوف ہی کی فرمایش سے کیا تھا۔ نواب صاحب نے ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا اور سرسید کے قریب دفن ہوئے۔

نواب وقار الملک ۱۸۴۱ء تا ۱۹۱۷ء خلافت علی گڑھ کے خلیفۂ ثانی نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین، شیخ فضل حسین کے صاحبزادے تھے۔ امروہہ (یو۔پی) کے قریب

ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ایک کمبوہ خاندان سے تھے۔ شروع میں کسی اسکول میں پڑھاتے تھے اور زمانہ قحط میں امروہہ میں کچھ سرکاری خدمات انجام دیں پھر رفتہ رفتہ سررشتہ دار اور منصرم صدر الصدور ہوگئے اور سر سیّد کے ساتھ کام کرتے رہے۔ سر سیّد ہی کی سفارش سے حیدر آباد پہنچے جہاں سالار جنگ کے حکم سے ناظم دیوانی کے عہدہ پر ممتاز ہوئے اور اپنی قابلیت تن دہی اور دیانت سے حکام اعلیٰ کو مطمئن اور خوش رکھا۔ سازشوں کی وجہ سے ان کو بھی حیدر آباد چھوڑنا پڑا مگر پھر جلد بلا لیے گئے۔ اور دوبارہ انہوں نے نہایت عمدہ اور مفید اصلاحیں سرکاری کاموں میں کیں جس کے صلہ میں معزز خطاب "وقار الدولہ وقار الملک" کا سرکار آصفیہ سے عنایت ہوا۔ ۱۸۹۱ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہوکر بقیہ عمر قومی کاموں میں علی الخصوص علی گڑھ کالج کی اصلاح و ترقی میں صرف کردی۔ نواب صاحب موصوف ۱۸۶۶ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کے ممبر اور "تہذیب الاخلاق" کے مہتمم بھی ہوگئے تھے۔ تصانیف آپ کی چند قیمتی مضامین ہیں جو "تہذیب الاخلاق" میں شایع ہوئے اور ایک انگریزی کتاب "فرنچ ریولیوشن اینڈ نپولین" کا اردو ترجمہ "سرگزشت نپولین بونا پارٹ" ہے جس کی تالیف میں منشی گنگا دھاری لال اور بابو گنگا پرشاد نے بھی کچھ حصہ لیا تھا۔ اور ۱۸۷۱ء میں مطبع نول کشور سے چھپ کر شایع ہوا۔

مولوی چراغ علی
۱۸۴۴ء تا ۱۸۹۵ء

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی محمد بخش تھا۔ انہوں نے میرٹھ سہارن پور اور پنجاب میں سرکاری ملازمت کرکے ۱۸۵۶ء میں انتقال کیا اور اپنے بعد چار لڑکے چھوڑے جن میں سے چراغ علی سب سے بڑے تھے۔ چراغ علی ابتدائی تعلیم سے فراغت کرکے ضلع بستی کے محکمہ خزانہ میں مبلغ بیس روپیہ ماہوار پر مقرر ہوئے ۱۸۶۷ء میں عدالت جوڈیشل کمشنر اودھ کے ڈپٹی منصرم اور پھر سیتا پور کے تحصیلدار ہوئے ۱۸۷۷ء میں

سرسید کی کوشش سے حیدرآباد گئے جہاں نواب محسن الملک کی ماتحتی میں نائب معتمد مال بمشاہرہ چار سو روپیہ مقرر ہوئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کرکے ریونیو اور پولیٹیکل سکریٹری کے معزز عہدہ پر بمشاہرہ پندرہ سو روپیہ ماہوار ممتاز ہوئے بعمرہ ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا۔

مولوی چراغ علی نہایت بیدار مغز متدین غیر متعصب اور راست باز شخص تھے۔ کتب بینی کا ان کو اس قدر شوق تھا کہ مقامات دور دراز مثلاً مصر و شام سے کتابیں منگواتے تھے۔ ابتدائے عمر سے مضمون نگاری کا شوق تھا جس میں مذہبی رنگ غالب تھا۔ کبھی کبھی عیسائیوں پادریوں سے بھی مقابلہ ہو جاتا تھا جس میں یہ مذہب اسلام کی خوبیوں کو نہایت شد و مد سے ثابت کرتے تھے، یہ مطالعہ کتب کے عاشق اور پابندی اصول کے ایک پیکر مجسّم تھے۔ ان کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ علاوہ ان کتابوں کے جو ملازمت حیدرآباد کے زمانے میں حیدرآباد کے انتظامی معاملات اور سرکاری رپورٹوں وغیرہ کے متعلق انہوں نے لکھیں، کتب ذیل جو عام دلچسپی کی ہیں مشہور ہیں۔

تحقیق الجہاد۔ مسلمانوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں کیا کیا اصلاحات کیں۔ رسولؐ برحق۔ اسلام کی دنیاوی برکتیں۔ قدیم قوموں کی مختصر تاریخ۔ ان کے علاوہ اُن کے مضامین تہذیب الاخلاق اور وہ خطوط جو "مجموعۂ رسائل" کے نام سے چھپے ہیں اور چند اُردو اور انگریزی پمفلٹ بھی ہیں جو مسائل اختلافی پر لکھے گئے تھے۔ مولوی صاحب موصوف علاوہ ایک متبحر فاضل اور جیّد عالم ہونے کے فن مناظرہ میں ایک بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ اور ان کو مشکل مسائل میں دلنشیں جواب دینے کا ایک خاص سلیقہ تھا۔ اور عبارت بھی نہایت زوردار لکھتے تھے۔ ہر چند کہ اس میں ادبی شان کم ہوتی تھی۔

مولوی محمد حسین آزاد متوفی ۱۹۱۰ء

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد گزشتہ صدی کی تیسری دہائی میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی باقر علی جنہوں نے شمالی ہند

میں مضمون نویسی میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ ذوق کے دلی دوست تھے اسی وجہ سے آزاد کی ابتدائی تعلیم اُستاد ذوق کے سایۂ عاطفت میں ہوئی انہیں کی بابرکت صحبت میں انہوں نے شعر گوئی اور فن عروض سیکھا۔ آزاد پُرانے دِلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے جس سے مولوی نذیر احمد مولوی ذکاء اللہ ماسٹر پیارے لال آشوب ایسے لائق اور ہونہار لوگ پڑھ کر نکلے۔ اُستاد ذوق کے ساتھ یہ بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے اور بڑے بڑے شعراء سے روشناس ہوتے تھے۔ اور انہیں ادبی سرچشموں سے ان کا ذوق سخن سیراب ہوتا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں کے بعد آزاد اپنے وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور سرگرداں پھرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ ان کے والد کا انتقال غدر میں ہو چکا تھا۔ استاد کا کلام اور کچھ خود ان کا کلام جو پہلے کا تھا غدر میں ضایع ہو گیا تھا ہنگامہ غدر فرو ہونے کے بعد آزاد نے کسب معاش کے مختلف ذرایع اختیار کیے۔ کچھ دنوں تک ایک فوجی اسکول میں ماسٹر رہے۔ مگر چند دنوں کے بعد اس کام کو چھوڑ دیا۔ آخر کار پھرتے پھراتے ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے اور مولوی رجب علی کے ذریعہ سے پنڈت من پھول لفٹنٹ گورنر کے میر منشی سے ملے جن کی سفارش سے سررشتہ تعلیم کے محکمہ میں پندرہ روپیہ ماہوار کے ملازم ہو گئے۔ چھوٹے عہدے کی وجہ سے اتنا موقع نہیں ملتا تھا کہ بڑے بڑے افسران سرکاری سے ملیں جو ان کی لیاقت اور قابلیت کا لحاظ اور قدر کر کے ان کو کسی اعلیٰ عُہدے پہ پہنچائیں۔ اتفاق سے ماسٹر پیارے لال آشوب کے ذریعہ سے جو ان کے ہی خواہ اور دوست تھے میجر فُلر صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم تک رسائی ہو گئی جو علوم والسنہ مشرقیہ سے کمال ذوق رکھتے تھے۔ اور رسائی کی صورت یہ ہوئی کہ میجر صاحب نے لفظ ایجاد کو مؤنث لکھا تھا جس کی نسبت تذکیر و تانیث کا کچھ شبہ تھا۔ ماسٹر پیارے لال نے آزاد کو بُلایا اور ان سے اس کی بابت دریافت کیا گیا۔ انہوں نے "ایجاد" کو مذکر کہا اور جب سند مانگی گئی تو یہ شعر سودا کا پڑھا۔

ہائے یہ کس بھڑوے کا ایجاد ہے
نسخہ میں معجون زر نبا د ہے

اس وقت سے میجر صاحب کی خدمت میں ان کی رسائی ہو گئی اور کچھ ترقی بھی ہو گئی۔ سب سے پہلے یہ اُردو فارسی کی درسی کتابیں لکھنے پر مامور ہوئے۔ چنانچہ فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب۔ اُردو کی پہلی۔ دوسری اور تیسری اور قصص ہند اس زمانے کی ان کی مشہور تصانیف ہیں جو بتدریج میں نہایت مقبول ہوئیں۔ اور انہیں تصانیف کی بدولت پنجاب میں اسکولی تعلیم بہت رائج ہوئی۔ آزاد کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ انہوں نے انجمن پنجاب کے قیام میں بہت بڑا حصہ لیا جس کی وجہ سے صوبہ پنجاب میں اُردو کی ترقی اور ترویج ہوئی۔ جب میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیم مقرر ہوئے جن کو زبان اُردو کا محسن سمجھنا بالکل بجا ہے تو ۱۸۷۴ء میں آزاد نے کرنل صاحب موصوف کو اس بات پر آمادہ کیا کہ انجمن پنجاب کی سرپرستی میں ایک خاص مشاعرہ قائم کیا جائے جس کی غرض یہ ہو کہ اُردو شاعری کی مبالغہ آمیز اور پُر تصنع روش بدل جائے اور اس میں حقیقت اور اصلیت کی رُوح پیدا کی جائے۔ ۱۸۶۵ء میں وہ کسی سرکاری کام سے کلکتہ اور پنڈت من پھول کی معیت میں ایک سفارتی مشن پر کابل و بخارا گئے تھے۔ ایران وہ دو مرتبہ گئے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۶۵ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۸۸۳ء میں۔ زبان فارسی سے اُن کو ایک خاص لگاؤ تھا اور اسی وجہ سے اس کا مطالعہ انہوں نے خاص طور پر کیا تھا۔ اور ایران کے قیام نے ان کو جدید فارسی سے بھی آشنا کر دیا تھا۔ انہیں وجوہ سے ان کی وہ تصانیف جو زبان فارسی کے متعلق ہیں دلچسپی اور معلومات سے پر ہیں۔ کرنل ہالرائڈ نے آزاد کو "اتالیق پنجاب" (ایک سرکاری اخبار) کا سب ایڈیٹر بمشاہرہ پچھتر روپیہ ماہوار مقرر کیا تھا۔ اور ایڈیٹر رائے بہادر پیارے لال آشوب تھے۔ جب تھوڑے عرصے کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا اور "پنجاب میگزین" اس کی جگہ نکلا تو آزاد اس کے بھی سب ایڈیٹر

مقرر ہوئے اور ان کے بعد مولانا حالی کچھ دنوں اس عہدے پر متعین رہے۔ آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر بھی ہو گئے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر ان کی قابلیت کے صلہ میں ان کو شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔ دماغی محنت اور سفر ایران کا تعب اور اپنی پیاری بیٹی کی بے وقت موت کی وجہ سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور جن کو نہایت عمدہ تعلیم دلائی تھی، ان کے قوائے دماغی پر بہت بڑا اثر پڑا جس کی وجہ سے ۱۸۸۹ء میں کچھ جنون کے آثار معلوم ہونے لگے۔ جس سے وہ کسی ادبی کام کے لائق نہیں رہے۔ آخر عمر تک یہی حالت جنون کی رہی اور ۲۲ر جنوری ۱۹۱۰ء کو اس جہان فانی سے رحلت کی۔

تصانیف آزاد کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

فارسی ریڈریں (۲ حصے)، قدیم اردو ریڈریں (۳ حصے)، اردو کا قاعدہ و قواعد اردو۔ قصص ہند۔ جامع القواعد نئی اردو ریڈریں (۳ حصوں میں) آب حیات۔ نیرنگ خیال۔ سخندان فارس۔ قند پارسی۔ نصیحت کا کرن پھول۔ دیوان ذوق۔ نظم آزاد۔ دربار اکبری۔ نگارستان فارس۔ سیاک دنماک۔ جانورستان۔

ریڈریں اور اسکولی کتابیں اردو اور فارسی ریڈریں اور ابتدائی رسائل صرف و نحو طلبائے اسکول اور مبتدیوں کے واسطے لکھے گئے تھے۔ ان سب کی عبارت نہایت سلیس اور عام فہم ہے اور فی الحقیقت طلباء کے واسطے وہ بہت مفید اور کچھ عرصہ تک وہ داخل درس رہی بھی ہیں بالخصوص قصص ہند جس میں تاریخ ہندوستان کے مشہور مشہور حالات و واقعات عجیب دل چسپ بلیغ اور پر زور عبارت میں لکھے گئے ہیں۔ یہ لاجواب کتاب جماعت طلباء میں اور نیز پبلک میں بے حد مقبول ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بچے اس کو دل چسپ واقعات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور پڑھے لکھے اس کی عبارت کے دلدادہ ہیں۔ جملوں کا توازن۔ عبارت کی چستی الفاظ کی شکوہ۔ اور

مضامین کی ترتیب اس کی ہم جنس کتابوں سے اس کا درجہ بلند کر دیتی ہے۔

آب حیات مولانا آزاد کا شاہکار اور ان کی بہترین تصنیف آب حیات ہے۔ اس میں مشہور مشہور شعراء کے مختصر حالات مع ان کے نمونۂ کلام اور تنقید کے درج ہیں اور زبان اُردو کی تاریخ اور اُن تغیّرات کا بھی ذکر ہے۔ جو زبان اُردو میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں۔ حقیقت میں اس کتاب کی تصنیف سے ایک بہت بڑی کمی پوری ہو گئی۔ اس وجہ سے کہ گو کہ اس سے قبل اکثر تذکرے اور مجموعۂ اشعار موجود تھے مگر وہ قابلِ اعتنا نہ تھے اور نامکمل بھی تھے۔ بعض کا تو یہ حال تھا کہ مشہور مشہور شاعروں کا حال صرف چند سطروں میں لکھ دیا۔ اور ان میں بھی آدھے سے زیادہ محض کلمات توصیف و تحسین۔ ادب اُردو آزاد کا ممنون ہے کہ انہوں نے ایک باقاعدہ اور مفصّل تذکرۂ شعراء ترتیب دیا۔ جس کے واسطے یقیناً ان کو بڑی محنت اور کاوش کرنا پڑی ہو گی۔ وہ ایک ایسا خزانۂ معلومات ہے کہ جس سے مابعد کے مصنفین بہت کچھ مدد لے سکتے ہیں اور لیتے رہے ہیں۔ علاوہ اس خوبی یعنی گنجینۂ معلومات ہونے کے اُس کی اصلی خوبی اُس کی بے مثال طرزِ عبارت ہے کہ جس کی نقل کی سب کوشش کرتے آئے ہیں مگر کما حقہٗ کوئی نہیں کر سکا۔ الحق آزاد نے آب حیات لکھ کر ادب اُردو میں ایک جدید طرز کا اضافہ کیا جو مثل حالی کے سادہ اور عاری از زیب و زینت نہیں اور نہ مولوی نذیر احمد کی طرح ثقیل اور وزنی ہے وہ ایک زوردار اور سب سے جدا رنگ رکھتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو احاطۂ بیان سے باہر ہیں اور صرف دل اُن سے لُطف اُٹھاتا ہے مگر اسی کے ساتھ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا نے اپنے جوش و شوق میں تاریخی مواد کو غور و خوض سے نہیں دیکھا غیر موثق اور غیر معتبر حوالوں کی بنیاد پر سر بفلک عمارتیں کھڑی کر دیں۔ اور بعض جگہ کتاب میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے واقعات میں کمی و بیشی اور تبدیلی تک کو

جائز رکھا۔ مگر زمانہ حال کے تجسس و تلاش اور تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ آبحیات کے اکثر بیانات غلط یا کم از کم مشکوک ضرور ہیں۔ اکثر جگہ جانب داری کا الزام بھی مصنف پر عائد ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے استاد ذوق کی بے حد تعریف و توصیف اور ان کے حالات میں شغف اور مرزا غالب کے کمالات سے نسبتاً بے پروائی بلکہ جگہ جگہ ان پر در پردہ چوٹیں۔ مرزا دبیر کے خاندان کو کم کر کے دکھانا۔ انشا کے آخری زمانے کے عبرت انگیز غیر موثق حالات وغیرہ۔ یہ اور اسی قسم کی باتیں جو اب اُفق مطالعہ پر نظر آئی ہیں۔ آب حیات، کے اکثر بیانات کے متضاد اور مخالف واقع ہیں۔ پھر بھی اگر اس قسم کی اور بھی غلطیاں نکل آئیں تو اس سے ہماری رائے میں کتاب کی اصل خوبی اور قدر و قیمت میں کوئی زیادہ فرق نہیں آتا۔ اسی کتاب سے تنقید کا صحیح معیار اُردو میں قائم ہوا۔ حالی کی یادگار غالب کو اسی کتاب کے مطالعہ کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ مختصر یہ کہ بحیثیت ایک قدیم تذکرہ کے۔ بحیثیت ایک خزانہ واقعات و حکایات کے۔ بحیثیت غیر قابل تقلید ہونے کے یہ کتاب آپ اپنی جواب ہے اور آئندہ بھی اس کا جواب مشکل معلوم ہوتا ہے۔

نیرنگِ خیال یہ بھی ایک جدید رنگ کی کتاب ہے جس میں خیالی افسانوں اور خواب وغیرہ کے پردہ میں عمدہ اخلاقی نتائج نکالے ہیں۔ یہ دو حصوں میں ۱۸۸۰ء میں تصنیف ہوئی تھی۔ اس قسم کے فرضی افسانے اور حکایات ہر زمانہ اور ہر قوم میں لوگوں کے مطبوع خاطر رہے ہیں۔ یونانی اور رومی لوگوں کو ان کا بہت شوق تھا۔ انگریزی میں ایڈیسن جان بنین اور اسپنسر کے ایلیگری (خیالی قصے) مشہور ہیں۔ اور فارسی میں مثنوی مولانا روم۔ اور انوار سہیلی۔ سنسکرت میں ہتوا پدیش اور عربی میں اخوان الصفا وغیرہ۔ ہمارے خیال میں آزاد نے اپنے قصوں کی بنیاد یونانی قصوں پر رکھی ہے اور اس سے ان کی یونانی علم الاصنام کی واقفیت کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے ان کو اس کتاب کے لکھنے کی ترغیب

دی تھی اور اس کا خاکہ تیار کر دیا تھا۔ مگر یہ بڑی قابل تعریف بات ہے کہ مولانا آزاد باوجود انگریزی کم جاننے کے اس اتباع میں کامیاب رہے یہ کتاب ان کے خاص طرز تحریر میں لکھی گئی ہے۔ مگر نفس مضمون سے زیادہ طرز بیان بہت دل چسپ ہے۔

سخندان فارس ادب فارسی کے متعلق یہ کتاب بھی بہت دل چسپ ہے۔ دراصل یہ ایک قیمتی رسالہ علم فلالوجی پر ہے جس میں فارسی اور سنسکرت زبانوں کو متحدالاصل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اہل ایران کے رسوم ورواج کا بھی ذکر ہے اور اُن کا مقابلہ ہندوستان سے کیا ہے۔ خود مصنف کے سفر ایران اور ان کے علمی مکاشفات کے حالات بھی درج ہیں۔ بمثل مولانا شبلی کی شعر العجم کے یہ ایک مکمل کتاب نہیں کہی جاسکتی مگر پھر بھی بہت مفید اور ایک ذخیرۂ معلومات ہے۔

قند پارسی اور نصیحت کا کرن پھول قند پارسی ایک مفید کتاب ہے جس سے زمانۂ حال کی فارسی کے حاصل کرنے میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ اس میں مولانا کے سفر ایران کے بھی بہت کچھ حالات درج ہیں۔ نصیحت کا کرن پھول جو ایک مکالمہ اور نصایح کے پیرایہ میں ہے۔ بچوں اور عورتوں کے لیے بہت مفید ہے۔ اس کی عبارت بہت صاف و سلیس ہے۔

دیوان ذوق اس کتاب کی ترتیب و تالیف سے مولانا آزاد نے ادب اُردو کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے اور اپنے اُستاد کے کلام کو گمنامی سے بچا لیا ہے۔ تذکرۂ آبحیات میں انہوں نے نہایت پُرماتم اور دردناک لہجہ سے اور تفصیل کے ساتھ استاد کے کلام کا ضایع ہو جانا اور پھر ان اجزائے پریشان کو بڑی محنت اور دقتوں سے جمع کرنا بیان کیا ہے۔ دیوان کے شروع میں ایک مختصر دیباچہ ہے۔ اور بعض بعض غزلوں کے ساتھ اُن کے حالات تصنیف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور بیشتر کے مطبوعہ کلام سے ایک ثلث اضافہ بھی اس میں موجود ہے۔ ان دل چسپ نوٹوں سے نہ صرف اشعار کی قدر و قیمت

بڑھ گئی ہے بلکہ اس میں ایک " رومان " کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ بعض لوگوں نے الحاقی کلام پر شک بھی ظاہر کیا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اس قسم کے شکوک بے بنیاد ہیں اور ان پر زیادہ نہ خیال کرنا چاہیے۔

دربار اکبری یہ اہم بالشان تصنیف اکبر بادشاہ کے عہد اور ان کے ارکین سلطنت کے حال میں ہے۔ اس کتاب کی عبارت اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ افسوس ہے کہ اس پر نظر ثانی نہ ہو سکی۔ اس کتاب میں عہد اکبری کی چلتی جاگتی تصویریں ہیں۔

دیگر تصانیف " پاک ودماک " و " جانورستان " اس زمانے کی تصانیف ہیں جب کہ مولانا صحیح الدماغ نہ رہے تھے۔ اول الذکر ایک غیر مربوط مجموعہ متصوفانہ خیالات کا ہے جو آمی عالم میں لکھے گئے تھے۔ اس سے کتنا بڑا شوق تصنیف و تالیف کا پایا جاتا ہے۔ کہ باوجود تعطلی دماغ کے بھی جب کبھی چند لمحے سکون کے ملتے تھے تو وہ ان کو ادبی کاموں میں صرف کرتے تھے۔ اسی زمانے اور اسی حالت کی تصنیف "جانورستان" بھی ہے۔ جس میں کچھ جانوروں کے حالات اور ان کی آوازوں کا بیان ہے۔ "نگارستان فارس" جو بعد ان کے انتقال کے شائع ہوئی ایران ہندوستان کے فارسی شعراء کا ایک مختصر تذکرہ ہے۔ جس میں رودگی سے لے کر حزیں اور واقف و آرزو تک تقریباً ۱۶۳ شعرا کے حالات مع ان کے نمونہ کلام کے درج ہیں۔ اس کی زبان بہت صاف و سادہ مگر مثل آب حیات کے پُر لطف نہیں ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ یہ ان کی ابتدائی تصنیفات میں سے ہو۔ آخر کتاب جو ان کے نام ان کے پوتے نے شائع کی ہے۔ "آکہیات" ہے۔

آزاد کا مرتبہ اُردو نثاروں میں اُردو نثر نگاروں میں آزاد کی ایک بہت رفیع اور بہت نمایاں ہستی ہے۔ بحیثیت بانی تحریک جدید ہونے کے۔ بحیثیت جدید طرز کے شاعر کے۔ بحیثیت ایک فارسی اسکالر کے جو قدیم رنگ کے ساتھ جدید رنگ کے بھی

بڑے ماہر تھے۔ بحیثیت ایک مروج تعلیم کے۔ جن کی وجہ سے پنجاب میں انگریزی کے ساتھ اردو فارسی کی تعلیم نے بھی بڑا رواج پایا۔ بحیثیت ایک اعلیٰ مضمون نگار کے بحیثیت ایک زبردست ناقد کے۔ بحیثیت ایک مشہور پروفیسر اور مصنف کے۔ بحیثیت حامیٔ اردو کے۔ بحیثیت ایک زبردست مقرر کے آزاد اپنے زمانہ میں عدیم المثال تھے مگر وہ چیز جس نے ان کو زندہ جاوید کر دیا وہ ان کا خاص طرزِ تحریر ہے جو لاثانی ہے اور جس کی تقلید محال ہے۔ زبان اردو نے ان کی ذات میں اپنا ایک بڑا مددگار اور حامی پایا تھا۔ ان کے طرزِ تحریر کی یہ خاص صفت ہے کہ فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اور دور از کار صنایع بدایع جن کا آج کل بہت رواج ہے اس میں نہیں پائے جاتے۔ ان کی عبارت کی یہ خاص نشان ہے کہ بھاشہ کی سادگی اور بے تکلفی۔ انگریزی کی صاف گوئی فارسی کا حسن و خوبصورتی اس میں ملی جلی ہوتی ہے۔ وہ تصنعات اور تکلفات سے کوسوں دور ہے مگر لطیف استعارے اور خوبصورت تشبیہیں اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں وہ ایک موسیقیت رکھتی ہے۔ آزاد کا مقابلہ انگریزی انشار پردازوں میں ڈی کوئینسی، ہیمسے اور اسٹیونسن سے جو صاحبان طرزِ خاص تھے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اپنے زمانے میں بھی آزاد بہت ہر دل عزیز اور مقبول ہو چکے تھے اور ان کے معاصرین ان کو نہایت قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ حالی نے آبِ حیات اور نیرنگِ خیال کی تقریظوں میں ان کی بہت تعریف کی ہے اور شاعری کی طرزِ جدید کا ان کو بانی قرار دیا ہے۔ اسی طرح مولانا شبلی ان کو اردو کا ایک بہت بڑا ہیرو سمجھتے تھے اور ان کی موت پر ان کو خدائے اردو کہہ کے یاد کیا۔ مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاءاللہ بھی ان کے بڑے مداح اور قدر دان تھے۔

آزاد ظریف الطبع۔ نہایت مہذب متین اور تعصب سے بالکل آزاد تھے وہ سریع الغیظ مگر جلد معاف کر دینے والے تھے۔ بعض معاصرین سے چشمک رہتی تھی جس کا انجام بحث و

مناظرہ کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔

حالی | خواجہ الطاف حسین حالی کا ذکر بحیثیت شاعر کے حصہ نظم میں ہو چکا ہے۔ یہاں بحیثیت معزز نثار کے ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:-

تریاق مسموم مطبوعہ ۱۸۶۶ء، علم طبقات الارض کی ایک عربی کتاب کا ترجمہ۔ مجلس النسار (۲ حصوں میں) مطبوعہ ۱۸۹۶ء۔ حیات جاوید یعنی سرسید مرحوم کی سوانح عمری مطبوعہ ۱۹۰۱ء۔ مضامین حالی۔ یعنی ان مضامین کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل میں چھپے ہیں۔

ابتدائی تصانیف | "تریاق مسموم" پانی پت کے ایک شخص کے اعتراضات کا جواب ہے جو مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا اور جس نے اسلام پر اعتراضات کیے تھے۔ اس میں کوئی ادبی خوبی نہیں۔ محض اس لیے دلچسپ ہے کہ اس سے ان کی ذکاوت اور طباعی کا پتہ چلتا ہے۔ "طبقات الارض" ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے جو خود فرانسیسی سے کیا گیا تھا۔ یہ ڈاکٹر لیٹنر کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ مجالس النسار" ایک انعامی رسالہ ہے جس کے صلہ میں مولانا کو مبلغ چار سو روپیہ کا انعام لارڈ نارتھ بروک وائسرائے ہند نے عطا کیا تھا۔ یہ عورتوں کے واسطے بہت مفید ہے اور لڑکیوں کے اسکولوں میں ایک عرصہ تک بحیثیت درسی کتاب کے داخل رہی ہے۔ اس میں بہت سے ایسے الفاظ و محاورات ہیں جو شریف گھرانے کی عورتیں بولتی ہیں۔

حیات سعدی | حیات سعدی یعنی شیخ سعدی شیرازیؒ کی سوانح عمری۔ اس سے مولانا نے اردو نثاروں کی صف اول میں جگہ پائی اور ان کی سوانح نگاری کی قابلیت اور اسلوب بیان کا پتہ چلا۔

مقدمہ شعر و شاعری | مولانا کے دیوان کے شروع میں یہ معرکۃ الآرا مقدمہ ہے جس نے اردو کی ادبی دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ مولانا کی شہرت کا یہی سنگ بنیاد ہے۔

اس میں نو سَو سے زیادہ صفحات ہیں۔ اور گو کہ دیوان کے ساتھ چھپا ہے مگر اس کو دیوان سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ایک نہایت قابلانہ تنقیدی مضمون نفس شاعری کے آئیڈیل (انتہائی نقطۂ خیال) پر ہے۔ اس کی تصنیف سے بڑے تجسُّس و تلاش اور وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں یونانی و رومی و انگریزی و عربی نقادانِ فن، شعر کے خیالات شعر کی بابت قلمبند کیے گئے ہیں۔ ہر چند کہ نہایت مجمل اور غیر مربوط طریقے سے اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔ یورپین شاعری میں مولانا حالی تہ تک غوطہ نہیں لگا سکتے کیونکہ اس بحر کے وہ شناور نہیں ہیں۔ سنسکرت کی شاعری کو بوجہ عدم واقفیت زبان بالکل چھوڑ دیا ہے۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے کتاب ایک ذخیرۂ معلومات ہے اور اس وجہ سے اس قسم کے فنِ نقد میں سب سے پہلی تصنیف ہے نہایت قابلِ قدر ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی جو مغربی تعلیم سے بالکل ناآشنا تھا۔ اس کے مطالعہ سے قدیم طرز کے شعراء کے سامنے جدید معلومات اور تخیّل کے دروازے کھل گئے ہیں۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کی تقلید میں زمانہ موجودہ کے اکثر دواوین کے ساتھ اکثر مقدمات لاطائل شائع ہوتے رہتے ہیں جن کا ماخذ درحقیقت یہی مقدمۂ شعر و شاعری ہے۔ اور کسی جدید بات کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔

یادگارِ غالب مولانا کی سب سے زیادہ ہر دل عزیز تصنیف "یادگارِ غالب" ہے۔ جس سے بہتر کوئی کتاب اس طرز کی اب تک نہیں نکلی۔ اس میں مرزا غالب کی زندگی کے حالات و واقعات ان کے لطائف و ظرائف وغیرہ نہایت عمدہ اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد ان کے ہر قسم کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ چونکہ مصنف مرزا صاحب کے شاگرد تھے لہذا اکثر واقعات چشم دید لکھے ہیں مشکل اشعار کے معانی بھی سمجھائے ہیں اور ان مواقع کا بھی بیان ہے جب وہ اشعار کہے گئے تھے جس سے اشعار کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس تصنیف کے ذریعہ

حالی نے اپنے استاد غالب کی شاگردی کا حق اسی طرح ادا کر دیا جس طرح کہ آزاد نے دیوان ذوق کو ترتیب دے کر ذوق کو زندہ جاوید بنا دیا۔ دونوں اپنے استادوں کے شاگرد رشید اور دل سے چاہنے والے تھے "یادگار غالب" تنقیدی کتابوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ تنقید گو کہ اعلیٰ درجہ کی ہے۔ مگر پھر بھی جوش عقیدت مندی کہیں کہیں جادۂ انصاف سے ہٹا دیتا ہے۔

حیات جاوید حالی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ کتاب ہے جس کی وجہ سے خود انہوں نے حیات ابدی پائی۔ یہ ایک بہت مفصل اور جامع ضخیم کتاب ہے۔ اس میں سرسید مرحوم کی طویل اور مختلف الاحوال کثیر الاشغال زندگی کے حالات اس قدر تفصیل کے ساتھ درج ہیں کہ اس کو زبان اُردو میں وہی مرتبہ حاصل ہو گیا ہے جو باسویل کی مشہور کتاب "ڈاکٹر جانسن کی لائف" کو انگریزی میں ہوا ہے۔ سرسید بحیثیت ایک لیڈر اور مدبر اور ریفارمر اور اہل قلم کے دکھائے گئے ہیں۔ سرسید کے ساتھ ان کے اکثر شرکائے کار کے بھی حالات مندرج ہیں۔ یہ ایک مہتم بالشان تصنیف ہے لیکن اس میں ہیرو کی تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہے اسی وجہ سے مولانا شبلی کا اعتراض بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب میں تصویر کا صرف ایک رُخ دکھایا گیا ہے معائب سے یا تو چشم پوشی کی گئی ہے یا ان کی کوئی توجیہ کر دی گئی ہے۔ مگر ہماری رائے میں اس زمانے کی تصانیف کو اتنی سختی کے ساتھ جانچنا مناسب نہیں ہے۔ اس وجہ سے کہ سوانح نگاری اور فن تنقید ہمارے یہاں ابھی ابتدائی حالت میں ہیں اور زیادہ تر قطع و برید سے بجائے نفع کے نقصان کا احتمال ہے۔

مضامین حالی وہ مضامین ہیں جو مولانا نے وقتاً فوقتاً اخبارات و جرائد میں علی الخصوص تہذیب الاخلاق میں چھپوائے ہیں۔ ان کے علاوہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے مکاتیب کا ایک مجموعہ بھی انہوں نے ترتیب دے کر چھپوایا ہے۔

طرزِ تحریر مولانا کی عبارت نہایت صاف و سادہ زبردست اور زور دار ہوتی ہے۔ مگر اس میں آزاد کی سی شوخی اور رنگینی اور مولانا نذیر احمد کی سی نمانک اور لطیف ظرافت نہیں ہوتی۔ حالی گو کہ صاحب طرز نہیں مگر بہترین نثار ہیں۔ وہ اسلوب بیان سے زیادہ نفس مطلب کا خیال رکھتے ہیں۔ صنایع بدایع کی نہ ان کے یہاں کثرت ہے اور نہ ان کا بے جا استعمال وہ کرتے ہیں۔ محض لفاظی اور عبارت آرائی وہ کبھی نہیں کرتے۔ اور عبارت کی ظاہری آرایش سے وہ قطعاً احتراز کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی عبارت بہت سلجھی ہوئی اور صاف ستھری ہوتی ہے۔ گو کہ وہ بلند پروازی نہیں کرتے مگر زور بیان اور فصاحت سے اُن کی عبارت مالا مال ہوتی ہے۔ جدید نثر اُردو نے ان کو اپنا بہت بڑا حامی اور مددگار پایا اور اُنھوں نے مرزا غالب اور سرسید کے طرز تحریر کو زندہ رکھا۔ ان کی تصانیف آئندہ نسلوں کے واسطے بہترین نمونہ سمجھی جا سکتی ہیں۔

مولانا نذیر احمد ۱۸۳۱ء تا ۱۹۱۲ء

شمس العلماء، خان بہادر مولانا نذیر احمد موضع ریٹر ضلع بجنور میں میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علم و فضل کے لیے مشہور تھا۔ والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ اور انہیں سے انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور سے بھی کچھ پڑھا اور دلّی میں آکر ۱۸۴۵ء میں مولوی عبدالحق کے شاگرد ہوئے جن کی پوتی سے انہوں نے عقد بھی کیا۔ دلّی کالج کے مشہور پروفیسر عربی مولوی مملوک علی کے اصرار سے وہ دِلّی کالج میں داخل ہوئے اور یہاں ادب عربی اور فلسفہ و ریاضی وغیرہ میں تکمیل حاصل کی۔ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کی ترغیب سے انگریزی بھی شروع کی مگر والد کی مخالفت کی وجہ سے چھوڑنا پڑی۔ اس زمانہ میں ان کے ہم سبق حالی، آزاد، منشی کریم الدین۔ مولوی ذکاء اللہ اور پیارے لال آشوب تھے۔ مثل اُس زمانے کے اور بڑے لوگوں کے مولوی نذیر احمد نے بھی

زندگی کی ابتدا ایک چھوٹی سی ملازمت سے کی یعنی وہ پنجاب میں کسی مقام میں بیس پچیس روپیہ ماہوار کے ٹیچر مقرر ہو گئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس مشاہرہ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے۔ غدر کے زمانے میں انہوں نے کسی میم کی جان بچائی تھی۔ جس خدمت کے صلے میں ایک تمغہ اور کچھ زر نقد سرکار سے ملا اور انسپکٹر مدارس کے درجے پر ترقی ہوئی۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ الہ آباد میں ہو گیا اور یہیں انہوں نے تھوڑی سی انگریزی سیکھ لی۔ کیونکہ ان کو نہایت شرم و حجاب معلوم ہوتا تھا کہ جو زبان حاکم و محکوم کے درمیان تبادلہ خیال کا ذریعہ ہے اس سے وہ محروم ہیں۔ اپنی طباعی اور ذہانت سے انہوں نے چھ مہینے کے اندر انگریزی میں کافی مہارت پیدا کر لی اور بعد کو کتب بینی سے اس قابل ہو گئے کہ ۱۸۶۱ء میں انڈین پینل کوڈ کے ترجمہ کی خدمت پر منجملہ دیگر اشخاص کے وہ بھی مقرر ہوئے۔ ان کا ترجمہ (مجموعہ تعزیرات ہند) ایسا مقبول ہوا اور پسند آیا کہ اس کے بعد وہ تحصیلدار اور پھر افسر بندوبست ہو گئے۔ انہوں نے نجوم کی بھی ایک کتاب کا ترجمہ کیا تھا جس کو اس زمانے کے رزیڈنٹ کشمیر نے لکھا تھا۔ اور مبلغ ایک ہزار روپیہ انعام پایا تھا۔ ان کی قابلیت کا شہرہ سن کر سالار جنگ اوّل نے ان کی خدمات گورنمنٹ سے اپنے یہاں منتقل کرالیں اور افسر بندوبست بمشاہرہ آٹھ سو روپیہ ماہوار مقرر کیا۔ اسی عرصہ میں انہوں نے قرآن شریف بھی حفظ کیا۔ اور بعد کو سالار جنگ کے ایما سے انگریزی ملازمت چھوڑ کر حضور نظام سے مستقل ملازمت اختیار کر لی جس میں وہ ترقی کرتے کرتے اعلیٰ ممبر مال بمشاہرہ ستر۷۰۰ روپیہ مقرر ہوئے اور ان کے بیٹے اور اعزہ کو معقول جگہیں اچھے اچھے عہدوں پر دی گئیں۔ سالار جنگ کے حکم سے انہوں نے ایک نصاب تعلیم تیار کیا تھا۔ اور سالار جنگ کے صاحبزادہ نواب لائق علی خاں اُن کے شاگرد رہے تھے۔ ایک عرصہ تک اپنے عہدہ کے فرائض منصبی انجام دے کر ملازمت سے دست کش ہو گئے۔ اور بقیہ عمر اپنے وطن مالوف دہلی میں یاد الٰہی

اور تصنیف وتالیف کے مشغلے میں بسر کی۔ ۱۹۱۲ء میں ایک نہایت کامیاب و معروف زندگی کے بعد اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کی اور ملت قوم کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔ مولانا موصوف سرسید کی اُس جماعت کے ایک معزز فرد تھے کہ جنہوں نے اپنی تصنیف و تالیف اور اپنے لکچروں کے ذریعہ سے اپنے ہم مذہبوں کی ترقی میں بڑی اعانت کی تھی۔

تصانیف مولانا کی تصانیف بہ کثرت ہیں جن میں سے حسب ذیل بہت مشہور ہیں:۔

(از قسم ناول و حکایات) مراۃ العروس۔ بنات النعش۔ توبۃ النصوح۔ ابن الوقت۔ محصنات۔ ایامیٰ۔ رویائے صادقہ۔ منتخب الحکایات (کتب مذہبی و اخلاقی) ترجمہ قرآن شریف ادعیۃ القرآن۔ دو سورہ۔ الحقوق والفرائض۔ مطالب القرآن۔ امہات الامۃ۔ اجتہاد (متفرق کتابیں) صرف صغیر۔ رسم الخط۔ موعظہ حسنہ۔ افسانۂ غدر۔ نصاب خسرو۔ چند پند۔ مبادی الحکمۃ۔ مائیٹیفیک فی الصرف۔ مجموعۂ لکچر اور انگریزی قانونی کتابوں کے ترجمے مثلاً تعزیرات ہند۔ قانون شہادت وغیرہ۔

مولانا کثیر التصنیف اور سریع التصنیف دونوں تھے۔ ان کی اکثر کتابیں۔ مثلاً مائیٹیفیک فی الصرف۔ مبادی الحکمۃ۔ منتخب الحکایات۔ رسم الخط وغیرہ اسکولوں کے طلباء کے واسطے لکھی گئیں اور واقعی ان کے واسطے بہت مفید ہیں۔ سرکاری ایکٹوں کے ترجمے گورنمنٹ کے حکم سے کیے گئے۔ مجموعہ تعزیرات ہند یعنی پینل کوڈ کے ترجمہ کو ان کا ایک کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ اس مشہور قانون کے ترجمے کے واسطے پہلے مولوی کریم بخش اور مولوی عظمت اللہ مقرر ہوئے تھے پھر سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر کے حکم سے مولوی نذیر احمد ان کے کام کی نگرانی اور نظر ثانی کے لیے مقرر ہوئے اور انہوں نے بڑی محنت و جانفشانی اور بڑی قابلیت سے یہ کام انجام دیا۔ ان کے تمام قانونی تراجم نہایت عمدہ اور صحیح ہیں جس میں اکثر جگہ نہایت مناسب اور ٹھیک الفاظ مشکل الفاظ انگریزی

کے لیے اردو میں وضع کیے گئے ہیں جو زبان زد خلایق ہو گئے ہیں۔ قانون شہادت یعنی ایوی ڈنس ایکٹ کا ترجمہ لیپرون کی کتاب سے کیا گیا ہے"۔ افسانۂ غدر" ایڈورڈ صاحب کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے۔ جس میں انہوں نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعض دل چسپ سوانحات کو قلم بند کیا ہے۔ ان کے علاوہ سات آٹھ چھوٹی چھوٹی مختصر کتابیں اور رسائل ہیں جو قیام حیدر آباد کے زمانے میں وہاں کے عمال کے لیے بطور ہدایت نامہ لکھے گئے تھے مگر چھپے نہیں۔

کتب مناظرہ و متعلق کتب

اس زمانے میں مسلمانوں اور عیسائی واعظوں سے جن میں سے بعض دین اسلام کو چھوڑ کر مسیحی ہو گئے تھے اکثر مباحثے رہتے تھے اور بڑے بڑے لوگ مثلاً سرسید۔ مولوی چراغ علی۔ نواب محسن الملک وغیرہ ان میں بڑی دل چسپی لیتے تھے۔ ایک عیسائی مبلغ احمد شاہ نامی نے امہات المومنین کے نام سے ایک لکھی تھی جس میں پیغمبر اسلام کے ازواج مطہرات کی نسبت کچھ بے جا الزامات قائم کیے تھے۔ مولوی نذیر احمد نے اس کے جواب میں "امہات الامہ" لکھی جس کی بعض لوگوں نے تو بہت قدر کی بعض نے سخت برا سمجھا اور ان کے بارے میں اتنا اختلاف بڑھا کہ اس کی جلدیں آخر میں جلا دی گئیں۔ اور وہ دوبارہ بعد ترمیم چھاپی گئی۔ مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا اردو ترجمہ قرآن شریف ہے جو نہایت آسان اور بامحاورہ زبان میں کیا گیا ہے۔ اس سے ان لوگوں کو بڑا نفع پہنچا جو قرآن شریف کو از بر بلا معنی سمجھے یاد کر لیا کرتے تھے۔ اس سے پیشتر جس قدر ترجمے قرآن شریف کے ہوئے تھے ان کی زبان قدیم تھی۔ اکثر الفاظ متروک ہو گئے تھے اور ترجمہ تحت اللفظ تھا۔ اسی وجہ سے مقبول عام نہ تھا۔ مولانا نے چار علموں کی مدد سے پورا ترجمہ نہایت محنت جانکاہی سے تین برس کے عرصہ میں پورا کر دیا۔ مگر اس میں بھی اتنا نقص ضرور ہے کہ بعض جگہ ترجمہ کی متانت قائم نہ رہی اور اصل الفاظ کا مطلب اردو الفاظ و محاورات کے لیے بجا

تصرف سے جاتا رہتا ہے اور نیز یہ کہ کثرت تشریح اور اضافہ تمثیلات کی وجہ سے ترجمہ ترجمہ نہیں رہتا بلکہ ایک تفسیر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر عمر میں انہوں نے ادعیۃ القرآن۔ دہ سورہ اور الحقوق و الفرائض تصنیف کیں جن میں سے آخر الذکر ایک بہت جامع اور مکمل کتاب ہے۔ ان کی آخری تصنیف جو نامکمل رہ گئی "مطالب القرآن" ہے۔ اب یہ چھپ گئی ہے۔ مولانا نے پاس ایک مطبع بھی تھا جس کا نام شمسی پریس تھا۔ اس میں ان کی تصانیف چھپا کرتی تھیں۔

اخلاقی ناول | سب سے پہلی کتاب جس سے مولانا کی شہرت کو ترقی ہوئی ان کا ناول مراۃ العروس ہے جو ایک معزز مسلمان خاندان کی (پرائیوٹ) نجی زندگی کا ایک قصہ ہے اس کی تصنیف اس وقت ہوئی تھی جب مولانا ڈپٹی کلکٹر تھے۔ قصہ کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ ایک جاہل بے پڑھی لکھی لڑکی ایک شریف گھرانے کی تعلیم کے ذریعہ سے کیونکر بدل گئی۔ یہ کتاب مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں مقبول ہے اور عورتیں اس کو بہت ذوق و شوق سے پڑھتی ہیں اس کی زبان نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف عورتوں کی خاص زبان اور اس قدر صحیح اور بامحاورہ لکھنے پر کیونکر قادر ہوئے۔ اس کتاب کو پبلک میں بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور گورنمنٹ نے بھی ایک ہزار جلدیں خریدیں اور ایک ہزار روپیہ لائق مصنف کو انعام دیا۔ اس کا ترجمہ ہندوستان کی اصلی دیسی کتابوں میں ہو گیا ہے۔ دوسری کتاب "بنات النعش" ہے جو مراۃ العروس کے بعد اور اسی طرز پر عورتوں کی تعلیم کی غرض سے لکھی گئی۔ اس میں بھی نہایت مفید اور دلچسپ باتیں عام معلومات اور مبادی سائنس کے متعلق اکثر جگہ مکالمہ کی صورت میں درج ہیں۔ اس کی بھی پبلک اور گورنمنٹ دونوں نے بڑی قدر کی۔ اس کے بعد "توبۃ النصوح" کا نمبر ہے جو مولانا کا سب سے بہترین ناول سمجھا جاتا ہے۔ اس میں مختصر طور پر انہوں نے قصہ کے طریق پر یہ دکھلایا ہے کہ ایک

فاسق و فاجر شخص جس کا نام نصوح ہے سخت ہیضہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ایک خواب دیکھتا ہے، اس کے بعد بیدار ہو کر خوف خدا و زری سے لرز جاتا ہے اور پابند شرع ہو کر تمام منہیات سے توبہ کر لیتا ہے اس کی بیوی اور بعض اور اعزہ بھی اس کے ہم خیال ہو جاتے ہیں مگر اس کا بڑا لڑکا اس کی راہ پہ نہیں آتا اور مصائب میں مبتلا ہوتا ہے اس میں مولانا نے ضمناً اولاد کی بری اٹھان کے برے نتیجے اور کمسنی میں ان کی سخت گیری اور نگرانی کی اہمیت کو بڑی خوبی سے دکھلایا ہے۔ "ابن الوقت" میں ایک ہندوستانی شخص کا حال لکھا گیا ہے جو غدر کے زمانے میں اپنی خدمات کے صلے میں ایک بڑے عہدہ تک پہنچ جاتا ہے اور انگریزوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے انہیں کی طرز معاشرت اختیار کر لیتا ہے اور یورپین سوسائٹی میں شامل ہو کر اپنے ہندوستانی عزیزوں اور دوستوں کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ پھر بعد کو جب اس کے انگریز دوست سب چلے جاتے ہیں تو وہ کدھر ہی کا نہیں رہتا۔ اور آخر کار بڑی دقت سے پھر اپنی ہی قوم و جماعت کے لوگوں میں ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کتاب کی نسبت بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اس میں مصنف نے خود اپنی ہی سرگذشت ایک افسانہ کے پیرایہ میں بیان کی ہے "ایامیٰ" میں انہوں نے بیوہ عورتوں کی شادی پہ بہت زور دیا ہے اور ہندوستان میں ان کی افسوسناک حالت کو بیان کر کے شرعاً ازدواج ثانی کے جواز کو ثابت کیا ہے۔ "محصنات" میں تعداد ازدواج کا نقصان دکھایا ہے۔ "رویائے صادقہ" میں اہل اسلام کے کچھ مذہبی عقائد کی بحث ایک دلچسپ مکالمہ کی صورت میں کی گئی ہے مذکورہ بالا سب کتابیں نہایت اخلاق آموز اور نصیحت خیز ہیں۔

لیکچر اور تقریریں ملازمت سے کنارہ کشی کے بعد مولانا نے اپنی تقریریں اور لیکچر شروع کر دیے تھے ہمارے خیال میں آپ کا پہلا پبلک لیکچر ۱۸۸۸ء میں ہوا تھا۔ وہ

انجمن حمایت الاسلام لاہور اور مدرسہ طبیہ دہلی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسوں میں پُر زور تقریریں کرتے تھے۔ سر سید مرحوم کے اثر سے وہ ہر اسلامی اہم اجتماع میں شریک ہوتے تھے اور سامعین کو اپنی پُر مغز تقریروں سے محظوظ کرتے تھے وہ نہایت خوش بیان اور طلیق اللسان مقرر تھے۔ اور یہ بھی ان کا قاعدہ تھا کہ اپنی وسیع معلومات اور دل چسپ حکایات اور علی الخصوص اپنے ظرافت آمیز طرز بیان سے سامعین کو بہت محظوظ کرتے تھے۔ اُن کا مجموعہ لیکچر چھپ گیا ہے اور مختلف انواع مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں عقائد مذہبی۔ تعلیم و حریت نسواں وغیرہ پر نہایت بلسوط بحث کی گئی ہے۔

بحیثیت شاعر کے — آخر عمر میں شاعری نے بھی طبیعت کو گدگدایا تھا اور شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے لیکچروں کو اپنے اشعار سے دل چسپ بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر ہم نہایت ادب سے اس بات کے کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ محض تبرک ہی تبرک ہوتے تھے اور شعریت ان میں مطلق نہ تھی۔ بتدریج کچھ کلام میں ترقی ضرور ہوئی مگر اصلی جذبات شعریہ سے وہ ہمیشہ دُور رہے۔ ان کا منظوم کلام چھپ گیا ہے اور مجموعہ بے نظیر کے نام سے موسوم ہے مگر اس سے ان کی قابلیت میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوتا۔

اخلاق و عادات — مولانا نہایت سادہ مزاج مہذب اور بہت ظریف الطبع تھے۔ زندگی نہایت سادگی بلکہ عسرت سے بسر کرتے تھے۔ اسی وجہ سے جزرس مشہور تھے مگر پھر بھی بعض غریب غریب طلبا کی امداد بہت فراخدلی سے کرتے تھے۔ آخر عمر میں روپیہ جمع کرنے کے شوق میں تجارت شروع کر دی تھی جس سے ان کی آمدنی میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ تعلیم و تعلّم کے وہ اس قدر شایق تھے کہ مرتے دم تک یہی اشغال جاری رکھے تھے۔ علی گڑھ کالج کے وہ پُرانے سرپرست اور معاون تھے بعمر ۱۸۹۶ء

میں شمس العلماء ۱۹۰۲ء میں یونیورسٹی آف اڈنبرا کی طرف سے ایل۔ ایل ڈی کی اعزازی ڈگری۔ اور ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی کی ڈی۔ او۔ ایل یعنی ڈاکٹر آف اورینٹیل لرننگ (عالم علوم مشرقیہ) کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اور نواب لفٹننٹ گورنر پنجاب نے بحیثیت چانسلر جلسہ کانووکیشن کے صدر تھے۔ ڈگری دیتے وقت اُن کے علم وفضل اور طباعی و ذہانت کی بہت تعریف کی تھی۔

طرزِ تحریر

مولانا کی عبارت بہت آسان اور صاف وسادہ ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی بڑے بڑے عربی وفارسی کے غیر مانوس الفاظ آتے ہیں اور کہیں رنگین عبارت اور صنائع بدائع سے بعض مواقع پر انگریزی الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں۔ جن سے ہمارے نزدیک عبارت میں بجائے حسن اور خوبصورتی کے بھونڈا پن اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ آزاد کی سی لطافت اور شیرینی ان کے یہاں نہیں ہے۔ البتہ خاص چیز جو ان کی نثر کا جوہر اعلیٰ ہے وہ اُن کا ظریفانہ رنگ ہے جو ان کے ناول لیکچر اور مضامین سب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی ظرافت بہت ہلکی اور لطیف ہوتی ہے اور ان میں پھکڑپن مطلق نہیں ہوتا۔ مولانا اپنے تمام معاصرین پر بلحاظ شہرت سبقت لے گئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ قوانین کے تراجم سے وہ گورنمنٹ اور پبلک میں روشناس ہوئے۔ قرآن شریف کے ترجمے سے مسلمانوں میں ان کی شہرت ہوئی اور ناولوں وغیرہ کی وجہ سے ہر گھر میں ان کا نام پہنچ گیا۔

مولوی ذکاء اللہ
۱۸۳۲ء تا ۱۹۱۰ء

شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ قدیم دلّی کالج کے مشہور شاگردوں میں تھے اور خود انہوں نے اپنی زندگی بچوں کی تعلیم وترقی کے لیے وقف کر دی تھی۔ ۱۸۳۲ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ ثناء اللہ تھا۔ اور مرزا کوچک سلطان بہادر شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے کے اتالیق تھے۔ مولوی ذکاء اللہ بارہ برس کی عمر میں کالج میں داخل ہوئے جہاں مولوی نذیر احمد

اور مولوی محمد حسین آزاد بھی پڑھتے تھے۔ لہٰذا ان تینوں میں عمر بھر رابطہ اتحاد و محبت قائم رہا اور تینوں آدمی شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ جب مولوی ذکاء اللہ کالج سے پڑھ کر نکلے تو پھر اسی کالج میں ریاضی کی تعلیم پر مقرر ہوئے جس کے بعد آگرہ کالج میں فارسی و اردو کے پروفیسر ہو گئے۔ سات آٹھ برس تک تعلیمی لائن میں رہ کر ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بمقام بلند شہر و مراد آباد ہو گئے۔ جس جگہ پر تقریباً گیارہ سال تک رہے۔ ۱۸۶۹ء میں دلی نارمل اسکول کے مدرس اعلیٰ ہوئے اور ۱۸۷۲ء میں اورینٹل کالج لاہور کی پروفیسری کے واسطے نامزد ہوئے مگر قبل اس کے کہ اس نئے عہدہ کا چارج لیں میور سنٹرل کالج الہ آباد میں عربی و فارسی کی پروفیسری ان کو مل گئی جہاں سے ۲۶ برس کی ملازمت کے بعد پنشن پائی اور تقریباً چوبیس پچیس برس پنشن سے بہرہ یاب ہو کر ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔

تصانیف تصانیف کثرت سے ہیں۔ اور متعدد مضامین پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ریاضی۔ تاریخ جغرافیہ۔ ادب۔ اخلاق۔ طبعیات۔ کیمیا۔ سیاسیات وغیرہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو سے کم نہ ہوگی۔ تصانیف کی کیفیت یہ ہے کہ زیادہ تر اسکولوں کے طلباء کے لیے لکھی گئی ہیں لہٰذا رنگینی و عبارت آرائی اور ایک ادبی شان ان میں بالکل نہیں ہے۔ مولوی صاحب بحیثیت ایک ریاضی داں اور مترجم اور مورخ کے مشہور ہیں مگر ریاضی میں ان کا پایہ بلند نہ تھا اور ان کی کوشش صرف انگریزی کتابوں کے ترجمے اور ان کی شرحیں لکھنے تک محدود رہی البتہ تاریخ میں انہوں نے ایک کارنمایاں ضرور کیا۔ ان کی تاریخ ہندوستان دس جلدوں کی ایک ضخیم کتاب اور قابل قدر تصنیف ہے۔ گو اس میں ریسرچ سے کم کام لیا گیا ہے اور عامۃ الناس کے لیے ہے۔ مہمات عظیم میں ان بڑی لڑائیوں کا ذکر ہے جو انگلستان اور دوسرے ملکوں میں کوئین وکٹوریہ کے عہد میں ہوئی تھیں۔ ان کی ایک اور بھی عمدہ تصنیف ہے جس میں کوئین وکٹوریہ کے عہد کے

خان بہادر مولوی ذکا اللہ خان

مولوی سید احمد (دہلوی) مولف فرہنگ آصفیہ

حالات اور ترقیاں درج ہیں جو تین جلدوں میں ہے" آئین قیصری" میں کوئن وکٹوریہ کے عہد کی انتظامی تبدیلیاں جو ہندوستان میں ہوئیں اور فرہنگ فرنگ میں یورپین شایستگی کی تاریخ اور کوئن وکٹوریہ اور ان کے شوہر کی زندگی کے حالات درج ہیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سی۔ ایم۔ جی کی سوانح عمری بھی ان کی تصنیف ہے آخر عمر میں ایک تاریخ اسلام لکھنے میں مشغول تھے۔ مگر وہ ناتمام رہی۔ ان تمام کتابوں کا طرز تحریر نہایت صاف سلیس اور عبارت آرائی اور تصنّع سے بالکل پاک ہے اور وہ سب اسکولوں میں پڑھانے کے قابل ہیں۔

مولوی صاحب میں ایک بڑی صفت یہ تھی کہ وہ اکثر مشہور جرائد و رسالوں کے باقاعدہ مضمون نگار بھی تھے مثلاً تہذیب الاخلاق۔ سائنٹیفک گزٹ علی گڑھ۔ رسالہ حسن۔ ادیب فیروز آباد۔ مخزن زمانہ۔ خاتون وغیرہ۔ ان کی کثیر التصانیفی پر مولانا حالیؔ نے یہ پھبتی کہی تھی۔ کہ مولوی ذکاء اللہ کا دماغ ایک بنیے کی دکان ہے جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے۔ اس میں یہ بھی لطیف اشارہ ہو کہ بنیے کے یہاں عمدہ اور قیمتی چیزیں کہاں ملتی ہیں۔

گورنمنٹ نے ان کی علمی خدمات کی بڑی قدر کی تھی۔ ترقی تعلیم نسواں کی کوششوں کے صلے میں ان کو ایک خلعت عطا ہوا اور دیگر علمی خدمات کے واسطے پندرہ سو روپیہ کا انعام اور خطاب خان بہادر و شمس العلماء عنایت ہوا۔ مولوی صاحب سر سیّد مرحوم کے گہرے دوستوں میں تھے اور ان کے تمام تعلیمی کاموں میں ہاتھ بٹاتے تھے۔

مولوی سید احمد دہلوی مولوی سید احمد دہلوی اپنی مشہور و معروف اردو لغت "فرہنگ آصفیہ" کے مصنف ہونے کی حیثیت سے اُردو داں پبلک میں ایک خاص شہرت رکھتے ہیں۔ دلّی میں ۱۸۴۶ء[1] میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام حافظ سید عبدالرحمٰن تھا جو مستند سادات سے تھے اور ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مولوی صاحب کی ابتدائی

[1] ولادت ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء۔ وفات ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۹ء۔ فاضل

تعلیم رواج زمانہ کے موافق دیسی مکتبوں میں ہوئی۔ جب کچھ حرف شناس ہو گئے تو سرکاری اسکول اور نارمل اسکول میں تحصیل علم کیا۔ اس کے بعد اپنی فطری طباعی اور مشاہیر اہل علم کی صحبت سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ چنانچہ طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک چھوٹی سی فارسی نظم "طفلی نامہ" کے نام سے اور ایک انشا کی کتاب "تقویۃ الصبیان" لکھ ڈالی۔ ۱۸۶۹ء میں ان کی کتاب "کنز الفوائد" نکلی جس پر سرکار سے دو سو روپیہ انعام ملا۔ ۱۸۶۸ء سے انہوں نے اپنی جلیل القدر تصنیف فرہنگ آصفیہ کے واسطے مسالہ جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۷۱ء میں ان کی دوسری کتاب "وقائع درونیہ" شایع ہوئی جس پر ان کو مبلغ ڈیڑھ ہزار روپیہ انعام ملے۔ اس رقم سے ان کی فرہنگ آصفیہ کی تیاری میں کچھ آسانیاں ہو گئیں۔ اس اثناء میں ڈاکٹر فیلن صاحب نے جو صوبہ بہار میں انسپکٹر مدارس تھے ان کو بلا بھیجا اور اپنی اردو اور انگریزی کی لغت کی تیاری میں ان سے مدد لینا چاہی۔ مولوی صاحب راضی ہو گئے اور فیلن کی ڈکشنری سات برس کی محنت شاقہ کے بعد ختم کی مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنا کام بھی کرتے رہے۔ ۱۸۸۰ء میں انہوں نے مہاراجہ الور کا ایک سفر نامہ مرتب کیا۔ اس کے بعد وہ گورنمنٹ پنجاب کے سرکاری بک ڈپو میں نائب مترجم کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ فیلن صاحب کی ڈکشنری کی تیاری کے زمانے میں انہوں نے اپنی کتاب "ہادی النساء" شایع کی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس کے بعد ان کی حسب ذیل تصنیفات شایع ہوتی رہیں جو اپنے طرز میں سب نہایت عمدہ اور مفید ہیں۔

"تکمیل الکلام" پیشہ وروں کے اصطلاحات میں۔ "تحقیق الکلام" اردو زبان کے نکات کے متعلق۔ "رس کھان" جس میں کچھ ہندی دوہے اور پہیلیاں اور گیت ہیں۔ "ریت بکھان" اہل ہنود کے رسم و رواج کے متعلق۔ "ناری کتھا" ہندو عورتوں کی بولی قواعد اردو۔ تعلیم نسواں اور عورتوں کے متعلق ان کی حسب ذیل کتابیں بہت

مشہور ہیں:۔

لغات النساء، تحریر النساء (لڑکیوں کی ریڈر) "بی راحت زمانی کا قصہ" عورتوں کو دقت کی قدر و قیمت سکھاتا ہے۔" اخلاق النساء" بچوں کی پرورش اور تربیت کے متعلق۔ "علم النساء" زبان اور اس کی ترقی کے متعلق۔ "رسوم دہلی" جس میں دہلی کے مروجہ رسوم و رواج کا ذکر ہے۔ غیر مطبوعہ کتابوں میں "سیر شملہ" جس میں شملہ کی تاریخ بھی داخل ہے۔ "اردو ضرب الامثال" "روزمرۂ دہلی" "رسوم اعلٰے ہنددات دہلی" ان میں سے بعض اب شائع ہو رہی ہیں۔

فرہنگ آصفیہ اس کتاب کی تیاری اور طباعت کی دقتوں اور پریشانیوں کے متعلق مصنف نے دیباچہ میں بہت طول دے کر لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ مولوی صاحب کو اتنی بڑی تصنیف کے چھاپنے کے لیے ایک زر کثیر کی ضرورت تھی جس کی فراہمی سخت مشکل تھی۔ بالآخر خوش نصیبی سے ۱۸۸۸ء میں سر آسمان جاہ بہادر شملہ آئے جہاں مولوی صاحب بھی کسی اسکول میں ملازم تھے۔ مولوی صاحب نے وزیر اعظم حیدر آباد کی خدمت میں حضوری حاصل کر کے اپنا مسودہ بطور نذر کے گزرانا جو سید علی بلگرامی کے معائنہ کے بعد منظور کر لیا گیا اور انعام کا وعدہ کیا گیا۔ جب ۱۸۹۲ء میں کتاب ختم ہوئی تو اس کا نام فرہنگ آصفیہ رکھا گیا اور اس کے سلسلے میں مصنف صاحب کو حیدر آباد متعدد دفعہ جانا پڑا۔ آخر کار وہ اپنی امیدوں میں کامیاب ہوئے اور پچاس روپیہ ماہوار بطور پنشن اور پانچ ہزار انعام دیا گیا۔ اسی طرح گورنمنٹ پنجاب نے بھی اُس کی قدر افزائی میں بہت کچھ حصہ لیا۔ فی الحقیقت یہ کتاب لغات اُردو کی کتب میں ایک خاص درجہ امتیاز رکھتی ہے اور ایک بڑی تحقیقات اور جانکاہی کی یادگار ہے۔

شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء
تعلیم اور ابتدائی مشاغل

مولانا شبلی نعمانی اپنے زمانے کے مشہور ترین قابل بزرگوں میں سے تھے۔ نہایت کثیر الاشواق اور جامع الاذواق تھے۔

اگر کوئی شخص ایک شاعر۔ فلسفی۔ مورخ۔ ناقد۔ ماہر تعلیم۔ معلّم۔ واعظ۔ رفارمر۔ جریدہ نگار۔ فقیہ۔ محدّث۔ سب کچھ ہو سکتا ہے تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی کہ انہوں نے ان سب کمالات مختلفہ اور علوم و فنون متنوعہ کا اپنی ذات میں اجتماع کر لیا تھا۔ اور اس شعر کے صحیح مصداق بن گئے تھے ؎

وَلَیْسَ عَلَی اللّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ　　اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدٍ

مگر ان سب میں ادب، تاریخ اور ریسرچ میں اُن کا رتبہ بہت بلند تھا۔ ۱۸۵۷ء میں موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ حبیب اللہ (جو وکیل تھے) کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی۔ ابتدائی کتابیں مولوی شکر اللہ نامی ایک شخص سے پڑھیں اور جب عربی و فارسی میں کچھ دستگاہ ہو گئی تو مولانا فاروق چریاکوٹی کے سامنے جو اس وقت غازی پور میں ہیڈ مولوی تھے اور فلسفہ و ریاضی و ادب وغیرہ کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ زانوئے شاگردی تہ کیا۔ انہیں سے انہوں نے عربی ادب اور معقولات پڑھی تھیں۔ پھر جذبۂ شوق نے ابھارا تلاش علم کے واسطے وہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اعظم گڑھ سے رامپور پہنچے جہاں استاد زمانہ مولوی عبدالحق خیرآبادی سے معقول اور مولوی ارشاد حسین صاحب محدث سے حدیث و فقہ کے اسباق لیے۔ لاہور میں ادیب کامل مولوی فیض الحسن صاحب سے حماسہ پڑھا۔ وہاں سے سہارنپور آئے اور تکمیل حدیث مولوی احمد علی صاحب سے کی۔ ۱۸۷۶ء میں جبکہ ان کی عمر صرف ۱۹ سال کی تھی، عازم حج بیت اللہ ہوئے اور راستے میں وفور شوق اور جوش عقیدت سے ایک پُر درد[1] قصیدہ فارسی کہا۔ بعد فراغت حج اعظم گڑھ واپس آئے اور سلسلہ درس و تدریس جاری رکھا۔ شوق کتب بینی کا یہ حال تھا کہ کتب فروشوں کی دکان پہ بیٹھ کر اکثر کتابیں دیکھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں رد وہابیہ میں

---

[1] دیکھیے آئندہ صفحہ ۸۵ پر

بھی کچھ رسالے لکھے جس میں "اسکات المعتدی" جو عربی میں ہے زیادہ مشہور ہے۔ کہا
ہے کہ انہوں نے امتحان وکالت بھی پاس کیا تھا اور اعظم گڑھ اور بستی میں کچھ دنوں
... آخر کار جب اس پیشے سے جی بھر گیا تو سرکاری ملازمت بھی
... مین ہو گئے تھے۔ چند دنوں کے بعد یہ ملازمت چھوڑ
... رف متوجہ ہو گئے ۱۸۸۲ء میں اپنے چھوٹے بھائی
ہمدی سے ... کالج میں پڑھتے تھے علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا

مولانا میرے حال پر ایک خاص نظر عنایت و شفقت رکھتے تھے مجھ کو ان سے استغراق کتب بینی کا ایک چشم دید واقعہ یاد ہے جس کا ذکر اس موقع پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ منشی نثار حسین مرحوم ایڈیٹر "پیام یار" مولانا کے ایک بے تکلف دوست تھے۔ اُن کی چوک میں عطر کی دکان تھی۔ جب مولانا لکھنؤ میں قیام کرتے تو سبزی منڈی میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز کے مکان پر فروکش ہوتے اور سہ پہر کو منشی نثار حسین کی دکان پر جو قریب ہی تھی آ بیٹھتے تھے۔ یہاں اکثر ارباب کمال کا مجمع ہوتا تھا جس میں مولوی عبدالحلیم شرر۔ شوق قدوائی۔ للن صاحب خورشید۔ ابو صاحب جلیس۔ سید شہنشاہ حسین رضوی وکیل مرحوم اور بہت سے بے تکلف احباب۔ جمع ہوتے اور گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے۔ وزیر تمبولی کی خوش ذائقہ گلوریاں اور حسین بخش ساقی کے معطر حقے سے احباب کی ضیافت کی جاتی کبھی کبھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کوٹ پتلون ڈاٹے عینک لگائے آنکھیں مچکاتے اور ہنستے اس جلسے میں شریک ہو جاتے اور اپنی پر لطف باتوں سے سب کو محظوظ کرتے۔ ایک دن جبکہ یہ سب یاران طریقت جمع اور مولانا بھی تشریف فرما تھے۔ شاید چھٹی یا ساتویں تاریخ محرم کی تھی۔ وقت ۷ ، ۸ بجے شام چوک میں بڑا مجمع تھا۔ تعزیے مع جلوس اور باجوں وغیرہ کے نکل رہے تھے۔ شور و غل اور مجمع کی کوئی حد نہ تھی۔ سب لوگ اس سیر میں مشغول مگر مولانا دکان کی کوٹھری میں بند کسی کتاب کے مقابلے میں جو کسی کاتب سے لکھائی گئی تھی، اس قدر مشغول اور منہمک تھے کہ باوجود دوستوں کے سخت اصرار کے بھی سر اُٹھا کے نہ دیکھا اور اپنا کام کرتے رہے یہاں تک کہ پوری کتاب ایسی حالت میں دس گیارہ بجے تک ختم کر دی۔ مترجم۔

یہاں بتوسط خان بہادر محمد کریم ڈپٹی کلکٹر مولوی سمیع اللہ خاں سے ملے جن کے ذریعہ سے سرسید مرحوم کی خدمت میں باریاب ہوئے اور ایک درخواست فارسی پروفیسری کی جگہ کے واسطے جو اس وقت خالی تھی گزرانی۔ جو منظور ہو گئی اور کچھ دنوں شہر میں قیام کے بعد خوش نصیبی سے سید صاحب کے بنگلے کے قریب رہنے کو جگہ مل گئی۔

قیام علی گڑھ | علی گڑھ کالج کی اس زمانے کی فضا اُس گُل سرسید کی شگفتگی کے لیے بہت مفید ہوئی۔ ارباب کمال مثلاً سرسید اور مولانا حالی وغیرہ کی صحبت اور سرسید کے کتب خانے کی قربت سے مولانا نے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ علی گڑھ کے مشہور اسلام دوست پروفیسر آرنلڈ سے ملاقات ہو گئی مولانا نے ان سے فرنچ سیکھی، اور ان کو عربی سکھائی جس طرح سے مولانا نے نکات تنقید بطرز اہل مغرب آرنلڈ صاحب سے حاصل کیے ہوں گے۔ اُسی طرح انصافاً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر صاحب اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" کی اکثر باتوں کے لیے مولانا کے ممنون ہیں۔

ابتدائی تصانیف | غالباً علی گڑھ ہی میں مولانا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام کی قدیم شان و شوکت اور اکابر سلف کے زرّیں کارنامے قلمبند کیے جائیں۔ اس مبارک کام پر سرسید نے بھی ان کی ہمت افزائی کی۔ یہاں سرسید کا کتب خانہ موجود ہی تھا جس میں دُور دراز مقامات مصر و شام تک کی مطبوعہ کتابیں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ ۱۸۸۵ء میں مثنوی صبح اُمید کا ستارہ مولانا کے اُفق تصنیف پر جلوہ گر ہوا جس میں اسلام کی شان و شوکت۔ موجودہ مسلمانوں کی نکبت و فلاکت اور ان کے ابھارنے کے لیے سرسید کی کوششوں کا ذکر نہایت پُر زور طریقے سے کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک زمانے میں اس قدر مقبول اور علی گڑھ کالج کے طلباء کو اتنی پسند تھی کہ اکثر اوقات وہ اس کو اسٹیج پر خوش آوازی سے پڑھتے اور لوگوں کے دلوں کو بے چین کرتے تھے۔ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" جو ۱۸۸۶ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں بطور ایڈریس پڑھی گئی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی جس سے لوگوں

کو مولانا کی تاریخی معلومات اور تبحر علمی کا پورا پتہ معلوم ہوا۔ اب دنیائے تصنیف میں ان کی شہرت بہت بڑھ گئی تھی۔ ان کے دل میں خیال آیا کہ ایک مکمل اور مفصل تاریخ بلاد اسلام اور خلفائے عباسیہ کی مرتب کی جائے اور اس کا نام "ہیروز آف اسلام" (مشاہیر اسلام) انگریزی کی تقلید میں رکھا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے "المامون" اور "سیرۃ النعمان" لکھی اور "الفاروق" شروع کرنے والے تھے کہ ۱۸۹۲ء میں سفر روم و شام اختیار کیا جس میں پروفیسر آرنلڈ بھی ان کے ہمراہ تھے اور انہوں نے قسطنطنیہ اور ایشیائے کوچک اور شام و مصر کے بڑے بڑے شہروں کی سیر کی۔ اس سفر کی زیادہ تر یہ غرض تھی کہ "الفاروق" کی تیاری کے واسطے صحیح اور معتبر ماخذ کا پتہ لگایا جائے نیز یہ بھی کہ بلاد اسلامی کی شان و شوکت اپنی آنکھ سے دیکھی جائے۔ سفر سے واپسی کے بعد اُن کا "سفرنامہ روم و شام" نکلا جس میں پورے سفر کے حالات نہایت دل چسپ طریقے سے قلمبند ہیں۔ ۱۸۹۸ء میں جب کہ سرسید کا انتقال ہوگیا تو مولانا بھی دل برداشتہ ہوگئے اور اپنا سلسلہ کالج سے منقطع کر لیا اور اعظم گڑھ گئے۔ اب وہ "الفاروق" کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہوگئے اور ایک قومی انگریزی اسکول کی ترقی میں بھی بہت کوشش کی جس کا افتتاح ۱۸۸۳ء میں ہو چکا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں سفر کشمیر پیش آیا۔ مگر اتفاق سے وہاں مولانا بیمار ہوگئے۔ اور اسی حالت میں "الفاروق" اختتام کو پہنچی۔

قیام حیدرآباد

مولانا کا سفر حیدرآباد نواب وقار الامراء کی وزارت کے زمانے میں ہوا تھا۔ سب سے پہلے وہ سید علی بلگرامی کی کوشش سے ناظم محکمہ تعلیم بمشاہرہ دو سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے۔ جو بعد کو تین سو روپیہ ہوگیا تھا۔ مولانا یہاں چار برس رہے اور اس زمانے میں انہوں نے محکمہ تعلیم میں بہت کچھ ترقیاں کیں اور اس کے ساتھ اپنا سلسلہ تالیف و تصنیف بھی برابر جاری رکھا۔ سید علی بلگرامی نے جو سلسلہ "کتب آصفیہ" کا جاری کیا تھا۔

اس میں مولانا کی بعض کتابیں شامل ہیں۔ اسی قیام حیدرآباد کے عرصہ میں جبکہ مولوی عزیز مرزا صاحب کا دور دورہ تھا مولانا نے حیدرآباد میں ایک مشرقی یونیورسٹی کے کھولنے کی اسکیم تیار کی تھی اور "الغزالی"۔ "سوانح مولانا روم"۔ "الکلام"۔ "علم الکلام"۔ اور "موازنہ انیس و دبیر" یہ سب اسی زمانے کی تصانیف ہیں۔

ندوۃ العلماء

ندوۃ العلماء کا قیام ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں ہوا تھا۔ اس کے قیام کی غرض اصلی یہ تھی کہ عربی مدارس کے لیے ایک مفید نصاب تعلیم ضروریات زمانہ کا لحاظ رکھ کر بنایا جائے نیز یہ کہ مسلمانان ہندوستان کے آپس میں یا ان کی جماعتوں میں جو جو اختلافات ہیں وہ رفع کیے جائیں۔ اس عمدہ خیال کے محرک مولوی عبدالغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مگر اس کی تکمیل مولوی سید محمد علی صاحب کانپوری خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب مرادآبادی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی جو اس کے بانی اور ناظم اوّل تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی نے اس کے قواعد وضوابط مرتب کیے۔ اکابر قوم مثلاً سرسید، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک وغیرہ نے بھی اس کے اغراض و مقاصد کو پسند کیا اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے اس کا خیر مقدم کیا۔ کہا جاتا ہے کہ نواب وقار الملک سو روپیہ ماہوار ندوہ کو اپنے پاس سے دیتے تھے پھر مولانا شبلی کی تجویز ہوئی کہ اس جماعت کے تحت میں ایک مدرسہ کھولا جائے جو ضروریات وقت کا لحاظ رکھ کے طلباء کو تعلیم دے سکے چنانچہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں

لہ مقاصد ندوۃ العلماء جو مسودہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے آخری صفحہ کے پشت پر درج ہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) نصاب تعلیم کی اصلاح اور علوم دین کی ترقی اور تہذیب الاخلاق اور شائستگی اطوار

(۲) علماء کے باہمی نزاع کا دفع اور اختلافی مسائل کے رد و قدح کا پورا پورا انسداد۔

(۳) عام مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور اس کے تدابیر مگر سیاسی اور ملکی معاملات اس سے علیحدہ ہیں

(۴) ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم قائم کرنا جس میں علوم و فنون کے سوا عملی صنایع کی بھی تعلیم ہوگی۔

(۵) دینی العدمیں فتوٰی دینے کے واسطے محکمہ افتاء کا ہونا جس میں بڑے بڑے عالم اور مفتی ہوں گے۔

اسی تجویز کے موافق دارالعلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھول دیے گئے اور ۱۸۹۹ء میں رؤسار شاہجہاں پور کی فیاضی سے کچھ زمینداری بطریق وقف ندوۃ العلمار کو حاصل ہوئی جس کو ندوۃ العلمار نے ٹھیکہ پہ دے دیا ہے اور مبلغ سات سو روپیہ سالانہ اس کی آمدنی سے ملتا رہتا ہے یایک عظیم الشان کتب خانہ کی بھی بنیاد ڈالی گئی جس میں تقریباً دس ہزار کتابیں داخل ہو چکی ہیں اور علاوہ مطبوعات یورپ، مصر، قسطنطنیہ، ٹیونس، طہران وغیرہ کے تقریباً ایک ہزار کتابیں قلمی اور اکثر نادر الوجود ہیں جو مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں یا مصنفین کے قریب زمانہ میں لکھی گئی ہیں اور ان پہ نامور علمار کے دستخط موجود ہیں۔ اس نوبت پر ایک افسوسناک واقعہ یہ پیش آیا کہ سر اینٹونی میکڈانل جو اس وقت ممالک متحدہ کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ ندوہ کے سخت مخالف ہوگئے۔ اور اس کو سیاسی سازشوں کا ایک آلہ کار سمجھ کر نگاہ شک سے دیکھنے لگے۔ مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے بعض رسائل بھی جو بہت پُر جوش لہجے میں لکھے گئے تھے اُسی وقت نکلے اور ندوہ کے مقابلے پہ ایک جنگجو جماعت جدوہ قائم کی جس کے اجلاس کلکتہ میں ہوئے تھے۔ غرض کہ جب لاٹ صاحب ولایت چلے گئے تو مولانا شبلی حیدرآباد سے لکھنؤ آئے اور ندوۃ العلمار کے اکثر انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پبلک اور گورنمنٹ کے دل میں جو بدگمانیاں اور شکوک اس کی طرف سے پیدا ہو گئے تھے ان کے رفع کرنے میں بڑی کوشش کی۔ اس کام میں کرنل عبدالمجید خاں صاحب نے بھی ان کی بڑی مدد کی۔ ندوہ کی مالی حالت اس وقت ایسی خراب ہو گئی تھی کہ اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ مولانا نے اس کو درست کرنے کے لیے اکثر دیسی ریاستوں کا سفر کیا اور رام پور سے مبلغ پانچ سو روپیہ سالانہ اور بھوپال سے مبلغ ڈھائی سو روپیہ سالانہ اعانتی رقمیں مقرر ہوئیں اسی طرح ہز ہائینس آغا خاں نے پانچسو روپیہ سالانہ اور نواب صاحب بھاولپور کی جدۂ ماجدہ نے پچاس ہزار روپیہ تعمیر عمارت کے واسطے عنایت[لے]

لے - دیکھیے آئندہ صفحہ ۹۰ پر

کیے۔ گورنمنٹ نے ایک وسیع اور خوشنما قطعہ آراضی دریائے گومتی کے کنارے لکھنؤ میں دارالعلوم کے واسطے عطا فرمایا نیز چھ ہزار روپیہ سالانہ کی امداد انگریزی زبان اور علوم دنیوی کے لیے دینا منظور فرمایا۔ سرجان ہیوٹ صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ نے دارالعلوم کا سنگِ بنیاد ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو رکھا۔ اسی طرح مولانا کی کوششیں بارور ہوئیں مگر آپس کی نزاعیں ہنوز قائم رہیں کیونکہ علماء کا آپس میں متحد الخیال ہونا سخت مشکل کام تھا۔ وہ لوگ مولانا پر بوجہ ان کی آزاد خیالی کے پورا اعتماد نہیں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے مولانا کچھ بددل ہو کر ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ سے چلے گئے اور اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔ اسی اثناء میں ایک نہایت افسوس ناک واقعہ یہ پیش آیا کہ مولانا کی ٹانگ ایک

"دارالعلوم ندوۃ العلماء کی گزشتہ تاریخ" مطبوعہ ۱۹۰۲ء میں ندوۃ العلماء کی جو مالی حالت بیان کی گئی ہے اس سے ندوۃ العلماء کی آمدنی حسب ذیل معلوم ہوتی ہے:۔

(۱) بھوپال سے تین ہزار روپیہ سالانہ جو ماہ بماہ ملتا ہے۔

(۲) بہاولپور سے وظائف کی مد میں تین سو روپیہ سالانہ۔

(۳) مسلمانان مدراس سے تقریباً دو ہزار روپیہ سالانہ اس رقم سے طلباء غیر مستطیع کی مدد دی جاتی ہے۔

(۴) دولت آصفیہ حیدرآباد دکن سے تقریباً سو روپیہ ماہوار دفتر کے خرچ کے لیے۔

لہ عزیز محترم عالی جناب نواب صفی الدولہ سید علی حسن خان بہادر عرف علی میاں صاحب جن سے مولانا مرحوم سے ربط محبت و یگانگت بہت بڑھا ہوا تھا اور جن کی نظر سے یہ مضمون گزر چکا ہے فرماتے تھے کہ "قیام دارالمصنفین کے متعلق میں نے مولانا کو نیم راضی کر لیا تھا کہ لکھنؤ میں کھولا جائے مگر ان کی خواہش تھی کہ اس کا تعلق ندوہ سے نہ ہو اور یہ ایک بالکل علیحدہ چیز ہے۔ اس کے واسطے بعض مواقع لکھنؤ میں دیکھے گئے اور مولانا نے دو ایک جگہوں کو پسند بھی کیا۔ پھر مولانا بمبئی تشریف لے گئے میں بھی وہاں موجود تھا۔ وہاں سے اپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق کی اچانک موت کی خبر سن کر دفعتاً الہ آباد اُن کو آنا پڑا۔ یہاں سے وہ بغیر دست اعظم گڑھ گئے اور مجھ کو لکھا کہ دارالمصنفین یہاں قائم کرنے کا ارادہ ہے۔ (باقی آئندہ صفحہ ۹۱ پر)

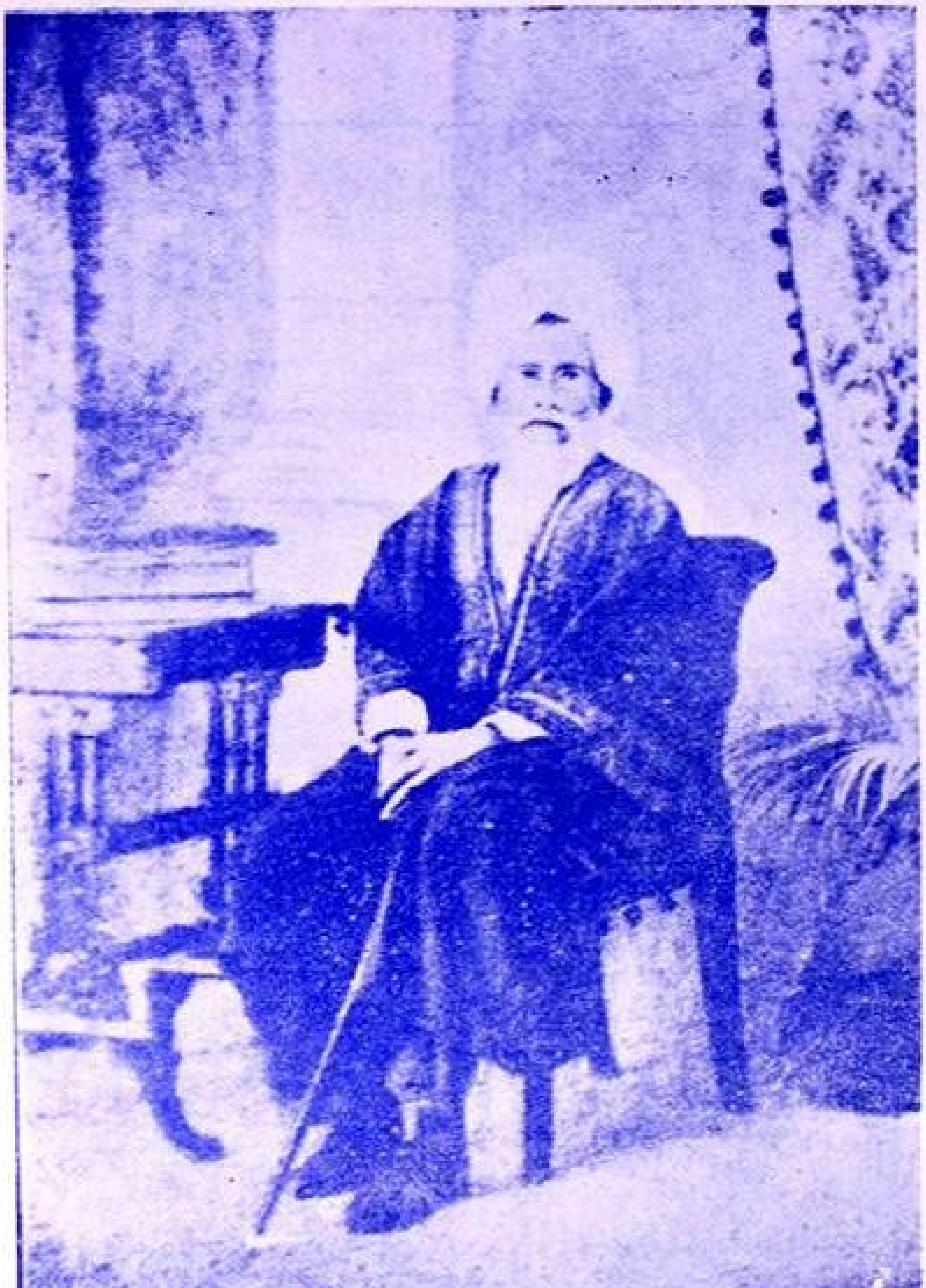

مولانا شبلی نعمانی

مولوی سعید انصاری

مولانا عبدالسلام ندوی

مولانا سید سلیمان ندوی

مولوی ابوالحسنات ندوی

اتفاقیہ گولی کے لگ جانے سے زخمی ہوئی اور آخر کار مجبور ہو کر اس کو کاٹنا پڑا۔

ندوہ نے جو خدمات ملک کی انجام دیں گو کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی وہ تکمیل کو پہنچ چکیں مگر اس میں شک نہیں کہ وہ بہت قابل تعریف ہیں۔ سب سے بڑا کام اس نے یہ کیا۔ کہ قدامت پسند عالموں میں جو ضروریات زمانہ سے بے خبر تھے ایک بیداری پیدا کر دی اور ان کو بھی اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ان کا قدیم نصاب بدل کر موجودہ زمانے کی ترقیوں کے حسب حال بنایا جائے۔ انگریزی زبان بھی داخل نصاب کی جائے غیر مفید کتابیں اور علوم موقوف کیے جائیں اور ادب عربی و فارسی اور حدیث و تفسیر کی تحصیل پر زیادہ زور دیا جائے۔ ندوہ نے یہ بڑا کام کیا کہ علوم عربیہ اور اسلامی تہذیب کو دنیا کے سامنے صحیح طور پر پیش کیا۔ قیمتی قلمی اور نیز ہزارہا مفید مطبوعہ کتابیں جمع کر کے ایک اعلیٰ درجے کا کتب خانہ قائم کیا۔ قرآن شریف کے صحیح انگریزی ترجمہ کا بھی کام ہاتھ میں لیا تھا مسلمانوں کے عہد حکومت ہندوستان کے متعلق جو تاریخی غلطیاں ناواقفیت سے لوگوں میں مشہور ہو گئی ہیں ان کو رفع کیا۔ اسی طرح مسلمانوں کے قانون وقف و میراث کے متعلق جو پیچیدہ مسائل قانونی اکثر پیش آجاتے ہیں۔ ان پر روشنی ڈالی۔ اسلامی علوم اور تمدّن کا ایک مرکز قائم کیا جس کا اثر ممالک دور دراز تک پر پڑا۔ ایک خاص رسالہ "الندوہ" بادارت مولانا شبلی و مولوی حبیب الرحمٰن صاحب شروانی نکالا گیا جس میں نہایت عمدہ اور قابلیت کے مضامین شایع ہوئے۔ مگر حق یہ ہے کہ مولانا کے انتقال سے ندوہ کو جو نقصان عظیم

(بقیہ مضمون حاشیہ گذشتہ صفحہ ۹۰)

اس کے افتتاح میں تم بھی شریک ہو۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ مولانا نے اپنا باغ وغیرہ اس کے واسطے وقف کر دیا ہے اور بعض اور لوگوں نے اپنی جائدادیں دی ہیں۔ میں نے کہا۔ بہت بہتر ہوتا کہ دار المصنفین لکھنؤ میں قائم ہوتا۔ ہنس کے فرمایا کہ کیا مضائقہ ہے۔ یہاں اس کو بالفعل رہنے دیجیے جب موقع آئے گا تو لکھنؤ میں منتقل ہو جائے گا۔

پہنچا۔ اس کی تلافی اب بہت مشکل ہے

دارالمصنفین اعظم گڑھ لکھنؤ سے واپسی کے بعد مولانا ہمہ تن اپنی محبوب اور مایۂ ناز تصنیف "سیرۃ النبی" کی تکمیل میں مصروف ہو گئے اور شعر العجم کا پانچواں حصہ بھی اسی وقت تمام کیا۔ مولانا چونکہ تالیف و تصنیف کے عاشقوں میں تھے۔ لہٰذا مصنفین کی ایک جماعت قائم کرنے کا خیال جو بہت عرصہ سے ان کے دل میں جاگزیں تھا۔ خدا خدا کر کے وہ اب پورا ہوا۔ جس کے واسطے انہوں نے اپنی ذاتی جائداد یعنی ایک مکان اور باغ اور نیز اپنا قیمتی کتب خانہ وقف کر دیا۔ اس کے علاوہ ندوہ میں ایک درجہ تکمیل بھی کھولا جس میں عربی و فارسی کے منتہی طالب علم ریسرچ کی خدمات انجام دیتے ہیں۔

قابلیت اور خدمات کا اعتراف ۱۸۹۲ء میں سلطان ٹرکی نے تمغہ مجیدی ان کو عنایت کیا تھا اور اسی کے قریب برٹش گورنمنٹ نے خطاب شمس العلماء عطا کیا۔ وہ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور مختلف کمیٹیوں کے ایک معزز رکن تھے۔ مثلاً ترقی علوم شرقیہ کی کمیٹی جو بہ مقام شملہ سر ہارکورٹ بٹلر کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ کمیٹی بابتہ نزاع مابین زبان اُردو و ہندی اور کمیٹی اتحاد ہندو مسلم جس کو گورنمنٹ نے منعقد کیا تھا۔

اخلاق و عادات مولانا شبلی ایک نہایت سچے اور راست باز خلیق و متواضع آدمی تھے۔ ان کی ایک زبردست شخصیت تھی گفتگو نہایت شیریں اور دلچسپ اور پُر از معلومات ہوتی تھی۔ حافظہ بہت زبردست پایا تھا۔ روپیہ کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ اور جو کچھ ملتا تھا نہایت آزادی سے خرچ کرتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے خواہاں تھے۔

تصانیف مولانا کی تصانیف بہت کثرت سے ہیں جن میں حسب ذیل مشہور ہیں۔

، سیرۃ النبی (صرف دو جلدوں کی تکمیل کر سکے) شعر العجم پانچ حصے ۔ الفاروق المامون سیرۃ النعمان ۔ الغزالی ۔ الکلام ۔ علم الکلام ۔ سوانح مولانا روم ۔ موازنہ انیس و دبیر سفر نامہ روم و مصر و شام ۔ اورنگ زیب عالمگیر ۔ الجزیہ ۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم ۔ تاریخ اسلام و فلسفہ اسلام ۔ حیات خسرو ۔ تنقید جرجی زیدان ۔ مقالات شبلی ۔ مکاتیب شبلی ۔ رسائل شبلی (نظم میں) دیوان شبلی اور دستۂ گل ۔ مثنوی صبح امید مجموعہ نظم اردو ۔

مولانا بحیثیت مورّخ مولانا کا بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کی قدیم شان و شوکت کی تاریخ کو طرز جدید میں پیش کیا اور ایسے دل چسپ طریق سے لکھا کہ عوام و خواص سب اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں اور ہر نظر میں وہ نہایت دل چسپ معلوم ہوتی ہے ۔ پھر یہ کہ اس کی تالیف میں انتہا کے تجسس و تلاش اور عمیق مطالعہ سے کام لیا ۔ اور جدید طریق کے موافق غیر معتبر اور بیکار چیزوں کو ترک کیا ۔ الفاروق ۔ المامون ۔ الغزالی سیرۃ النعمان مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم ۔ اور علی الخصوص ان کی معرکۃ الآرا تصنیف یعنی سیرۃ النبی جس کو انہوں نے ناتمام چھوڑا ۔ ایسی یادگار تصانیف ہیں جو ان کے تبحّر علمی ، وسیع تحقیق ، عمیق مطالعہ اور بے حد کد و کاوش کا پتہ دیتی ہیں ۔

مولانا بحیثیت ناقد کے مولانا علاوہ جلیل القدر مورّخ کے ایک زبردست ناقد بھی تھے ۔ شاعر شیریں مقال ہونے کے ساتھ قوت انتخاب ۔ ذوق سلیم ۔ رائے صائب بھی اعلیٰ درجے کی رکھتے تھے ۔ اگر کسی شخص کو زمانہ حال کی کوئی ایسی تصنیف دیکھنا ہو جو وسعت مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور سلاست زبان کا ایک بہترین مجموعہ کہی جا سکے تو اس کو شعر العجم دیکھنا چاہیے ۔ جس کی یکتائی پر پروفیسر براؤن ایسے مشہور زمانہ مستشرق کی شہادت موجود ہے ۔ یہ سچ ہے کہ مولانا کے انتقال کے بعد اُس کی اکثر غلطیاں نکالی گئیں اور وہ ایک جارحانہ نظر سے دیکھی جا رہی ہے مگر پھر بھی ہمارے نزدیک کتاب کی قدر و قیمت اور مولانا کے تبحّر علمی میں اس سے

کوئی فرق نہیں آسکتا۔ کتاب مذکور نظم فارسی کی ایک مکمل تاریخ ہے اور نہایت سلیس اور دلچسپ زبان میں ہے۔ "موازنہ انیس و دبیر" بھی ایک بہت بیش بہا تصنیف ہے اور گوکہ اس سے بھی اختلاف کیا گیا اور بعض کتابیں اس کے جواب میں نکلیں مگر پھر بھی اس کی اکثر باتیں کارآمد اور صحیح ضرور ہیں۔ آرٹیکل اور مضمون نگاری میں بھی مولانا ایک ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اُن کی اس قسم کی تحریریں نہایت دلچسپی اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں کیونکہ اس میں نہایت مفید اور کارآمد باتیں پائی جاتی ہیں۔ اُن کے مکاتیب بھی بہت دلچسپ ہیں جس سے اُن کے ذاتی حالات اور نیز اُن کے معاصرین اور اس زمانے کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ "مقالات شبلی" اور "رسائل شبلی" ان کے اخباری مضامین کا اور "مکاتیب شبلی" اُن کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

طرز تحریر مولانا ہمیشہ صفائی اور سادگی اور وضاحت کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کی عبارت میں کبھی گنجلک نہیں ہوتی۔ اس میں ایک خاص چمک اور تڑپ ہوتی ہے۔ سرسیّد مرحوم مولانا کو ان کے طرز تحریر پہ مبارک باد دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم تو لکھنؤ اور دلی دونوں کے لیے باعث رشک ہو۔ مولانا کے یہاں صنایع بدایع اور عبارت میں تکلّف بہت کم ہوتا ہے اور گوکہ اکثر جگہ فصاحت اور زور بیان مضمون میں چار چاند لگا دیتا ہے پھر بھی نفس مطلب نہایت واضح رہتا ہے۔ یہ بڑی قابلِ تعریف بات ہے کہ مختلف انواع تحریر کے لیے مولانا اُسی کے مناسب حال انداز بیان بھی اختیار کرتے ہیں۔ بعض تکلّف پسند طبیعتوں کو مثلاً وہ جن کی زبان کو آزاد اُردو کا چٹخارہ ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا کا رنگ روکھا پھیکا اور بے مزہ معلوم ہو مگر کاروباری نثر کا وہ بے مثل نمونہ ہے۔ جو کہ دَور موجودہ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

جیسا کہ لکھا گیا مولانا کا مرتبہ بحیثیت ایک مورّخ اور ناقد کے بہت بلند ہے۔ اُنھوں نے اسلامی تمدّن کی توسیع واشاعت میں بڑا حصّہ لیا۔ ان میں ہم نیشنلزم کی نئی رُوح جادہ گر

دیکھتے ہیں اور یہ ان میں سب سے بڑا کمال ہے کہ علوم مشرقی کو وہ مغربی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ وہ ندوۃ العلماء کے روح رواں اور دار المصنفین کے بانی تھے۔ اپنے زمانے کی نمایاں ہستیوں اور بلند شخصیتوں میں تھے۔ اور در اصل انہیں کی روحانی برکت ہے جو دار المصنفین کی مساعی جمیلہ کی کامیابی کا باعث ہے۔ ان کے لائق شاگردوں سے ابدالآباد تک اُن کا نام روشن رہے گا۔

سید سلیمان ندوی

مولانا سید سلیمان صاحب مولانا شبلی کے جانشین علوم مشرقی اور عربی و فارسی کے جیّد فاضل ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم اُن سے اپنی زندگی میں بہت محبت کرتے اور ایک خاص نظرِ شفقت و عنایت اُن پر رکھتے تھے۔ اور اسی وقت وہ اپنی ذہانت و قابلیت و طباعی سے ان کے اور شاگردوں سے ممتاز تھے۔ انہوں نے مولانا مرحوم کی روایات کو جاری رکھا اور بالفعل انہیں کی نگرانی اور اہتمام میں حلقہ دار المصنفین عربی اور فارسی کی نایاب کتابوں کا ترجمہ و تالیف کی بیش بہا خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ المعارف کے ایڈیٹر بھی ہیں جو زبان اُردو کا مشہور مجلّہ علوم اہل اسلام کی اشاعت کے لیے مخصوص ہے اور اس کے مضامین سے ان کی مضمون نگاری اعلیٰ قابلیت اور تحقیق علمی کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا دار المصنفین اور معارف دونوں کی روح رواں ہیں۔ انہوں نے بلادِ اسلامی اور یورپ کا سفر بھی کیا ہے۔ اور سیرۃ النبی کا بقیہ حصّہ اسی شان و شوکت سے ختم کیا ہے سیرۃ العائشہ۔ ارض القرآن۔ لغات جدیدہ وغیرہ آپ کی مقبول اور مفید تصانیف سے ہیں۔

مولانا سلیمان صاحب کے علاوہ مولانا حمید الدین۔ مولانا عبد الباری۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی۔ پروفیسر نواب علی اور مولانا عبد السلام۔ دار المصنفین کے پُرجوش اور معزز ارکین ہیں۔ مولانا حمید الدین صاحب علاوہ انگریزی کے زبان فارسی و عربی کے مستند فاضل اور علم القرآن اور ادب عربی میں ایک خاص بصیرت رکھتے ہیں۔ مولوی عبد الباری نے برکلے کے فلسفہ کا بہت سلیس کا ترجمہ اُردو میں کیا ہے۔ اور بعض اور فلسفیانہ تصانیف

بھی ان کی ہیں۔ مولوی عبدالسلام اور مولوی عبدالماجد کے مختصر حالات حسب ذیل ہیں
اس موقع پر یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ شعبۂ دارالمصنفین اپنے سامنے ایک درخشندہ مستقبل رکھتا ہے اور اگر اس نے اپنی موجودہ رفتار ترقی جاری رکھی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان اُردو کی تکمیل میں یہ بہت بڑا حصہ لے گا۔ مگر ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنی تصانیف میں عربی اور فارسی الفاظ کی بہتات سے احتراز کرے۔ تاکہ تمام ہی خواہان اُردو کو اس سے سچی ہمدردی رہے۔ اور اس طرح یہ بھی نہ چاہیے کہ تمام مغربی و دیگر علوم مشرقیہ سے قطع نظر کرکے اپنی توجہ صرف علوم اسلامی کی نشر و اشاعت پر محدود رکھے۔

مولوی عبدالسلام ندوی مولوی عبدالسلام صاحب کی ذات پر دارالمصنفین کو جس قدر ناز ہو، کم ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً معارف میں نہایت اعلےٰ درجے کے مضامین لکھتے رہتے۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ اسوۂ صحابیات۔ شعرالہند حصہ اول و دوم۔ ابن یمین۔ وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ سُنا ہے کہ مولانا شبلی کی زندگی کے حالات بھی مرتب کر رہے ہیں مگر وہ اب تک شایع نہیں ہوئے۔ شعرالہند میں جو نظم اُردو کی ایک مبسوط تاریخ ہے ان اثرات و حالات کو جو مختلف اوقات میں نظم اُردو پر مترتب ہوئے ہیں مفصل اور نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اپنی نوعیت میں یہ کتاب بہت عمدہ اور قابل تعریف ہے اور اس کتاب کو تصنیف کرکے مصنف نے فی الحقیقت زبان اُردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ مگر یہ کہنا پڑتا ہے کہ کتاب کا نام اسم غیر مسمیٰ ہے نیز اس میں بعض ضروری باتوں میں فروگزاشتیں بھی ہوگئی ہیں اور اکثر اُن لوگوں کا ذکر بھی نہیں جنھوں نے زبان اُردو کی ترقی میں بہت کوششیں کی ہیں۔ ان اعتراضات کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں نظم اُردو کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھا گیا۔ بہرحال کچھ بھی ہو کارآمد اور مفید ضرور ہے اور مثل مولوی حکیم عبدالحی صاحب مرحوم کے "گل رعنا" کے جو قدیم طرز کا تذکرہ ہے اس میں بعض خاص خاص باتیں

ح ۱ ولادت سنہ ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۳ء - وفات تقریباً ۱۹۶۰ء

ایسی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں۔

مولوی عبدالماجد دریا آبادی مولوی عبدالماجد صاحب دریا آبادی خلف الصدق مولوی عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر مرحوم۔ ۱۸۹۳ء آپ کا سال ولادت ہے۔ ابتدائی عربی اور فارسی تعلیم سے گھر پر فراغت کر کے زبان انگریزی سیتاپور ہائی اسکول میں پڑھنا شروع کی اور انٹرینس پاس کر کے کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۹۱۲ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی پھر درجہ تکمیل (پوسٹ گریجویٹ اسٹنڈیز) کے لیے علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے مگر والد کے انتقال کے سبب سے وہاں زیادہ عرصہ تک قیام نہ کر سکے لکھنؤ چلے آئے اور یہاں آکر تصنیف کے سلسلے میں مشغول ہو گئے ۱۹۱۷ء عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ سے تعلق ہو گیا تھا مگر کچھ عرصہ بعد یہ تعلق ترک کر دیا گو اب بھی گورنمنٹ نظام کے وظیفہ خوار ہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے واسطے کچھ نہ کچھ ادبی کام کرتے رہتے ہیں۔ مولانا سیاسیات سے بھی بڑی دل چسپی رکھتے ہیں اور سیاسی حلقوں میں ایک خاص عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ہفتہ وار اخبار "سچ" آپ کی ادارت میں نکلتا ہے۔

مولانا کو ادبی دنیا میں ایک خاص شہرت حاصل ہے۔ کتب ذیل آپ کی تصانیف سے مشہور ہیں۔

فلسفہ جذبات۔ فلسفہ اجتماع۔ تاریخ اخلاق یورپ۔ مکالمات برکلے یعنی برکلے کی مشہور کتاب "ڈائیلاگز" کا اُردو ترجمہ۔ پیام امن۔ بحر المحبت (مثنوی مصحفی) زود پشیماں (ناٹک) سائیکالوجی آف لیڈرشپ (انگریزی میں) تصوّف و اسلام۔ فلسفیانہ مضامین (اس میں وہ کچھ مضامین داخل ہیں جو الناظر میں چھپے تھے)۔ مولانا کا مطالعہ فلسفہ بہت عمیق ہے اور فلسفیانہ کتابیں اور مضامین نہایت سلیس اور دل چسپ اُردو میں لکھنے کا آپ کو خاص ملکہ حاصل ہے آپ کے انگریزی کے ترجمے نہایت صاف بامحاورہ اور متین ہوتے ہیں۔ مصحفی کی مثنوی "بحر المحبت" جو غیر مطبوعہ تھی، آپ نے نہایت محنت اور عرق ریزی

سے چھپوائی اور اس پر ایک مفید اور بلیغ مقدمہ لکھا ہے۔ آپ کبھی کبھی اپنے مقررہ مسلک یعنی فلسفہ اور تصوف اور سنگین اصناف سخن سے ہٹ بھی جاتے ہیں اور تفنن طبع کے طور پر ہلکی اور سُبک چیزوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اسی آخرالذکر صنف میں آپ کا ڈراما "ز۔ د پشیمان" ہے جو ہرچند کہ اسٹیج کے لائق نہیں مگر پڑھنے میں بہت لطیف اور دلچسپ ہے آپ کو شعر گوئی میں بھی کافی شہرت حاصل ہے گو کہ کم کہتے ہیں مگر جس قدر کہتے ہیں زیادہ تر متصوفانہ رنگ میں ہوتا ہے۔ موجودہ اخبارات و رسائل مثلاً معارف الناظر۔ اُردو۔ ہندوستان ریویو۔ ماڈرن ریویو۔ وغیرہ یہ سب آپ کے اعلیٰ مضامین کے مرہون منّت ہیں۔ آپ کے مضامین معلومات سے پُر ہوتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اعتدال پسندی اور جنٹلٹی اور علمیت آپ کے کلام کا خاص جوہر ہے۔ قوت تنقید آپ کو خدائے تعالیٰ نے بہت اعلیٰ درجے کی دی ہے۔ سُنا جاتا ہے کہ بالفعل آپ ملفوظات مولانا روم کو شایع کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپ کی ذات ادب اُردو کے لیے باعث فخر ہے اور آپ کی تصانیف سے زبان کو خاص فوائد پہنچتے رہتے ہیں

جدید علوم کی ترویج
دِلّی کالج کا قیام

دِلّی کالج کے قیام سے جدید علوم و فنون کی ترویج و ترقی میں خاص مدد ملی۔ بقول مسٹر اینڈ ریوز کے "انیسویں صدی کے شروع میں جو ایک عجیب و غریب علمی روشنی چمکی تھی اس کی وجہ زیادہ تر نئے انگریزی علوم و فنون تھے جن کی تعلیم نے ہندوستان کے واسطے ایک بالکل طلسمی منظر پیش کر دیا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آئندہ پردہ غیب سے ظاہر کیا ہوگا۔ دِلّی کالج میں جو کیمسٹری اور فزکس (کیمیا و طبعیات) کے نئے نئے تجارب طلبا کو دکھائے جاتے تھے۔ اُن سے وہ بغایت مسرور بلکہ مبہوت ہو جاتے تھے اور نہیں کہہ سکتے تھے کہ آئندہ وہ کیا دیکھیں گے۔ وہ بے تکلّف خیال کرتے تھے کہ ہم لوگ ایک جدید دَور کے بانی ہیں اور ترقی اور انکشافات کے وہ خواب دیکھا کرتے تھے۔

اس جدید علمی نور نے اس عہد کو منور کر دیا تھا جس میں سلطنت مغلیہ کے دور آخر کا کر و فر اور شان و شکوہ بھی کچھ شامل تھے مگر یہ روشنی تھوڑے عرصہ تک قائم رہ کر بجھ گئی اور اس کے فنا ہونے کے اسباب میں غدر ۱۸۵۷ء کو بھی بڑا دخل ہے۔"

دلی کالج میں ۱۸۲۷ء میں ایک درجہ انگریزی کا بھی کھل گیا تھا اور باوجود انگریزی سے مخالفت کے طلباء کی تعداد کم نہ تھی۔ ۱۸۳۱ء کے رجسٹروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی کالج میں تین ۳۰۰ سو طالب علم انگریزی پڑھتے۔ اسکول اجمیری دروازہ کے قریب تھا مگر جب وہ ترقی کر کے کالج ہوا تو کشمیری دروازہ اور دریائے جمنا کے قریب آگیا۔ ۱۸۴۳ء میں اسکول اجمیری دروازہ سے منتقل ہو کر شاہی کتب خانہ میں آگیا۔ چونکہ جدید تعلیم سے لوگوں میں منافرت اور مخالفت پھیلی ہوئی تھی۔ لہٰذا اس وقت طلباء سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی بلکہ اچھے اچھے وظائف ان میں انگریزی کا شوق پیدا کرنے کے واسطے ان کو دیے جاتے تھے۔ کالج میں مغربی علوم کے ساتھ ایک مشرقی صیغہ بھی تھا۔ ریاضی کی تعلیم نہایت اعلےٰ درجے کی ہوتی تھی۔ ادب اور زبان انگریزی کو لوگ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے مگر مغربی علوم اور ریاضی کے بہت گرویدہ تھے۔ تعلیم زیادہ تر لکچروں کی مدد سے ہوتی تھی نہ کہ کتابوں سے۔ کیونکہ کتابیں دور دراز مقامات سے آتی تھیں اور دقّت سے ملتی تھیں اور ظاہر ہے کہ اس وقت جدید علوم کی کتابوں کے ترجمے بھی نہیں ہوئے تھے۔ لکچروں کو طلبہ نہایت شوق سے سنتے تھے۔ نئے نئے ریاضی کے مسائل سیکھ کر جدید تجارب کیمیاوی و برقی و مقناطیسی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان کو خیال پیدا ہوتا تھا کہ ہم بالکل ایک نئی علمی دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ پروفیسر رام چندر جو ایک زبردست شخصیت رکھتے تھے اور مسٹر ٹیلر پرنسپل کالج اور پنڈت اجودھیا پرشاد جو دلّی کے کشمیری پنڈت اور اسسٹنٹ پروفیسر تھے طلبہ کی تعلیم ترقی میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ مشرقی صیغہ میں عربی و فارسی کی تعلیم زبان اُردو کی وساطت سے ہوتی تھی۔ اور یہ صیغہ طلباء میں بہت ہر دل عزیز تھا۔ مولوی امام بخش صہبائی فارسی کے بڑے

زبان داں اور ماہر کالج میں فارسی پڑھاتے تھے۔ ٹیلر صاحب اور مولوی امام بخش صہبائی دونوں غدر میں مارے گئے۔

دلّی کالج سے پڑھ کر مشہور لوگ نکلے جنہوں نے زبان اردو کی آئندہ توسیع و ترقی پہ بہت بڑا اثر ڈالا مثلاً مولوی نذیر احمد۔ ماسٹر پیارے لال آشوب۔ مولانا آزاد۔ مولانا حالی۔ اور مولوی ذکاء اللہ کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ دنیاوی ترقیاں بھی ان میں سے بعض نے بہت کیں۔ چنانچہ مولوی شہامت علی ریاست اندور کے وزیر اعظم ہو گئے اور ڈاکٹر مکند لال شمالی ہند میں نہایت مشہور و معروف زمانہ حال کے طرز کے ڈاکٹر گزرے ہیں۔ ڈاکٹر چمن لال عیسائی ہو گئے اور غدر میں مارے گئے۔ ۱۸۴۲ء میں دلّی کالج کی سرپرستی میں ایک ادبی انجمن کھولی گئی جس کی روح رواں پروفیسر رام چندر اور مولانا صہبائی تھے۔ اس انجمن کی قابل ستائش کوششوں سے اکثر مفید کتابیں تیار ہوئیں جو دلّی میں چھپیں اور طلبہ کے بہت کام آئیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں انگریزی سے اور بعض فارسی سے ترجمہ ہوئی تھیں دلّی کی تقلید میں اور شہروں میں بھی مثلاً آگرہ اور لکھنؤ اور بنارس میں اسی قسم کی کتابیں تیار ہوئی تھیں جو انڈیا آفس کے کتب خانے میں موجود ہیں اور ان کے نام بلوم ہارٹ نے اپنی مرتبہ فہرست میں دیے ہیں۔ اسی قسم کے تراجم اور تالیفات سے یہ بہت بڑا فائدہ ہوا نثر اردو بہت صاف سادہ اور بے تکلف ہو کر اس قابل ہو گئی کہ اس میں کاروباری دنیا کی باتیں لکھی جائیں اور غیر زبانوں سے کارآمد ترجمے کیے جاویں۔ ۱۸۶۴ء میں رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب نے دلّی میں ایک اور ادبی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تھی جس کے وہ خود سیکرٹری تھے۔ اس سوسائٹی کے انتظام میں بہت سے مفید لکچر دیے گئے۔ اور نثر اردو کا چراغ گو کہ ٹمٹماتا رہا مگر بجھا نہیں۔ آشوب ہی کی توجہ اور مدد سے مولانا آزاد اور حالی نے جدید رنگ کی شاعری اختیار کی اور انہیں نے مولانا حالی کو اکثر انگریزی چیزیں ترجمہ کر کر کے دیں تاکہ وہ ان کو اردو کا جامہ پہنائیں۔ پروفیسر رام چندر اور

مولانا صہبائی کے مختصر حالات علیحدہ لکھے جاتے ہیں۔

پروفیسر رامچندر یہ قدیم دلّی کالج میں ریاضی کے مشہور پروفیسر تھے۔ ٹیلر صاحب پرنسپل کالج کے میل جول اور اثر سے عیسائی ہو گئے تھے۔ یہ ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے قدیم دلّی کالج کے انگریزی اسکول میں سب سے پہلے تعلیم پائی تھی۔ بہت ذکی اور ذہین آدمی تھے انہوں نے ریاضی کا ایک نیا مسئلہ دریافت کیا تھا جس کی وجہ سے ان کو اہلِ یورپ کے مشہور مہندسوں میں شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ مولوی نذیر احمد۔ مولانا آزاد۔ مولوی ذکاء اللہ وغیرہ ایسے مشہور مشہور لوگ ان کے شاگرد تھے۔ مولوی ذکاء اللہ کو علم ریاضی سے خاص مناسبت تھی۔ اس وجہ سے وہ پروفیسر رامچندر کے بہت محبوب شاگرد تھے۔ اور اسی وجہ سے ان دونوں میں ایک فنّی محبت اور ارتباط عمر بھر قائم رہا۔

پروفیسر رامچندر کی نسبت لکھا ہے کہ نہایت بے خوف۔ راست باز۔ راسخ الاعتقاد شخص تھے۔ چونکہ ہندو مذہب چھوڑ کر عیسائی ہوئے تھے لہذا تمام تعلقات قرابت برادری کے منقطع ہو گئے تھے اور بڑی تکلیفیں اُٹھانا پڑی تھیں اور اسی وجہ سے مزاج میں ایک قسم کی سختی اور خشونت پیدا ہو گئی تھی جو کبھی کبھی مباحثے اور مناظرے کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی مگر پھر بھی رحم دل اور معاملے کے سچّے تھے۔ غدر کے زمانے میں ان کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ ایک شاگرد نے اس سے ان کو مطلع کیا۔ چنانچہ وہ کچھ دن ایک مکان میں چھپے رہے بعد کو بھیس بدل کر نکل گئے۔ کچھ دنوں بعد جب شہر میں امن و امان ہو گیا تو وہ واپس آئے اور اپنی کوشش سے اپنے بعض دوستوں کو بھی شہر میں بلوا لیا۔ کہا جاتا ہے کہ پروفیسر صاحب ریاست پٹیالہ کے ڈائرکٹر تعلیمات ہو گئے تھے۔ وہ تذکرۃ الکاملین کے مصنّف ہیں جس میں روم اور یونان کے مشہور فلاسفروں اور

لہ ولادت ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۱ء۔ وفات ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء۔ ابھی ایک مفصّل کتاب بھی شایع ہوئی ہے۔ فاضل۔

شعراء کے مختصر حالات انگریزی اور عربی کتابوں سے اخذ کرکے لکھے ہیں۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۸۴۹ء میں چھپی تھی بعد کو ۱۸۷۶ء میں مطبع منشی نول کشور میں چھپی۔ اس میں بعض انگریزی شعراء اور فلسفی بعض فارسی شعراء اور بعض مشہور اہل ہند مثلاً والمیک شنکر اچارج اور بھاسکر جوتشی کے حالات بھی درج ہیں۔ پروفیسر صاحب "اصول علم ہیئت" اور "عجائب روزگار" کے بھی مصنف ہیں۔ یہ کتابیں ۱۸۴۶ء و ۱۸۴۷ء میں تیار ہوئی تھیں ان کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے اور ان کے نثر کے نمونے مولوی غلام یحییٰ صاحب تنہا نے اپنی کتاب "سیر المصنفین" میں دیے ہیں۔

مولوی امام بخش صہبائی صہبائی قدیم دلی کالج میں فارسی اور عربی کے پروفیسر بہت روشن خیال اور اخلاقی جرأت کے آدمی تھے۔ زبان فارسی میں ان کو کمال حاصل تھا اور اس زمانے میں بھی جب کہ فارسی کا دَور دَورہ تھا۔ اک خاص عزت اور قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے سرسید مرحوم کو "آثار الصنادید" کی تصنیف میں بہت مدد دی تھی۔ طلبہ میں بہت ہر دل عزیز تھے اور ان کی قابلیت اور شہرت کا طلبہ کے دل پہ بڑا اثر تھا فن شعر میں استاد مشہور تھے اور قلعہ کے اکثر شاہزادے اور متوسلین ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ زمانہ غدر میں مارے گئے اور ان کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔

مولوی غلام امام شہید مولوی غلام[۲] امام شہید شاہ غلام محمد کے بیٹے امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ کے نامور آوردہ شاعروں میں ہیں۔ چونکہ نعت بہت کہتے تھے اس وجہ سے مدّاح نبیؐ اور عاشق رسولؐ کے لقب سے مشہور ہیں۔ قتیل و مصحفی سے اصلاح لیتے

---

[۱] ولادت ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء۔ وفات ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء۔ فاضل

[۲] ولادت ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۸۰۴ء وفات ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء۔ فاضل۔

اور فارسی نظم و نثر میں آغا سید اسماعیل مازندرانی کے شاگرد تھے الہ آباد میں پیشکار تھے۔ ملازمت سے دست کش ہونے کے بعد ریاست حیدر آباد سے ایک معقول رقم بطور وظیفہ کے آخر عمر تک ملتی رہی۔ نواح لکھنؤ حیدر آباد دکن۔ مراد آباد رامپور۔ اور آگرہ میں کثرت سے شاگرد چھوڑے۔ سر سالار جنگ اول۔ نواب کلب علی خاں اور دیگر روسائے عہد ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ "مجموعہ میلاد شریف" "انشائے بہار بے خزاں" اور چند قصائد و غزلیات ان سے یادگار ہیں۔ تاج گنج آگرہ کا حال پرانے رنگ کی نثر میں انہوں نے خوب لکھا ہے۔

منشی غلام غوث بیخبر خواجہ غلام غوث بیخبر کا اصل وطن کشمیر تھا۔ جہاں ان کے بزرگ معزز عہدوں پر ممتاز تھے۔ ان کے والد خواجہ حضور اللہ کشمیر سے تبت اور وہاں سے نیپال آئے جہاں خواجہ غلام غوث کی ولادت ۱۲۴۰ھ میں ہوئی۔ یہ اپنے والدین کے ساتھ بہت کم سنی میں جب کہ ان کی عمر صرف چار برس کی تھی بنارس آ گئے یہاں کچھ قدیم رنگ کی تعلیم حاصل کر کے ۱۸۳۸ء میں اپنے ماموں خان بہادر مولوی سید محمد خاں کی ماتحتی میں جو نواب لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی تھے ملازم ہو گئے۔ وہ لارڈ النبرا گورنر جنرل کی ہمراہی میں قلعہ گوالیار کی جنگ میں بھی شریک ہوئے تھے اور بعد اختتام جنگ ایک اعزازی خلعت سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ اپنے ماموں کے انتقال کے بعد ان کے عہدۂ میر منشی پر فائز ہوئے جہاں عرصہ دراز تک نہایت قابلیت کے ساتھ خدمات منصبی انجام دے کر ۱۸۸۵ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہوئے۔ خواجہ صاحب کو علاوہ خطاب خان بہادری کے بہت سے انعامات اور خلعت اور طلائی تمغہ قیصر ہند سرکار سے عنایت ہوا تھا۔ مرزا غالب کے بڑے دوستوں میں تھے چنانچہ مرزا کے اکثر دلچسپ خطوط ان کے نام "اردوے معلیٰ" اور "عود ہندی" میں موجود ہیں "فغان بیخبر" اور "خونابہ جگر" ان کی گراں بہا تصانیف ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں بہت کبر سنی میں انتقال کیا۔

ان کی تقریظ شہید کی "بہارِ بے خزاں" پر پرانے طرز اور خوشامدانہ رنگ میں ہے۔ خواجہ صاحب عام طور پر صاف اور سلیس نثر لکھتے تھے۔ مگر تقریظوں وغیرہ میں وہی قدیم رنگ برتتے رہتے یعنی مقفیٰ اور مسجع عبارت فارسی کی تقلید میں۔

شمس العلماء سید علی[1] بلگرامی

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی۔ بلگرام کے ایک مشہور خاندان کی آپ یادگار تھے جو علم و فضل کے لحاظ سے بہت معروف و ممتاز تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ہندوستان میں ایک نمایاں شہرت اور قابلیت سے تعلیم ختم کر کے تکمیل کے لیے انگلستان گئے جہاں آپ نے ہندوستان سے بھی زیادہ شہرت اور کامیابی حاصل کی آپ کے اخراجات سفر کے متکفل سر سالار جنگ بہادر تھے۔ آپ کو مختلف زبانیں سیکھنے کا خاص شوق تھا چنانچہ عربی و فارسی و سنسکرت میں کامل مہارت حاصل کرنے کے علاوہ یورپ کی مختلف زبانیں اور نیز ہندوستان کی اکثر زبانیں مثلاً بنگلہ مرہٹی تلنگی خوب جانتے تھے۔ آپ کی شہرت زیادہ تر آپ کی مشہور کتب "تمدن عرب" اور "تمدن ہند" سے ہے جس میں اول الذکر فرنچ مستشرق لیبان کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے۔ آپ نے ایک ڈاکٹری کتاب کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ علاوہ تصنیف و تالیف کے آپ علی گڑھ کالج کے معاملات میں بھی بہت دل چسپی لیتے تھے۔ آپ مذکورہ بالا دونوں کتابوں کی وجہ سے مصنفین زبان اردو کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں کیونکہ یہ دونوں کتابیں علمیت اور قابلیت کے علاوہ آپ کی قدرت زبان پر پوری گواہی دیتی ہیں۔

سید حسین[2] بلگرامی

آنریبل نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ ڈاکٹر سید علی بلگرامی مذکورۂ بالا کے برادر بزرگ ہیں اور گو کہ علمی اور ادبی قابلیت میں چھوٹے بھائی

---

[1] ولادت ۱۰ نومبر ۱۸۵۱ء مطابق ۱۲۶۷ھ۔ وفات ۳ مئی ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ۔

[2] ولادت ۱۸۴۴ء وفات ۱۹۲۶ء۔ ناقل

سید علی بلگرامی

مولوی محمد عزیز مرزا - بی اے - ایم آر - اے - ایس

بڑے بھائی پر فوقیت رکھتے ہوں مگر پبلک اور سیاسی زندگی میں نواب صاحب کو ڈاکٹر صاحب موصوف پر یقیناً فضیلت حاصل ہے آپ ایک عرصۂ دراز تک حیدر آباد دکن میں دولت آصفیہ کے اکثر معزز عہدوں پر ممتاز رہ کر سیکرٹری آف اسٹیٹ ہند کی کونسل میں منتقل ہو گئے افسوس ہے کہ آپ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں کوئی معرکۃ الآرا یادگار نہیں چھوڑی۔ صرف چند مضامین اور وہ ایڈریس جو علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھے گئے تھے اور "وسائل عماد الملک" کے نام سے چھپ گئے ہیں۔ ادبی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب تقریباً چار سو صفحہ کی ہے اور اس کے اکثر مضامین سے علی الخصوص ترقی تعلیم کے مضامین سے آپ کی قیمتی رائیں بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ "ہوا اور پانی" کا مضمون علی الخصوص بہت عمدہ اور قابل قدر ہے اور سائنٹیفک ہونے کے باوجود غیر ضروری اصطلاحات سے پاک ہے۔ دائرۃ المعارف کا قیام جس کا مقصد کمیاب اور مفید عربی کتابوں کا شائع کرنا تھا، آپ ہی کی مبارک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ آپ نے بہت کچھ وقت قرآن شریف کے انگریزی ترجمے پر بھی صرف کیا مگر افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہا۔

مولوی عزیز مرزا[1]

مولوی عزیز مرزا بی۔ اے۔ اس زمانے کے نہایت قابل اور مشہور ممتاز مصنفوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر کے حیدر آباد میں ملازمت اختیار کی۔ یہاں مختلف جگہوں پر رہنے کے بعد ہوم سیکرٹری کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ نہایت قابل تعریف بات ہے وہ اپنے عہدے کے اہم فرائض منصبی کی انجام دہی میں بھی اتنا وقت نکال لیتے تھے جس کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف اور مشاغل علمیہ میں صرف ہوتا تھا۔ تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) نواب فتح نواز جنگ مولوی مہدی حسن کے انگریزی سفر نامہ انگلستان کا ترجمہ جو "گلگشت فرنگ" کے نام سے مشہور ہے۔

---

[1] ولادت ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء۔ وفات ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء

(۲) شاہان بہمنی کے مشہور وزیر خواجہ جہاں عماد الدین محمود گاواں کے حالات زندگی موسوم بہ سیرۃ المحمود؛

(۳) کالی داس کا مشہور ڈرامہ "وکرم اُروسی" کا اُردو ترجمہ جس کے شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں سنسکرت ڈراما کی اصل اور نوعیت کے متعلق بہت سی مفید باتیں لکھی ہیں)۔ ان کو پُرانے سکے جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ ان کا مجموعہ سکہ جات بہت اعلےٰ درجے کا خیال کیا جاتا تھا۔ اکثر جرائد اور اخبارات میں جو مضامین لکھتے تھے۔ وہ "خیالات عزیز" کے نام سے شایع ہو گئے ہیں۔ ان کو بھی علی گڑھ کالج کی ترقی بلکہ عموماً مسلمانوں کی ترقی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ہو گئے تھے۔ جس میں نہایت ہوشیاری اور قابلیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دیے تھے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۹۱۲ء میں ہوا۔ طرز تحریر نہایت سلیس اور دلکش ہے۔ بیجا لفاظی اور تطویل سے بہت بچتے ہیں۔ اپنے زمانے کے مشہور نثر نگاروں میں خیال کیے جاتے تھے۔

مولوی عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقی اُردو

زمانہ موجودہ کے مشہور افاضل اور مصنفین میں مولوی عبدالحق صاحب قابل مدیر رسالہ "اُردو" اور آنریری سیکرٹری انجمن ترقی اُردو کا اسم گرامی خاص طور پر نمایاں ہے۔ سچ پوچھیے تو جس قدر زبان اردو کی تدریجی ترقی اس وقت دکن میں ہے۔ وہ آپ ہی کی ذات بابرکات کی بدولت ہے۔ آپ ہی انجمن مذکور کے روح رواں اور آپ ہی کے ہاتھ میں اس کے کل کاروبار کی عنان ہے۔ انجمن نے آپ ہی کے زیر ہدایت و سرپرستی نہایت مفید اور عمدہ کتابیں خواہ از قسم

ے اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن عکسی تصاویر اور نقشوں کے ساتھ مصنف مرحوم کے لائق فرزند کی طرف سے نظامی پریس بدایوں سے حال میں شایع ہوا ہے - ۱۲

ے ولادت ۱۸۷۰ء وفات ۱۹۶۱ء - فاضل -

تالیفات یا تراجم بکثرت شایع کی ہیں اور اکثر مطبوعات انجمن پر مفید اور فاضلانہ مقدمے اور دیباچے ہیں وہ آپ ہی کے رشحات قلم کے نمونے ہیں جن سے آپ کی تحقیقات علمیہ اور معلومات کا پورا پتہ چلتا ہے ۔ ان کے علاوہ جو مضامین آپ رسائل وغیرہ میں لکھتے رہتے ہیں وہ بھی نہایت موقر اور پر از معلومات ہوتے ہیں۔ الحق آپ کی ذات ہمارے لیے بہت غنیمت اور یقیناً آپ کی شخصیت بہت زبردست ہے۔ آپ نے تمام عمر ادب اردو کی خدمت میں صرف کردی اور اسی کی بدولت ہم کو آج یہ دن نصیب ہوا کہ صدہا پرانے قلمی نسخے جو گوشۂ گمنامی میں پڑے پڑے ضایع ہو جاتے آج زیب قرطاس ہو کر ہماری آنکھوں کو روشن کر رہے ہیں اور قدیم تاریخ نظم و نثر اردو سے جس قدر ہم اس وقت بہرہ مند ہیں وہ بھی زیادہ تر آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ ایک عرصہ دراز تک آپ نے نظام گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم میں کام کیا۔ مثل اکابر سلف کے آپ حد درجہ منکسر المزاج اور خاموش کام کرنے والوں میں ہیں اور اسی وجہ سے اپنی زندگی کے حالات تک دینے سے گریز فرماتے ہیں۔ قوت نقد آپ میں بہت زبردست ہے اور آپ کی تنقیدات ہمیشہ غیر جانب دارانہ اور منصفانہ ہوتی ہیں۔ اردو نقاروں میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور سب سے بڑی خوبی آپ کی تحریر میں یہ ہے کہ آپ کبھی عمدہ ہندی الفاظ کو نہیں چھوڑتے بلکہ ان کو اپنی عبارت میں نہایت خوبی اور استادی کے ساتھ کھپاتے جاتے ہیں البتہ آپ کی عبارت کا مثل مولانا آزاد وغیرہ کے کوئی خاص طرز نہیں۔ جو لوگ آزاد کے طرز اور ان کی خوشیوں کو پسند کرتے ہیں۔ ان کو ضرور آپ کی عبارت روکھی پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوگی۔ مگر اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا۔ آپ کو زبان پر پوری طرح قدرت حاصل ہے ۔ ہمارے نزدیک آپ کی تحریر کا رنگ اگر کسی سے ملتا ہے تو وہ مولانا حالی ہیں۔ بلکہ زمانہ حال کی ضروریات اور جدت طرازیوں کا لحاظ رکھا جائے تو ان پر آپ

سبقت لے گئے ہیں علاوہ دیگر کمالات کے جس سے آپ متصف ہیں، سب سے بڑی صفت آپ میں یہ ہے کہ آپ نے اس عہد میں اپنے اثر سے لوگوں کے دلوں میں زبان کا خاص شوق پیدا کر دیا ہے۔

مولوی وحیدالدین سلیم مثل مولوی عبدالحق صاحب کے مولوی سید وحیدالدین صاحب سلیم بھی زمانہ موجودہ کے نامور شاعروں اور محسنین زبان اُردو میں ہیں۔ آپ مشہور خاندان سادات سے ہیں جنہوں نے پانی پت میں توطن اختیار کر لیا تھا جہاں آپ کے پدر بزرگوار حاجی مولوی فریدالدین صاحب کو شاہ شرف بوعلی قلندر کے مزار پر انوار کی تولیت کا شرف حاصل تھا۔ مولوی صاحب موصوف ابتدائی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے لاہور گئے جہاں آپ نے ادب عربی کی تکمیل مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے کی اور معقول و منقول مولانا عبداللہ ٹونکی سے پڑھا۔ زبان انگریزی میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اور فارسی میں منشی فاضل کا درجہ حاصل کیا۔ ابتداء میں قانون کی طرف کچھ میلان خاطر تھا۔ مگر اس خیال کو ترک کر کے ریاست بہاولپور میں صیغہ تعلیم میں کوئی جگہ حاصل کی جہاں کچھ عرصہ تک قیام کر کے رامپور ہائی اسکول کے ہیڈ مولوی ہو گئے مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ کے قدردان و مربی جنرل عظیم الدین خاں کے قتل کا ناگوار واقعہ پیش آیا تو ترک تعلق کر دیا۔ کچھ دنوں اپنے وطن پانی پت میں مطب بھی کھولا تھا اور ایک دواخانہ بھی قائم کیا تھا۔ اس کے بعد مولانا حالی کی وساطت سے سرسید مرحوم کی خدمت میں باریابی ہوئی۔ وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور آپ کی وجاہت اور قابلیت کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا۔ سلیم صاحب سرسید کے پرائیویٹ سیکرٹری ہو گئے اور عام طور پر ان کی تصنیفات اور مضمون نگاری میں اعانت کرنے لگے۔ سید صاحب کے ساتھ ان کے تعلق مرتے دم تک رہے۔

لہ ولادت ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء۔ وفات ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء۔ فاضل۔

بابائے اردو مولانا عبدالحق

اس کے بعد اپنا رسالہ "معارف" نکالا جو کچھ عرصے تک کامیابی سے چلا پھر نواب محسن الملک کے اصرار سے علی گڑھ گزٹ کے اڈیٹر ہو گئے مگر تھوڑے دنوں بعد بوجہ علالت کے اس کو ترک کر دیا۔ اس کے بعد مسلم گزٹ لکھنؤ کے اڈیٹر ہوئے مگر مسجد کانپور کے ہنگامے کے متعلق کچھ تیز مضامین لکھنے کی وجہ سے یہ جگہ بھی چھوڑنا پڑی پھر اخبار "زمیندار" کے اسٹاف میں بحیثیت جوائنٹ اڈیٹر داخل ہوئے لیکن اس کی ضمانت ضبط ہوگئی تو ان کو بھی اپنے تعلقات اخبار سے منقطع کرنا پڑے۔ ان کی مضمون نگاری اور ترجمہ کی شہرت نے حیدر آباد کے دار الترجمہ کی طرف ان کو گھسیٹا جہاں ان کی مشہور کتاب "وضع اصلاحات" تصنیف ہوئی۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہوا تو پہلے اسسٹنٹ پروفیسر اردو مقرر ہوئے مگر چار برس کے بعد پورے پروفیسر ہو گئے۔

آپ کا طرز تحریر نہایت زور دار سلیس اور معنی خیز ہے۔ کہیں کہیں آپ جذبات نگاری سے بھی کام لیتے ہیں۔ آپ اس زمانے کے اکثر مشہور جرائد اور رسائل میں مفید مضامین لکھتے رہتے ہیں علی الخصوص آپ کے مضامین "تلسی داس کی شاعری" "اردو دیو مالا" اور "عرب کی شاعری" جو رسالہ "اُردو" میں چھپے تھے نہایت اعلیٰ درجے کے اور قابل پڑھنے کے ہیں۔ ایک بڑی صفت آپ کی تحریر میں یہ ہے کہ آپ غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ کے زیادہ شائق نہیں بلکہ مثل مولانا حالی کے ہندی کے شیریں اور رسیلے الفاظ اپنی تحریروں میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ آپ کی قابلِ قدر تصنیف "وضع اصطلاحات" نہایت مفید اور اعلیٰ درجے کی کتاب ہے جس سے آپ کے تبحر علمی اور تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں زبان اُردو کی اصل کا نہایت غور سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور جدید سائنٹیفک اور تکنیکل الفاظ اور محاورات وضع کرنے کے لیے نہایت مفید قواعد قائم کیے ہیں؎۔

؎ افسوس ہے کہ مولوی صاحب موصوف کا ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا ۱۲

شیخ عبد القادر شیخ عبد القادر صاحب زبان اور ادب اُردو کے مستقل محسنوں میں ہیں اب سے تقریباً باون ترپن برس پیشتر لدھیانہ میں پیدا ہوئے[1] جہاں آپ کے اسلاف قانون گویوں کے معزز خدمات انجام دیتے تھے۔ آپ کے والد شیخ فتح الدین لدھیانہ کے محکمہ مال میں ملازم تھے جس وقت ان کا انتقال ہوا۔ شیخ صاحب کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ زمانہ طالب علمی نہایت ناموری اور کامیابی سے ختم کر کے ۱۸۹۴ء میں فورمین کرسچین کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کی ڈگری اول درجے میں حاصل کی جس کے بعد پنجاب "آبزرور" کے اڈیٹوریل اسٹاف میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۸ء میں چیف اڈیٹر ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں اخبار سے تعلق کر کے بیرسٹری کے واسطے انگلستان روانہ ہوئے جہاں حسب معمول تین برس رہے اور اسی عرصہ میں ولایت کے اکثر مشاہیر سے ملنے اور پبلک معاملات کو بغور مطالعہ کرنے کا خوب موقع ملا۔ بعد حصول ڈگری اکثر ممالک یورپ اور بلاد اسلامی کا سفر کیا جس سے معلومات میں اضافہ اور خیالات میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ ہندوستان واپس آکر پہلے دہلی میں کام شروع کیا تھا مگر دو برس بعد لاہور آگئے۔ ۱۹۱۱ء میں لائل پور میں سرکاری وکیل اور پبلک پراسیکیوٹر مقرر ہوئے ۱۹۲۰ء میں یہ عہدہ ترک کر کے لاہور میں پھر بیرسٹری شروع کی اور اب ان کا شمار درجہ اول کے بیرسٹروں میں ہونے لگا۔ ۱۹۲۱ء میں ہائی کورٹ کے جج عارضی طور پر ہوئے اور پھر ایک سال تک اڈیشنل جج بھی رہے۔ ۱۹۲۳ء لیجسلیٹو کونسل پنجاب کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر ڈپٹی پریسیڈنٹ اور پریسیڈنٹ بھی ہو گئے۔ ۱۹۲۵ء میں پنجاب کے وزیر تعلیمات مقرر ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں لیگ اقوام کے ساتویں اجلاس مقام جینوا میں ہندوستان کی طرف سے بحیثیت ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ ان مناصب جلیلہ اور ادبی خدمات سے صاف ظاہر ہے کہ جس قدر اُمیدیں آپ کے کامیاب زمانہ تعلیم میں آپ کی ذات

[1] ولادت ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء۔ وفات ۱۳۶۹ھ مطابق ۹ فروری ۱۹۵۰ء فاضل۔

سے وابستہ تھیں وہ سب پوری ہوئیں۔

شیخ صاحب کو زبان اُردو کے ساتھ ایک خاص عشق ہے جب آپ انڈر گریجویٹ تھے تو آپ نے اسی زمانے میں ایک سلسلہ لکچر زبان انگریزی میں زمانہ حال کے اُردو شعراء اور نثّاروں پہ دینا شروع کیا تھا جو ۱۸۹۸ء میں کتاب کی صورت میں شایع ہؤا اور پبلک میں بہت مقبول ہؤا۔ پنڈت بشن نرائن درآ نجہانی نے بھی اس کی بڑی تعریف کی تھی۔ گو کہ اس کے بعض نتائج اور رایوں سے ان کو اختلاف بھی تھا۔

۱۹۰۱ء میں اُردو کا مشہور و معروف ماہواری رسالہ "مخزن" جاری ہؤا جس نے ادب اُردو کی نہایت بیش بہا اور قابل قدر خدمات انجام دیں اور فی الحقیقت ہماری زبان پر اُس نے اپنا سکہ جما دیا اس رسالہ کے اکثر مضمون نگاروں کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۱ء تک شیخ صاحب ہی اُس کے ایڈیٹر تھے بلکہ ۱۹۲۰ء تک وہی اُس کے آنریری ایڈیٹر رہے۔ اس رسالہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کے اکثر مضامین اس قدر مشہور و مقبول ہوئے کہ کتاب کی صورت میں شایع ہو کر داخل کورس ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں شیخ صاحب نے "اُردو کانفرنس" کے اجلاس کلکتہ میں صدارت کی تھی اور بالفعل آپ "انجمن ارباب علم لاہور" کے صدر ہیں۔

پنڈت منوہر لال زتشی پنڈت صاحب ۱۸۷۶ء بمقام فیض آباد پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد پنڈت کنہیا لال زتشی پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ آپ کے والد کا انتقال ۱۸۸۸ء میں ہؤا۔ ۱۸۹۶ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری کیننگ کالج لکھنؤ سے حاصل کر کے ۱۸۹۷ء میں امتحان ٹریننگ نہایت عزت کے ساتھ پاس کیا۔ پہلے کسی اسکول میں ٹیچر ہوئے پھر ۱۹۰۲ء میں امتحان ایم۔ اے سے فراغت کر کے (جس

میں آپ اوّل ہوئے تھے) سنہ ۱۹۰۲ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک ٹریننگ کالج الہ آباد کے پروفیسر رہے اور اسی عرصہ میں آپ اکثر مضامین انگریزی ہندوستان ریویو کو اور اُردو مضامین زمانہ، ادیب، اور کشمیری درپن کو بھیجتے رہے سنہ ۱۹۱۶ء میں ہیڈ ماسٹری کے بعد انسپکٹر مدارس ہوئے۔ ایک سال رجسٹرار بنارس یونیورسٹی اور ایک سال پرنسپل ٹریننگ کالج الہ آباد بھی آپ رہ چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں لوکل گورنمنٹ کے انڈر سیکرٹری اور سنہ ۱۹۲۱ء میں ایک سال کے واسطے قائم مقام اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم ہے۔ بالفعل آپ جوبلی کالج لکھنؤ کے پرنسپل ہیں۔ گلدستۂ ادب اور "ایجوکیشن ان برٹش انڈیا" (تعلیم برٹش انڈیا میں) آپ کی تصانیف سے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے مرزا غالب اور چکبست وغیرہ پر نہایت فاضلانہ مضامین بھی لکھے ہیں اور اکثر ادبی مباحثوں میں نہایت ذوق و شوق سے حصّہ لیا ہے۔ آپ کو کتب بینی کا بے حد شوق ہے اور ناقد بھی آپ اعلےٰ درجے کے ہیں۔ آپ کے ریویو نہایت منصفانہ اور غیر جانب دارانہ ہوتے ہیں کبھی کبھی آپ نظم اُردو کے پُرانے رنگ سے ناراض ہو کر زمانہ حال کے زبردستی کے شاعروں کی خوب خبر لیتے ہیں۔

منشی دیا نراین نگم دنیائے جریدہ نگاری میں منشی دیا نراین نگم[1] کے نام سے کون ناواقف ہے۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں بمقام کانپور ایک معزز کایستھ خاندان میں آپ پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا منشی شیو سہائے صاحب ایک مشہور وکیل اور وایس چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ تھے۔ نگم صاحب سنہ ۱۸۹۹ء میں کرائسٹ چرچ کالج کانپور میں داخل ہوئے اور سنہ ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور اسی سال اپنا مشہور پرچہ "زمانہ" نکالا جو اب تک بفضلہ نہایت کامیابی سے جاری ہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں "آزاد" جاری کیا جو چند روز روزانہ

---

[1] ولادت سنہ ۱۳۰۰ھ مطابق سنہ ۱۸۸۲ء۔ وفات سنہ ۱۳۶۱ھ مطابق سنہ ۱۹۴۲ء فاضل۔

شیخ عبدالقادر

لالہ سری رام صاحب - مولف خمخانہ جاوید

وہ کہ اب ہفتہ وار ہوگیا ہے۔ ۱۹۱۵ء میں آپ آنریری مجسٹریٹ ہوئے۔

بالفعل آپ مختلف مصروفیتوں کے مرکز ہیں جس میں معاشرتی، سیاسی، علمی، ادبی، تعلیمی، اخباری، غرض کہ ہر قسم کے مشاغل اور مصروفیتیں شامل ہیں۔ سوشل رفارم (اصلاح معاشرت) کے معاملات میں آپ نہایت روشن ضمیر اور آزاد خیال۔ اور سیاسیات میں آپ اعتدال پسند ہیں۔ تعلیمی اور ادبی مشاغل میں خاص کر آپ کو توغل ہے اور بحیثیت ایک مدیر اور جریدہ نگار کے تو آپ ہمارے نوجوانوں کے لیے خضر طریقت ہیں کہ وہ آپ کی مثال کو دیکھیں اور آپ کی کامیابی سے سبق حاصل کریں۔ آپ نے اپنی پوری عمر اپنے پیارے "زمانہ" کی بہبودی اور ترقی میں صرف کر دی اسی وجہ سے وہ عرصہ زائد بیس سال سے اس نمایاں کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ "زمانہ" ہندوستان کا بہت پرانا ماہوار رسالہ ہے۔ اور اس کا شمار اب اُردو کے اُن مخصوص چند پرچوں میں ہے جو فی الواقع زبان کی سچی خدمت کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں قابل ہندو اور مسلمان دونوں بلا تفریق مذہب و ملت مضامین لکھتے ہیں۔ اس کی تنقیدیں نہایت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں اور اس میں معاشرتی اور سیاسی مضامین پر ایسے اہل قلم کے مضامین درج ہوتے ہیں جو اپنے اصابت رائے کے واسطے مشہور ہیں۔ خود منشی صاحب کے مضامین جب کبھی نکلتے ہیں نہایت بچے تُلے اور غیر جانب دارانہ ہوتے ہیں مگر ہم کو افسوس اور شکایت ہے کہ ان کے مضامین سے پرچہ زیادہ ترفیض یاب نہیں ہوتا۔ منشی صاحب ہندوستانی اکاڈمی کے ایک پُرجوش اور سرگرم ممبر بھی ہیں۔

لالہ سری رام دہلوی ایم اے[1] لالہ سری رام صاحب ایک مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کی شہرت اور عظمت کے واسطے یہ کیا کم ہے کہ اس کا سلسلہ معاکے اکبر کے

---

[1] ولادت ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء۔ وفات ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۰ء ناضل

کے مشہور وزیر راجہ ٹوڈر مل سے مل جاتا ہے۔ لالہ صاحب کے آباد اجداد سلاطین مغلیہ کے عہد میں ہمیشہ معزز و ممتاز رہے ہیں۔ آپ کے پدر بزرگوار آنریبل رائے بہادر مدن گوپال صاحب ایم۔ اے بیرسٹرایٹ لاء کے اسم گرامی سے دلّی اور لاہور کا بچہ بچہ واقف ہے اور آپ کے عم نامدار رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب آشوب کو کون نہیں جانتا کہ ایک مشہور و معروف استاد اور ماہر فن تعلیم صوبہ پنجاب میں گزرے ہیں اور خواجہ الطاف حسین حالیؔ اور مولوی محمد حسین آزاد کے معاصر اور دوست تھے۔

لالہ صاحب موصوف ۱۸۷۵ء میں دلّی میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے بارہ برس کی عمر میں والد کے ہمراہ لاہور گئے۔ ۱۸۹۵ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۸۹۸ء میں ایم۔ اے اور منصفی کا امتحان پاس کر کے منصف مقرر ہوئے اور لاہور، امرتسر دلّی وغیرہ کی کرسی منصفی کو چند سال تک زینت دیتے رہے۔ مگر دمہ کے موذی مرض میں مبتلا ہو جانے سے ۱۹۰۷ء میں سرکاری ملازمت ترک کرنا پڑی اور علمی مشاغل اور اپنی وسیع ریاست کے اہتمام و انتظام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ آپ ایک اعلیٰ درجے کی علمی قابلیت رکھنے کے علاوہ نہایت خوش تقریر خلیق اور ملنسار واقع ہوئے ہیں۔ اور آپ کا خاندان ہمیشہ سے علم و فضل امارت و سخاوت اور پبلک خدمات کے واسطے ضرب المثل ہے اور اس پہ مولانا جامی کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے ؎

این سلسلہ از طلائے ناب ست   ایں خانہ تمام آفتاب ست

تذکرہ ہزار داستان المعروف بہ خمخانۂ جاوید	لالہ سری رام صاحب اس عدیم المثال تذکرہ کے مصنف ہیں جو افسوس ہے کہ اب تک اتمام کو نہیں پہنچا یعنی اس کی چار ضخیم جلدیں چھپ

گئی ہیں اور تقریباً چار ہی ابھی باقی ہیں۔ یہ شعراء اردو کے حالات کا خزانہ اور ان کے منتخب

کلام کا مجموعہ ہے اور اس کو بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے اور اس کے ترتیب اور تدوین میں کس قدر وقت اور روپیہ صرف ہوگا اور کس قدر تحقیق و تلاش اور کس قدر محنت کرنا پڑی ہوگی۔ اس کی ابتدا کے حالات فاضل مصنف نے جلد اول کے میں مفصل طور پر بیان کیے ہیں اس کی چار جلدیں سنین ذیل میں شایع ہوئیں۔

یعنی جلد اول سنہ ۱۹۰۶ء جلد دوم سنہ ۱۹۱۰ء جلد سوم سنہ ۱۹۱۵ء اور جلد چہارم سنہ ۱۹۲۶ء میں اس لاجواب تذکرہ کو اگر معلومات کی کان کہیں تو بجا ہے اور اگر اس کو تاریخ الشعراء کی جان سمجھیں تو زیبا ہے۔ اس نے صدہا بھولے بھٹکے شاعروں کو روشناس خلق کیا۔ جس میں بعض ایسے بھی ضرور ہیں کہ جن کا کلام ہم تک نہ پہنچتا تو کوئی زیادہ حرج نہ تھا۔ انداز بیان اس کا اس قدر متین اور مہذب ہے کہ اچھوں کا تو ذکر کیا بُروں کو بھی اچھا کر دکھایا ہے۔ بعض جگہ کچھ غلط بیانیاں بھی ہوگئی ہیں مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کو شاعر دکھایا ہے۔ اور ان کا تخلص اشتیاق بتایا ہے۔ جس کی غلطی سے مولانا حالی نے متنبہ کر دیا۔ اسی طرح تعشق کو اُنس کا بیٹا بتایا اور اسی غلطی کو منشی احسن مرزا، نشتر لکھنوی نے اپنی فاضلانہ تقریظ میں درست کر دیا۔ مگر انسان انسان ہے اور الانسان مرکب من الخطاء والنسیان مشہور ہے فاضل مصنف نے انتخاب کلام میں واقعی کمال دکھایا ہے کہ ہر شاعر کے صرف چوٹی کے اشعار منتخب کیے جو فی الواقع بڑی سلامتی مذاق اور اصابت رائے کی دلیل ہے۔ عبارت اس قدر سلیس اور بامحاورہ فصیح و بلیغ کہ چشم بد دور کہنے کو جی چاہتا ہے اور مضامین اس درجہ اعلےٰ و ارفع کہ نور علیٰ نور کہنے کو جی چاہتا ہے۔ اتمام و اختتام کے بعد یہ تذکرہ بے نظیر و بے عدیل الحق ہوگا اور نظم اُردو کا انسائیکلوپیڈیا یعنی قاموس الاعظم کہلائے جانے کا بے شک مستحق ہوگا۔ اور کیوں نہ ہو یہ قابل مصنف لالہ سری رام صاحب کی عمر بھر کی محنت اور ہمارے عہد کی بہترین ادبی خدمت ہے تمام تذکرہ نویس اس زمانے کے اس کے مرہون منت اور خوشہ چین ہیں اور سب سے بڑھ کر مولف کتاب ہذا بالیقین ہے۔ اگر

کسی کو تقریظوں کی بہار اور ریویو کے لآلی آب دار دیکھنا ہوں تو وہ اس کی جلدوں کے آخری صفحات پڑھے اور دیکھے کہ کن کن لوگوں نے کس کس انداز اور کس کس ادا سے نظم و نثر دونوں میں کیا کیا گلفشانیاں اور سحر بیانیاں کی ہیں۔ ہمارے نزدیک اتنی کثرت سے اور اتنے اعلیٰ درجے کے ریویو کسی ایک کتاب پر ہرگز نہ ہوئے ہوں گے۔ لالہ سری رام صاحب نے ۱۸۹۵ء میں دیوان انور اور ۱۹۰۲ء میں مہتاب داغ اور ضمیمہ یادگار داغ بھی نہایت عمدگی سے شائع کیا تھا ظاہر ہے کہ ایسے جامع تذکرہ کی فراہمی کے واسطے کتنی کتابیں کتنے صرف کثیر سے جمع کرنی پڑی ہوں گی ع

درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اسی وجہ سے موصوف کا کتب خانہ جس میں اکثر نادر قلمی کتابیں اور تصاویر بھی ہیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ اور آپ بالفعل اسی ادبی فضا میں بکمال فراغت ایک قابل رشک زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور خواجہ حافظ کے اس شعر کے کم از کم دوسرے مصرع کے ضرور مصداق ہیں[1] ؎

دو یار زیرک و از بادۂ کہن دو منے فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

دیگر نثاران اردو موجودہ زمانے میں اردو نثاروں اور ناقدان سخن کی اتنی کثرت ہے کہ ان تمام اصحاب کے مختصر حالات لکھنا بھی تطویل کا باعث ہوگا۔ لہذا یہاں بعض ارباب ادب کے صرف نام بتائے جاتے ہیں۔ ان کے مفصل حالات مع موجودہ شعرا کے ذکر کے ایک دوسری کتاب میں جو ہم تیار کر رہے ہیں انشاء اللہ ضرور جگہ پائیں گے۔

(۱) پنڈت بشن نرائن[2] در آنجہانی اردو کے بڑے مبصر ہونے کے علاوہ شاعر شیریں سخن بھی تھے۔ ادب اردو پر اردو اور انگریزی دونوں میں نہایت فاضلانہ تنقیدی مضامین

---

[1] نہایت افسوس سے سنا جاتا ہے کہ تھوڑے عرصہ سے لالہ سری رام صاحب سخت علیل ہیں خدا ان کو صحت جلد عنایت کرے۔ [2] ولادت ۱۸۶۴ء۔ وفات ۱۹۱۶ء۔

لکھتے رہتے تھے۔ علی الخصوص وہ مضامین جو سرشار کے متعلق ہیں۔ اور شیخ عبد القادر کی کتاب "نیو اسکول آف اُردو لٹریچر" (جدید ادب اُردو) پر جو فاضلانہ تقریظ لکھی ہے نہایت دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے۔

(۲) مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی[2] ڈپٹی کلکٹر زمانہ حال کے نہایت خوشگو شاعر اور قابل سخن سنج ہیں۔ ان کے مضامین میر و سودا سے ہم نے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا، کلام نہایت سلیس اور زوردار ہوتا ہے۔

(۳) احسن[3] مارہروی فن تنقید میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں دیوان ولی کو نہایت قابلیت سے ایڈٹ کیا۔ کتاب "اُردو لشکر" بھی ان کی تصنیف ہے جس میں نظم اُردو کی درجہ بدرجہ ترقی کو نہایت خوبی سے دکھایا ہے۔ خیالات آزاد اور زبان زوردار ہوتی ہے۔ مگر بعض اوقات ذاتیات کی بحث سے بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے ہمارے نزدیک احتراز کرنا چاہیے۔

(۴) حامد[4] اللہ افسر رشید احمد صدیقی۔ سید مسعود حسن رضوی اور جلیل احمد قدوائی یہ سب زبان اُردو کے اعلیٰ درجے کے ادیب اور ناقد ہیں۔

(۵) اسی طرح پروفیسر[5] نامی۔ پروفیسر ضامن علی الہ آباد یونیورسٹی کے لکچرار اُردو بھی ادب اُردو میں بڑی بصیرت رکھتے ہیں۔

(۶) حسرت[6] موہانی۔ نظم اُردو اور فن تنقید کے ایک استوار ستون ہیں مضامین گو کہ مختصر لکھتے ہیں مگر اوریجنل اور بہت طبیعت داری کے ہوتے ہیں۔

۱؎ ولادت ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۵ء۔ ماشاء اللہ حیات ہیں۔

۲؎ ولادت ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء وفات ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء۔

۳؎ ولادت ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء۔ ناقل ۴؎ ولادت ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء۔

۵؎ ولادت ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۷ء۔ وفات ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء مطابق ۱۳۷۰ھ۔

(۷) خان بہادر[1] مرزا سلطان احمد صاحب کثیر التصانیف ہیں۔ مختلف مضامین پر صفائی اور سلاست سے مگر عام رنگ میں لکھتے ہیں۔

(۸) سلطان[2] حیدر جوش ایک مخصوص رنگ کے نہایت عمدہ لکھنے والے ہیں۔ جن کے مضامین سے الناظر کے صفحات کو زیب و زینت ہوتی ہے۔

(۹) سید سجاد حیدر یلدرم[3]۔ نثر افسانہ نما بہت خوب لکھتے ہیں۔ عبارت بہت دلفریب اور اس میں ایک خاص نغزیت ہوتی ہے۔ ترکی جانتے ہیں۔ اور ایک ترکی ناول اور ایک ترکی ڈرامہ موسوم بہ خوارزم شاہ کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان کا مجموعہ مضامین "خیالستان" مشہور ہے۔

(۱۰) مولانا ظفر علی خاں[4] ادبی اور اخبار نویسی کی دنیا میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ زبردست مضمون نگار اور محسن زبان ہیں۔ ان کے اکثر تصانیف انجمن ترقی اُردو کے ذریعہ سے چھپ چکی ہیں۔ سیاسی مضامین لکھنے کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔

(۱۱) مولانا ہاشمی فرید آبادی[5]۔ ادبائے دکن میں خاص طور پہ ممتاز ہیں۔ تصانیف بہ کثرت رکھتے ہیں۔

(۱۲) مہدی[6] حسن بہت اچھے لفظی مصور اور صاحب طرز تھے۔ ان کی کتاب افادات[7] مہدی مشہور ہے۔ افسوس کہ نوجوانی کی موت نے ان کی ہونہار زندگی کو قطع کر کے آئندہ امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔

---

[1] ولادت ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء۔ وفات ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۱ء۔ [2] ولادت ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء

[3] ولادت ۱۲۹۷ھ وفات ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء۔

[4] ولادت ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء۔ وفات ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء۔

[5] ولادت ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء وفات ۲۰ر جولائی ۱۹۶۲ء مطابق ۱۷ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ

[6] ولادت ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء۔ وفات ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء

[7] افادات مہدی مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور

جدید نثرِ اُردو کے دو طرز زمانہ حال میں نثرِ اُردو اتنی کثیر الاشکال ہے اور ادیبوں نے اس قدر علیحدہ علیحدہ طرزِ انشاء اختیار کیے ہیں کہ ان سب کا استقصا اور ان پہ رائے زنی کرنا دشوار ہے۔ لہٰذا ہم یہاں صرف دو طرزوں کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

پہلا طرز عربی اردو اور اس کے مقابلہ میں ہندی آمیز اُردو اکثر لوگوں کا میلانِ طبع اس طرف ہے کہ عبارت مشکل اور غیر مانوس فارسی عربی الفاظ بالقصد استعمال کیے جائیں تاکہ عبارت شاندار اور وقیع معلوم ہو۔ ممکن ہے کہ اس طرز کی ابتدا اس طرح ہوئی ہو کہ سر سید اور ان کے رفقاء اور مقلدین ان کی تقلید میں نہایت سیدھی سادی مگر زوردار عبارت لکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ بعد کو بعض جدت پسند طبائع کو جب وہ روکھی پھیکی بدمزہ معلوم ہونے لگی تو اس میں رنگینیت اور علمیت کی چاشنی پیدا کرنے کے لیے عربی فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا جانا ضروری سمجھا گیا۔ گویا اس طرز کو سر سید مرحوم کے طرز کا ردِ عمل کہنا چاہیے۔ ہمارے خیال میں اس طرز کے مخترع مولانا ابو الکلام آزاد ہیں۔ جنہوں نے اپنے مشہور اخبار الہلال میں اس کو بہت برتا۔ مولانا موصوف مذہب اور سیاسیات پر بڑے زبردست لکھنے والوں میں ہیں اور خود ان کی تحریروں میں اس قسم کی خطا بیاں اور لغزشیں مطلق نہیں ہوتیں جو ان کے مقلدین کے یہاں بکثرت پائی جاتی ہیں، جن کی عبارتیں سوائے تسلسل الفاظ کے کوئی خوبی نہیں رکھتیں۔ یہ طرز تحریر اس جماعت کو نہایت پسند آیا جو چاہتے ہیں کہ اہلِ اسلام کے مختص علوم مثلاً فقہ تفسیر حدیث وغیرہ کی نشر و اشاعت ہو اور اس ذریعہ سے لوگوں میں مذہبی جذبات پیدا ہوں۔ اس کے بالمقابل اور اسی کے جواب میں ایک فرقہ نے سنسکرت اور ہندی کے الفاظ بکثرت استعمال کرنا شروع کیے۔ مگر غنیمت ہے کہ اس قسم کی تحریریں خواہ وہ کیسی ہی نیک نیتی پر محمول ہوں ایک مختصر جماعت تک محدود ہیں۔ اور بہی خواہان اُردو نے اس بدعت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

دوسرا طرز خیالی یعنی ٹیگوری اردو طرز مذکورہ بالا کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا طرز بھی مروج ہے جو خیالی اُردو کہا جا سکتا ہے۔ اس کو ٹیگوری اُردو بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ یہ رابندرو ناتھ ٹیگور کے اس طرز کا تتبع ہے جو انہوں نے اپنی تصانیف گیتان جلی وغیرہ میں اختیار کیا ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ ٹیگور اور بعض مشہور انگریز انشاپردازوں کا حقیقی تتبع نہیں بلکہ ان کے کلام کی محض نقل ہے جس میں ان لوگوں کے محاسن کلام مطلق نہیں پائے جاتے۔ یہ نقال نہ تو اصلی تصوف سے واقف ہیں اور نہ اُن میں حقیقی تخیل کی روح ہے۔ ایسے لوگوں کی انشاء پردازی سوائے چند مستثنیات کے طور پر بالکل خام ہوتی ہے۔ اس میں کسی قسم کا ادبی حُسن نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر مبالغہ آمیز اور مطلق العنان اور سطحی ہوتی ہے اور بعض اوقات تو وہ مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ان غیر مسلک پوتوں کو بسا اوقات اُن کے صناع قیمتی سچے موتی خیال کرتے ہیں بعض وقت اس قسم کی تحریریں غیر مہذب بلکہ فحش درجہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس قسم کی نثر کی ابتدا افسانہ نویسی سے ہوئی۔ اس سے لوگوں کو بہت لطف آنے لگا اور نئی معلومات کے راستے کُھل گئے۔ مضامین میں وسعت اور تنوّع اور عبارت میں ایک خاص شان اور رنگینی اس سے پیدا ہوئی۔ صاحب تحریر سب بے تکلف صاحب طرز بن بیٹھے اور اپنے مفروضہ شاعرانہ خیالات اور شاعرانہ انداز کو بلا عروض کے جھنجھٹ کے نثر کی صورت میں اکڑ اکڑ کر دکھانے لگے تاکہ لوگ ان کو نثار شاعر سمجھنے لگیں۔ اور یہ اس طرح ہوا کہ کبھی تو عبارت عربی الفاظ اور ترکیبوں کا مجموعہ بن گئی کبھی جدّت کے واسطے نئے نئے الفاظ اور ترکیبیں تراشی گئیں اور کبھی ایک خاص زور اور انداز پیدا کرنے کے واسطے معمولی صرفی نحوی ترکیبیں اُلٹ پلٹ کر عبارت ایک طرفہ معجون بنائی گئی۔ مضامین میں بھی علیٰ ہذا القیاس عجیب و غریب تغیرات ہوئے کبھی ان میں جدّت اور رنگینی پیدا کرنے کے واسطے مشرقی اور مغربی (رومی اور یونانی) دیومالا چھائی گئی کبھی نیچر کی بے جان چیزیں جاندار تصور کر کے اس قدر جوش و خروش اور ایسے

مصنوعی شاعرانہ جذبات کے ساتھ اُن سے تخاطب کیا گیا کہ بعض اوقات اس کو پڑھ کر یا سُن کر بے اختیار ہنسی آتی ہے اور وہ ایک چھوٹی نمایش اور شعبدہ بازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ایسے مضامین اور ایسی عبارت البتہ ایک استاد کے قلم سے تو فی الواقع رنگ و حسن و موسیقیت کا جلوہ زار بن سکتی ہے مگر نو آموزوں کے ہاتھ میں وہ محض ایک گورکھ دھندا بن کر رہ جاتی ہے جس میں سوائے الفاظ کے معنی کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

پُرانی اخباری دنیا ۱۸۳۶ء میں پریس کو آزادی ملی۔ ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر حسین نے اُردو اخبار دلّی سے جاری کیا جو حقیقت میں اخبار یعنی خبروں کا مجموعہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک ادبی پرچہ تھا جس میں اکثر اوقات ذوقؔ و غالبؔ و مومنؔ اور دیگر معاصر شعراء کی غزلیں اور کبھی کبھی ہم طرح غزلیں بھی درج ہوتی تھیں۔ کبھی اس میں زبان اور محاورات کی بحث ہوتی تھی۔ ذوقؔ کی وفات کی تاریخیں اور شہیدی کی شاعری پر مباحثہ بھی اس میں چھپا تھا۔ گورنمنٹ اس کی سرپرستی کرتی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں منشی ہرسکھ رائے نے جو ایک بھٹ نگری کایستھ تھے لاہور سے کوہ نور نکالا۔ یہ پرچہ برٹش انڈیا اور دیسی ریاستیں دونوں میں بہت مقبول تھا۔ مہاراجگان کشمیر و پٹیالہ اس پرچہ کی اور نیز اس کے مالک کی بڑی قدر کرتے تھے۔ پہلے وہ ہفتہ وار تھا مگر بعد کو ہفتہ میں دو مرتبہ اور پھر تین مرتبہ نکلنے لگا۔ آخر میں اس کا زوال ہو گیا اور انہیں لوگوں کے ہاتھوں ہوا جنھوں نے اس میں کام سیکھ سیکھ کر اس کے رقیب دوسرے پرچے نکالنا شروع کیے۔ منشی نولکشور صاحب بھی اس کے اسٹاف میں کام کرتے تھے۔ پھر شعلۂ طور اور مطلع نور کانپور سے۔ پنجابی اخبار اور انجم الاخبار لاہور سے۔ اشرف الاخبار دلّی سے۔ وکٹوریہ اخبار سیالکوٹ سے۔ قاسم الاخبار بنگلور سے۔ کشف الاخبار بمبئی سے۔ کارنامہ لکھنؤ سے اور جریدۂ روزگار مدراس سے نکلے اور چند دنوں کے بعد اکثر ان میں سے بند ہو گئے۔ اودھ اخبار جس کو منشی نولکشور صاحب نے ۱۸۵۸ء میں جاری کیا تھا اب بھی نکلتا ہے بلکہ اس کا شمار ہمارے

صوبے کے اعلےٰ درجے کے اور مشہور روزانہ اخباروں میں سے ہے۔ شروع میں جب منشی صاحب موصوف کے زمانے میں یہ اخبار نکلتا تھا تو یہ زیادہ تر اُن خبروں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ جو انگریزی اخباروں کے تاروں یا نوٹوں سے ترجمہ کر کے چھاپی جاتی تھیں اور اس کی کوئی معینہ پالسی بھی نہ تھی سوائے اس کے کہ سیاسی شورش کے یہ ہمیشہ خلاف تھا۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا۔ اس کے بعد روزانہ ہوا۔ اس کا ساز و سامان اور اسٹاف اعلےٰ درجے کا تھا۔ اسی کا ہمعصر شمس الاخبار تھا جو مدراس سے نکلتا تھا اور زیادہ تر مسلمانوں کے واسطے مخصوص تھا۔ یہ کوئی مشہور پرچہ نہ تھا۔ اور تھوڑے عرصے کے بعد بند ہو گیا۔ ایک دوسرا مشہور پرچہ اخبار عام لاہور ہے جس کو پنڈت مکند رام نے نکالا تھا جو کوہ نور میں ملازم تھے اور پنشن یافتہ سرکاری عہدہ دار اس کے معاون تھے۔ یہ ایک خاص خبروں کا پرچہ تھا اور نہایت ارزاں تھا کچھ دنوں گورنمنٹ اس کی سرپرست رہی اور ہر اسکول میں اس کے پرچے جاتے تھے مگر یہ سرپرستی اب موقوف ہو گئی۔ پہلے یہ بھی ہفتہ وار تھا۔ اس کے بعد سہ روزہ اور دو روزہ ہوا۔ اس کی زبان اخباری زبان تھی یعنی اس میں کوئی ادبی خصوصیت نہ تھی۔ مگر یہ بات قابل تعریف ضرور ہے کہ اس کی ارزانی قیمت نے لوگوں کے دل میں اخبار بینی کا شوق پیدا کر دیا۔ اودھ پنچ لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں وجود میں آیا۔ یہ ایک ظرافت کا پرچہ تھا اور اپنے عنفوان شباب میں نہایت کامیاب۔ لوگوں کو اس کا انداز اس قدر پسند آیا کہ ملک میں اس کے اکثر نقال پیدا ہو گئے۔ اس کی خاص خوبیاں یہ تھیں کہ آزادی سے لکھتا تھا۔ ظریفانہ رنگ میں لکھتا تھا۔ جس کی ملک میں بڑی ضرورت تھی۔ انشا پردازی اعلےٰ درجے کی ہوتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی خاص فرقہ یا جماعت یا کسی خاص مذہب کا طرفدار یا مخالف نہ تھا۔ منشی سجاد حسین مرحوم اس کے قابل ایڈیٹر تھے اور اکثر اس عہد کے قابل ظریف الطبع اصحاب اس کے نامہ نگار تھے۔ ہندوستانی کی ابتدا لکھنؤ میں ۱۸۸۳ء میں ہوئی۔ یہ سب سے پہلا اردو پرچہ تھا جس نے سیاسیات اور واقعات حاضرہ پر بالاستیعاب بحث کی

یہ ایک اعلیٰ درجے کا پرچہ تھا اور کبھی چھوٹی چھوٹی باتوں اور جزئی مناقشوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ پہلے ہفتہ وار تھا پھر سہ روزہ ہوگیا۔ اس کی زبان میں ادبیت نہ تھی۔ ممکن ہے کہ ترجمہ وغیرہ کی جلدی اس کا باعث ہو۔ اسی شان کا پرچہ رفیق ہند تھا جو لاہور سے نکلتا تھا پیسہ اخبار ۱۸۸۵ء میں نکلا۔ منشی محبوب عالم صاحب اس کے ایڈیٹر تھے اس کی ارزاں قیمت اور مضامین کی عمدگی سے لوگ اس کو بہت زیادہ پڑھتے تھے اور اسی وجہ سے اس میں اشتہارات بکثرت نکلتے تھے۔

ادبی اُردو رسالے اس قسم کے رسالوں میں مولانا شرر مرحوم کا دلگداز بہت پرانا رسالہ ہے جو اب بھی نکل رہا ہے۔ کانپور کا ذکر منشی دیا نراین صاحب نگم کے ذکر میں گزر چکا۔ ادیب الہ آباد بھی نہایت عمدہ رسالہ تھا مگر افسوس ہے کہ تھوڑے دنوں میں اس کی عمر ختم ہوگئی۔ الناظر جس کے قابل ایڈیٹر مولانا ظفر الملک صاحب علوی ہیں۔ نہایت آزاد خیال اور بڑی قابلیت کا پرچہ ہے۔ ہزار داستان لاہور میں صرف چھوٹے افسانے اور ناول نکلتے ہیں۔ ہمایوں لاہور اور شباب اُردو لاہور بھی اپنی صنف میں عمدہ پرچے ہیں۔ نگار لکھنؤ (جو پہلے بھوپال سے نکلتا تھا) ایک اعلیٰ درجے کا ادبی پرچہ ہے اور اپنے فاضل ایڈیٹر نیاز فتحپوری کی شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔ معارف اعظم گڑھ اور اُردو اورنگ آباد یہ دونوں زمانہ موجود کے بہترین ادبی رسالے ہیں جن کے اکثر مضامین نہایت اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں۔ سُہیل علی گڑھ گو کہ حال ہی میں طلوع ہوا۔ نہایت ہونہار رسالہ ہے۔ اس کے مقاصد بہت اعلیٰ ہیں اور اگر ترقی کرتا رہا تو اس کا شمار بہترین اُردو رسائل میں ہو جائے گا۔ مولانا حسرت موہانی کا اُردوئے معلی ایک زمانے میں بہت مشہور تھا۔ مگر اب ویسا نہیں ہے۔ مُرقع، لکھنؤ اور اکبر، الہ آباد سے نکلتے ہیں۔ مخزن ادب اردو کی بہت بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ مختصر یہ کہ سب رسائل کو نام بنام گنوانا بہت مشکل ہے مگر ان پرچوں میں جو ایک زمانے میں شہرت رکھتے تھے۔ اور اب بند ہوگئے۔ دکن ریویو۔

حسن اور العصر قابل ذکر ہیں۔

اکثر اخبار نویسوں کے حالات اُن کے نام کے تحت میں درج کیے گئے ہیں۔ مولانا ظفر الملک، مولوی بشیر الدین ایڈیٹر البشیر اور تاجور نجیب آبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اس وجہ سے کہ یہ حضرات ادب اُردو کی بہت قیمتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اگر کسی کو اُردو روزانہ اخباروں کے ایڈیٹروں کے نام دیکھنا ہوں تو ایک مختصر کتاب "اخبار نویسوں کے حالات" مولفہ محمد الدین فوق ایڈیٹر کشمیری میگزین کا مطالعہ کریں۔

باب ۱۷

اُردو ناول کی اِبتداء

شرر اور سرشار کا زمانہ

اُردو کے پرانے قصے

"افسانہ گوئی کا شوق دنیا میں بہت قدیم اور انسان کے دل میں اس کا بہت گہرا اثر ہے۔" پرانے اُردو قصے یا تو فارسی سے ترجمہ ہوئے یا سنسکرت سے بذریعہ فارسی تراجم کے لیے گئے یا انہیں دونوں چیزوں کو گھٹا بڑھا کر کچھ نئے قصے گھڑ لیے گئے تھے۔ یہ سب اپنی نوعیت میں مختلف ہیں۔ بعض ہمت و شجاعت کے قصے ہیں۔ بعض میں دیووں اور پریوں کا ذکر ہے۔ بعض اخلاقی ہیں اور بعض نہایت مخرب اخلاق۔ انداز بیان سب کا وہی ٹکا بندھا معمولی ہے۔ واقعات کا بیان قریب قریب یکساں ہے جن کو بار بار پڑھ کر طبیعت اکتا جاتی ہے۔ عجائب و غرائب کا ذکر عام ہے۔ انسان دیووں اور پریوں کے ساتھ بے تکلف ملتے جلتے ہیں۔ طلسم سحر جادو ہر قصے میں کسی نہ کسی صورت سے موجود ہے بلکہ اکثر اسی پر قصے کا دارومدار ہوتا ہے انداز بیان عام طور پر سادہ اور سبق آموز ہوتا ہے مگر کیرکٹر نویسی کا کسی میں پتہ نہیں۔ اور نہ کوئی داخلی دلچسپی نہ کسی پلاٹ کی تعمیر ہوتی ہے، زیادہ تر حسن و عشق کے حالات

ساحروں اور جادوگروں کی لڑائیاں، جادوگروں کے شاہزادوں سے مقابلے اور آدمیوں کا جانوروں کی صورت میں بدل جانا دکھایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر روزمرہ کے واقعات سے وہ خالی ہیں۔

اقسامِ قصص | خاص اقسام قصص حسب ذیل ہیں۔

(۱) الف لیلہ (۲) بوستان خیال (۳) داستان امیر حمزہ مع اُس کے فروعات طلسم ہوشربا وغیرہ کے (۴) قصۂ حاتم طائی و باغ و بہار وغیرہ (۵) ہندوستانی قصّے جیسے بیتال پچیسی۔ کلیلہ و دمنہ سنگاسن بتیسی۔ گل بکاؤلی۔ طوطا کہانی وغیرہ۔

مطبع منشی نول کشور لکھنؤ | اکثر اس قسم کے قصّے مطبع منشی نول کشور میں چھپے ہیں جس کے بانی خود منشی نول کشور صاحب سی۔ آئی۔ ای تھے۔ اس مطبع نے زبان اُردو کی بڑی خدمت کی اور اس کی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا اور نادر قدیم کتابوں کی اشاعت مشہور کتب فارسی وعربی کے تراجم جدید کتابوں کی، پبلک مذاق کے موافق تیاری۔ اور نیز اسکولی کتابوں کی تیاری سے ادب اُردو پر بہت بڑا احسان کیا۔ منشی صاحب موصوف ۱۸۳۶ء میں بستوئی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا منشی بالمکند آگرہ میں سرکاری خزانچی تھے۔ اور والد منشی جمنا داس بھی کاروبار کرتے تھے۔ منشی نول کشور ایک خود ساختہ آدمی تھے اور بچپنے ہی سے تجارت کی اعلےٰ قابلیت رکھتے تھے۔ ان کو اخبارات سے بڑا شوق تھا۔ منشی ہرسکھ رائے کی ماتحتی میں اخبار کوہ نور لاہور میں کچھ عرصہ تک رہے جہاں ان کو چھاپہ خانہ وغیرہ کے حالات کا بہت وسیع تجربہ ہو گیا۔ غدر کے بعد ملازمت ترک کر کے لکھنؤ آ گئے۔ جہاں ۱۸۵۸ء میں سر رابرٹ منٹگمری اور کرنل ایبٹ کی سرپرستی میں اپنا مطبع کھولا۔ تقدیر نے یاوری کی اور ان کے کام کو روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔ ان کی قابلیت اُن کی دیانت داری ان کی پابندی اصول سے یہ مطبع تھوڑے ہی عرصہ میں ہندوستان کیا بلکہ ایشیا کے سب سے بڑے مطابع میں شمار کیا جانے لگا۔ منشی صاحب نے

زرکثیر قیمتی نادر قلمی کتابوں کی خریدہ میں صرف کیا جن میں سے اکثر کو شایع کرکے پبلک کو بہت بڑا فائدہ پہنچایا۔ اس مطبع سے ہزارہا عربی فارسی سنسکرت اردو اور ہندی کتابیں بڑے صرف اور بڑے تکلف سے چھپ کر شایع ہوئیں۔ مختلف قسم اور مختلف ہدیوں کے قرآن شریف شایع ہوئے جن سے اہل اسلام کو بہت بڑا نفع پہنچا۔ اودھ اخبار بھی ۱۸۵۸ء میں انہوں نے جاری کیا تھا جیسا کہ اخبارات کے ذکر میں بیان ہوا۔ اُن کی موت ۱۸۹۵ء میں واقع ہوئی اور وفات کے وقت انہوں نے تقریباً ایک کروڑ روپیہ کی جائداد اور کاروبار چھوڑا۔ ان کے بعد ان کے لائق فرزند بہادر منشی پراگ نراین صاحب آنجہانی نے ادب اُردو ہندی کی بڑی خدمت کی۔ اور اب ان کے ہونہار فرزند منشی بشن نرائن صاحب بھارگو اپنے والد کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔ اور نول کشور پریس آپ کی کوششوں سے نہایت کامیابی سے ترقی کر رہا ہے۔

داستان امیر حمزہ صاحب قران ایک حجیم اور ضخیم کتاب متعدد جلدوں میں ہے۔ اصل کتاب فارسی میں شیخ ابو الفیض فیضی نے اکبر کی تفریح طبع کے واسطے تیار کی تھی۔ اس کے آٹھ دفتر ہیں اور ہر دفتر میں صدہا صفحات کی کئی کئی جلدیں ہیں جن کی مجموعی تعداد ۱۸ اٹھارہ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ سب سے مشہور دفتر اوّل مسمّٰے بہ نوشیرواں نامہ دو جلدوں میں اور دفتر پنجم موسوم بہ طلسم ہوش رُبا سات جلدوں میں ہے اور مؤخر الذکر بہت مقبول عام ہے طلسم ہوش رُبا کی اوّل چار جلدوں کا ترجمہ میر محمد حسین جاہ اور آخر تین جلدوں کا ترجمہ احمد حسین قمر کا ہے۔ ایک منظوم ترجمہ طوطا رام شایاں نے بھی کیا تھا۔ نوشیرواں نامہ کا منشی نول کشور صاحب کی فرمایش سے شیخ تصدق حسین داستان گو نے کیا تھا۔ اس کتاب میں ایک فرضی طویل افسانہ امیر حمزہ کا ہے جو پیغمبر اسلام صلواۃ اللہ علیہ والسلام کے عم بزرگوار تھے۔ جس میں ایک قصہ سے سیکڑوں قصے پیدا ہوتے چلے گئے ہیں۔

بوستان خیال اس کی نو ضخیم جلدیں ہیں اور اس کے مصنف میر تقی خیال سمجھے جاتے ہیں

جو اصل میں گجرات نے رہنے والے تھے مگر آخر میں دلی میں آ گئے تھے۔ یہ قصہ مصنف نے اپنی معشوقہ کی دلچسپی کے لیے داستان امیر حمزہ کے رنگ میں تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب کو محمد شاہ رنگیلے نے بہت پسند کیا اور وہ انہیں کے زمانے میں اور انہیں کے حکم سے اختتام کو پہنچی۔ اس کے تقریباً چار ہزار صفحات ہیں۔ پانچ جلدوں کا ترجمہ اُردو میں خواجہ بدرالدین معروف بہ خواجہ امان دہلوی نے اور دو جلدوں کا ترجمہ لکھنؤ میں چھوٹے آغا نے کیا اور پوری کتاب پر نظر ثانی بھی کی۔

ان سب کتابوں میں بڑا عیب یہ ہے کہ صحیح جذبات نگاری اور کیرکٹر نویسی ان میں مفقود ہے۔ کوئی معیّن پلاٹ بھی نہیں ہے۔ چند مشہور لوگوں کے بعید از قیاس افسانے ہیں جن میں جنّات اور دیوزادوں سے لڑائی اور ساحروں سے مقابلہ کا ذکر ہے۔ کبھی کبھی وہ سحر و طلسم میں پھنس بھی جاتے ہیں۔ مگر آخر میں فتح یاب نکلتے ہیں اور اپنی محبوبہ کو ظالموں کے پنجہ سے نجات دلاتے ہیں۔ قصّہ کے تمام واقعات میں ایسی یکسانی ہے کہ جی اُکتا جاتا ہے کوئی تنوّع اور جدّت نہیں اور روزانہ واقعات زندگی کا تو کہیں ذکر نہیں ہے۔ اکثر یہ قصّے فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شایع ہوئے۔ اور اب منشی نول کشور کے مطبع میں بڑے آب و تاب سے شایع ہوتے رہتے ہیں۔

افسانہ اور ناول کی بیچ کی کڑی مرزا رجب علی بیگ سرور نے ناول کی آفرینش میں بہت کچھ مدد دی یعنی اپنی مشہور کتاب فسانہ عجائب کی تصنیف سے لوگوں کے دلوں میں افسانہ کا شوق پیدا کر دیا یہ ضرور ہے کہ اس کی مصنوعی مقفیٰ اور مسجّع عبارت نے کہیں کہیں مطلب کو گنجلک کر دیا۔ اور تسلسل بیان میں فرق ڈال دیا ہے۔ واقعات معمولی اور زبان نہایت پر تصنّع اور پیچیدہ ہے۔

البتہ مولوی نذیر احمد صاحب کے بعض قصّے موجودہ ناول کی حدود تک پہنچ جاتے ہیں گو کہ ان میں بھی موجودہ اصول ناول نویسی کی پوری پیروی نہیں پائی جاتی۔ وہ اوّل سے

منشی نول کشور

منشی بشن نرائن صاحب بہاگو
مالک نول کشور پریس

آخر تک نصیحت آمیز ہیں اور کسی معاشرتی یا تعلیمی مضمون یا کسی مذہبی مسئلہ پر ایک زبردست وعظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رویائے صادقہ، توبۃ النصوح، مرأۃ العروس وغیرہ کی تہ میں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق ضرور ہے جو بہت زور کے ساتھ سکھایا گیا ہے۔ بے شک مولوی صاحب نے یہ بہت بڑا کمال کیا کہ مافوق العادت اور حیرت انگیز چیزوں کو اپنی تصانیف سے ایک قلم خارج کر دیا۔ اور معمولی واقعات زندگی کو ایک منظّم پلاٹ کی صورت میں دلچسپی سے بیان کیا۔ ان کی قابل قدر تصانیف جو اس زمانے کے رسم و رواج اور طُرق و عادات کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی قوت استدلال و مشاہدہ کے شاہد عادل ہیں۔ زبان پر ان کو پوری طرح قدرت حاصل ہے اور گو کہ اس میں کہیں کہیں ثقالت پیدا ہو جاتی ہے مگر پھر بھی سلاست و روانی ان کے ناولوں کی خاص مابہ الامتیاز چیز ہے سلسلۂ واقعات وہ خوب قائم رکھتے ہیں۔ گو کہ کہیں کہیں اس قاعدے کی خلاف ورزی سے قصّے کے تناسب میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ کیرکٹر دل چسپ مگر ضرورت سے زیادہ ادب آموز ہیں۔

اودھ پنچ اور اس کی ادبی خدمات

منشی سجاد حسین مرحوم نے لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ نکال کر ہندوستانی اخبار نویسی اور ادب اُردو پر احسان عظیم کیا۔ نثر کی ایک خاص شان پیدا کی۔ مذاق و ظرافت جس سے اب تک ہمارا ادب خالی تھا داخل نثر کئے زبان میں بلیغ الفاظ شامل کر کے گرانقدری پیدا کی۔ پُر زور طریقہ سے کتابوں کی تنقید کی۔ ناول نویسی میں ترقی کی۔ اودھ پنچ سب سے پہلا اخبار ہے جس نے ایک مقرّر اور معیّن پالیسی اختیار کی۔ وہ محض خبر رسانی نہیں کرتا تھا بلکہ پبلک معاملات میں اپنی آزادانہ رائے رکھتا۔ اور قومی حقوق کا تحفّظ کرتا تھا اور ہندوستانی رؤسا کا ناصح اور محتسب بھی تھا۔ وہ اصول کانگریس کا حامی، ہندو مسلم اتحاد میں ساعی، البرٹ بل کی تحقیر اور ایکٹ انکم ٹیکس کے پاس ہونے کا سخت مخالف تھا لیکن اسی کے ساتھ سوشل معاملات میں بہت قدامت پرست سر سید

اور ان کی تجاویز کا دشمن اور تعلیم نسواں اور پردہ کے توڑنے کا بھی سخت مخالف تھا۔ غرض کہ اس اعتبار سے جدید و قدیم رنگ کا ایک عجیب مجموعہ تھا۔ اس کے اکثر نامہ نگار نہایت قابل اور فاضل لوگ تھے۔ مثلاً علاوہ خود منشی سجاد حسین مرحوم کے مرزا مچھو بیگ عاشق (جو ستم ظریف کے نام سے اودھ پنچ میں مضامین لکھتے تھے) تربھون ناتھ ہجر۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ احمد علی کسمنڈوی۔ اکبر الہ آبادی۔ نواب سید محمد آزاد جن میں سے بعض کے کچھ حالات علیحدہ بھی لکھے جائیں گے۔

اودھ[1] پنچ یوں تو ایک ظریفانہ موقر اخبار تھا مگر کبھی کبھی اس کی ظرافت کا رنگ بدل جاتا

---

[1] اس زمانے میں لوگ اس قدر بے حس ہو گئے ہیں اور مذاق و ظرافت کا ان میں اس قدر فقدان اور اس شئے لطیف کی ان میں اتنی کمی ہو گئی ہے کہ اودھ پنچ ایسا بے مثل ہنسنے ہنسانے والا پرچہ جو مذاق کے پیرایہ میں نصیحت اور ظرافت کے ساتھ عبرت سکھاتا اور انشا پردازی کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ اپنے سابق ایڈیٹر منشی سجاد حسین صاحب کے ساتھ خود بھی مر گیا تھا۔ مگر خدا بھلا کرے حکیم ممتاز حسین عثمانی موجودہ ایڈیٹر کا کہ انہوں نے اس کو زندہ کیا اور اس کے تن بے جان میں نئے سرے سے جان ڈالی۔ ایک معنی میں تو ہم حکیم صاحب موصوف کو منشی سجاد حسین مرحوم پر ترجیح دیں گے۔ اس وجہ سے کہ منشی صاحب مرحوم کے وقت میں تو بہت سے قابل اہل سخن ان کے ہم مذاق اور یار و مددگار موجود اور ان کا ہاتھ بٹانے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ پبلک بھی قدر دان تھی حساس بھی۔ باحمیت تھی۔ اودھ پنچ کے تازیانہ ظرافت سے لوگ اسی طرح ڈرتے تھے جیسے شوخ لڑکے ڈنڈے باز مولوی سے ڈرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک بدکردار شخص جب اپنا بدنما چہرہ صفحات اودھ پنچ کے مجلے آئینے میں دیکھتا تو اپنی ڈراؤنی صورت سے ڈر کر بُرے افعال سے توبہ کر لیتا اور اودھ پنچ کا خریدار بن جاتا تھا۔ اس طرح ہم خرما و ہم ثواب کے اصول پر خود اودھ پنچ کا بھی فائدہ ہوتا اور دوسروں کے اخلاق بھی درست ہو جاتے تھے۔ یخ وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا۔ مگر اب وہ باتیں نہیں رہیں۔ لوگوں کے اخلاق بدل گئے۔ اطوار متغیر ہو گئے۔ ظرافت کے قدر دان اور اس سے فائدہ اٹھانے والے باقی نہ رہے۔ لوگوں سے حس اور اثر پذیری کا مادہ جاتا رہا اور ظرافت کا انداز بھی بدل گیا۔ مگر پھر بھی بُری بھلی جیسی ہے ایسی ہے کہ۔ (باقی بر صفحہ ۱۳۱)

تھا۔ اور وہ طعن و تشنیع اور ذاتی حملوں پہ اتر آتا تھا بعض مضامین کے پڑھنے سے مثلاً وہ جو فسانہ آزاد۔

(بقیہ صفحہ ۱۳۰) اس وقت ہندوستان میں اودھ پنچ کا نظیر و عدیل نہیں۔ وہ اپنی آپ مثال اور قلمرو ظرافت میں حاکم علی الاطلاق ہے۔ ہزار آفریں ہے اُس کے فاضل ایڈیٹر کو کہ انہوں نے اس کی روایات قدیمہ کو قائم رکھا بلکہ زمانہ حال اور ضروریات کے مطابق مضامین کا معیار بلند کر دیا۔ پورا پرچہ بیچارے تن تنہا نکالتے ہیں اور ٹھیک وقت پر نکالتے ہیں جو ہفتہ وار اور ماہوار رسالوں کے لیے قابل فخر اور قابل تقلید بات ہے۔ اس موقعہ پر ہم ایک بات اپنے مکرم فاضل دوست سے ضرور گزارش کریں گے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے پرچے سے "بوانصیبن" کا ذکر خیر اور ان کی بات چیت کا انداز ذرا کم کر دیں بلکہ اگر بالکل خارج کر دیں تو اور بھی اچھا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض مقامات پر اس کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اس جنس کی بھی مانگ ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ مولانا (سابق مسٹر) محمد علی اپنی مکہ شریف والی عبا اور عمامہ۔ دارم چہ ازیں پوشم کے قاعدے سے پہن کر اسمبلی کے اجلاس میں تشریف لے گئے۔ پنڈت مدن موہن مالوی ان کی اس نئی دھج کو دیکھ کر کہنے لگے۔ کہ آہا! مولانا محمد علی ہیں ہم تو سمجھے تھے کہ بیگم صاحب بھوپال آرہی ہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ اس جگہ جہاں عورتیں ہی عورتیں ہیں اگر آپ مجھ کو بیگم صاحب سمجھے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ بہر طور یہ اصل کہ اودھ پنچ کے بعض ناظرین عورتوں سے کم یا زیادہ مرتبہ نہیں رکھتے۔ لہٰذا اُن سے ہم کلام ہونے کے لیے بھی "بوانصیبن" کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک حد تک تو ضرور صحیح اور قابل تسلیم ہے۔ مگر جب اس میں تجاوز ہو جاتا ہے اور سیاسی و علمی و معاشرتی جملہ معاملات میں جا و بے جا بوانصیبن یا ان کی سہیلی منطق آرا بیگم دریائے لطافت کی پی نورن کی طرح آن کر کود پڑتی ہیں۔ اور وائسرائے لارڈ اِروِن سے لے کر شیخ حبیب اللہ صاحب تک سے سیاسی اور علمی مسائل میں اپنے خاص انداز میں ہمکلام ہونے لگتی ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یا اللہ ان باتوں کے واسطے کیا کوئی مرد دستیاب نہیں ہوتا تھا کہ عورتوں کی طرف سے اور ان کی زبان میں یہ مطالب ادا کیے گئے۔ اور اس سے نفس مسئلہ اور اخبار کے ظریفانہ انداز میں کیا اضافہ ہوا۔ ہمارے ملک میں تعلیم نسواں ابھی اس درجے کو نہیں پہنچی کہ ایسی عورتیں پیدا ہو گئی ہوں جو سیاسی اور علمی معاملات میں کوئی صائب رائے رکھتی یا اس کا اظہار کر سکتی ہیں۔ پھر اس نئی اُپج سے اور اخبار پہ رجعت پسندی کا الزام عائد کرنے سے کیا فائدہ؟

حالی۔ داغ۔ گلزارنسیم وغیرہ کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اودھ پنچ کے صفحات مہذب، اور سنجیدہ ظرافت سے گزر کر پھکڑ کا ایک میدان بن گئے ہیں۔ مگر اقسام ذیل کے مضامین نہایت قابلیت اور شستگی کے ساتھ اس کے صفحات میں درج ہوتے رہے ہیں۔ لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں۔ محرم۔ چہلم۔ عید۔ بقرعید۔ شب برات۔ ہولی۔ دیوالی۔ بسنت۔ عیش باغ کے میلے۔ ناچ رنگ کے جلسے اور دعوتیں۔ مشاعرے۔ اجلاس ہائے عدالت۔ مرغ و بٹیر کی پالیاں۔ الکشن کے مقابلے وغیرہ۔

منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ

منشی سجاد حسین مرحوم منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر کے بیٹے تھے۔ جو گورنمنٹ سے پنشن لے کر حیدر آباد دکن گئے اور وہاں سول جج ہو گئے تھے۔ منشی سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان کیننگ کالج سے پاس کر کے اور کچھ دنوں مختلف ملازمتیں کر کے ۱۸۷۷ء میں اپنا مشہور اخبار "اودھ پنچ" نکالا۔ ان کی ذاتی قابلیت طبیعت داری اور وسیع الاخلاقی سے ان کے بہت سے دوست ہم مذاق و ہم مشرب پیدا ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ تک پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی اُن کے اخبار میں مضمون نگاری کرتے تھے۔ مگر جب سے کہ وہ خود اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہوئے اودھ پنچ کی نامہ نگاری چھوڑ دی جس کا ذکر کسی قدر تفصیل سے آئے گا۔ منشی سجاد حسین پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہندوستان میں ایک ظریفانہ رنگ کا اُردو اخبار نکالا جس نے کہ ملک اور زبان دونوں کی معقول خدمت انجام دی۔ منشی صاحب نہایت نیکدل، صاف باطن اور غیر متعصب شخص تھے اور کبھی مذہبی رنگ کے مضامین کو اپنے اخبار میں جگہ نہیں دیتے تھے۔ ان کی تحریر کا ایک خاص انداز تھا جس میں واقفیت اور معلومات کے ساتھ مذاق و ظرافت اور لطائف و ظرائف بکثرت ہوتے تھے۔ عبارت میں بے ساختگی اور شستگی بہت نمایاں تھی۔ ان کے وہ فرضی خطوط جو ہندوستانی رؤسا کے نام ہیں۔ ایک عجیب انداز کے ہیں۔ ان میں ایک خاص طریقے سے نصیحت کی گئی ہے۔ منشی صاحب ایک زبردست ناول نگار بھی تھے۔ چنانچہ اُن کے ناول حاجی بغلول۔ طرحدار لونڈی۔ پیاری دنیا۔ احمق الذین۔ میٹھی چھری۔ کایا پلٹ۔ حیات شیخ چلی

خواجه بدرالدین خان عرف خواجه امان مترجم بوستان خیال

مشہور ہیں اور ان سب کی عبارت نہایت بلیغ اور دلچسپ ظریفانہ انداز میں ہے بسنہ ۱۹۱۰ء میں مرض فالج میں مبتلا ہوئے اور ایک عرصہ دراز تک جسمانی تکالیف اور آلام و مصائب میں مبتلا رہ کر ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا۔ اور اودھ پنچ سابق ۱۹۱۲ء میں ان کی زندگی میں بند ہو گیا تھا۔

مرزا مچھو بیگ[1] عاشق — مرزا محمد مرتضیٰ عرف مرزا مچھو بیگ عاشق تخلص مرزا اصغر علی بیگ کے بیٹے شرفاء لکھنؤ میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ بچپنے میں ورزش کا بڑا شوق تھا اور بانک پٹا وغیرہ اپنے نانا سے سیکھا تھا۔ شاعری کا شوق فطری تھا۔ نسیم دہلوی سے تلمذ تھا۔ بہت خوش گو اور رنگین طبع شاعر تھے۔ مگر نظم سے زیادہ نثر میں ان کو شہرت حاصل ہوئی جس میں وہ صفائی زبان صحت محاورہ اور بذلہ سنجی کے لیے مشہور تھے۔ آخر عمر میں "ستم ظریف" کے لقب سے اودھ پنچ میں مضمون نگاری کرتے رہے۔ ان کے مضامین پڑھنے کے قابل ہیں اور محاورہ اور صفائی زبان کے لیے اپنی آپ مثال ہیں۔ مطبوعہ تصانیف نظم و نثر حسب ذیل ہیں۔

گلزار نجات۔ میلاد شریف (منظوم)، آفتاب قیامت (لکچر کے انداز میں ایک ظریفانہ نظم جو الہ آباد میں پڑھی گئی تھی)، بہار ہند (اردو محاورات کی ایک ناتمام لغت)، مثنوی نیرنگ خیال۔ بعض مضامین جو اودھ پنچ میں نکل چکے تھے اور "چشم بصیرت" کے نام سے علیحدہ شایع ہوئے ہیں۔ ان کا اُردو دیوان ان کے صاحبزادہ مرزا محمد صدیق کے پاس ہے جو ہنوز شایع نہیں ہوا۔ منشی بالمکند گپتا سابق ایڈیٹر بھارت متر کلکتہ ان کے ایک مشہور شاگرد تھے۔ مرزا صاحب نہایت ہشاش بشاش، خلیق و متواضع اور وسیع الاحباب تھے۔ مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خود داری اور آزادی یہاں تک تھی۔ کہ ملازمت سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اس وجہ سے کہ اس میں پابندی عائد ہوتی تھی۔ سیاسیات سے بھی شوق تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کے ڈیلی گیٹ کی حیثیت

---

[1] ولادت ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء۔ وفات ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء۔

سے کانگریس میں شریک ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ صفائی زبان بذلہ سنجی آپ کے خاص جوہر ہیں۔

تربھون ناتھ ہجر | پنڈت تربھون ناتھ سپرو متخلص بہ ہجر پنڈت دشمبر ناتھ سپرو کے بیٹے تھے۔ ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم انگریزی سے فراغت کرکے اخبار نویسی کا مشغلہ اختیار کیا، کچھ دنوں تک لکھنؤ میں وکالت بھی کی تھی۔ نہایت شریف الطبع ملنسار اور ہر دلعزیز تھے۔

نواب سید محمد آزاد[1] | نواب سید محمد آزاد۔ آئی۔ ایس۔ او ۱۸۴۶ء میں بمقام ڈھاکہ پیدا ہوئے۔ مشرقی بنگال کے ایک معزز اور دولت مند خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ ابتدائی تعلیم آغا احمد علی اصفہانی سے حاصل کی اور یہ وہی شخص ہیں جن سے مرزا غالب سے "برہان قاطع" کے بارہ میں معرکے رہے ہیں۔ انگریزی گوکہ پرائیویٹ طور پر پڑھی تھی۔ مگر اس زبان میں ان کو مہارت کامل حاصل تھی۔ ابتدائے ملازمت سب رجسٹراری سے ہوئی اور اسی لائن میں ترقی کرتے کرتے انسپکٹر جنرل رجسٹری کے معزز عہدہ تک پہنچے۔ بنگال کونسل میں دو دفعہ کرسی ممبری کو زینت بخشی اور امپیریل سروس آرڈر (آئی۔ ایس۔ او) کا نشان اعزازی آپ کو عطا ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہوئے۔ پہلے آپ ایک فارسی اخبار "دوربین" میں بزبان فارسی مضامین لکھتے تھے مگر اس کے بعد اودھ پنچ، آگرہ اخبار وغیرہ مختلف اخبارات و رسائل میں زبان اردو میں لکھتے رہے۔ ۱۸۷۷ء میں ان کا ناول "نوابی دربار" نکلا جس میں کہ مذاق کے پیرایہ میں پرانے رنگ کے فاقہ مست نوابوں کا خوب خاکہ اڑایا گیا تھا اور بہت مقبول عام ہوا۔ آپ انگلستان بھی گئے تھے اور وہاں سے جو خطوط بھیجے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ آپ کی کتاب موسوم بہ "نئی لغت" ظریفانہ رنگ کی مقفیٰ نہایت دل چسپ کتاب ہے۔

جوالا پرشاد برق | منشی جوالا پرشاد متخلص بہ برق ایک نہایت ذہین اور قابل شاعر و نثار

---

[1] ولادت ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء۔ وفات ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۶ء۔

دونوں تھے۔ ۱۸۶۳ء میں بمقام سیتاپور پیدا ہوئے۔ انٹرنس کا امتحان کھیری سے پاس کرکے ۱۸۷۸ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں بی، اے اور ۱۸۸۳ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۸۵ء تک وکالت کرکے منصف ہوگئے جس میں ترقی کرتے کرتے قائم مقام ڈسٹرکٹ و سشن جج کے درجے تک پہنچے۔ ۱۹۰۹ء میں کمرلیشن کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں بعارضہ پلیگ اس دار فانی سے کوچ کیا۔ نہایت طبیعت دار اور ذہین شخص تھے۔ فسانۂ آزاد کی عبارت کے اس قدر دلدادہ تھے کہ خود بھی وہی طرز ایک حد تک اختیار کیا۔ آپ کی مثنوی "بہار" ایک نہایت اعلیٰ درجے کی تصنیف ہے جو سرسید مرحوم کو بہت پسند تھی۔ آپ علاوہ شاعر خوشگو ہونے کے مترجم بھی اعلیٰ درجے کے تھے۔ بنکم چندر چٹرجی کے اکثر مشہور ناولوں کے ترجمے آپ کے قلم سے نکلے ہیں۔ مثلاً بنگالی دولہن، پرتاب، روہنی، مرنالنی، مار آستین وغیرہ۔ آپ کا کا ترجمہ اس قدر صاف سلیس بامحاورہ اور شیریں ہوتا ہے کہ مطلق ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ کتب مذکورہ بالا بہترین اردو ناول خیال کیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ شیکسپیئر کے بعض ڈراماؤں کا بھی ترجمہ آپ نے کیا تھا مگر افسوس کہ ان میں سے اکثر شایع نہ ہوسکے۔

احمد علی شوق منشی احمد علی[1] شوق قدوائی امیر مرحوم کے معزز شاگردوں میں تھے۔ غزل اور مثنوی خوب کہتے تھے۔ چند ناٹک نثر و نظم بھی آپ کی یادگار ہیں جس میں "قاسم و زہرہ" اور "میکفرسن و لوسی" زیادہ مشہور ہیں۔ مثنویاں آپ کی بہت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں علی الخصوص "عالم خیال" جس کی زبان نہایت لطیف و شیریں ہے۔ بے حد مقبول ہوئی۔ یہ کتاب ایک ستم رسیدہ عورت کی دکھ بھری داستان ہے جو اپنے بچھڑے ہوئے شوہر کی واپسی کا انتظار بڑے شوق و ذوق سے کر رہی ہے۔ اس کی عبارت فارسی اضافتوں سے خالی ہے۔ دیوان بھی آپ کا شایع ہوگیا ہے اور نہایت اعلیٰ درجے کا ہے۔ آپ فن عروض اور نکات ادبیہ سے

[1] ولادت ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۳ء وفات ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۵ء۔

پوری طرح واقف تھے۔ اور نثر کے مضامین بھی صفائی اور صحت زبان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ آخر عمر میں ریاست رام پور سے تعلق ہو گیا تھا۔ آپ کی وفات حسرت آیات سے ممتاز شعرائے اُردو کی صف میں ایک جگہ خالی ہو گئی جس کی خانہ پُری مشکل ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ در متخلص بہ سرشار گزشتہ صدی کے آخر میں ایک عجیب زندہ دل باکمال شخص گزرے ہیں۔ ایک معزز کشمیری خاندان سے تھے ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ صرف چار برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اُن کے چھوٹے بھائی پنڈت بشمبر ناتھ در ڈپٹی کلکٹر تھے جن کے بیٹے ریاست بلرام پور میں ملازم ہیں۔ سرشار کے صاحبزادے پنڈت رنجن ناتھ در سرکاری خزانے میں ملازم تھے مگر جوانی میں انتقال کر گئے۔ سرشار عربی فارسی انگریزی تینوں زبانوں سے واقف تھے۔ انگریزی انہوں نے کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھی تھی مگر اس میں کوئی ڈگری نہیں حاصل کی۔ سب سے پہلے ضلع اسکول کھیری میں ٹیچر ہوئے اور یہیں سے وہ "مراسلہ کشمیری" میں جو اس زمانے میں کشمیری پنڈتوں کا ایک ماہوار رسالہ نکلا کرتا تھا اور "اودھ پنچ" میں اپنے مضامین بھیجا کرتے تھے۔ یہ آرٹیکل گو کہ کوئی خصوصیت نہیں رکھتے تھے مگر پھر بھی ان کی آیندہ تصانیف اور شہرت کا ایک سنگ بنیاد ضرور تھے۔ سرشار ترجمہ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے اور وہ اپنا اس قسم کا کام سرشتۂ تعلیم کے کسی رسالہ میں بھیجا کرتے جہاں وہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ڈائرکٹر سرشتۂ تعلیم اس کو بہت پسند کرتے اور ان کی قابلیت کی داد دیتے تھے۔ سرشار کبھی کبھی "مرآۃ الہند" اور "ریاض الاخبار" میں بھی اپنے مضامین بھیجتے ۱۸۷۶ء میں انہوں نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا اور اس کا نام "شمس الضحیٰ" رکھا۔ اس میں انہوں نے اکثر سائنس کی اصطلاحات کا ترجمہ عمدہ اور سلیس اُردو میں کیا ہے۔ اسی سال وہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور یہ اس طور پہ ہوا کہ ڈاکٹر کمپ لفتھہ ڈائرکٹر سرشتۂ تعلیم نے ان کا تعارف منشی نول کشور صاحب مالک اخبار سے کرایا جن کو اس وقت

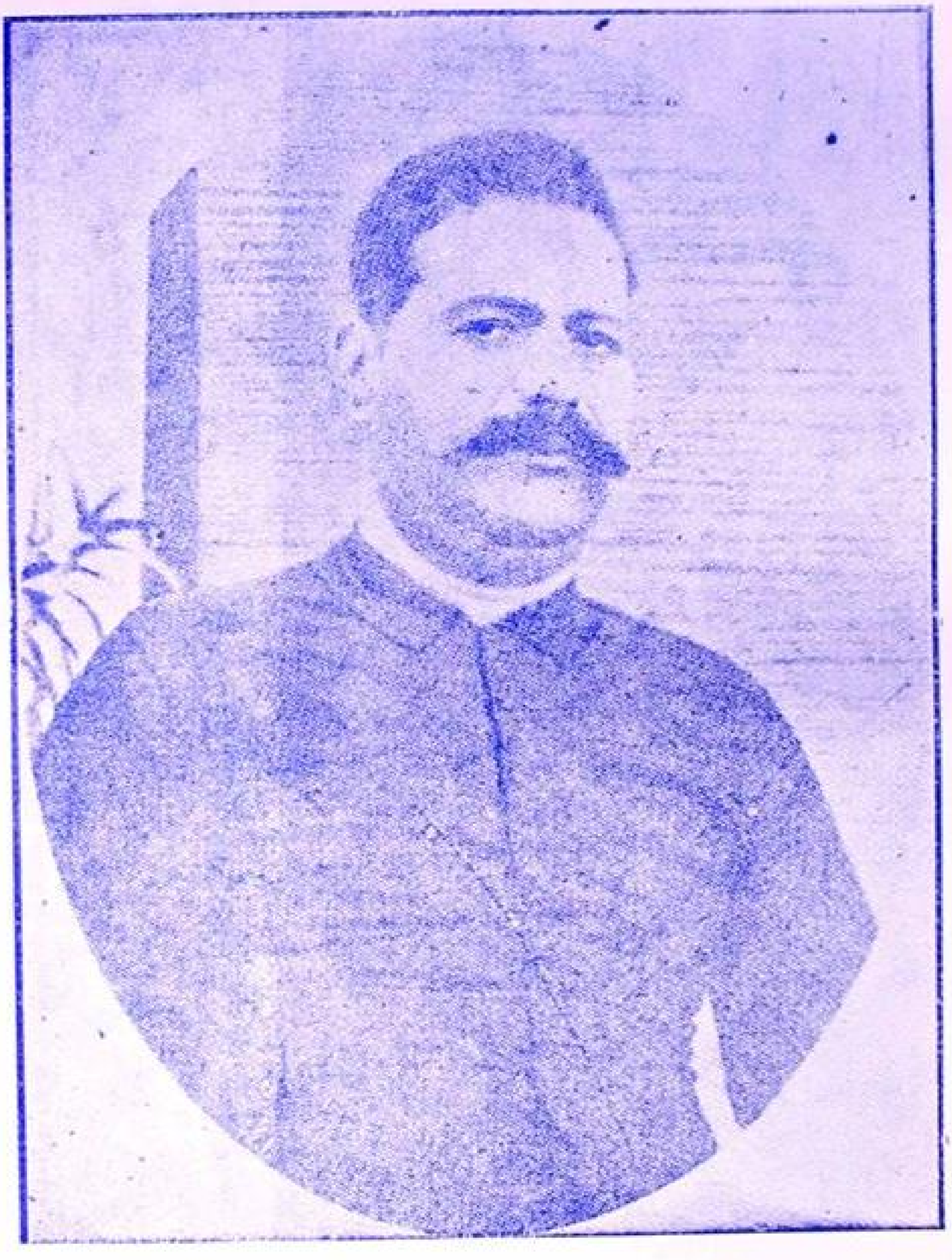

منشی سید سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ

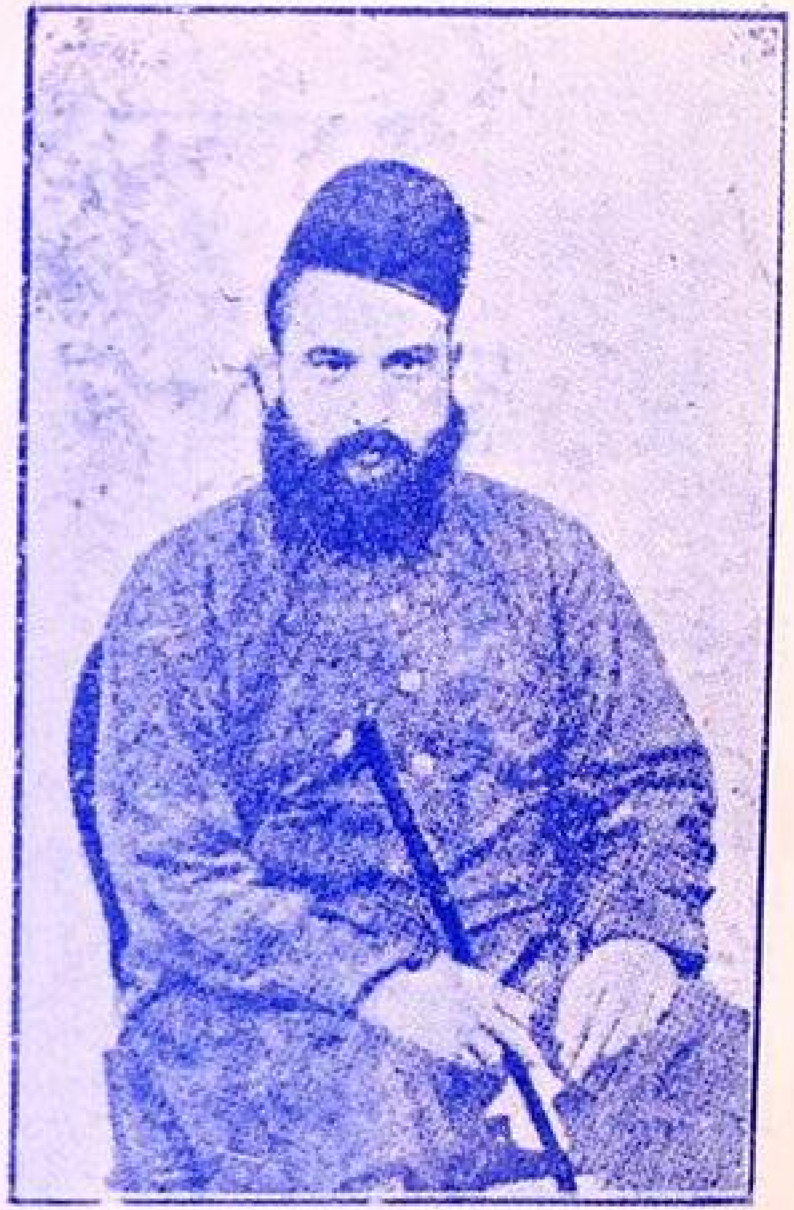

پنڈت تربھون ناتھ ہجر

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف

اخبار کے لیے ایک قابل آدمی کی ضرورت تھی۔ سرشار نے اپنی مشہور و معروف تصنیف فسانۂ آزاد کا سلسلہ اسی اودھ اخبار میں شروع کر دیا جو دسمبر ۱۸۷۹ء تک قائم رہا اور ۱۸۸۰ء میں فسانۂ آزاد بصورت ایک علیحدہ کتاب کے چھپا اور بہت مقبول ہوا۔ اسی عرصہ میں اودھ پنچ اور اودھ اخبار میں وہ مشہور معرکہ شروع ہوا جو عرصہ دراز تک قائم رہا۔ اودھ پنچ، اودھ اخبار اور اُس کے ایڈیٹر کو اپنے ظریفانہ انداز میں سیکڑوں صلواتیں سُناتا تھا۔ اور اس کا جواب بھی ٹکّہ بہ ٹکّہ پاتا تھا۔ آخر بعض دوستوں کی کوشش سے مصالحت ہوگئی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ سرشار دو اور مباحثوں میں بھی شریک ہوئے تھے۔ ایک بیان یزدانی میرٹھی اڈیٹر "طوطی ہند" اور دوسرا خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے ساتھ۔[1]

سرشار کی تصانیف سیر کہسار، جام سرشار، کامنی اور خدائی فوجدار بہت مشہور ہیں۔ آخر الذکر ایک انگریزی ناول ڈان کوئی زوٹ کا ترجمہ ہے۔ ۱۸۹۳ء میں انہوں نے ایک سلسلہ موسوم بہ خُمکدہ سرشار شروع کیا تھا اور اسی زمانے میں ان کے ناول کڑم دُھم، بچھڑی دولہن، طوفان بے تمیزی، پی کہاں اور ہشّو بھی شایع ہوئے مگر ان میں اُن کا زور بیان کم ہے۔ حیدر آباد جانے سے قبل کچھ دنوں وہ الہ آباد ہائیکورٹ میں مترجم بھی ہوگئے تھے۔ مگر قواعد دفتر کی سختی کے متحمل نہ ہو سکے اور تھوڑے ہی دنوں ملازمت ترک کر دی۔ ۱۸۹۵ء میں وہ حیدر آباد گئے۔ اپنے قیام حیدر آباد کا حال ایک خط میں جو "کشمیری درپن" مارچ ۱۸۹۹ء میں شایع ہوا تھا اور جس کا ایک حصہ پنڈت برج نراین چکبست صاحب نے اسی سے نقل کیا ہے۔

---

[1] ہم کو یاد پڑتا ہے کہ یہ مباحثے سرشار سے نہیں بلکہ اودھ پنچ سے ہوئے تھے کیونکہ اودھ پنچ میں ایک سلسلۂ اعتراضات حالی پر ایک عرصہ دراز تک اس سُرخی سے چھپتا رہا ؎

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے　　میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

اور آخر میں کچھ مضامین حالی کی تعریف میں بھی اس سُرخی سے نکلے تھے ؎

عیب حالی کے بہت تم نے گنائے اے پنچ　　اشک شوئی کو دو چار ہنر بھی کہہ دو

اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

"تقریباً چار برس ہوئے کہ میں ممبر کانگریس کی حیثیت سے مدراس آیا تھا۔ میری خوش نصیبی مجھ کو حیدرآباد لائی جہاں ہندو مسلمان امیر غریب سب نے نہایت گرمجوشی سے مجھ کو لیا اور میرے اوپر بڑی عنایتیں کیں۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے اپنے کلام نظم و نثر کی اصلاح کے لیے دو سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ خلعت خوشنودی اور فی شعر جو پسند خاطر ہو جاتا ہے۔ ایک اشرفی عنایت فرماتے ہیں حضور نظام مجھ سے پہلے ہی واقف تھے پہلے دن جب میں حاضر خدمت ہوا تو نذر گزرانی اور اپنی کچھ کتابیں بھی پیشکش کیں۔ اعلیٰ حضرت نے ذرہ نوازی کی۔ کہ ایک ٹکڑا دربار کے بیان کا میرے سیر کہسار سے اور ایک مقام جام سرشار سے سماعت فرمایا۔ میں نے ایک تاریخ شاہزادے کی ولادت کی مبارکباد میں بندگان عالی خدمت میں پیش کی۔ جس کو اعلیٰ حضرت نے بہت پسند فرمایا۔ میرا نام معزز درباریوں کی فہرست میں شامل ہو گیا ہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ منصب بھی ملے۔ اگر خدا نے چاہا تو میرا جدید ناول "گور غریباں" ایک ہفتہ کے عرصہ میں شایع ہو جائے گا۔"

کچھ عرصہ تک سرشار دبدبۂ آصفیہ کی ادارت کرتے رہے۔ ان کا ناول چنچل اسی اخبار میں نکلتا تھا۔ مگر پورا نہیں ہوا۔ "گور غریباں" جس کا ذکر ان کے خط میں ہے شایع نہ ہو سکا اور چنچل کوئی باوقعت تصنیف نہیں ہے۔ آخر عمر میں سرشار نے مے نوشی کی بڑی کثرت کر دی تھی۔ اور یہی ان کی قبل از وقت موت کا باعث ہوئی۔ چنانچہ ان کا انتقال حیدرآباد ہی میں ۱۹۰۲ء میں ہوا۔

سرشار نہایت خوشگو شاعر تھے۔ اسیر کے شاگرد تھے اور خوب کہتے تھے۔ ۱۸۹۲ء میں انھوں نے اپنا ایک قصیدہ کشمیری کانفرنس میں پڑھا اور ایک مثنوی تحفۂ سرشار بھی لکھی ہے جو اس موقع پر کہی گئی تھی جبکہ پنڈت بشن نرائن در کی واپسی انگلستان پر پرانے خیال کے کشمیری پنڈتوں

نواب سید محمد خان بہادر آزاد

منشی جوالا پرشاد برق

میں ایک قسم کی برہمی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اس کی معقول باتوں سے لوگوں کی برہمی سفرِ ولایت کی نسبت ایک حد تک رفع ہو گئی۔

عام عادات و اخلاق سرشار حقیقی معنے میں آزاد مزاج تھے۔ قوت حافظہ بہت قوی پائی تھی اور تعصب اور مذہبیت سے بالکل بری تھے۔ باتیں بہت دل چسپ اور مزے کی کیا کرتے تھے اور طبعاً ظریف واقع ہوئے تھے۔ شراب خواری نے ان کے ساتھ بھی وہی کیا جو درگا سہائے سرور کے ساتھ کیا تھا یعنی ایک ہونہار زندگی کا جلد خاتمہ کر دیا۔ اردو ناول کو انگریزی طرز پر لکھنے کا فخر انہیں کو حاصل ہے اور اس کے ساتھ وہ ایک زبردست جرنلسٹ، ایک مشہور مصنف، اردو کے زبردست زباندان، ظریف اور بذلہ سنج اور ایک طرزِ خاص کے موجد بھی تھے۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی شہرت کو کچھ تو لوگوں کے تعصب نے اور کچھ ان کی ذاتی بے پروائی اور لاابالی پن نے کم کر دیا۔ ان کی فسانہ آزاد اور دیگر تصانیف میں اکثر جگہ پر رطب و یابس اور درجہ سے گری ہوئی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ زیادہ تر ان کے مزاج کی جلد بازی اور بے پروائی کہی جا سکتی ہے۔ ان کی شراب نوشی کبھی ان کے تخیل میں پَر لگا دیتی اور کبھی اس کے خمار سے ان کا دماغ معطل اور بے کار ہو جاتا تھا۔ انہیں وجوہ سے نہ وہ کبھی اپنے مسودہ پر نظرِ ثانی کرتے اور نہ کبھی پروف پڑھنے کے عادی تھے۔ ہمیشہ برجستہ اور قلم برداشتہ لکھتے اور اگر کسی وقت پر قلم نہ ملتا تو تنکے سے کام نکال لیتے تھے۔ اسی بے پروائی اور بے اصولی سے ان کے قائم کیے ہوئے پلاٹ اور ان کے دکھائے ہوئے کیرکٹر، ان کے بیان کیے ہوئے واقعات میں اکثر جگہ حد درجہ بے ربطی اور عدم تسلسل پایا جاتا ہے۔ جب کبھی ان سے کوئی مضمون لکھوانا ہوتا تو مالک مطبع شراب کی ایک بوتل پیش کرتے اور وہ اس مضمون کو فوراً لکھ ڈالتے۔ ...... مگر اس طبعی کمزوری کے ساتھ ان میں خود داری اور آزادہ روی بھی اتنی تھی کہ کبھی کسی امیر و رئیس کی خوشامد نہیں کی اور اپنی شہرت کے واسطے کسی دوسرے کے شرمندۂ احسان نہیں ہوئے۔ خود ان کی قابلیت اور

طباعی اور ذہانت ان کی شہرت کا حقیقی باعث تھی۔ آخر عمر میں البتہ وہ زمانے کے ہاتھ سے تنگ آکر حیدر آباد گئے۔ تاکہ دولت آصفیہ کے زیر سایہ کچھ دنوں بفراغت زندگی بسر کریں۔ مگر بدنصیبی نے پرانی عادتوں کی طرح وہاں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور آخر کار وہیں پیوند خاک اور غالب کے اس قطعہ کے مصداق ہوئے۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

تصانیف ان کی حسب ذیل تصانیف بہت مشہور ہیں:۔

فسانہ آزاد۔ سیر کوہسار۔ جام سرشار۔ کامنی۔ خدائی فوجدار۔ کڑم دھم۔ بچھڑی دولہن۔ ہشو۔ طوفان بے تمیزی۔ رنگے سیار۔ پی کہاں۔ شمس الضحیٰ۔ والیس[1] کی کتاب "رشیا" کا ترجمہ اردو میں۔ لارڈ ڈفرن کی کتاب "لیٹرز فرام ہائی لیٹی ٹوڈس" کا ترجمہ اردو میں۔

فسانۂ آزاد جیسا کہ اوپر بیان ہوا فسانۂ آزاد شروع میں اودھ اخبار کے کالموں میں نکلتا تھا۔ اس کی اشاعت نے دنیائے اردو میں ایک عجیب ہلچل ڈال دی۔ جب یہ اخبار میں نکلتا تھا تو لوگوں کو اتنا اشتیاق ہوتا تھا۔ کہ دوسرے پرچہ کے لیے بیتاب رہتے تھے۔

پنڈت بشن نرائن در آنجہانی اس کتاب کی نسبت یوں رقم طراز ہیں:۔

قصہ کا پلاٹ تو بہت سادہ بلکہ حد درجہ بے مزہ ہے مگر ڈھائی ہزار گنجان صفحے پڑھتے چلے جایئے ذرا بدمزہ نہیں ہو جیے گا۔ بلکہ سطر سطر پر اشتیاق بڑھتا جائے گا۔ محض اس وجہ سے کہ عبارت آرائی غضب کی ہے۔ طرز ادا نہایت بے تکلف اور آسان۔ تازہ اور نیچرل تمثیلی اور واضح۔ پھر اس کے ساتھ جابجا پرلطف ظرافت۔ پھڑکتے ہوئے فقرے۔ مزیدار

---

[1] سر ڈونلڈ مکنزی والیس۔ لارڈ ڈفرن اور مارکوئیس اور لینسڈون کے پرائیویٹ سیکرٹری نہایت قابل اور صاحب تصنیف اور بڑے سیاح تھے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانکا کی دسویں ایڈیشن کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔

شوخیاں، ترکی بہ ترکی جواب، حماقت آمیز مضحک باتیں جن کو پڑھ کر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ آزاد اصل قصہ کا ہیرو ایک دولت مند نوجوان دنیا دار شخص بہت حسین اور طرحدار تعلیم یافتہ کئی زبانوں سے واقف۔ سپاہی پیشہ ظریف شاعر عاشق مزاج لچھے دار باتیں کرنے والا اور ہر اچھی صورت پر مرنے والا۔ ایک طرف اعلیٰ سوسائٹی کی زیب و زینت۔ دوسری طرف ایک بھٹیاری کا عاشق جاں باختہ۔ بیگمات کو بھی للچائی ہوئی نظروں سے گھورنے والا۔ اتفاقاً یہ میاں آزاد ایک حسین دولت مند حسن آرا پر لٹو ہوتے ہیں۔ اُس سے عشق بازیاں کرتے ہیں۔ آخر وہ ان کے ساتھ اس شرط پر عقد کرنے کے لیے راضی ہوتی ہے کہ پہلے وہ ٹرکی جائیں۔ لشکر اسلام میں نام لکھائیں۔ روسیوں سے نبرد آزمائی کریں۔ آزاد اپنی معشوقہ کے احکام کی بجا آوری خوشی خوشی کرتے ہیں۔ اور بقول شخصے بندھا ٹوب مار کھاتا ہے بل بانکتے کودوں پھانکتے ٹرکی جاتے ہیں۔ روسیوں سے لڑتے ہیں اور مظفر و منصور واپس آتے ہیں۔ اپنی جانبازیوں کے بدلے اپنی معشوقہ سے ایفائے وعدہ چاہتے ہیں۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ ہے اصل قصہ کے اور جہاں تک قصہ کے پلاٹ کا تعلق ہے اس سے بدتر اور بے مزہ تر شاید ہی کوئی قصہ انسانی دماغ سے نکلا ہوگا۔ مگر اسی قصہ کو رتن ناتھ در کی زبان سے سُنیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک نگار خانۂ چین میں چلے جا رہے ہیں جس کی دلکش جیتی جاگتی تصویریں الفاظ کا جادو تخیل کی کثرت۔ مناظر کی چونچالی ایسی ہے۔ کہ جب اس آئینہ خانہ سے گزرتے ہیں تو کچھ یقین کچھ شک کرتے ہوئے ایک طلسم کو جو ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زبردست بازیگر نے اپنے کرشمے ڈنڈے سے یہ سارا سماں ہمارے سامنے کھینچ دیا ہے۔

مندرجہ بالا ریویو لفظاً لفظاً صحیح ہے۔ فسانۂ آزاد کو پلاٹ کے تناسب کیرکٹر نگاری کے اسلوب اور قصہ کی تدریجی ترقی اور دلچسپی کے لحاظ سے نہ پڑھنا چاہیے۔ اصل قصہ کو ایک کھونٹی سمجھنا چاہیے جس پر ہزاروں واقعات ٹنگے ہوئے ہیں اور انہیں علیحدہ علیحدہ واقعات کے

پڑھنے میں سارا لطف آتا ہے۔ وہ اُن کا مذاق وظرافت، وہ دل چسپ کیرکٹر وہ شوخیاں اور حاضر جوابیاں یہی سب باتیں کتاب کی جان ہیں۔ فسانۂ آزاد میں مثل ڈوما کے ناولوں کے ساری عمدگی اور دل چسپی اشخاص قصہ کی باتوں میں ہے۔ نہ کہ نفس قصہ کے بیان میں۔ سرشار مکالمہ کے اُستاد ہیں اور کیرکٹر نگاری کی خوبیاں طول طویل بیان سے نہیں بلکہ خود ان اشخاص کی گفتگو سے نہایت کامیابی سے دکھلاتے ہیں۔

سرشار کی مرقع نگاری سرشار مثل مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کے پُرتکلف اور مقفّٰی عبارت نہیں پسند کرتے۔ نہ وہ برائیوں کو چھپاتے اور اچھائیوں کو چمکاتے ہیں بلکہ ہو بہو تصویریں کھینچتے ہیں۔ اور علی الخصوص اشخاص لکھنؤ اعلےٰ وادنےٰ امیر وغریب سب کے بے مثل مرقعے اپنے اس لاجواب کتاب میں کھینچ دیے ہیں۔ ان کے اشخاص قصہ سایہ کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں گزرتے۔ بلکہ وہ ہمارے آپ کی طرح گوشت پوست کے بنے ہوئے چلتے پھرتے جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ پنڈت بشن نراین در اس کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"اگر تم ان کے مجمعوں کے اندر جاؤ۔ غُل غپاڑے والے طوفان بے تمیزی کے مجمعے۔ تو تم کو بڑی احتیاط سے جانا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں کی دھکّا دھکّی سے تم خود نہ گر پڑو اور اس کی احتیاط کرنا ہوگی کہ تمہاری گھڑی یا کوئی اور چیز جو تمہاری جیب میں ہے۔ کہیں نکل جائے۔ یہی حال ان کے مُحرّم، چہلم اور عیش باغ کے میلوں کا ہے کہ تم وہاں اپنے تئیں ایک عجیب بھیڑ میں پاتے ہو جس میں بٹیر باز۔ پتنگ باز۔ افیمی۔ زرق برق نواب مع اپنے ڈیڑھ بچے زرد رو مصاحبوں کے۔ رنڈیاں گاڑیوں میں سوار کسی بُڈھے فیل سوار تماشبین سے آنکھیں لڑا رہی ہیں۔ فقیر گاڑیوں کے پیچھے دوڑتے دعائیں دیتے جا رہے ہیں۔ اور اگر کچھ نہیں ملتا ہے تو چپکے چپکے سیکڑوں صلواتیں سُناتے ہیں۔ فاقہ مست عاشق۔ رنگیلے بے کار

لہ اس نام کے دو ناولسٹ باپ اور بیٹے فرانس میں گذشتہ صدی میں بہت مشہور ومعروف گزرے ہیں ان کے اکثر ناول نہایت دل چسپ ہیں۔ ۱۲

پنڈت رتن ناتھ سرشار

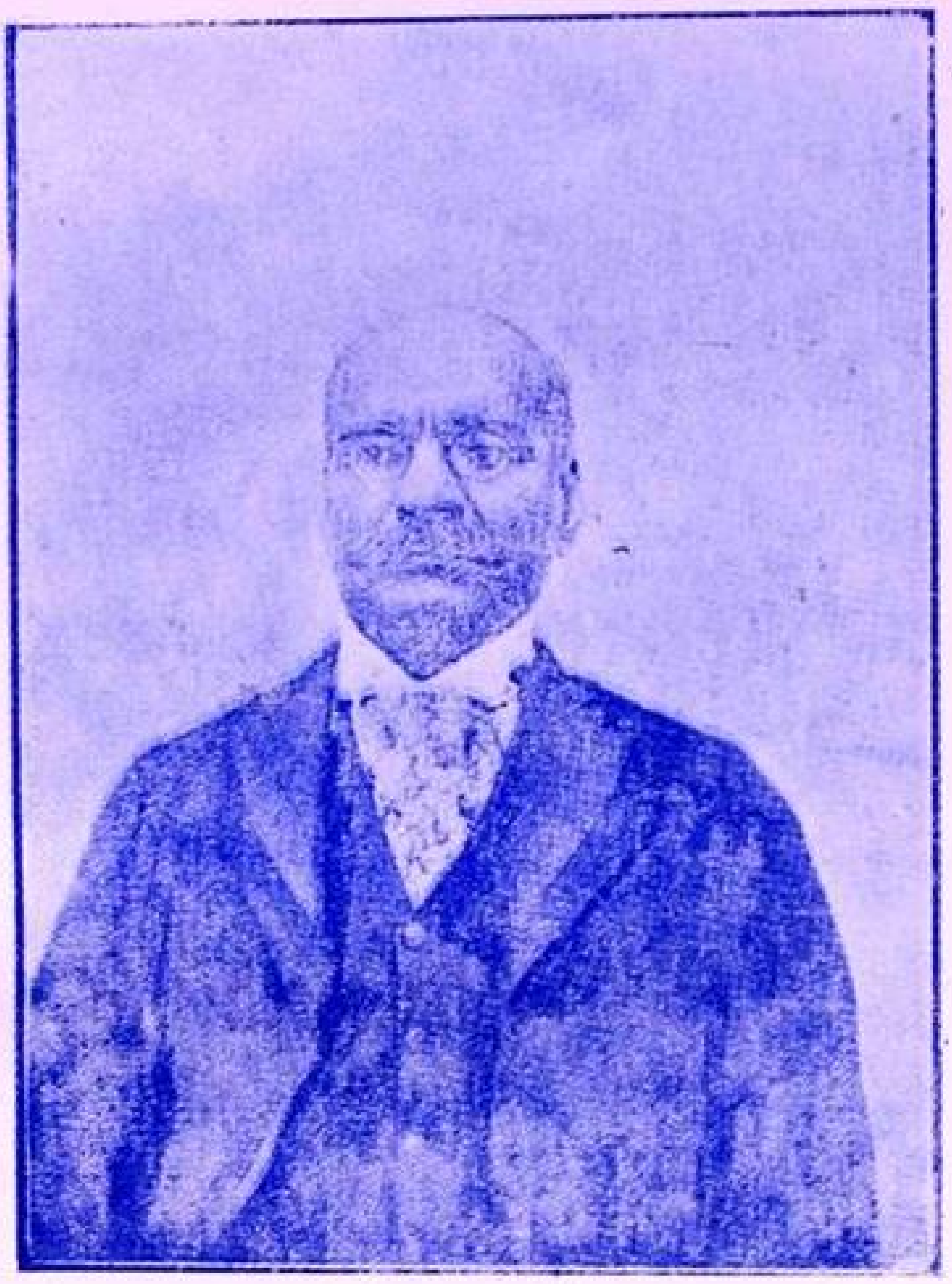

پنڈت بشن نرائن در

عمدہ تنیں خوبصورت بدصورت۔ کوئی اپنے کھوئے ہوئے بچے کو آواز دے رہی ہے کوئی اپنے یار سے لڑ رہی ہے۔ کوئی کسی نواب کے مصاحب خاص سے ناز و انداز کی باتیں کر رہی ہے۔ پولیس کانسٹیبل۔ چور۔ اُچکے۔ چنگی کے محرّر۔ ریلوے بابو۔ ٹھاکر صاحب کسی قریب کے گاؤں سے میلا دیکھنے آئے ہیں۔ لالہ بھائی کسی تنبولی یا تنبولن سے ذرا سی بغت چھانٹ رہے ہیں۔ انگریز نما گریجویٹ سگریٹ منہ میں دبا ہوا۔ نیوفیشن کے مسلمان ٹرکی ٹوپی ڈالے۔ بنگالی بابو مہین نرم دھوتیاں ہوا میں اڑاتے ہوئے۔ یہ ہے وہ مجمع جس کی سرشار تم کو سیر کراتے ہیں جس میں ہزاروں مختلف آوازیں تمہارے کانوں میں آ رہی ہیں اور چاروں طرف زندہ چلتے پھرتے باتیں کرتے غل مچاتے انسانوں کا ایک سمندر موجزن ہے اور پھر ان سب پر طرّہ یہ کہ اس عظیم الشان مجمع میں ہر آدمی کو اس کی بات چیت اور اس کے حرکات و سکنات سے تم بخوبی پہچان سکتے ہو"

فسانۂ آزاد بلکہ سرشار کی اکثر ناولوں کی خاص خصوصیات یہ دو چیزیں ہیں۔ یعنی

(۱) لکھنؤ کی اس زمانے کی سوسائٹی کی ہو بہو تصویریں کھینچنا اور

(۲) شوخی و ظرافت۔ ہمارے نزدیک کسی شاعر یا ناثر نے اس سے قبل لکھنؤ کے آخری دور، تمدن اور سوسائٹی کی صحیح تصویریں اس قدر جزئیات کے ساتھ کبھی نہ کھینچی ہوں گی۔ سرشار پرانے رنگ کے نوابوں ان کے افعال و اشغال کے ان مصاحبوں اور ہم جلیسوں کے سچے نقشے کھینچنے میں کمال رکھتے ہیں اور باوصف اس کے کہ وہ ہندو تھے۔ مگر سخت حیرت[ل] ہے۔ کہ

[ل] یہ کوئی حیرت کا مقام نہیں۔ یہ اس زمانے کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول اور دلی اتحاد کا بیّن ثبوت ہے۔ دوسری مثال اس کی نظیر اکبرآبادی کی ہے جنہوں نے ہندوؤں کے تہوار میلے ٹھیلے یہاں تک کہ ان کے مذہبی معتقدات تک کو کس قدر واقفیت اور تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اب جب کہ دونوں قوموں کے درمیان نفسانیت اور تعصب کی ایک آہنی دیوار قائم ہے تو یہی باتیں تعجب اور حیرت کی معلوم ہوتی ہیں ۱۲۔

مسلمانوں کے بڑے گھرانوں کے اندرونی حالات اور بیگمات کی طرزِ معاشرت اور بول چال سے وہ اس طرح واقف ہیں کہ کوئی مسلمان بھی ان سے بہتر نہیں جان سکتا۔ انہوں نے ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا ہے اور ہم ہندو اور مسلمان حرم سراؤں کے اندرونی حالات نہایت صفائی سے بالکل بے پردہ دیکھتے ہیں۔ ان کو مختلف پیشہ وروں کی خاص خاص اصطلاحیں مختلف جماعتوں کی خاص خاص بولیاں اور ان کا طرزِ ادا، دیہاتی بولی۔ بیگمات اور ان کی مغلانیوں اور پیش خدمتوں کی بات چیت۔ بھٹیارے اور بھٹیاری۔ افیمی۔ چنڈو باز۔ شرابی۔ چور اچکوں کی زبان۔ دیہاتی گوکھے ٹھاکروں اور پڑھے لکھے لالہ بھائیوں کا طرزِ تکلم۔ ان سب پر ان کو کامل عبور حاصل ہے۔

سرشار کی شوخی اور ظرافت ان کا مذاق کامل، مہذّب اور آزادانہ ہے۔ البتہ اس میں غالب کی سی لطافت اور رنگینی نہیں ہوتی اور الفاظ کی رَو میں اور محاکات کے شوق میں کبھی وہ وہ اس قدر بڑھ جاتے ہیں اور ان کا سمندِ طبع اس قدر بے قابو ہو جاتا ہے کہ وہ فحش سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ مگر باوجود اس کے اس خاص چیز یعنی شوخی اور ظرافت میں کوئی ان کے قریب تک نہیں پہنچتا۔ مکالمات لکھنے میں وہ کمال رکھتے ہیں۔ علی الخصوص ادنے طبقہ کی بول چال ان کے ٹکے بندھے فقرے ان کے ضلع جگت کو وہ من وعن ادا کر دیتے ہیں۔ اس رنگ زمانہ کو بے نقاب کرنے کی نسبت پنڈت بشن نرائن در اپنے اسی مضمون میں جس سے بعض مقامات اوپر نقل کیے گئے اس طرح رقمطراز ہیں:۔

"بے ادبی و گستاخی، پرانے رسوم و خیالات کا استیصال، دنیاوی لذتوں سے تمتّع۔ موجودہ چیزوں کی ناپسندیدگی یہی سب خیالات ان کے زمانہ میں لوگوں کے دلوں کو مسخّر کیے ہوئے تھے اور وہ خود بھی یہی خیالات رکھتے تھے۔ پس کوئی شخص ان کی سچائی اور راست بیانی پر اعتراض نہیں کر سکتا جب کہ وہ اپنے کلام کو اس رنگ میں ڈبوتے ہیں اور اس کو طرح طرح کی خوبیوں سے آراستہ بھی کرتے جاتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ آزادانہ تحریک

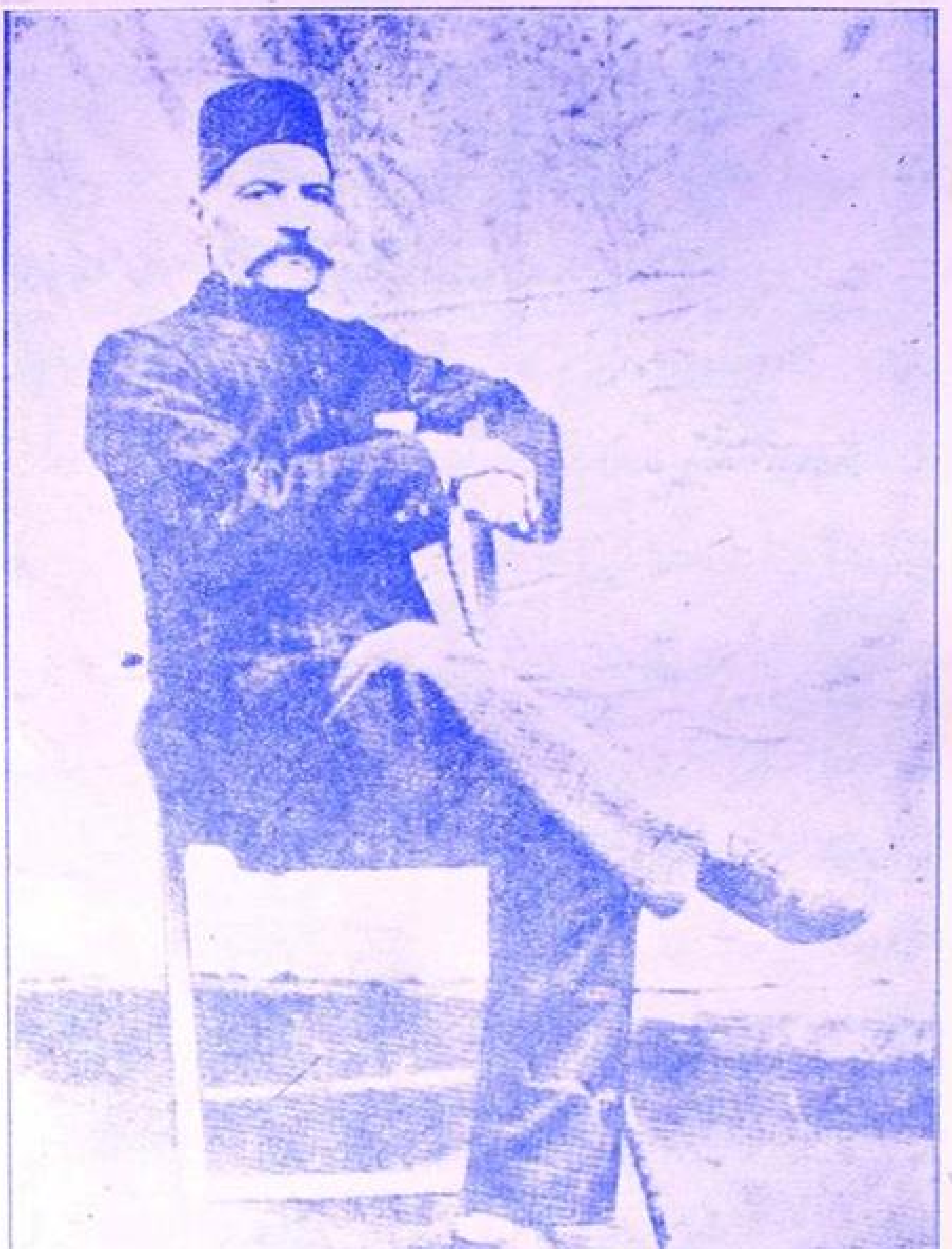

شوق قدوائی

کے بڑے حامی ہیں کہ جو پرانے خیالات اور قدیم رسم و رواج کو توڑنا چاہتی تھی۔ ہر سوسائٹی کے منازل ارتقا میں ایک ایسا درجہ ضرور آتا ہے کہ جب عیوب اور غلطیوں کی اصلاح کے واسطے ظرافت اور استہزا، مثل وعظ و نصیحت کے مفید ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ اور جب بدکاری کی برائی دکھانے کا یہی بہترین طریقہ ہے کہ وہ عریاں کر کے دکھائی جائے۔ بہت سی غلطیاں جو وعظ و نصیحت سے اصلاح نہیں پا سکتیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ ایک مذاقیہ جملہ سے بالکل دہل جاتی ہیں اور ایک طنز آمیز قہقہہ کی گولی عیوب کی تیز پرواز چڑیا کو فوراً گرا دیتی ہے۔ رتن ناتھ سے جب کسی زاہد آموز واعظ یا مولوی سے۔ کسی پرانے خیال کے چھوت چھات ماننے والے سے۔ کسی دولت مند پر گھمنڈ کرنے والے یا حسب و نسب پر فخر کرنے والے سے مڈبھیڑ ہوتی ہے اور ان کی پند و نصیحت کو ان کی ڈینگوں اور شیخی کی باتوں کو سنتے ہیں تو وہ اُن سے بحث و مباحثہ نہیں کرتے نہ کبھی ان سے لڑنا جھگڑنا چاہتے ہیں بلکہ صرف اُن کا مذاق اُڑانے لگتے ہیں۔ اور گو کہ متانت پسند لوگ اُن کی اس ادا کو ناپسند کریں مگر باقی اور لوگ جو اس تماشے کو دیکھتے اور ان کی باتوں کو سنتے ہیں ہنسی کے مارے لوٹ جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسخرہ نے اپنی باتوں سے ان کے دلوں کو موہ لیا اور اس کے بعد وہ لوگ جو مسخرہ کے ساتھ ہنس چکے پھر کسی واعظ کی تعلیم و تلقین پر نہیں رہتے۔ بس رتن ناتھ کی نصیحت کا یہی طریقہ ہے۔ وہ تمسخر کرتے ہیں، ہنستے ہیں اور فتح پاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم ان کو سوسائٹی کی برائیوں کا ایک بہت بڑا مصلح سمجھتے ہیں مگر وہ کسی خاص اصلاحی تحریک سے تعلق نہیں رکھتے انہوں نے کسی پیغمبر یا مصلح قوم کی طبیعت نہیں پائی تھی۔ وہ دل سے مسخرے اور ہنسی میں اڑا دینے والے تھے۔

سرشار کی کیرکٹر نگاری

سرشار کیرکٹر نگاری کے اُستاد ہیں مگر وہ ہوبہو نقشے نہیں کھینچتے بلکہ اصلیت کے ساتھ مبالغے سے بھی کام لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے کیرکٹروں میں ڈکنس اور تھیکرے[۱] دونوں کا مجموعی رنگ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام کیرکٹروں میں جو خاص اور ممیز باتیں ہوتی ہیں اُن کو چن لیتے ہیں اور اُنہیں میں وہ وہ شگوفے پیدا کرتے ہیں جن کو پڑھ کر آدمی ہنستے ہنستے لوٹ جاتا ہے

---

[۱] انگلستان کے گزشتہ صدی کے دو مشہور ناولسٹ گزرے ہیں۔

اُن کے کیرکٹروں کو اس نظر سے نہ دیکھو کہ وہ بالکل نیچر کے مطابق ہیں۔ بس اس کو پڑھو اور ہنسو اور یہی کافی ہے۔

خوجی | خواجہ بدیع الزماں معروف بہ خواجہ بدیعا مخفف خوجی۔ وہ پرانا ۱؎ بے وقوف، مسخرہ، آزاد کا

۱؎ دنیائے افسانہ کے اس عجیب و غریب کیرکٹر کا سرشار نے جو خاکہ اپنے خاص رنگ میں کھینچا ہے حسب ذیل ہے:۔

"گیدیوں کے قبلہ گاہ، پدریوں کے پشت و پناہ، گاودیوں کی جان بلکہ روحِ رواں۔ دیوار حماقت کے پُشت بان، چُھٹے پہلوان میاں خواجہ بدیع الزمان صاحب بدیع (آنجہانی) غریق لجۂ نادانی نہایت حیرانی اور نہایت پریشانی سے دل ہی دل میں ...... ٹھنڈی سانسیں بھرتے شتہ گام جانے لگے اور چونکہ ماشاء اللہ ڈنڈپیل جوان اور کامل فن پہلوان تھے۔ یہ کیفیت ہوئی کہ دس قدم چلے اور تیورانے لگے اللہ ری طاقت اول تو پستہ قامت۔ ماشہ بھر کا قد دوسرے قطع شریف ازبس ناموزوں، اونٹ کی طرح کوئی کل درست نہیں۔ اُس پر طُرّہ یہ کہ مدت کے بعد ایک چوبی قرولی جو کسی اُستاد بخار نے پیر مرد کو بطریق نذر دی تھی۔ زیب دست تھی۔ مثل مشہور ہے۔" اوچھے کے گھر تیتر۔ باہر رہے نہ بھیتر" کبھی داہنے ہاتھ میں لی۔ بازار والوں کی طرف دیکھ کر چمکائی، کبھی بائیں ہاتھ میں لی اور اکڑ کر چلنے لگے۔ اب زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے۔ دماغ فلک الافلاک پر ہے۔ اللہ ری نخوت۔ اور کیوں نہ ہو خدا نے حُسن دیا تو گلو سوز نور عطا کیا تو عالم افروز۔ ایک تو گراں ڈیل جوان دوسرے فن سپہ گری میں طاق۔ کشتی کے پہلوان۔ بانک، پٹے، بانے۔ بنوٹ میں مشاق۔ اور خانہ جنگی میں شہرۂ آفاق اور سب صفتوں سے بڑھ کر یہ صفت جناب باری نے عطا کی تھی کہ میدان جنگ میں بھاگتوں کے مقدمۃ الجیش۔ سپہ سالار نامدار بنتے تھے۔ کوئی اور بھاگے یا نہ بھاگے، یہ سب کے پہلے میدان چھوڑنے کی فکر کرتے تھے۔ اللہ ری بہادری۔ بازار میں اس عجیب الخلقت پر جس کی نظر پڑتی بے اختیار ہنس دیتا تھا کہ واہ ماشاء اللہ کیا قطع ہے اور اس بونے پن پر اکڑنا اور تن تن کر چلنا اور اینڈنا اور شتہ گام جانا اور مصنوعی قرولی سے بھیڑ کو ہٹانا اور بھی لطف دیتا تھا۔ فقرہ باز آپ جانیے زمانہ بھر کے بے فکرے اُن کو شگوفہ ہاتھ آیا جس گلی کوچے کی طرف سے نکل جاتے تھے لوگ اُنگلیاں اُٹھاتے تھے اور پھبتیوں کے چھرے چلتے جاتے تھے۔

(۱) ذری سنبھلے ہوئے حضرت دیکھیے کہیں ٹھوکر نہ لگے۔

(۲) آدمی کیا پگیو کا ٹانگن ہے۔ کیا کھٹ پٹ جا رہا ہے۔

(باقی بر صفحہ ۱۴۷)

ہمزاد ذیابار غار۔ کمزوروں کو دبانے والا، رنگیلا، عیاش۔ نہ بیٹیا۔ بد معاش، جسمانی اور دماغی کمزوریوں کا پوٹ، ہوتا جو اپنے تئیں ہرگز بونا نہیں سمجھتا بلکہ بونا کہنے سے سخت برا مانتا ہے اپنے گزشتہ کارناموں پر جو سراسر لغو اور جھوٹ ہیں۔ ڈینگیں مارنے والا، جہاں جائے لوگ اس پر آوازے کسیں اور پھبتیاں اڑائیں، ہمیشہ اس خیال میں کہ دنیا جان بوجھ کر اس کی بڑائیوں اور خوبیوں پر خاک ڈالتی ہے۔ اس کا مسخرا پن، اس کی دل لگیاں، اس کی آزاد کے ساتھ محبت و وفاداری، اس کا اپنی چھوٹی سی تلوار لے کر پینترے بدلنا، اس کا بات بات پر قسم کھانا اس کی اپنی بزدلی چھپانے کی ترکیبیں، انہیں سب باتوں سے وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کیے ہوئے ہے اس کے اکثر فقرے اور جملے اردو میں ضرب المثل ہو گئے ہیں[1]۔ اس عجیب و غریب کیرکٹر کی آفرینش سے سرشار ہمیشہ یاد رہیں گے۔ تمام ادب اردو اس کا مدِ مقابل اب تک پیدا نہیں کر سکا۔ وہ ادب ظریفانہ کی سب سے زیادہ اوریجنل اور سب سے زیادہ عجیب مخلوق ہے۔

سرشار نے اپنے ناولوں سے ان بیہودہ چیزوں کو خارج کر دیا

ایک خاص صفت ان کی تصانیف کی یہ ہے کہ انہوں نے غیر فطری جزو کو اپنے ناولوں سے خارج کر کے انسانی زندگی کے معمولی معمولی واقعات میں ایک غیر معمولی دل چسپی پیدا کر دی۔ مولوی نذیر احمد کا بھی یہی خصیصہ ہے مگر ان میں اور سرشار میں یہ فرق ہے کہ ان کے قصے صرف اخلاقی اور نصیحت آموز ہیں جن کی غرض صرف یہی معلوم ہوتی

(بقیہ صفحہ ۱۴۶) (۳) ہم کو تو چنڈول معلوم ہوتا ہے۔ (قہقہہ لگا کر)

(۴) کلجگ کے باون اوتار کے . . . . ذریات میں سے ہے۔

(۵) اکڑتے تو بہت جاتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چپت دے۔ قر دلی دردلی چھین لے۔

(۶) ہاتھ پاؤں ماشاء اللہ کتنے سڈول ہیں۔

(۷) ارے میاں جھمن ذری ادھر تو دیکھو یہ بھیڑیے کے بھٹ سے نکالے گئے ہیں۔ سنا ابھی تک آدمی کی بولی نہیں بول سکتے۔ ۱۲

[1] خوجی کے جملے ضرب المثل نہیں ہوئے بلکہ وہ خود ضلع جگت کی طرح مثلیں بھی بولنے کا بہت شائق ہے ۱۲

ہے کہ ان کو عورتیں پڑھیں اور ان سے فائدہ اُٹھائیں اور اسی وجہ سے ان میں دلچسپی اور حیرت انگیزی کم ہے۔ ہماری رائے میں سرشار سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے زندگی کے معمولی معمولی واقعات کو قصّے کے پیرایہ میں دل بہلانے کی غرض سے لکھا جو زمانہ حال کی ناولوں کی اصلی اور صحیح غرض ہے۔

نقایص کلام سرشار کے قصوں میں مندرجہ ذیل نقایص بتائے جاتے ہیں۔

(۱) پلاٹ مربوط اور منتظم نہیں ہوتے۔ فسانۂ آزاد ایک باقاعدہ پلاٹ کا قصہ نہیں لہٰذا مصنف جب واقعات میں ایک ترتیب و نظام قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ناکام رہتے ہیں، وہ تمام متفرق واقعات کو کبھی یکجا نہ کرسکے اور اُن سے کبھی باقاعدہ اور مرتب پلاٹ نہ تیار کرسکے۔ یہی کمزوری ان کے دوسرے ناولوں میں بھی نمایاں ہے۔ ان کی وجہ بظاہر ان کی بے پروائی اور بے قاعدگی معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ کوئی چیز مستقل باقاعدہ طور پر نہیں کرسکتے تھے۔ وہ ایک سچے آرٹسٹ کی طرح محنت اور شوق کے ساتھ کام کرنے سے گھبراتے تھے۔ اور اخبار کی ایڈیٹری یا اس کے واسطے قصّے تیار کرنا اُن کو ایک بارگراں معلوم ہوتا تھا۔ افسوس ہے کہ ایسے طباع اور ذہین آدمی نے بوجہ اپنے وارفتگی مزاج اور پابندی قواعد سے گھبرانے کے اپنی خلقی طباعی و ذہانت سے پوری طرح کام نہیں کیا اور اس کی قدر نہیں کی۔

(۲) یہی سبب ان کے واقعات میں عدم تسلسل اور ابواب میں بے ربطی کا بھی ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے ان کے کیرکٹروں میں ہمواری اور یک رنگی نہیں ہے جو قصّے کے سلسلے میں سیکڑوں رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ وقتی ضروریات کو مدِّنظر رکھتے ہیں اور کیرکٹروں کے خصائص کے دماغ میں قائم نہیں رہتے۔ اسی وجہ سے وہ ان کو نباہ نہیں سکتے فطری بے صبری اور جلد بازی کی وجہ سے ان کا قلم سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑنے لگتا ہے۔ وہ لکھتے رہتے ہیں خواہ طبیعت حاضر ہو یا نہ ہو جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی فکر میں قوت پرواز نہیں رہتی تو وہ زمین پر گھسلنے لگتے ہیں۔

(۳) اُن میں فلسفیت اور اخلاق آموزی کی کمی ہے۔ اسی وجہ سے فسانۂ آزاد کی آخری جلد اور ہُشّو کے بھی آخری ابواب جن میں تعلیم نسواں، تہیا سوفی، اور ترکِ مے نوشی وغیرہ کے متعلق وعظ نما تقریریں ہیں نہایت بے مزہ اور بے اثر ہیں۔ جب وہ اس کوچے میں قدم رکھتے ہیں تو پھر وہ سرشار نہیں رہتے۔

(۴) ان میں جذبات کی بھی کمی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی تصانیف میں تصاویرِ درد و غم کا پتہ نہیں۔ ان کی جذبات نگاری جہاں کہیں ہوتی ہے مصنوعی معلوم ہوتی ہے اور اِدھر اُدھر کے اقوال و اشعار سے اس کمی کو وہ پورا کرنا چاہتے ہیں۔

(۵) بعض جگہ اخلاق سے گری ہوئی اور غیر مُہذّب باتوں کا بھی ان پر الزام لگایا جاتا ہے۔ اور فی الحقیقت انہوں نے بعض جگہ غیر مُہذّب اور سوقیانہ الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے ہمارے اخلاقی احساسات کو ضرور صدمہ پہنچتا ہے۔ مگر اس کے جواب میں ان کی طرف سے دو عذر پیش ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اس زمانہ کا جس میں وہ تھے رنگ ہی یہ تھا۔ دوسرے یہ کہ کسی عیب کی خرابی صرف اسی وقت بخوبی ظاہر ہو سکتی ہے جب کہ اس کو عُریاں کر کے دکھایا جائے ورنہ لوگ اس کی اصلی حقیقت سے متاثر نہ ہوں گے۔

(۶) ان کے قصوں میں کیرکٹروں یعنی اشخاص قصّہ کی اتنی کثرت ہے کہ ان کے کھینچے ہوئے مرقعے اکثر کچھ پیچ ہو گئے ہیں اور واقعات کی بھی اتنی کثرت ہے کہ تناسب قائم نہیں رہتا اور پڑھنے والے کی طبیعت میں وفورِ واقعات سے پریشانی پیدا ہو جاتی ہے مگر سچ پوچھیے تو یہ سب اعتراضات اگر صحیح بھی مان لیے جائیں تو اس عظیم الشان خدمت کے مقابلے میں ہیچ ہیں جو انہوں نے اپنی تصانیف سے ادب اُردو اور سوسائٹی کی انجام دی۔ اور ان کے جزوی نقائص سے ہم کو اغماض کرنا لازم ہے۔

سرشار بحیثیت ایک صاحب طرز کے

سرشار کا بحیثیت ایک ماہر زبان اور ایک صاحب طرز کے بہت بڑا مرتبہ ہے صاف۔ سلیس۔ بامحاورہ اور زور دار عبارت لکھنے میں ان کو اپنے

ہمعصروں پر فوقیت حاصل ہے اور بہ حیثیت ایک صاحب طرز کے گو وہ آزاد سے دوسرے نمبر پر ہوں مگر اور سب سے وہ ضرور بڑھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک ایسا طرز اختیار کیا تھا جو افسانہ نویسی کے واسطے نہایت موزوں تھا اور ان کی تصانیف میں لوگ نفس قصہ سے زیادہ عبارت سے دلچسپی لیتے ہیں۔ ہر چند کہ بعض آدمیوں نے اُن کی زبان اور محاورات پر بھی اعتراض کیے مگر اس قسم کے اکثر اعتراضات غیر منصفانہ اور حسد و تعصب پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ زبان میں وہ ضرور بے روک ٹوک ہیں اور کبھی ضرورت سے زیادہ صرف محاورات و اصطلاحات کرتے ہیں مگر اس کی وجہ وفور خیالات اور قدرت زبان کہی جاسکتی ہے۔

سرشار اور سرور کا مقابلہ مرزا رجب علی بیگ سرور کے یہاں تکلّف اور آورد بہت ہے اور سرشار کی عبارت واضح بے تکلّف اور نیچرل ہوتی ہے۔ سرور چیزوں کا بیان کرتے ہیں اور سرشار آدمیوں کا۔ سرور آئیڈیل (خیالی) تصویریں کھینچتے ہیں اور تصویروں کے محاسن کو اُبھارتے اور معایب کو چھپاتے ہیں۔ برخلاف اس کے سرشار کی تصویریں بالکل سچّی اور ہُو بہُو ہوتی ہیں اور اچھائیاں اور برائیاں سب وہ بے تکلّف ظاہر کر دیتے ہیں۔ سرور کے یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک باغ میں کھڑے ہوئے ہیں۔ اس کے بیچوں بیچ میں ایک خوبصورت نہر جاری ہے جس میں صاف موتی سا پانی بہتا ہے اور اس کے کناروں پر گلاب اور ترشاوے کے پھول مہک رہے ہیں۔ سرشار ہم کو ایک عظیم الشان دریا کے پاس کھڑا کر دیتے ہیں جس میں ہوا کے زور سے لہریں اُٹھ رہی ہیں اور دریا کے آس پاس جنگل سے سنّاٹے کی آوازیں آرہی ہیں۔ کبھی کبھی دریا کے صاف پانی پر کوئی خس اور خراب چیز بھی بہتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ سرور کے مُرقعے اس وجہ سے دلچسپ اور حسین ہیں کہ وہ ان چیزوں سے جن کو وہ بیان کرتے تھے خود بڑی محبت رکھتے تھے۔ اور ان میں کوئی عیب نہیں دیکھتے تھے۔ سرشار برخلاف اس کے جس سوسائٹی کا خاکہ کھینچتے ہیں اُس کو پسند نہیں کرتے بلکہ اکثر موقعوں پر تو اس سے نفرت ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس نفرت و ناراضی کو وہ کہیں چھپاتے نہیں۔ بس کہا جاسکتا ہے کہ سرور قدامت پسند ہیں اور زمانہ قدیم سے

تعلق رکھتے ہیں اور سرشار اس نئی تحریک کے حامی ہیں کہ جو فنون لطیفہ کو تکلف اور قدامت پسندی کے پنجے سے چھڑا کر آزاد کرنا اور اس کو نیچر کا تتبع دیکھنا چاہتی ہے اور اسی وجہ سے وہ زمانہ حال اور مستقبل دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس مضمون کے اختتام پر ہم منشی سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کی عبارت کے نمونے پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو دونوں کے رنگ طبیعت سے آگاہی حاصل ہو۔ منشی سجاد حسین کے مشہور ناول حاجی بغلول سے وہ مقام لیا جاتا ہے، جہاں "حاجی صاحب" اپنی معشوقہ کنڈے والی کو یاد کر کے اس کے تصور سے اپنے دل ہی دل میں باتیں کر رہے ہیں۔ اور فسانۂ آزاد جلد چہارم سے اسی کے قریب قریب وہ مضمون نقل کیا جاتا ہے جس میں تو جی بمبئی پہنچنے سے کچھ پہلے جہاز پہ اپنی معشوقہ شتاب جان درزن سے ملنے کے خیال میں بے چین ہو رہے ہیں اور اسی کے متعلق آزاد سے باتیں ہو رہی ہیں۔

(**ماخوذ از حاجی بغلول**) ناظرین! ذرا چلیے اس وقت تنہائی میں حاجی صاحب پڑے کراہ رہے ہیں۔ کان لگا کر سنیے تو کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر دیکھیے، دور ہی رہیے۔ نزدیک گئے۔ اور سارا کھیل بگڑ گیا۔ آپ کہہ رہے ہیں۔

اے نیک بخت! افسوس تجھ کو خبر نہیں کہ کوئی حاجی جان دیتا ہے۔ یوں دم توڑتا ہے۔ آپ تو کھیتی باڑی میں جی بہلاتی ہو گی یا گھر کے چکی چولھے میں پڑی ہو گی (رائے تو یہ مصرف ہو گی) یا اپلیاں پیاری پیاری پتاتی ہو گی۔ مگر یہاں سوکھ کر عشق کی دھوپ میں ہم کنڈا ہوئے جاتے ہیں۔ تم کو کیا نام کہ جاننا چاہیے ہم بنو اکنڈے جس کی آنچ ایسی تیز ہوتی ہے کہ پتیال جنتر میں عرق اور تیل اسی سے نکل سکتا ہے۔ کیمیا کے نسخے اسی سے تیار ہوتے ہیں۔ ہائے افسوس۔ کیا نام کہ حضور کی محبت میں کیسے کیسے مخمصے اٹھائے۔ لوگوں کا ارہر کے کھیت میں لے جانا گھوڑی پر سے گرنا۔ عمل خوانی میں کڑی سہنا یہ سب واقعات ہیں جن کا ناول میں ذکر ہے، مگر حاجی عاشق صادق ہے جو تسلیم و رضا کی سپر لگائے سب چوٹیں کھاتا ہے۔ ورنہ کیا نام کہ مجال تھی کسی کی انگلی

تو دکھائے مارے جریبوں کے سُتھراؤ کر دیا ہوتا۔ مگر نہیں عاشقی کے ضابطہ کے خلاف یہ بات تھی۔ جس گاؤں کو تم اپنے جلوہ سے رشک ارم بناؤ۔ وہاں کا گدھا اور سُور بُراق اور دُنبہ ہے۔ اور آدمی تو ہماری آنکھ میں حور اور غلمان ہیں۔ دم بھر کو کوئی سُسرال جاتا ہے چوتھی کھیلی جاتی ہے۔ بھلا ہے کوئی مرد آج اس میدان میں جو عشق بازی میں آپ کے حاجی کا مقابلہ کر سکے۔ ہائے میں آج کو کوّا ہوتا اور جہاں تم ہوتیں وہاں بیٹھ کے تاؤں تاؤں کی صدا سُناتا۔ تم ہنکا نے اُٹھتیں اور ہم تمہارے سر پہ آ بیٹھتے۔ ہائے تمنّا ہے کہ ہم تمہارے گائے بھینس ہوتے اور کیا نام کہ تم ہمارے گلے میں رسّی باندھ کر چرانے لے جاتیں۔ پٹھوں پر تمہارے نازک ہاتھ پھرتے تم دودھ دوہتی ہوتیں اور ہم تم کو چاٹتے ہوتے کیا نام کہ اگر کہو تو بمبئی چلیں اب تو ہم آپ کے عاشقوں میں ہو گئے۔ آج تک کبھی یہ چوٹ نہیں اُٹھائی مگر قسمت کا لکھا ہوا اب تو ہم دنیا میں تمہارے عاشق مشہور ہو گئے۔ سب پر بھید کھُل گیا ؎

مرے دل کے مونڈھے پہ بیٹھو صنم تم تنِ زار گھٹ کر بھٹیرا ہوا ہے

آہ یہ کمر کا درد۔ تمہارے عشق کی چوٹ ہے۔ جو سارے جسم و جان میں پھیلی ہوئی ہے۔ افسوس ؎

سوختیم و سوزشِ ما بر کسی ظاہر نہ شد
چوں چراغاں در شبِ مہتاب بے جا سوختیم

ہائے سینے میں الاؤ لگا ہوا ہے۔ بھُس کی آگ کی طرح اندر ہی اندر سُلگ رہا ہے۔

(ماخوذ از فسانہ آزاد جلد ۳) اتنے میں ملّاحوں نے کہا اب بمبئی سامنے سے نظر آتی ہے سُنتے ہی خوجی کی باچھیں کھِل گئیں۔ چلّا کر کہا۔ یارو ذرا دیکھنا۔ بی شتاب جان صاحب کی فنس تو نہیں آئی ہے۔ کریم بخش نام مہری ساتھ ہو گی۔ اطلس کا چھٹکا ہے اور کہاروں کی پگڑیاں وردیاں رنگی ہوئی ہیں۔ مچھلیاں ضرور لٹک رہی ہوں گی۔ بی شتاب جان ہوت۔ اے شتاب جان صاحب۔ آزاد پاشا آواز آئی۔ ارے یار آواز آئی ہو تو خدا کا واسطہ بتا دو۔ بی شتاب جان

اے کرم بخش بہری! مہری کیا بہری ہے۔

لوگوں نے سمجھایا کہ صاحب ابھی بندرگاہ تو آنے دیجئے۔ بی شتاب جان! اور کرم بخش یہاں سے کیونکر سُن لیں گی۔ کہا اجی ہٹو بھی تم کیا جانو، کبھی کسی پہ دل آیا ہو تو سمجھو۔ ارے نادان! عشق کے کان دو دو کوس تک کی خبر لاتے ہیں۔ اور کون کوس کڑی منزل کے کوس، کیا شتاب جان نے آواز نہ سُنی ہو گی۔ واہ بھلا کوئی بات ہے۔ مگر جواب کیوں نہ دیا۔ یہ پوچھو اس میں ایک لم ہے پوچھو وہ کیا وہ یہ کہ ع

معشوق پن نہیں اگر اتنی کجی نہ ہو

اگر آواز کے ساتھ ہی آواز کا جواب دیں تو بندے کی نظروں سے گر جائیں، مزا جب ہے کہ ہم بوکھلائے ہوئے اِدھر اُدھر ڈھونڈتے اور آوازیں دیتے ہوں کہ بی شتاب جان صاحب! اجی بی صاحب! اور وہ بے خبری میں پیچھے سے ایک دھول جمائیں اور ٹنک کر کہیں ٹڈی کا ناتا، آنکھوں کا اندھا نام نین سکھ غل مچاتا پھرتا ہے۔ شتاب جان! شتاب جان! اے بی صاحب تیری بی کو کیا کہوں۔ موئی کہیں چرخہ کات رہی ہو گی۔ اور ہم دھول کھا کر کہیں کہ دیکھیے سرکار! اب کی دھول لگائی تو خیر، جواب دھول لگائی نہ تو بگڑ جائے گی۔ بس کہہ دیا ہے اور وہ جھلا کر ایک اور جمائیں کہ ایں جانب کی ٹوپی گھوڑے پر جا کر گرے۔ اور ساتھ ہی اس گھٹی ہوئی کھوپڑی پر تڑا تڑ دو چار اور جما دیں۔ تب ہنس کر کہوں۔ جانِ من خدا گواہ ہے اس وقت پیٹ بھرا ہے۔ ورنہ مارے بھوک کے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ ہنزار پردیس میں ایسی چاند تارہ سا پارہ کہاں ملتی جو بے دھڑک دھول پہ دھول جماتی۔ اور ابھی کیا ہے پیاری، ذرا تہ دل ہو کر بیٹھیں تو پھر دو ایک جوتے ضرور لگانا۔ ہاں بے پاپوش کاری کے طبیعت بے چین رہتی ہے۔

آزاد: بالفعل کہیے تو خاکسار ہی لگا دے۔

خوجی: (مسکرا کر) ہائے نہیں حضرت آپ کو تکلیف ہو گی۔

آزاد: واللہ کس مردود کو اپنے حساب تکلیف ہو۔ ڈو بوتوں میں آپ اس درجے کو پہنچ جائیں کہ پھر عمر بھر آرام سے سوئیے ع نے غم دزد نے غم کالا۔ یا کہیے نقط سنگھاہی دوں گو تکلیف ہو کچھ پرواہ نہیں۔ اس کا کہاں تک خیال کروں گا۔

خوجی: میاں پہلے منہ دھو آؤ۔ دل لگی نہیں ہے۔ ان کھوپڑیوں کے سہلانے کے لیے پریوں کے ہاتھ چاہئیں نہ کہ تم ایسے دیو زادوں کے۔

آزاد: خدا کرے جس وقت آپ پر پاپوش کاری کریں اُس وقت ہم بھی ہوں۔ کہتا جاؤں کہ ہماری خاطر سے ایک اور پھر پڑے۔ اب کی رنجک چاٹ گئی۔ اب کے خوب چٹاخے سے آواز آئی۔ ہاں ذرا ایک اور، اور ذرا دور تک آواز جائے ؎

ناصح کے سر پہ ایک جمائی چٹاخ سے

پھر ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

اتنے میں ساحل بحر نظر آیا۔ تو خواجہ صاحب نے غل مچایا۔ شتاب جان صاحب اجی حضور کا غلام فرزندانہ آداب عرض۔ اس قدر کہہ چکے تھے کہ لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ اور خوجی متحیّر ہوئے کہ یہ کیا اسرار ہے۔ آزاد سے پوچھا اس خندہ بے محل کا کیا سبب۔ آزاد بولے، آپ کی حماقت اس کا سبب ہے۔ کیا فقرہ کہا تھا آپ نے ذرا پھر فرمائیے گا۔ خواجہ صاحب نے طیش کھا کر پھر وہی فقرہ سُنایا۔ اجی حضور! غلام فرزندانہ آداب عرض کرتا ہے۔

آزاد: تو آپ شتاب جان کے صاحبزادہ فرزند دلبند ہیں۔

خوجی: یہ کلام ہے سے۔ صاحبزادہ ہیں یا میاں ہیں شوہر خاص۔

آزاد: پھر یہ فرزندانہ آداب کیسا ہوتا ہے۔ جو رو کو کوئی فرزندانہ آداب عرض کرتا ہے۔ تو آپ کی بیوی کیا آپ کی والدہ شریفہ ٹھہریں؟

خوجی: (گالوں پر تھپیڑ مار کر) اررررر! غضب ہو گیا، بُرا ہوا، واللہ ستم ہو گیا۔ سخت مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ ایسے خفیف ہوئے کہ توبہ ہی بھلی۔ اے ہے خفت سی خفت ہے

مگر چھڑے کی زبان پھسل گئی لیکن تشفی یہ ہے کہ بدحواسی کے وقت ایسا کلمہ زبان سے نکلا اور وہ بھی اپنی پیاری تتاب جان کی نسبت ۔ جی ۔ پھر دریں چہ مضائقہ باشد۔ اب تو صاف صاف قلس نظر آتی ہے ۔ وہ دیکھیے ہوا سے زُلف درہم و برہم ہوئی جاتی ہے ؎

سمجھ کر چھیڑا و مشاطہ اُس کی زلف پُرخم کو
خدا کے واسطے برہم نہ کر اسباب عالم کو

وہ مہری سامنے ڈٹی کھڑی ہے ۔ اُخاہ اب تو بی کرم بخش بھی باٹرھ پر ہیں ۔ سرو قامت رشک شمشاد ۔ اس حور کردار کی مہری بھی پری زاد ہے ۔ وہ ہنسی اُہو ہو ہو ۔ دُرِ دندان نے مار ڈالا کیا پیارے دانت ہیں ؎

چمک لعلِ بدخشاں کی مٹا دے
ترے ہونٹوں پہ ایسا رنگ پاں ہے

یاران مژدہ باد کہ عروس مانوس من دنگار گلعذار من وصبیہ من بی تتاب جان دام امت حُسنہ از جھروکہ وزرنگار مرامی بیند ومی گوید ؎

یار نام خدا ہے کشتی میں ناخدا آج پار بیڑا ہے !

آزاد : یار عمر بھر میں برجستہ شعر آج ہی سُنا حسب حال ۔

خوجی : درست اور وہ شعر جو کانسل کے نام ہم نے لکھا تھا ۔

اے قبائے بادشاہی راست بربالائے تو
(مصرع ثانی حذف شد) والائے تو

آزاد : مگر ایک غضب پھر کھایا ۔ پہلے تتاب جان کو اپنی مادر مہربان بنایا ۔ اب کے ایک ایسا کلمہ کہا کہ پھر جھیپ جاؤ گے زبان سے کہا ہی نہیں ۔

خوجی : کیا طاقت ہم نے کہا کیا تھا ۔ یہی کہا تھا نہ ۔ کہ عروس من نگار من وصَبِیّہ من بی تتاب جان

پھر کیا عروس نہیں یا صبیہ نہیں ہے۔

آزاد: اے لعنت خدا۔ ارے کم بخت۔ عربی میں صبیہ لڑکی کو کہتے ہیں۔ بے اب سرپیٹو۔ کبھی ماں بناتا ہے کبھی لڑکی۔ اور پھر اوپر سے غرّاتا ہے۔

خوجی: (سر پیٹ کر) زبان تراش ڈالنے کے قابل ہے۔ لیکن خیر گزشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط۔

آزاد: یار وہ دیکھو، سامنے کیا نور کا بُکّا نظر آیا۔

خوجی: یہی ہماری شتاب جان ہے۔ کیا صورت ہے ؎

چہرۂ گلگوں ہے گلشن۔ قامتِ موزوں ہے سرو
گوشِ نازک ہیں گُلِ ترہ غنچۂ گُل ناک ہے
جلوہ گر خالِ سیہ ہے روئے آتش ناک پر
چشمۂ خورشید میں زنگی مگر تیراک ہے

مولوی عبدالحلیم شرر ایک دوسری زبردست ہستی جس نے اُردو ناول کی اشاعت و ترقی میں بڑی اعانت کی، مولوی عبدالحلیم شرر ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اُردو میں تاریخی ناول لکھے۔ قصّہ کے پلاٹ اور کیرکٹروں کی ترقی پر توجہ کی اور نیز اپنے طرزِ تحریر سے ثابت کر دیا کہ صاف بے وارنش کی ہوئی زبان ہی ناول نویسی کے واسطے نہایت موزوں ہے۔ انہوں نے ناول کو غیر مہذّب اور سخیف الفاظ و مضامین سے پاک کیا اور اپنی وسیع معلومات سے وہ مواد فراہم کیا جو ان کی تصانیف کے کام آیا۔ وہ صرف ناولسٹ ہی نہ تھے، بلکہ مؤرّخ، ڈراما نگار، ادیب، اور ایک زبردست جرنلسٹ بھی تھے۔

[یہاں سے صفحہ ۱۶۶ تک خود مولانا شرر صاحب مرحوم کے بیان کردہ حالات زندگی جو انہوں نے بعد نظر ثانی بغرض اشاعت مجھ کو عنایت فرمائے تھے اور میرے پاس موجود ہیں درج کیے جاتے ہیں۔ چونکہ یہی حالات کم و بیش مختلف عنوانات سے مصنف صاحب

مولانا عبدالحلیم شرر

نے بھی اس کتاب میں بیان کیے ہیں۔ لہٰذا اصل مضمون کتاب کے بجائے اسی پر اکتفا کی گئی۔ مترجم]

جمعہ کے دن ۔ ۱۰ جمادی الثانی ۱۲۷۶ھ کو غدر ۱۸۵۷ء کے تین سال بعد لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۔ نانا چونکہ دربار اودھ میں رسوخ اور معزز حیثیت رکھتے تھے لہٰذا اودھ کے شاہی خاندان کے ساتھ انگلستان گئے اور وہاں سے واپس آ کے مٹیا برج کلکتہ میں قیام پذیر ہو گئے تمام خاندان کو چونکہ اگلے شاہی دربار سے وابستگی تھی لہٰذا مولانا کے دیگر بزرگ اور والد بھی انہیں رسیّوں میں بندھے ہوئے مٹیا برج کلکتہ پہنچے ۔ مولانا کے والد حکیم تفضل حسین صاحب عربی و فارسی میں کامل بصیرت رکھنے کے ساتھ ایک پختہ مغز طبیب تھے ۔ ۱۲۸۵ھ میں جبکہ ۹ سال کی عمر تھی ، کلکتہ گئے ۔ اور اُسی وقت سے گویا تعلیم شروع ہو گئی گو ایک ناقص طریقے پر لکھنؤ میں بھی ابتدائی تعلیم ہوتی رہی تھی ۔

مٹیا برج میں ابتدا ء اپنے والد صاحب سے اور چند اور اساتذہ سے ابتدائی کتب فارسی و عربی پڑھیں ۔ مولوی سید علی حیدر صاحب اور مولوی محمد حیدر صاحب سے کچھ معقولی و ادبی کتابیں پڑھیں ۔ مولوی مرزا محمد علی صاحب مجتہد سے چند اوپر کی منطقی کتابیں پڑھیں ۔ حکیم محمد مسیح صاحب سے بعض کتب طبیہ پڑھیں ۔ کچھ انگریزی بھی پڑھی مگر پرائیوٹ طور پر اور بالکل ناقص ۔ اخبارات کا ذوق اسی زمانے میں پیدا ہو گیا تھا ۔ کیونکہ ان دنوں اودھ اخبار میں بہ حیثیت کارسپانڈنٹ خبریں لکھ لکھ کے بھیجا کرتے تھے ۔

اُنیس سال کی عمر میں کلکتہ سے تعلق ترک کر کے لکھنؤ کی سکونت اختیار کی ۔ اور مولوی محمد عبد الحی صاحب مرحوم سے کتب درسیہ عربی ختم کیں ۔ بیس برس کی عمر میں ماموں کی بیٹی سے شادی ہوئی ۔ اور شادی کے بعد ہی حدیث کا شوق ایسا غالب ہوا کہ دہلی چلے گئے ۔ اور مولوی محمد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو کے اور ان کے مدرسہ میں رہ کے حدیث کی تعلیم تکمیل کو پہنچائی ۔ اب اس کے بعد انہیں انگریزی کا شوق ہوا ۔ اور

انگریزی جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خانگی طور پر بے انتہا محنت شروع کی اور چند روز میں بقدر ضرورت دستگاہ پیدا کرلی۔

اسی زمانے میں اُنہیں منشی احمد علی کسمنڈوی مرحوم سے صحبت ہوئی۔ جو بعض اخبارات اور خصوص اودھ پنچ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ اور ان کا فارسیت کا مذاق بہت بڑھا ہوا تھا۔ اُن کے شوق دلانے سے بعض اخبارات میں مضامین لکھنے لگے۔ جن میں بجائے پالٹکس میں منہمک ہونے کے انشاء پردازی کا مذاق بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء میں منشی نول کشور صاحب نے اُنہیں اُودھ اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں لے لیا۔ یہ نوعمری کا زمانہ تھا طبیعت زوروں پر تھی۔ اعلیٰ خیال آفرینی کے ساتھ فلسفیانہ معنی آفرینی اور لٹریری مذاق بڑھا ہوا تھا۔ اسی رنگ کے مضامین اس زور شور سے لکھنا شروع کیے کہ ہر جگہ شہرت ہوگئی اور ایسی شہرت ہوئی کہ حیدر آباد میں اور بعض اور چھوٹی ریاستوں میں طلب کیے گئے۔ مگر ناپسند کیا۔ سرسیّد سے گو شناسائی نہ تھی مگر اُنہوں نے "روح" کے سبجکٹ پر مولانا کا ایک مضمون اس قدر پسند کیا کہ منشی نول کشور کو لکھا۔ "میں اس مضمون میں سے کچھ اخذ کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا صاحب مضمون سے اس کی اجازت چاہتا ہوں۔"

اسی زمانے میں انہوں نے اپنے ایک دوست مولوی عبدالباسط کے نام سے محشر نام ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا جس کا رنگ عبارت اس قدر دلکش اور دلفریب تھا کہ ہر طرف دھوم پڑ گئی۔ اس میں اٹھارہ انیس نمبروں میں انہوں نے مسلسل صبح کا سماں دکھایا تھا جس نے تمام صاحب ذوق لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہ رنگ اُردو میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اس میں فارسی کے تشبیہات و استعارات تھے مگر بندشیں انگریزی تھیں گویا انگریزی عروس سخن کو فارسی و اُردو کا لباس پہنا دیا گیا تھا۔ اسی ضرورت سے قافیہ بندی اور رعایت لفظی بالکل چھوڑ دی۔ اور اس سے بہت پرہیز کیا کہ نثر میں جابجا اشعار شامل کیے جائیں۔ ابتداءً اس رنگ کے نباہنے میں اکثر جگہ عبارت اُلجھ جاتی تھی جس کی کچھ تو یہ وجہ تھی کہ اُردو نثر میں انگریزی

کی طرح علامات اوقاف (پنکچویشن مارکس) نہیں ہیں۔ اور کچھ یہ کہ مولانا کا ایجاد کیا ہوا رنگ ابھی پختگی کو نہیں پہنچا تھا۔ مگر چند ہی روز کے بعد ایسا اعتدال پیدا ہوا کہ ان کی عبارت نے خاص رنگ پکڑ لیا۔ اور ایسا مقبول رنگ کہ یہی طرز عبارت آج ساری اُردو انشاء پردازی اور اخبارات کی عام زبان پر حکومت کر رہا ہے۔

یہ اسی عبارت کی شان تھی کہ جس نے ایک دفعہ دیکھا بے انتہا گرویدہ ہو گیا۔ اور فوراً اس کو اختیار کر لیا۔ افسوس کہ نثر کے وہ اودھ اخبار اور محشر کے مضامین کسی نے علیحدہ نہیں چھاپے اور وہ اصل پرچے کہیں دستیاب نہیں ہوتے۔ ورنہ شاید ہندوستان بہ نسبت سابق کے ان کی زیادہ قدر کرتا۔

۱۸۸۲ء میں منشی نول کشور کے تعلق کو چھوڑ دیا جس کا سبب یہ تھا کہ مطبع اودھ اخبار نے اسپیشل کارسپانڈنٹ بنا کے حیدر آباد بھیجا تھا۔ مولانا گئے مگر چھ مہینے رہ کر واپس آنا چاہا۔ مطبع نے اس کی اجازت نہ دی۔ اور آپ خود ہی چلے آئے۔

اس زمانے میں انہوں نے اپنا سب سے پہلا ناول "دلچسپ" لکھا جس میں دقتوں اور حالتوں کا ایسا سماں دکھایا ہے کہ اُردو زبان میں بالکل نیا اور حیرت انگیز ہے۔ مگر چونکہ اس رنگ کا پورا ڈیولپمنٹ (رواج) ہنوز نہیں ہوا تھا لہذا جا بجا اُلجھا ہوا اور پیچیدہ ہے اور اخلاق پسندی کی شان دکھاتا ہے۔ وہ ایک ہندوستانی معاشرت کا ناول ہے جس میں عشق کو دلچسپی کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستانی خاندان زیادہ تر کن اسباب سے تباہ ہوتے ہیں سال بھر بعد اس کا دوسرا حصہ شایع ہوا جو انشاء پردازی کے اُس نقص سے پاک تھا۔ جو پہلے حصے میں ہے۔ اس میں نہایت پختگی حاصل ہو گئی ہے۔

اس کے دو سال بعد مولانا نے بنکم چندر چٹرجی کے ناول درگیش نندنی کو اس کے انگریزی ترجمہ سے اُردو میں ترجمہ کر کے شایع کیا۔ اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک اچھا انشاء پرداز ترجمہ کرے تو اس میں کیسی خوبیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

امید چونکہ مولانا کے کلام کی بے انتہا مشتاق تھی۔ ہر طرف دست شوق پھیلا ہوا تھا کہ مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر البشیر اور منشی نثار حسین صاحب نثار مالک پیام یار کے اصرار سے ۱۸۸۷ء میں مولانا نے اپنا مشہور رسالہ دلگداز جاری کیا۔ اس کے شائع ہوتے ہی شوق نے سارے ہندوستان میں ایک سرگرمی پیدا کر دی۔ اور اس کی اشاعت ہزار سے زیادہ ہو گئی۔ اس میں خاص قسم کے ایسے مضامین تھے جن کے نمونے اگر کوئی ڈھونڈھے تو صرف انگریزی اعلیٰ لٹریچر میں مل سکتے ہیں۔ اردو کا خزانہ اُس وقت تک اس سے خالی تھا۔ کسی خیال کو مؤثر اور بغیر تشبیہ و استعارہ کے اور بغیر قافیہ بندی کے کسی مطلب کو دل کش و دل فریب بنا دینا دل گداز کے معجز نگار ایڈیٹر کا خاص حصہ تھا۔ اس کے مضامین اس قدر پسندیدہ اور ایسے دلکش رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ سررشتہ تعلیم کو بھی بغیر اس کے کہ مولانا کو اس محکمے سے کوئی بھی لگاؤ ہو آپ کے مضامین لینے پڑے۔ اور اب ہندوستان میں اُردو کا کوئی کورس نہیں ہے جس میں دو ایک مضامین شرر کے نہ ہوں۔

۱۸۸۸ء میں دل گداز میں ناول نویسی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اور اس وقت سے مسلسل وہ ناول شائع ہونے لگے۔ جن کے نام ملک العزیز ورجنا۔ حسن انجلینا منصور موہنا وغیرہ ہیں جن میں مورخانہ شان سے قدیم دلچسپ واقعات کو اعلے لٹریچر کا لباس پہنایا گیا ہے۔ یہ ناول اس قدر مقبول ہوئے کہ اس وقت تک ان کے بیسیوں ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ اور مانگ ویسی ہی باقی ہے بلکہ زیادہ ہے۔

شرر کے ناولوں اور نیز مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تاریخ کو اور بخصوص اسلامی تاریخ کو حد سے زیادہ اسٹڈی کیا ہے۔ اسی وجہ سے مضمونوں اور ناولوں میں روز بروز خیال آرائی کا رنگ چڑھتا گیا۔ اور تحقیق و تدقیق کے ساتھ صرف سادے الفاظ میں جوش پیدا کرنے اور واقعات کو انتہا سے دل کش بنا دینے کی شان بڑھتی گئی۔ ان کے آخری ناولوں میں ایک "ایام عرب" ہے جس میں جاہلیت عرب کی زندہ سوسائٹی ایسی عمدگی و

نیاز فتحپوری

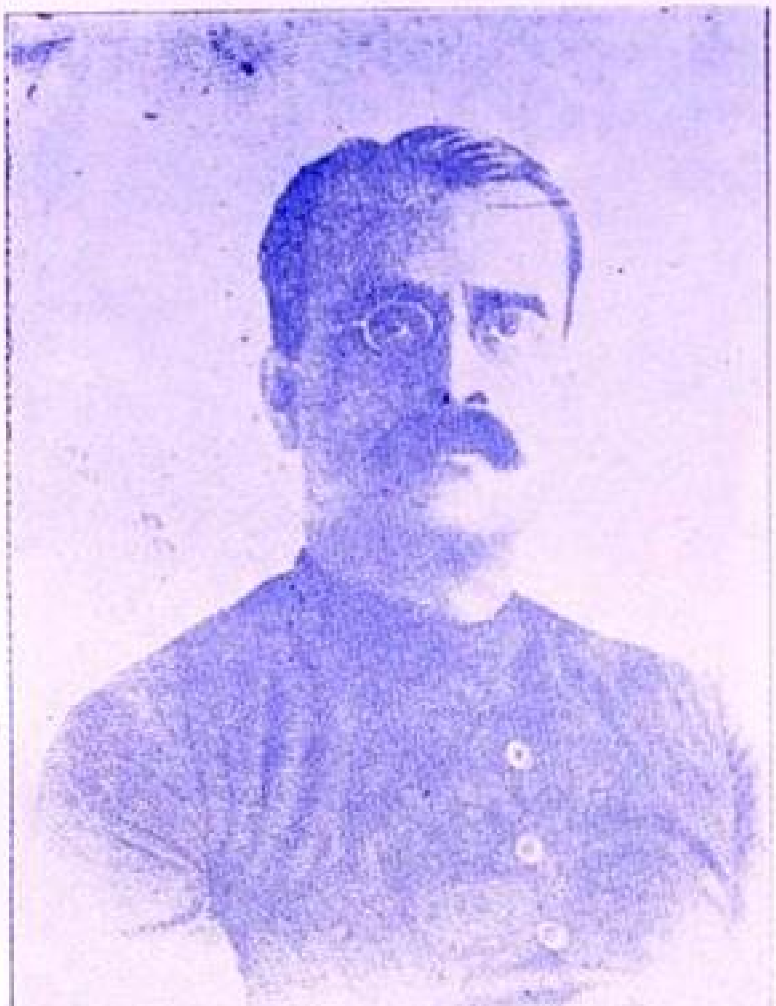

پنڈت برج نرائن چکبست

خوب صورتی سے دکھائی گئی ہے کہ زمانہ حیرت کرتا ہے۔ فلورا فلورنڈا" اور "فتح اندلس" وغیرہ میں اسپین کے اسلامی دور کو ایسی خوش اسلوبی سے دکھایا ہے کہ لوگ بار بار پڑھتے ہیں۔ اور جی نہیں بھرتا۔

انہیں آخری ناولوں میں ناول "فردوس بریں" بھی ہے اس کا پلاٹ ایران میں اور اس زمانے میں دکھایا گیا ہے جب کہ جبال طالقان اور التمونت میں باطینوں (اسیسن لوگوں) کا زور تھا۔ اور ہزار ہا بندگانِ خدا اُن کے خنجر سے مارے جاتے تھے۔ ان کے بادشاہ نے پہاڑوں میں ایک جنّت بنا رکھی تھی جس میں وہ سب سامان فراہم کیا تھا جو مسلمانوں کے خیال میں جنّت میں ہونا چاہیئے۔ اس ناول میں عجیب حیرت ناک طریقے سے دکھایا گیا ہے کہ وہ لوگ کیونکر لوگوں کو فریب دے کر اپنا گرویدہ بناتے اور اپنی فلسفیانہ تقریروں سے انسان کو کیونکر اپنا فریفتہ کر لیتے تھے۔

تاریخی مذاق کے بڑھنے کا ایک یہ نتیجہ تھا کہ مولانا شرر نے ۱۸۹۰ء میں مہذب نام ایک اخبار جاری کیا جس میں مسلسل علمائے اسلام کی سوانح عمریاں ہُوا کرتی تھیں۔ اس پرچے کی اشاعت بڑھتی جاتی تھی اور مسلمانوں میں نہایت مقبول تھا کہ یکایک ۱۸۹۱ء میں انہوں نے دل گداز اور مہذب دونوں کو بند کر کے حیدر آباد کا سفر کیا۔ اور وہاں ریاست میں دو سو روپیہ ماہوار کا تعلق پیدا کر لیا۔ جس کی وجہ سے ایک مدت تک وہ ملک کی نظر سے غائب رہے۔ اتفاقاً نواب وقار الأمراء بہادر سابق مدار المہام مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے نواب ولی الدین خاں انگلستان میں ایٹن کالج میں تعلیم پاتے تھے اور چونکہ بچپن سے بھیجے گئے تھے لہٰذا مذہب سے بالکل آشنا نہ تھے۔ مولانا شرر کو وقار الأمراء بہادر نے اس خدمت کے لیے منتخب کیا۔ اور ۱۸۹۵ء میں وہ انگلستان گئے جہاں چودہ پندرہ مہینے قیام رہا۔ اور موسیو کوربین نام ایک فرانسیسی محقق سے فرنچ زبان سیکھنی شروع کی جس میں اتنی دستگاہ ہے کہ ڈکشنری کی مدد سے ترجمہ کر سکتے ہیں۔ ۱۸۹۶ء کے آخر میں ہندوستان واپس آئے۔

۱۸۹۸ء میں آپ نے حیدر آباد سے دل گداز کو از سرِ نو جاری کیا۔ مگر گیارہ ہی مہینے تک جاری رکھ کے خود ہی بند کر دیا۔ جس کی وجہ یہ ہوئی کہ حضرت امام حسین علیہ السّلام کی صاحبزادی جناب سکینہؓ کی لائف آپ نے شایع کرنا شروع کی تھی۔ اس میں چونکہ تاریخی تحقیقات کر کے اصلی واقعات لکھے تھے وہ عام مسلمانوں اور خاصۃً شیعہ لوگوں کے خلاف ہوئے اور ایک قسم کی شورش پیدا ہوئی۔ بعض عہدہ داران گورنمنٹ نظام نے پرائیوٹ طور پہ آپ کو ہدایت کی کہ اس مضمون کا سلسلہ روک دیں۔ مگر آپ نے جب یہ رنگ دیکھا تو بجائے اس مضمون کے خود پرچہ بند کر دیا۔ اور اُسے ۱۹۰۱ء میں پھر لکھنؤ آ کے جاری کیا جس میں سب سے پہلے اُسی سکینہؓ بنت حسینؑ کی لائف کا بقیہ تھا۔

اس زمانے میں ریاست دکن کے تعلقات قائم تھے۔ صرف مدار المہام مرحوم کی فیاضی اور سابق ہوم سیکرٹری مولوی محمد عزیز مرزا صاحب کی کوشش سے آپ کو لکھنؤ میں رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔ سنہ ۱۹۰۱ء کے درمیان میں آپ واپس طلب کیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دل گداز بند کر کے آپ پھر حیدر آباد گئے۔ اس مرتبہ جانے میں یکایک ایسے انقلابات ہو گئے کہ آپ کے تعلقات ریاست کو نقصان پہنچا۔ وقار الامرا بہادر وزارت سے علیحدہ ہوئے اور چند روز بعد انتقال بھی کر گئے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب جن کو آپ سے خاص ہمدردی تھی اضلاع میں ڈپٹی کمشنری کی خدمت پر بھیج دیے گئے۔ نئے مدار المہام مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کو آپ سے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی۔ اور مسٹر واکر جو فنانس کا انتظام کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان کے نزدیک ریاست کو مولانا کی ضرورت نہ تھی۔ غرض ریاست سے جو تعلق تھا جاتا رہا۔ اور جو تعلق وقار الامرا کے صاحبزادے نواب سلطان الملک بہادر کی سرکار سے تھا۔ اُسے آپ نے خود ہی چھوڑ دیا۔ اور ۱۹۰۲ء میں لکھنؤ واپس آ کے پھر پبلک کی خدمت شروع کر دی۔ جب سے دل گداز پھر جاری ہوا۔ اور اس وقت تک جاری ہے۔

مولانا کا رنگ عبارت اسٹڈی کیا جائے اور اس میں خاص حیثیت سے انسان منہمک ہو تو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اُردو میں کیا چیز پیدا کی ہے۔ اُردو کے پُرانے نمونے دو وضع کے تھے۔ ایک تو میر امّن دہلوی کی سادی عبارت۔ اور دوسری مرزا رجب علی بیگ سرور کی فارسی مذاق کی رنگین اور مسجّع و مقفّیٰ عبارت۔ اس کے بعد جو اُردو کے نئے مجدّد پیدا ہوئے وہ حسب ذیل ہیں:۔

سرسید احمد خاں۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ مولانا نذیر احمد صاحب۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مولانا عبدالحلیم شرر۔ سرسیّد نے سادگی اور وہ شان اختیار کی جو کبھی مولانا شاہ اسماعیل کے قلم نے دکھائی تھی۔ یعنی ہر مضمون اس طرح ادا کیا جائے کہ عامی سے عامی شخص اس کو سمجھ جائے۔ مولوی محمد حسین کی شان یہ تھی کہ زبان میں بے تکلّفی و روانی کے ساتھ شاعرانہ تشبیہات و استعارات بھی بہت ہی معتدل حد تک ہوں۔ مولوی نذیر احمد صاحب صرف روانی چاہتے تھے اور بے تکلّفی میں اس قدر حد سے بڑھ گئے ہیں کہ زبان کو جب متین بنانا چاہتے ہیں تو سوا اس کے کہ عربی یا انگریزی جملے اور لغات داخل کر دیں۔ ان کا کچھ زور نہیں چلتا۔ بندشیں وہی رہتی ہیں اور عبارت بھی وہی باقی رہتی ہے۔ پنڈت رتن ناتھ میں کوئی ایجادی مادّہ نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو صرف اتنا کہ ان میں ظرافت کا مادّہ بڑھا ہوا ہے۔ ان کی عبارت دو طرح کی رہتی ہے۔ ایک تو وہ جہاں وہ خود کوئی سماں کھینچنا چاہتے ہیں یا کسی کیفیت کو بیان کرتے ہیں وہاں ان کی عبارت میں اور سرور کی عبارت میں کوئی فرق نہیں۔ وہی قافیہ پیمائی ہے۔ وہی مبالغے ہیں۔ وہی پُرانی تشبیہات و استعارات ہیں اور وہی جابے جا اور ضرورت و بے ضرورت اشعار کا بھرتی کرنا ہے۔ بلکہ الفاظ بھی وہی پُرانے نثّاروں کے ہیں۔ دوسری عبارت وہ جہاں عورتوں کی زبان سے وہ ان کے خیالات ادا کرتے ہیں۔ اس میں سوا خاص خاص لغزشوں کے وہ لکھنؤ کی عورتوں کی زبان اچھی اور بے تکلّف لکھتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سرشار کی زبان

میں کوئی جدت نہ تھی سوا اس کے کہ خلاف قیاس مضامین کو چھوڑ دیا۔ پرانی عبارت اور اُن کی عبارت میں کوئی فرق نہ تھا۔ شررؔ نے ان سب لوگوں سے علیحدہ ہو کے یہ کمال دکھایا کہ انگریزی انشاپردازی کی خوب صورت بندشوں کو اُردو میں داخل کیا۔ مگر تشبیہات و استعارات وہی پرانے ایشیائی رکھے۔ انہوں نے خیالی مضامین کو لیا۔ اور ان میں بالکل انگریزی جادو نگاروں کی سی خیال آفرینیاں کیں اور عجب خوبصورتی کے ساتھ انہیں اُردو میں کھپایا۔ اندو پلاک میں ابتداءً یہ نیا رنگ تھا۔ انگریزی دانوں کو اُردو میں وہ چیز مل گئی جسے وہ ڈھونڈھ رہے تھے۔ اور صرف اُردو جاننے والوں کو تھوڑی وحشت کے بعد جب اس کی چاٹ پڑی تو ان کے نزدیک اس سے زیادہ دلچسپ کوئی رنگ عبارت تھا ہی نہیں۔ سرشار کا رنگ ان کے چند ابتدائی ناولوں پہ محدود ہے اور وہ بھی جن میں پلاٹ نہیں۔ بخلاف اس کے شررؔ کا رنگ زیادہ تر ان کے مضامین میں نظر آتا ہے جو اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور جن کے سامنے کسی کو قلم اُٹھانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ شررؔ ہی نے درحقیقت وہ زبان شروع کی جس کی نسبت سب کو اتفاق ہے۔ کہ وہی جدید اُردو ہے اور وہ زبان ہے جو فی الحال ملکی لٹریچر پر حکومت کر رہی ہے۔ اور جوں جوں یہ رنگ چمکتا اور اُبھرتا جائے گا۔ اسی قدر زیادہ نمایاں طور پہ شررؔ کا سکہ اُردو لٹریچر پہ نظر آتا جائے گا۔ سادی حیثیت میں وہ متین محققانہ بلکہ فلسفیانہ ہے شاعرانہ خیال آفرینی کی حیثیت میں وہ شاعری کے رنگ میں انتہا سے زیادہ ڈوبی ہوئی ہے وہ جس چیز کی تصویر کھینچتے ہیں اُسے اسکاٹ کی طرح ناظرین کی نظر کے سامنے لا کے کھڑا کر دیتے ہیں۔ انسانی جذبات پر اس طرح اور اتنا تصرف کرتے ہیں کہ جس قسم کے جذبات چاہتے ہیں۔ اپنے ناول پڑھنے والے کے دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنا زور طبع دکھانے کے لیے انہوں نے ایسے ایسے سبجکٹ لیے جن پہ اُن سے پیشتر کسی نے قلم نہیں اُٹھایا تھا۔ مثلاً غریب کا چراغ" "صحبت برہم" "نہیں" "ہاں" "لالۂ خود رو" "یاد رفتگاں" "دیہات کی لڑکی" "خواب دو شیں" وغیرہ وغیرہ۔ ایسے مضامین کو اُردو میں پہلے پہل انہیں نے

انٹروڈیوس کیا۔ اور سچ یہ ہے کہ آج تک ان سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکا۔ شرر سچ یہ ہے کہ اُردو لٹریچر کی دنیا میں ایک چابک دست مصنف رہیں۔ اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والے بادشاہ۔

تاریخی ذوق بڑھنے کی بدولت مولانا ناولسٹ سے ایک مورخ بن گئے۔ آپ نے دل گداز میں جو تاریخی مضامین لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مسائل تاریخی اور اکثر نامورانِ سلف کی سوانح عمری لکھ کے آپ نے ہندوستانی پبلک کی واقفیت بہت بڑھا دی ہے۔ مگر ان کے علاوہ آپ نے دو تاریخیں بھی لکھی ہیں جو بہت بڑے پیمانے پر ہیں۔ ایک تاریخ سندھ جس میں آپ نے اسلامی عہد کو عام مسلمات کے خلاف کچھ اور ہی ثابت کردیا ہے۔ اور اس کی تکمیل کے لیے عربی اور انگریزی تاریخوں کی بہت ورق گردانی کی ہے۔ دوسری تاریخ ارض مقدس ہے۔ جس میں یہود کے ابتدائی زمانے سے سول آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک کے حالات بڑی تنقیح و تحقیق سے لکھے ہیں۔

مولانا کا کیرکٹر یہ ہے کہ رسم و رواج کے اکثر خلاف رہتے ہیں۔ اور تحقیق و تنقید کی دُھن ہے۔ تقلید سے گریز۔ اور اہل حدیث کے اصول مذہب کی طرف رجحان ہے۔ اگرچہ بعض مسائل میں اپنی تحقیق کی بنا پر اہلِ حدیث سے بھی علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ آزادی کا خیال غالب ہے۔ اور جو چیز صحیح ثابت ہو جائے۔ اُس کے تسلیم کرنے اور علانیہ اس کا اعتراف کر دینے میں باک نہیں کرتے۔ علمائے زمانہ کی اکثر شکایت کرتے ہیں۔ انہیں اسباب سے اکثر عوام الناس ان سے سخت مخالفت رکھتے ہیں۔ پہلی ناراضی لوگوں کو ان سے یہ تھی کہ مستند تاریخوں سے نقل کر کے یہ شایع کر دیا کہ حضرت شہر بانو کا عقد جناب امام حسینؑ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے امام زین العابدینؑ نے اپنے غلام زبید سے کر دیا۔ دوسری مخالفت وہی سکینہ بنت حسینؓ کی لائف کی بنیاد پر تھی۔ مگر سب سے زیادہ اختلاف اس وقت ہوا جب آپ نے ۱۹۰۶ء میں پردہ عصمت نام ایک رسالہ لکھنؤ سے شایع کیا۔

جس کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں میں سے پردے کا رسم اُٹھا دیا جائے۔ آپ کا دعویٰ تھا کہ پردہ اسلام میں صرف ایک ساتر اور مہذب لباس کا نام ہے نہ کہ گھر کی چار دیواری میں بند کر دینے کا۔ یہ رسالہ برس دن تک نکلا۔ ہر جگہ سخت اختلاف ہوا۔ مگر اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ اس لیے کہ اس وقت تک اس مسئلہ کو علانیہ کوئی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب ہر جگہ ایک جماعت اس کی طرف دار ہے اور پردے کو توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اپریل سنہ ۱۹۰۴ء سے آپ نے ایک نیا پندرہ روزہ رسالہ جاری کرنا شروع کیا۔ جس کا نام "اتحاد" رکھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات صاف کیے جائیں۔

مولانا کے آخر عمر یعنی تقریباً سنہ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۲۶ء ان کے سال وفات تک کے مزید حالات مختصراً اس طرح پر تقسیم ہو سکتے ہیں:۔

(۱) دل گداز اس زمانے میں کئی دفعہ بند ہوا اور پھر جاری ہوا اور بالفعل اُن کے صاحبزادے مولوی محمد صدیق حسن صاحب منیجر انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کی اڈیٹری میں لکھنؤ سے نکلتا ہے۔

(۲) جب مولانا محمد علی ۱۹۱۲ء میں اخبار "ہمدرد" دہلی سے نکالنے والے تھے تو سب سے پہلے انہوں نے اس کی ادارت کے واسطے مولانا کو دو سو روپیہ ماہوار پر مقرر کیا تھا مگر بعض وجوہ سے مولانا چند ماہ دہلی میں قیام کر کے قبل اخبار نکلنے کے لکھنؤ چلے آئے اور اخبار مذکور سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔

(۳) ۱۹۱۵ء میں حضور نظام فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ نے مولانا کو طلب کر کے ان کو اپنی سوانح عمری تیار کرنے کا حکم دیا تھا مگر بعد کو یہ خیال ترک کیا گیا اور بجائے اس کے مولانا تاریخ اسلام لکھنے پر مامور کیے گئے جس کے واسطے ایک معتد بہ رقم ماہوار اُن کو لکھنؤ

گھر بیٹھے ملتی تھی۔ یہ کتاب تین جلدوں میں تیار ہوئی جس کی پہلی جلد شایع ہو گئی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔

مولانا کی چھوٹی اور بڑی تصانیف اتنی کثرت سے ہیں کہ وہ اس خاص صفت میں اپنے تمام معاصرین پر گوے سبقت لے گئے تھے۔ اور ان کی اس کثرت تصانیف سے وہ زمانہ قرون اولیٰ کا یاد آجاتا ہے جبکہ تصانیف کی کثرت مختلف طریقوں سے کتب تاریخ و سیر میں بیان کی جاتی تھی مثلاً کسی مصنف کے تراشہ قلم سے اس کے غسل میت کے واسطے پانی گرم کیا جاتا۔ یا کسی شخص کی مصنفہ کتب کا بار کئی اونٹوں پہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جایا جاتا وغیرہ۔ غرضکہ مولانا کی تمام تصانیف کی اسم نویسی اس جگہ تحصیل حاصل ہے۔ اس کے واسطے کوئی فہرست کتب یا دل گداز کے آخری اشتہاری صفحات دیکھنا چاہیے۔ یہاں پہ ہم ان کے جاری کردہ اخبارات و رسائل اور ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد باعتبار اُن کے مضامین کے بتا دینا کافی سمجھتے ہیں۔

اخبارات و رسائل

(۱) محشر ہفتہ وار ۱۸۸۱ء لغایت ۱۸۸۲ء

(۲) دل گداز ماہوار ۱۸۸۷ء

(۳) مہذب ہفتہ وار

(۴) پردۂ عصمت پندرہ روزہ

(۵) اتحاد " "

(۶) العرفان ماہوار

(۷) دل افروز ماہوار

(۸) ظریف ہفتہ وار

آخر میں چند سال ہوئے ایک ماہوار پرچہ "مورخ" کے نام سے بھی نکالا تھا۔

تصانیف

سوانح عمریاں مثلاً "ابوبکر شبلی" "جنید بغدادی" وغیرہ	۲۱
تاریخی ناول مثلاً ایام عرب، بابک خرمی، وغیرہ	۲۸
خیالی ناول "حسن کا ڈاکو، غیب داں دولہن وغیرہ	۱۴
تاریخ مثلاً تاریخ سندھ، عصر قدیم وغیرہ	۱۵
نظم و ڈراما مثلاً شہید وفا، شب غم، شب وصل وغیرہ	۶
متفرق	۱۸ کل ۱۰۲

مولانا کے مضامین جو "دل گداز" میں چھپے ہیں۔ سید مبارک علی شاہ تاجر کتب لاہور نے آٹھ جلدوں میں مضامین شرر کے نام سے حال ہی میں شایع کیے ہیں۔ یہ سب کتابیں نہایت دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں مگر علی الخصوص وہ جلد جس میں قدیم لکھنؤ کے حالات جو "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" کے نام سے دل گداز میں چھپتے رہے، دیکھنے لائق ہے۔ اوران لوگوں کے لیے جو لکھنؤ کی پرانی تاریخ اور دلچسپیوں کے جویا ہیں نہایت مفید اور پر از معلومات ہے۔

مرزا محمد ہادی رُسوا — مرزا محمد ہادی[1] بی، اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی متخلص بمرزا و رسوا۔ فن شعر میں مرزا اوج مرحوم کے شاگرد ہیں۔ مرزا صاحب جوانی میں مرزا غالب کے رنگ کو بہت پسند کرتے تھے اور دیوان غالب ان کو قریب قریب کل حفظ تھا۔ مگر اب غالب کی نازک خیالیاں اور عبارت آرائی ان کو زیادہ مرغوب نہیں بلکہ کلام نہایت صاف سادہ اور لطیف تخئیل سے معمور ہوتا ہے۔ اس صفائی اور سادگی میں وہ مومن کے تتبع البتہ کہے جا سکتے ہیں۔ مرزا صاحب

---

[1] ولادت فروری ۱۸۵۸ء ۔ وفات ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء ۔

کی معرکہ آرا تصنیف ان کی ناول " امراؤ جان ادا " ہے جس کو لکھے ہوئے تقریباً پچیس تیس برس ہوئے ہوں گے۔ یہ نہایت اعلےٰ درجے کا ناول ہے اس کی عبارت نہایت اعلےٰ درجے کی ہے۔ سب سے بڑی صفت اس میں یہ ہے کہ جو اُردو کے بہت کم ناولوں میں پائی جاتی ہے کہ اس کا پلاٹ یعنی ترتیب قصہ نہایت باقاعدہ اور منظم اور اس کے کیرکٹر (اشخاص قصہ) صاف واضح طور پہ نظر آتے ہیں۔ ہم نے کسی ناول میں اتنی دلچسپی اتنی کثرت واقعات اور فطرت انسانی کی اتنی صحیح تصویر نہیں دیکھی۔ اس میں اس زمانے کی طرز معاشرت اور سوسائٹی کے ہو بہو نقشے کھینچے گئے ہیں جن میں کسی قسم کا مبالغہ یا آورد نہیں ہے۔ مرزا صاحب کی دیگر تصانیف۔ ان کے مثنوی نوبہار، صبح امید، مرقع لیلیٰ مجنوں (ڈراما) اور ذات شریف (ناول) وغیرہ ہیں۔ مرزا صاحب بالفعل عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں ملازم ہیں۔

حکیم محمد علی حکیم محمد علی متخلص بہ طبیب، جن کا تھوڑا عرصہ ہوا کہ انتقال ہوگیا۔ ایک مشہور ناول نگار تھے۔ مندرجہ ذیل ناول ان کی تصنیف سے ہیں:۔

عبرت۔ حسن سرور۔ دیول دیوی۔ گورا۔ رام پیاری۔ جعفر و عباسہ۔ اختر و حبیبہ۔ وغیرہ بعض ناول انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں۔ مثلاً نیل کا سانپ جو رائڈر ہیگرڈ کی کلیوپٹرا کا ترجمہ ہے اور دیول دیوی اور جعفر و عباسہ تاریخی ناول ہیں۔ حکیم صاحب گو اپنے اقران و امثال میں ممتاز تھے مگر اعلےٰ درجے کے ناول نگار نہیں کہے جا سکتے اس وجہ سے وہ زمانے کے رنگ سے بے خبر تھے اور نہ وہ اس زمانہ یا اس سوسائٹی کے حالات سے واقف تھے جس کی وہ تصویریں کھینچتے تھے۔ فطرت انسانی سے وہ پوری طرح باخبر نہیں اور لطیف جذبات کے بھی ماہر نہ تھے۔ عبارت میں یکرنگی ہے اور پند و نصائح سے یہی اسے غیر دلچسپ بے اثر کر دیتے ہیں۔

راشد الخیری ناول نویسی میں مولانا نذیر احمد صاحب کے صحیح جانشین کہے جا سکتے ہیں۔ ان کی توجہ زیادہ تر عورتوں کی تعلیم و ترقی اور ان کے مصائب زندگی پر مبذول ہے چونکہ

لہ ولادت ۱۸۵۳ء۔ وفات ۱۹۱۸ء۔ ۲ہ ولادت ۱۸۶۸ء۔ وفات ۱۹۳۶ء۔

عبارت نہایت دردانگیز اور تاثیر سے لبریز ہوتی ہے۔ لہٰذا مصورِ غم کے لقب سے مشہور ہیں۔ کثیر التصانیف ہیں۔ بعض مشہور تصانیف کے نام حسب ذیل ہیں۔

صبح زندگی۔ شام زندگی۔ نوحۂ زندگی۔ عروس کربلا۔ زہرہ مغرب وغیرہ۔

نیاز فتح پوری اُردو کے مشہور و مشاق ادیب و جرنلسٹ نیاز محمد خاں نیاز فتح پوری۔ وطن فتح پور (یو۔پی) سال ولادت ۱۸۸۴ء۔ ابتدائی تعلیم فارسی و عربی گھر پر ہوئی پھر مدرسہ اسلامیہ فتحپور مدرسہ عالیہ رام پور اور ندوۃ العلماء کے دار العلوم میں فراغت حاصل کر کے حدیث مولانا عین القضاۃ صاحب لکھنؤ سے پڑھی۔ انگریزی تعلیم ایف اے تک پرائیوٹ طور پر حاصل کی اور ترکی زبان ایک ترک سے پڑھی۔ مختلف روزانہ اخبارات میں کام کیا۔ اب سات سال سے "نگار" ایک ادبی علمی رسالہ جاری کیا ہے۔ جو پہلے بھوپال اور اب لکھنؤ سے جاری ہے۔

تصانیف۔ صحابیات۔ گہوارہ تمدن، نگارستان (بعض ادبی مضامین کا مجموعہ ہے) جذبات بھاشا شہاب کی سرگزشت، شاعر کا انجام، المسئلۃ الشرقیہ، عرض نغمہ (ترجمہ گیتان جلی)

طرزِ تحریر آپ کا طرزِ تحریر سب سے علیحدہ ہے اور آپ معمولی سیدھی سادی عبارت سے نظم نما نثر کو زیادہ پسند کرتے ہیں مگر بعض موقعوں پر جب یہ رنگ حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو عبارت باتکلف اور بے لطف معلوم ہونے لگتی ہے۔ عبارت اور مضمون میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لہٰذا اس قسم کی عبارت کو صرف انہیں مضامین پر صرف کرنا چاہیے جو اس کے متحمل ہو سکیں مگر یہ بات ضرور قابل قدر ہے کہ آپ نے قدیم طرز انشاء پردازی کو چھوڑ کر اپنے واسطے ایک نئی شاہراہ قائم کی ہے۔ آپ نے ٹگور کی گیتان جلی کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے اور رومی اور یونانی علم الاصنام سے بھی آپ کبھی کبھی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ "کیوپڈ اور سائیکی" اور "مریخ سیاح کی ڈائری" انگریزی کے ترجمے معلوم[1] ہوتے ہیں آپ کی بعض کتابیں، مثلاً

---

[1] یہ ترجمے نہیں ہیں بلکہ طبعزاد مضامین ہیں ۱۲۔

"شاعر کا انجام" اور "گہوارۂ تمدن" جس میں تمدنی تمدن میں عورتوں کے حصہ لینے کی بحث ہے۔ نہایت عمدہ اور دلچسپ کتابیں ہیں۔ آپ کا رسالہ "نگار" ایک نہایت ممتاز ادبی رسالہ ہے جس کے اکثر مضامین جو آپ کے زور قلم کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ نہایت اعلیٰ درجے کے اور پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی خواجہ حسن[1] نظامی دلّی میں ۱۲۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی ولادت درگاہ فلک بارگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں ہوئی۔ خواجہ صاحب ابتدائے عمر ہی سے اخبارات میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک گورنمنٹ ان کو بنظر شک دیکھتی ہی اور پولیس ان کی نگرانی کرتی تھی۔ وہ بوجہ اپنے مرتبہ اور نیز بوجہ صوفی صافی ہونے کے بہت بااثر شخص ہیں۔ پچاس سے زیادہ کتب اور رسائل کے مصنف ہیں جن میں سے بعض بہت اچھی ہیں۔ آپ کی یہ خصوصیت ہے کہ معمولی معمولی مضامین اور خیالات کو نہایت دل کش اور موثر طریقے سے ادا کرتے ہیں۔ اور الفاظ نئے اور عجیب وضع کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت نہایت سادہ سلیس اور دل کش ہوتی ہے مگر خیالات میں گہرائی نہیں ہوتی۔ آپ نے تقریباً دس کتابیں غدر کے بارے میں شایع کی ہیں جس میں سے بعض ترجمے ہیں اور بعض میں معزول شاہ دہلی کی اولاد کی پریشاں گردیوں کے افسوسناک اور عبرتناک حالات ہیں۔ آپ کی کتاب کرشن بیتی کو اہل اسلام اور خصوصاً ارباب تصوف بہت پسند کرتے ہیں۔ بعض دیگر تصانیف حسب ذیل ہیں۔

میلاد نامہ۔ محرم نامہ۔ یزید نامہ۔ بیوی کی تعلیم۔ اولاد کی شادی۔ جگ بیتی کہانیاں وغیرہ۔

پریم چند میدان قصہ گوئی کے مشہور شہسوار ہیں۔ اصلی نام دھنپت[2] رائے ہے۔ پریم چند کے لقب سے مشہور ہیں۔ سنہ ۱۸۸۰ء سن ولادت ہے۔ آپ کے والد منشی عجائب لال بنارس

---

[1] ولادت جمعہ ۱۰ محرم ۱۲۹۶ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۸۷۸ء۔ وفات ہفتہ ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء مطابق ۱۱ ذی حجہ ۱۳۷۴ھ

[2] ولادت ۱۸۸۰ء۔ وفات ۱۹۳۶ء۔

کے قریب موضع پانڈے پور کے رہنے والے تھے۔ فارسی کی تعلیم تقریباً سات آٹھ برس حاصل کرکے انگریزی شروع کی اور بنارس کالجیٹ اسکول میں داخل ہوئے جہاں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ سات برس کی عمر میں ماں کا اور پندرہ برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ شروع میں آپ نے صیغہ تعلیم میں ملازمت کر لی تھی مگر درس و تدریس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ آپ کی ادبی زندگی ۱۹۰۱ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب سے کہ آپ نے "زمانہ" میں مضامین لکھنا شروع کیے۔ ۱۹۰۲ء میں ایک ہندی ناول "پریما" لکھا جو انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا۔ ۱۹۱۲ء "جلوہ ایثار" اور ۱۹۱۵ء میں "بازار حسن" ہر دو حصہ تصنیف کیے مثل اُردو کے آپ کو ہندی میں بھی کمال حاصل ہے چنانچہ سیوا سدن، پریم آشرم، رنگ بھوم اور کایا کلپ آپ کے مشہور ناول ہیں جن کے اُردو ترجمے[1] بھی سُنا گیا ہے کہ عنقریب شائع ہوں گے۔ رنگ بھوم علی الخصوص ایک نہایت دلکش ناول ہے۔ آپ کا تاریخی ڈراما کربلا رسالہ زمانہ میں بہ اقساط نکلتا رہا۔ منشی صاحب موصوف چھوٹے چھوٹے قصّے لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ آپ کے اس قسم کے افسانے اس زمانہ کے کثیر التعداد نام نہاد ناولوں کے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہیں۔ جو سچے نگینوں کو جھوٹے پتھروں کے ساتھ ہوتی ہے آپ کو دیگر ناول نگاروں پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ آپ نے ہندوستانی دیہات کے ہُو بہو نقشے اور یہاں کے کسانوں کے سچے سچے واقعات نہایت عمدہ طریق سے اپنے ناولوں میں بیان کیے ہیں۔ آپ کبھی مبالغے کو اپنی تصانیف کے پاس نہیں آنے دیتے اور نہ کبھی حق اور سچائی سے انحراف کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت میں بے حد آمد اور زور معلوم ہوتا ہے۔ لطیف استعارات اور تشبیہوں سے عبارت کی خوبی اور بڑھ جاتی ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا آپ کو اردو و ہندی دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے اور ساتھ ہی اس کے جذبات و نفسیات انسانی کے بھی

---

[1] سیوا سدن کا ترجمہ بازار حسن کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ رنگ بھوم کے ترجمے کا پہلا حصہ چوگان ہستی کے نام سے شائع ہوا ہے۔ دوسرا حصہ بھی عنقریب شائع ہو گا۔ ۱۲

پورے ماہر ہیں۔ آپ کے کلام میں کہیں ظرافت اور کہیں درد دہی رنگ دکھاتا ہے جیسے۔ کر دھوپ اور چھاؤں۔ آپ کے کیرکٹر نہایت مخصوص جیتی جاگتی تصویریں ہوتی ہیں۔ آپ کا ناول بازار حسن جو دو جلدوں میں ہے ایک طویل کتاب ہے مگر دلچسپی میں کم نہیں ہے۔ اگر آپ کے اس قسم کے ادبی اشتغال جاری رہے تو کچھ عرصہ میں آپ بڑی ترقی حاصل کریں گے۔ تھوڑے عرصہ سے بوجہ اُردو کی ناقدری کے آپ ہندی کی طرف زیادہ توجہ فرما رہے ہیں۔ آپ کے خیالات سوشل اور پولٹیکل معاملات میں بہت اعلےٰ وارفع ہیں۔ آپ کے مضامین ہندو مسلم اتحاد اور دَورِ جدید جو 'زمانہ' میں نکلے تھے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ آپ کی تصانیف علاوہ کتب مذکورہُ بالا کے پریم پچیسی حصّہ اوّل و دوم اور پریم بتیسی حصّہ اوّل و دوم چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہیں۔ خواب و خیال ابھی حال میں پنجاب سے شایع ہوا اور فردوس خیال انڈین پریس شایع کر رہا ہے۔

سُدرشن آپ بھی ایک مشہور افسانہ نگار ہیں اور پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ منشی پریم چند کی بعض خصوصیات آپ میں بھی موجود ہیں مگر ان سے کم درجے پر۔ آپ میں وہ استادی اور فنی کمال نہیں ہے اور نہ عبارت میں اس قدر ادبیت اور صحت ہے۔ آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) نعبت کا انتقام ایک انعامی رسالہ جس پر پنجاب گورنمنٹ نے پانچ سو روپیہ انعام دیا۔ پہلے ہندی میں لکھا تھا اس کے بعد اس کا ترجمہ اُردو میں ہوا۔

(۲) چندن اس پر خواجہ حسن نظامی نے دیباچہ لکھا ہے۔ پندرہ چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے۔

(۳) بہارستان۔ اس پر منشی پریم چند نے دیباچہ لکھا ہے۔ یہ بھی چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے۔

(۴) و (۵) تہذیب کے تازیانے اور زہریلا آب حیات بنکم چندر چٹرجی کے بعض مضامین اور ناول کے ترجمے ہیں۔

(۶) عورت کی محبت ایک بنگالی مصنف کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۷) "بے گناہ مجرم" بنگالی اور فرنچ کتابوں سے لیا گیا ہے۔

(۸) سدا بہار پھول مختصر قصوں کا مجموعہ ہے۔

دیگر ناول نویس

فی زمانہ ناول نگاروں اور چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے والوں کی اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ ان کے نام بتانا بھی ایک امر محال معلوم ہوتا ہے۔ بہر طور اصحاب ذیل ان سب لوگوں میں زیادہ مشہور و ممتاز ہیں۔

(۱) حامد اللہ افسر میرٹھی جو علاوہ ایک عمدہ شاعر اور نقاد ہونے کے افسانے لکھنے میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی اکثر کتابیں سررشتہ تعلیم میں بھی داخل ہیں۔ ایک مجموعہ قصص جس میں ڈالی کا جوگ اور دیگر قصص شامل ہیں تیار ہو رہا ہے۔

(۲) مجنوں گورکھپوری (۳) احمد حسین خاں، ایڈیٹر "شباب" اردو

(۴) سید عابد علی۔ (۵) حکیم شجاع الدین۔

(۶) مولوی ظفر عمر صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس ممالک متحدہ۔ جاسوسی قصے لکھنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ آپ کے ناول "نیلی چھتری"، "بہرام کی گرفتاری" بہت مشہور و مقبول ہیں۔ ان کے علاوہ بعض قابل خواتین نے بھی اس فن کی طرف توجہ کی ہے اور صوبہ پنجاب سے بعض بہت دل چسپ قصے عورتوں کے لکھے ہوئے شایع ہوئے ہیں:-

منشی پریم چند

مہاشے سدرشن

باب ۱۸

اُردو ڈراما

اُردو ڈراما | اُردو ڈراما ایک غیر ملکی پودا ہے۔ جو سرزمین اُردو پر اُنیس صدی کے وسط میں نصب کیا گیا اور اب خوب جڑ پکڑ گیا اور نہایت تندرست اور تنومند معلوم ہوتا ہے۔

ڈراما کی عمومیت | محاکات یعنی نقالی کا شوق ہر قوم میں فطری ہے عام اس سے کہ وہ قوم ترقی کی معراج پر ہو یا بربریت اور گمراہی کے گڑھے میں پڑی ہو۔ نقالی انسانی فطرت میں داخل ہے البتہ بعض ممالک میں یہ جوش دبا دیا گیا اور بدعت کہلایا اہل اسلام اسی چیز یعنی نقالی کو جس میں ڈراما، بت تراشی، تصویر کشی۔ رقص اور موسیقی سب داخل ہیں ممنوع سمجھتے ہیں پس اُن کے ممالک میں فنون لطیفہ کی نشو و نما اور ترقی کو گویا بدعت یا انحراف سنت کی تاریخ سمجھنا چاہیے اسی وجہ سے فارسی سے اس قسم کے کوئی نمونے اُردو کو نہیں ملے۔ مگر خود فارسی اس نقالی کے جذبے سے محفوظ نہ رہ سکی وہاں ڈراما نے پیشن پلے (مرثیہ) کی صورت اختیار کر لی۔ جس میں میدان کربلا میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت پر اظہارِ رنج و غم کیا جانے لگا۔ مذہب جو زمانہ قدیم میں عنصر غالب تھا۔ اب ڈراما اور دیگر اصناف ادب کو ذریعہ تبلیغ قرار دینے لگا۔ اہل یورپ

اور اہل انگلستان کے مریکل پلے (ایسے سین جن میں معجزات دکھائے جاتے ہیں) جو قدیم کلیسائے مسیحی کے رسوم اور طریقۂ عبادت کے مظہر ہیں۔ اسی طرح سنسکرت اور ہندی کے مذہبی ڈراما جو پرانوں اور دیگر مذہبی کتب ہنود سے اخذ کیے گئے اور اوبرامرگو[1] کے پیشن پلے ان سب کا ماخذ وہی قدیم مذہبی اعتقادات ہیں۔ ہندوستان میں اب تک مذہب کا بہت بڑا اثر ڈراما پر ہے۔ پران اور دیگر مذہبی کتب کے قصّے ڈراما کی صورت میں آکر اپنے خوب صورت پردوں اپنی دل چسپ موسیقی اور اخلاقی نتائج سے اب بھی ہزاروں آدمیوں کے دل کشی اور تفریح کا باعث ہوتے ہیں۔

سنسکرت اور ہندی ڈراما نے اُردو پر کیوں نہیں اثر کیا

ہندوستان میں ڈراما درجۂ کمال تک پہنچ گیا تھا پس قدیم سنسکرت ڈراما کو جو اپنے عروج تک پہنچ گیا تھا۔ اردو ڈراما پر کچھ نہ کچھ ضرور اثر کرنا چاہیے تھا۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ جس طرح اُردو فن نظم سنسکرت کے اثر سے محفوظ رہا۔ اسی طرح فن ڈراما پر بھی اس کا کوئی اثر نہ پڑا۔ سنسکرت کے ان دونوں خزانوں سے اُردو نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جن کی وہ حقیقی وارث تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنسکرت ڈراما کا زرین دور گزر چکا تھا اور اب وہ ایک تن بے جان اور محض کتابوں میں محفوظ تھا۔ اس کے شاہکار ہندوستان کی دیسی زبانوں میں مفقود تھے۔ اس کا کھیل (ایکٹنگ) بھی موقوف ہو چکا تھا شروع میں بودھ مت اور جینی ڈراما کو ناپسند کرتے تھے مگر اس کا یہ فائدہ دیکھ کر کہ وہ ان کے دینی مسائل کے پھیلانے کا ایک اچھا ذریعہ ہے وہ بھی اس کی قدر کرنے لگے۔ اور بودھ مت کا ڈراما تو راجہ ہرش اور اشوک کے زمانہ میں بڑی ترقی کر گیا تھا۔ جب بودھ مت کو زوال اور برہمنوں کی ترقی ہوئی تو

---

[1] اوبرامرگو جرمنی میں ایک مقام ہے جہاں مقررہ اوقات پہ حضرت مسیحؑ کے حالات زندگی ناٹک کی صورت میں اسی طرح دکھائے جاتے تھے جس طرح ہمارے یہاں رام لیلا ہوتی ہے۔ ہزاروں آدمی اس مذہبی تماشے کے دیکھنے کو دُور دُور سے آتے تھے۔ معلوم نہیں کہ اس تہذیب و تمدن کے زمانے میں بھی اس قسم کا اجتماع ہوتا ہے یا نہیں۔

ڈراما اپنا پرانا عروج حاصل نہ کر سکا اس وجہ سے کہ غیر اقوام کے حملوں اور قوم کی مفلسی سے ملک میں ایک بے اطمینانی کی حالت پھیل گئی تھی۔ اب ڈراما کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہوگئی اور وہ اس کی پرانی شان و شوکت جاتی رہی۔ اور جب ادنٰے درجہ کے لوگوں نے ناٹک کی کمپنیاں کھول لیں تو ڈراما کی رہی سہی عزت جاتی رہی۔ ایکٹر لوگ قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھے جاتے تھے اور مضمون بھی ادنیٰ درجے کے بعض وقت فحش کی حد تک پہنچ جاتے تھے۔ اس زمانے میں اُردو اپنا جنم لے رہی تھی سنسکرت ڈراما محض ایک مکتوبی چیز رہ گیا تھا اور ہندی ڈراما ادنیٰ درجے کا اور ذلیل ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ اُردو زبان ابتدا ہی سے فارسی کے آغوش محبت میں آگئی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں نے سگی ماں کو کونے میں بٹھا دیا تھا۔ فارسی روایات فارسی محاورے فارسی تخیّل اُردو پر غالب تھے۔ فارسی ادیب اس نوزائیدہ بچے کو پیار کرتے تھے اور وہ فارسی تہذیب و تمدن کے سرچشمہ سے سیراب ہوتا تھا۔ سنسکرت ادیبوں کی غفلت اور بے توجہی کے سبب سے طفل زبان مسلمانوں ہی کی گود میں پلنے لگا۔ فارسی زبان دان سنسکرت سے ناواقف تھے۔ اسی وجہ سے سنسکرت ڈراما اور فن نظم دونوں بے اثر رہے۔ اگر یہ لوگ بھاشا اور سنسکرت کی قدر کرتے یا اگر پنڈت لوگ اُردو کی پرورش زیادہ محبت سے کرتے تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔ اور اُردو زبان اپنے اکثر نکتہ چینوں کو دنداں شکن جواب دیتی۔

اُردو ڈراما کے عناصر خمسہ مسٹر عبداللہ یوسف علی آئی۔ سی۔ ایس۔ نے ایک فاضلانہ مضمون میں اُردو ڈراما کے عناصر ترکیبی حسب ذیل قائم کیے ہیں:۔

(۱) قدیم سنسکرت ڈراما۔

(۲) اہل ہنود کے خالص مذہبی ناٹک یا مریکل پلے اور دیوتاؤں اور دیویوں کے حالات۔

(۳) وہ چیزیں جو ادنیٰ درجے کے لوگوں میں جاری ہیں مثلاً سوانگ نوٹنکی نقلیں وغیرہ۔

(۴) اسلامی نقلیں اور قدیم روایات

(۵) زمانہ موجودہ کا انگریزی ڈراما اور یورپین اسٹیج کی ترقیاں۔

سنسکرت ڈراما ہر چند کہ قدیم سنسکرت ڈراما کا اُردو ڈراما پر بہت کم اثر پڑا مگر پھر بھی بعض مشہور ناٹکوں کا ترجمہ اُردو میں ہو گیا ہے اور وہ کھیلنے کے قابل کر دیے گئے ہیں۔ تھوڑے عرصہ سے ڈراما کے پُرانے قواعد بھی استعمال میں آ رہے ہیں خاص کر وہ جو ابتدائی سین کے متعلق ہیں مثلاً ناٹک شروع ہونے سے پہلے ایک شخص جو سوتر دھار کہلاتا ہے مع اپنی بیوی کے اسٹیج پر آتا ہے اور تماشہ کے تمام واقعات کو مختصر طور پر بتلا دیتا ہے اور لوگوں کو آگاہ کر دیتا ہے۔ کہ اب اصلی کھیل شروع ہونے والا ہے۔ بدوشک یعنی مسخرے کا پاٹ بھی ضرور ہوتا ہے مگر اچھے تماشوں میں یہ بالکل علیحدہ رہتا ہے اور تماشہ کے اصل واقعات سے اس کو تعلق نہیں ہوتا۔

ہندو مریکل پلے وغیرہ اس قسم کے ناٹکوں نے بھی موجودہ اُردو ڈراما کے واسطے بہت کچھ مواد فراہم کر دیا ہے۔ ان کی نسبت اُردو کے ساتھ وہی ہے جو ہالنشیڈ[1] اور "ہال" کے پُرانے قصوں اور مورخ پلوٹارک[2] کی قدیم یونانی مشہور لوگوں کی سوانح عمریوں کی شیکسپیئر کے ناٹکوں کے ساتھ ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اُردو ڈراما کی ابتدا ہی اس قسم کی ہندی چیزوں سے ہوئی تھی۔ قدیم زمانہ سے ہندو لوگ رام اور کرشن کے مشہور واقعات زندگی کو تیوہاروں کے موقع پر مندروں میں ناٹک کی صورت میں لوگوں کو دکھایا کرتے تھے تاکہ وہ اپنے مذہبی روایات سے واقف ہوں، ان سے اچھی اچھی باتیں سیکھیں اور اپنے دیوتاؤں اور سورماؤں کے واقعات زندگی سے مفید سبق حاصل کریں۔ رامائن کے واقعات دسہرہ کے زمانے میں جب کہ رام چندر جی اپنے حریف راون پر فتح پاکر بھارت ورش میں واپس آئے تھے، اسی قسم سے

---

[1] یہ دونوں انگلستان کے قدیم مورخ سولہویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں۔ ان کے تاریخی قصوں کو جن کو کرانیکل کہتے ہیں شیکسپیئر نے اپنے تاریخی ڈراموں میں بہت مدد لی ہے۔ [2] مشہور یونانی مورخ جو ظالم شہنشاہ نیرو کا معاصر تھا۔ تقریباً ۴۶ء میں پیدا ہوا۔ اس کی کتاب "لائیوز" سوانح عمریاں زمانہ قدیم کی ایک مشہور اور مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ جس میں چھیالیس بڑے بڑے یونانی اور رومی مشاہیر کے حالات بالمقابلہ نہایت وضاحت سے لکھے گئے ہیں۔ اس کی دوسری کتاب موریلیا کئی رسالوں کا مجموعہ ہے ۱۲۔

ہیں اور آج کل ایسے ناٹک رام ناٹک اور رامائن کے نام سے مشہور ہیں اور مذہبی لوگوں اور علی الخصوص عورتوں کو بہت پسند آتے ہیں۔ اسی طرح کرشن جی کے عاشقانہ گیت بھی اُردو ڈراما کا جزو ہیں سچ پوچھیے تو جس قدر عاشقانہ اور جذباتی شاعری ہندی اور بنگالی میں بالفعل ہے اور اُس کا زیادہ تر حصہ کرشن اور رادھا کے عشق پر مبنی ہے۔ بہت سی دیسی کمپنیاں جو منڈلی کہلاتی ہیں متھرا اور بندرابن وغیرہ متبرک مقاموں سے چل کر راستے میں اپنے مذہبی گانوں اور تماشوں سے لوگوں کے دلوں کو محظوظ کرتی ہیں۔ ناچ اور گانا ان تماشوں کی جان ہے۔ اس قسم کی کمپنیاں دولتمند اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے نہیں بلکہ عوام الناس کی دل چسپی کے لیے ہیں۔ یہ لوگ جگہ جگہ کی سیر کرتے پھرتے ہیں جہاں پہنچنے ہی فوراً ایک اسٹیج تیار کر لیتے اور کپڑے اِدھر اُدھر سے مانگ جانچ کر مہیا کر لیتے ہیں۔ اپنے چہروں کو رنگتے اور چراغوں یا مشعلوں کی روشنی میں اپنے تماشے دکھاتے ہیں اور آخر میں دو دو چار چار پیسے لوگوں سے وصول کرتے ہیں۔ مولانا غنیمت کشمیری نے اپنی مشہور مثنوی "نیرنگ عشق" میں ان جماعتوں کا جن کو وہ بھگت باز کہتے ہیں خوب خاکہ اُڑایا ہے۔ غالباً انہیں جماعتوں سے واجد علی شاہ نے جو اپنے عیش پرستیوں کے لیے مشہور تھے۔ ناٹک کا پہلا سبق سیکھا ہوگا۔ اور وہ اُن کو بہت پسند آیا ہوگا۔ پھر انہوں نے ناٹک اور رہس خود قائم کر لیے جس میں وہ خود کنھیا اور ان کے محل کی عورتیں نہایت قیمتی اور زرق برق لباس میں گوپیاں بنا کرتی تھیں ہمارے نزدیک یہ ناچ اور گانا جو اُردو ڈراما کا جزو لاینفک ہے انہیں رہس منڈلیوں سے لیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ فرنچ اوپرا کا بھی اس پر کچھ اثر ہو کیونکہ واجد علی شاہ کے عہد میں ان کے یورپین دوستوں کی وجہ سے یہ وہاں مروّج ہو گیا تھا۔

سوانگ نقلیں وغیرہ سوانگ کی ہندوستان میں وہی حیثیت ہے جو "پیجنٹ" کی انگریزی ڈراما کی ترقی کے پیشتر انگلستان میں تھی۔ سوانگ ہندو تہواروں کے موقع پر جلوس اور باجوں کے ساتھ نکلتے ہیں۔ ان کو ابتدائی بھدی نقالی سمجھنا چاہیے۔ مگر عنصر ظرافت (کامک) ان میں ضرور پایا جاتا ہے۔ پرانے زمانے کے نقال یا مسخرے امیر لوگوں کی صحبت یا ملازمت میں رہتے تھے۔ اور اپنی

ظریفانہ باتوں اور نقلوں سے اپنے مالکوں کا دل خوش کیا کرتے تھے۔ نقالی اس زمانے میں ایک مشکل فن تھا جو خاص تربیت اور محنت سے آتا تھا، اور اس کی تکمیل کے واسطے گانا ناچنا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ نقالوں کی وہی حیثیت تھی جو انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ کے زمانے میں امرائے دربار کے مصاحبین اور ملازموں کی تھی جو جماعتوں میں نکلا کرتے تھے اور اپنے گانے بجانے اور مسخرے پن سے لوگوں کو خوش کرتے تھے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہی پھرنے والی نقال کمپنیاں عہد ایلزبتھ کے ترقی یافتہ ڈراما کی اصلی پیشرو تھیں۔ ہندوستان میں نقالوں کی جماعتیں طائفہ کے نام سے مشہور ہیں جو شادی بیاہ کے موقعوں پر بہ اجرت بلائے جاتے ہیں اور اپنے ناچ گانے اور مذاق کی باتوں سے سامعین کو محظوظ کرتے ہیں۔ انہیں پرانے زمانے کی نقلوں سے آجکل کے تماشوں کے کامک اور نقلیں ماخوذ ہیں۔

اسلامی نظمیں اور روایات یہ اُردو ڈراما کا عنصر غالب ہیں۔ نظم اُردو عاشقانہ رنگ اور ڈراما نگاری کے لیے ایک خاص استعداد اور موزونیت رکھتی ہے۔ قدیم ڈراما نہایت مؤثر پُردرد اونچے سُروں کی عاشقانہ نظموں میں ہوتے تھے۔ اُن کی نثر مقفّٰی اور شعر دونوں مؤثر ہیں۔ زبان اُردو بڑی زوردار چیز ہے۔ اس کا طرزِ ادا، اس کے صنایع بدایع نہایت دل کش اور قابل تعریف ہیں وہ رزم و بزم دونوں موقعوں کے لیے موزوں اور جذبات نگاری کے لیے بھی پوری طرح مناسب ہے۔

انگریزی اسٹیج اس کا اثر زمانۂ حال کے اُردو ڈراما پر سب سے زیادہ ہے۔ اُردو اسٹیج آج کل انگریزی ناٹکوں کے ترجموں سے بھری ہوئی ہے۔ اسٹیج کی وضع تھیٹر کی ساخت پردے لباس نشستوں کا طریقہ، تماشہ کے تقسیم۔ پارٹوں کا انتظام یہ سب بالکل انگریزی اصول کے مطابق اور اسی کے زیرِ اثر ہیں۔

اُردو ڈراما کے اقسام اُردو ڈراما مستقل تصانیف اور تراجم پر مشتمل ہے۔ اول الذکر کی تعداد نسبتاً کم ہے اور جو ہیں وہ کسی پولٹیکل یا سوشیل مبحث پر مبنی ہیں۔ تراجم کے ماخذ حسب ذیل ہیں

(۱) سنسکرت۔ (۲) انگریزی یا اور کوئی یورپی زبان بذریعہ ترجمہ انگریزی۔

(۳) فارسی قصّے (۴) دیسی زبانیں علی الخصوص بنگلہ ، مرہٹی اور زیادہ تر ہندی۔

قصّوں کے مضامین حسب ذیل چیزوں سے ماخوذ ہیں:۔

(۱) پوران اور ہندو دیومالا (۲) فارسی اور عربی قصّے۔ (۳) ہندوستان کے مشہور قدیمی روایتیں اور قصّے (۴) انگریزی قصّے (۵) مسائل حاضرہ یعنی کوئی پولٹیکل مسئلہ یا سوشیل خرابیاں۔

اُردو ڈراما پر شاہی درباروں کا اثر سب سے پہلا اُردو ڈراما اندر سبھا ہے جس کو امانت شاگردِ ناسخ نے تصنیف کیا تھا جو عہد واجد علی شاہ میں دربار شاہی سے تعلق رکھتے تھے اور مشہور ہے کہ یہ کتاب بادشاہ ہی کے حکم سے تیار کی گئی تھی۔ ایک ہندی شاعر نواز نامی نے فرخ سیر بادشاہ دہلی کے عہد میں مشہور و معروف شکنتلا ناٹک کا زبان برج بھاشا میں ترجمہ کیا تھا۔ مگر خود اس ترجمہ کو ڈراما سمجھنا غلطی ہے۔ اس وجہ سے کہ نہ تو یہ ترجمہ ایک صحیح ترجمہ ہے کیونکہ دوہوں کی صورت میں ہے اور نہ اس میں ڈراما کی شان باقی رہی کیونکہ اشخاص قصہ جس طرح کہ ڈراما میں دستور ہے آتے جاتے نہیں اور نہ اس میں کیرکٹر اور ایکشن کا کہیں پتہ ہے۔ اس وجہ سے نہ تو وہ ڈراما ہے اور نہ اس کا تعلق اُردو سے ہو سکتا ہے۔ جیسا اوپر مذکور ہوا، زمانہ شاہی میں نقالوں اور بھروپیوں کا بڑا رواج تھا۔ ان کی نقلوں سے لوگ خوش ہو کر ان کو انعام و اکرام سے مالا مال کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ محمد شاہ بادشاہ دہلی جو اپنے ناچ رنگ اور عشرت پرستیوں کی وجہ سے محمد شاہ رنگیلے کے نام سے مشہور رہیں، اپنے اسی قسم کے اشغال میں مصروف تھے کہ نادر شاہ کا حملہ دلّی پر ہوا۔ صحبت شاہی میں مُخل ہونے کے ڈر سے کوئی شخص اس بُری خبر کو اپنے مُنہ سے نہیں نکال سکتا تھا۔ مجبوراً ایک نقال کے ذریعہ سے یہ خبر بادشاہ کو پہنچائی گئی۔ نقلوں کی کوئی کتاب مرتب نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ حسب موقع فی البدیہ یا فرمائش سے فوراً تیار کرلی جاتی تھیں۔ لکھنؤ جو بادشاہان اودھ کا دارالسلطنت تھا عیش و عشرت کا مرکز بنا ہوا تھا، اور

---

[1] دیکھیے فٹ نوٹ صفحہ ۱۸۳۔

علی الخصوص واجد علی شاہ کا زمانہ تو دولت و ثروت، شوکت و عشرت کا بہترین دور تھا۔ اس زمانے کی ان الفاظ میں کیا اچھی تصویر کھینچی گئی ہے۔ "وہاں دولت، خوشحالی، فارغ البالی، ناچ رنگ گانے بجانے کے ہر طرف جلسے تھے۔ عاشق مزاج خوش رو جوانوں اور حسین مہ جبین نازنینوں کے جمگھٹے تھے۔ زندگی اس مزہ سے گزرتی تھی جس طرح پھولوں کے تختے پر باد بہاری چلتی ہے۔ ہر طرف سُریلی آوازوں سے کان لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ خیالی پرستان جس کو کوہ قاف کہتے ہیں اس سچ مچ کے پرستان کے آگے جہاں ہزاروں لاکھوں آدمی اپنی زندگی نہایت بے فکری اور عیش و عشرت میں گزارتے تھے۔ مات تھا۔ شاہزادے اور رؤسا امراء جو شادمانی اور کامرانی کے مجسم تصویریں تھے اور ان کو دیکھ کر دنیاوی جاہ و جلال اور مال و منال کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا۔" اسی دربار میں اُردو ڈرامانے جنم لیا۔ بادشاہ اور ان کے وزراء اور مصاحبین اپنی مسرت اندوزیوں کے نت نئے طریقے سوچا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک فرانسیسی نے جو دربار شاہی سے متوسل تھا اوپرا کی تجویز پیش کی جس کا اس زمانے میں یورپ میں عروج ہو رہا تھا۔ جو فوراً منظور کر لی گئی، اس وجہ سے کہ اس میں صدہا حسین و مہ جبین گائنوں کے لیے جس سے دربار بھرا ہوا تھا۔ ایک اچھا مشغلہ نکل آیا اور امانت کو اسی قسم کا ایک تماشہ لکھنے کا حکم ہوا۔

اندر سبھا امانت امانت نے ۱۲۷۰ھ (مطابق ۱۸۵۳ء) میں اپنی کتاب اندر سبھا تیار کی جو کامیڈی ہے اور چونکہ اس میں گانا اور ناچ بھی شامل ہے لہذا موسیقی دار کامیڈی ہے جو اوپرا کی ایک قسم ہے۔ جونہی یہ کتاب تیار ہوئی۔ اس کے واسطے لکھنؤ کے مشہور محل قیصر باغ میں ایک اسٹیج آراستہ کیا گیا۔ مشہور ہے کہ بادشاہ خود تماشہ میں شریک ہوتے اور راجہ اندر بنتے تھے اور پریوں کا پارٹ خوب صورت حسین عورتیں کرتی تھیں جو پر تکلف اور قیمتی لباس اور جواہرات سے آراستہ ہوتی تھیں۔ ان تماشوں میں کسی غیر آدمی کے جانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ مسئلہ کہ آیا اُردو ڈراما کی ترقی میں یورپ والوں نے کوئی حصہ لیا یا نہیں ہنوز مابہ النزاع ہے۔ مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم اس کو نہیں مانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی یورپین نے اُردو ڈراما کی ترقی میں حصہ

نہیں لیا۔ یہ معاملہ تاریکی میں چھپا ہوا ہے اور اس زمانہ کی کوئی معتبر تاریخ ایسی نہیں ملتی جس سے اس پر کافی روشنی پڑ سکے مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یورپین لوگوں نے اُردو ڈراما کو زمانۂ حال کے مطابق بنانے اور اسٹیج کے ساز و سامان اور تیاری میں کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور لیا ہوگا۔ نور الٰہی اور محمد عمر صاحبان نے اپنی کتاب ناٹک ساگر میں بہت سے دلائل مولانا شرر مرحوم کے جواب میں پیش کیے ہیں، مولانا واجد علی شاہ کے دربار میں یورپین لوگوں کی موجودگی خود واجد علی شاہ کو نئی چیزوں کا شوق اندر سبھا کی اندرونی شہادت وغیرہ وغیرہ اور اس کے علاوہ خورشید جی بالی والا جو اس زمانے میں ایک مشہور ایکٹر تھے۔ ان کا قول بھی اس کی تائید میں نقل کیا ہے مگر حق یہ ہے کہ بالیقین یہ نہیں کہا جا سکتا کہ واجد علی شاہ تماشہ میں کچھ حصّہ لیتے تھے۔ یا کہ اندر سبھا کا تماشہ قیصر باغ میں ہوا تھا یا امانت نے یہ کتاب بادشاہ کے حکم سے لکھی تھی یا نہیں[1]۔

---

[1] مکرمی سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم۔ اے اُردو لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی نے اپنے ایک فاضلانہ مضمون میں جو رسالہ "اُردو" میں چھپ چکا ہے۔ یہ ثابت کر دیا ہے کہ اندر سبھا نہ تو واجد علی شاہ کے حکم سے لکھی گئی نہ اس کا کھیل کبھی قیصر باغ میں ہوا اور نہ بادشاہ کبھی اس میں شریک ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ امانت نے اس کتاب کی شرح میں (جو ان کے پاس موجود ہے) یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب ان کے (امانت کے) ایک شاگرد کے کہنے سے لکھی گئی اور اس کے ایکٹنگ کا طریقہ نہایت دلچسپ اور مفصل طریقے سے بیان کیا ہے۔ بادشاہ کا راجہ اندر بننا بالکل بے اصل ہے۔ اس وجہ سے کہ بادشاہ کو رہس کا بڑا شوق تھا چنانچہ اُن کی تصانیف میں اس طرح کی چیزیں بکثرت پائی جاتی ہیں جس میں وہ مختلف پارٹ مختلف لوگوں کو تقسیم کر دیتے تھے جن کے نام بھی بتا دیے گئے ہیں۔ مگر یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ رہسوں میں کنہیا کا پارٹ بجائے مرد کے ہمیشہ وہ کسی عورت کو دیتے تھے اور خود کبھی نہیں بنتے تھے۔ جب رہس میں کنہیا کا پارٹ خود انھوں نے کبھی نہیں لیا۔ تو بعید از عقل ہے کہ وہ راجہ اندر بنتے ہوں۔ اندر سبھا پر یورپین اثر کے متعلق مولانا شرر مرحوم اور سید مسعود حسن صاحب دونوں کی قطعی رائے ہے کہ فرانسیسیوں نے اس میں کچھ نہیں کیا۔ اگر لفظ پردہ سے اس کا ثبوت دیا جائے تو تصویر دار پردے جو سین کہلاتے ہیں اور تھیٹروں میں مروج ہیں جو بیشک یورپ کی نقل ہیں وہ رہس یا اندر سبھا میں کبھی استعمال نہ ہوتے تھے۔ البتہ معمولی پردے چادروں کی وضع کے ڈال دیے جاتے تھے تاکہ تماشائیوں اور تماشا گروں میں ایک قسم کا پردہ ہو جائے اور یہ بہت قدیم رسم ہے۔ اس کو یورپین اثر سے کچھ تعلق نہیں۔ ۱۲ مترجم۔

اندر سبھا کا پلاٹ بہت معمولی ہے۔ کتاب راجہ اندر کی سبھا یعنی دربار کے سین سے شروع ہوتی ہے اور قصہ اس قدر مشہور ہے کہ اس کو یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں وہ شائع ہوتے ہی بہت مقبول ہوئی اور اس کی مقبولیت کا سبب ظاہر ہے یعنی یہ کہ ابتدائی دھنیں اس کی شعروں اور گیتوں کی بڑے بڑے اُستادوں نے قائم کی تھیں اور اس کا سامان ظاہری یعنی پردے لباس وغیرہ نہایت پُر تکلف تھا۔ اس کی کامیابی دیکھ کر مداری لال نے ایک دوسری اندر سبھا لکھی جو ادبی حیثیت سے تو امانت کی اندر سبھا کی برابر نہیں ہے۔ گو ڈراما کی حیثیت سے اس کے برابر یا اس سے بڑھ کر ہو۔ بعد کے زمانے میں جب تھیٹریکل کمپنیوں کا رواج ہوا تب بھی اندر سبھا کی مقبولیت میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا اور اس کو لوگ اور تماشوں سے ہمیشہ بہتر سمجھتے تھے۔ اس کی مقبولیت اِس سے ظاہر ہے کہ وہ دیوناگری۔ گجراتی۔ گورمکھی اور اور مختلف زبانوں میں ترجمہ کی گئی اور اس کے کم سے کم چالیس ایڈیشن انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ اس کا ترجمہ جرمن میں بھی ہوا۔ جو بمقام لیپزگ سنہ ۱۸۹۲ء میں شایع ہوا۔ اب سُنا جاتا ہے کہ ایک نہایت عمدہ اور تنقیدی ایڈیشن اندر سبھا کا لاہور سے نکلنے والا ہے۔

اُردو ڈراما اور پارسی ابتدا میں ہندو دیومالا کے قصے بطور تماشے کے دکھلائے جاتے تھے۔ ان کو دیکھ کر چند پارسی نوجوانوں کے دل میں خیال آیا کہ کچھ قدیم ایرانی قصے جس میں رستم و سہراب وغیرہ کا ذکر ہو عجلت کے ساتھ تیار کیے جائیں اور جھوٹ موٹ کے اسٹیج پر لوگوں کو دکھائے جائیں۔ ان تماشوں کو ایسے لوگوں نے بھی دیکھا جو یورپی تھیٹر دیکھ چکے تھے اور ان کی نسبت اچھی رائے ظاہر کی۔ چند امیر پارسیوں نے جو کاروباری قابلیت رکھتے تھے۔ اس کام کی اہمیت کو سمجھ کر چند کمپنیاں بڑے بڑے شہروں میں مثلاً دہلی۔ کلکتہ اور بمبئی میں انگریزی تھیٹر کی نقل میں قائم کیں سب سے پہلی کمپنی سیٹھ پسٹن جی فرام جی کی تھی جن کو اُردو اسٹیج کا ابوالآبا سمجھنا چاہیے۔ یہ اُردو خوب جانتے تھے۔ بلکہ شعر بھی کہتے تھے۔ رنگ اور پروین تخلص کرتے تھے اور نواب علی نفیس سے اصلاح لیتے تھے۔

اوریجنل تھیٹریکل کمپنی رونق بنارسی

ان کی کمپنی کا نام اوریجنل تھیٹریکل کمپنی تھا جس میں یہ خود بھی بہت عمدہ ایکٹ کرتے تھے اور خورشید جی بالی والا کاؤس جی کھٹاؤ سہراب جی اور جہانگیر جی مشہور ایکٹر تھے۔ تماشوں کی زبان اُردو بھی مگر لکھنؤ اور دلی کی خالص اور عمدہ اُردو نہیں، بلکہ ایسی زبان جو عام لوگوں کی سمجھ میں آسکے۔ کمپنی چونکہ تاجرانہ غرض سے قائم ہوئی تھی لہذا تماشوں میں وہی زبان استعمال کی جاتی تھی جو بمبئی، گجرات بنگال غرضکہ تمام صوبجات ہندوستان میں بخوبی سمجھ میں آسکے۔ تماشے اندرسبھا کی تقلید میں نظم میں ہوتے تھے۔ نیز اس وجہ سے کہ کانوں کو خوش آیند معلوم دیں۔ اس زمانے کے ڈراما نگار رونق بنارسی اور میاں حسینی متخلص بہ ظریف تھے۔ رونق بمبئی میں رہتے تھے۔ اور انگریزی تماشوں سے بھی ترجمہ کرتے تھے۔ ان کا ایک تماشا "انصاف محمود شاہ" زبان گجراتی میں ۱۸۸۲ء میں بھی بمبئی سے چھپ کر شایع ہوا تھا۔ ظریف کے بہت سے تماشے ہیں جن میں نتیجہ عصمت۔ خدا دوست۔ چاند بی بی۔ بُلبُل بیمار وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ جب فرام جی بانی کمپنی کا انتقال ہوگیا تو بالی والا اور کاؤس جی نے اپنی اپنی کمپنیاں علیحدہ قائم کرلیں۔

وکٹوریہ ناٹک کمپنی طالب بنارسی

یہ کمپنی خورشید جی بالی والا کی قائم کردہ تھی۔ اور اس کا تھیٹر ۱۹۱۱ء کے مشہور دربار دہلی کے موقع پر موجود تھا۔ خورشید جی خود ایک بہت بڑے مشہور ایکٹر تھے اور اس فن میں ان کو کمال حاصل تھا۔ اور کامک پارٹ علی الخصوص خوب کرتے تھے۔ ان کی ایکٹنگ میں کسی قسم کا بازاری پن یا تکلف اور آورد نہیں معلوم ہوتی تھی اور نہ ان کو شرم اور جھجک تھی جس سے شیکسپیئر بھی مرعوب ہوجاتا تھا۔ ان کو اسٹیج پر دیکھتے ہی لوگ ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ ان کی کمپنی میں مشہور ایکٹر یہ تھے۔ رستم جی۔ مس خورشید۔ مس مہتاب۔ اور ایک یورپین مس میری فنٹن جو ہندستانی چیزیں بھی خوب گاتی تھی۔ یہ کمپنی ایک زمانہ میں انگلستان بھی گئی تھی مگر اس کا وہاں بہت بڑا نقصان ہوا۔ جو آخر میں بمبئی میں پورا کرلیا گیا۔

طالب[1] بنارسی

منشی بنایک پرشاد طالب بنارسی اس کے ڈراما نگار تھے۔ طالب شعر بھی کہتے تھے۔

---

[1] ولادت ۱۸۵۵ء۔ وفات ۱۹۱۹ء۔ (فاضل)

اور راسخ دہلوی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے فن ڈراما کو ترقی دی اور اس کی زبان اور مضامین کو بھی درست کیا۔ ان کا انتقال ۱۹۱۳ء میں ہوا۔ ان کا ایک ڈراما لیل ونہار ہے جو لارڈ لٹن کی اسی نام کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس میں مترجم نے اصل کتاب کی خوب صورتی کو بہت کچھ قائم رکھا ہے ان کی دیگر تصانیف یہ ہیں۔ وکرم ولاس۔ دلیر دل شیر۔ ناتواں۔ نگاہ غفلت۔ ہریشچندر۔ گوپی چند۔

الفرڈ تھیٹریکل کمپنی احسن لکھنوی

وکٹوریہ کمپنی کے مقابلہ میں الفرڈ تھیٹریکل کمپنی قائم ہوئی جس کو کاؤس جی کھٹاؤ نے قائم کیا تھا۔ برخلاف خورشید جی کے یہ ایک بڑے کارک ایکٹر تھے۔ کاؤس جی ایک مشہور ٹراجک ایکٹر تھے۔ یعنی جذبات درد وغم دکھانے کے استاد تھے۔ ان کو لوگ ہندوستان کا ارونگ کہتے تھے جو حق بجانب ہے۔ یہ شیکسپیر کے رومیو اور ہیملٹ کا پارٹ خوب کرتے تھے اور مثل خورشید جی کے یہ بھی کامل الفن تھے۔ مرض ذیابیطس میں بمقام لاہور ۱۹۱۶ء میں انتقال کیا۔ ان کی کمپنی کے مشہور ایکٹر منچیر شاہ۔ مگر علی خاں۔ مادھو رام ماسٹر موہن۔ ماسٹر منچیر جی مس زہرہ اور مس گوہر تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے جہانگیر جی نے تھیٹر چار پانچ سال تک چلایا۔ اور پھر کلکتہ کے مشہور تاجر مسٹر میڈن کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ میڈن کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوا۔

احسن لکھنوی[1]

الفرڈ کمپنی کے سب سے پہلے ڈراما نگار احسن لکھنوی تھے۔ جن کا نام سید مہدی حسن ہے اور حکیم نواب مرزا شوق مشہور مصنف زہر عشق و بہار عشق وغیرہ کے نواسے ہیں۔ احسن صاحب نہ صرف ایک کامل ڈراما نگار بلکہ ایک شاعر خوش گو اور بہت اچھے موسیقی داں بھی ہیں۔ ان کی ڈراماؤں کی زبان نہایت فصیح اور بامحاورہ ہوتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ زبان داں ہیں۔ ان کی ایک مشہور تصنیف واقعات انیس ہے۔ جس میں میر انیس مرحوم کے حالات زندگی نہایت صحت اور عمدگی کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ ڈرامٹک تصانیف یہ ہیں۔ فیروز گلنار۔ چندراولی۔ دل فروش۔ بھول بھلیاں۔ بکاولی اور چلتا پرزہ۔

---

[1] ولادت ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۹ء۔ وفات ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء۔

بے تاب دہلوی احسن کے بعد الفریڈ کمپنی کی ڈراما نگاری کی خدمت پنڈت نراین پرشاد بے تاب دہلوی کو سپرد ہوئی جو پنڈت ڈ ہلا رائے کے بیٹے اور فن شعر میں سردار محمد خاں طالب شاگرد غالب کے شاگرد ہے۔ کبھی کبھی اپنا کلام نظیر حسین سخا کو بھی دکھاتے تھے۔ یہ کمپنی میں باقاعدہ کام کرتے تھے اور بمبئی میں رہتے تھے۔ ایک رسالہ موسوم بہ شیکسپیئر نکالتے تھے۔ جس میں استادِ زمانہ کے مشہور ڈراموں کا ترجمہ چھپتا تھا یہ اب بند ہو گیا ہے۔ تصانیف حسب ذیل ہیں:-

قتل نظیر۔ مہابھارت۔ زہری سانپ۔ فریب محبت۔ رامائن۔ گورکھ دھندا۔ پتنی پرتاب۔ کرشن سداما۔ "قتل نظیر" پہلا تماشہ تھا جو بے تاب نے کمپنی کے واسطے تیار کیا تھا۔ اس کی مقبولیت کی شاید یہ وجہ بھی ہو کہ اس زمانے میں دلی ایک رنڈی نظیر نامی مار ڈالی گئی تھی جس کا چرچا لوگوں میں پھیلا ہوا تھا۔ "مہابھارت" کا تماشا سب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں بمقام دہلی دکھلایا گیا جو بہت مقبول ہوا اور اب بھی لوگ اس کو بہت پسند کرتے ہیں۔ بے تاب اس میں بڑی مہارت رکھتے ہیں کہ مہابھارت وغیرہ ہندوؤں کے مذہبی کتابوں سے جو دلچسپ واقعات کا خزانہ ہیں ضروری ضروری دلچسپ واقعات چن لیتے ہیں اور ان کو نہایت عمدہ اور دل فریب طریقے سے ڈراما کا جامہ پہناتے ہیں۔ ان کو ہندی میں بھی بڑا عبور ہے اور ان کے ہندی دوہے اور گیت نہایت شیریں اور موثر ہوتے ہیں۔ انہوں نے متعدد تاریخی واقعات کو مثلاً درو پدی کا مہاراج سری کرشن جی کی خون بہتی انگلی باندھنے کے واسطے اپنی ساری پھاڑ ڈالنا اور ریبوا اور چیتا چاروں کا قصہ وغیرہ نہایت استادی اور حسن سے اپنے ڈراموں میں باندھا ہے۔ وہ سین جس میں ساری پھاڑنا دکھایا گیا ہے بعض نکتہ چیں اس کو خلاف قواعد فن اور خلاف تہذیب خیال کرتے ہیں مگر اس میں کوئی قباحت نہیں بلکہ اس سے انتہا درجے کا اعتقاد اور محبت اور سری مہاراج کی عظمت کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ ایک اور اعتراض ان کے تماشوں پر یہ کیا جاتا ہے کہ جنت و دوزخ وغیرہ بھونڈے پن اور دقیانوسی طریقے پر دکھلاتے جاتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کی زبان بھی ایک حد تک ضرور قابل اصلاح و ترقی ہے۔ ان کے یہاں نثر مقفیٰ کی بہتات ہے جو بعض وقت بہت بری معلوم ہوتی ہے اسی طرح ہندی اور سنسکرت الفاظ

فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ بہت بُرے اور بے میل معلوم ہوتے ہیں اور کانوں پر گراں گزرتے ہیں۔ اشعار بھی موقع وبے موقع مکالمے میں استعمال ہوتے ہیں اور بعض وقت رنج وغصہ کے موقع پر بھی شعر ہی پڑھے جاتے ہیں جو بالکل خلاف فطرت چیز ہے۔ مگر باوجود سب کمیوں کے بے تاب نے ڈراما نگاری میں توسیع اور ترقی ضرور کی بعض مخالفین یہ بھی کہتے ہیں بے تاب چونکہ آریہ سماج سے تعلق رکھتے ہیں ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جو سناتن دھرمیوں کو ناگوار اور ناپسند ہوتی ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ ان کے تماشوں کی شہرت زیادہ تر اس وجہ سے بھی ہوئی کہ مشہور حسین عورتیں اس میں تماشہ کرتی تھیں۔ مختصر یہ کہ بیتاب کے جذبات عمیق اور ان کے کیرکٹر زبردست ہوتے ہیں اور وہ اصولِ ڈراما کو خوب سمجھتے ہیں۔

نیو الفرڈ کمپنی۔ آغا حشر کشمیری ایک شخص محمد علی ناخدا نامی نے ایک دوسری کمپنی الفرڈ کمپنی کے طرز پر کھولی اور اس کا نام الفریڈ رکھا۔ مشہور کامک ایکٹر سہراب جی اس کے منیجر تھے جو بعد کو شریک بھی ہو گئے۔ یہ کمپنی اِدھر اُدھر پھرا کے آخرکار احمد آباد میں مستقل طور سے قائم ہو گئی۔ عباس علی جو بعد کو جوبلی کمپنی میں چلا گیا اور امرت لال کیشو اس کے مشہور ایکٹر تھے۔ امرت لال کا مس گوہر کے ساتھ تعلق ہو گیا تھا اور یہ دونوں آدمی آخر میں پارسی ناٹک منڈلی میں چلے گئے۔ جس کے مالک فرام جی اپّو نے امرت لال کو اپنی کمپنی کا منیجر بنا لیا۔ اور امرت لال نے چند اور آدمیوں کی شرکت سے اپنا ڈراما امرت نکالا۔ امرت لال کا انتقال اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے عین جوانی میں ہو گیا۔

آغا حشر[1] کشمیری آغا حشر کشمیری الاصل ہیں۔ مگر عرصہ سے ان کا خاندان بنارس میں مقیم ہے اور شال کی تجارت ہوتی ہے۔ حشر کی ولادت امرتسر میں ہوئی۔ وہ نہایت ذکی الطبع آدمی ہیں۔ انہوں نے بہت سے تماشے نیو الفریڈ کے واسطے تحریر کیے جن کے پلاٹ زیادہ تر یوروپی ڈراموں سے لیے گئے اور کچھ ڈرامے اُن کی مستقل تصانیف بھی ہیں۔ نیو الفریڈ سے

[1] ولادت ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) وفات ۱۳۵۴ھ (۱۹۳۵ء)

ترکِ تعلق کے بعد انہوں نے اپنی ذاتی کمپنی موسوم بہ شیکسپیر تھیٹریکل کمپنی کھولی جو نقصان اُٹھا کر تھوڑے ہی دنوں میں بمقام سیالکوٹ بند ہو گئی۔ اس کے بعد حشر کلکتہ چلے گئے اور میڈن کے یہاں ایک معقول تنخواہ پر فلم ایکٹر ہو گئے۔ مگر اب بھی وہ کبھی کبھی کچھ لکھتے رہتے ہیں بعض مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

شہید ناز۔ مرید شک۔ اسیر حرص۔ ترکی حور خوب صورت بلا۔ سفید خون وغیرہ بعض ہندی ڈرامے بھی لکھے۔ مثلاً سور داس۔ سیتا بن باس۔ گنگا اَوتَرن وغیرہ۔

آغا حشر کو لوگ اُردو ڈراما کا مارلو کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے یہاں مارلو کا رنگ بہت ہے وہ اپنے کیرکٹروں میں وفور جذبات دکھاتے ہیں۔ ان کا عشق بہت گہرا ہے اور ان کے جذبات بہت عمیق ہیں۔ وہ نثر و نظم دونوں کے استاد ہیں اور ان کا انداز بیان اس جگہ خوب معلوم ہوتا ہے جبکہ دو کیرکٹروں سے جو ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں آپس میں مکالمہ کراتے ہیں۔ اس قسم کے سین آپ کو اسیر حرص، خوب صورت بلا اور سور داس میں ملیں گے۔ آغا حشر کی ڈرامانگاری میں عیوب بھی وہی ہیں جو مارلو میں ہیں۔ یعنی جذبات کی شدت نہ کہ لطافت فوق البھڑک رنگ بجائے اس کے کہ رنگ ہلکے ہوں اور ان میں تناسب کا خیال ہو۔ ان چیزوں کا اثر نازک اور حساس دماغ پر بہت پڑتا ہے علی الخصوص ایسے سین جن میں قتل و غارت گری وغیرہ دکھائی جاتی ہے۔ آغا حشر پر یہ بھی اعتراض ہے کہ ایک ہی تماشے میں دو مختلف پلاٹ قائم کرتے ہیں جس سے توجہ منتشر ہو جاتی ہے اور خاتمہ میں کمزوری اور بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر جگہ شعر کو ایکشن پر ترجیح دیتے ہیں یا اشعار کو محض حسن بیان کے طور پر لکھتے ہیں۔ جو اصولی ڈرامہ نگاری کے خلاف ہے۔ کبھی کبھی واہیات اور سوقیانہ دل لگی اور مذاق شامل کیا جاتا ہے جس سے سین کا اثر جاتا رہتا ہے۔ بعض اوقات بیان واقعات میں عجلت کی جاتی ہے جس سے ایکشن پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ مگر باوجود ان تمام عیوب کے آغا صاحب ایک مشہور شخص ہیں اور ان کی تصانیف اُردو ڈراما میں اعلےٰ درجہ رکھتی ہیں۔

دوسری کمپنیاں مذکورۂ بالا کمپنیوں کے علاوہ جو کمپنیاں قائم ہوئیں اُن میں سے بعض مشہور کے نام ہم یہاں لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی۔ گزشتہ صدی کے آخر میں قائم ہوئی تھی ۱۹۰۱ء میں لاہور میں جل گئی۔ مگر اپنے مالک آر دشیر جی کی قابلیت اور حسنِ انتظام کی وجہ سے پھر دوبارہ قائم ہوئی۔

(۲) جوبلی کمپنی دہلی۔ اس کو دلّی کے ایک امیر آدمی نے عباس علی ایکٹر کے زیرِ اہتمام قائم کیا تھا۔ اس میں عباس علی گلرو زربہ اور جامِ جہاں نما میں پارٹ کرتے تھے۔

(۳) بھارت دیاکل کمپنی میرٹھ۔ اس میں بدھ بھگوان کا تماشہ خوب ہوتا تھا۔ تھوڑے عرصہ کے قیام کے احمد آباد میں ختم ہو گئی (۴) امپریل کمپنی اور

(۵) لائٹ آف انڈیا۔ ان میں حافظ محمد عبداللہ اور مرزا نظیر بیگ اکبر آبادی تماشہ کرتے تھے حافظ عبداللہ کے بعض تماشوں کے نام یہ ہیں۔ جشنِ پرستان۔ انجامِ ستم۔ ستم ہامان وغیرہ اور مرزا نظیر بیگ نے نلدمن۔ بہارِ عشق۔ فسانۂ عجائب۔ ماہی گیر وغیرہ لکھے۔

آخر انیسویں صدی کے مشہور ڈراما نویس علاوہ مذکورۂ بالا ڈراما نویسوں کے اس زمانے کے بعض ڈراما نویس جن کی تصانیف کتب خانۂ انڈیا آفس میں محفوظ ہیں یہ ہیں۔ غلام حسین ظریف مصنف انجامِ سخاوت ۱۸۸۹ء۔ محمد عبدالوحید قیس جنہوں نے انجامِ نیک و بد اور طلسمِ پرستان لکھا۔ فقیر محمد تیغ مصنف انجام الفت و بے نظیر و بدرِ منیر۔ فیروز شاہ خاں مصنف بھول بھلیاں ترجمہ شیکسپیئر۔ احمد حسن وآفر مصنف بلبلِ بیمار۔ میر کرامت اللہ۔ میر عبدالماجد و مقصود علی۔ امداد علی مصنف البرٹ بل (اردو میں سب سے پہلا سیاسی ڈراما) جہانگیر ترجمہ ہیملٹ۔

شروع بیسویں صدی کے بعض ڈراما نویس (۱) منشی غلام علی دیوانہ الگزنڈرا تھیٹریکل کمپنی میں ہیں تائید یزدانی اور مہر جبیں ان کے تماشے ہیں۔

(۲) منشی محمد ابراہیم محشر انبالوی۔ حشر کے شاگرد ہیں اور آتشیں ناگ۔ نگاہِ ناز۔ خود پرست وغیرہ کے مصنف ہیں۔

(۳) منشی رحمت علی مصنف دردِ جگر، باوفا قاتل وغیرہ پہلے البرٹ تھیٹریکل کمپنی کے مینجر تھے۔ اب پارسی تھیٹریکل کمپنی کے ڈائرکٹر ہیں۔

(۴) دوارکا پرشاد اُفق مصنف رام ناٹک جو ایک بہت طویل ڈراما ہے۔

(۵) مرزا عباس مصنف نورجہاں۔ شاہی فرمان وغیرہ

(۶) آغا شاعر دہلوی شاگرد داغ۔ مصنف حورِ جنت

(۷)، و (۸) لالہ کشن چند زیبا۔ لالہ نانک چند ناز۔ یہ دونوں پنجابی ہیں اور اکثر ڈراموں کے مصنف ہیں جن میں غیر مانوس ہندی الفاظ کی کثرت ہے۔

(۹) لالہ کنور سین ایم، اے چیف جسٹس ہائی کورٹ کشمیر سابق پرنسپل لا رکالج لاہور۔ ڈراما کے مشہور نقاد ہیں۔ ان کا ڈراما برہانڈ ناٹک بہت عمدہ ہے اس میں آسمانی ستاروں کے کیرکٹر دکھائے گئے ہیں۔

(۱۰) بشمبر سہائے بیاکل مصنف بدھ دیو جو بہت مقبول ہوا۔ اس میں شانتی رس یعنی قلبی اطمینان کی بہترین تصویر کھینچی ہے۔ یہ اُن عیوب سے پاک ہے جو اُردو کے اکثر ڈراموں میں پائے جاتے ہیں۔ بیاکل کمپنی کے روحِ رواں تھے جو میرٹھ میں قائم ہوئی تھی اور ایک زمانے میں شمالی ہندوستان کی کمپنیوں میں بہت مشہور تھی اور اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اکثر ایکٹر پڑھے لکھے اور اچھے طبقے کے لوگ تھے۔ علی اطہر اس کمپنی کا ایک مشہور ایکٹر تھا۔ منشی جوالا پرشاد ماتل دہلوی۔ ایڈیٹر رسالہ زبان نے اس کمپنی کے واسطے دو تماشے چندر گپت اور تیغ ستم تیار کیے تھے۔

(۱۱) حکیم احمد شجاع بی، اے۔ اسسٹنٹ سکرٹری لیجسلیٹو کونسل پنجاب و ایڈیٹر رسالہ ہزار داستان ایک اچھے افسانہ نگار اور ڈراما نویس ہیں۔ باپ کا گناہ۔ بھارت کا لال۔ جانباز وغیرہ کے مصنف ہیں مگر ان کے ڈراما اسٹیج پر اچھے نہیں معلوم ہوتے

(۱۲) سید امتیاز علی بی، اے مصنف انارکلی، دولہن وغیرہ۔ بالفعل ریسین کے الگزنڈر کا ترجمہ کر رہے ہیں۔

(۱۳) سید دلاور علی شاہ مصنف پنجاب میل۔ معمولی ڈراما ہے۔

(۱۴) خان احمد حسین مصنف حسن کا بازار وغیرہ

(۱۵) رادھے شام اکثر مذہبی ڈرامے لکھتے ہیں جو اہل ہنود میں بہت مقبول ہیں۔

(۱۶) سُدرشن جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

ادبی، سیاسی اور سوشل ڈراما اُردو میں ادبی ڈراموں کی بہت قلت ہے۔ مگر پھر بھی حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔ میکفرسن اور روسی اور قاسم و زہرہ مؤلفہ شوق قدوائی۔ شہید وفا، مولانا شرر مرحوم۔ کرم ادبی مترجمہ مولوی عزیز مرزا مرحوم۔ روس و جاپان مولفہ مولوی ظفر علی خاں۔ تسخیر فرانس جو شیکسپیئر کے ہنری خامس کا ترجمہ ہے اور جولیس سیزر مترجمہ سید تفضل حسین نصیر۔ منشی جوالا پرشاد برق نے شیکسپیئر کے اکثر ناٹکوں کے ترجمے جس میں معشوقہ فرنگ رومیو جیولٹ کا منظوم ترجمہ ہے۔ بیداری مولفہ حکیم اظہر صاحب ایڈیٹر تحریک۔ ان کے علاوہ منشی محمد عمر صاحب مترجم ہائی کورٹ جموں کشمیر اور منشی نور الٰہی نے جو ناٹک ساگر کے مشہور مصنف ہیں جو تمام ملکوں کے ڈراما کی ایک مبسوط گو کسی قدر نامکمل تاریخ ہے اور اس سے اس باب میں بہت کچھ مل گئی ہے۔ اکثر مفید اور دلچسپ ڈراموں کا ترجمہ اُردو میں کیا ہے۔ ان کی یہ کوشش نہایت قابل تعریف ہے اور ان دو اصحاب کو اس فن میں خاص مہارت ہو گئی ہے اور ہم کو اُمید ہے کہ زیادہ تجربے کے ساتھ یہ زبان پر پوری قدرت اور فن ڈراما نگاری میں عبور حاصل کر لیں گے۔ ان کی بعض تصانیف حسب ذیل ہیں۔

(۱) روح سیاست۔ جس میں امریکہ کے مشہور پریسیڈنٹ ابراہام لنکن کی زندگی کے حالات اور مقصد نہایت خوبی سے ڈرامے کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔

(۲) جان ظرافت فرانس کے مشہور ڈراما نویس مولیر کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے جس میں کنجوس کی بہت خبر لی گئی ہے۔

(۳) قزاق مشہور جرمن شاعر اور ڈراما نویس شلر کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ (۴) بگڑے دل۔ مولیر کی ایک دوسری کتاب کا ترجمہ (۵) ظفر کی موت۔ میٹرلنک کے ایک ڈراما کا ترجمہ ہے۔

سوشل ڈراموں کے ذیل میں مولوی عبدالماجد صاحب دریاآبادی کا زود پشیماں جس میں کم عمری کی شادی کی قباحتیں دکھائی ہیں قابل ذکر ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایم اے۔ جو ایک خوش گو شاعر اور بہت بڑے مضمون نگار ہیں۔ ڈرامہ سے بھی ایک خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ بالفعل کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سیکرٹری کے عہدے پر ممتاز ہیں۔ راج دلاری اور مراری دادا آپ کی مشہور تصانیف ہیں راج دلاری پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے منظور ہوگئی ہے۔ مسٹر کنور سین مشہور نقاد ڈراما ان دونوں کتابوں کی نسبت لکھتے ہیں۔ "یہ دونوں نثر ڈرامے ہمارے موجودہ سوشیل اور خانگی زندگی کے بہترین نمونے ہیں ان کے لکھنے کی غرض اصلاح معاشرت ہے اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو چاہیے کہ ان کو پورا آئینہ اخلاق سمجھیں ان میں طبقہ متوسط کے مردوں اور عورتوں دونوں کے صحیح خیالات وجذبات اور نیز ان کے نقائص اور کمزوریاں، اور ان کے عادات نہایت کامیابی سے دکھلائے ہیں۔ طرز تحریر بہت شوخ، زبان بامحاورہ، اور خیالات بہت پاک وصاف ہیں ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جین آسٹن کے ناولوں کو برنارڈ شا نے ڈرامہ کا جامہ پہنا دیا ہے۔ البتہ لایق مصنف میں اتنی کمزوری ضرور ہے کہ اپنی آزاد خیالی کو اس کی منطقی حد تک نہیں پہنچایا ہے۔" مولانا مرحوم نے میوۂ تلخ پردہ کی سختی کی خرابیوں پر لکھا۔ غرض کہ زمانۂ موجودہ میں متعدد ڈراما ہیں معاشرتی مسائل پر لکھے جاتے ہیں جس میں ضمناً یا صراحتاً مغربی تہذیب کی حد سے زیادہ تقلید کا خاکہ اڑایا جاتا ہے۔

سیاسی صنف میں منشی امراؤ علی کا ڈراما البرٹ بل جو ۱۸۹۳ء میں بمقام لاہور شایع ہوا تھا۔ یعنی اس وقت جب کہ مشہور البرٹ بل پر سخت مباحثہ ہو رہا تھا اور نیز ایک اور ڈراما جس میں انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد کو بیان کیا ہے۔ سیاسی ڈرامے کہے جا سکتے ہیں مگر یہ کوئی دلچسپ اور وقیع تصانیف نہیں ہیں۔ اسی طرح ترک موالات کے عروج کے زمانے میں بہت سے نام نہاد ڈرامے سیاسی مسائل پر لکھے گئے اور ممنوع ہو گئے۔ ان میں سے کوئی قابل ذکر نہیں الا وہ جو منشی کشن چند زیبا نے زخمی پنجاب کے نام سے لکھا تھا۔

اُردو ڈراما کی ترقی میں مختلف لوگوں نے کیا حصہ لیا

جیسا اوپر بیان ہوا اندر سبھا سے اُردو ڈراما کی بنیاد پڑی مگر یہ رہس کے طرز پر لکھی گئی۔ نہ تو اس میں کوئی منظم پلاٹ ہے اور نہ صحیح معنوں میں کیرکٹر ہیں۔ اس کے بعد ظریف نے جدید رنگ کے ڈراما کی بنیاد ڈالی یا کم سے کم اس کی ترقی و اشاعت میں کوشش کی ان کی تصانیف کی وجہ سے زبان ہندوستانی یعنی اُردو کی ہندوستان کے مختلف حصوں میں جہاں ان کے ڈراما کھیلے گئے، شہرت ہوئی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ظریف کی غرض صرف دل چسپی اور تفریح تھی۔ ان کے ڈراما ادبی حیثیت سے ممتاز نہیں۔ ان کے پلاٹ اور کیرکٹر بہت کمزور ہیں۔ ان کی تحریر میں استادی نہیں پائی جاتی۔ نثر و نظم دونوں ابتدائی رنگ کی اور ناقص ہیں۔ حافظ عبداللہ اور مرزا نظیر بیگ نے ظریف کی پیروی میں اپنے تماشوں میں دو دو پلاٹ الگ الگ قائم کیے۔ ان کے بعد طالب و احسن نے اس فن کو ترقی دی اور زبان کو بھی ایک حد تک بہت درست کیا انہوں نے دو پلاٹوں کو ایک کر دیا۔ اور اسی پلاٹ میں بعض کیرکٹروں سے مسخرہ کا کام لیا یعنی کومیڈی کو بھی اسی قصہ میں شامل کیا۔ گفتگو مقفیٰ نثر میں ہوتی تھی اور نظم گیتوں کے واسطے مخصوص کی گئی۔ کبھی کبھی گفتگو میں بھی اس کو زوردار اور مؤثر کرنے کے لیے شعر استعمال کیے گئے۔ گیت زیادہ تر ہندی زبان میں ہوتے تھے اور ڈراما رہس کی حد سے نکل کر صحیح ڈراما کی حد میں آگیا کیرکٹر سازی، ایکشن، اور اختتام قصہ پہ زیادہ توجہ کی گئی۔ طالب نے سب سے پہلے فارسی الفاظ کی ہندی میں آمیزش کی۔ حشر نے پھر وہی طریقہ یعنی ایک قصہ میں دو پلاٹوں کا اختیار کیا۔ ان کے خصوصیات کا بیان ان کے حالات میں مختصراً ہو چکا ہے بے تاب کی شہرت ان کے دو مشہور ڈراموں مہابھارت اور رامائن سے ہوئی جس کے کیرکٹر مشہور سنسکرت شاعر بیاس سے لیے گئے جن کی تصانیف اپنی مجموعیت اور رنگینیت سے بہترین ڈراما کہی جا سکتی ہیں۔ بے تاب کے نقائص کو بشمبر سہا سئے نے اپنے ڈراما بدھ دیو میں دور کیا اور اس کی زبان گو اعلیٰ درجے کی بامحاورہ اُردو نہیں ہے مگر پھر بھی بہت زوردار زبان ہے جس میں ہندی الفاظ کی کثرت ہے۔ خیالات بہت پاکیزہ اور انداز بیان بہت دلکش ہے۔

مسٹر کنور سین نے اپنی کتاب برہانڈ ناٹک میں علم ہیئت یعنی ستاروں سے کام لیا اور واقعی بڑی اُستادی اور خوبی سے ترتیب دیا۔ کیفی صاحب نے سوشل مضامین پر ڈراما لکھے "نور وطن" اور "اتفاق" بلاشبہ سیاسی ڈراما ہیں۔ تاریخی ڈراما کا بھی اب رواج ہو چلا ہے اور یہ زیادہ تر مشہور بنگالی ناٹکوں کے ترجمے ہیں۔ ان کے علاوہ ہندو دیومالا اور ہندوستانی تاریخ بھی بہت کچھ مواد آجکل فراہم کر رہی ہے اور مغربی ڈراموں کے ترجمے بھی بکثرت ہو رہے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اُردو ڈراما بہت کچھ ترقی کر رہا ہے۔

اُردو ڈراما کے دیر میں ظاہر ہونے کے اسباب ہم اوپر بیان کر آئے ہیں یعنی یہ کہ سنسکرت اور ہندی ناٹک زوال میں آکر متروک ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ سنسکرت ناٹکوں کے جو ترجمے بڑے بڑے قابل انگریزوں مثلاً سر ولیم جونس۔ پروفیسر ولسن اور مونیر ولیمس نے کیے تھے۔ انگریزی زبان میں ہونے کی وجہ سے اُن لوگوں کی سمجھ سے باہر تھے جو اُردو ڈراما لکھتے تھے اور یہ لوگ انگریزی کے ساتھ سنسکرت سے بھی ناواقف تھے اور نہ اس کے جاننے کے خواہشمند تھے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اُردو ڈراما کا صحیح وجود اس وقت ہوا جب کہ اہل مغرب کا اثر اس ملک پر ہونے لگا۔ اس کے بعد البتہ سنسکرت ڈراموں سے بذریعہ انگریزی تراجم فائدہ اٹھایا جانے لگا۔

ابتدائی ڈراموں کے نقائص شروع میں ڈرامے کی بالکل ادبی حیثیت نہ تھی بلکہ وہ محض فائدے کی غرض سے کھیلے بھی جاتے تھے اور لکھے بھی جاتے تھے۔ پارسی لوگوں نے جو تجارت کا خاص مذاق رکھتے ہیں۔ اس کام کو ایک کاروبار کی حیثیت سے اختیار کیا اور جب ان کی کمپنیوں کو کامیابی ہوئی تو تماشے بھی بکثرت لکھے جانے لگے جن کے ماخذ جیسا اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ ہندو دیومالا پُرانے قصے اور افسانے انگریزی ڈراموں کے ترجمے سبھی کچھ تھے۔ تماشے کی عمدگی اور تکمیل کا خیال مطلق نہیں رکھا جاتا تھا۔ کسی پُرانے قصے کے واقعات کو توڑ مروڑ کر اور کچھ اشعار بطور گیت کے اور کچھ مذاق کی باتیں اس میں جوڑ کر تماشا تیار کر لینا بس یہی کافی تھا۔ ڈرامانگار بھی اس وقت کچھ

زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ زیادہ تر ایکٹروں میں سے یا ان لوگوں میں سے جن کو اس قسم کے تماشے دیکھنے کا شوق ہوتا تھا، یہ لوگ منتخب کر لیے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسے لوگ رکھ لیے جاتے تھے۔ جو منیجروں کی ہدایت کے موافق جلد جلد تماشے تیار کر دیا کرتے تھے۔ نفس ڈراما میں یہ خرابیاں ہوتی تھیں کہ ان کی عبارت بہت سست ہوتی تھی۔ اشخاص ڈراما بجائے معمولی طریقے کے اشعار میں گفتگو کرتے تھے اور بعض اوقات غزلیں کی غزلیں اس قسم کی گفتگو میں شامل ہوتی تھیں اور اشعار بھی اعلےٰ درجے کے نہ ہوتے تھے بلکہ نہایت معمولی اور بے مزہ۔ نثر بھی انتہا درجے کی مصنوعی اور غیر مکمل۔ پلاٹ اور کیرکٹر کا کہیں پتہ نہیں۔ ایکشن نہایت ناہموار سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ ٹریجڈی اور کامڈی جن کا میل نہیں ہو سکتا، ایک ہی پلاٹ میں شامل کر دی جاتی تھیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ڈرامے نہایت ہی ادنی درجے کے ہوتے اور مہذب اور متین لوگوں کے دیکھنے کے لائق ہرگز نہیں ہوتے تھے۔ بوسے بازی، گلے ملنا، اور فحش گفتگو بے تکلف جائز تھی۔ بلکہ اس سے کم کے ٹکٹ والے بہت خوش ہوتے تھے۔ ایکٹرس عورتیں زیادہ تر ادنےٰ درجے کی رنڈیاں ہوتیں۔ قتل و خونریزی کے سین بے تکلف اسٹیج پر دکھائے جاتے۔ کامک پارٹ اور نقلیں وغیرہ نہایت ادنیٰ درجے کی ہوتی تھیں بغرض کہ فن ڈراما جن اعلیٰ عناصر سے مرکب ہے وہ بالکل ناپید تھے۔

کچھ عرصے کے بعد انگریزی ڈراموں نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور شیکسپیئر کے تماشے لوگوں کو بہت پسند آئے ان میں سے اکثر ترجمے کے ذریعہ سے اسٹیج پر دکھائے جانے لگے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک میں بھی اصلیت کی جھلک تک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ان کی مقبولیت اس درجہ ہوئی کہ بعض تماشوں کے چار چار پانچ پانچ ترجمے کیے گئے جن میں سے اکثر کا ذکر انڈیا آفس لائبریری کی فہرست میں موجود ہے۔ ان ترجموں میں اشخاص قصہ کے نام بدل کر ہندوستان کی مناسبت سے کچھ اور رکھ لیے گئے ہیں مگر اصلی کیرکٹر مترجموں کی سمجھ میں مطلق نہیں آئے مثلاً شیکسپیئر کے مشہور تماشے ہیملٹ میں وہ سین جس میں ہیملٹ اپنے دل سے

باتیں کرتا ہے۔ مترجم صاحب بوجہ انگریزی نہ جاننے کے اس کا صحیح مطلب بالکل نہیں سمجھ سکے مسٹر عبداللہ یوسف علی فرماتے ہیں۔ "انگریزی اسٹیج کا اثر ہندوستانی اسٹیج پر اس کی بناوٹ اُس کے سازوسامان اس کے پردوں وغیرہ سے پوری طرح ظاہر ہے۔ اُردو ڈراما نے انگریزی ڈراما کی اندھا دُھند تقلید دو طریقے سے کی۔ پہلے یہ کہ ابتدا میں وہ انگریزی ڈراما جو "پرابلم پلے" کہلاتے تھے اور جن کی غرض اصلی یہ تھی کہ سوسائٹی کے تمام پُرانے رسم و رواج اور اخلاق و عادات کا خوب خاکہ اُڑایا جائے۔ ان کی تقلید میں ابتدائی اُردو ڈراما بھی اس معاملے میں تمام پُرانی چیزوں کی نسبت بہت آزاد و بے باک ہوگیا پس اس معاملے میں انگریزی ڈرامانے اُردو ڈراما کے ساتھ وہی کیا جو اٹالین ڈراما نے فرنچ ڈراما کے ساتھ اور فرنچ ڈراما نے عہد رسٹوریشن کے انگریزی ڈراما کے ساتھ کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ اسی تقلید کی وجہ سے انگریزی دُھنیں ہندوستانی تھیٹروں میں رائج ہوگئیں مگر نہایت بھونڈے طریقے سے رائج ہوئیں اور بڑی خرابی یہ ہوئی کہ اس قسم کی نئی دھنوں کے واسطے معمولی شعرا نے نظمیں بھی اسی انداز کی لکھنا شروع کیں جس کا نتیجہ نہایت تمسخر انگیز ہوگیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی اُردو شعر کو انگریزی دُھن میں گائے اور چونکہ اس کوشش میں الفاظ ضرور ٹوٹ پھوٹ جائیں گے لہذا ان کا مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا مسٹر کنور سین نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے۔ مگر ہماری رائے میں یہ خرابی انگریزی اثر کے علاوہ اور چیزوں کا بھی نتیجہ ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا یعنی ایکٹروں کا ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھنا۔ ڈراما نویسوں کی معمولی لیاقت۔ تماشائیوں کا اچھے بُرے میں امتیاز نہ کرنا۔ اور مالکان تھیٹر کا اپنے نفع کی غرض سے ان لوگوں کو خوش کرنا جن سے انہیں زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ دوسری بات جو انگریزی دُھنوں کے متعلق اوپر لکھی گئی۔ یہ بالکل صحیح ہے اس سے واقعی ہندوستانی موسیقی کو جو نہایت سائنٹیفک اور اعلےٰ درجے کی ہے۔ بہت بڑا نقصان پہنچا۔

موجودہ ڈراموں میں اصلاح و ترقی موجودہ زمانے میں اُردو ڈراما میں ایک نمایاں تغیر و ترقی دیکھی جاتی ہے۔ اُردو ڈراما بہت تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اردو ڈراما پر

یوریپین ڈراما اور سنسکرت ڈراما اور انگریزی اور فرنچ ڈراموں کے ترجمے نیز بنگالی گجراتی اور مرہٹی ناٹکوں کا بہت بڑا اثر پڑا۔ ایک شخص بنارس میں تھے جن کا نام بابو ہریش چندر تھا۔ یہ بھارت اِندر کے لقب سے مشہور تھے اور ہندی ناٹک لکھنے میں کمال رکھتے تھے۔ یہ سنسکرت سے پوری طرح واقف تھے اور مشہور کالیداس اور بھاؤبھوتی کے رنگ میں ان کا کلام ڈوبا ہوا تھا۔ یہ اپنے قصوں کے پلاٹ زیادہ تر پرانوں سے لیتے تھے جو دلچسپ قصوں اور افسانوں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہیں۔ اور اب یہ سب کو مسلّم ہے کہ پلاٹ کی درستی اور قصے کو خوب صورت بنا دینے میں وہ عجب کمال رکھتے تھے۔ چونکہ یہ ہندی میں لکھتے تھے لہٰذا ان کی تصانیف پر اس کتاب میں کوئی رائے زنی نہیں کی جاسکتی مگر اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ ان کے تصانیف کا اثر مابعد کے اُردو ڈراموں پر بہت کچھ ہوا مثلاً "راجہ ہریش چندر" "رُکمنی منگل" "بلوا منگل" وغیرہ۔ بالفعل اُردو ڈراما کے مضامین میں بہت توسیع کی جارہی ہے۔ علاوہ ان پُرانے قصّوں کے جن کا رواج اب تک تھا۔ اب نہایت دل چسپ قصے اسٹیج پر لائے جاتے ہیں۔ پولٹیکل اور سوشل ڈراما بھی اب ترقی کر رہا ہے۔ قصوں کی عمدگی اور اخلاق آموزی میں بھی بہت کچھ فرق ہے۔ عشق و عاشقی جو اسٹیج پر دکھائی جاتی ہے۔ نیز وہ جذبات اور واردات قلبیہ جو ایکشن ذریعہ سے دکھائے جاتے ہیں بہت اعلیٰ ہوتے ہیں۔ نفسیات کی طرف زیادہ توجہ ہے۔ ڈراما کے مضامین اور سطح نظر بہت وسیع ہوگئے ہیں کیرکٹر اور پلاٹ میں بھی ترقی ہے۔ ایکٹروں کو اپنے افعال پر کافی قابو ہوتا ہے اور اب وہ پہلا سا بے تکا پن ان میں نہیں ہے خیالات اور الفاظ دونوں میں شُستگی اور متانت کا لحاظ رکھا جاتا ہے نتیجہ کی عمدگی پر بھی کافی توجہ کی جاتی ہے۔ نقلوں اور کامک پارٹوں میں وہ پہلے کی سی بدتمیزی اور پھکڑپن جو نفیس طبائع کو ہمیشہ ناپسند تھا۔ اب نہیں ہے مختصر یہ کہ قدیم اور جدید اُردو ڈراموں میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا ہے۔

اصلاح و ترقی کی ضرورت مگر بایں ہمہ اب بھی اصلاح و ترقی کی بہت کچھ ضرورت ہے خیالات اور زبان دونوں اب بھی بہت کچھ محتاج اصلاح ہیں۔ الفاظ میں ڈینگ نہ ہونا چاہیے بلکہ معنویت اور

بھارتندو ہریش چندر

اصلیت کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ تکلف اور تصنع سے عبارت بالکل خالی ہو۔ گفتگو کے موقع پر مقفیٰ
عبارت گو معین حافظہ سہی مگر بے جوڑ معلوم ہوتی ہے۔ اس کی جگہ بے تکلف سیدھی سادی بات چیت
سے کام لیا جائے جیسا کہ موقع و محل کا تقاضا ہو۔ پلاٹ کی ترتیب و تنظیم میں بھی ابھی بہت اصلاح
کی گنجائش ہے۔ اس کے واسطے بہت ہوشیار اور چابک دست قلم چاہیے۔ تمسخر اور مذاق کے
موقعوں پر فحش اور بھانڈپن سے بچنا چاہیے اور مذاق نہایت ستھرا اور شائستہ ہونا چاہیے۔ اصلاح
زبان پر بھی توجہ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اصلی فن ڈراما نگاری سے ہمارے ڈراما نویس ابھی
آشنا نہیں ہیں اور ہماری رائے میں یہ بات اسی وقت نصیب ہو گی جبکہ اس کام وہی لوگ کریں
گے اس کام کے اہل ہیں اور جن کا قدرتی میلانِ طبع اس طرف ہے۔ اُردو ڈراما کی ترقی کا واحد
طریقہ یہی ہے کہ اس کا میدانِ عمل وسیع کیا جائے اور قابل اور اہل لوگوں کی ہمت افزائی کی جائے
نیز یہ کہ بہترین یورپین اور انگریزی ڈرامے اور پرانے سنسکرت ناٹک ترجمہ کرائے جائیں جن
سے ہمارے اہل وطن کو اصلی ڈراما کی حقیقت اور اعلےٰ آئیڈیل کا حال معلوم ہوگا اور وہ دیکھیں گے
کہ یہ فن شریف گزشتہ زمانے میں کس عروج تک پہنچ گیا تھا اور آج کل کی زندہ قوموں اور ملکوں
میں اس کی ترقی کی کیا حالت ہے۔ اسی میں سے ان کو اپنے ملک اور اپنی سوسائٹی کے
حسب حال جو چیزیں مناسب معلوم ہوں اخذ کرنا چاہیے مگر یہ ضرور ہے کہ ترجموں کی کثرت سے
طبع زاد تصانیف دب نہ جائیں۔ زمانۂ حال کی خرابیوں کی اصلاح کے واسطے دلچسپ اور سوشل
تماشے مرتب کیے جاویں اور سوسائٹی ہی سے اس قسم کے مضامین اخذ کیے جائیں۔ اس فن کو
بنظر حقارت نہ دیکھا جائے اور ہمارے علماء و فضلاء اس کی تضحیک و تذلیل کے درپے نہ ہوں۔ ایکٹرسوں
پر بھی ذلّت کی نگاہیں نہ ڈالی جائیں۔ ان کاموں کے واسطے زیادہ ہمت اور زیادہ سرپرستی کی ضرورت
ہے۔ پردہ کی موجودگی سے ہمارے ناولوں اور ڈراما میں بعض رکیک اور ذلیل باتیں پائی جاتی
ہیں، وہ یقیناً رسم پردہ اُٹھنے کے ساتھ دور ہو سکتی ہیں کیونکہ موجودہ صورت میں سچے جذبات عشق
کا اظہار ناممکن ہے۔ اگر کوئی شخص ایکٹری کا پیشہ اختیار کرے تو وہ ذات برادری سے خارج نہ

کیا جائے۔ اسی طرح ڈراما نویس اور ایکٹر بھی اپنے اپنے پیشوں اور کاموں کو معزز سمجھیں۔

اُردو ڈراما کا مستقبل ہر چند کہ پیشین گو سچے نہیں سمجھے جاتے اور ان کی رائے کو معتبر نہیں مانا جاتا مگر بایں ہمہ ہم کہنے کے لیے تیار ہیں کہ اُردو ڈراما اپنے لیے ایک روشن مستقبل رکھتا ہے جس طرح اس باب کی ابتدا مسٹر عبداللہ یوسف علی کے فاضلانہ مضمون سے کی گئی تھی اُسی طرح اس کا اختتام بھی انہیں کے الفاظ میں کیا جاتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ "اُردو ڈراما بہت زوردار ترقی کے آثار پیدا کر چکا ہے تعلیم یافتہ اور ذی وجاہت لوگ یقیناً اس میں ایک زبردست وسیلہ قومی ترقی کا دیکھتے ہیں۔ اور اس کی آئندہ منزلِ ترقی ہماری رائے میں وہی ہوگی جو ایران ایسے ملک میں ہوئی کہ خیال صحیح فن ڈراما سے کوئی واقف نہ تھا یعنی تاریخی اور سیاسی ڈراما نگاری۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ایسے شاہکار جو شیکسپیئر نے لکھے ہیں، ان کی تصنیف کے واسطے ابھی ایک زمانہ درکار ہے اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انہیں کی سچی تقلید سے ہندوستان میں صحیح ڈراما نگاری کا مادّہ پیدا ہوگا اور اسی وقت اُردو ڈراما دنیا کے بہترین ڈراموں کی صف میں ایک ممتاز جگہ پانے کا مستحق ہوگا۔"

باب ۱۹

زبانِ اُردو کی خاص خوبیاں اور اُس کے متعلّق بعض اہل الرائے لوگوں کی قیمتی رائیں

پورے ادب اُردو کا ایک خاکہ ابواب مذکورۂ بالا میں کھینچا گیا۔ اس باب میں زیادہ تر زبانِ اُردو سے بحث ہوگی نیز یہ کہ ادب اُردو کا بہ مقابلہ دوسری دیسی زبانوں کے کیا مرتبہ ہے۔ اس باب کی ترتیب میں مولوی عبدالمجید صاحب کے اس فاضلانہ مضمون سے بہت مدد لی گئی ہے جو ماڈرن ریویو میں شائع ہوا ہے۔

اُردو ایک فصیح اور شیریں زبان ہے اُردو بالاتفاق ایک ایسی زبان ہے جو فصاحت و بلاغت خیر بینی اور اظہار مطلب کے لیے بڑی شہرت رکھتی ہے۔ یہ تہذیب و تمدّن کی زبان ہے اور اس میں خیالات اور جذبات کے نازک نازک فرق ادا ہو سکتے ہیں چونکہ اس میں اکثر دوسری زبانوں کے مخصوص الفاظ و حروف شامل ہیں مثلاً عربی فارسی ترکی سنسکرت وغیرہ لہٰذا یہ بہ نسبت دوسری دیسی زبانوں کے ذریعہ تعلیم بننے ادبی خیالات کو اچھی طرح ظاہر کرنے اور تمدّن و شائستگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے زیادہ تر موزوں ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہے ہندو اور مسلمان دونوں نے اپنی اپنی قومی اور ملکی زبانوں کو چھوڑ کر اور ایک تیسری زبان اختیار کر کے ایثار و اتحاد کی ایک بیّن مثال پیش کی اور یہ زبان گو کہ ہندوستان میں پیدا ہوئی مگر غیر ملکی ذرائع اس کی ترقی اور نشو و نما کے باعث ہوئے لہٰذا اس سے بہتر عملی طور پر اتحاد کا بیّن ثبوت نہ کوئی امر دست

تھا اور خراب ہے۔

ہندوستان کی زبانِ عام ہے اُردو صحیح معنوں میں ہندوستان بھر کی "لنگوا فرینکا" یعنی زبانِ عام ہے کیونکہ اُن مقامات میں بھی جہاں یہ بولی نہیں جاتی بخوبی سمجھی جاتی ہے۔ اور زبانوں کا حال یہ ہے کہ صرف اپنے اپنے ملک یا دیس میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں مگر دوسری جگہ اُن کو سمجھنا دشوار ہے مثلاً کشمیر میں اگر مرہٹی بولی جائے بہار میں گجراتی اور سندھ میں تامل تو بھلا ان کو کون سمجھے گا۔ مگر وہ زبان جس کو ہندوستانی یا اُردو کہتے ہیں ہر شخص اپنے ذاتی تجربہ سے بتلا سکتا ہے کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ اور چپے چپے میں بلکہ دور دراز تک اس سے باہر بھی مثلاً عدن بندر سعید مالٹا وغیرہ تک میں بے تکلف سمجھ لی جاتی ہے۔ ہم اپنے برادرانِ وطن سے معافی کے خواستگار ہیں اور کسی دیسی زبان کی توہین یا بُرائی نہیں کرنا چاہتے مگر اصل یہ ہے کہ تمام دیگر دیسی زبانیں زیادہ سے زیادہ کسی ایک صوبے کی مخصوص زبان کہی جاسکتی ہیں اور اُردو ایک بین الاقوامی اور ہر صوبہ کی زبان مانی جائے گی۔ اور چونکہ تمام دیسی زبانوں میں بہت سے اُردو الفاظ شامل ہیں اور اب زیادہ ہوتے جاتے ہیں لہٰذا ان مقامات کے رہنے والوں کو بھی جہاں اُردو عام طور پر نہیں بولی جاتی۔ اس کے سمجھنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔

ایک وسیع زبان ہے اُردو ایک نہایت وسیع زبان ہے اور اس میں متعدد زبانوں کے الفاظ بکثرت شامل ہو گئے ہیں جس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ نئے الفاظ و اصطلاحات کے بنانے میں آسانی ہوتی ہے مثلاً آج کل کے اُردو لکھنے والے اگر مغربی سائنس پر کچھ لکھنا چاہیں تو وہ عربی فارسی سنسکرت اور انگلش وغیرہ سے بے تکلف الفاظ لے سکتے ہیں اور ان کو ایک ضروری تغیر اور مناسبت زبان کے ساتھ اپنا کر سکتے ہیں مگر افسوس ہے کہ آج کل عربی سے زیادہ استعارہ کیا جا رہا ہے جس سے کسی قدر زبان اُردو موردِ الزام اور غیر مطبوع ہوتی جاتی ہے۔

بعض یورپین محققین کی رائے جے بیمس صاحب مصنف انڈین فلالوجی حسبِ ذیل رائے دیتے ہیں۔

"میں اُردو کو ایک نہایت ترقی کرنے والی اور شائستہ صورت اس بڑی اور وسیع زبان کی سمجھتا ہوں جو ہندوستان میں رائج ہے۔ اُردو صرف ایک وسیع، فصیح، معنی خیز اور جامع زبان ہے بلکہ یہی صرف ایک صورت ہے کہ جس میں دریائے گنگ کے قریب کی رہنے والی قومیں اپنی زبان کی ترقی صحیح طور پر دکھلا

سکتی تھیں ۔ (دیکھیے جرنل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۳۵ متعلق ۱۸۶۶ء صفحہ ۱)

مشہور فرنچ مستشرق "گارسن ڈی ٹاسی" لکھتے ہیں "اُردو کی ہندوستان بھر میں وہی پوزیشن ہے جو فرنچ (فرانسیسی زبان) کی یورپ میں ہے ۔ یہی وہ زبان ہے جو ملک میں بکثرت مستعمل ہے ۔ عدالتوں میں اور شہروں میں جاری ہے ۔ ارباب ادب اپنی تصانیف اسی زبان میں لکھتے ہیں ، موسیقی داں اپنے راگ راگنیاں اسی زبان میں تصنیف کرتے ہیں اور اہل یورپ سے گفتگو بھی اسی میں کی جاتی ہے ۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اُردو کو ہر مقام کے ہندو لوگ نہیں سمجھ سکتے مگر یہی حالت ہر ملک میں ہر زبان کی ہے مثلاً برٹنی کے کسان ، عام اس سے کہ 'پروانس' یا السیس کے ہوں ، اصل فرنچ نہیں سمجھ سکتے پس کیا یہ وجہ معقول ہو سکتی ہے کہ اُردو عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے اُٹھا دی جائے ؟"

جارج کیمبل مصنف "انڈیا ایز اٹ مائٹ بی" تحریر کرتے ہیں "میرے نزدیک یہ بہت مناسب ہے کہ تمام سرکاری اسکولوں میں ہندوستانی زبان ایک عام زبان کر دی جائے اور دیسی زبانیں بھی بقدر ضرورت رکھی جائیں ۔ میں اس کو بالکل ناممکن سمجھتا ہوں کہ کوئی عام زبان کا ذریعہ کیے بغیر کام چلایا جا سکتا ہے اور چونکہ انگریزی کو ہندوستان کی زبان عام بنانا محال معلوم ہوتا ہے لہذا ہندوستانی ہی کو یہ فخر ملنا چاہیے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ۔ اُردو ہندوستان بھر کی عام زبان (لنگوا فرینکا) کہی جانے کی مستحق ہے کیونکہ یہی وہ زبان ہے جس کو ادنےٰ و اعلےٰ اور یہاں کے انگریز بھی بولتے ہیں ۔ اس میں ایک خاص خوبی یہ ہے جو کسی دوسری زبان میں نہیں پائی جاتی کہ دوسری زبانوں کے الفاظ بلا کسی تغیر کے ' یا خفیف تغیر کے ساتھ اپنے میں جذب کر لیتی ہے اور پھر وہ لفظ اُسی کے ہو جاتے ہیں ۔"

مسٹر ونسنٹ اسمتھ مصنف "ہسٹری آف انڈیا" اپنی کتاب کے آخری باب میں لکھتے ہیں "زبان اُردو جو ہماری زبان انگریزی سے باعتبار اپنی سادگی اور قواعد صرف و نحو کی نرمی اور کثرت الفاظ کے بہت مشابہ ہے ، ضرور اس قابل ہے کہ تمام مطالب ، عام اس سے کہ وہ ادبی ہوں یا فلسفیانہ یا سائنٹیفک اس میں ادا کیے جائیں ۔"

اُردو کی نام نہاد کم مائگی یہ عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ زبان اُردو کوئی ایسا سرمایۂ ادب اپنے پاس

نہیں رکھتی جس پر فی الحقیقت اس کو ناز ہو نہ اپنے ارتقاء و ترقی کی کوئی خاص تاریخ رکھتی ہے۔ یورپین محققین اس کی طرف کم متوجہ ہوئے اور ہندوستانی اس سے بھی کم۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس میں کوئی چیز قدر و قیمت کی نہیں پائی جاتی اور جب اس کا مقابلہ کلاسیکل (قدیم) اور متمدن مغربی زبانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے تو اس کی بے حقیقتی پوری طرح معلوم ہو جاتی ہے۔ ان اعتراضات کے دو جواب دیئے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں تک اُردو ادب کا تعلق ہے وہ کوئی قدیم چیز نہیں ہے اور کسی جدید ادب سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قدیم زبانوں کی طرح بیش بہا ادبی خزانوں سے معمور ہو خلاف عقل ہے۔ اس کی ادبی زندگی فارسی سے علیحدہ رہ کر بہت کم گذری ہے دوسرے یہ کہ یہ بہت ہونہار زبان ہے اور اگر یہی رفتار ترقی رہی تو تھوڑے عرصہ میں یہ ایک ایسے ادب سے مالا مال ہو جائے گی جو دنیا کے بہترین ادبوں سے مقابلہ کر سکے گا اور ابھی ہندوستان کی اور مروجہ زبانوں میں اس کا کوئی مدمقابل نہیں ہے۔

اقسام ادب اُردو ادب دو بڑی قسموں پر منقسم ہو سکتا ہے۔ (۱) مستقل تصانیف (۲) تراجم۔ ترجمے زیادہ تر زبان انگریزی، فارسی، عربی اور شاذ و نادر ہندی اور سنسکرت سے اور دیسی زبانوں میں بنگالی، مرہٹی اور گجراتی سے بھی کیے جاتے ہیں۔

تصانیف مستقل تصانیف نظم، نثر، ناول، ڈراما پر مشتمل ہیں نظم اُردو مختلف اقسام کی ہے اور نہایت ہی پُر لطف اور مزے دار ہے۔ اس میں پند و نصائح اخلاق حسن و عشق کے افسانے، مرثیے، حمد و نعت بادشاہ وقت کی تعریف ہجو ظرافت، اور زمانہ حال کی نیچرل نظمیں، مختلف مضامین پر سب کچھ موجود ہیں مشہور شعرائے اُردو ماضی و حال میر، سودا، درد، ناسخ، آتش، ذوق، غالب، امیر، داغ، حالی، اقبال، حسرت، اکبر کے نام نامی نہایت فخر کے ساتھ پیش کیے جا سکتے ہیں جن کے کلام کے سمجھنے کے لیے ایک خاص ذوق سلیم اور مناسبت طبیعت کی ضرورت ہے۔ بالفعل نظم اُردو کا بہترین انتخاب مولوی محمد الیاس برنی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن نے ایک جدید اسلوب سے تین حصوں میں کیا ہے اور ہر حصہ (سمت) کا علیحدہ نام رکھا ہے یعنی (۱) معارف ملت (۲) جذبات فطرت۔

(۳) مناظرِ قدرت ۔ یہ تینوں حصے یا سٹ بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مولف نے ارادہ کیا ہے کہ ان میں نظم اُردو کے صرف بہترین انتخابات پیش کیے جائیں اور اس غرض سے اکثر شعرائے اُردو قدیم وجدید کا بہترین کام باعتبار مضمون منتخب کیا ہے۔ بہر طور یہ ایک اعلیٰ درجے کا مفید مجموعہ ہے۔ اور کیا اچھا ہو کہ اس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہے۔ مشہور نثاروں میں مرزا رجب علی بیگ سرور۔ سرسید۔ مولوی نذیر احمد۔ مولانا شبلی۔ مولانا آزاد۔ پروفیسر ذکاء اللہ مولانا حالی کے نام گنائے جا سکتے ہیں اور سرشار۔ شرر۔ مرزا رسوا۔ راشد الخیری اور پریم چند سے دنیائے افسانہ نویسی میں کون ایسا شخص ہے جو واقف نہ ہوگا۔

تراجم تراجم کے ذیل میں بھی زبان اُردو بہت مایہ دار ہے۔ دنیا کی اکثر مشہور مشہور کتابیں نظم اور ڈراما کی اُردو میں ترجمہ ہو گئی ہیں مثلاً ہومر کی الیاڈ۔ مہابھارت۔ رامائن۔ شکنتلا۔ میگھ دوت۔ وکرم اروسی۔ رتو سنگھار۔ ملٹن کی پیراڈائز لوسٹ۔ ٹیگور کی گیتان جلی۔ چترا مالی۔ اسی طرح شیکسپیر کے اکثر ڈراموں سے اُردو داں پبلک بذریعہ ترجمہ کے خوب واقف ہے۔ شیریڈن کے بعض ڈرامے اور ڈینٹی، گوئٹے، لانگ فیلو سودے، شیلی بائرن، ورڈسورتھ، اور ٹینیسن کی بھی اکثر مشہور مشہور نظموں نے اُردو کا جامہ پہن لیا ہے۔ افسانوں اور ناولوں میں رینالڈس، اسکاٹ، میری کالیری۔ اور کانن ڈایل کی تصانیف کو لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ بنکم چندر چٹرجی کے قریب قریب سب ناول اور ٹیگور کے بھی بہت سے قصے اُردو میں آگئے ہیں۔ ابھی تھوڑے عرصے سے اسٹی وینسن رائڈر ہیگرڈ، آسکر وائلڈ، برناڈ شا، اور ایچ۔ جی ویلس کو بھی لوگ پسند کرنے لگے ہیں۔ نثاروں میں مکالمے۔ کارلایل، اسمائیلس اور لیک کی مشہور تصانیف ترجمہ ہو گئے ہیں۔ فلسفہ اور نفسیات میں افلاطون وارسطو کی اکثر کتابیں چانکیا کے اقوال، سینکا کے فلسفیانہ خیالات، برکلے کے مکالمات۔ اسی طرح بیکن، ہیوم، کینٹ۔ مل۔ اسپنسر۔ جیمس اور اسٹاوٹ کی بھی بعض تصانیف اُردو میں موجود ہیں۔ تاریخ اور سوانح عمریوں میں پلوٹارک کی مشہور مشہور یونانیوں اور رومیوں کی سوانح عمریاں، رالن کی تاریخ یونان۔ بیری کی تاریخ یونان، ڈوزی کا "اسپین اہلِ اسلام کی حکومت میں" والیس کی تاریخ روس، ایبٹ کی سوانح عمری نپولین، بوناپارٹ

گزین کی تاریخ انگلستان، ونسنٹ اسمتھ کی تاریخ ہندوستان، قدیم الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان، مالکم کی تاریخ ایران، اور گبن کی تاریخ زوال سلطنت روم۔ اور اسی طرح اور بھی مشہور کتابیں اُردو میں موجود ہیں۔ سیاسیات اور معاشیات میں حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔

ارسطو کی پالیٹکس، مل کا رسالہ لبرٹی اور پولیٹکل اکانمی وغیرہ، ہیل کے قوانین دولت، مورلی کا میکیاولی۔ لارڈ کرزن کا پرشیا۔ مزینی کا فرائض انسان۔ شوسٹر کا اختناق ایران، بلنٹ کا مستقبل اسلام۔ اسی طرح سیلی، ولسن، پالک، سجوک، جیونس، مارشل اور مارسین کی بھی بعض بعض کتابیں۔ سیاسیات کے علاوہ بعض فلسفیانہ تاریخیں بھی ترجمہ ہوگئی ہیں۔ مثلاً گیزو کی تاریخ تمدن۔ بکل کی تاریخ تمدن انگلستان۔ لیبان کی تمدن عرب اور تمدن ہند۔ لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ۔ ڈریپر کی تاریخ ارتقائے یورپ۔ دت کی تاریخ قدیم تمدن ہند۔ فلسفہ، تعلیم میں بھی اُردو اساتذہ ذیل کی تصانیف سے ناواقف نہیں ہے۔ اسپنسر، مِل۔ فروبیل، پاسٹالوڈزی۔ ہربرٹ۔ مانٹی سوری۔ سائنس میں ڈریپر کی معرکۂ مذہب و سائنس اور ڈاروِن۔ ہیکل۔ ہکسلی۔ لائل۔ گیگی۔ ٹنڈل۔ بوس۔ کیلون۔ میکسول۔ کروک اور سر آلیور لاج کی جدید تحقیقاتیں اُردو میں آچکی ہیں۔ قانون اور طب کا ذکر بے کار ہے۔ اس وجہ سے کہ اس کی اکثر کتابیں بضرورت ترجمہ ہوگئی ہیں۔

مذہبی لٹریچر اہل عرب و فارس کا پورا اسلامی ادب اور سنسکرت و ہندی کا ایک معتد بہ حصہ ترجمہ ہوگیا ہے۔ مذہبی کتابوں میں قرآن شریف۔ گیتا۔ پُران۔ مہابھارت۔ راماین کے ایک نہیں بلکہ متعدد ترجمے موجود ہیں۔ اسی طرح اکابر دین مثلاً پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ سری کرشن۔ سری رام چندر۔ گوتم بدھ۔ گرو نانک اور کبیر کے بھی مفصل حالات زندگی۔ نیز مقتدایان دین اور بڑے بڑے اہل دل صوفی اور رشی اور حکماء و شعراء اور تمام مؤرخین کے بھی حالات موجود ہیں مثلاً جوگیوں میں بشسٹ متصوفین میں مولانا روم اور حافظ اخلاقی فلسفہ میں غزالی اور سعدی شعراء میں فردوسی حکماء میں بو علی سینا۔ مورخین میں ابن خلکان، ابن خلدون اور فرشتہ وغیرہ۔

ادب اُردو کے سرچشمے بالفعل ایسے سرچشمے جن سے ادب اردو کا ہرا بھرا باغ سیراب ہو رہا ہے حسب ذیل ہیں۔

(۱) عثمانیہ یونیورسٹی جس میں دار الترجمہ قائم ہے

(۲) انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن۔

(۳) دار المصنفین اعظم گڑھ۔ ان تینوں جماعتوں کے حالات اپنی اپنی جگہ پر لکھے جا چکے ہیں اور یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی انجمنیں اور سوسائٹیاں ادب اُردو کی اشاعت و ترقی کے واسطے دِلّی، لکھنؤ اور لاہور میں قائم ہیں۔

ہندوستانی اکیڈمی قائم شدہ ۱۹۲۷ء

گورنمنٹ ممالک متحدہ نے صوبہ کی کونسل کی دلچسپیوں سے مطمئن ہو کر اپنے صوبہ میں ایک ہندوستانی اکیڈمی قائم کی ہے تاکہ اُردو و ہندی ادب کو ایک نمایاں ترقی کرنے کا موقع مل سکے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اسی پر کاربند ہو کر اکیڈمی نے جو اغراض و مقاصد اپنے واسطے منضبط کیے ہیں ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

(۱) خاص خاص مفید مضامین پر بہترین کتابوں کے واسطے مقابلہ کے انعامات تجویز کرنا۔

(۲) اچھی اچھی اور فائدہ مند اُردو ہندی کتابوں کا ترجمہ اپنے تنخواہ دار مترجموں سے کرانا اور ان کو اپنی طرف سے چھپوانا اور شایع کرنا۔

(۳) اُردو ہندی کی ترقی کی غرض سے عمدہ تصانیف اور تراجم کے واسطے ہندوستانی یونیورسٹیوں اور ادبی انجمنوں یا دیگر مستحق اور قابل اشخاص کو مالی امداد دینا۔

(۴) قابل قابل اہل قلم کو اکیڈمی کی فیلوشپ (اعزازی ممبری) کے واسطے منتخب کرنا۔

اکیڈمی کے موجودہ نظام میں ایک کونسل اور ایکزیکیٹو کمیٹی داخل ہیں لیکن اصلی اختیارات فیلوؤں کے ہاتھ میں رہیں گے جن کا انتخاب کونسل سے ہوا کرے گا۔ کونسل میں بالفعل ایک پریسیڈنٹ چھ اکس ایفیشیو ممبر اور تیس معمولی ممبر شامل ہیں (ان میں جنرل سیکرٹری داخل ہے) جن کو شروع میں گورنمنٹ نے نامزد کیا تھا اور گورنمنٹ سے ابتداء میں مبلغ پچیس ہزار روپیہ بطور امداد کے اکیڈمی کو عنایت ہوا تھا۔ اور گورنمنٹ ہی نے سر تیج بہادر سپرو کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کو اکیڈمی کا پریسیڈنٹ اور ڈاکٹر تارا چند پی۔ ایچ۔ ڈی کو اس کا سیکرٹری مقرر کیا تھا۔

اکیڈمی کا قیام ریخ پوچھیے تو اس عہد کے گورنر صوبہ مشہور اسکالر اور ناقد ہز اکسلنسی سر ولیم میرس کی خاص ادبی دلچسپی اور ہمدردی۔ اور ان کے روشن خیال جوان ہمت اور موقع شناس وزیر تعلیم آنریبل رائے راجیشور بلی صاحب کی ان تھک کوششوں اور پیش بینیوں اور نیز منشی دیا نراین صاحب نگم کی سعی بلیغ کا معقول نتیجہ ہے کہ یہ مبارک اسکیم انہیں حضرات کی محنت و جاں فشانی اور عمیق دلچسپی کی وجہ سے درجہ تکمیل کو پہنچی اور انہیں کی آبیاری سے یہ تخم سرسبز ہوا۔ اکیڈمی اپنے وحید العصر خلیق و متواضع پریسیڈنٹ اور اپنے فاضل سیکرٹری اور نیز اپنے قابل ممبروں کی کوششوں اور گورنمنٹ صوبہ کی نظر عنایت سے ضرور ایک درخشاں مستقبل اور ایک بارونق مطمح نظر اپنے سامنے رکھتی ہے۔

اُردو کا رسم الخط سُنا ہے کہ اورنگ آباد اور حیدر آباد دکن میں اُردو کے رسم الخط کی درستی اور ترمیم کے واسطے بڑی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اسی غرض سے اکثر کمیٹیاں قائم ہوئی ہیں جنہوں نے اپنی تجاویز پبلک کے سامنے پیش بھی کیں مگر سُنا جاتا ہے کہ یہ جدید رسم الخط نوآموزوں کے واسطے نہایت پیچیدہ مشکل اور پریشان کن ہے اور اس سے غلط پڑھنے اور غلط لکھنے دونوں کا قوی احتمال ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اس قسم کے اظہار میں غلط بیانی یا غلط فہمی ہوئی ہو مگر اتنا ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ طریقہ تحریر میں جو نقائص اور کمیاں ہیں اور ان پر ماہرین فن کی توجہ ضرور مبذول ہوئی اور یقیناً اس قسم کی خرابیاں کبھی نہ کبھی ضرور رفع ہو جائیں گی۔

ممبران ہندوستانی اکیڈمی

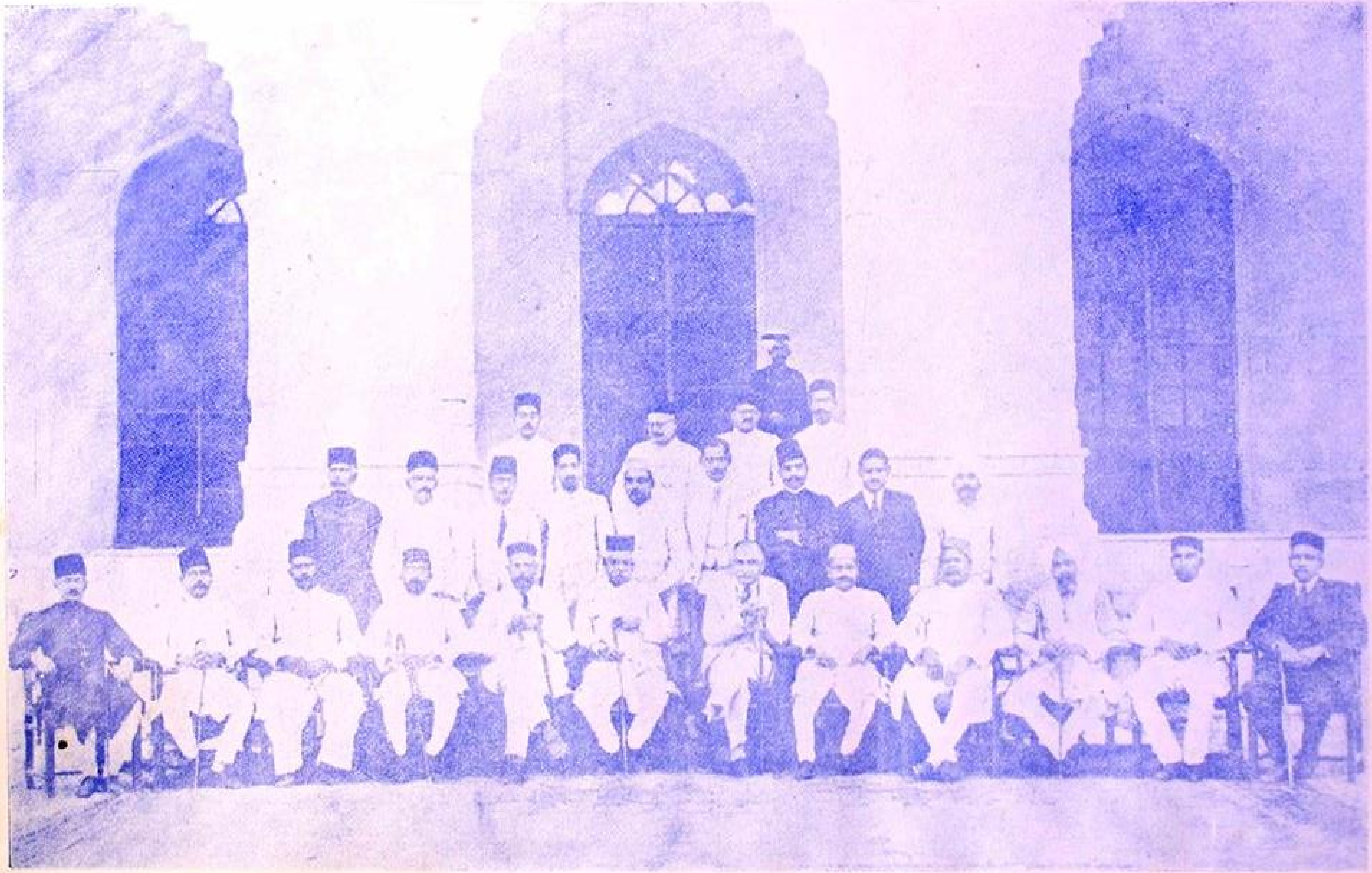

P. T. O.

ممبران ہندوستانی اکیڈمی

(۱) بیٹھے ہوئے (بائیں جانب سے)—پروفیسر ضامن علی—نیاز فتحپوری—پروفیسر ناصری—سید مسعود حسن رضوی—بابو شیام سندرداس—لالہ سیتا رام—سرتیج بہادر سپرو—رائے راجیشور بلی—بابو جگن ناتھ داس رتناکر—پنڈت اجودھیا سنگھ اپادھیا—پنڈت رام نراین مصر—پنڈت سریدھر پاٹھک—

(۲) کھڑے ہوئے (بائیں جانب سے) مولانا صفی—مرزا محمد عسکری—سید سجاد حیدر یلدرم—بابو دھرندر ورما—پنڈت بدری ناتھ بھٹ—ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی—پروفیسر نعیم الرحمن—رام بابو سکسینہ—منشی پریم چند—

(۳) پچھلی صف (بائیں طرف سے) ڈاکٹر تارا چند (سکریٹری)—پنڈت منوہر لال جوتشی—ڈاکٹر بینی پرشاد—بابو دیا نرائن نگم—

ضمیمۂ تاریخ ادبِ اُردُو

بعد تیاری کتاب اصحاب ذیل کے حالات دستیاب ہوئے جو ضمیمہ کی صُورت میں درج کیے جاتے ہیں

نظؔر لکھنوی

نوبت رائے نظؔر ایک معزز سکسینہ کایستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے افراد زمانۂ نوابی میں لکھنؤ میں معزز و ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ نظؔر لکھنؤ میں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت کے آثار اُن کے چہرے سے نمایاں تھے۔ اُردو، فارسی اور انگریزی کی ضروری تعلیم سے فراغت حاصل کر کے ہمہ تن شعر و شاعری میں منہمک ہو گئے جس سے کہ اُس وقت فضائے لکھنؤ معمور ہو رہی تھی۔ ستمبر ۱۸۹۶ء میں اپنا مشہور ادبی رسالہ "خدنگ نظر"[1] لکھنؤ سے

---

[1] "خدنگ نظر" "پیام یار" کے بعد لکھنؤ کا سب سے قدیم اور مشہور گلدستہ تھا۔ اس کی اشاعت آصفی پریس نوازگنج لکھنؤ سے ہوتی تھی اور حضور نظام سابق میر محبوب علی خاں مرحوم کے نام نامی کے ساتھ معنون تھا۔ پہلے اس کے ٹائٹل پر یہ شعر دیا جاتا تھا ؎

مانوس ہیں اگر نگہِ فتنہ گر سے آپ
بہلائیں دل کو سیرِ "خدنگِ نظر" سے آپ

کچھ عرصہ کے بعد یہ شعر دیا جانے لگا ؎

نکلا ہے بن سنور کے "خدنگ نظر" نظؔر
یاں دل دھڑک رہا ہے کسی کی نظر نہ ہو

جاری کیا۔ جو شروع میں تو صرف مجموعۂ غزلیات ہوتا تھا مگر بعد کو کچھ نثر کے مضامین بھی اس میں شامل ہوتے تھے۔ شاعری میں آغا مظہر لکھنوی سے تلمذ تھا جن کی کوشش سے مشاعرے منعقد ہوتے تھے اور انہی مشاعروں کی غزلیں "خدنگ نظر" میں درج ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ تھوڑے عرصہ تک جاری رہ کر بند ہو گیا۔[1]

سنہ ۱۹۰۴ء میں نظر رسالہ زمانہ کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے اور اپنی خدمات نہایت قابلیت اور مستعدی سے انجام دیتے رہے جیسا کہ اس وقت کے رسالہ مذکور کے مضامین کی عمدگی سے ظاہر ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں انڈین پریس الہ آباد کی طلبی پر الہ آباد گئے اور رسالہ ادیب کی اڈیٹری پر فائز ہوئے جو اس وقت نیا نیا جاری ہوا تھا اور اُردو رسالوں میں یہ اوّل درجے کا اور موقر پرچہ سمجھا جاتا تھا۔ نظر نے اس نوزائیدہ بچے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا اور انہیں کی تربیت وہ پروان چڑھا اور اس کو وہ شہرت حاصل ہوئی کہ جو کسی اُردو رسالے کو نہ اُس وقت تھی اور نہ اب ہے۔ نظر کا تعلق ادیب کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ دو سال تک رہا جس کے بعد ان کو پھر کانپور آنا پڑا اور وہ "زمانہ" کے اسٹاف میں دوبارہ داخل ہوئے۔ اب کی مرتبہ تقریباً دو سال تک کانپور میں رہے اور ہفتہ وار "آزاد" کی نگرانی بھی اُن سے متعلق ہو گئی۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں وہ لکھنؤ آ گئے اور یہاں زبان اُردو کے مشہور محسن اور شعر و شاعری کے دلدادہ مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم کی وساطت سے رائے بہادر منشی پراگ نراین بھارگو مالک نول کشور پریس و اودھ اخبار سے ملے اور منشی صاحب موصوف ہی کی نظر عنایت سے نظر کو اخبار تفریح کی اڈیٹری اور تھوڑے عرصہ کے بعد لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور اودھ اخبار کی اڈیٹری بھی مل گئی۔ اس میں اُنھوں نے اس قدر محنت اور جانفشانی سے کام کیا کہ اُن کی صحت خراب ہو گئی اور اسی کے ساتھ روحانی آلام کا بھی سامنا ہوا یعنی اُن کا پیارا نواسہ جس سے کہ وہ بہت مانوس تھے چل بسا اور کچھ عرصہ بعد اس بچے کی ماں یعنی اُن کی اکلوتی

---

[1] غالباً سنہ ۱۹۰۹ء میں بند ہوا۔

منشی نوبت رائے نظر

بیٹی بھی داغ مفارقت دے گئی جس سے کہ اُن کا چراغ شادمانی گُل ہوگیا اور ان جانفرسا حادثوں کی بدولت اُن کو اپنا تعلق اودھ اخبار سے بھی قطع کرنا پڑا۔ انھیں حادثات اور مالی دشواریوں کی وجہ سے اُن کی زندگی کا آخری حصّہ بہت تلخ ہوگیا تھا آخر کار دمہ کے موذی مرض میں ایک عرصہ تک مبتلا رہ کر ۵۶ برس کی عمر میں ۱۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو اس جہانِ فانی سے رحلت کی اور دنیائے ادب کو اپنا سوگوار چھوڑ گئے۔ لکھنؤ کا گلشنِ شاعری اس بلبلِ خوش الحاں کے اُٹھ جانے سے سُونا ہوگیا۔ تمام شعرائے لکھنؤ کو جن کو اُن سے دوستی اور محبت کا پیوند تھا اس واقعہ جاں گداز سے دلی صدمہ ہوا۔ اکثر نے تاریخیں کہیں جن میں مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی نے مادہ تاریخ خوب نکالا ہے ؎

کلکِ محشر نے لکھا سالِ وفات — شاعرِ کامل نظر سے چھپ گیا
۱۹۲۳ء

نظر ایک فطری شاعر تھے اور یہی قدرتی میلانِ طبع اور کہنہ مشقی اُن کی قدرتِ زبان اور کمالِ شاعری کا راز تھے۔ تلمذ بھی اُن کو لکھنؤ کے ایک مشہور اور مستند اُستاد سے تھا۔

رسالہ زمانہ ستمبر ۱۹۱۹ء میں نظر نے اپنے ابتدائی شوق کا حال نیز یہ کہ ۱۸۸۴ء میں اُن کو آغا مظہر سے شرفِ تلمذ کیونکر حاصل ہوا تھا نہایت دلکش طریقے سے قلمبند کیا ہے۔ جیسا کہ اُوپر بیان ہوا مصائب و آلام کی گھنگھور گھٹاؤں نے اُن کی آخر عمر کو تیرہ و تار کر دیا تھا جس کا اثر حُزن و یاس کی صورت میں اُن کے کلام پر بھی چھا گیا تھا جیسا کہ ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے ؎

نظر اب چل کے کرنا چاہیئے آباد مرقد کو — بہت ہے منتظر اپنی زمیں گورِ غریباں کی
مُوت سے کیا ساز کر رکھا ہے اس نے اے نظر — مدّتیں گذریں سبب کُھلتا نہیں تاخیر کا
زندگی کی کشمکش سے مر کے پائی کچھ نجات — اس سے پہلے اے نظر فرصت کبھی ایسی نہ تھی
مدّت سے ڈھونڈھتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے — وہ اِک سکونِ خاطر جو بیشتر نہیں ہے
دل تھا تو ہو رہا تھا احساسِ زندگی بھی — زندہ ہوں اب کہ مُردہ مجھ کو خبر نہیں ہے

آہیں بھریں بہت کچھ دم توڑنا ہے باقی — اس آہ میں بھی دیکھوں ہے یا اثر نہیں ہے
تاریک ہو گئی ہے دنیا ہی جب نظر میں — پھر کوئی امتیازِ شام و سحر نہیں ہے
دنیا سے جا رہے ہو کیا دیکھتے اے نظرؔ تم — زادِ سفر نہیں ہے، رختِ سفر نہیں ہے
طولِ غم سے مختصر غم کی کہانی ہو گئی — جب بھری اک آہ دل کی نوحہ خوانی ہو گئی
ختم وہ دلچسپی تری اے دارِ فانی ہو گئی — ہم بھی زندہ تھے کبھی وہ زندگانی ہو گئی
ہر قدم پہ ایک نالہ ہر قدم پر ایک آہ — زندگی کیا ایک شرحِ سخت جانی ہو گئی
ہجر میں آنکھوں سے جاری ہے برابر سیلِ اشک — بند دو کوزوں میں دریا کی روانی ہو گئی

مے کو دنیا آتشِ سیّال کہتی ہے نظرؔ
لیکن اپنے جام میں آتے ہی پانی ہو گئی

کچھ اندوہ و یاس پر ہی موقوف نہیں نظرؔ کے کلام میں سلاستِ زبان، لطفِ بیان، اعلیٰ تخیّل، غرض کہ جملہ محاسنِ شاعری علی الخصوص وہ سب چیزیں جو غزل گوئی کی جان ہیں پوری طرح موجود ہیں۔ وہ غزل ہی خوب کہتے تھے اور اسی صنف میں وہ اپنے امثال و اقران میں ممتاز تھے۔ اور وہ لوگ ان کی بڑی قدر و عزت کرتے تھے۔ اُن کے چند اشعارِ غزل جو رسالہ زمانہ اور دیگر رسالوں میں چھپ چکے ہیں منتخب کر کے بطور نمونہ یہاں دیئے جاتے ہیں۔

گردشِ دہر بھی اک گردشِ پیمانہ ہے — ذرہ ذرہ میں ترا جلوۂ مستانہ ہے
اِک طبیعت کی اُداسی کا اثر اتنا ہے — ساری دُنیا نگہِ یاس میں ویرانہ ہے
حالتِ محفلِ عشرت ہے رقم سب اِس میں — ایک دفتر کے برابر پرِ پروانہ ہے
پرتوِ مہر کجا ذرۂ ناچیز کجا — کیوں یہ دل حسرتیِ جلوۂ جانانہ ہے

تیرے ملنے کی وہ تقریب جو ہے یاد اب تک
جس سے کہتا ہوں وہ کہتا ہے اک افسانہ ہے

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی — اب یہ دنیا نہیں بدلنے کی

دیکھ لو سیرِ دم نکلنے کی   یہ ہوا پھر نہیں ہے چلنے کی

دلِ سوزاں کو شمع کیا کہیئے!

اُس کو حسرت کہاں ہے جلنے کی

مسدّس بھی نہایت عمدہ کہتے تھے۔ وہ مسدّس جو بطورِ مرثیہ اپنے پیارے نواسے کی موت پر کہا تھا نہایت درد انگیز و مؤثر ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں۔

ہوا تمام اُمیدوں کا خاتمہ تم پر   کسی سے اب نہ توقع ہے کسی پہ نظر

جہاں میں اپنا ہوا انجام کیا نہیں ہے خبر   مرے پہ دیکھیے ملتا ہے اب کفن کیونکر

کہاں گئے مری بگڑی سنوارنے والے

پکار لو مجھے لالہ پکارنے والے

تمھیں تو کہ اس اُجڑے مکاں کا تھا یہ چراغ   بہار پر تھا اسی نونہال سے یہ باغ

نہ ہوگا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ   تمام عمر دلِ ناتواں ہے اور یہ داغ

فغانِ بلبلِ جاں دل کے پار ہوتی ہے

نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

اسی طرح اُن کا وہ مسدّس بھی جو جنوبی افریقہ کی ستیہ گرہ کے موقع پر کہا تھا دل ہلا دینے والا ہے۔ آخر عمر میں جدید رنگ میں بھی طبع آزمائی شروع کی تھی مگر اس میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے کیونکہ جب کبھی اس رنگ میں کہنا چاہتے تھے وہ پُرانا رنگ پھوٹ نکلتا تھا اور وہ کلام بھی غزل ہی معلوم ہونے لگتا تھا۔

علاوہ شعر و شاعری کے وہ فنِ تنقید اور نثر نگاری میں بھی بہت ممتاز تھے۔ عرصہ تک رسالہ زمانہ میں نقاد لکھنوی کے نام سے کتابوں پر ریویو لکھتے رہے۔ معرکۂ چکبست و شرر میں جو مثنوی گلزارِ نسیم کے متعلق چھڑ گیا تھا انھوں نے نمایاں حصّہ لیا اور اُن کی رائے ہمیشہ بہت جچی تلی غیر جانبدارانہ اور منصفانہ ہوتی تھی جس سے اُن کی ذاتی قابلیت اور شاعرانہ مہارت کا پتہ

چلتا ہے۔

اس بات پر نظر رکھتے ہوئے کہ وہ جدید طریق تنقید سے کما حقہٗ آگاہ نہ تھے۔ اُن کے ریویو اور ادبی تنقیدیں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔

مختصر یہ کہ نظر ایک اعلیٰ درجے کے غزل گو اور نقاد تھے۔ ہر چند کہ اُن کا کلام کسی نئے پیام کا حامل نہ تھا۔ اُن کا کلام سلاست و روانی و پاکیزگی میں درگا سہائے سرور کے کلام سے بہت مشابہ ہے۔

بالفعل منشی بشیشر پرشاد منور نظر کے شاگردوں میں لکھنؤ میں موجود ہیں۔ افسوس کہ نظر کا کلام علاوہ اُس کے جو رسالوں اور گلدستوں میں شایع ہوا جمع نہ ہو سکا۔ ہمارے نزدیک اگر کوئی باہمت شخص اُن کا کلام یکجا کر کے اس کو شایع کر دے تو اُس سے ادبِ اُردو میں ایک مفید اور قیمتی اضافہ ہو جائے گا۔

چکبست لکھنوی

تحریک جدید کے مشہور لیڈر، روش تازہ کے صحیح راہبر، زمانۂ حال کی شاعری کے رُکنِ رکین، روش قدیم و جدید کے جامع پنڈت برج نرائن چکبست فیض آباد میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر ہی میں اپنے وطن اصلی لکھنؤ میں آ گئے جہاں ابتدائی تعلیم سے فراغت کر کے ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری اور ۱۹۰۸ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنؤ ہی میں وکالت شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی قابلیت، ایمانداری، مستعدی اور سب سے زیادہ اپنی خوش اخلاقی سے وکلاء کی صف اوّل میں آ گئے اور اُن

کی ذات سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ ہوگئیں۔ مگر افسوس ہے کہ عنفوان شباب میں ایک عجب حسرتناک طریقے سے انتقال کیا یعنی ۱۲۔ جنوری ۱۹۲۶ء کو جبکہ وہ کسی مقدمہ کی پیروی میں رائے بریلی گئے ہوئے تھے واپسی کے وقت ریلوے اسٹیشن پر ایک شدید دورہ فالج کا ہوا جس سے کہ بے حس و حرکت ہو گئے اور زبان بند ہوگئی اور قریب سات بجے شام کے اسٹیشن ہی پر روح مفارقت کر گئی۔ جب یہ وحشتناک خبر اُن کے بڑے بھائی رائے بہادر پنڈت مہاراج نارائن چکبست کو پہنچی تو وہ فوراً گئے اور لاش موٹر پر لکھنؤ لے آئے۔ اس سانحہ عظیم سے لکھنؤ بھر کو جو صدمہ اور قلق ہوا لائق بیان نہیں۔ عدالتیں بند کر دی گئیں۔ سر لوئی اسٹوارٹ چیف جج اور مسٹر کینڈل ڈسٹرکٹ جج لکھنؤ نے اپنے اپنے اجلاس پر اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مرحوم کے قلب و دماغ کے صفات عالیہ کی بہت تعریف کی اور ان کی اس ناگہانی موت پر بے حد رنج و قلق کا اظہار کیا۔ دنیائے ادب بھی اظہار رنج و ملال میں کسی سے پیچھے نہیں رہی۔ تعزیتی جلسے منعقد کیے گئے جن میں مختلف مذاہب کے لوگوں نے مؤثر اور دردناک تقریریں کیں۔ بڑے بڑے شعراء اور ادباء نے دردانگیز اشعار اور مضامین سپرد قلم کیے۔ تاریخیں کہیں۔ جن میں سے بعض چیدہ چیدہ اشعار جو اس موقع پر کہے گئے تھے نذر ناظرین کیے جاتے ہیں۔ صفی صاحب فرماتے ہیں ؎

شمع بزم شعر ابرج نراین چکبست — بے وفا عمر نے تم سے نہ وفا کی افسوس
داغ فرقت سے تمہارے لب اُردو پہ — دہر سفاک نے اک تازہ جفا کی افسوس
شور ماتم ہے بپا حلقۂ احباب میں آج — شان اس بزم میں ہے بزم عزا کی افسوس

ہائے بیتابی دل اور وہ بیتابی دل
جب زباں بند ہوا اک نکتہ سرا کی افسوس

عزیز لکھنوی فرماتے ہیں ؎

شاعر نکتہ سرا برج نراین چکبست — جس کو قدرت نے دیا ذوق سخن بے وراست

خادمِ قومِ صفا کیش مرنجان و مرنج ساقیِ میکدۂ نکتہ رسی جام بدست

سبق آموز ہے ہر نظم مرصع اُس کی
صاف ترشے ہوئے ہیرے کہ لفظوں کی نشست

ان کے علاوہ محشرؔ، محرومؔ اور سحرؔ ہنگامی نے بھی مؤثر نظمیں لکھیں۔ علی الخصوص آخر الذکر کا کہا ہوا مرثیہ نہایت مؤثر اور حسرت انگیز ہے مگر محشرؔ صاحب نے کمال کیا کہ مرحوم ہی کے ایک مشہور مصرعہ سے لفظ عزرا (۲۰۸) کا تعمیہ کرکے ایک نہایت عمدہ تاریخ نکالی ہے

ان کے ہی مصرع سے تاریخ ہے ہمراہ عزرا موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا
۱۳۴۴ھ

چکبست کو شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے نو برس کی عمر میں غزل کہی تھی۔ طالب علمانہ زندگی میں بھی وہ اس شغل سے بے پروا نہیں رہے بلکہ کالج کے مشاعروں میں شریک ہو کر خراج تحسین کے علاوہ انعام اور تمغے بھی حاصل کرتے رہے۔ مگر شاعری کو دون مرتبہ سمجھ کر یا شہرت طلبی سے عار کرتے ہوئے کبھی انھوں نے کوئی تخلّص نہیں کیا۔ ضرورت کے موقع پر صرف لفظ چکبست پر جو اُن کا خاندانی نام تھا اکتفا کرتے تھے۔ خود کہتے ہیں ہے

ذکر کیوں آئے گا بزمِ شعرا میں اپنا مَیں تخلّص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

شروع میں معمولی غزل کہتے تھے مگر کچھ عرصہ بعد قومی، سیاسی، سوشل اور نیچرل نظموں پر آ رہے جن میں اُنھوں نے کمال حاصل کیا۔ مسدّس کا شوق اُن کو بہت تھا۔

تخلّص کے ساتھ اُنھوں نے فرسودہ طریقہ اُستادی و شاگردی کو بھی خیرباد کہا تھا یعنی کسی کے شاگرد نہیں تھے اور صحیح معنوں میں "تلمیذ الرحمان" کہے جانے کے مستحق تھے۔ اساتذہ قدیم مثلاً میرؔ و غالبؔ انیسؔ و آتشؔ وغیرہ کے چشموں سے سیراب ہوتے اور انھیں بزرگوں کے کلام کو سامنے رکھ کر طبع آزمائی کرتے تھے۔ نثر میں مولانا محمد حسین آزاد کے پیرو تھے۔

چکبست کا مطمح نظر بہت وسیع تھا۔ چنانچہ مثنوی گلزار نسیم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "یادہ

رہے کہ محض عبارت سادہ نظم کرنا شاعری نہیں ہے۔ شاعری کی عام تعریف یہ ہے کہ نثر سے زیادہ دلکش ہو اور پُر تاثیر ہو۔ برخلاف نثر کے شاعری میں یہ اصول مدِ نظر رہتا ہے۔ کہ جو مضمون باندھا جائے اور محض ایک حالت کا اشارہ کرے۔ ترکیب الفاظ ایسی ہو کہ اس حالت کی نسبت مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے گزر جائیں۔"

بندش الفاظ پر بہت زور دیتے تھے۔ گویا یہ شعر آتش کا ان کے پیش نظر تھا ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

بندشِ الفاظ کے ساتھ مناسب ہندی الفاظ بھی موقع موقع سے خوب صرف کرتے تھے اور جدید رنگ کے مضامین اور خیالات کو صاف سادہ اور سلیس طرز میں کہنے پر قدرت رکھتے تھے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

چکبست کا مطبوعہ منظوم کلام بہت مختصر ہے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ آخر میں اپنے پیشہ کے کام میں مصروف رہنے کی وجہ سے شعر کہنے کا وقت بہت کم نکال سکتے تھے۔ ان کا مجموعہ نظم انڈین پریس الہ آباد میں چھپ گیا ہے جس پر ادب اُردو کے دلدادہ محسن سر تیج بہادر سپرو نے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی اضافہ کیا ہے۔ اُن کی تنقیدات اور دیگر مضامین بھی اسی پریس سے شایع ہو گئے ہیں۔ چکبست نے خود ایک ماہوار رسالہ "صبحِ اُمید" کے نام سے ۱۹۱۸ء میں جاری کیا تھا جو سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کا پرچہ تھا اس میں وہ اکثر لکھتے رہتے تھے مگر اُن کے مضامین زیادہ تر سیاسی رنگ کے ہوتے تھے۔ ہمارے خیال میں یہ مضامین کتابی صورت میں اب تک شایع نہیں ہوئے ہیں۔

بحیثیت غزل گو بحیثیت غزل گو چکبست پرانے رنگ سے بالکل علیحدہ رہنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے صنف غزل میں ایک خاص جدت اور ترقی کی اور قدیم طرز سے علیحدہ رہے۔ پُرانے فرسودہ تشبیہات و استعارات اور لوازمات غزل گوئی کو یک قلم خارج کر دیا اور شیریں

اور صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا اور یہی چیزیں ان کے کلام کے مابہ الامتیاز جوہر ہیں۔ ان کے مجموعہ نظم میں بمشکل پچاس غزلیں نکلیں گی اور ان میں بھی اکثر ناتمام ہوتی ہیں مگر انھیں میں انھوں نے اپنی سحر کاری اور جادو نگاری کا پورا کرشمہ دکھا دیا ہے۔ کہیں کہیں فلسفہ اور اخلاق اور نصیحت آمیز شعر بھی خوب کہے ہیں۔ اُن کے اکثر اشعار دارالضرب کے سکۂ شاہی ہیں اور بقاء دوام کے مستحق ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا — اجل کیا ہے خُمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا — دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

کمالِ بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں — اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

اُبھرنے ہی نہیں دیتی ہمیں بے مائگی دل کی — نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا — نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

دلِ احباب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر — یہی جنت ہے میری اور یہی باغِ ارم میرا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انساں سہتا ہے — نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر — کہ جیسے عکسِ گُل رہتا ہے آبِ جوئے گلشن پر

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے — جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

ہمارے اور واعظوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے
کہیں گے ہم جس کو پاسِ انساں وہ اس کو خوفِ خدا کہیں گے

طویل نظمیں ان کی طویل نظموں میں علاوہ مذکورۂ بالا خوبیوں کے مقامی رنگ اور ہندی الفاظ کا بھی بہت خوشگوار اضافہ ہے جس کے کلام کا اثر دوبالا ہو جاتا ہے۔ ان نظموں کا ملکی رنگ قدیم ملکی روایات، رسم و رواج کا شمول، نئے نئے تشبیہات و استعارات، اعلیٰ آئیڈیل ان کی نظموں کو ادبی جواہر ریزے بنا دیتے ہیں۔ چکبست کی اس قسم کی نظمیں پانچ قسموں پر تقسیم ہو سکتی ہیں

(۱) مراثی جو ہندوستان کے مشہور لیڈروں کی وفات پر کہے گئے۔

(۲) قومی و سیاسی نظمیں جو ملک کے اہم سیاسی مضامین پر لکھی گئیں جن سے اعلیٰ تخیل کے ساتھ شاعر کے سیاسی آئڈیل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ درحقیقت تمام تعلیم یافتہ نوجوانانِ ہند کی بلند خیالیوں کی حقیقی ترجمان ہیں۔

(۳) سوشل نظمیں

(۴) مذہبی نظمیں

(۵) نیچرل نظمیں

مراثی اس صنف میں وہ پُرزور اور درد انگیز نظمیں شامل ہیں جو ملک کے جاں نثار لیڈروں اور آزادی کے علمبرداروں کی وفات پر شاعر کے قلم سے نکلیں۔ یہ عموماً مسدّس کی شکل میں ہیں اور جوش و تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں بلکہ فی الحقیقت یہ وہ آزادی اور حریت کے خیالات ہیں جو کسی علمبردار آزادی کے اس دنیا سے رخصت ہونے پر شاعر کے دل میں موجزن ہوئے اور زبانِ قلم سے آنسوؤں کی طرح ٹپک پڑے۔ چند بند یہاں بطورِ نمونہ دیئے جاتے ہیں۔

گوپال کرشن گوکھلے کے متعلق ؎

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو — مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو — مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے تیرے نکلتا ہے
سُہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

بال گنگا دھر تلک کے متعلق ؎

اُٹھ گیا دولتِ ناموسِ وطن کا وارث — قومِ مرحوم کے اعزاز کہن کا وارث
جاں نثارِ ازلی شیرِ دکن کا وارث — پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رَن کا وارث

تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں
آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

پنڈت بشن نرائن در کی دائمی مفارقت پر ؎

ہم نے دیکھے ہیں ترے اشکِ محبت اکثر　　　جن پہ صدقے ہیں زباں اور قلم کے جوہر
وہ چمکتے تھے حمیت کے ترے قلب و جگر　　　ہوئی غیروں کو نہ اس پاک خزانہ کی خبر
ظاہری حسن لیاقت کے یہ دیوانے ہیں
شمع دیکھی نہیں فانوس کے پروانے ہیں

قومی نظمیں ان سب میں وہی انداز ہیں اور وہی سچے جذبات جلوہ گر ہیں جو مرثیوں میں نمایاں ہیں وہی شستگیِ الفاظ، وہی اعلیٰ اور اچھوتے خیالات۔

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے　　　دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے　　　اللہ ری زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی　　　(از خاکِ ہند)

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی　　　تھا جس پہ ناز مسیحا کو وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی ہے وہ ادا ہے یہی　　　غریب ہند کے آزار کی دوا ہے یہی
نہ چین آئے گا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے

یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا　　　رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا　　　دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے　　　(وطن کا راگ)

Home Rule

آبروئے قوم نے پائی ہے وہ دن آیا ہے — تو نے پودا جو لگایا تھا وہ پھل لایا ہے
مرنے والوں کی وفا کا یہی سرمایا ہے — ہم نے بھولے ہوئے ورثہ کا نشاں پایا ہے

دل تڑپتا ہے کہ سوراج کا پیغام ملے
کل ملے آج ملے صبح ملے شام ملے

دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رُک جائے — حکم حاکم کا ہے فریاد زبانی رُک جائے
پر یہ ممکن نہیں اب جوشِ جوانی رُک جائے — قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رُک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا نہیں یہ قوم نے کروٹ لی ہے (مسز بسنٹ کی نظربندی پر)

جب ۱۹۱۴ء میں مہاتما گاندھی ہندوستانی باشندوں کی حالت پر غور کرنے اور اس کو سدھارنے کے لیے جنوبی افریقہ گئے تو چکبست نے ایک پُر تاثیر نظم "فریاد" کے نام سے لکھی جس میں مہاتما جی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

ادھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا — وطن سے دور رہیں ہم پہ نگاہ کر بیٹھ

۱۹۱۶ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس میں کچھ نفاق و شقاق پیدا ہوا تھا جس سے بعض لیڈر کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تو انھوں نے "نالۂ درد" کے نام سے ایک نظم تیار کی۔ اسی طرح لکھنؤ کے اجلاس کانگریس منعقدہ ۱۹۱۶ء میں ایک زوردار نظم پڑھی تھی جس کا ایک شعر اس وقت یاد ہے ؎

ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا — برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا

جنگ عظیم میں شرکت کے لیے جب ہندوستانی سپاہی یہاں سے روانہ ہونے لگے تو وہ اُن سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں ؎

طنطنہ جرمن خود بیں کا مٹا کر آنا — ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا
ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا — قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا

یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لیے
دھار تلوار کی ہے پار لگانے کے لیے

سوشیل نظمیں سوشیل معاملات کی اصلاح میں بھی شل سیاسی معاملات کے اُن کا مسلک میانہ روی اور اعتدال پسندی تھا۔ اُن کی نظم "پھول ملا" جو ہندوستانی عورتوں کے واسطے ہے۔ عورتوں کو بہت زیادہ آزادی اور تفریح (انگریزیت) کی خرابیوں سے متنبہ کرتی ہے، کہتے ہیں ؎

روشِ خام پہ مردوں کے نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز

نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم
تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

رنگ ہے جس میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز

نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرتِ قومی نہ ملانا ہرگز

رُخ سے پردے کو اُٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز

پُوجنے کے لیے مندر جو ہے آزادی کا
اُس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز

وہ ازدواج بیوہ کے بھی مؤید تھے اور ۱۹۱۷ء میں ایک نظم "برقِ اصلاح" کے نام اپنی خاص جماعت (کشمیریوں) کے واسطے اسی مبحث پر لکھی تھی۔

مذہبی نظمیں اس صنف میں اُنھوں نے بڑا زورِ قلم دکھایا ہے۔ رامائن کا وہ منظر جہاں سری رامچندر جی بن باس سے پیشتر اپنی ماں سے رخصت ہونے جاتے ہیں نہایت مؤثر اور درد انگیز الفاظ میں دکھایا ہے۔

"کشن کنھیا" سری کرشن جی کی پیدائش کے متعلق چھوٹی سی ایک نہایت دلکش اور مقدس نظم ہے اور سب سے زیادہ دلچسپ پُر زور اور مؤثر نظم گائے پر ہے جس کے دو بند یہاں دیے جاتے ہیں ؎

دیکھے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار
بے پئے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار

مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار وہ اُترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزہ کا نکھار

ایک اک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا

پی کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

صاحب دل تجھے تصویر وفا کہتے ہیں چشمۂ فیض خدا امرِ خدا کہتے ہیں

دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں

کون ہے جس نے ترے دودھ سے منہ پھیرا ہے

آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

نیچرل نظمیں ان کی تعداد گو کم ہے مگر جس قدر ہیں سب اعلیٰ تخیل اور حسن بندش سے لبریز ہیں، پرانی تشبیہیں اور تمثیلیں ان میں مطلق نہیں، "پھول" "جلوۂ صبح" "سیر دون" اسی قبیل کی نظمیں ہیں جن میں آخرالذکر لطافت و عمدگی میں سب پر فوقیت رکھتی ہے۔

رباعیات چند رباعیات بھی کہی ہیں حسب ذیل رباعی اپنے حسب حال ہے:

بیکار تعلّی سے ہے نفرت مجھ کو لو دادِ سخن نہیں یہ عادت مجھ کو

کس واسطے جستجو کروں شہرت کی الدان خود ڈھونڈلے گی شہرت مجھ کو

چکبست کی زبان اُن کی زبان نہایت صاف شستہ اور شیریں ہے۔ الفاظ نہایت مناسب روزمرہ اور روزمرہ استعمال کرتے ہیں۔ کلام میں لکھنؤ کا رنگ ہے مگر بہترین قسم اور اعلیٰ درجہ کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ مناسب ہندی الفاظ کلام میں ملاکر کلام کی شیرینی اور اثر کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

چکبست بحیثیت نقاد بسبب اعلیٰ انگریزی دانی کے چکبست مشرقی اور مغربی دونوں قسم کی تنقیدوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اسی وجہ سے ان کی رائیں ادبی معاملات میں بہت جچی تُلی منصفانہ اور غیر جانبدارانہ تھیں کبھی کسی تعریف یا تنقیص آنکھیں بند کرکے یا مبالغہ کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ ذاتی حملوں سے ہمیشہ بچتے اور اشتعال طبع پر بھی اعتدال اور میانہ روی

کو ہاتھ سے نہیں دیتے تھے۔ بیجا مناظرہ اور تُو تُو میں میں سے ہمیشہ گریز کرتے جیساکہ خود
کہتے ہیں ؎

اُلجھ پڑوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں   وہ پھول ہوں جو کسی کے گلے کا ہار نہیں

ان کے مضامین داغ اور سرشار اور اُردو شاعری پر نہایت اعلیٰ درجے کے ہیں اور بڑی واقفیت اور معلومات کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ مشہور مناظرہ جو معرکۂ چکبست و شرر کے نام سے مشہور ہے ان کی اعتدال پسندی متانت اور فنی قابلیت کا شاہد عادل ہے اور اس معاملہ میں اُن کی تعریف اکثر مشہور اہل فن و اہل قلم نے کی ہے۔ جو انتخابات غالب و آتش وغیرہ کے کلام کے "عطر سخن" کے نام سے رسالہ صبح اُمید میں چھپا کرتے تھے۔ وہ اُن کی سخن فہمی اور نکتہ سنجی کا بیّن ثبوت ہیں۔

چکبست بحیثیت نثار نثر میں بھی مثل نظم کے اُن کا پایہ بہت بلند تھا۔ علاوہ "صبح اُمید" کے وہ اکثر موقر رسالوں میں مثلاً کشمیری درپن، خدنگ نظر، زمانہ وغیرہ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان کی عبارت نہایت متین معنی خیز زور دار اور روشن ہوتی ہے۔ منشی سجاد حسین سابق اڈیٹر اودھ پنچ، ستم ظریف (مرزا مچھو بیگ عاشق لکھنوی) نواب سید محمد آزاد، جوالا پرشاد برق، رتن ناتھ در، دیا شنکر کول، تربھون ناتھ ہجر وغیرہ پر جو مختصر مضامین اُنھوں نے لکھے ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہیں۔

رامائن کے سین سے چند بند بطور نمونہ یہاں پیش کیے جاتے ہیں جن سے چکبست کی قدرت زبان اور چستی بندش کا حال بخوبی معلوم ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہوگا جیساکہ حالات مصنف میں جو شروع میں کتاب صبح وطن میں دیے ہوئے ہیں لکھا ہے کہ "وہ انیس کے کلام کے شیدا تھے"۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام | راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام | دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال | خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال | سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

یہ عجیب بات ہے کہ غالب اور انیس کا اثر زمانہ حال کی شاعری پر اس درجہ چھایا ہوا ہے کہ اس زمانے کے اکثر شعرا جب کسی چیز کو مؤثر اور درد انگیز بنانا چاہتے ہیں تو یہی صنف اختیار کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے چکبست کی تقریباً دو ثلث نظمیں جو مجموعہ صبحِ وطن میں چھپی ہیں اسی مسدس کی صورت میں ہیں۔ مگر انھوں نے بعض نظموں میں (مثلاً مرقعِ عبرت جو کسی قومی انجمن کے سالانہ جلسے کے واسطے لکھی گئی تھی) مسدس حالی کے تتبع اور اسی رنگ میں قوم کی حالت، نوجوانوں کی حالت، مذہب، دولت، آزادی و اصلاح وغیرہ کے عنوان سے آٹھ آٹھ دس دس بند کہے ہیں۔ چنانچہ نوجوانوں کی حالت کے متعلق کہتے ہیں ؎

موجود ہے جن بازوؤں میں زورِ جوانی | طوفاں سے انھیں کشتیِ قومی ہے بچانی
پُر ہے مئے غفلت سے سرِ دل میں یہ گرانی | آرام پسندی میں یہ رکھتے نہیں ثانی
پہلو میں کسی کے دلِ دیوانہ نہیں ہے
ہیں مرد مگر ہمتِ مردانہ نہیں ہے

عبرت نہیں دیتا انھیں نیرنگِ زمانہ | عمر اُن کی فقط لہو و لعب کا ہے فسانہ
تعلیم کہاں اور کہاں صحبتِ دانا | بس پیشِ نظر رہتا ہے آئینہ و شانہ

گہ رُخ پہ گہے موئے پریشاں پہ نظر ہے
اِک شغل یہی ان کے لیے شام و سحر ہے

ہمت نہیں لیکن دل پُر جوش پہ نازاں
بے ہوش و خرد ہیں خرد و ہوش پہ نازاں
بدشکل ہوں پر چشم و لب و گوش پہ نازاں
کم ظرف کوئی اپنے تن و توش پہ نازاں
نیرنگیِ افلاک کا ڈر ان کو نہیں ہے
فرعون ہیں موسیٰ کی خبر ان کو نہیں ہے

مذہب کے متعلق ؎

سودائے محبت میں نہیں ان کے ہے خامی
خود بینی سے خالی نہیں مذہب کے ہیں حامی
عرفاں کی خبر لاتی ہو طبعِ گرامی
ہے نفس کے منظورِ حقیقت میں غلامی
کچھ قوم کی پروا ہے نہ فکرِ کہ دمہ ہے
ہو جائے نجات اپنی تمنا ہے تو یہ ہے

عالم کے دکھانے کے لیے خاک نشیں ہیں
دعویٰ ہے کہ ہم مالکِ فردوسِ بریں ہیں
دنیا کی ترقی پہ سدا چیں بجبیں ہیں
گویا کہ یہی رازِ الٰہی کے امیں ہیں
جو اور ہیں وہ معرفتِ حق سے جُدا ہیں
بس ایک یہی بندۂ مقبولِ خُدا ہیں

مذمت شراب کے متعلق ۔ جو "آب انگور" کے نام سے لکھی گئی ۔

رفیق اس کی ہے مستی عدو شعور اس کا
وداعِ ہوش کا ساماں ہے ظہور اس کا
خمارِ مرگ جو لائے وہ ہے سرور اس کا
سیاہ قلب کو کر دے جو ہے وہ نور اس کا
لگائے آگ کلیجے میں جو وہ آب ہے یہ
کرے جو طرفہ قیامت وہ آفتاب ہے یہ

خیال بادہ کشی دل میں گر ہویدا ہو ۔۔۔ تمام قلب سیہ ۔ صورتِ سویدا ہو
زباں مزے پہ جوابِ طرب کے شیدا ہو ۔۔۔ تو سوزِ آتش پنہاں جگر میں پیدا ہو
زباں کے واسطے گو رشک انگبیں ہے یہ
مگر جگر کے لئے آبِ آتشیں ہے یہ

ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال زمانہ حال کے فلسفی شعراء میں ایک بہت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی شہرت حدود ہندوستان سے نکل کر بلادِ اسلام افغانستان و ایران بلکہ یورپ و امریکہ تک پہونچی ہے۔ وہ زمانہ موجودہ میں ایک زبردست اور نمایاں ہستی ہیں اور ان کا نام اور کلام شعرائے حال کی صفِ اولیں میں بھی سب سے آگے ہے۔ سال ولادت[ل] ۱۸۷۶ء اور مقام ولادت سیالکوٹ ملک پنجاب ہے مگر بزرگوں کا اصلی وطن کشمیر ہے جیسا کہ اُن اشعار سے ظاہر ہوتا ہے ؎

بُلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور ۔۔۔ ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے ۔۔۔ اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد ۔۔۔ جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

تعلیم ابتدائے عمر میں ایک مکتب میں پڑھا۔ پھر تھوڑے عرصہ کے بعد جب انگریزی کا شوق ہوا تو سیالکوٹ کے اسکول میں داخل ہوئے جہاں اپنے ساتھ والوں میں بہت ممتاز تھے اور

ل ولادت جمعہ ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ ۔ ۹ نومبر ۱۸۷۶ء وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء ۔ فاضل

برابر انعام اور اسکالر شپ پاتے رہے۔ میٹریکولیشن، کا امتحان پاس کرکے اسکاٹس مشن کالج سیالکوٹ میں نام لکھایا جہاں عربی و فارسی کے مشہور پروفیسر اور علوم مشرقیہ کے باکمال عالم سید میر حسن صاحب کے زیر تعلیم و نگرانی رہے اور اُنھیں بزرگ کی بدولت شعر و شاعری وادبیات کا ذوق اُن میں پیدا ہوا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان اوّل درجے میں پاس کرکے گورنمنٹ کالج لاہور کے درجہ بی، اے میں داخل ہوئے اور فلاسفی منجملہ مضامین اختیار کے لی۔ یہیں سے نہایت نیکنامی اور عزت کے ساتھ بی اے کی ڈگری لی جس میں زبان عربی اور انگریزی میں اسپیشل پروفیشنسی (امتیاز خصوصی) حاصل کیا۔ اس کے بعد جب ایم۔ اے کا امتحان دیا تو یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے۔

مسٹر آرنلڈ سے تلمذ لاہور میں علی گڑھ کالج کے مشہور ہر دلعزیز پروفیسر مسٹر آرنلڈ سے فخر تلمذ حاصل ہوا جس سے اقبال کو بہت فوائد حاصل ہوئے۔ اس کا اثر جانبین پر بہت گہرا اور دیرپا تھا، چنانچہ جب صاحب موصوف انگلستان جانے لگے تو اقبال نے ایک نہایت مؤثر نظم "نالہ فراق" (آرنلڈ کی یاد میں) اس موقع پر لکھی تھی[1]، اب لاہور ہی میں اُنھوں نے وطن اختیار کرلیا اور بعد فراغت تعلیم پہلے اورینٹل کالج میں تاریخ و فلسفہ و معاشیات کے پروفیسر پھر گورنمنٹ کالج میں انگلش اور فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

---

[1] یہ مختصر نظم مسدس کی صورت میں ۵ بند کی ہے۔ پہلا بند یہ ہے ؎

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اُس کو سرزمیں
آگیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں
ظلمتِ شب سے ضیائے روزِ فرقت کم نہیں
تا ز آغوشِ وداعش داغ حسرت چیدہ است
ہمچو شمعِ کشتہ در چشمم نگہ خوابیدہ است

قیام انگلستان ستمبر ۱۹۰۵ء میں بغرض انگلستان روانہ ہوئے جس کے تمام مصارف کے کفیل اُن کے بھائی تھے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوکر ڈاکٹر ٹیگرٹ کے زیر تعلیم مغربی فلسفہ پڑھنا شروع کیا اور کتب بینی بکثرت کی اور یہیں انگلستان کے مشہور مستشرقین پروفیسر براون، نکلسن اور سارلی سے استفادہ کا موقع ملا۔ ایتھکس (اخلاقیات) میں ڈگری حاصل کر کے جرمنی گئے اور میونک میں کچھ عرصہ تک قیام کر کے اپنا تھیسس (مضمون) متعلق بہ فلسفہ ایران تیار کیا۔ میونک ہی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری اُن کو ملی اور مضمون مذکور انگلستان میں میٹا فزکس آف پرشیا (فلسفہ ایران) کے نام سے شایع اور اُن کے قدیم دوست مسٹر آرنلڈ (جو اَب سر ٹامس آرنلڈ ہیں) کے نام سے معنون ہوا۔ جرمنی سے انگلستان واپس آکر بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ جب مسٹر آرنلڈ جو لندن یونیورسٹی کے عربی پروفیسر مقرر ہو گئے تھے رخصت پر گئے تو ڈاکٹر اقبال ہی نے کچھ عرصہ تک اُن کی قائمقامی کی تھی۔ بعد واپسی انگلستان لاہور میں اُن کا پُرجوش خیر مقدم ہوا اور یہیں پر انھوں نے اپنی پریکٹس شروع کی اور باوقات فرصت شعر و شاعری کے مشغلے میں بھی مصروف رہے۔ اُن کی قابلیت اور شہرت کے سبب سے ایک زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبل پرائز اُن کو یقیناً ملے گا۔ ۱۹۲۲ء میں درجہ نائٹ ہڈ یعنی سر کے معزز لقب سے ممتاز ہوئے۔

اقبال ایک وسیع النظر شاعر ہیں۔ اُنھوں نے فلسفہ مشرق و مغرب دونوں کا عمیق مطالعہ کیا۔ وہ علاوہ ایران کے فلسفہ کے ہندوستان کے فلسفے سے بھی بخوبی واقف ہیں اور زبان و ادب فارسی میں اُن کا تبحّر اُن کے فارسی کلام سے بخوبی ظاہر ہے۔

تصانیف تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) علم الاقتصاد۔ اُردو اقتصادیات پر ایک رسالہ جو ۱۸۹۶ء میں شایع ہوا تھا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس فن میں اُردو میں پہلی تصنیف ہے۔

(۲) فلسفہ ایران - اس کا ذکر اوپر ہوا۔

(۳) اسرار خودی - مثنوی فارسی جس میں فلسفہ خودی کی بحث ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے مع دیباچہ اور نوٹوں کے شایع کیا ہے اور یورپ و امریکہ میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

(۴) رموز بیخودی - یہ بھی مثل نمبر ۳ کے فارسی میں فلسفیانہ مثنوی ہے جس کی خاص غرض مسلمانوں میں روح حیات پیدا کرنا ہے۔

(۵) پیام مشرق - بجواب جرمن شاعر گیٹے کے "سلام مغرب" کے۔ یہ بھی فارسی میں ہے۔ اور بہت مقبول ہے۔

(۶) بانگ درا - مجموعۂ نظم اردو مطبوعہ ۱۹۲۴ء۔ اسی طرح کا ایک دوسرا مجموعہ "کلیات اقبال" کے نام سے مولوی محمد عبدالرزاق نے ایک طویل مقدمہ کے ساتھ حیدر آباد سے شایع کیا ہے۔ اقبال کا فارسی کلام ہماری کتاب کے مبحث سے خارج ہے لہذا اس پر خصوصاً کوئی رائے زنی نہیں کی جا سکتی۔ البتہ اُن کے کلام اردو پر کی جائے گی۔

اقبال کی شاعری اقبال کو شعر کا ذوق ابتدائے عمر ہی سے تھا جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ جب وہ سیالکوٹ اسکول میں پڑھتے تھے تب ہی سے فکر سخن کرنے لگے تھے۔ لاہور کے قیام میں اس شوق نے اور بھی ترقّی کی اور آخر ایک مشاعرہ میں اُنھوں نے اپنی ایک غزل پڑھی، جس میں اتفاقاً اُردو کے مشاق شاعر اور مشہور زباں داں مرزا ارشد گورگانی بھی تھے، جنھوں نے اس شعر کی خاص طور پر بڑی تعریف کی ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اسی عرصہ میں اقبال کو ارشد سے تلمذ بھی ہو گیا مگر کچھ دنوں بعد وہ داغ کے باقاعدہ شاگرد ہوئے۔ جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اُس پر نہیں نازاں　　مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں پر

مگر افسوس ہے کہ یہ سلسلہ تلمذ کا بہت دیر قائم نہ رہا۔ شروع میں اقبال اپنا کلام صرف مجمع احباب اور مخصوص مشاعروں تک محدود رکھتے تھے۔ پبلک میں اُن کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جبکہ اُن کی مؤثر اور دلکش نظم "نالۂ یتیم" انجمن حمایت الاسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ اجلاس (۱۸۹۹ء) کے عظیم الشان اجتماع میں پڑھ کر سنائی گئی اور اُس کے بعد اُن کی دوسری نظم "ہمالہ" اسی انجمن کے کسی دوسرے سالانہ جلسے میں دوستوں کے اصرار سے پڑھی گئی۔ جو رسالہ مخزن لاہور کے سب سے پہلے پرچے میں شایع ہوئی تھی۔ اس کے بعد تا ردانگی ولایت وہ برابر بہت شوق سے کہتے رہے اور اُن کا کلام متعدد اُردو پرچوں ادبی رسالوں اور کانفرنسوں کے اجلاسوں کی زینت سمجھا جاتا تھا اور نہایت اشتیاق اور عزت کے ہاتھوں سے لیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں اُنھوں نے بہت کچھ کہا اور بہت جلد کہنے کی مشق بہم پہنچائی حافظہ ایسا زبردست پایا تھا کہ اکثر پوری پوری نظمیں بغیر کاغذ دیکھے پڑھ سکتے تھے۔ وہ تقریباً ہر سال اپنی ایک نہ ایک نظم انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں سناتے تھے۔ جس سے اُن کی شہرت دنیائے اُردو میں پھیل گئی۔ تصویر درد، فریادِ اُمت، ہمارا دیس، نیا شوالہ، ترانہ اور اسی قسم کی دوسری نظمیں اسی موقع پر پڑھی گئیں اور اسی زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔

قیام یورپ کے زمانے میں اقبال نے شعر گوئی ترک کر دی تھی یہاں تک کہ اس سے بالکل تائب ہو جانا چاہتے تھے مگر اپنے بعض مخصوص دوستوں مثلاً پروفیسر آرنلڈ اور خان بہادر شیخ عبدالقادر کے اصرار سے اس ارادہ سے باز رہے اور زبان فارسی کو اپنے اظہار خیالات و جذبات کا ذریعہ قرار دیا[۱]۔ ہندوستان واپس آکر فارسی اُردو دونوں میں کہنے لگے۔ مگر اب زیادہ تر

---

[۱] شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا سابق مدیر مخزن نے جو فاضلانہ دیباچہ "بانگ درا" پر لکھا ہے اس میں وہ اس خاص موقع کی نسبت یعنی جب اقبال اپنا شوق شاعری ترک کرنا چاہتے تھے مگر شیخ صاحب موصوف اور مسٹر آرنلڈ کے اصرار سے وہ باز رہے اپنے خاص دلکش انداز میں لکھتے ہیں" اس زمانے میں دو بڑے تغیر اُن کے خیالات میں آئے ان تین سالوں میں سے دو سال ایسے تھے (باقی اگلے صفحہ)

(باقی اگلے صفحہ)

اُن کا رجحان ملّیت (پین اسلامزم) کی طرف ہے شکوہ، جواب شکوہ، اور اسی قسم کی پُرجوش نظمیں اُس زمانے کی یادگار ہیں۔

اقبال کی شاعری کے تین دَور اقبال کی شاعری کے تین دَور صاف طور پر نظر آتے ہیں[۱]۔ پہلا دَور ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء تک کا یعنی جب تک کہ وہ ولایت نہیں روانہ ہوئے تھے۔ یہ دَور اُن کی تیاری کا زمانہ کہا سکتا ہے۔ اس زمانے کے کلام میں جو زیادہ تر غزلوں کی صورت

(بقیہ صفحہ ۲۳۱) جس میں میرا بھی وہیں قیام تھا اور اکثر ملاقات کے موقع رہتے تھے۔ ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ اُن کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں اور قسم کھالیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے اُسے کسی اور مفید کام میں صرف کریں گے۔ میں نے اُن سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے جسے ترک کرنا چاہیئے بلکہ اُن کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے اس لیے ایسی مفید خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہوگا شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادہ ترک شعر کو بدل دیں اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترک شعر اختیار کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لیے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت اس شغل کی نذر کرتے ہیں وہ اُن کے لیے بھی مفید ہے اور ان کے مُلک و قوم کے لیے بھی مفید ہے۔ ایک تغیر جو ہمارے شاعر کی طبیعت میں آیا تھا اُس کا تو یوں خاتمہ ہوا مگر دوسرا تغیر ایک چھوٹے سے آغاز سے ایک بڑے انجام تک پہنچا یعنی اقبال کی شاعری نے فارسی زبان کو اُردو زبان کی جگہ اپنا ذریعہ اظہار خیال بنالیا۔"

[۱] اقبال کی شاعری کے یہ تین دَور غالباً اُن کے مطبوعہ کلام اُردو (بانگ درا) کے تین حصوں پر مبنی ہیں۔ ان حصوں کی تقسیم اس طرح پر ہے۔ حصہ اوّل ۱۹۰۵ء تک۔ حصہ دوم ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک۔ حصہ سوم ۱۹۰۸ء سے۔

نیں ہے۔ اُن کی طباعی کی جھلک اور ان کی سحر نگاری کی ابتداء مشق کے الفاظ و بندش میں کسی قدر بھونڈا پن ہے اور وہ موسیقیت و مصوری الفاظ ابھی درجہ کمال کو نہیں پہنچی مگر اس کا وجود ضرور پایا جاتا ہے اور ایک درخشاں مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔ اقبال اس دَور میں ایک ملّی شاعر نہیں، بلکہ ایک مُلکی شاعر نظر آتے ہیں یعنی وہ تمام ہندوستان اور تمام مختلف المذاہب اور مختلف الخیال ہندوستانیوں کے شاعر ہیں۔ اُن کی نظمیں ہمالہ، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوّں کا قومی گیت، نیا شوالہ وغیرہ اسی زمانے کی تصنیف ہیں جنھوں نے اقبال کو تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں عزّت کی جگہ دی اور اُن کی شہرت کو تمام ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا۔

دوسرا دَور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا اُن کے قیام یورپ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس زمانہ اُن کی تصانیف کی تعداد بہت ہی کم ہے اور تین چیزیں اس دَور کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ایک یہ کہ اقبال کو اس عرصہ میں فارسی کا بہت شوق ہو گیا اور اسی زبان کو انھوں نے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک سخت ملّی شاعر ہو گئے۔ اور اُن کے خیالات اسی ایک مرکز پر جمع ہو گئے۔ تیسرے یہ کہ اس زمانے کی اُن کی نظمیں گو کہ عمق خیال کے اعتبار سے بڑھ گئیں مگر فلسفیت اُن پر غالب آ گئی جو اقبال کے فلسفہ مشرق و مغرب پڑھنے کا نتیجہ تھا، ترانۂ ملّی وغیرہ اسی انداز اور اسی دَور کی نظمیں ہیں۔

تیسرا دَور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ اقبال ۱۹۰۸ء میں ہندوستان واپس آئے۔ اس میں اُن کی مشق شاعری درجۂ کمال کو پہنچ گئی۔ اس میں اُن کا کلام پُر زور اور شیریں الفاظ کا ایک خزانہ ہے۔ مگر یہ الفاظ زیادہ فارسی ہیں۔ ملّیت کا عنصر غالب ہے مگر وطنیت کا جذبہ کم ہے۔ اسی سبب سے وطن کی زبان (اُردو) پیش پیش نہیں ہے۔ یعنی اس دَور میں اس کو وہ مرتبہ نہیں حاصل ہے جو دَورِ اوّل میں تھا اور جس کی وہ اب بھی

یقیناً مستحق ہیں۔ فارسیت کا غلبہ ان کے فارسی الفاظ اور فارسی تراکیب اور اساتذہ عجم کے کلام کی تضمین سے ظاہر ہے۔ تمام عشاق اُردو اس دن کے منتظر ہیں کہ جب اقبال کی شاعری مثل سابق کے ایک وطنی اور خالص اُردو شاعری کی حیثیت سے پھر جلوہ نما ہو گی۔

اقبال کی اُردو غزلیں اور نظمیں مثل دیگر شعرا اُردو کے اقبال کی شاعری کا آغاز بھی تغزّل سے ہوا۔ جیسا کہ اُوپر لکھا گیا پہلے وہ ارشد گورگانی کے پھر داغ کے شاگرد ہوئے۔ داغ کا ذکر انھوں نے نہایت محبّت اور شکر گزاری کے ساتھ اس مرثیہ میں کیا ہے جو اُن کی وفات پر لکھا تھا۔ نیز اکثر مقطعوں میں بھی اُن کی طرف اشارہ ہے۔ مگر یہ سلسلۂ تلمذ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ اُن کی ابتدائی غزلوں میں کوئی غیر معمولی اور خاص بات نہیں پائی جاتی مگر آئندہ ترقیوں کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ کہیں کہیں بندش بھونڈی مگر تخیل اعلیٰ ہے۔ جوں جوں تجربہ بڑھتا گیا اُسی قدر کلام میں پختگی کے ساتھ حسنِ بندش اور نشست الفاظ کی خوبصورتی بھی ترقی کرتی گئی اور اسقام کم ہوتے گئے۔ غزلوں کی تعداد گو کہ صرف ۲۷ ہے مگر متانتِ کلام بلندیٔ خیال اور فلسفیت میں وہ مرزا غالب کی غزلوں سے ٹکر کھاتی ہیں۔ اسی وجہ سے اگر اقبال جانشین غالب کے معزز لقب سے یاد کیے جائیں تو کچھ بیجا بات نہیں۔ ہر چند کہ غالب کی سی نزاکت خیال اور اُن کی مخصوص ترکیبیں اقبال کے یہاں نہ سہی پھر بھی کلام کا جذبات سے لبریز ہونا اور فلسفہ اور تصوف کے رنگ میں شرابور ہونا اُن کے کلام کو غالب کے کلام سے بہت قریب پہنچا دیتا ہے۔ بعض جگہ فارسیت کی کثرت اور تصنّع و آورد کے معائب کلام کی روانی، موسیقیت، الفاظ، اثر، بلندیٔ خیال اور ارتفاع نظر کے محاسن سے دُور ہو جاتے ہیں۔ اہل دہلی و لکھنؤ چھوٹی چھوٹی لفظی لغزشوں پر نکتہ چینی کیا کریں۔ پُرانے رنگ کے اُستاد عروضی غلطیاں نکالیں یا کہیں کہ فلاں لفظ غلط یا بے موقع ہے مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اقبال کے ہر ہر شعر پہ اُن کی طباعی اور ذہانت کا ٹھپّہ لگا ہوا ہے جس سے اُن کا کلام بہت سی چیزوں میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

چھوٹی نظمیں سہل اور صاف عبارت میں مثل حالی اور اسمٰعیل کی نظموں کے ہیں۔ یہ زیادہ تر اُسی زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں جبکہ اقبال پر فارسیت کا غلبہ کم تھا۔ اکثر یہ نظمیں بچوں کی درسی کتابوں میں شامل ہیں اور ان سے کوئی نہ کوئی عمدہ اخلاقی نتیجہ نکالا گیا ہے۔ بعض نظموں کے نام یہ ہیں: ہمدردی، ایک مکڑا اور مکھی، ایک گائے اور بکری، ایک پہاڑ اور گلہری، بچے کی دعا، ماں کا خواب وغیرہ۔ چونکہ یہ چھوٹے بچوں کے واسطے لکھی گئیں۔ لہذا اُن کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے۔

طویل نظمیں اقبال کی شہرت کا دارومدار اُن طویل نظموں پر ہے جن میں اُن کا خاص رنگ اور تخیل پایا جاتا ہے۔ انھیں نظموں میں اُنھوں نے اپنے خاص شاعرانہ جوہر دکھائے ہیں اور فلسفہ و تصوف اور حبِ وطن کے جذبات کے ساتھ بہترین شستہ و رفتہ زبان، سلاست بیان، زورِ تخیل، جذبِ اثر، اور نئے نئے استعارے اور تمثیلیں بھی ان میں پائی جاتی ہیں۔ "ہمالہ" "خضرِ راہ" "شمع و شاعر" "شکوہ" اسی صنف سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُن کو رسمی اور معمولی نظمیں نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ سچے جذبات کا صاف و شفاف آئینہ اور طرز بیان اور بلندی خیال کا بہترین نمونہ ہیں۔

"ہمالہ" میں موضوع کی بلندی کے ساتھ مضمون کی بلندی بھی داد طلب ہے۔ ہمالیہ ہندوستان کا اصلی محافظ ہے۔ شاعر کو چونکہ اپنے وطن ہندوستان سے عشق ہے لہذا وہ اس کے محافظ کا بھی عاشق ہے۔ "والدہ مرحومہ کی یاد" میں اقبال نے جو مؤثر نظم لکھی ہے وہ سچے جذبات سے مملو ہے۔ "خضرِ راہ" شاعر کے دلی جذبات کا نتیجہ ہے اس میں وہ جدید مغربی ترقیوں کو اپنے اہلِ وطن کے واسطے شک و بے اعتباری کی نظر سے دیکھتا ہے۔ "شکوہ" میں ایک نہایت لطیف اور شاعرانہ پیرایہ میں اُن تمام مصائب اور پستیوں کا ذکر ہے جو بدنصیبی سے اس زمانے کے مسلمانوں کے حصہ میں آگئی ہیں۔ "جوابِ شکوہ" میں انھیں سب باتوں کا معقول جواب دیا ہے اور اُن کے اسباب بتائے ہیں۔ "ترقی اسلام" میں بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار ہے۔ "شمع و پروانہ" نہایت اعلیٰ درجہ کی ایک خیالی نظم ہے۔

دیگر نظمیں اقبال کی وہ چیز جس نے اُن کا تخم محبت تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں بو دیا،

اُن کا جذبہ حبِ وطن ہے جس کا اظہار نہایت جوش اور سچائی کے ساتھ انھوں نے اپنی بعض نظموں میں کیا ہے جو فی الحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتیں ایسی نظمیں جو کسی خاص مقصد یا غرض سے لکھی جاتی ہیں اتنی جاذب اور موثر ثابت نہیں ہوتیں جتنی کہ خیالی اور بے غرض نظمیں ہوا کرتی ہیں۔ جگنو، چاند، حسن و عشق وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں جن کو ہر شخص دل سے پسند کرتا ہے۔ "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ہندوستان کا مقبول ترین گیت ہے۔ "نیا شوالہ" ہندو مسلم اتحاد کی ایک بیش بہا نظم ہے، علیٰ ہذا جو مختصر نظمیں داغ، غالب، سوامی رام تیرتھ، شبلی و حالی، شیکسپیئر، عُرفی، نانک وغیرہ پر ہیں۔ نیز وہ جو مناظر قدرت پر لکھی ہیں نہایت اعلیٰ درجے کی نظمیں ہیں۔

اقبال بحیثیت ایک ہندوستانی شاعر کے اقبال نے شاعری کی دنیا میں ایک ہندوستانی شاعر کی حیثیت سے قدم رکھا اور اُن کی شاعری نے نوجوان ہندوستانیوں کے دلوں کو موہ لیا۔ اُس زمانے کی اُن کی شاعری کا عنصرِ غالب وطن کی محبت ہے اور اسی وجہ سے اُن کی پہلی نظم "ہمالہ" یہ عنصر تمام جذبات پر غالب ہے۔ "صدائے درد" میں یہ خیال اور بھی تقویت پکڑ گیا ہے اور اس میں وطن کے تمام مصائب اور خرابیوں کے اسباب کا ذکر نہایت پرجوش طریقے سے کیا گیا ہے۔ "سید کی لوحِ تربت" میں بھی یہی جذبہ وطنی جلوہ نما ہے اور اس میں مذہبی تعصب اور فرقہ بندی کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ "تصویرِ درد" کو ہندوستان کا نہایت پُراثر اور پُرجوش مرثیہ کہنا بجا ہے۔ "ہندی ترانہ" اور "قومی گیت" سے مادرِ ہند کی محبت ہمارے دلوں میں موجزن ہو جاتی ہے۔ "ترانہ ہندی" کو بنگال کا بندے ماترم سمجھنا چاہیے جس سے بڑھ کر ہندوستان میں شاید کوئی دوسرا قومی گیت مقبولیت اور ہردلعزیزی میں نہ ہوگا۔ یہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مروّج اور ہر شخص کی زبان پر ہے۔ اس جذبہ وطنیت کا انتہائی عروج اُن کے "نیا شوالہ" میں پہنچ گیا جس میں وہ خاکِ وطن کے ذرہ ذرہ کو ایک دیوتا سمجھتے ہیں۔ چونکہ یہ مختصر مگر نہایت ہی مؤثر اور جذبۂ وطنیت میں ڈوبی ہوئی نظم ہے۔ لہٰذا

پوری یہاں دی جاتی ہے ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے ‏ تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تُو نے بُتوں سے سیکھا ‏ جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے مَیں نے آخر دَیر و حرم کو چھوڑا ‏ واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تُو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اِک بار پھر اُٹھا دیں ‏ بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سُونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی ‏ آ اِک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اُونچا ہو اپنا تیرتھ ‏ دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے ‏ سارے پجاریوں کو مے پریت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

مگر یہ اُن کا جذبۂ وطنیت روانگی انگلستان کے ساتھ مدھم پڑ گیا یہاں تک کہ اُن نظموں میں جو قیامِ انگلستان کے زمانے میں لکھی گئیں۔ یہ جذبہ تریب قریب معدوم ہو جاتا ہے بہرحال ہم کو پوری اُمید ہے کہ اقبال، اُردو کی طرف پھر رجوع کریں گے اور ہندوستان کے قومی شاعر کا معزز لقب اُن کو پھر حاصل ہو گا۔

اقبال بحیثیت پین اسلامسٹ کے یہ پین اسلامزم (اخوتِ ملی) کا رنگ اقبال میں قیامِ یورپ کے زمانے میں پیدا ہوا تھا جبکہ اُن کی آمد و رفت لندن کی پین اسلامک سوسائٹی کے جلسوں میں بہت تھی اور اس سوسائٹی کا نام بھی انھیں کے ایما سے بدل کر صرف اسلامک سوسائٹی رکھا گیا تھا جس کے واسطے اُن کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ اسلام میں عنصر اجتماعیت پہلے سے موجود ہے لہٰذا لفظ "پین" جو اجتماعیت کے معنی دیتا ہے زائد ہے اور اس کو نام سے خارج کر دینا چاہیے۔

اس چھوٹے سے واقعہ سے اُن کے میلان طبع کا پتہ چلتا ہے۔ اُنھوں نے یہ خیال لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کرنا چاہا کہ تمام روئے زمین کے مسلمان ایک عالمگیر سوسائٹی کے رکن ہیں عام اس سے کہ وہ اس بات سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔ زمانہ حال کے سیاسی معاملات نے اُن کا یہ خیال پوری طرح ثابت کر دیا۔ ڈاکٹر لطیف لکھتے ہیں :۔

"نئی صدی کے آغاز سے مسلمانوں کے سیاسی نقطۂ نظر میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہوا۔ اُن کا سیاسی تحفظ اور آزادی کی جد و جہد صرف ہندوستان ہی تک محدود نہ رہی بلکہ جہاں جہاں اسلام کے نام لیوا تھے یعنی ٹرکی، ایران، ترکستان، مصر، طرابلس، مراکش، یہاں تک کہ دور دراز ملک چین بھی اُن کے دائرہ عمل میں شامل ہو گیا۔ یہ عالمگیر اتحاد اسلامی کی کوشش جس کا دوسرا نام پین اسلامزم تھا سلطنت ٹرکی کے مٹ جانے سے اور زور پکڑ گئی۔ اس کی ابتدا ۱۹۱۱ء کے اطالوی حملہ طرابلس سے ہوئی تھی جس کے بعد جنگ بلقان میں اس کی شرر افشانی اور بڑھی مگر جنگ عظیم میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے متعلق بے شمار پمفلٹ، رسالے، اخباری مضامین، اسپیچیں ہر قسم اور ہر حالت کے لوگوں کی زبان و قلم سے نکلیں جن میں اقبال، شبلی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، ظفر علیخاں اور علی برادران بہت ممتاز ہیں ..... اس احساس کا ظہور تین مختلف طریقوں سے ہوتا تھا (۱) رنج و الم کسی اسلامی قوم یا ملک کے سلب آزادی پر عام اس سے کہ یہ گزشتہ زمانہ کا واقعہ ہو یا زمانہ موجودہ کا (۲) ایسے اسلامی ممالک کے مستقبل کی فکر جو دول یورپ کے زیر اثر ہیں (۳) شک اور بے اعتباری یورپین اقوام کے ساتھ جو بقول اُن لوگوں کے ہر مقام پر زوال اسلامی کی ذمہ دار ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کچھ عرصہ تک اس بین الملی اخوت کے خاص علمبردار سمجھے جاتے تھے اور اُنھوں نے اس معاملے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار اس زمانے کی نظموں میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ کیا تھا۔"

اقبال تمام دنیا کے مسلمانوں سے ملتجی ہیں کہ اگر تم کو اپنی ہستی قائم رکھنی ہے تو جزئی جزئی

مذہبی اختلافات ترک کردو اور ایک عالمگیر اتحاد و اخوت پیدا کرو۔ اُن کو بخوبی معلوم ہے کہ دنیائے اسلام چونکہ موجودہ زمانے میں منتشر اور تشتت ہے۔ لہٰذا وہ مغرب کے باقاعدہ حملوں سے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے گی اور بہت جلد اُن کا شکار بن جائے گی۔

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

اُن کی دلی خواہش ہے کہ اسلام کا بکھرا ہوا شیرازہ محبت و یک جہتی کی مضبوط رسّی سے بندھ جائے اور مسلمان اپنے مذہب کے ضروری احکام و ارکان کے دل سے پابند ہو جائیں۔ مسلمانوں کو یہ خیال ترک کر دینا چاہیئے کہ ہم ہندی ہیں یا ترک، مصری ہیں یا افغانی۔ اُن کو اپنے تئیں ایک عظیم الشان زنجیر کی کڑیاں سمجھنا چاہیئے۔ قوم و ملک، قرب و بُعد کے فرضی خیالات دل سے یک قلم نکال دینا چاہیئے اور اپنے تئیں ایک برادری کے افراد سمجھنا چاہیئے ؎

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بُتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گُم ہو جا نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اُن کا قول ہے ؎

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

جب اقبال یورپ جا رہے تھے تو راستے میں جہاز سے جزیرہ سسلی نظر پڑا جو ایک زمانہ میں عربوں کے اقتدار اور تہذیب و شان و شوکت کا مرکز تھا اُس کو دیکھ کر عجب پُر اثر طریقے سے فریاد کرتے ہیں ؎

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور
مُردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا آدمی آزاد زنجیرِ توہم سے ہوا

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

یہ اسی پین اسلامزم کی برکت ہے کہ اقبال کی شہرت ممالک اسلامی کے علاوہ یورپ و امریکہ میں بھی پھیل گئی ہے۔

اقبال کا فلسفہ اقبال محض خوشگو شاعر ہی نہیں بلکہ ایک زبردست فلسفی بھی ہیں۔ اُن کا کلام فلسفیانہ حقائق سے معمور ہے۔ اُن کا فلسفہ مختصراً دو جملوں کا ترجمان ہے (۱) اپنی ہستی پہچان (۲) اپنی ہستی ثابت کر۔ اسی ہستی سے باخبر ہونے میں قوموں کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ اہل مشرق کے دلوں سے وہم و گمان جو اُن کے کیرکٹر کا عنصر غالب ہے نکل جانا چاہیئے اور اس کی جگہ یقین اور اعتبار کو ملنا چاہیئے ؎

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

اقبال مغربی مادیت کے دشمن ہیں اہل مغرب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

"طلوع اسلام" میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

اُن کے کلام میں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں جن میں انسان کو خوشدلی اور خودداری کی تلقین کی گئی اور اُس کو اس کی اصلی عظمت و شان یاد دلائی گئی ہے ؎

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

اس قسم کے اشعار بکثرت ہیں لہٰذا اُن کے بحر سخن میں غوطہ مارنا اور فلسفہ کے تمام دُر شاہوار باہر

علامه اقبال

نکالنا اس مختصر مضمون کے مقصد سے باہر ہے۔

بعض یورپی نقادوں کا خیال ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مضامین کے لیے بعض مغربی فلسفیوں مثلاً نطشے اور برگسان وغیرہ کے ممنونِ احسان ہیں۔ خود ڈاکٹر صاحب اس خیال کی تکذیب کرتے ہیں مگر اتنا ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اُن پر اکابر مذکور کے فلسفہ کا اثر بہت گہرا ہے۔

اقبال کا پیغام کیا ہے

جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا اقبال کی دلی خواہش ہے کہ اُن کے برادرانِ دینی میں اپنی ہستی سے واقف ہونے اور اپنے تئیں پہچاننے کا مادّہ پیدا ہو جائے اور کوشش و عمل کی شدید ضرورت کا احساس اُن کے دلوں میں بیٹھ جائے۔ اقبال کے نزدیک عملی جدوجہد زندگی اور سُستی اور بیکاری موت ہے۔ اُن کا پیغام نہایت اعلیٰ سچّا اور پُرجوش ہے۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کو بآنگِ دُہل سُنانا چاہتے ہیں کہ غفلت و سُستی ترک کرو۔ اُن کی غرض کوئی مُلکی توسیع یا سیاسی ترقّی نہیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں سادگی، بے ریائی، شجاعت، ہمّت و استقلال اپنے اُوپر بھروسہ کرنے کی قوت غرضکہ وہ جملہ خصائل و فضائل جو کسی زمانے میں اُن کے اسلاف میں پائے جاتے تھے۔ ان میں بھی پیدا ہو جائیں۔ اس پر معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تو پُرانے افسانوں کو یاد کرنا اور ترقی کی گھڑی کی سوئیاں اُلٹی گھمانا ہوا مگر درحقیقت یہ اعتراض سطحی اور غیر واجبی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اقبال زمانہ موجودہ کی تصویر تاریک رنگوں میں اور زمانہ گزشتہ کا مرقع نہایت چمکتے ہوئے رنگوں میں کھینچتے ہیں محض اس غرض سے کہ مسلمان اُس سے ایک مفید سبق حاصل کریں اپنی غفلت شعاری چھوڑیں اور سعی و کوشش سیکھیں۔ مختصر یہ کہ اقبال کا پیغام، عمل و کوشش کا پیغام ہے ؎

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

اقبال کے کلام میں اُمید و مسرّت

اقبال محزون و مایوس شاعر نہیں۔ اُن کے کلام میں اُمید و مسرت جلوہ گر ہے بلکہ یہی چیز اُن کو اُن کے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اس تاریک فضا سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ مصائب اور ناکامیاں انسان کے کیرکٹر کو پختہ

اور مضبوط کرتی ہیں۔ جس طرح سونا گھریا کی تیز آنچ سے پاک وصاف ہوکر چمک جاتا ہے اسی طرح قومیں بھی ناکامیوں اور نامرادیوں کی کسوٹی پر چڑھ کر قوت پکڑتی ہیں۔ وہ تاریک اور مصائب گرفتہ مشرق کے لیے ایک درخشاں مستقبل دیکھتے ہیں اور کبھی افسردہ دل نہیں ہوتے بلکہ ناکامیوں کے بادل کے پیچھے شعاع امید جلوہ گر دیکھتے ہیں۔

اقبال عملی شاعر ہیں باوجود خیالی شاعر ہونے کے اقبال بہت بڑے عملی شاعر بھی ہیں وہ اشیاء کا عملی پہلو کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ گو اُن کے خیالات فلک پیما ہیں مگر وہ خود مادر زمین کے ساکن ہیں۔ اُن کو انسانی کمزوریوں کا بخوبی احساس ہے۔ اُن کی دنیا عملی دنیا ہے جس میں خوشی و غم اور اُمید و یاس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ کبھی اس حقیقت کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتے۔

اقبال کی نیچرل نظمیں اس صنف میں بھی اقبال کا کلام لاجواب ہے اور اُن کی وہ نظمیں جو نیچرل چیزوں اور قدرتی مناظر پر ہیں اپنا نظیر نہیں رکھتیں مثلاً جگنو، چاند، صبح کا ستارہ، ایک پرندہ اور جگنو، ابر وغیرہ۔ اعلیٰ تخیل، صحت بیان اور شیرینی زبان کے واسطے یہ نظمیں لاجواب ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی شاعر ورڈس ورتھ کے یہاں جو سادگی طفلانہ مسرت اور اصلیت کا جوش و خروش پایا جاتا ہے وہ اُن کے یہاں نہیں۔ مگر یہ چیز تو کسی اردو شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتی پس اقبال کے یہاں جس قدر بھی ہے بہت غنیمت ہے اور اوروں سے بہت زیادہ ہے شعرائے مشرق کے یہاں مناظرِ قدرت کا بیان اظہار جذبات کے لیے وہی کام دیتا ہے جو تصویر کے واسطے اس کا پس منظر یعنی بالذات اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی صرف تصویر کو اُبھارنے کے کام آتا ہے۔ ہمارے شاعروں کا اصلی مقصد کسی جذبہ یا تخیل کا اظہار ہوتا ہے اور وہ کسی منظر کو بطور تمثیل یا تشبیہ کے ضمناً پیش کر دیتے ہیں برخلاف شعرائے مغرب کے کہ وہ حسین مناظر کے بیان میں جو اُن کے پیش نظر ہوتے ہیں محو ہو جاتے ہیں اور اُنہیں کا من وعن بیان اور انھیں سے لطف اندوزی اُن کی مقصود بالذات ہوتی ہے۔ اقبال بمقابلہ دوسرے شعرائے اردو کے اس معاملہ میں شعرائے مغرب سے بہت قریب تر ہیں اور اُنھوں نے پرانے فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر

اپنے واسطے ایک نیا راستہ اختیار کیا ہے۔

اقبال کی خصوصیات شاعری (۱) پہلی خصوصیت وہی پین اسلامزم ہے جس کا ذکر اُوپر ہوا۔

(۲) اسلام کی قرون اولیٰ کی سادگی پر جو بُرا اثر عجمی تکلف و تصنّع کی تہذیب نے ڈالا تھا اُس کے وہ بہت شاکی ہیں اور اسی کو وہ اسلام کے انحطاط و زوال کا اصلی سبب ٹھہراتے ہیں۔

(۳) اُن کا پیغام نہایت سچا اور پُرجوش ہے مگر چونکہ بعض باتیں بمصلحت وہ علانیہ طور پہ کہنا نہیں چاہتے، لہٰذا تمثیل و تشبیہ کے پردے میں اُن کو کہنا پڑتا ہے۔

(۴) وہ حقیقی شاعر ہیں کیونکہ نہ تو وہ کسی کی فرمائش سے کہتے ہیں نہ کسی کی بے جا اور خوشامدانہ تعریف میں کہتے ہیں۔

(۵) اُن میں ایجاز و اختصار کی صفت ہے یعنی چھوٹے چھوٹے لفظوں میں معنی کے دریا بھرے ہوتے ہیں۔ مثل غالب کے اُن پر بھی یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ پہلے الفاظ کی کیمیائی تحلیل کر لو۔ اُس کے بعد معنی کا خالص سونا ہاتھ آئے گا۔

(۶) اُن کے مضمون اکثر فارسی الفاظ و محاورات کے تہ میں ہوتے ہیں مگر کبھی راز سربستہ نہیں ہوتے، غور کرنے سے بخوبی سمجھ میں آجاتے ہیں۔

(۷) وہ بالکل زمانہ حال کے شاعر ہیں۔ ہر طرح کے حقایق سائنٹیفک، فلسفیانہ، مذہبی سب اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ جس طرح تصوف، و اخلاق کے بیش بہا مضامین بہترین اور حسین ترین الفاظ میں اُن کے کلام میں جلوہ گر ہیں اُسی طرح علوم مغربی مثلاً کیمیا و طبعیات وغیرہ کے رموز بھی لطیف تشبیہوں اور استعاروں کے پردے میں پائے جاتے ہیں۔

(۸) اُن کی بعض تشبیہیں نہایت لطیف و نادر ہیں مثلاً "ہلالِ عید" "روشنی کا حباب ہے"۔ جگنو کی نسبت کہتے ہیں ؎

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا

(۹) اُن کے کلام کا خاص طرۂ امتیاز جوش، سچائی اور قوت ہے۔ اُن کی نظموں میں وہی زور ہے جو بہتے ہوئے دھاروں میں ہوتا ہے۔ یہ زور و قوت اور اُردو شعرا کے یہاں بہت کم ہے۔

اقبال کی شہرت ہمارے خیال میں کسی اُردو شاعر کو یہ شہرت اور ہردلعزیزی نصیب نہیں ہوئی جو اقبال کو ہوئی۔ ان کی شہرت ہندوستان کے علاوہ دُور دُور ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں وہ ایک قومی شاعر مانے جاتے ہیں بڑے بڑے شعرا اور اہلِ قلم مثلاً شبلی نعمانی، اکبر، خواجہ حسن نظامی، سر ذوالفقار علی خاں وغیرہ نے اُن کو باج تحسین دیا ہے۔ انگلستان کے مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے اُن کی کتاب "اسرارِ خودی" کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ یورپ و امریکہ کے مشہور ناقدوں نے اُن کی تصانیف پر نہایت عمدہ عمدہ ریویو لکھے۔ ہندوستان میں وہ ترجمانِ حقیقت کے لقب سے مشہور ہیں۔ اسی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں "سر" کا معزز خطاب اُن کو دیا گیا۔ نوبل پرائز کے مستحقین میں ایک زمانے میں اُن کا نام بھی لیا جاتا تھا۔

وہ نوجوانانِ ہند کے بہترین شاعر ہیں کیونکہ اُنھیں کے جذبات و احساسات کو وہ عمدہ طریقے سے ادا کرتے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ اپنی بیش بہا نظموں کی بدولت پورے ہندوستان کے دلوں پر حکومت کرتے تھے اور مُلک کا ہر طبقہ اُن کو مادرِ وطن کا حقیقی شاعر مانتا تھا مگر کچھ عرصے سے وہ اُن لوگوں میں اس قدر ہردلعزیز نہیں رہے جو جذباتِ وطن کو دیگر جذبات پر مقدم سمجھتے ہیں۔ اور ان کی کمی شہرت کا باعث یہ بھی ہوا کہ وہ اُردو کو زبانِ فارسی کے ماتحت کر دینا چاہتے ہیں مگر باوجود ان سب باتوں کے اقبال کا مرتبہ زمانۂ حال کے دیگر اُردو شعرا میں بہت بلند ہے بلکہ وہ تو دُنیا کے بڑے بڑے شعرا کے ہم پلّہ ہیں۔

انڈکس

آبحیات ۶۴،
ابن الوقت ۷۷،
اثر (مرزا جعفر علی خاں) ۱۱۷،
آثار الصنادید ۵۱-۱۰۲،
آرچر (مسٹر) ۴۸،
آرائش محفل (افسوس) ۱۳،
آرائش محفل (حیدری) ۱۵،
آزاد (اخبار) ۱۱۲-۲۱۰،
آزاد (سید محمد-نواب) ۱۳۰-
۱۳۵-۲۲۴-
آزاد (مولانا ابوالکلام) ۱۱۹،
آزاد (مولوی محمد حسین) ۶۲ تا ۹۶-
۲۱۶،
آشوب (دیکھو پیارے لال آشوب)
آئین قیصری ۱۸،
احسن مارہروی ۱۱۷،
احمد حسین قمر ۱۲۸،
احمد رضا خاں (مولوی بریلوی)
۸۹،

احمد علی کسمنڈوی ۱۳۰-۱۶۰،
اخبار نویسوں کے حالات ۱۲۴،
اخلاق ہندی ۱۳-۱۴،
اخوان الصفا (ترجمہ) ۱۹،
اردو اخبار (دلی) ۱۲۲،
اردو اخبارات ۱۲۲-۱۲۳،
اردو رسائل ۱۲۳-۱۲۴،
اردوئے معلیٰ ۳۹،
اسپرنگر (ڈاکٹر) ۱۶،
اسد علی (حکیم سید) ۲۹،
اسرار التوحید ۵،
اسکاٹ (کرنل) ۱۲-۱۶،
اسماعیل (مولوی-شہید) ۲۳-۲۴
اشک (خلیل علی خاں) ۲۲،
آغا مظہر ۸۹-۲۱۱،
افسر (حامد اللہ) ۱۱۸-۱۸۵،
افسوس (میر شیر علی) ۱۱،
اکبر الہ آبادی ۱۳۰،
اکرام علی (مولوی) ۱۹،

اقبال (ڈاکٹر سر شیخ محمد) ۲۲۷-
۲۳۰-۲۳۲-۲۳۸-تا ۲۴۴،
الغزالی ۸۸،
الفاروق ۸۷،
الف لیلہ (تراجم) ۳۷،
الکلام ۸۸،
المامون ۸۷،
الیاس برنی (مولوی محمد) ۲۰۴،
امانت اللہ (مولوی) ۲۱،
امراؤ جان ادا (ناول) ۱۶۹،
امن دہلوی (میر) ۱۰،
امہات الامہ ۷۵،
امہات المومنین ۷۵،
امیر خسرو دہلوی ۱۱،
انجمن ترقی اردو ۱۰۶-۲۰۶،
اندر سبھا ۱۸۲،
انشائے سرور ۳۸،
انوار سہیلی (ترجمہ) ۲۸،
اوبرامرگو (جرمنی) ۱۷۶ (فٹ نوٹ)

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

اودھ پنچ ۱۲۹-۱۳۷،
ایامیٰ ۷۷،

بارہ ماسہ ۱۶،
باغ اردو ۱۳،
باغ و بہار ۱۱،
بحرالمحبت (مثنوی) ۹۷،
برج نرائن (پنڈت) ۲۱۴-
۲۱۸-۲۲۱-۲۲۳-۲۲۵،
برق (جوالا پرشاد) ۱۳۰-۱۳۵-
۲۲۴،
برہان الدین جانم (شاہ) ۴۱،
بستان حکمت ۲۸،
بشن نرائن در ۳۴-۱۱۱-۱۱۸-
۱۴۱-۱۴۲-۱۴۳،
بشیشر پرشاد منور (منشی) ۲۱۴،
بلوم ہارٹ (فہرست) ۱۰۰،
بنات النعش ۹۷،
بوستان خیال ۱۲۷،
بہادر علی (دیکھو حسینی)
بہار بےخزاں ۱۰۳،
بہار دانش (ترجمہ) ۱۳-۲۲،
بیتال پچیسی (ترجمہ) ۱۸،
بےخبر (منشی غلام غوث) ۱۰۳،
بیمس (مسٹر جے) ۲۰۲،
بینی نرائن جہاں ۲۰،

پردۂ عصمت (رسالہ) ۱۶۵،
پریم چند (منشی) ۱۷۱،
پند نامہ (ترجمہ) ۱۸،
پیارے لال آشوب (ماسٹر)
۶۰-۶۲-۱۰۰-۱۱۴،
پیام یار (رسالہ) ۲۰۹،

تاراچند (ڈاکٹر) ۲۰۸،
تاریخ آسام (ترجمہ) ۱۴،
تاریخ شیر شاہی (ترجمہ) ۱۸،
تاریخ فرشتہ (ترجمہ) ۱۶،
تاریخ نادری (ترجمہ نادر نامہ) ۱۵،
تاریخ ہندوستان (مولوی ذکاء
اللہ) ۸۰،
تحسین (عطا حسین خاں میر محمد) ۷،
تحفہ الفنسٹن ۲۶،
تذکرۂ جہاں ۱۶،
تذکرۃ الکاملین ۱۰۱،
تربھون ناتھ ہجر ۱۳۰-۱۳۴،
ترجمۂ بائیبل ۲۷،
تریاق مسموم ۵۹،
تصانیف شرر ۱۶۸،
تصدق حسین داستان گو ۱۲۷،
تعزیرات ہند (مجموعہ) ۲۷،
تمدن ہند ۱۰۴،
تنبیہ الغافلین (ترجمہ) ۲۱-۴۷،
تواریخ قاسمی ۷،
توبۃ النصوح ۷۶،
تیج بہادر سپرو (ڈاکٹر سر)
۲۰۸-۲۱۷،

ٹیلر (کپتان) ۱۹،
ٹیلر (مسٹر پرنسپل دلی کالج) ۲۰،

جامع الاخلاق (ترجمہ اخلاق جلالی) ۱۵
جامع القواعد ۲۶،

نمبروں سے صفحات مراد ہیں

جانورستان ۶۷،
جل ترنگ ۴۲،
جوالا پرشاد (دیکھو برق)
جوان (کاظم علی جوان) ۱۶،
جوش (سلطان حیدر) ۱۱۸،
جمیس ماؤنٹ (کپتان) ۲۱،

چار گلشن ۲۰،
چراغ علی (مولوی) ۵۹،
چشمۂ فیض ۲۶،
چکبست (دیکھو برج نرائن)
چھاپے خانے ۴۵-۴۸،

حاجی بغلول ۱۳۲-۱۵۱،
حالی ۶۹ تا ۷۲،
حدائق البلاغت (ترجمہ) ۲۶،
حسرت موہانی ۱۱۷،
حسن نظامی (خواجہ) ۱۷۱،
حسینی (بہادر علی) ۱۳،
حفیظ الدین احمد ۱۸،
حمید الدین (مولوی) ۹۵،

حیات جاوید ۷۱،
حیات سعدی ۶۹،
حیدری ۱۴،
حیران (میر حیدر علی) ۱۲،

خدنگ نظر (رسالہ) ۲۰۹-۲۱۴،
خرد افروز (انشا) ۱۸،
خلاصۃ التواریخ ۱۳،
خلیل (علی ابراہیم خاں نواب) ۱۴
خمخانۂ جاوید ۱۱۴،
خواجہ امان دہلوی ۱۲۸،
خوجی ۱۴۵-۱۴۶-۱۴۸-۱۴۹،

دار المصنفین اعظم گڈھ ۹۱-
۹۲-۲۰۷،
داستان امیر حمزہ ۱۲۷،
دربار اکبری ۶۷،
درگیش نندنی ۱۵۹،
دریائے لطافت ۷-۲۶،
دلچسپ (ناول) ۱۵۹،
دلگداز (رسالہ) ۱۶۲،

دلّی کالج ۹۸،
دہ مجلس فضلی ۵،
دیوان انور ۱۱۵،
دیوان ذوق ۶۶،
دیا نرائن نگم ۱۱۲-۲۰۸،

ڈراما (اردو) ۱۷۵،
ڈوما (فرنچ ناولسٹ) ۱۴۱،

ذکاء اللہ (مولوی) ۶۱-۷۹،
ذوق (استاد) ۶۰،

راجیشور بلی (آنریبل رائے)
۲۰۸،
راشد الخیری ۱۶۹،
رامچندر (پروفیسر) ۱۰۰-۱۰۱
رتن ناتھ سرشار (دیکھو سرشار)
رجب علی بیگ سرور (مرزا)
(دیکھو سرور)
رسالہ گلگرسٹ ۹-۱۳،
رسم الخط اردو ۲۰۸،

رسوا (مرزا محمد ہادی) ۱۶۸،
رشید احمد صدیقی ۱۱۷،
رصدخانہ شاہی ۹۴،
رواں (سید جعفر علی) ۲۲،
روہنی (ناول) ۱۳۵،
"رویائے صادقہ" ۴۷،

زمانہ (رسالہ) ۲ تا ۱۱-۲۱-۲۲۴،
زود پشیماں (ڈراما) ۹۸،

سائنٹیفک سوسائٹی علی گڈھ ۵۲،
سب رس ۶،
سپاک و نماک ۶۷،
ستم ظریف (مرزا مچھو بیگ) ۲۲۴،
سجاد حسین (سابق اڈیٹر اودھ پنچ) ۱۱۸-۲۲۴،
سجاد حیدر (یلدرم) ۱۱۸،
سخندان فارس ۶۶،
سرشار ۳۶ تا ۱۵۶-۱۶۳،
سرور (مرزا رجب علی بیگ) ۲۸ تا ۳۸-۱۲۸-۱۵۰،
سرور سلطانی (ترجمہ شمشیر خانی) ۳۶-۱۳۰،
سروش سخن ۳۶،
سنگاسن بتیسی ۱۶،
سوانح مولانا روم ۸۸،
سید احمد خاں (سر) ۱۱-۴۵-۵۰-۵۶-۱۱۰،
سید احمد دہلوی ۱۸-۸۲،
سید احمد شہید ۴۶-۴۷،
سید سلیمان ندوی ۹۵،
سید محمد خاں (خان بہادر مولوی) ۱۰۳،
سیرت العائشہ ۹۵،
سیرت النبیؐ ۹۲،
سیرت النعمان ۸۷،

شاہ محمد قادری (سید) ۵،
شاہ میر (سید) ۵،
شبستان سرور ۳۲-۳۷،
شبلی نعمانی ۸۳ تا ۹۵،
شرح مرغوب القلوب ۴،
شرر (مولوی عبد الحلیم) ۱۵۶ تا ۱۶۸-۱۸۲،
شرر عشق ۳۲-۳۶
شرف الدین میرٹھی ۲۹،
شعر العجم ۹۳،
شعر الہند ۹۶،
شکنتلا ناٹک (ترجمہ) ۱۶-۱۷،
شگوفۂ محبت ۳۲-۳۶،
شمائل الاتقیا و دلائل الاتقیا ۵،
شمس العشاق (دیکھو میرانجی بیجاپوری شاہ)
شوق قدوائی (احمد علی) ۱۳۵،
شہرت (افتخار الدین) ۲۲،
شہید (مولوی غلام امام) ۱۰۲،
شیدا (دیکھو امانت اللہ مولوی)
شیر سنگھ (سردار) ۴۷،
شیر علی (میر) (دیکھو افسوس)

صبح امید (مثنوی) ۸۶-۲۱۷-
صرف اردو ۲۲،
صہبائی (مولوی امام بخش)،

٩٩-١٠٠-١٠٢ ،

ضامن علی (پروفیسر) ١١٧ ،
ضوابط انگریزی ٦ ،

طلسم حیرت ٣٦ ،
طلسم ہوشربا ١٢٧ ،
طوطارام شایاں ١٢٧ ،
طوطا کہانی ١٥ ،
طیش (حکیم مرزا جان) ٢٢ ،

ظفر علی خان (مولوی) ٥٨-١١٨ ،
ظفر عمر (مولوی) ١٤٢ ،
ظفر الملک (مولانا) ١٢٤ ،

عبدالباری (مولوی) ٩٥ ،
عبدالحق دہلوی (مولوی) ٨٩ ،
عبدالحق (مولوی۔ سکریٹری انجمن ترقی اردو) ٢١-١٠٧ ،
عبدالسلام ندوی (مولوی) ٩٦ ،
عبدالعزیز (شاہ) ٢٥-٤٢ ،
عبدالغفور (مولوی) ٨٨ ،
عبدالقادر بی۔اے (آنریبل مولوی) ١١٠ ،
عبداللہ یوسف علی ١٧٤-١٧٧-١٩٧-٢٠٠ ،
عبدالماجد دریابادی (مولوی) ٩٧ ،
عبدالمجید خاں (کرنل) ٨٩ ،
عثمانیہ یونیورسٹی ٢٠٦ ،
عزیز مرزا (مولوی) ١٠٥ ،
عطا حسین خاں (میر محمد دیکھو تحسین)
علی ابراہیم خاں (نواب) (دیکھو خلیل)
علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ٥٣-١٠٩ ،
عود ہندی ٣٩ ،
عیاں (پسر کاظم علی جوان) ١٦ ،
عین الدین گنج العلم (شیخ) ١٤ ،

غالب (مرزا) ٣٠-٣٨ تا ٥١-٢١٦-٢٢٥ ،
غازی الدین حیدر ٣٠-٣١ ،

فخر الدین حسین (خواجہ) ٣٠ (فٹ نوٹ) ٣٦ ،
فردوس بریں (ناول) ١٦١ ،
فرخ (میاں) ٢٩ ،
فرہنگ آصفیہ ٨٣ ،
فسانہ آزاد ١٣٧-١٤٠-١٥٢ تا ١٥٦ ،
فسانہ عجائب ٣٢ تا ٣٨ ،
فطرت (مرزا محمد) ٢٢ ،
فقیر محمد خاں (دیکھو گویا)
فلر (میجر) ٦١ ،
فورٹ ولیم کالج کلکتہ ٣٠-٤٧ ،
فیلن (ڈاکٹر) ١١-٢٥ ،

قرآن شریف (تراجم) ١٦-٢٢ ،
قصہ لقمان ١٣ ،
قند پارسی ٦٦ ،
قواعد المبتدی ٢٦ ،

کاظم حسین (محشر مرزا) ۲۱۱،
کاظم خاں (میر محمد) ۱۰،
کاظم علی (مرزا) (دیکھو جوان)
کان پور ۳۰،
کریم (عبدالکریم خاں دہلوی) ۲۲،
کریم الدین (منشی) ۱۱،
کلیات سودا ۱۳،
کوچک سلطان (مرزا) ۸۷،
کورٹ آف ڈائرکٹرز ۷۷،
کیمبل (جارج) ۲۰۳،
گارسن ڈیتاسی ۲۰-۲۵-۵۱-
۲۰۳،
گلزار ابراہیم (تذکرہ) ۱۶،
گلزار دانش (ترجمہ بہار دانش) ۱۵
گلزار سرور ۳۲-۴۷،
گلشن فیض ۲۶،
گلشن ہند (تذکرہ) ۲۱،
گلگشت فرنگ ۱۰۵،
گل مغفرت (معروف بہ دہ
مجالس ۱۵۱،
گلکرسٹ (ڈاکٹر) ۷-۵-۱-
۱۳-۲۵،
گنجینۂ خوبی ۱۱،
گور غریباں ۱۳۸،
گویا ۲۵،
لطف (مرزا علی) ۱۲-۲۱،
لطف (دیکھو امن دہلوی-میر)
لطائف ہندی ۲۰،
لغات اردو ۲۶،
للو لال جی ۳۰،
لنگوسٹک سروے آف انڈیا
(مصنفہ ڈاکٹر گریرسن ۹،
لیلیٰ مجنوں (قصہ) ۱۴،
مادھونل و کام کنڈلا ۱۵،
مار آستین ۱۳۵،
مجلس النساء ۶۹،
محسن الملک (نواب) ۵۶ تا
۵۵-۵۸،
محصنات ۷۷،
محمد حسین جاہ ۱۲۷،
محشر (رسالہ) ۱۵۸،
محمد علی (حکیم) ۱۶۹،
محمد علی کانپوری (مولوی سید)
۸۸،
مخزن (رسالہ) ۱۱۱،
مذہب عشق ۱۵۹،
مرآۃ العروس ۶۹،
مراسلۂ کشمیر ۱۳۶،
مرغوب القلوب (شرح) ۴۲،
مرزا خانی کوتوال دہلی ۱۷،
مسعود حسن رضوی (سید) ۱۱۷،
مسکین (میر عبداللہ) ۲۲،
مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم ۸۶،
مطبع ٹائپ ۴۸،
مطبع مصطفائی ۴۸،
مطبع میر حسن ۴۸،
مطبع نولکشور ۴۶-۴۹-۱۳۶،
مظہر علی خاں (دیکھو ولا)
معارف (رسالہ) ۱۰۹،

معراج العاشقین ۴۲،

مفرح القلوب ۱۳،

"مقدمہ شعر و شاعری" ۶۹،

ممتاز (پسر کاظم علی جوان) ۱۷،

ممتاز حسین عثمانی (حکیم) ۱۳۰،

(فٹ نوٹ)

من پھول (پنڈت) ۶۲،

منوہر لال زتشی (پنڈت) ۱۱۱،

موازنہ انیس و دبیر ۱۵۸،

مہدی حسن ۱۱۸،

مہذب (اخبار) ۱۶۱،

مہر و ماہ (قصہ) ۱۴،

میرانجی بیجاپوری (شاہ) ۴،

میراں یعقوب ۹،

میر تقی (مصنف بوستانِ خیال) ۱۲۷-۱۲۸،

میر تقی (ولد سر سید احمد خاں) ۵۱،

میر مہدی (خط بنام) ۴۱،

میکڈانل (سر انٹونی) ۹۸،

نئی لغت ۱۳۷،

نامی (پروفیسر) ۱۱۷،

نثر بینظیر ۱۳،

نثر نثرہ نثار ۳۷،

ندوۃ العلماء ۵۸،

نذیر احمد (مولوی) ۲۳-۴۷-

تا ۵۷-۱۲۸-۱۴۷،

نشاط العشق ۴،

نصیحت کا کرن پھول ۲۶،

نصیر (شاہ) ۲۳،

نگار (رسالہ) ۱۷۰،

نوابی دربار ۱۳۴،

نوبت رائے نظر ۲۰۹-۲۱۰-

۲۱۱-۲۱۳،

نوازش (آغا) ۲۹،

نوشیرواں نامہ ۱۲۷،

نوطرز مرصع ۶،

نولکشور (منشی) ۱۲۹-۱۵۸،

نہال چند لاہوری ۱۷،

نیاز فتحپوری ۱۷۰،

نیرنگ خیال ۶۵،

واقعات اکبر (ترجمہ اکبر نامہ)

۲۲،

وزیر (خواجہ) ۲۹،

وقار الملک (نواب) ۵۸-۵۹،

وکرم اروسی ۱۰۶،

ونسنٹ اسمتھ ۲۰۸،

ولا (مظہر علی خاں) ۱۷،

ہالرائڈ (کرنل) ۶۲،

ہاشمی فرید آبادی ۱۱۸،

ہدایت الاسلام ۲۲،

ہرشچندر ۱۹۸،

ہفت پیکر (جواب ہفت پیکر

نظامی) ۱۵،

ہندوستانی اکیڈمی ۲۰۷-۲۰۸،

ہندوستانی گرامر ۲۴-۲۵،

ہیوٹ (سر جان) ۹۰،

یادگار غالب ۷۰،

یلدرم (دیکھو سجاد حیدر یلدرم)

۱۱۸،